

# گیان سنگ شاطر

ناول

از گیان سنگ شاطر

گیان سنگھ شاطر

جملہ حقوق برحق گیان سنگھ شاطر محفوظ ہیں

131

A CC - NO.

379

سند اشاعت : ۱۹۹۴ء

طباعت : اُشناک اینڈ اروند، نئی دہلی

فون : ۳۲۸۰۱۲۵، ۳۲۷۲۹۹۰

کتابت : عارف حیدر آبادی

قیمت : ۳۰۰ روپے

ناشر : گیان سنگھ شاطر

## ملنے کے پتے

- ۱۔ جناب پریم گوپال تل، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولامارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- ۲۔ جناب اسد یار خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
- ۳۔ ڈاکٹر خلیق انجم، اردو گھر، دین دیال پُبادیا مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

## مصنف کا پتہ

۱، ۵۰۱۔ ستیہ پارٹمنٹ، مانصاحب ٹینک حیدر آباد، ۵۰۰۰۲۸

ٹیلیفون نمبر - ۲۲۰۲۳۸



گیان سنگ شاطر

A. 40.  
379

اَسْلَمُ اور سَلِیْم کے نام

جن کی رفاقت، سخاوت کا سرچشمہ ہے۔

گیان سنگ شاہر

جِن کا مقصود ہو کمالِ حیات  
حادثوں کے وہ گھر بناتے ہیں  
وہ مسیحا نفس نہیں ہوتے  
جو صلیبوں سے لوٹ آتے ہیں

# تمہید

یوں ہی مت جان جو آندھی میں فروزاں ہو چیراغ  
اُس کے پردے میں کوئی آبلہ یا ہوتا ہے



باب نمبر	پہلی کتاب	صفحہ نمبر
۱	ہر اک زمین پر ہوتا ہے قتلِ انساں کا یہ کیا ضرور، زمیں وہ زمینِ مقتل ہو	۱۶
۲	آباد ہیں یہ مجھ سے جہانِ خراب میں میں ہی نہ ہوں تو فرشِ و فلک کس حسا میں	۱۷
۳	آپ اپنی تلاش کرتا ہوں نقشِ فرضی میں رنگ بھرتا ہوں	۲۵
۴	بود جس سے نمود تک پہنچی محبِ تخلیق کی ہے رعنائی	۳۲

- ۴۰ ۵ نہ جانے کتنے ہوئے اس جہان میں شاطر  
بساطِ زیست پر سب اپنی اپنی چال چلے
- ۵۸ ۶ میری ہستی ہے جستجوئے تمام  
اک یہی وصف مجھ میں کیا کم ہے
- ۶۹ ۷ میں نے عنوان دیا ہے ہر شے کو  
زندگی کیا ہے؟ میرا طرزِ بیاں
- ۷۶ ۸ نعماتِ پُر بہار ہیں، شاداب ہے چمن  
لیکن پھٹے پھٹے سے ہیں پھولوں کے پیر بہن
- ۸۱ ۹ اتنی سی سرگزشت ہے بزمِ حیات کی  
کوئی ہنسنا خوشی سے کوئی غم سے رو دیا
- ۸۹ ۱۰ شاطر نگاہِ شوق کا محرمِ ازل سے ہوں  
آدم ہوں کوئی لالہ صحرَا نہیں ہوں میں
- ۹۷ ۱۱ پاتا ہوں اپنے پر تو ہستی سے کم اُسے  
گر می تو ہے شعور نہیں آفتاب میں
- ۱۰۸ ۱۲ ہر گام پہ ٹھوکر سے گرا دیتا ہے  
ہر بزم سے بے فیض اٹھا دیتا ہے  
جس میں نہ ہنر ہو یہ زمانہ اُس کو  
مانندِ غلطِ حرفِ مٹا دیتا ہے

- ۱۲۱ اک شخص سے رستے میں ملاقات ہوئی  
۱۳ دل چسپ طریقے سے مدارات ہوئی  
شرما کے نگاہوں کو جھکایا پہلے  
پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات ہوئی
- ۱۳۹ آندھی میں گھرا ہوا شجر ہو جیسے  
۱۴ طوفان کی زد میں کوئی گھر ہو جیسے  
اُف شورشِ آنفاس بہ ہنگام وصال  
کھسار سے ندی کا گزر ہو جیسے
- ۱۴۵ اپنے عمل کا جس نے کیا تجزیہ صحیح  
۱۵ دیکھا ہے اُس نے بھر کے نظر آفتاب میں
- ۱۵۱ ابھی تک قلب مضطرب سے صدائے غم نکلتی ہے،  
۱۶ ہوئی مدت کہ چھیڑا تھا کسی نے دل کے تاروں کو
- ۱۷۱ خدا کیسا! کہاں کا دیرد کعبہ  
۱۷ یہ آدم ہی نے سب فتنے جگائے
- ۱۷۲ بہجومِ شوق کے پردے سے شاہ  
۱۸ کوئی کیسے حقیقت دیکھ پائے
- ۱۸۷ وصل میں بے خودی کا وہ عالم  
۱۹ گویا خود سے جدا ہو گئے تم

## گیان سنگ شاطر

۱۸۹ طاری ہے اک جمود سا بزمِ حیات پر ۲۰  
مرنے کا حوصلہ ہے، نہ جینے کا بانگین

۲۰۵ ہرنے زخم کی قسم شاطر ۲۱  
بِزندگانی سے اور پیار جتا

۲۱۴ شاطر نہ درندے سے نہ حیواں سے ڈرو ۲۲  
دوزخ کے عذابوں سے نہ شیطان سے ڈرو  
ہر قفسِ دنیا کا ہے ماخذِ انساں،  
ڈرنا ہے اگر تم کو تو انساں سے ڈرو

۲۲۴ اپنے لہو میں جب نہ رہی گرمی وفا ۲۳  
کیوں عذرِ سہو جہری دنیا کرے کوئی

۲۲۹ اُسی نے گھول دیا زہرِ ساخیاں میں ۲۴  
اُسی کا ذکر مجھے زندگی سے پیارا ہے

۲۳۳ کوئی یقین کرے اس پہ یا ہنسے شاطر ۲۵  
وہ زندگی ہے مری جس نے مجھ کو مارا ہے

۲۳۸ زندگی کی بساط پر شاطر ۲۶  
چال اپنی نہ کوئی کام آئی

چراغِ منزل تو ہیں وہ شاطر ۲۷  
وہی جو نقشِ پاپیں خوں چکاں سے

- ۲۵۱ کانٹوں کے ساتھ ساتھ ہیں چھالے بھی ہم سفر ۲۸  
دشتِ جنونِ شوق میں تنہا نہیں ہوں میں
- ۲۵۶ تفسیر ہیں بستی کی، تقدیر ہیں بستی کی ۲۹  
تصویر ہیں بستی کی، اُجڑے ہوئے ویرانے
- ۲۶۱ غم کبھی اشک ہیں کبھی آہیں ۳۰  
یوں بھی آب و ہوا بدلتی ہے
- ۲۷۲ جو ہوا منحرف روایت سے ۳۱  
اُس نے راہِ حیاتِ نو پائی
- ۲۷۹ اُڑے سے جاتے ہیں شاطرِ وصال کے لمحے ۳۲  
کچھ ان پہ روک لگاؤ بہار کے دن ہیں
- ۲۹۱ دھکتے چہرے جہاں پر دھنک ہوسینوں کی ۳۳  
دیں پہ ڈالو پڑاؤ بہار کے دن ہیں
- ۲۹۹ کھنکنے لہجے، اُبلتی ہوئی آداؤں کے ۳۴  
کوئی نہ روکے بہاؤ بہار کے دن ہیں
- ۳۰۳ دلِ تباہ میں یوں حسرتِ وصال پہلے ۳۵  
کسی مزار پہ جیسے کوئی چراغ جلے

۳۱۱ اک مرے چاہنے سے بنتی نہیں بات کوئی ۳۶  
تم بھی کچھ بات بناؤ تو کوئی بات بنے

۳۲۳ بنایا آئینہ جس نے یہ اُس کا مقصد تھا ۳۷  
ہنر میں اپنے کوئی عیب ہو تو دیکھ سکے

۳۲۷ زندگی کے ہزار پہلو ہیں ۳۸  
اور کوئی نہیں کسی سے کم

۳۳۶ جس نے لڑ لڑ کے اندھیرے سے اُجالا چھینا ۳۹  
اُس پہ یہ راز کھلا کون خدا ہوتا ہے

۳۴۲ یہ میرے دل کی آبادی کہ بربادی کے سماں ہیں ۴۰  
مرا شوقِ نمو آواز دیتا ہے بہاروں کو



یوں ہی مت جان جو آندھی میں فروزاں ہو چراغ  
اُس کے پردے میں کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

**قارئین !** کچھ لوگ وقت سے پہلے یا مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں، میں اُن میں سے کسی ایک زمرے سے تعلق رکھتا ہوں۔

میرے لئے زندگی بیدار مغزی اور حقیقت پسندی کا دوسرا نام ہے۔ جو آدمی ان عناصر سے بیگانہ ہے، وہ دوسری انواعِ حیات کی طرح برحسُنِ حادثہ نوعِ آدم سے متعلق ہے۔ اُس کا وجود حشراتِ الارض کی طرح ہے، جو رنگینیِ طلوعِ سحر سے بے بہرہ ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ کی روایتِ حُسنِ موجودات ہے اور اسی طرح بیدار مغزی اور حقیقت پسندی۔ خود فریبی فطرتِ انساں ! اپنی جگہ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ بیدار مغز اور حقیقت پسند ہے لیکن اصلیت اِس کے برعکس ہے۔ وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہے۔

کیا میں بھی فریبِ نفس میں مبتلا ہوں ؟ —

نہیں ! قارئین نہیں !! — اور اسی لئے میں اپنی شخصیت کا محرمِ راز اور حقیقت شناس ہوں۔ میں نے اپنی شخصیت کو گیان سنگ شاہ کی صورت بیان کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ گیان سنگ شاہ کی حقیقت بیتابیِ روح، شوقِ آگہی، شدتِ جذبات عینِ اعمال اور حیاتیاتی کیفیت کا ایسا ہیجان خیز طوفان ہے جس کا ردِ عمل فکر و اعصاب پر ہوگا اور تغیر کو جنم دے گا۔ جو قاری اِس حیرت انگیز تحریک کی لذت سے نا آشنا ہے، وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ ان سطروں سے آگے بڑھے، ورنہ یہیں رُک جائے۔ میں تاکید کرتا ہوں اور میری تاکیدیں تنبیہ کی آمیزش ہے کیوں کہ میری کہانی سراسر حقیقت ہے اور حقیقت، دروغ سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور نفرت انگیز ہوتی ہے۔

کذبِ انسانیت کی سب سے بڑی تکریب ہے۔ جو کوئی اس سے نجات پانے میں ناکام رہتا ہے، وہ نہ خود پیتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو پینے دیتا ہے۔ حقیقت کی آفاقی خوبی وقتی طور پر بھیانک لگتی ہے لیکن اِس کے دیررس اثرات خوش گوار اور رُوح پرور ہوتے ہیں۔ انسانوں کی اکثریت کو تاہ بین ہوتی ہے۔ حقیقت سمجھنے کے لئے سمجھ بوجھ کی حیثیت لگتی ہوئی ضروری ہے، جس کے لئے مخصوص قسم کی ضمیر بینی

درکار ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اس لئے حقیقت کو بیان کرنا، آفات کو دعوت دینا ہے۔  
مجھے یحییٰ ہی سے طرح طرح سے گمراہ کیا گیا، بے جا تقلید پر مجبور کیا گیا، روایت پرست بنایا گیا  
لیکن میرے شمع کی خود اعتمادی اور اعتبار افزائی! تمیں اپنی ہی طرح بڑا ہوا، اپنی ہی سمت چلا اور ہوتے ہوئے  
اس سچائی کا قائل ہوا کہ زندگی کی بنیادی خصوصیات ہیں کہ وہ مجسم صحت مند اور سرکشی کی مد تک خود رہو۔  
جو زندگی ان اوصاف کی حامل نہ ہو، وہ زندگی بیمار ہے، انحطاط پر رہے۔ اور کسی کے رحم و کرم پر جیسے والا کمزور  
ہوتا ہے! وہ اُس شان و شوکت سے بھی بیگانہ ہوتا ہے جو خود بیداری اور خود نمونی کی ابرو ہے۔ اسی زندگی کو  
فریبِ نفس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اُس کی ذہنی کیفیت بندریا کی متناجیسی ہوتی ہے جو اپنے مُردہ بچے کو زندہ  
جان کر چھاتی سے پیٹائے رکھتی ہے۔

میں زندگی کا نہیں اس کی سچائی کا احسان مند ہوں۔ جہاں زندگی موقوفی ہے وہاں اس کی  
سچائی دائمی ہے۔ اپنی سچائی کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ یہ میرے مرنے کے بعد بھی زہرِ زندہ رہے گی  
بلکہ تاریخ کا ایک باب بنے گی۔ میں اپنے اس یقین کو اپنی تقدیر کہوں کہ کچھ اور؟ میرے نام کے ساتھ کسی دوسرے  
ناموں کی سچائی بھی زندہ رہے گی۔ کہنے کو وہ لوگ اُسے گئے ہو گئے لیکن اپنی سچائی میرے ساتھ چھوڑ گئے۔ اُن کی  
سچائی میرا ورثہ ہے۔ میں اُسے جیسے چاہوں، جہاں چاہوں ظاہر کروں! وہ اسے اپنے حق میں مداخلت بے جا  
خیال کریں تو یہ اُن کی نادانی ہوگی۔

میرے قارئین! اپنی کڑی سچائی کی طرح میں آپ کو اپنے کڑے انداز میں انتباہ دیتا ہوں۔  
میری حقیقت جان کر آپ کی وہی حالت ہوگی جو سیلاب سے ساخت و تاراج دھرتی کی ہوتی ہے۔ وہ وقتی طور  
پر لٹ جاتی ہے لیکن سیلاب ٹھہرتے ہی اُس تغیر سے روشناس ہوتی ہے جو خود غیزی کی ٹوٹی ہے۔  
میری ذہنی اُچیچ کے ساتھ یہ تہذیب کا کوشم ہے کہ میں آپ سے قریب بھی ہوں اور مخاطب بھی،  
ورنہ یہ کاروبار دنیا اور کروڑوں اربوں کا ازدحام! اور میں اس بھڑ میں اکیلا کھڑا ہوں! نہ کوئی میرا پیش رو تھا  
اور نہ کوئی میرا جانشین ہوگا!

خدا کے بارے میں اہل مذہب ہزاروں صدیوں سے دہراتے آئے ہیں،  
”خدا کا نام نِمت ہے“!

”خدا کا نام برکت ہے“!

قارئین! کیا خدا کا نام واقعی نِمت اور برکت ہے؟ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آدمی، خدا کا نام  
جپت اور خوش و خرم رہتا۔ کیا ایسا سمجھنے اور سمجھانے والے نیرنگی خیال میں مُبتلا اور ارتقاے حیات کے

تقاضوں سے بے بہرہ نہیں ہیں ؟

آدمی نظریہ ساز اور مصلحت سوز ہے۔ اس لئے براہ راست نشیب و فراز سے مُسلک ہے، جو اس سے ہندھی ملتی قدروں کی توقع کرتے ہیں، وہ گونا گونی حیات کو اسبرِ نفس دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں اپنی حقیقت سمجھتا ہوں اس لئے میں اپنا وکیل اور گواہ اور منصف ہوں، اور زندگی کو بے نقاب کرتے ہوئے کسی الجھن کا شکار نہیں ہوں۔ اپنے جذبات و افعال اور حادثات و احوال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے، میں نے لفظوں میں نرمی اور سنگینی کو یکساں برتا ہے تو اس کی وجہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نشاط و غم کے جن طوفانوں سے میں گزرا ہوں، آپ حضرات بھی اُن حادثات کو اُسی رشادت سے محسوس کریں تاکہ آپ میری عباداری اور غیر جانبداری کا صحیح تجزیہ کر سکیں۔ میرے اس بیان سے جڑا ہوا میرا ایک احساس ہے۔ میرا ہر لفظ میری سچائی کا مظہر ہے اور اس کا ایسا اہم اور لطیف حصہ ہے جیسا کہ دل کی دھڑکن خرام حیات کا۔ آپ کا ہر لفظ پر غور نہ کرنا دل کا دھڑکن سے چوکنے کے برابر ہوگا، اسی لئے میں نے اپنی سرگزشت کا آغاز آپ حضرات سے مخاطب ہو کر کیا ہے۔

میرے نزدیک فطرت نے دنیا کو خوبصورت بنایا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو خوبصورتی کا غارت گرجھا پیدا کر دیا ہے۔ وہ غارت گر کوئی اور نہیں، آدمی ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ آدمی اپنی تمام تحقیر آمیز صفات کے باوجود ایک لحاظ سے فطرت سے برتر ہے۔ وہ یوں کہ جہاں کاروبارِ فطرت نہاں ہے، وہاں کاروبارِ آدم عیاں ہیں۔ فطرت تخلیق کرتی ہے لیکن اپنی تخلیق کو نام نہیں دے سکتی۔ آدمی تخلیق کرتا ہے اور اپنی تخلیق کو نام دیتا ہے اور پھر اُسے صوت و معنی کی کیفیت دے کر سوز و گداز سے حظ اٹھاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ہنگامہ تخلیق فطرت میں کوئی کیا ہوتا؟ یہ کوئی نہ جاننا کیوں کر اس کے تعلق سے بیان کرنے والا کوئی نہ تھا۔

قارئین ! میں آپ کی بصارت و سماعت کو نئے دیدہ و گوش دے رہا ہوں اس لئے میں آپ کی پوری توجہ چاہتا ہوں۔

## باب ۱

ہر اک زمین پہ ہوتا ہے قتلِ انساں کا  
یہ کیا ضرور، زمیں وہ زمینِ مقتل ہو

جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے، میری ماں کا بیاہ اس کے باپ کے ناپسند کردہ خاندان میں ہوا تھا۔ اپنے بیاہ کا حادثہ وہ کچھ اس طرح بیان کرتی ہے۔

”تیرے نانا اپنی بہن کے وسیلے سے تیرے ہونے والے دادا کے ہاں پہنچے۔ پورے گھر میں خشتی روئے گھٹی کے ہوں گے۔ اس بیٹھک کی جگہ کچی پھینٹوں کا لیے روشن مکان تھا، جس میں پائے تک نہ تھے۔ کڑیاں، داسوں پر رکھی تھیں۔ بلبوں اور سرکنڈوں کی چھت، سرے کچھ می اُچی تھی۔ دروازہ اندر کو کھلتا تھا اور ہتھ گل سے بند ہوتا تھا۔ دروازے سے دور کچھ ڈھونڈنا ہوتا تو دین کو چراغ جلانا پڑتا۔ بجھتے چراغ کا ڈیس لٹکی رہتی تھیں، جو اندھیرا ہوتے ہی اندر سے باہر اور باہر سے اندر تیروں کی طرح اڑتیں۔ اُن سے ٹکرا جانے کے ڈر سے گھونگٹ نکالنا پڑتا۔ اندر گھٹن ایسی تھی کہ دروازے کے سامنے ہی سانس بوجھل ہو جاتی تھی۔ ایک تو تیری دادی کی مینائی گمرو تھی، دوسرے وہ بھی بھی پھوہڑا! تو نے دیکھا تو ہے۔ اُس نے بالٹی بھر دودھ میں شکر ملائی اور خوں کی توں لے جا کر تیرے نانا کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے بالٹی کے ساتھ پیتل کا گلاس رکھا، وہ کسے سے ہر تھا اور دودھ پر چڑھے کی مینگیاں تیر رہی تھیں۔ وہ گندگی دیکھ کر تیرے نانا کو قے ہو گئی۔ تیرے بھائی بھی گھر میں نہ تھے، تیرے نانا، اُن کا انتظار کئے بغیر اُٹھ کر چل دیئے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ وہ جس گھر کو ٹھکرا کر جا رہے ہیں، وہیں اُن کی بیٹی، بہو بن کر آنے والی ہے۔“

”تقدیر! میری ماں آہ بھر کر خاموش ہو جاتی اور آنکھیں نیچی کر لیتی جیسے اپنے کلیجے پر اُن زخموں کو دیکھتی جن پر وقت کی کھپری جم گئی تھی لیکن جو اندر سے ہرے تھے۔“

”تیرے نانا گلی سے گزرتے ہوئے ہریانہ کی جانب مڑے تو ننگڑ پر تیرے بھائی جی سے ٹکرا گئے۔ اتنے میں تیرے دادا نے بتایا کہ وہی اُن کا لڑکا ہے، جسے دیکھنے کے لئے وہ آئے ہیں۔ تیرے نانا نے انہیں اغوش میں لیا، وہیں شگن کا روپیہ دیا اور گھر چلے آئے۔ جب تک میرا بیاہ نہ ہوا، تیرے نانا، تیری نانی سے کہتے رہے، ایسے ہی! تین نہ چاہتے ہوئے بھی میلو (میری ماں کا نام) کا رشتہ وہاں پکا کر آیا ہوں! میں، رتن سنگھ کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا! اُس کا رنگ روپ پڑھتا ہوا سورج ہے! ویسے گھر میں اندھیرا ہی ہے! روشنی ہو جائے تو تیری لڑکی کا اپنا بھاگ ہے!“

”میں بیاہی آئی تو گھر میں گندوباسن سا ہونکار کا آنا جانا تھا۔ ایک دن میں روٹی پکا رہی تھی کہ وہ کھانے کھنکارے بغیر اندر گھس آیا اور چوہے کے آگے ٹانگیں پसार کر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے روکا تو وہ مجھ پر بگڑنے لگا۔ تیری دادی نے اُس کی حمایت کی اور مجھے برا بھلا کہنے لگی۔ اُس وقت یہ کہاوت مُردج تھی۔

گمرو پناں گت نہیں

شاہ پناں پت نہیں

تیرے بھائیاجی نے شاہ اور ادھار کی پھسکار کا ارتھ اپنے انداز میں سمجھا۔ انہوں نے گندو کو ٹھونکا اور گھسیٹ کر باہر لگی بن پھینک دیا۔ تیرے دادا سادھو سمجھاؤ تھے اور کچھ نہ بولتے تھے۔ تیری دادی نے داویل کیا۔ انہوں نے اُسے بھی دھریا، اُسی دن میرا سارا زیور بیچ کر ادھار چکایا اور فیصلہ کیا کہ بھوکے مرجائیں گے لیکن ادھار نہ کھائیں گے۔ ہم نے کئی مہینے بیچھڑ کا پھلکا، لون مرچ کی چٹنی اور تسی سے کھایا اور سنتو کھ کیا۔ اُس کے بعد ہماری حالت اچھی سے اچھی ہوتی گئی لیکن تیرے بھائیاجی کی عادت بُری سے بُری۔ اُن کے دماغ میں بھی بات بیٹھ گئی کہ مار دھاڑی ہر مشکل کا حل ہے۔“

## باب ۲

آباد ہیں یہ مجھ سے جہاں خراب میں

میں ہی نہ ہوں تو فرش و فلک کس حساب میں

میں ۲۳ فروری ۱۹۳۷ء میں ڈوبیانہ کلاں میں پیدا ہوا۔ پنجاب کا یہ چھوٹا سا گاؤں ہوشیارپور میں واقع ہے، اور ہریانہ سے شام چورامی جانے والی سڑک پر دو میل کی دوری پر ہے۔ اس پرسکون آبادی کو فطرت کا فراوانی رائگاں کی سعادت حاصل تھی۔ دائمی آب جو کے کنارے سبزہ زاروں اور درختوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی بستی اس قدر حسین اور خواب آور تھی کہ یہاں گردشِ شام و سحر کی رُکی رُکی سی دکھائی دیتی تھی۔ بلبلوں کے نغمے، فاختاؤں کی ٹٹروں ٹوں، کونلوں کی کوکو، موروں کی کوکویں، پیپھیوں کی پی کہاں، ٹٹیریوں کی ہم یہاں، خود رو پھولوں کی بہار، جنگلی پھولوں کی بھرمار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، رنگ رنگ فضا.... زمین کا یہ گوشہ کیا تھا! دوشیزہ فطرت کا دل نواز گہوارہ تھا۔

اور شاید میں یہاں بزمِ فطرت کے قانونِ توازن کی تجدید کے لئے پیدا ہوا۔ میری پیدائش معنوں ثابت ہوئی اور یہ فضا نے نغمہ و رنگ در ہم برہم ہو گئی۔ اُس کی وجہ مجھ پر طاری رحم مادر کا فسوں تھا جسے دُنیادی شور و غل توڑ نہ سکا تھا۔ سنتی والی نے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر اٹالٹا کیا، میرے منہ میں چھونکا، جپتیس لگائیں چٹکیاں توڑیں....

لیکن میرے بے جان ماس میں جان نہ پڑی، ہر کوئی مجھے روپیٹ چکا تھا، لیکن میری دانی مجھ سے ملاؤں نہ تھی۔ وہ میری ہی طرح خاموش تھی لیکن اپنا کام کئے جارہی تھی۔ آخر وہ جلتا ہوا پانی تھا جس نے میری دنیاے قرار کو پھونک دیا۔ میری دنیا لٹے ہی دوسروں کی دنیا آباد ہو گئی اور میری چیزوں میں سب کی چیزیں ڈوب گئیں۔

میری زندگی کی سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ میری بد بختی، لاعلمی اور بے کسی کے باوجود میرا نام، گمراہ گرنٹھ میں سے استخارہ دیکھ کر گیان سنگھ رکھا گیا۔

میری ماں ہر بھر بانی، پتہ خیز تھی، میں ریگنا ہی سیکھ رہا تھا کہ میری جگہ ایک دوسری بچی نے لے لی۔ ماں کی گود کیا چھٹی! میرا ہر سہارا چھوٹ گیا۔ میں بھرے گھر میں اکیلا ہو گیا اور رغبت و محبت سے محروم، جس کی مجھے اپنی سانسوں کی طرح ضرورت تھی۔

بچنے کا نام نہ تھی، ہوسلے اور نہ مستقبل، اس کا صرف حال ہوتا ہے اور وہ اسی کی حفاظت کرتا ہے۔ میری بہن دودھ چونگھتی اور میں ماں کے پاس بیٹھا اُسے حسرت سے دیکھتا۔ وہ مجھ پر ترس کھاتی، مجھے پہلو میں بٹھاتی اور دوسری دودھی میرے منہ میں ڈال دیتی۔ دودھی میرے منہ میں ہوتی لیکن میں اُسے چونگھ نہ سکتا۔ میں رقابت کی آگ میں جلتا ہوا اپنی بھوکی رقیب کو دیکھتا جو ہڑپ ہڑپ دودھ چونگھتی ہوئی غوطے کھاتی جان پڑتی۔ اپنا حق چھینے جانے کے غم میں۔ میں مشکل سے دو ایک اوپری اوپری چٹکیاں ہی لے پاتا کہ میری دشمن اپنا حصہ چونگھ خور کر رونے لگتی۔ آخر کار میری ماں کو اسی کی تسلی منظور ہوتی اور وہ میرے منہ سے دودھی کھینچ کر اُس کے منہ میں ٹھونس دیتی۔ میں اپنی آرزو کی میں اپنے حصے کی حفاظت کرتا اور اپنی دشمن پر چھپتا۔ ماں اُسے مجھ سے بچاتی اور مجھے پرے دھکیل دیتی۔ میرے سنناپ کو بڑھانے کے لئے یہی کافی ہوتا۔ میں گلے تک منہ پھار کر روتا، ایسٹریاں رگڑا اور سر کے بال نوچتا۔ وہ مجھے پچکارتی، چکنی چپٹری باتوں سے بہلاتی، دھارس بندھاتی اور میرے قریب نہ رکھنے پیار کرتی۔ میں نفرت سے باؤلا ہوتا اور اُس کے ہاتھ لگاتے ہی اُسے کاٹ کھاتا۔ وہ اپنی تکلیف سے گھبرا کر مجھے پرے دھکیلتی اور غصے سے کہتی، ”جا پرے مر!“ میں زمین پر گر کر بسل کی طرح لوٹتا۔ میرے آنسوؤں کا غلبہ چکیوں کی گہرائی تک پہنچ جاتا اور میں الجھے الجھے سانس لیتا جیسے رگب جاں میں گرہ پڑ گئی ہو۔

ایک بار میری ماں میری بہن کو میرے پاس لٹ کر اندر چلی گئی۔ بال ایرکھا! میں نے اپنی بہن کا منہ نوچ لیا اور اُسے ہولہان کر دیا۔ اُس دن بڑی کڑی سزا مجھے ماں کے ہاتھوں ملی۔

میری ماں مجھے اوپر اور دودھ پلاتی جسے دیکھتے ہی میرے حلق میں کانٹے اُگ آتے۔ میں منہ نہ کھولتا اور اُس کی دودھی سے دودھ پینے کی فصد کرتا۔ وہ لاڈ لاتی ہوئی مجھے گود میں لیتی اور دُوبی دودھ پینے کی ترغیب دیتی جس سے مجھے رغبت نہ تھی۔ میں کسی طرح نہ پسینا اور منہ بند رکھتا۔ وہ اپنی اٹنگی سے میری باجھیں پھار کر کھولتی اور میرے حلق میں دودھ

اُندلی۔ میں دودھ اُگل دیتا تو وہ مجھے پیٹی۔ میں ڈر کے مارے دودھ نہ اُگلتا لیکن گلے سے نیچے بھی نہ اُتارتا۔ وہ میری ناک پکڑ کر میری سانس روکتی، مجھے منہ سے سانس لینے پر مجبور کرتی اور یوں مجھ سے گلے میں دودھ اُتر داتی۔ وہ ہر بار میرا منہ دودھ سے بھرتی اور ہر بار ہی رویہ اختیار کرتی۔ وہ دودھ پینا ایسا عذاب تھا جس کا درد ابھی تک تازہ ہے۔ بھرتے بھرتے پیٹ بھر جاتا لیکن میں تسکین سے محروم رہتا۔ میں اپنے مظلوم خوابوں میں دیکھتا کہ میں ماں کا دودھ پینے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ مجھے باز رکھتی ہوئی میری بہن کو دودھ پلا رہی ہے۔ میں تڑپ کر نیند سے بیدار ہوتا اور پھر روتا روتا سو جاتا۔ میری محرومی نے مجھے اس قدر ہٹلانا دیا تھا کہ میں کسی صورت نہ بھلتا تھا۔ مجھے بھلانے کے لئے تیا جی مجھے حسنی بنا کر دیتے۔ میں اُسے اس شدت سے چوستا کہ چند ہی دنوں میں اُس کی کہیں نکلی آتیں جو میرے منہ کو مجروح کرنے لگتیں۔ میرے بچپن کا سب سے اہم اور کام کا کھلونا، رُٹو تھا جو مجھے تیا جی نے بنا کر دیا تھا۔ وہ مجھے وہ تحفہ نہ دیتے تو شایدیں چلنا نہ سیکھ سکتا۔

مجھے زبان ملی تو میں نے ہٹکلانا سیکھا اور ہٹکلانا بھی اس غضب کا کہ میں دو لفظوں کا ایک جملہ نہ بول پاتا۔ میں لفظوں میں ایسے اُلجھ جاتا جیسے جالے میں گھٹی۔ میں بے بس، بے اختیار بھٹیں بھٹیں، بھٹ بھٹاتا۔ کوئی دوسرا میرے سامنے بات کرتا تو میں اُسے جسرت سے دیکھتا اور اُس کی زبان کی روانی اور بے ساختگی پر حیران ہوتا لیکن میں بات کرتا تو اپنی پریشان خاطر کی دعویت دیتا۔ میرے بچپن کی کہانی کُل ترکی سی ہے۔ اُس کی نازک پیکھڑیاں باد و باراں کے تھپیرے کھاتی ہیں لیکن کراماتی طور پر ٹوٹنے سے بچی رہتی ہیں۔

بدگمانی اور بے تسکینی اور ناگامی میری گھٹی میں پڑی۔ میری پرورش حسد کی مٹی میں ہوئے گئے بیج کی طرح ہوئی۔ میں ہر کسی سے اپنی ہی بات منواتا اور ہر چیز پر اپنا حق جتاتا۔ میں اپنے من کی مراد نہ پاتا تو روتا اور آنسوؤں کے سیلاب میں ایسے سانس لیتا جیسے کوئی پانی میں ڈوبے، ابھرے، دُوب کر ابھرے کوئی دِلا سا مجھے رام نہ کرتا۔ ہر کوئی مجھے نفرت سے دیکھتا اور مجھ سے دُور رہنا۔ میں ایڑیاں رگڑتا اور مسلسل رگڑتا۔ اُن سے خُون بہنے لگتا تو ماں اُن پر پیٹاں بامدھ کر میری مانگیں جکڑ دیتی۔ میں ایڑیاں رگڑ کر نہ رو سکتا تو میرا اُبال اُس کڑھی کی طرح ہوتا جس کے نیچے آگ کی لپک تیز ہو۔ میرا چلن نئے جتنے بچے کا سا تھا جو چلانا اور نقطہ چلانا جانتا ہے۔

میں بھائی جی کے سوا کسی سے نہ ڈرتا تھا۔ وہ عام طور پر گھر میں نہ رہتے، رہتے تو کسی قسم کا شور پسند نہ کرتے۔ وہ خوں خواری کی حد تک شور مچاتے تھے۔ گھر میں کوئی چڑیا گھونسلانا بتاتی، وہ لوکرے کا پھندا بنا کر اُسے پکڑ لیتے اور اُس کی گردن مروڑ کر پرے پھینک دیتے۔ اُس خوں خرابے سے ہم کہیں کوئی دُک جاتا اور دیر تک گم گم پڑا رہتا۔ میں روتا ہوا انھیں دیکھ لیتا تو ایسے چپ ہو جاتا جیسے میری جیخوں سے جڑی ہوئی تانیں ٹوٹ گئی ہوں۔ میری گئی اُس تازہ ذبح شدہ جانور کی سی ہوتی، جو مڑتا ہوا تڑپ نہ سکے۔ وہ مجھے بسورتا ہوا دیکھتے، بریدے میرے اوپر

## گیان سنگھ شاطر

آتے، مجھے گلے سے دبوچ کر ہوا میں جھلادیتے اور جب تک میرے دیدے ابل نہ پڑتے، مجھے زمین پر نہ رکھتے۔  
میں پاؤں پر ایسے ڈھ پڑتا جیسے اُن کے نیچے سے ہمارا کھسک گیا ہو۔

میری ماں معروف ترین گڑہستن تھی۔ شاستروں کی رُورُعایت سے اُس کی پدوی بھگوان کے دُوسرے  
درجے پر سہی لیکن حقیقت میں وہ بندھواؤ کرانی سے بدتر تھی۔ وہ میرے باپ کے اشاروں پر ناپتی تھی، اُس کے نفسِ  
حیوانی کا شکار ہوتی تھی، بچے جتنی تھی اور اپنے مالک اور اپنی مخلوق سے رگیں بھی چھڑواتی تھی۔ میرے ملعون بچپن میں  
اگر کوئی قابلِ فخر بات ہے تو وہ یہ کہ میرے ننھے شیشے کی طرح صاف رہتے تھے، جو شاید میری ماں کے دودھ  
کا چمتکار تھا۔

دَندے مصیبت میں ہوں تو اپنے حریفوں سے دوستی کر لیتے ہیں کچھ دُہی نفسیات غریبوں کے بچوں  
کی ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ بے یار و مددگار مر جاتے۔ میرے بچپن میں اِس صورتِ حال کو بُرا دخل رہا ہے۔  
مجھے مٹی کھانے کی عادت پڑ گئی۔ میری گندی عادت چھڑوانے کے لئے ماں مجھے گڑ کی دلی دیتی لیکن  
میں گڑ لے کر بھی دُہی کرتا جو مجھے کرنا ہوتا۔ تایا جی کی بڑی ہو بے انت کو رہ پھور کھایا کرتی تھی۔ وہ اُس کی دلی، دو  
دلی جیب میں رکھتی، مجھے اکیلا دیکھ لیتی تو ایک ادھ کئی میرے مُنہ میں ڈال دیتی۔ یہ مٹی دوسری مٹی سے زیادہ سواد  
اور خستہ تھی۔ مجھے جوں ہی اُس کے ذخیرے کا علم ہوا، میں نے چلے کا پایہ توڑا اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگا۔  
کہتے ہیں کہ بچہ اکیلا چپ چاپ بیٹھا ہو تو سمجھو کوئی کُل کھلا رہا ہے۔

بھائی جی میرے پیچھے سے دَبے پاؤں آئے اور مجھے مٹی کھاتے پا کر میرے گلے پر جھپٹے۔ میرا اوپر  
کا دم اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ لون دانی پاس ہی پڑی تھی، اُنہوں نے اُس میں سے مچوں کی مٹی بھری اور میرے  
مُنہ میں ایسے جھونکی جیسے وہ موشی کی باجھیں پھاڑ کر اُسے لُون دیتے تھے۔ میری سانس رُک گئی، مجھے اُٹی ہوئی تو  
میری سانس کھلی۔ مچوں اُڑیں، آنکھوں میں پُریں، ناک میں پڑھیں، مجھے ہچکیاں آنے لگیں اور ساتھ ہی چھینکیں،  
میرے اندر اور باہر اگ لگ گئی، میں اُسے تھوک تھوک کر بجھاتا اور کبھی پونچھ پونچھ کر۔ میں تڑپتا اور لوٹتا ہوا  
ایسے چلا رہا تھا جیسے کسی کو بار بار، لگاتار چرکا دیا جا رہا ہو۔

میری عمر دُور اڑھائی سال کی ہوگی لیکن وہ حادثہ مجھے کل کے واقعے کی طرح یاد ہے۔ لوٹے لوٹے اُرتے  
روتے، چھینکتے چھینکتے، ہچکیاں بھرتے بھرتے میرا دم اُلٹ رہا ہے۔ بھائی جی اپنا پاؤں اوٹے پر رکھے، ہاتھ کھٹنے  
پر دھرے، کچھ آگے جھکے مجھے اُس سکونِ مضطرب سے دیکھ رہے ہیں جو بکرے کی گردن مار کر قصائی کے چہرے پر  
اُبھرتا ہے۔ میرے آنسوؤں کی دھند میں وہ مجھے، وہ راکشش نظر آرہے ہیں، جو گناہ گاروں کو اٹھا اٹھا کر  
دوزخ کی آگ میں جھونکتا ہے۔



ہمارے گھر میں دوزخ کی ایک تصویر تھی جس میں دھرم راج کے بھیانک قسم کے کارکنی اگناہ گادوں کو آذیتیں دیتے دکھائے گئے تھے۔ وہ کہیں اگ میں جلانے جارہے تھے، کہیں دیگوں میں اُبالے جارہے تھے، کہیں لال سلاخوں سے کچوکے دے دے کرتائے جارہے تھے۔

میری بیچ و پکار تانی رلی کے گھرنک پنچ گئی اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے دوڑی آئی۔ میری بری حالت دیکھ کر وہ، بھائیاجی پر برس پڑی، ”پانی! اسے ویسے ہی مار ڈال! تڑپا کیوں رہا ہے؟“

وہ مجھے اٹھا کر غسل خانے میں لے گئی، مجھ پر پانی کی باٹی انڈیلی، میرے منہ پر پانی چھپا کا، انگلی سے میرے منہ کا آندڑی جھٹھا صاف کیا، باجھوں میں پانی ڈال کر انہیں بار بار دھویا اور مجھے اپنے دوپٹے میں لپیٹ کر اپنے گھر لے جانے کے لئے اٹھایا۔ بھائیاجی نے اُس کا راستہ روک کر مجھے، اُس سے چھیننے ہوئے کہا، اُسے مرجانے دے، یہ مردود اسی قابل ہے!“

مجھے اُن سے بچانی ہوئی اور اُن کے ارادے کو رد کرتی ہوئی، تانی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اُس نے مجھے چار پانی پر لٹایا، گلی شکر کھلایا اور میرے پنڈے پر زرا گھی ملا۔ جو اگ، پانی سے نہ بجتی تھی وہ گھی سے بجی۔ تانی کی ممتا! اُس نے مجھے چھاتی سے دودھ بلایا۔ اُس کی چھاتی میں دودھ نہ تھا لیکن میں اُسے پونگھتے پونگھتے سو گیا۔ وہ سب مجھے اتنا اچھا لگا کہ تانی کا دودھ چونگھنا میرا معمول ہو گیا۔ وہ مجھے دودھ چونگھاتی اور پیار سے میرے کيسوں میں انگلیاں پھیرتی۔ میری خود فریبی! میں سوکھی چھاتی کو ایسے پونگھتا جیسے وہ ہری ہو۔ ایک منجڑ ہوا، اُس کی سوکھی چھاتی ہری ہو گئی۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ اُس نے اپنے دروازے پر بندھنوار لٹکا دیا اور وہ بلینز کے آگے اپنا دچاولوں کے آٹے سے بنائی ہوئی چتر کاری، بنالیا جیسے اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہو۔ میری خوشی لاشانی تھی! میں اُسی کے پاس رہتا، کھیلنا اور جب چاہتا پنا (وہ دودھ جو محبت مادی سے کنواری لڑکی کی چھاتی میں اتر آئے) پیتا۔ ہمارے ریشے کو نیا عنوان مل گیا۔ میں اسے تانی ماں کے نام سے بلانے لگا اور وہ مجھے چھوٹے بیٹے کے نام سے۔ وہ مجھے کہانیاں سناتی، پیروں پر بٹھا کر جھولتا جھلاتی اور لوری سناتی۔

جھونٹے مایاں دے

لیف تلامیاں دے

بڑھے مایے

چرخ چک لے

آندھی آئی

بادل آیا

لوری کی آخری لے کے ساتھ وہ پیروں کو اوپر جھلاتی اور وہیں روک لیتی اور مجھے گدگداتی۔ میں ہنسی سے لوٹ لوٹ ہو کر اُس کی گود میں جا گرتا۔

میری صحت بڑھنے لگی، چڑچڑاہٹ گھٹنے لگی اور کھیل کود میں چالاکی آنے لگی۔ تانی ماں میرے ایک ہاتھ میں کوئی چیز دیتی تو میں دوسرا ہاتھ آگے بڑھا دیتا، وہ اس پر چیز رکھتی تو میں منہ کھول کر ’اے‘ کرتا۔ وہ خوشی سے میری مٹھی لیتی اور منہ میں چیز ڈال کر کہتی، ”تُونھا مٹھا بدماش ہے!“

مجھے جینے کے لئے تانی ماں الگ، پرکاش کو الگ اور سورن کو الگ چیز دیتی۔ زیادہ مٹھا کھانے سے پیچھے پیدا ہو گئے۔ میں چوڑے کھلاتا اور تکلیف سے چلاتا۔ تانی میرے چوڑوں میں اُبلوں کی راکھ گھسائی اور کہتی، ”اور کھا چیز!“ میری چیز بند کر دی گئی۔ میں جس سے چیز مانگتا وہی مجھے جن جنوں کے نام سے ڈراتا اور چیز کھانے سے روکتا۔ بال ہٹ، بال ہٹ ہے! مجھے چیز نہ ملتی تو میں دو طرح سے حاصل کرتا، پہلے رٹ لگا کر، تانی ماں چیز دو، تانی ماں چیز دو، تانی ماں چیز دو، دوسرے روکر۔

تانی ماں کے چار بچے تھے اور چاروں مجھ سے بڑے تھے۔ میری تائیری بہنیں سورن کو اور پرکاش کو اور مجھے جی جان سے چاہتی تھیں۔ وہ میری ماش کر تیں، مجھے نہلاتیں اور مکھن کھلاتیں۔ اُن کے حُسنِ صنوک سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سارے میرے گھر والوں سے اچھے ہیں۔ میں اپنے گھر، ماں کے بلانے پر ہی جاتا اور وہ بھی بسوتا ہوا۔ تانی ماں کے گھر میں بھونپو والا گراموفون تھا جسے سب بجا کہتے تھے۔ بابے کے بھونپو پر گتے کی تصویر بنی ہوئی تھی، جو اپنے گوتھوں پر بیٹھا بھونپو کے آندر دیکھتا جیسے کچھ سنتا ہو۔ گراموفون ریکارڈز پر بھی گتے کی سفید تصویر بنی ہوئی تھی۔ ریکارڈ جیتا، میں تانی ماں سے پوچھتا، ”تانی ماں! یہ گانا کون گارہا ہے؟“

”بھونپو کے آندر جو گتا بیٹھا ہے، وہ گارہا ہے“ تانی ماں کہتی۔

میں حیران ہو کر بھونپو کے آندر جھانکتا۔ گتا چپ چاپ بیٹھا ہوتا لیکن گیت برابر سُنانی دیتا اور جب ریکارڈ ختم ہو کر رُکتا، گیت بھی بند ہو جاتا۔ بھونپو آتار کر باجا بجاؤ تو سادہ نڈبوکس میں سے گیت کی ہلکی ہلکی آواز آتی تھی۔ میں اپنے طور پر سوچتا کہ ریکارڈ والا کتا ہلے ہلے گا تاہے جسے بھونپو والا کتا سُن کر اُونچے سرورں میں دوہراتا ہے۔ ایک دن میں نے یہی بات تایا جی سے کہی جیسے میں نے بہت بڑا راز پالیا ہو۔ انہوں نے مُسکرا کر کہا، گتا بھونکتا ہے، گیت تھوڑے ہی گاتا ہے۔ ”میں نے انہیں اپنی بات منوانی چاہی تو وہ کاتے ہوئے گتے کو دیکھنے کے لئے میرے ساتھ چل پڑے۔ باجا بجنے لگا۔ تایا جی نے کہا، ”ادھر دیکھ! یہ گتا گاتا ہے تو اس کا منہ ہلنا چاہیے لیکن یہ چپ چاپ بیٹھا ہے!“

”لیکن تانی ماں کہتی ہے کہ کُتّا گاتا ہے!“

”وہ جھوٹ کہتی ہے“

”پھر یہ گاتا کون ہے“

”اس ریکارڈ میں گانا بھرا ہوا ہے جو ساؤنڈ بکس اور بھونپو کے وسیلے سے بجتا ہے۔“

”یہ کُتّا یہاں کیا کرتا ہے؟“

”ریکارڈ اور گراموفون بنانے والوں کا ٹریڈ مارک ہے۔“

”ٹریڈ مارک کیا ہوتا ہے؟“

”تو بڑا ہوگا تو سمجھے گا۔“

اُن کی بات سے میرے جذبہ تلاش کی تسکین نہ ہوئی لیکن گانا سننے میں میری دلچسپی برابر رہی۔  
مجھے گیتوں کے کئی انترے یاد ہو گئے۔ میری ناکافی! میں گانا چاہتا تو گانا نہ سکتا لیکن اُس کی تان کو رگوں میں ترقی  
آدھرتی محسوس کرتا۔

میں وہ ہر کام کرتا جو میرے سامنے کیا جاتا۔ مجھے روکا جاتا، میں اُٹنی ہی دیر کے لئے رکتا جتنی دیر  
روکنے والا میرے پاس ہوتا اور پھر وہی کام کرنے لگتا۔ تانی ماں نے چرخے کا تھکا سیدھا کیا اور اُٹھ کر اندر پوئیاں  
لینے گئی۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہوا طریق کار ہاتھوں سے آزمایا اور تھکا اُٹنا ٹیڑھا کر دیا کہ وہ گھومتا ہوا دائرہ  
بنانے لگا۔

تانی ماں کھیتوں کو جاتی تو میں اُس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا تو میرے  
جذبات اُلے اعلے ہوتے، کئی بار مجھے خوف کا احساس ہوتا، کئی بار کمتری کا اور کئی بار نارسائی کا۔ وہ جھوٹے  
قدم زندگی کے بڑے سفر تھے۔ میں گھر سے چمکتا، لہکتا اور ادھر ادھر بھاگتا چلتا جیسے گائے کے ساتھ بچھڑا۔  
ہمارے زیادہ کھیت کچھار کے پارتھے، جن کا راستہ ریت، دلدل، پانی، گھاس، اُٹار، چڑھاؤ، دھوپ،  
چھاؤں میں سے گزرتا تھا۔ تانی ماں احتیاط سے چلنے کو کہتی لیکن میری خوشی بے احتیاطی میں ہوتی۔ میں جان بوجھ کر  
ریت میں گزرتا، دلدل میں لٹھرتا، پانی میں بھینگتا اور دھولان پر پھسلتا۔ میری ترنگ میری حرکت تھی۔ تانی ماں کے  
ساتھ میں چارہ کاٹتا، کھیتی گورتا اور ہرانکالتا۔ بچوں کے لئے کھیتی باڑی کے چھوٹے اوزار تھے۔ میں نے اپنی مٹی  
(چھوٹا ربا) اور چوٹی (چھوٹی درانتی)، چُن رکھی تھی، اور کسی دوسرے کو اُن سے کام نہ کرنے دیتا تھا۔ کوئی انہیں دیکھنے  
کے لئے بھی اٹھاتا تو میں اُس سے چھین لیتا اور دعویٰ کرتا کہ یہ میرے ہیں۔ گیان سنگھ کے! میں کام کرتا کرتا  
چوٹ کھاتا، دزد سے رونا، تھوڑی دیر رکتا اور پھر وہی کام کرنے لگتا جو میری تکلیف کا باعث ہوا تھا۔ مجھے

کھلے آسمان کی سمیٹھی سے بچانے کے لئے تانی ماں مجھے درخت کے سائے میں بٹھاتی، درخت پاس نہ ہوتا، وہ چادرو وغیرہ سے اوٹ کر کے سایہ کرتی لیکن میری فصد! میں ٹھکانہ بیٹھتا اور کام کرنے پر مقرر رہتا۔ اپنی نااہلی اور ناتجربہ کاری کے باوجود مجھ میں برتری کا جذبہ تھا اور میں باہم مقابلے کا جوہر رکھتا تھا۔ تانی ماں پر ات کئی شبیازوں کو ایک ساتھ کاٹنا، ٹھکانی اور میں ایک شبیاز! میں پیچھے رہنے لگتا تو اٹھ کر آگے بیٹھ جاتا اور اپنے پیچھے آئے ایسے دیکھتا جیسے اُسے ہرا دیا ہو۔ وہ چارے کی بھری (گٹھا) اٹھائے کھیتوں سے گھرائی اور میں اپنے سر پر پوٹی۔ اُن مٹھی بھرتیوں کو میں تانی ماں کی بھری سے الگ رکھتا اور اس خیال سے تسکین پاتا کہ میں نے اُس سے زیادہ کام کیا ہے۔ پٹھے کترنے کا وقت آتا، میں اصرار کرتا کہ میری پوٹی الگ کٹرو اور پٹھرے کو ڈالو۔ ہمارے خاندان کے سب افراد میں سے صرف تایا جی بچوں سے تعلیمی اور تربیتی انداز میں پیش آتے تھے اور اُن سے صبر و تحمل برتتے تھے، باقی سارے بچوں سے بڑوں کی ہی سمجھ داری کی توقع رکھتے تھے اور انہیں ڈانٹنے، پیٹنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ کوئی جدت، میزار تایا جی کے پیارے رویے پر ٹھجرت کرتا، وہ کہتے۔ ”بچے، بڑوں سے زیادہ تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو، ان کے تجسس کی تسکین کرنی چاہیے تاکہ یہ زندگی کو اپنے طریقے سے سمجھ سکیں۔“

چاندنی راتوں کی تین باتیں قابل ذکر ہیں۔ تایا جی کی کہانیاں، دھوپ چھاؤں کا کھیل، تربیخ کے گیت (وہ گیت جو لڑکیاں گروہ میں بٹھ کر چرخہ کا تاتی ہوتی گاتی ہیں)۔ میں جہاں ہوتا مکمل طور پر دیں ہوتا اور اُن کے عمل سے اپنے علم میں اضافہ ہوتا ہوا محسوس کرتا۔ تایا جی کہانی سناتے ہوئے پٹ سن بھی نکالا کرتے تھے۔ وہ کوئی بات ذکر کرتے ہوتے تو اُن کی خاموشی اُن کی متانت ہوتی۔ اُن کے تہرے کی دل کشی! میں انہیں ایسے دیکھتا جیسے کوئی خوبصورت منظر کی خوبصورتی میں کھوکھو کو بھول جائے۔ وہ میرے تصور میں دھار رک کتھاؤں کے رشی مئی ہوتے جو شہزادوں کو علم دہن رکھایا کرتے تھے۔ جیسے جیسے روی کی توبی اُس کی مدد کرتا ہے ویسے ہی اُن کی آواز میں خوش اثری تھی۔ اُن کے لب و لہجے میں وہ معنی تھے جن کی تفسیر کھنا اُن کو گھٹانا ہے۔ اُن کا دماغ اس قدر لبریز اور زرخیز تھا کہ وہ کسی متجسس سے بات کرتے ہوتے تو لفظوں کو آدھرو تشکیل دیتے لگتے۔ لفظ لافانی ہے اور عمل فانی، اس کے باوجود پہلا، دوسرے کا بدل نہیں ہے کیوں کہ عمل، لفظ کا موجد ہے اور مجدد بھی۔ میں کتنی ہی تفصیل میں جاؤں بہت کچھ ناگفتہ رہے گا جسے کوئی دوسرا بیان کرے گا اس لئے کہ وہ اپنے عمل سے لفظ کو نئے معنی دے گا۔“

میں اُن سے سوال کرتا اور وہ میری تسلی ہونے تک میرے سوالوں کے جواب دیتے اور برہم نہ ہوتے۔

”تایا جی! یہ کیا ہے؟“

”اُری ہے۔“

”اے اری کیوں کہتے ہیں؟“  
 ”کسی نے اے ہی نام دیا ہے اور ہر کوئی اے اسی نام سے جانتا ہے۔“  
 ”اے ہی نام کیوں دیا ہے؟“  
 ”ہر چیز کی پہچان کے لئے اُسے نام دیا جاتا ہے جیسے تجھے نام دیا گیا ہے، گیان سنگھ۔“  
 ”مجھے یہ نام کیوں دیا گیا ہے۔؟“  
 ”ہم اُمید کرتے ہیں کہ تو بڑا ہو کر گنتی گیانی بنے گا۔“  
 ”گنتی گیانی کیا ہوتا ہے؟“  
 ”جو الفاظ کے صحیح ارتھ اور چیزوں کے صحیح گنتی سمجھتا ہو۔“

## باب ۳

اپنی تلاش کرتا ہوں  
 نقشِ فرضی میں رنگ بھرتا ہوں  
 (شاہ)

میری کہانی کی ہزاروں تفصیلات کسی کی نظر میں غیر ضروری ہو سکتی ہیں لیکن میرے پاس ان کی بڑی اہمیت ہے۔ میں ان تفصیلات سے گریز کروں گا تو اپنے نشیب و فراز کی واضح تصویر نہ کھینچ سکوں گا کیوں کہ نشیب و فراز زندگی سے ایسے جڑے ہوئے ہیں جیسے منزل سے راستے۔

اس سے پہلے کہ میں بڑا ہوتا اور لفظوں کے معنی صحیح طریقے سے سمجھتا، میری سوجھ بوجھ کو رُوم و روایات اور شکوک و توثقات نے داب لیا۔ میرے پہلے پن سے چھٹکارا دلانے کے لئے میری ماں مجھے گرووار لے جاتی، مجھ سے گرو گرنہ کے آگے ماتھا لٹکواتی، مَنت ماننے کی ترغیب دیتی اور خود بھی مَنت مانتی، ”میرے گرو میرے بیٹے کا بھلانا ٹھیک کر دے، میں تیری درگاہ میں سوار ہو پے کا پر ساد چڑھاؤں گی۔“

میں اپنے طور پر دُعا کرتا اور وہ جسمانی خوبی حاصل کرنے کی آرزو کرتا جس کی مجھ میں پیدائشی کمی تھی مجھ میں اعتقاد پیدا کرنے کے لئے میری ماں مجھے ایسی دھارک کتھائیں سناتی جن کا مول مدعا میری تنہا حاصل ہوتا۔ جیسے کہ فلاں سکھ نے گرو کی خدمت سے یہ پایا اور فلاں نے یہ۔ اُس نے یہ کہانی مجھے کی بار سنائی تھی کہ ایک لنگڑا لولا کوڑھی، گرو کرپا سے صحت مند اور شکیل نوجوان بن گیا تھا۔ اس کہانی کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ

کوڑھی، راجکمار کی کانت تھا۔ اُن دونوں کا یہاں کسی حادثے کا نتیجہ نہ تھا، راجکمار کی کے باپ کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا کیوں کہ دھرم شیل (خدا ترس)، راجکمار کی، اپنے ادھری باپ کے پوچھنے پر کہ وہ کس کا دیا کھاتی ہے، بے دھڑک بول اُٹھی تھی کہ میں بھگوان کا دیا کھاتی ہوں اور وہی میرا سچا باپ ہے۔ میں گرو دوارے میں بھار د لگاتا، سنگت کے جوتے صاف کرتا اور اُس میں اپنی محرومی کا علاج ڈھونڈتا۔ میں اپنے سے بڑوں اور اچھے بھلوں کو گرو گرتھ کے آگے سر جھکاتے اور در مانگتے دیکھ چکا تھا۔ میں ویسا کرتا تھا تو اپنے آپ کو سرب شکتی مان (ختمیا رگل) بھگوان کے قریب سمجھتا تھا۔ میں اپنے ہم عصروں سے کمزور تھا اور باہمی جھگڑوں میں ہمیشہ ہیتا تھا۔ اپنی ماں کی سکھائی ہوئی پراختنا کے ساتھ میں نے ایک پراختنا اور جوڑ لی، اپنے دھاکر اور کٹرے ہونے کی پراختنا۔ میری محرومی کا دائرہ جیسے جیسے بڑھنے لگا ویسے ویسے میری دُعاؤں کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ دُعائیں اتنی بڑھ گئیں کہ میں اُن کا حساب سانسوں سے کرنے لگا اور یہ عین مذہبی کہاوتوں کے اُتار (مطابق) تھا۔ کوئی میرے سلمے بھگوان کا نام لے بغیر کچھ کرتا تو میں اُسے ٹوکنے میں کارِ ثواب سمجھتا۔

میری ماں سینچر کے دن میرے کیس نہ دھوئی اور نہ ہی تیل استعمال کرنے دیتی۔ وہ اسے اُسٹھ سمجھتی تھی اور بیماری کا گھر۔ بھکاری سینچر کو سینچر دیتا کہ نام کی الکھ جگتا ہے پھرتے، سینچر دلی، دے تیل دی پٹی، سب بلا ٹلی۔ کئی اور ایسی ہی باتیں روزمرہ کا درس و تدریس تھیں۔ گھر سے باہر کام پر جاتے وقت کسی کا چھینکنا، پیچھے سے پکارنا، بلی کا راستہ کاٹ جانا بد شگون مانتی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے، بڑوں سے زیادہ جویا اور بے اختیار ہوتے ہیں۔ میں کئی بار اس بات پر سزا پاتا کہ میں بڑوں سے پوچھ لیتا، آپ کہاں جا رہے ہو۔ ایک تایا جی تھے جو ایسی پوچھتا چھ پر برہم نہ ہوتے تھے۔ وہ سوال کا جواب خوشی سے دیتے تھے اور پیار سے بات بھی کرتے تھے۔ میں اُن کے الگ برتاؤ سے متاثر ہو کر اُن سے پوچھتا، "تایا جی! آپ جس سوال پر خوش ہوتے ہیں دوسرے اسی پر ناخوش، ایسا کیوں؟" جاہل، دہم پرست ہوتا ہے اور خود اعتمادی سے عاری۔ وہ اپنے بر عمل کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ ہر جگہ ہر وقت بد بختی اُس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اس سے پنپنے کے لئے، وہ بندھے ٹکے قول کا سہارا لیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اسی میں اُس کا بچاؤ ہے۔ جو کوئی اُس کی رسم پرستی میں مغل ہو تا ہے، وہ اُسے برا لگتا ہے۔ "دہم پرست اور خدا پرست دلیل کرنے کے نااہل ہوتے ہیں اس لئے وہ خود کو دوسروں پر لادتے ہیں، اور انھیں اپنی نفی کے معاون بناتے ہیں۔"

تایا جی ایسے لوگوں کی حقیقت بیان کرتے۔

میں نے ثانی ماں کا دودھ چونکھنا چھوڑا نہ تھا جب بھائی جی نے گاؤں کے اطراف کی اُمریاں خریدیں۔ انھوں نے کئی رشتے داروں کو بلایا جن میں سے میری نانی اور ماما مہندر سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔ میری نانی میرے لئے

لکڑی کی رنگین کٹوری اور پیالی لائی۔ میں انہیں ہر کسی کو دکھاتا، اپنی ملکیت بچا کر خوش ہوتا اور انہیں اتنا عزیز رکھتا کہ سوتے وقت سہاگنے رکھ کر سوتا۔ میری ماں مولشیوں کو قبروں والے باغ میں لے گئی اور وہیں رہنے لگی۔ میں باقی ماں کے گھر سے باغ میں نہ جاتا تو ماجی مجھے اٹھا کر لے جاتے۔ وہ مجھے پیٹھ پر لا کر کبھی دھکی لگاتے چلتے اور کبھی بچد کتے، میں خوشی اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ باغ میں جھولا ڈالا ہوا تھا۔ میری نانی مجھے جھولا جھلاتی اور لہار گاتی۔

ہم سے دیس چکے آمریاں، ٹہنی ٹہنی پیسنگاں پیاں  
کسی بہانے اہل ستیاں

اُن دنوں ڈویانہ کلاں کے ساتھ جنت نشاں کی صفت لگائی جاتی تھی۔ باغ سے کچھ قدم کی دوری پر آبِ حیات تھی۔ ششہم سا شفاف آبِ رواں۔ تل پر بنتی بگڑتی ریت کی دھاریاں، تیرتی لہرائی رنگ برنگی مچھلیاں، بتوروں کی سی گول مٹول بٹیاں۔۔۔ وہاں گھونگے، ہیرے تھے اور سیپ، ریشپ کی طشتریاں۔ میں اُس مچھلی پر گھر میں ماجی کے ساتھ نہاتا، چھلیں کرتا، سیپ اور گھونگے اکٹھے کرتا اور مچھلیاں پکڑتا۔ وہ ہوشیار اور سبک رفتار میرے ہاتھ کہاں لگتیں! میں اُن کے پیچھے بھاگتا، پانی میں گرنا، غوط کھانا لیکن مجھے سنبھالنے کے لئے ماجی وہیں موجود رہتے تھے۔ سیر ماجی اور نانی ماں کا اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ میں نے تائی ماں کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ وہ مجھے دودھ پلانے کے لئے بارش میں آتی اور کوسٹی۔ ”پر آیا مال، پر آیا ہی ہوتا ہے! میری کوکھ کا جٹا ہوتا تو یوں نہ ہوتا۔“ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی۔ میں اُس کی گود سے اتر کر نانی ماں کی گود میں چڑھ جاتا۔ وہ مجھے لینے لگتی، میں نانی ماں کے گلے سے لٹ جاتا اور اُس کے کھینچنے پر ”نانی ماں! نانی ماں!“ چلانے لگتا۔

”نانی ماں! خضم!“ تائی ماں مجھے پھسکارتی اور روٹھ کر گھر چلی جاتی لیکن پھر دودھ چونگھانے ضرور آتی ایک دن وہ مجھ دونوں کے بعد آئی اور میں دودھ چونگھنے کے لئے اُس کی گود میں چڑھ گیا۔ اُس نے پیار سے میری مٹھی لی اور دوسری دھاکتے ہوئے بولی۔ ”دودھ سوکھ گیا ہے، میرے ننھے!“

اُس کے لہجے کی افسردگی کچھ کھوکھراپانے کی سی تھی۔ وہ انداز میری خود غرضی کے مقصود منظر ہرے تھے اور مصیبت۔ مازِ ضمیر کے دلچسپ نمونے۔ رُوحِ تغیرِ زمانہ مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی اور اُس کا مشاہدہ کرتے ہوئے کئی مجھے چھوٹا بدشاہ کہنے لگے تھے۔

میری نانی مجھے تھپک کر سلاتی ہوئی کچھ اس طرح کی لوری دیتی۔

تُو بڑا بڑکا!

ہو نہ ہوگا!

ہنر سیکھے گا !  
 جواں مرد بنے گا !  
 بیاہ کرے گا !  
 دیس بدیس جائے گا !  
 کمائے دھمائے گا !  
 اپنا پر یوار پالے گا !  
 ماتا پتا کی سیوا کرے گا !  
 میری نانی میری بہن کو جیسی لوری دیتی اُس کے معنی الگ ہوتے۔  
 تو بڑی ہوگی !

گھر کی لاج بنے گی !  
 کھانا پکانا سیکھے گی !  
 سینا پر دنا سیکھے گی !  
 کاتنا بننا سیکھے گی !  
 سُسرال جائے گی !  
 لڑکے جننے گی  
 سہاگن جسے گی

میری نانی میری دادی کے برعکس میری ماں کی حمایت کرتی ، اُس کے گھر یلو کاموں میں اُس کا ہاتھ  
 بٹاتی اور سب کے بعد ماں کے ساتھ کھانا کھاتی۔ دال اور بڑی نہ بچتی تو وہ آچار ، چٹنی ، ملائچی اُبھونے ہوئے اُموں  
 کا کھٹا میٹھا رس سے روٹی کھا کر بھی خوش ہوتی۔ میری ماں کے ساتھ اُس کا رویہ میری دادی سے الگ تھا۔ ضرورت  
 پر وہ بچوں کی گندگی تک دھو دیتی جب کہ میری دادی کسی ایسے کام کے لئے ماں کو بُلاتی ، وہ بھاگی بھاگی نہ جاتی تو  
 اُسے کھری کھوٹی سناتی۔

باغوں میں مکھٹیوں اور چھڑوں کی ریل پیل تھی۔ سرِ شام گیلی گھاس سلگائی جاتی جو ساری رات دُھواں  
 دیتی۔ مٹی۔ چھڑا تسے زہریلے تھے کہ جہاں لڑتے ، ددوڑے پڑ جاتے۔ ماں کو دودھ دوہنا ہوتا ، وہ بھینس کو دُھوئیں  
 کے پاس لے آتی ورنہ بھینس کھڑ جاتی۔ ماں گڈے کو ایک تھن دودھ چُونگھا کر اُسے پکڑ لیتی ، بھینس کے آگے باندھ دیتی  
 اور باقی سارا دودھ دودھ لیتی۔ گڈرا ماں ماں کرتا اپنی ماں کے تھنوں پر لپکتا لیکن رسا چھوٹا ہونے کے کارن وہاں تک



پہنچ نہ سکتا۔ بھینس، اکٹڑے کو چاٹتی جیسے اُس کی محرومی میں اُسے دلاسا دیتی۔ میں اُس کے نتھے دل کی زبان سمجھتا، اُسے پیار کرتا، ہمدردی جتاتا اور ماں سے ضد کرتا کہ وہ اُسے اور دودھ دے۔ وہ مجھے طرح طرح سے سمجھاتی، اکٹڑا گھاس کھانے لگا ہے، اُسے اور دودھ کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بھینس، اکٹڑے کے لئے ہمیشہ دودھ پڑا لیتی ہے اور وہ دودھ اُسی وقت آتا رہتا ہے جب اکٹڑا چوٹ کھتا ہے۔“

لیکن میں ماں کی بات سمجھنے سے انکار کر دیتا اور اپنی بات پر اُڑا رہتا۔ میرا بس نہ چلتا، میں نانی ماں کی مدد لیتا۔ وہ میری دل جوئی کے لئے ماں کو مجبور کرتی اور اکٹڑے کے لئے اور دودھ چھڑا دیتی۔ میری ماں مجھ سے کہتی، ”تیرے حصے کا دودھ اکٹڑے کو دے دیا ہے، تجھے رات کو دودھ نہیں ملے گا۔“

اُس وقت میں خوشی خوشی مان جاتا لیکن جوں ہی ماں دودھ گرم کر کے اُس میں میٹھا ملائی، میں اپنا کٹورا لئے سب سے آگے ہوتا۔

توتے کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک تو تاگھماں اُجاڑتا ہے، اور وہاں توتوں کے غول تھے ان کو باغوں سے بھگانے کے لئے جیسے طریقے استعمال کئے جاتے تھے، قابل ذکر ہیں۔

۱۔ رہسکے چلائے جاتے تھے۔

۲۔ درختوں کے دو شاخوں میں خالی پیسے لٹکا رکھے تھے جو رسیاں کھینچ کر بجائے جاتے تھے۔

۳۔ تھال بجائے جاتے تھے۔

۴۔ آوازے لگائے جاتے تھے۔

۵۔ ڈھیلے مارے جاتے تھے۔

لیکن توتے اتنے ڈھیلے تھے کہ ”ٹیں ٹیں، ٹیں ٹیں“ کرتے یہاں سے اُڑتے وہاں جا بیٹھتے اور وہاں سے تہاں۔ آخر بھائیاجی نے توتے مارنے کی جھگڑ لڑائی۔ وہ توتے کے بل پر نظر رکھتے، رات کو اُس میں ہاتھ ڈال کر اُسے پکڑ لیتے اور مار دیتے۔ جہاں کوئی بل گہرا تھا، انہوں نے اُس میں ڈاٹ مار دیا اور یوں باغوں کے بلوں کے علاوہ قُرب و حُوار کے بلوں پر دھاوا بول دیا۔

رات کو سونے سے پہلے میری نانی کچھ پڑھ کر بچوں پر چھو نکتی۔ میں پوچھتا کہ وہ کیا کرتی ہے تو وہ کہتی، ”نانی پڑھ کر چھونک رہی ہوں تاکہ آلا بلا دُور رہے!“

”نانی ماں! آلا بلا بچوں ہی کے پاس کیوں آتی ہے؟ میں در کر پوچھتا۔“

”بچے معصوم ہوتے ہیں اور اپنی حفاظت نہیں کر سکتے، اس لئے۔“

”بچے معصوم کیوں ہوتے ہیں؟“

”تو زیادہ باتیں نہ بنا، چپ چاپ سو جا! ورنہ ’کو کو‘ پکڑ لے گی!“

اور میں ڈر کر چپ ہو جاتا لیکن کبھی کبھار پوچھتا، ”نانی ماں! ’کو کو‘ کیا ہوتی ہے؟“

اول تو میری نانی ماں چپ رہتی، کبھی بولتی تو وہ ”کو کو“ کا نقشہ کچھ اس طرح کا بیان کرتی۔ ’کو کو‘ بھینس کی طرح ہوتی ہے، بڑے بڑے سینگوں والی، بڑے بڑے پنکھوں والی۔ میں کئی بار خواب میں دیکھتا کہ ہماری بھینس کے پٹکھ اُگ آئے ہیں اور وہ منہ کھولے مجھ پر منڈلا رہی ہے۔ میں اُس سے ڈر کر چلاتا اور کئی بار بستر پر اٹھ بیٹھتا جب تک کوئی نہ کوئی جاگ پڑتا، جو مجھے تھپک کر سلا دیتا۔

باغ میں گھر لُلو کام کم تھے اور باہر کے کام زیادہ۔ میری نانی اور ماں نوکروں کے لئے چالیاں بنائیں، بودورام اور بنتارام، شہنوش کی چھڑیوں سے ٹوکرے بناتے۔ باغ میں کوئی کام ایسا نہ تھا جس کا تعلق آدموں سے نہ ہو۔ کوئی ام چیکتا، کوئی ام ہلوتا (ٹھنی ہلا کر پھل گرانا)، کوئی پتے توڑتا، کوئی کھسکا ہلاتا اور کوئی رہ بکلا چلاتا۔ ٹوکرے لگانے کا اہم کام بھائیاجی خود کرتے تھے۔ وہ ٹوکرے کی تہ میں بھرتی کا مال بھرتے اور اوپر بڑھیا قسم کے ام چھتے، ٹوکرے کے منہ پر سیاہی مائل ہرے پتے پچھا کر جالیوں کستے کہ سنہری اور سیندوری ام پتوں میں سے جھانکتے لگتے۔ میری نانی نے مجھے چھوٹا سا چھینکا بنا دیا تھا، جس میں تین چار ام آتے تھے۔ درختوں سے ام بھد بھد کرتے اور دُور دُور تک خبر کرتے لیکن میں صرف دُبی ام اکٹھے کرتا جو مجھے اچھے لگتے۔ سیندوری اور سیبی ام میری پسند تھیں۔ میں سیندوری ام لے کر نانی ماں کے پاس جاتا اور اُسے گال سے لگا کر کہتا، ”نانی ماں! ام زیادہ سیندوری ہیں کہ میرے گال؟“

”میرے راجہ بیٹا کے گال زیادہ سیندوری ہیں! وہ خوشی سے میرا منہ چوم رہی ہیں اور کھل کر رہی۔ اُس خوبصورت ماحول میں کوئی شے بد صورت تھی تو وہ بھی میری بڑی چھو بھی۔ دُبی پتلی، کھونڈی چھو بھی۔ اُس کی پٹلیوں، رالوں اور باہوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ شلوار کھنٹوں تک اٹھا کر بیٹھی تو گھٹنے کی چپنی اُس پھوڑے کی طرح نظر آتی جس کا منہ نہ نکلا ہو۔ اُسے ناس لینے کی لت تھی۔ وہ اپنا ہاتھ سدا ہلاس دانی میں رکھتی تھی۔ اُس کے نتھنے اُن آنکلیوں کی طرح گھٹاؤ نے تھے جن سے وہ ہلاس لیتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو دودھ پیتے پلے کی طرح لٹی رہتی تھی اور اُسے بھی ہلاس کی پٹلی دیتی رہتی تھی۔

میرے کسوں کا رنگ کرتا تھا۔ میری نانی میرے کس سنوارتی ہوئی کہتی، ”بیٹا! تیرے کس سونے کے ہیں!“ انکھ میں سے جتنے بال نکلتے، وہ اُن کی گتھی بنا کر مجھے دیتی اور رازدارانہ لہجے میں کہتی، ”اُسے چھپا کر رکھ لے۔ تیرا بیابا ہو گا تو تیری بیوی کے گھنے اس سے بنوائیں گے۔“

میری معصومیت! میں بالوں کی اُن گانٹھوں کو درختوں کی جڑوں میں چھپاتا اور کہیں تکیوں کے اندر۔  
 کئی درخت اُموں سے اس قدر لدے ہوئے تھے کہ اُن کی شاخیں ہاتھ کی پہنچ تک ٹھکی ہوئی تھیں۔  
 میں اُن سے پکے اُم توڑنے کی خواہش کرتا تو ماما جی مجھے کاندھوں پر اٹھالیتے۔ ڈوبک (تازہ توڑے اُم کی ہر سے رستا  
 ہوا رُس) سے میرے ہاتھ مژدہ زخمی ہو گئے تو ماما جی نے مجھ سے وہ کھیل چھڑوایا۔

سادا آیا تو ٹپکے کا بھر پڑا۔ بھائی جی نے جا کر بھی کھول لی۔ ننتار ام ہشکر کھار، داسو باقی اور  
 کئی دوسرے اُم بطور جاگڑے جانے لگے۔ ٹپکے کے گڈے امرتسر، جالندھر اور ہوشیار پور کو لادے جانے لگے۔ اُموں کو  
 پکھلے جانے سے بچانے کے لئے، گڈوں میں ٹوکے رکھنے کے لئے ایک کے اوپر ایک اور اُس کے اوپر کئی خانے بنائے  
 گئے۔ پانی اور ہوا اکٹھے آتے تو اتنے اُم گرتے کہ درختوں کے نیچے دھرتی دکھائی نہ دیتی۔ ہوشیار پور کے ندی نالے  
 اپنے اتار چڑھوں کے لئے مشہور ہیں۔ شہروں کو مال جانا بند ہو جاتا۔ اُس کساد بازاری سے مقامی گاہک فائدہ اٹھاتے۔  
 اُم دو طرح سے بکتے، جنس میں اور نقد میں۔ کئی گاہک اُم خرید کر گھر لے جاتے اور کئی آب و جو کے کنارے بیٹھ کر چوستے۔  
 آب جو کا پانی گدلا ہو گیا تھا لیکن لوگ بہتے پانی کو صاف مانتے تھے اور اُسے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ آب جو  
 کے کنارے گھٹلیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ٹپکے کا کچھ حصہ گر کر چھٹ جاتا۔ شروع شروع میں جتنا ٹپکا پھٹتا، اُسے گھر  
 کے لوگ چوس لیتے۔ کسی کی گھٹلی چٹی (پوری طرح چوسی ہوئی گھٹلی) نہ ہوتی تو بھائی جی اُسے ڈانٹتے ڈپٹتے۔ ٹپکے کا  
 بھر پڑا تو پچھے ہوئے ٹپکے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، جسے سستے داموں بیچا جاتا اور جو نہ بکتا اُس سے انہیں بنالیا جاتا۔  
 اُموں کے ساتھ جہاں بھی کم ہوئے اور پھر ماما جی کے سوائے سب چلے گئے۔ جب تک گھٹلیاں پھوٹ  
 آئیں اور ماما جی نے میری خوشی کا نیا سامان پیدا کر دیا۔ وہ مجھے پیسٹیا بنا کر دیتے اور اس احتیاط سے کہ اُس کا تاج  
 جیسے کاویسا رہتا۔ میں اُسے بجاتا ہوا، اُس کے تاج پر نگاہ رکھتا اور پچھو لانا سہاتا۔ وہ مسرت بھر سے دین میری زندگی  
 کے متنازعہ اور دالبا نہ دن تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے بعد میں اتنے اُلٹے جذبات سے نہیں گزرا ہوں۔ میرے پیسے  
 کا تاج ٹوٹ جاتا یا مر جاتا تو ماما جی مجھے نیا پیسٹیا بنا دیتے۔ کوئی آرام سے بیٹھا ہوتا، میں چپکے سے اُس کے پاس جاتا  
 اور کان میں پیسٹیا پھونک دیتا۔ وہ گہرا کر اٹھل پڑتا اور میں اپنی چالاک اور شوخی پر ناز کرتا۔ ماما جی اپنا پیسٹیا سر میں بجاتے  
 تھے۔ مجھے شک ہوتا کہ انہوں نے اپنے لئے مجھ سے اچھا پیسٹیا بنایا ہے۔ میں اُن سے اُن کا پیسٹیا لے لیتا اور اُسے  
 بھی بے سراہی بجاتا۔ میں ماما جی کی دیکھا دیکھی گھٹلی اٹھا کر پیسٹیا بنانے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھے ڈراتے، "ان میں  
 سبویلے ہوتے ہیں! ان کے پاس مت جایا کرو۔"

لیکن میری آرزو بھری تلاش! جوں ہی میرا دل لگتا، میں گھٹلی اٹھا ڈالنا اور اُس کا پھلکا اُٹار کر اُسے  
 اینٹ پر گرڈے لگتا۔ میں پیسٹیا بنالیتا لیکن وہ چھوٹے پر پتھر سا رہتا۔

کوئی ہے۔ اِس نے کوئل کی سُربلی آواز سے نطف نہیں اٹھایا ہے اور وقتی طور پر اپنے آپ کو اُس کا ہم نوا ثابت کرنے کا جتن نہیں کیا ہے! انجوں کہ کوئل کا نغمہ، مُطرب وقت کا سنوارا ہوا ہے اُس کے سرود میں ابھی سرور ہے جس کی ہستی کے سامنے مے خانہ عشرت بے معنی ہے۔

چوں کہ کوئل میری پیاری تھی اِس لئے میں کوئل پادے اُم اکٹھے کیا کرتا تھا۔ وہ کھٹے ہوتے تھے لیکن مجھے میٹھے لگتے تھے۔ ماما جی کی طرح میں بھی کوئل کا حریف تھا۔ ہزاری، تُو او، تُو او کی باہمی جنگ سویرے بیدار ہوتے ہی شروع ہو جاتی اور رات کو بستر پر دراز ہونے تک چلتی۔ کوئل چُپ ہوتی، ماما جی اُسے اگساتے، کوئلے تیرا کاں (کوا) مرے تو رندی ہو، تُو او۔ وہ چُپ رہتی، ماما جی اُسے دوبارہ اگساتے اور کئی بار سہ بارہ۔ کوئل مَوں تو رتی اُس کی اول لے نرم اور چھوٹی ہوتی جیسے وہ بد دعا سے سہم گئی ہو۔ پھر اُس کی ہر مُکھڑ لے اُونچی اور سُربلی ہوتی جاتی، تُو او، تُو او، تُو او، تُو او، تُو او، تُو او۔

اُس انوکھی جنگ میں کئی بار ماما جی جان بوجھ کر ہار جاتے، اُس وقت کوئل کی گرم ہوشی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ میری ماں اُس جنگ سے نطف اٹھاتی اور ماما جی کی جمائیت میں کوئل کو ہدایت کرتی، ”کوئلے، رندی اے، چُپ ہو جا! ایسا نہ ہو کہ بولتے بولتے تُو مر جائے اور اُنکا کاں رندا ہو جائے!“

عدالت یار کوئل کے اِس عجیب و غریب مزاج کی تفسیر اپنے دھنگ سے بیان کرتا تھا۔ ”علم موسیقی کے موجدوں نے پیغمبر، کوئل سے سیکھا تھا۔ کیوں کہ یہ اُسے کوئل کی سی نقاست سے نہیں گاسکتے، وہ ان کی نااہلی اور بے آہنگی پر برہم ہوتی ہے اور طعنہ دیتی ہے، تُو گنوار ہو۔“

سب درخت اُموں سے خالی ہو گئے لیکن باغ کے مشرق میں ایک بھدواڑہ (وہ اُم بوجھا دوں میں پکٹا ہوا) اُم تھا جو ویسے ہی لدا ہوا تھا۔ اُم ذرا گدرائے تو بھایا جی نے انہیں تڑوا کر پال ڈال لی اور پھر اُن کو ’پال کے لدو‘ کہہ کر بیچنے لگے۔

## باب ۴

بُود جس سے نمود تک پہنچی

کرب تخلیق کی ہے رعنائی (شاطر)

میں اُسے حدت پسند ہی کہوں گا جس نے مجھے پہلے روندو پھر گونگے اور پھر تھکے کا نام دیا۔ بڑے چھوٹے بے لحاظ و بے تمیز میری نقل اُتارتے گویا مجھے کھنڈی چھری سے کاٹتے۔ میں اُن کی زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لیتا اور برہم ہو کر بال نوچتا، ایسٹریاں رگڑتا، سر پٹکتا اور روتا۔ میری زود رنجی اور چڑچڑاہٹ پیدا لشی تھی۔ میرے

ستانے والے میری بے کسی سے فائدہ اٹھاتے اور مجھے چڑا کر میری بے بسی کا تماشا دیکھتے۔

ہمارے گھر سے کچھ ہی دور عدالت یار کی حویلی تھی جو گھنے درختوں میں گھری ہوئی پُر آسرا لگتی تھی۔ اُس سے بڑھ کر پُر آسرا اور چیز تھی نئے اور ساز کی لے، جو حقیقت میں موجِ مے تھی۔ وہ اڑتی ہوئی مستی، میری رگوں میں سرایت کرتی اور مجھے مدھ بوش بنا دیتی۔ ایک شام میں اسی مدھوشی کی حالت میں عدالت یار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر دھک دھک گاتے گاتے چپ ہو گیا اور پردے پر سے ہاتھ اٹھالیا۔

”تم کون ہو؟“ اُس نے مسکرا کر حیرت سے پوچھا۔  
 ”گیان! اپنے نام کے پہلے حرف میں اُلجھتے اُلجھتے بیٹھے ہوئے میں نے جواب دیا۔  
 ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“  
 وہ آگے جھک کر مسکرایا۔

”گنگا ناسنے۔“

میں گ میں اُلجھتے اُلجھتے بچا۔

”تمہیں گانا آتا ہے؟“

اُس کی مسکراہٹ میں تہک سی بس گئی۔

”نہ نہ نہیں!“

میں ہلکایا اور محسوس کیا کہ میرا سارا خون گالوں میں دوڑ آیا ہے۔

”تم میرے ساتھ گاؤ گے؟“

اُس نے ساز چھیڑ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں ۰۰۰۰۰۰“

میری کھلبلی میری ہلکا ہٹ کو جھن جھن ہٹ تک بڑھا گئی۔

”خوب، گاؤ!“

اُس کا لہجہ تان سے معمور تھا۔

مجھے دعوتِ نغمہ دے کر وہ جگمگا (پنجابی لوک گیت) کی طرزیں سُروں کو چھیڑنے لگا اور گاتے ہوئے میری آنکھوں میں تاکنے لگا۔ وہ گارہا تھا اور بس خاموش سُن رہا تھا۔ وہ گھڑی آفاقی گھڑی تھی! عدالت یار کے گیت کی لے میرے روم روم سے ہوتی ہوئی میری رگوں میں جذب ہو رہی تھی۔ پہلا اترہ وہ بار بار دہرا رہا تھا اور گاہے گاہے رُک کر مجھے کانے پر اُگسا رہا تھا۔ تین الفاظ زبان پر نہ لایا رہا تھا لیکن میری کوشش سے میرے اندر خروش پیدا ہو رہا تھا۔

میں چُپ تھا لیکن میری رگیں بول رہی تھیں، اُس لے پر تھرک رہی تھیں جو جھڑک تھی لیکن متحرک نہ تھی۔ میری زبان میں وہ بے قراری تھی جو کسی ثابت کے سِار بننے سے پہلے اُس کے اجزا میں موجزن ہوتی ہوگی۔ زبان پر حروف پھیل رہے تھے جیسے اپنی گہرائی دیگر لائی کا جائزہ دے رہے ہوں۔ حروف زندہ تھے اور میں انہیں سانس لیتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اُن کا وجود انوکھا منظر تھا! میں انہیں صوت و معنی سے پہچان رہا تھا۔ میری خاموشی حروف کی قوتِ گفتار کی حامل تھی جسے میرے تحت الشعور کی تائید حاصل تھی۔ وہ اُسی تائید کی تصدیق تھی کہ میں عدالتِ یار کے ساتھ کانے لگا۔ میں جگتا جگتا ہوا دہاں سے نکلا تو ہر کوئی مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی دھن میں گارہا تھا اور گائے جارہا تھا۔ جگتا گانا میل مٹول ہو گیا۔ میری تالی ماں جس دن سویرے میرے گانے کی آواز نہ سنتی، مجھے دیکھنے چلی آئی۔ وہ گمان کرتی کہ میں بیمار ہوں۔ میرے پرانے نام حرفِ مہمل کی طرح مٹ گئے اور میں جگتا کے نئے نام سے مشہور ہو گیا۔

یہ تغیر میری زندگی میں دوسرا بڑا تغیر تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو میں اُس انوکھے کیڑے کی طرح ہوتا جسے حالات کے چمٹکار نے انسان بنا دیا ہو لیکن اُسے زبان کے ہدیے سے نہ نوازا ہو۔

پہلے میں نے عدالتِ یار کو دیکھا نہ تھا۔ اُس دن سے میں اُسے روز دیکھنے لگا اور کئی کئی بار ملنے لگا۔ ہماری دوستی ہو گئی، زبانی دوستی! وہ اٹھائیس تیس کا جوان سال اور میں تین چار برس کا نوہال۔ وہ جہاں ملتا، میں ہمکتا ہوا اُس کی جانب پلکتا۔ وہ آگے بڑھ کر مجھے باہوں سے اٹھاتا، اُدپر اُچھالتا، میں نیچے گرنے لگتا تو مجھے تھام کر گھٹے سے لگا لیتا۔ اُسے کوئی کام نہ ہوتا، وہ مجھے حویلی میں لے جاتا اور گانا سکھاتا۔ سنگیت سے میری زبان کی ہم آہنگی! میں جو کچھ سنتا اُسے سنتے ہی دُور ہراتا اور بالکل ٹھیک طرز میں۔ عدالتِ یار، کڑیل جوان تھا۔ اُس کے گٹھیلے پٹھے تاروں سے گوندھے ہوئے لگتے تھے۔ اُس کی مٹی کی خوبی! اُس کے سخت و کزخت اعضا کی تاثیر نرم و نازک تھی۔ اُس کی آنکھوں میں محبت کی روشنی، ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تازگی اور زبان میں نغمے کی دلکشی تھی۔ اُس کی سادھارن سی بات کانوں میں رس گھول کر رگ دپے کی لذت بن جاتی تھی۔ وہ اپنی خوش مزاجی اور فیاضی کی وجہ سے گاؤں والوں کا لاڈلا اور بچوں کا پیارا تھا۔ اُس کی بانسری کی دھن، اُس کے کھیتوں کو جانے یا کھیتوں سے لوٹنے کی خوش خبری ہوتی تھی۔ بچے اُسے کھیتوں سے لوٹنا دیکھ کر کھیلنا چھوڑ دیتے اور اُس سے پلٹ جاتے۔ وہ اسے کاندھے پر اٹھاتا اور اُسے باہوں میں، باقی اُس کے ساتھ رگڑ کھاتے ہوئے چلتے اور مُنہ کی طرف دیکھتے جیسے کسی رعایت کے خواہش مند ہوں۔ وہ اُن کے پاؤں سے پاؤں بچاتا ہوئے ہوئے چلتا اور موسیقیوں کو طویلے میں بانک کر اُن کی طرف دھیان دیتا اور ہر کسی کی جیب جنگلی پھلوں سے بھر دیتا۔ اُن کا موسم نہ ہوتا تو وہ دہقانے تحفے بانٹتا جیسے گنڈیریاں، مونگ پھلیاں وغیرہ۔ کوئی اُس سے پوچھتا کہ وہ تب کچھ کہاں سے لاتا ہے تو وہ مسکرا کر کہتا، ”میرے پاس کام دھینو ہے!“ (کام دھینو، دیوکتھاؤں کی ایک گائے جو مانگنے پر ہر اچھا پوری کرتی ہے)۔

گیت میری گرمی آواز بننے لگے۔ میری ہیکل ہٹ گھٹنے اور خود اعتمادی بڑھنے لگی۔ میں گیت گاتا تو لگتا کہ وقت جھولا جھلا رہا ہے۔ میں سوچتا کہ میں اُسی کام کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میں اپنے آپ کو مُنازگ و گویا سمجھتا۔ میری رسائی اُردو سیوں پڑوسیوں سے بڑھ کر دوسرے گھروں تک ہو گئی۔ میں بڑی بوڑھیوں، خاں کرڑکیوں کا چہیتا تھا۔ وہ میرے چختے تھیں اور مجھے آغوش میں بھینچ کر پیار کرتیں لیکن وہ سب مجھے اچھا نہ لگتا۔ مجھے بھی اچھا لگتا کہ میں گاتا رہوں اور کوئی سُنا رہے۔ میرے گیتوں سے تنگ اگر میری ماں مجھے پُچھا کر کہتی، ”اچھا بیٹا! باہر دُور جا کر گا!“

”لیکن وہاں میرا گیت کون سُنے گا کون؟“ میں بے اختیار کہتا۔

میری مقصود خود دوی میری ماں کو لاجواب کر دیتی اور وہ خوشی سے میرا منہ جُوم لیتی۔

اُنہی دنوں کسی نے مجھے یہ بولی یاد کر دادی،

کھٹن گیا کھٹن مومن گیا تاں کھٹ کے لیا یا بتاشا

۔ ہوئی ادھ لینی جہدے سِدھ وچ بولے کا کا

(کوئی کمانے کے لئے گیا اور بتاشا کما کر لایا۔ میں اُس سے بیاہ کروں گا جس کے پیٹ میں کا کا بولتا ہو،

کئی بڑی بوڑھیاں مجھ سے سفارش کر کے یہ بولی سُنتیں اور پھر پیٹ پکڑ کر ہنستیں۔ میں نے اس بولی کو

تَب تک گایا جب تک مجھے اس کا ارتھ نہ آیا۔

وقت کے ساتھ ہر چیز بدل رہی تھی، سنور رہی تھی لیکن دادی کی حالت بگڑ رہی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ اندھی ہو گئی تھی۔ ماں نے ویہڑے (صحن) کے ایک کونے میں پردہ کیا اور اُسے دادی کی ذاتی حاجتوں کے لئے وقف کر دیا۔ وہ جنگل جانا پسند کرتی جس کے لئے اُسے کسی کی اعانت درکار ہوتی جو اُسے وقت پر نہ ملتی۔ ایک بار میں اُسے باہر لے جا کر لایا۔ اُس نے کمرے کے گرد باندھی ہوئی لیر کی کانٹھ میں سے ایک ڈبل میسہ نکال کر مجھے دیا اور اپنے پاس کھینچ کر آہستہ سے کہا، ”جنگلیا! تو مجھے ہر روز باہر لے جایا کر، اسی طرح! کوئی دُوسرا میرے ساتھ آتا ہے تو وہ چپ گڑپ رہتا ہے اور میری اندھی آنکھوں کا اندھیرا ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔“

اُس دن سے میں اُس کی روشنی اور لاٹھی ہو گیا۔ وہ چار پائی سے ایسے اٹھتی جیسے گُڑی پوئی زندگی کا سارا بوجھ اُس کی ٹانگوں پر ہو۔ وہ آہ بھرتی اور پوپلے منہ سے تو کئی آوازیں گاتی۔

پِپِل دیا پتیاؤں کی کھڑکھڑ لائی!

پت پُرانے جھڑ گئے رُت نمایاں دی آتی

(اے پپل کے پتے تو کیا کھڑکھڑ شور مچا رہا ہے! پُرانے پتے جھڑ گئے ہیں اور اب نئے پتے پھوٹنے کی رُت ہے،

وہ ایک پہیلی جھُویا کرتی تھی، میں آپ کو بھُواتا ہوں۔

کاچے بھتے ساڈنے، گدیں اور مٹھائیں  
اے کھی وہ پھل کون سے جو پا کے کڑوائیں؟

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے پیچھے کمزور کمزور چلتی۔ میں گیت گاتا ہوا، اُسے راستے کے آثار چڑھاؤ بتاتا ہوا جنگل پھر اکر لاتا۔ مجھے اپنی خدمت کا صلہ اس کے مجھے کی شکل میں ملتا جو ٹھنڈا، کھردرا اور گھناؤنا ہوتا۔ اس کے بے نور چہرے پر بے رنگ خط وخال ایسے لگتے جیسے ویرانے میں شکستہ آئینے کے ٹکڑے پڑے ہوں۔ اس کا ماس ہڈیوں سے لٹک رہا تھا اور پچھلے پُرانے کپڑے کی طرح چرسا ہوا تھا۔ وہ مجھے برا لگتا۔ میں اس کی باچھیں پکڑ کر ماس کو پیچھے گردن کی طرف کھینچتا، شکن در شکن ماس کھچ کر کچھ سنور جاتا۔ میں خوش ہو کر اُسے بھھاؤ دیتا، ”دادی ماں! تم اپنے ماس کو یوں ہی پکڑ کر رکھا کرو۔ تم یوں سنور لگتی ہو۔“

وہ اپنی بھڑوں کو بے اختیار چھوٹی جیسے کسی کے یاد کروانے سے کوئی اپنی بھڑی ہوتی قیمتی چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھے اور اُسے موجود پارک مطمئن محسوس کرے۔ وہ میرا ہاتھ جوم کو فخر سے کہتی ”نتھے! یہ بھڑیاں نہیں، میرے بڑھاپے کے گہنے ہیں۔“

دادی کی بھڑیوں کو گینچ گراں مایہ فطرت سمجھیں تو وہ واقعی گہنے تھے، کہیں سسکھ، کہیں کوڑیاں، کہیں سیپ اور کہیں گھونگے۔

اُس کی تو تلی ہنسی اور بے ربط آواز سے گمان ہونا کہ کوئی بچہ، بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کا منہ خالی آلے کی طرح تھا جسے وہ ہر وقت ہلاتی رہتی اور کچھ کھاتی لگتی۔

”دادی ماں! تم کیا کھاتی رہتی ہو۔“ ایک باری میں نے اس سے پوچھا۔

”اپنی عمر!“ اُس نے گہرا سانس لے کر کہا، گویا وہ اُس کی عمر کا نوالہ تھا۔ اُس کے منہ کے ساتھ بھڑیاں ہل کر اسے بھڑکیں جیسے ہزاروں ہونٹوں نے بریک زبان اُس کے انوکھے بیان کی تصدیق کی ہو۔

میری دادی کبھی کبھار ان دنوں کی باتیں سناتی جب وہ جوان تھی اور سارے کام پھرتی اور خوبصورتی سے کرتی تھی۔ اس وقت قیاس ہوتا کہ کوئی نوالہ اپنے پامال کمال پر فخر کرتا ہے جو کسی وقت اُس کی عظمت کی شہادت تھی اور خود داری کی رواداری۔ اُس کے چہرے پر مسرت آمیز حسرت دکھائی دیتی جو اس احساس کو ظاہر کرتی کہ اُس نے اپنی بے بندی کی پستی بڑی بے بسی اور افسروگی سے دکھی ہے۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ اُس دنیا میں پھر سے لوٹ جاتی جس سے بے رحم وقت نے اُسے مٹانے کے لئے جد کیا تھا۔

اپنے اکیلے پن میں وہ تنہائی سے بھی تنہا ہوتی جسے آباد کرنے کے لئے وہ آئیں بھرتی یا اپنے آپ سے باتیں کرتی۔ چھوٹے بچوں کو کہانی کا لالچ دے کر وہ انہیں اپنے گرد اکٹھا کر لیتی اور کہانی سناتی۔ سنے چہروں میں پُرانا چہرہ،



پھولوں بھری کیرری میں ڈٹھل دکھائی پڑتا جسے مالی کا سگھڑا تھ اٹھا کر اُٹھال بھول جائے۔

میرا خیال ہے کہ دادی ماں کی کہانیوں میں سے کوئی ایک کہانی بیان کرنا اُچت (بر محل) ہوگا۔

”ایک ماں کے دو بیٹے تھے۔ وہ بوڑھی ہو گئی اور اپنی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہ رہی۔ ایک دن

اُس نے اپنے بڑے بیٹے سے کہا، بیٹا! میں نے کئی دن سے اُشنان نہیں کیا، مجھے اُشنان کرواؤ!“

”بڑا بیٹا اٹھ کر مزاج تھا اور بات بے بات ماں سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ اُس نے پانی کا کڑا ہا اُبالا

اور ماں کو اُس میں ڈال دیا۔ وہ بے چاری جھلنے لگی اور بچاؤ بچاؤ کی دہائی دینے لگی۔ اُس کے چھوٹے بیٹے نے اُس کا

واوٹا اُٹھا، اُسے کھولتے پانی میں سے نکالا، اُس پر ٹھنڈا پانی ڈالا اور اُس کی آگ کو بجھایا۔ اُس نے بڑے بیٹے کو سر پر

دے دیا جیسے تُو نے مجھے جلایا ہے، بھگوان کرے تو رہتی دنیا تک جلتا رہے۔“

”اُن دنوں ست جگ کا زمانہ تھا اور بھگوان ہر دکھی دل کی فریاد سُنتا تھا، اُس نے دکھی ماں کے ظالم

بیٹے کو سورج بنا دیا۔“

”اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو آشیر داد دی۔ تُو نے مجھ دکھاری کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے۔ بھگوان تجھے

جگکا جگ ٹھنڈا رکھے۔“

”بھگوان نے اُس کے رحم دل بیٹے کو چاند بنا دیا۔“

دادی ماں! پھر تارے کیسے بنے؟“ اُس کے نصیحت آموز جھوٹ پر حیران ہو کر ایک بار میں

نے پوچھا۔

”جو لوگ بھگوان کے سچے بھگت ہوتے ہیں وہ تارے بنتے ہیں۔“

اُس کا انداز بیان اتنا پُر اعتماد تھا جیسے عرش و فرش کے سارے رموز اُمی کے دل میں ہوں۔

وہ کہا کرتی تھی کہ دھروو (قطبی ستارہ) سب سے بڑا بھگت ہوا ہے اور اُس کے بعد سپت رشی (سات تارے)

مریچ، اتر، ملہا، پُل ستیہ، رتو، آنگیرا، وشِشٹھ)۔ دھروو کی پدی اتنی بڑی ہے کہ سارا برہمنڈ (نظام شمسی)

اُس کی پریکراما (طواف) کر رہا ہے۔

اُس کی بات سُن کر میں تصور کرتا کہ میں دھروو سے بھی بڑا بھگت بنوں گا اور پھر بھگوان سے برا مانگوں

تاکہ میری پدی اتنی بڑی ہو کہ برہمنڈ کے ساتھ دھروو بھی میری پریکراما کرے۔

گاؤں میں لودے (چیچک کے ٹیکے) ہوتے۔ زیادہ تر لوگ بچوں کو لے کر کھیتوں کو بھاگ گئے۔ وہ

لوگ لودے کروانے کو بیماری مول لینا خیال کرتے تھے اور اُن کی افادیت سے یکسر مُنکر تھے۔ وہ کسی چیز کے قابل تھے

تو جڑی بوٹی اور تُو نے گندے کسے۔ وہ اُن کی ان دیکھی طاقت پر بھروسہ کرتے تھے اور لودوں پر نکتہ چینی۔ ”ایک

بیماری دوسری بیماری کو ختم دے سکتی ہے، اُسے مارتی تھوڑا ہی ہے۔“

”ڈاکٹر منتہر نہیں پڑھتے، سوتیاں چبھوتے ہیں۔ ایک بار چبھوتی ہوئی سوتی کا اثر عمر بھر کے لئے کیوں کر کافی ہو سکتا ہے!“

وہاؤں کی روک تھام کے لئے اکھنڈ پاٹھ اور ہون ہوتے تھے یا ٹوٹے ٹوٹے۔ اپنے تحفظ کے لئے لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ وہاکی روک تھام کا ایک طریقہ اور تھا، افریانی، لیکن وہا میں آتی تھیں اور اپنا حصہ لے جاتی تھیں۔

تایاجی دقیا نوی خیالوں کی تردید کرتے تھے اور زندگی کو نئی روشنی کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے پرکاش کور کے حوالے کیا تاکہ وہ مجھے لودے کر والائے۔ ہمیں راستے میں کل کور مل گئی اور ہم تینوں زمضان کی حویلی کی طرف چل پڑے جہاں لودے ہو رہے تھے۔ دوسرے سو یک سنگھ آتا ملا، جو لودوں کے درد سے بلبلاتا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر میں اریل ٹٹو کی طرح پیچھے قدم لینے لگا۔ پرکاش کور نے مجھے لاڈ لڈا کر کہا، ”میرے اچھے بھیرا! تو کیوں ڈرتا ہے؟ تجھے تو وہاں جگنا سنانا ہے!“

پھر کیا تھا! میں خوشبو کی طرح تھا جسے اُڑنے کے لئے جھو کے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں حویلی کی طرف بھاگا اور اپنی ساتھنوں سے پہلے لودے کرنے والوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور میرا نام پوچھنے لگے۔ اسنے میں پرکاش کور اور کل کور آگئیں۔ ”ان کو جگنا سنا دے!“

اور میں اگلی گھڑی کے عذاب سے بے خبر جگنا گانے لگا۔

جگنا جیسا تاں ملن ودھائیاں

بڑا ہو کے ڈاکے ماردا

جگلیا! ہائے، اوئی فی ماں لے لا!

میں گودنے کے درد سے بندھا ہوا ہو کر گر پڑا۔ پرکاش کور مجھے نہ سنبھالنے تو میں ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ وہ مجھے رونا ہوا اٹھا کر گھر میں لائی۔ چوں کہ اُس نے مجھ سے دھوکا کیا تھا، میں اُس سے روٹھ گیا جو اُس پر گراں گزرا۔ وہ میری تائیری بہن سہی، حقیقی سے پیاری تھی۔ ہم دونوں ماں کو ستانے کے لئے کیسے کھیل کھیلے تھے! میں دیر تک گھر میں نہ پہنچتا، ماں کو میرے بارے میں تشویش ہوتی، وہ مجھے ڈھونڈتی اور کلیوں میں آوازے لگاتی۔ میں اُس کی پریشانی سے متاثر ہو کر گھر جانے کے لئے کہتا۔ پرکاش کور منہ بسور لیتی۔ مجھے اُس کی دل جوئی منظور ہوتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ماں یک جھک کر چُپ ہو جاتی۔ تھوڑی دیر کے بعد پرکاش کور مجھے کاندھے سے لگائے ماں کے پاس جاتی اور میں سازش کے مطابق گھیسلا ہوش رکھتے ہوئے بے ہوش نظر کرنا رہتا۔ وہ معصومیت کی دیوی بن کر ماں کو یقین دلاتی ”چاچی جی!“

جنگا میرے گھر میں بے سدھ سویا پڑا تھا۔ میں آند گئی، اسے دیکھا اور اٹھا کر لائی ہوں!“

پرکاش کو نے مجھے منانے کے لئے کیا کیا جتن کئے! میرے لئے کھدو (سوت کا گیند) بنائی اور اُس کے گرد موٹے دھاگے سے جالی ڈالی، کروشنے سے سفید ٹسر کی بنیان مٹی لیکن اُس کا حاشیہ نیل کوں رکھا۔ وہ یوں نہ بھی کرتی تو کیا فرق پڑتا! معصوم دل کے روٹھنے اور سننے میں دیر ہی کہاں ہوتی ہے! وہ ایک گھر کی میں رو دیتے ہیں تو ایک گدگدی میں ہنس پڑتے ہیں۔

لودے لال ہوئے اور بانہہ شوج گئی اور ہلانے سے ٹوٹی لگتی۔ میں بخار اور درد سے بڈھال رہتا۔ مجھے بہلانے کے لئے پرکاش کوں مجھے کاندھے سے لگائے کھومتی، وہ تھک جاتی تو سون کوں مجھے سنہالتی۔ میری ہر آہ پر وہ مجھے دلا سادیتی اور لوری سناتی۔ وہ گاتی رہتی تو بانہہ کا درد غائب رہتا لیکن وہ جوں ہی چپ ہوتی، درد ہی اتنی سے لوٹ آتا۔ میں اُسے گاتے رہنے پر مجبور کرتا اور اپنے پاس سے ہلنے نہ دیتا۔ اُس کا میلان خاطر! وہ مجھے اپنے ساتھ اٹھائے کھومتی جیسے میں اُس کا ٹوٹا ہوا انگ تھا۔ اُس کا سارا وقت میری خدمت گزاری میں صرف ہوتا۔ وہ گرم گیلے کپڑے سے میرا بدن پونٹھتی، مجھے چار پانی پر لٹا کر میرے کس دھوتی، کنگھی کرتی، جوڑا باندھتی اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی۔ وہ لودوں کے گرد کھجراتی، جس سے مجھے آرام ملتا۔ اُس کی بے آرائی میں میرا آرام تھا اور اُس کے دکھ میں میرا سکھ۔ میں سوتا تو وہ سوتی، میں جاگتا تو وہ جاگتی، مجھ سے پیاری پیاری، میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ مجھے نیند نہ آتی تو وہ میری آنکھیں موند کر نیند کو بلاتی جیسے میری نیند، اُس کی سکھی سہیلی ہو۔

لودے بھر کر بہنے لگے۔ پرکاش مجھے دیوی دوالے لے گئی اور وہاں سے سُرخ لائی۔ وہ اُسے جاؤ کے طہ پر لودوں پر چھرتی اور ہتی ہوتی پیپ پھاہے سے صاف کرتی۔ لودے سوکھنے شروع ہوتے ہی سسلانے لگے۔ میری بے جینی مجھے اکساتی کہ میں انہیں کھجلاؤں اور کھجلاؤں ہوں۔ وہ مجھے کھجلانے سے روکتی۔ میں اتنی ہی دیر رکھتا جتنی دیر وہ مجھ پر نظر رکھتی پھر کھجلائے لگتا۔ میں کھنڈ اتارنے کی کوشش کرتا، وہ مجھے لاڈ سے سمجھاتی۔ کچا کھنڈ اتارنے سے داغ پڑ جاتا ہے۔ کھنڈ پک کر اترے لیکن داغ چھوڑ گئے۔ مجھے غسلِ صحت دینے سے پہلے اُس نے پٹری سے میرا رن صاف کیا۔ میں بنیان پہن کر اور کھدو لے کر کھیلنے نکلا تو میں زالی ترنگ میں تھا۔ میرے ساتھی میری نئی چیزوں پر شک کرتے اور انہیں ہاتھ لگا کر دیکھتے جیسے وہ آکاش سے اُتری ہوں۔ اتنے میں دھیان سنگ آگیا۔ اُس نے مجھ سے دیکھنے کے لئے کھدو لیا اور دیکھتے دیکھتے اُسے نالی میں گرادیا۔ میں نے غصے سے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اُس نے مجھے ایسا جھٹکا دیا کہ میں کھدو کے اوپر جا کر گر آ۔ میں روتا ہوا اٹھا تو وہ ہنس رہا تھا۔ میں اُس سے آنکھیں نہلاتا ہوا، روتا ہوا گھر چلا آیا۔ میرا یہ رویہ میری نامزدی سے زیادہ اُس محرومی کا نتیجہ تھا جو میرے گرد کی بے رخی سے میری تقدیر بنی ہوئی تھی۔

## باب ۵

نہ جانے کتنے ہوئے اس جہان میں شاہِ طر

بساطِ زیت پر سب اپنی اپنی چال چلے (شاہِ طر)

میں سمجھتا ہوں کہ آگے لکھنے سے پہلے مجھے اپنے گھر کیو ماحول کے بارے میں لکھنا چاہیے تاکہ کوئی امید پرست میرے بے اعتبار لیل و نہار کو شک کی نظر سے نہ دیکھے۔

جس دن سے میری ماں نے میرا دودھ چھڑوایا، مجھے زندگی کی ہر تفصیل یاد ہے۔ جو قارئین میرے بیان کو مبالغہ آرائی سے موصوم کریں، اُن کی جانکاری کے لئے میں عرض کرتا ہوں کہ رنج و غم کی نفسیات، نشاط و مسرت سے الگ ہے اور اُسی طرح اُن کے تاثر۔ پہلے جتنے دائمی ہیں دوسرے اتنے ہی وقتی۔

میرے بھائی جی بری قسم کے لڑاکے تھے اور بات بات پر پھار ڈھانے کو دوڑتے۔ وہ سیدھی سادھی بات بھی کرتے تو لتاڑتے لگتے۔ اُن کے کرڑے بول گھریں ایسے بکھرے نظر آتے جیسے تازہ قتل کے بعد خون کے دھبے۔ اُن کی موجودگی میں گھر میں بولنے رن کا سماں ہوتا تھا اور ہر شے پر موت کا سایہ منڈلاتا دکھلائی دیتا تھا۔ میں خیران ہوں کہ زندگی اُن کی نزد سے کیسے بچ نکلتی تھی؟ وہ اپنے اکھڑ پ پر فخر کرتے تھے جیسے کوئی ہنڈپ اپنے تہذیبی ورثے پر۔ میں اُس طرزِ حیات کا اتنا عادی تھا کہ گھر میں ہنگامہ نہ ہوتا تو میں ہنگامہ بکا درو دیوار کو تکتا اور بھائی جی کے زندہ ہونے پر شک کرتا۔ مجھے اپنے گھر سے شدید نفرت تھی! میں وہاں رہتا تھا تو اُس کی وجہ عجیب و غریب ہے۔ مجھے اُس منظرِ میت سے حجت تھی جو وہاں کے بایوں کی قبمت تھی۔ میرے بھائی جی نے مجھے قصور بے قصور اس بے وزدی سے پیٹا ہے کہ اُس کی یاد سے بدن یکپانے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جہارانا سنگرام سنگھ کے جسم پر جنگی زخموں کے اتنی نشان تھے۔ میرے جسم پر اتنی نہ سہی! لاٹھیوں اور درانتیوں کے اٹھ نشان ضرور موجود ہیں! سر پر، ماتھے پر، انگلیوں پر، پتلیوں پر، ٹخنوں پر۔ یہ داغ دیکھنے کو سطحی اور معمولی ہیں لیکن ان کی گہرائی خطرناک گھاٹیوں کی طرح ناقابلِ پیمائش ہے۔

میرے بھائی جی مجھے بے ضرورت پلے کی طرح پیٹتے۔ میں وار بچانے کی کوشش کرتا تو اُن کا ہاتھ پورا نہ پڑتا۔ اُس صورت میں اُن کا لپکنا جھپٹنا بڑھ جاتا۔ میں مار کی تاب نہ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ وہ میرا پیچھا کرتے، راستوں سے روڑے اُدھ کھیتوں سے ڈھیلے اٹھا کر مجھے مارتے۔ میری کمپرسی سارا زمانہ دیکھتا لیکن کوئی بچ بچاؤ نہ کرتا۔ میرے گرنے اور اُدھ مٹا ہونے تک اُن کا اُبال ٹھنڈا نہ ہوتا۔ وہ اپنی بھڑاس نکال کر چلتے جتے لیکن میں مقامِ حادثہ پر دکھوں کی گھڑی کی طرح پڑا رہتا۔ میں اپنے آپ سے عاجز سینے میں سر چھپائے روتا، روتا اور روتا۔ میرے اُتسوک

جاتے لیکن اُن کا سیلاب رگوں میں ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ اُن بے ڈھارس لمحوں میں مجھے انسانی رشتے بے معنی لگتے اور دنیاوی کاروبار فُصول سی شے۔ انسانی زندگی، جسے مذہبی فراست میں انمول قیمتی۔۔۔ کہا جاتا ہے، اُس کا مقصد اور مطلب میری سمجھ میں نہ آتا۔

اپنی پستی میں آدمی اپنے مستقبل سے بے خبر ہوتا ہے اور بے تعلق بھی۔ میری حالت مٹی کے گیلے ڈھیلے کی سی ہوتی جو اپنے ہی بوجھ سے ٹوٹ رہتا ہے۔ میرا ہونٹھنڈا پڑ جاتا، میں برت کی طرح جھنے لگتا تو میری کبھی میری بعد وہ ہند بن جاتی۔ لیکن میری وہ سچی اُس تلون کی سی ہوتی، جو اپنے گلے سڑے انگ کو کاٹ کر پھینکنے کے بجائے عزیز رکھے، اُس کی بددلوئیں سست رہے اور اُسے زندگی سمجھ۔

میں نے درندوں کو اپنے پلوں سے کھول کرتے دیکھا ہے، خطرے کے لحاظ میں اُن کی جائے ماں بدلتے دیکھا ہے، دکھ درد میں انہیں چاٹتے دیکھا ہے اور اُن کے نقصان میں روتے۔ لیکن میرے بھائیاجی! لاڈ پیار تو دور کی بات ہے، وہ نرم نگاہی کے لمس ہی سے بیگانہ تھے۔ میں اُس گھناؤنی گھٹن میں تڑپتا ہوا سانس نہ لے سکتا جو اُن کی بدبخت قرابت کی پیداوار تھی۔ اُن کے جبر و ستم کے آگے میری ماں کی احتجاج سے خاموش دست برداری، میرے خنم کے کُناہوں کا بوجھ تھی جس نے مجھے دُور اندر تک کچل رکھا تھا۔ بھائیاجی کی آہٹ پا کر میں اندھیرے گوشے میں چھپ جاتا، اگر سامنا ہو ہی جاتا میں خوف سے کانپتا ہوا اُس شے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا جس کے پاس کھڑا ہوتا۔ میں چھپ نہ سکتا تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا اور خود کو محفوظ سمجھتا۔ میرا بے عمل اندھیرے میں رہنے والے کیڑے کا سا ہوتا جو روشنی دیکھنے سے آندھا ہو جاتا ہے۔ کئی بار یوں بھی ہوا کہ میں کانپتا کانپتا پیروں میں دھنس گیا جیسے پانی میں ریت۔ میری ماں میرے پاس نہ ہوتی تو مجھے لگتا کہ میرے جسم کا کوئی اہم حصہ غائب ہے۔

میں رات کو صحن میں ماں کے ساتھ لیٹا ہوتا۔ دن بھر کی تھکی ماندی ماں میری ضد پر کوئی کہانی سناتی اور سناتی سناتی سو جاتی۔ میں خاموش جاگتا رہتا اور آسمان کے دل میں مکر مکر دیکھتا اور دادی ماں کی کہانیوں کی روشنی میں چاند ستاروں کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا۔ بھائیاجی دبے پاؤں آتے، ماں کو ہلا کر جگاتے اور کمرے کے اندھیرے میں گم ہو جاتے۔ میں ڈر کر آنکھیں بند کر لیتا اور اپنے آپ میں کچھوے کی طرح سکڑ جاتا۔ میری ماں میرے پاس سے اُٹھ کر کہیں چلی جاتی اور دیر کے بعد واپس آتی، جب تک میں سہما ہوا کروٹ نہ بدلتا۔

گھر میں تقریب تھی اور کوئی چار پائی خالی نہ تھی۔ مجھے جگہ نہ ملی، میں نیند کی جھوک میں فرش پر سو گیا۔ جسے مجھ پر ترس آیا اُس نے مجھے فرش سے اٹھا کر بھائیاجی کے ساتھ سلا دیا۔ انہوں نے جب مجھے اپنے ساتھ لیٹے دیکھا، اُٹھا کر نیچے بیٹھ دیا۔ رات کا سناٹا اور میرا واؤلا! کیا ہوا! کیا ہوا! ایک شور برپا ہو گیا جس کسی نے جو قیاس دوڑایا وہی سچ سمجھا۔ ماں نے مجھے کلبے سے لگایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دُور کے گھر کے گوشوں اور دوپٹے

کا پھا ہا بنا کر منہ کی بھاپ سے سینکا اور میں کچھ شانت ہوا۔ وہ حادثہ راز ہی میں رہتا اور ہر کوئی یقین کر لیتا کہ میں چار پانی پر سے گر پڑا تھا۔ لیکن بھائیاجی کے تہر و غضب میں شور و غل کی لڑاوت اُن کی زندگی کا وضع تھا یہی دھڑکا نہ بندھی تھی کہ انہوں نے سارے ہنگامے کو سن کر دیا، اس ذیل پہلے کو میرے ساتھ کس باجی نے سلایا تھا؟

وہ نہ کسی کو چاہتے تھے اور نہ ہی کسی کو پاس پھٹکنے دیتے تھے، اس کے باوجود تمنا کرتے تھے کہ ہر کوئی اُن کے ناز اٹھائے اور فرماں بردار رہے۔ اُن کے نظموں میں وہ گھر والوں کے اُن داتا تھے۔ ”میں نہ ہوں تو تم سب جھوٹے مر جاؤ گے!“

ماں کوئی نئی چیز تیار کرتی اور پہلے اُن سے جھوٹی نہ کراتی تو وہ اُسے نئے نئے طریقے سے ذلیل کرتے۔

”اُس بستر کو ماں کے جہیز میں دینا ہے جو سنبھال کر رکھ لیا ہے؟“

”تو نے وہ چیز بنائی تھی، بڑی جلدی ختم ہو گئی! اپنی بہن کے یار کو کھلا دی کیا؟“

اُن کا نفیس جذبات سے دُہی رشتہ تھا جو بیٹھے کا قوتِ باہ سے ہوتا ہے۔ اُن کو نرمی سے دُبی نسبت تھی جو سُوکھے ٹھنڈے کو آج سے ہوتی ہے۔ اُن کی اذیت خواہی لافانی تھی اور ہلاکت خیزی سے سازگاری لاشافی۔ اُن کے تناؤ میں سچ سمجھاؤ ہوتا تھا جو اپنے وقار میں کسی انجانی تہذیب کا پُر شکوہ انداز لگتا تھا۔ اپنی ظاہری سن موہنی صورت کے برعکس، وہ اپنے اندر کراہت کی حد تک بدہیت تھے۔ نہ انہیں اپنے کا پاس تھا اور نہ پرانے کا لحاظ! یہی ماں بہن ذلیل شرطوں پر اُن کے ساتھ رہتی تھی، لیکن بے زندگی گزیر کرتی۔

عورت کے بارے میں اُن کے خیال زرا لے تھے،

عورت اور زمین اُسی کی ہے جو اس میں مل چلا تا ہے اور وقت آنے پر کھرا بیج بوتا ہے۔

”داسی، داس، بٹشو اور ناری، سارے تانوں کے ادھیکاری“

اُن کی فریب کاری! میری ماں کے سوائے وہ ہر عورت کو عزت سے بلاتے اور اُس پر ڈورے ڈالتے لگتے۔ وہ باتیں جو عورت کی بھر پور تذلیل تھیں، انہیں کہاوتوں کی طرح یاد تھیں۔ کس گاؤں میں کون سی عورت اپنے لباس میں کیا سوغات چھپائے ہے؟ انہیں ایسے علم تھا جیسے کھوجی کتے کو علم ہوتا ہے کہ کس جھاڑی میں سے کون سا رشکار ملتا ہے۔ وہ کسی جو بن مانی کو دیکھ لیتے تو بے اختیار کہتے، ”تیار پڑی ہے!“ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے اور ایسے سانس لیتے جیسے کوئی کسی لذیذ چیز کو دیکھ کر للچائے اور آپ دہن نکلے۔

اُن کا بڑا بھائی ماٹا سنگھ مر گیا۔ اُس کی بیوہ بچی سوگ ہی میں تھی کہ وہ اُسے جا پڑے اور عین اُس وقت جب وہ نہانے کے لئے کپڑے اُتار چکی تھی۔ اُس نے اپنی آبرو بچانے کی خاطر دھانی دی لیکن اُسے کہیں سے کوئی مدد نہ ملی کیوں کہ بھائیاجی اپنے لنگوٹیوں سے ساز باز کئے ہوئے تھے۔ اُس نازک حالت میں وہ اُن کے حیلے سے کیسے بچی!

وہی بہتر جانتی ہے، ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اُسی گھڑی اپنے میکے چلی گئی اور کبھی لوٹ کر نہ آئی۔ میری ماں گھر میں نہ تھی۔ اُسے خبر ہوئی، وہ کُنویں میں ڈوب مرنے کے لئے دوڑی، اُسے پہناریوں نے نہ بچایا ہوتا تو کون جانے ہمارے گھر کا نقشہ کیا ہوتا؟

جہاں تک مجھ سے بن پڑتا، میں ماں کی مدد کرتا اور اُس کے اشارے کو محکم سمجھتا۔ لیکن میں اُس کے دکھ میں مسکھ کا خیال کرتا تو مجھے ایک ہی صل نظر آتا، اسے گھر سے بھاگ جانا چاہیے، اُن کٹھنوں میں، میں ہر کسی کے انجام سے بیگانہ ہوتا۔ میرے جذبے کی شدت! ماں کی کوئی خوبی میری تنگ دلی کا حلقہ نہ توڑ سکتی اور وہ مجھے گھناؤنی لگتی۔ اُس کی اخلاقی خوبی سے کوئی الگ جذبہ ہو گا جس نے اُسے میرے کیسے باپ سے جدا ہونے سے باز رکھا ہوا تھا۔

ہمارے گھر کو جھکڑے دوسروں کی خوشی کا باعث ہوتے تھے۔ اُن کے اپنے گھروں میں لگ بھگ وہی حالات تھے لیکن وہ ہمارے عذاب میں فرار پاتے تھے۔ یوں سنگھ کے اپنے تینوں بیٹے اُس کی آنکھوں میں کانٹے تھے لیکن وہ ہمیں مشورہ دینے میں پیش پیش تھا۔ ”تم اپنے باپ کو سلوتر خانے لے جاؤ اور خفی کروالو۔ وہ پتے پال نہیں سکتا تو پید ا کیوں کرتا ہے؟“

شیر سنگھ اپنے اکیلے بیٹے کی صورت دیکھنے سے گھبراتا تھا۔ وہ اس دروازے سے اندر آتا اور شیر سنگھ اُس دروازے سے باہر چلا جاتا لیکن اُسے ہمارا غم تھا۔ ”تمہارا باپ جس رفتار سے بچے پیدا کر رہا ہے، تمہارے جتنے فی کس ایک ایکو زمین نہ آئے گی۔ سوچو! تم گھر کہاں بناؤ گے؟ کاشت کہاں کرو گے؟ اپنے مستقبل کا خیال کرو اور اپنے باپ کا صفایا کرو۔“

ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لئے وہ مثالیں دیتا کہ فلاں گاؤں میں فلاں کے بیٹوں نے ایسا کیا ہے اور فلاں فلاں گاؤں میں فلاں کے بیٹوں نے۔

اُس کا لڑوں درغلانہ میرے غم و غصہ میں اضافہ کرتا، میری کدورت کو میرے باپ کے خلاف بھڑکاتا اور میں اُسے مار ڈالنے کے خیالی منصوبے بناتا۔

جارے کی کڑی راتیں ہوں یا طوفانی برساتیں، میرے بھائی جی کسی بات پر میری ماں سے جھگڑتے اور اُسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے، میں روتا اور وہ مجھے اُس کے پیچھے ہانک دیتے۔ وہ چھیننے کے سے انداز میں مجھے اٹھاتی، سینے سے لگاتی جیسے کلیجے میں رکھ لینا چاہتی ہو۔ وہ کچھ دیر رکتی گویا انتظار کرتی کہ کوئی اُسے روک لے۔ اپنے کسی دہم سے گھبرا کر وہ مجھے اپنے ساتھ سختی سے بھینچتی، میں درد سے بلبلا اٹھتا۔ وہ اپنی گرفت دھیلی کرتی، مجھے تشویش سے دیکھتی جیسے کہ اُس میں میرے کھوئے جانے کا اندیشہ ہو۔ ہمارے گھر کے ساتھ لگا ہوا تایا جی کا پڑانا طویل تھا، گھر سے باہر جانے کا راستہ اُسی میں سے ہو کر جاتا تھا۔ دھتکاری ہوئی میری غریب ماں جوں ہی وہاں سے گزرتی، تایا جی اُس کا راستہ

روک لیتے، مجھے اُس سے لے کر گود میں اٹھاتے، اُسے دِلِسا دیتے اور مجھے بچکا کرتے۔ اُن کی دِل داری سے اُس کی بے قراری بڑھ جاتی اور وہ بے تحاشا روتی۔ اُس کی فغاں سے میرے سکتے کا عالم ٹوٹ جاتا اور میں بے طرح رونے لگتا۔ فرطِ گریہ سے ہر مردہ شے میں جان پڑ جاتی اور مہر دُفِ فریاد نظر آتی۔ تایا جی میں جیسے تیسے بہلاتے، کمرے میں بٹھاتے اور باہر چلے جاتے۔ اندھیرا کمرہ، کال کو ٹھٹھی لگتا۔ میں ڈر کر ماں کا دامن کھینچتی اور اُسے اپنی جانب رُغَب کرتا۔ وہ اپنے غم سے بے حال میری حالت سے بے بہرہ ہوتی۔ کمرے کے اندھیرے میرے مَحْضوم دھوں کو ابھارتے، اتہیں ڈراؤنے ہیولوں میں بدل دیتے اور میں جینٹا ہوا ماں سے لپٹ جاتا۔ وہ مجھے گود میں لیتی اور میری دھارس بندھاتی بندھاتی خود بھی سنبھل جاتی۔

تایا جی حویلی میں ہمارے کھانے کا انتظام کرتے۔ وہ کنوئیں سے پانی کی باٹی بھر کر لاتے اور بکری کے چار کا تسلا صاف کرتے۔ ماں اُن کے ہاتھ سے تسلا چھین لیتی، روٹی پکانے پر راضی نہ ہوتی، بس یہی رٹ لگاتی، ”مجھے بھوک نہیں! مجھے مَر جانے دیجئے، اسی میں میرا سکھ ہے!“

وہ جیسے تیسے اُسے روٹی پکانے پر راضی کرتے۔ وہ میری جانب دیکھتی، ٹھنڈی آہ بھرتی، تسلا مانجی اور اٹھا گوندھتی۔ تایا جی اینٹیں کھڑی کر کے چولہا بناتے اور پرال سے آگ جلاتے۔ ماں تسلے سے اٹھا نکال کر چھاج میں رکھتی اور تسلا چھلے پر اٹھا رکھ کر روٹی پکاتی۔ تایا جی کسی چاٹی کا دھکن دھو کر اُس میں راب نکالتے، ٹوکرے میں سے پیاز لے کر توڑتے، دبا کر تیزاب نکالتے، چھیلتے اور پھاڑ کر دھکن کے کنارے پر رکھ دیتے عین اُس وقت جب روٹی کی خوشبو، رال بن کر ٹپسکتی ہوتی، بھائیاں جی گر جتے ہوئے آتے اور ماں پر پسکتے۔ وہ چیخ مار کر پیروں پر ڈھیر ہو جاتی، تایا جی جہاں کے تہاں جم جاتے، حیران مویشی ناندوں سے پلٹ کر دیکھتے اور میں ہکا بکا آنکھیں پھاڑے بھائی جی تسلے کو ٹھوک مارتے، جو جھن جھن کر اڑتا ہوا دُور جا کر جاتا۔ وہ چولہے پر چھلانگ لگاتے اور اکاڈنا ڈونا چ (نُفرت اور غصے سے بھری ہوئی حرکات جو آدمی خون خرابے کے دوران کرتا ہے) ناچتے۔ دھرتی دھپ دھپ کانپتی اور بھونچال آنے کا منظر پیش کرتی۔ گھاس چھوس کی آگ پہلے ہی نیم مڑہ ہوتی ہے! راکھ کے ساتھ چند شرارے اڑتے اور چولہا ٹھنڈا پڑ جاتا۔

تایا جی آفسردہ درنجیدہ کھڑے وہ خونخوئی تماشا دیکھتے۔ اُن کے روم روم سے وہ آنسو ٹپکتے جان پڑتے جو اپنی تندی میں دراڑیں پھیلانگ کر رگوں میں جذب ہو گئے ہوتے۔

”مانسا، تیرے کرم! مانسا، تیرے کرم!“

اُن کے چہرے کے تاثر اور آواز کے لمبے سے لگتا کہ وہ نہایت مجبور اور بے بس ہیں۔ اُن کا انداز کچھ اور گہرائی اختیار کر لیتا جب وہ کہتے، ”رتن رسیاں، تو معافی کے قابل نہیں! لیکن میں، تجھے مُٹاف کرتا ہوں! مُٹاف



کرتا ہوں!

وہ مجھے گود میں اٹھاتے اور پیار کرتے۔ میں اپنے آنسوؤں کی دھند میں سے انہیں دیکھتا، وہ مجھے اب زندہ آئینہ سے نظر آتے۔ وہ کچھ دیر کشاں کشاں گھومتے اور پھر منانت کی نرمی میں نہا جاتے اور اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے۔ "محبت وہ لطیف جذبہ ہے جو ہر بد صورتی کو خوب صورتی میں بدل دیتا ہے۔ کاش، تم اس جذبے کو پہچانتے!"

"ظلم غیر فطری ہے اس لئے وقتی طور پر پنپتا ہے۔ پھر یہ ظالم ہی کا پیچھا کرتا ہے اور زہریلے سانپ کی طرح اُمی کو ڈستا ہے۔"

"نفرت تو خیر نفرت ہے، حد سے زیادہ محبت بھی انسان کو صحیح راستے سے بھٹکا دیتی ہے!"  
تایاجی کی فراست اور جذبے کی نزاکت محض انہیں کی تسلی ہوتی۔ بھائیاجی انہیں اُس درندے کی طرح دیکھتے جو گھریلو ماحول میں پلتا ہے اور پوری طرح توں خوار نہیں بنتا ہے۔ اُن کی ہر ادا میری ماں کو یہ تنبیہ کرتی سُنائی پڑتی، تو بھٹکے گی تو مجھے چھاڑ کر رکھ دوں گا۔"

تایاجی کی صبر آزمائی اور خوش آمدیدی! وہ ہماری بے کسی پر اُساں ہو کر آسمان کی جانب دیکھتے جیسے ہماری خوں چکان فرد حیات میں خوشی کا باب ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ مجھے کا ندھ سے لگائے صحن میں گھومتے اور آواز کی ترنجیر کو ہلاتے، بیلوں کو تھپکتے، پتھر ٹوں کو تہلاتے، اُن سے اور مجھ سے بیک وقت مخاطب ہوتے، میری آنکھوں میں جھانکتے، مجھے لگدگاتے، حتیٰ کہ تیں ہنسنے پر مجبور ہو جاتا۔

شدتِ غم سے جی جی سی میری ماں بگھلتی بگھلتی پگھل جاتی اور رونے لگتی۔ اُس کی فریادیں دعا کی سی التجا ہوتی۔ دُرد بھری فریاد اندھیرے کو اور بھیانک نادیتی اور طویلِ اُقام کدے کی طرح ہونکتا۔ نالے اتنے گہرے ہوتے کہ اپنا پر سہ آپ لگتے۔ اندھیرا بڑھ جاتا اور میری ماں کو ایسے ہرپ لیتا جیسے کوئی بھوکا دیو اپنے شکار کو۔ تایاجی سرسوں کے تیل کا چراغ جلاتے، اُس کی مدد سے لومیں میری ماں آہوں اور اشکوں کا جھستہ نظر آتی۔

اُس خوفناک خاموشی کو توڑنے اور ٹھیراؤ میں حرکت پیدا کرنے کے لئے تایاجی گرہنے (سن کے پوٹے) نکالتے۔ جاڑا ہوتا تو سلینگینوں (سلنگنی، وہ پتھری جس پر سے سن اُتار لی گئی ہو) کی دھونی بجلا لیتے درندہ اندھن کے لئے رکھ دیتے اور کوئی داستان سُناتے۔ اُس داستان کا لڑکا غم و مصوٰبت کی زندگی گزارتا، دشمنوں سے لڑتا، ہجرت انگیز طریقے سے موت کے منہ سے بچتا وہاں جا نکلتا جہاں نامعلوم رعایا اپنے نئے بادشاہ کی راہ دیکھ رہی ہوتی۔ وہ لڑکا، بے گھر آدبے سہارا لڑکا اچانک بادشاہ بنا دیا جاتا اور محل کے عیش و آرام میں بسا دیا جاتا۔ وہ اپنی رعایا کی حسین ترین لڑکی سے شادی کرتا اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم رہتا۔ اُس دُردناک داستان کا خوش گوار انجام میرے تصور میں

امید کا جادو جگا دیتا اور میں تایا جی کے زانو پر سر رکھ خیال کرتا کہ میں وہی لڑکا ہوں جو آفتوں سے برسرِ پیکار رہے، لیکن اس رعایا کی طرف بڑھ رہا ہے جسے اپنے نئے بادشاہ کا انتظار ہے۔

ایسے بہتر اور بے سمت حالات میں تایا جی میری ماں کو کئی طرح نصیحت کرتے، ”بیٹا، اٹھ اور کوئی کام کر! کام دیکھ کے لئے دوا ہے اور سکھ کے لئے دعا۔“

”میلے تن کے لئے صابن اور دیکھی من کے لئے کام کی اہمیت ایک ہی ہے“

”کام انسانی زندگی کا حلال ہے! یہ مصیبت کے ہر اندھیرے کو نابود کرتا ہے۔“

ایک بار میری ماں نے تایا جی سے پوچھا، ”بھائی جی! میں اپنے گھروالے کے لئے وہ سب کچھ کرتی ہوں

جو کر سکتی ہوں۔ بدلے میں مجھے ذلت کیوں ملتی ہے؟ میری محنت اور محبت کا اعتراف کیوں نہیں ہوتا؟“

وہ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر ولے، انسان کی فطری کمزوری ہے کہ اسے جہاں سے لگا تار ملتا ہے وہاں

اس کی توقع بڑھ جاتی ہے۔ اور توقع ایسا رذیل جذبہ ہے کہ یہ اپنی انتہا میں اپنے محسن کو ملیا میٹ کرنے پر اتر آتا ہے۔

اپنے محسن کی تذلیل اس کی ابتدائی صورت ہے۔ بھوکا پتھر پہلے شور مچاتا ہے، اگر دودھ کا سوتا پیچ ہی میں ٹوکھ جائے تو

وہ اپنی لالسا، حرص میں اسے کاٹ کھاتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی جی!“

ماں نے ان کے بیان کی تصدیق ترنت کی جیسے اسے ذاتی تجربہ ہو۔

تایا جی جتنے فیاض اور بردبار تھے، تائی اتنی ہی کینی تھی اور بٹی بھی۔ اس کا زندگی سے رشتہ بڑھنے سے

گلی لکڑی کا ساتھ جو نہ جلتی ہے، نہ چولہے کو گرماتی ہے اور نہ اپنے پاس بیٹھنے والے کو جین کا سانس لینے دیتی ہے۔

منہ سے پھول جھڑنا، یہ تجاورہ کسی پر پورا اترے کہ نہ اترے لیکن تائی کے بارے میں یہ دھوکے سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کے

منہ لگنا اپنا منہ چڑانا تھا۔ جیسے فطرت کا راز و نیاز خاموشی ہے ویسے ہی تایا جی کی صبر آزمائی تھی۔ وہ تائی کی جلی جی تھکتے لیکن

اسے کچھ نہ کہتے، اس کی بدتمیزی پر زیادہ دھیان دیتے تو اٹھ کر کھیتوں کو چلے جاتے۔ وہ اپنے تیبے میں آپ مری جاتی اور

ان پر طامت کرتی۔ بالکل سانپ کی طرح ٹھنڈا ہے۔“

تائی جھگڑا سہیڑنے اور اُلٹا ہوا دینے میں ثانی نہ رکھتی تھی۔ وہ اپنا کام جیسے تیسے نکال لیتی لیکن دوسرے کو

وقت پڑنے پر اس کی کافی انگلی پر نہ مومتی۔ وہ بڑوسیوں کی آنکھ بچا کر ان کی بھڑولی دمنی کا چولہا جو تورا سا ہوتا ہے لیکن

اس میں صرف اچلے جلائے جاتے ہیں) میں سے دودھ جڑا لیتی اور کاڑھنا (دودھ گرم کرنے کا ریتی کا برتن) تنکا چھوڑ دیتی۔

کوئی ہمت کر کے پوچھ لیتا تو وہ اُسی کے سر کی قسم کھا کر کہتی، ”میں کیا جانوں! موتی پنی پنی گئی ہوگی!“ پھر اس کا حریف

بھلے چپ ہو جائے، وہ چپ نہ ہوتی۔ اس کی برہی آئینے کے سامنے بیٹھی چڑیا کی سی ہوتی، جو اپنے ہی سایہ کو ٹھونکتی

ٹھونگی بولہبان ہوتی رہتی ہے۔ کوئی کم بخت بات کو طول دے بیٹھتا، وہ اپنی مصومیت جتانے کے لئے سر کے بال نوچتی اور چھاتی پیتی۔ اُس کے نوحوں سے پُرحکوں کی ٹھنڈی چٹائیں پھر سے سلگ پڑتیں۔ اُس کی ستیرہ ٹوٹی زالی تھی؛ وہ دوسروں کی کھڑیوں (ناندوں) میں سے چارہ نکال کر اپنی کھڑیوں میں ڈال لیتی، دھوروں کا گوبر اٹھا کر لے جاتی اور اُن کے کام میں یوں بین میکھ نکالتی، ”تم ان بے زبانوں کی بددعا نہ لو، ان سے کام لیتے ہو تو رخصت کھانے کے لئے بھی دو، بے چارے بھوک کے مارے گوبر تک نہیں کرتے۔“

تائی ہماری بد بختی پر خوش ہوتی لیکن ہمارے ساتھ تایاجی کا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر جل مرنی۔ محبت کی طرح نفرت بھی خوش اعتمادی بڑھا دیتی ہے۔ تائی، تایاجی کو جیسے بول بولتی، اُن کو سن کر ڈوب مرنے کی جائے ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تایاجی اُس کی بکواس کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ اُن کی زباں بندی سے گھبرا کر ایک بار اُس نے اُن پر شہمت لگائی، ”میں جو کہتی ہوں، سچ کہتی ہوں درد تو میری زبان نہ کھینچ لیتا!“

”تیرے پاس زبان ہے کہاں جسے کوئی کھینچ سکتا! وہ تو تیرے وجود کا کھویا ہوا حصہ ہے۔“

اُن کے غیر متوقع جواب سے وہ اور بھڑک اُٹھی اور زبان کے پھوڑے کی طرح پھٹ پڑی۔

جیسے تایاجی کی خاموشی باتوں پر بھاری تھی ویسے اُن کی باتیں کتابوں پر۔ اُن کے الفاظ معراجِ عمل کی تفسیر تھے اور اندارجیات کی تعمیر اُن کے سامنے شاستروں کی حقیقت نہ تھی کیوں کہ اُن کا وجود جیتا جاگتا کر دار تھا۔ وہ کہتے تھے۔ ”الفاظ بے جان جسموں کی طرح ہیں۔ ان کی اصلیت دیکھنے کے لئے ان میں عمل کی مدد چھونکنی پڑتی ہے۔“

کتابوں کی قربت سے فہم و فراست بڑھتی تو کتب خانوں کے محافظ عظیم دانشور ہوتے۔ انہوں نے بات ایک برہمن سے کہی تھی جو ڈینگ مانتا تھا کہ اُس کے گھر میں چاروں دید اور اٹھوں سمرتیاں ہیں۔

تایاجی کی فہم و فراست میں احساس کی لاگ تھی۔ وہ حیوانوں، درختوں، نیچوں، پھولوں، پھلوں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ ہمارے بغیر جی سکتے ہیں لیکن ان کے بغیر ہم مر جائیں گے۔ وہ ان سب کا احترام اپنے طریقے سے کرتے تھے، ضرورت سے کم کھاتے تھے اور جھوٹے نہ چھوڑتے تھے۔ وہ کھانا کھا چھتے تو اُن کی تھالی ایسے صاف ہوتی جیسے ناکھانے سے پہلے۔ وہ کسانوں کو ان داتا سے بڑھ کر حیوان دانا سمجھتے تھے اور جما شرے کا سب سے ضروری جزو۔

اور میرے بھائیاجی! وہ انسانوں سے حیوانوں جیسا سلوک کرتے تھے اور حیوانوں سے درندوں جیسا۔

نی نیا مویشی خرید کر لاتے اور اُسے کھونٹے سے باندھ کر لاٹھی سے پیستے۔ وہ بے چارہ درد سے آرتا، جان کی امان اور رستارٹو کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتا۔ اُسیل تو اُسیں ہیں، اُن سے مر کھنے تک ڈرتے تھے۔ وہ کھڑی میں چارہ تہ ہوتے، مویشی دور کھڑے ہوتے، جب وہ پرے ہتے، مویشی آگے بڑھتے، پہلے چند نوالے رکتے رکتے اور ڈرتے نہ کھاتے۔ اُن کے سانپے میں آہ، اُن کی سختی کی تصدیق تھی۔ وہ ہل باہتے ہوتے تو بیل دم اٹھائے چلتے اور باگ

کھینچنے پر رکتے، رکتے، رکتے۔

اُن کی حاضر جوابی اور کھڑی چوٹ کی دھوم تھی اور اُن کے فقرے قحاوروں کی طرح دُہرائے جاتے تھے۔  
”پہلے نوالے اور آخری گھٹے کی لذت مساوی ہوتی ہے۔“

”لنگڑا گھوڑا اور ڈھیلا ... کون پالتا ہے۔“

”بانجھ عورت میرا کچھا ہی بہن لے تو معاملہ ہو جائے اور جس بچے کو جہنم دے وہ پیدا ہوتے ہی دوڑنے لگے۔“  
”گڑیوں کو ... ہوتیں تو وہ طاق میں نہ رکھی رہتیں۔“

”ایک بار شیر سنگھ نے اُن سے طنزاً کہا، ”رتن سیریاں! تیرے پانچ بیٹے ہیں۔ اتنوں کے آگے اتنے ایٹے ہوئے تو اُن کو گھر میں خانہ خاندانے گا۔ اب تو ب پست آئٹرم اختیار کر لے۔“

”شیر سیریاں! اس کا ایک اور علاج ہے۔“ انہوں نے اُسے کاٹتے ہوئے کہا۔  
”کیا؟“ اُس نے حیران ہو کر سوال کیا۔

”میں اپنے لڑکوں میں سے کچھ کا بیج پکانے والا ہوں۔ معاملہ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔“  
اُن کی بات گاؤں میں محاورے کی طرح دُہرائی جانے لگی۔ کوئی لڑکا جوان ہوتا، اُس کا باپ اُس کا بیاد  
ذکر تا تو لوگ اُسے چھیڑتے۔ ”تیرا باپ تیرا بیج پکارا ہے کیا؟“  
اور وارث شاہ کا یہ شعر تو اُن کا منہ چڑھاتا تھا جسے وہ عورت کی زندگی کا چوڑ سمجھتے تھے۔

وارث شاہ جندوں رن دیال ہو دے

بھانڈا موت دا کڈھ دکھاؤندی اسے

(اے وارث شاہ، جس آدمی پر عورت مہربان ہوتی ہے، اُسے موت کا برتن پیش کرتی ہے)

اُن کی باتیں اُن کے نقش و نگار ہی کی طرح دل میں اُتر جاتی تھیں۔ وہ اپنی شخصیت کا اظہار یوں کرتے تھے۔  
رُتب نے مجھے، اپنی مٹی سے بنایا ہے۔“

اُن کی یہ بات ہر لفظ کے حرف و صوت تک پر ہے۔ اُن کے دُجود کا ہر بون مُوان کے یکتا ہونے کی  
ضمانت تھا۔

ایشر سنگھ کا تکیہ کلام تھا، میں سچ بولتا ہوں، بھائیابی نے اُسے ایک بار کاٹا اور اُن کا فقرہ اشتہار بن گیا۔  
”ایشر سیریاں! تیرے نیچے چھیدے ورنہ تو اُدا لیا ہوتا!“

کسی کی بات کو کاٹنا اور اپنی بات میں نکتہ پیدا کرنا، اُن کا جنون تھا جیسے اُسی میں اُن کی مغفرت ہو جہاں  
وہ ایسا نہ کر سکتے وہاں جھگڑا کھڑا کر دیتے۔ وہ مسافری سے اُسے، اُن کی بھابی جانتی تھی کہ وہ وہاں بڑھی کا کام کرتے تھے

لیکن اُس نے چھیڑ خانی سے پوچھا، ”رتنسیا! تو پردیس میں کیا کرتا ہے؟“  
وہ اندر گئے، ہتھوڑی اور کیل لائے اور اپنی بھابی کا لہنگا کپنچ کپنچ کر اُس کے گھیرے میں کیل ٹھونکنے لگے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کیلوں میں سے لہنگا نکالنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بولی، ”موئے! تو وہاں یہ کرتا تھا؟“

”اور کیا! ایک چوب لگانی باقی ہے۔“ انہوں نے اُسے اڑاتے ہوئے ترنت کہا۔  
وہ بچوں کو پیروں کی بیڑیاں کہتے تھے۔ نئے بچے کی پیدائش پر کوئی بدھائی دیتا، وہ اُس کا منہ چڑاتے، منگلا چار کی کیا بات ہے اس میں؟ ایک پلا اور آئرا ہے! اس کا منہ بھرنے کے لئے مجھے اور مرنّا کھپنا پڑے گا۔“  
وہ عورت ذات پر برستے، ”عورت اور کُتیا کی نفسیات ایک سی ہے۔ اسے روٹی کپڑا دونہ دو، اس کے چمڑے سے پلٹے رہو اور تھن چوٹھتے رہو۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی اُسودگی۔“  
یہ کہہ کر وہ اپنے آپ کو فخر سے دیکھتے جیسے وہ دُنیا کے سارے مردوں کے امام ہوں اور مردانہ جارحیت کی نظیر۔

اُن کے نزدیک دُنیا کی ہر نعمت فقط مرد کے لئے بنی تھی۔ وہ بادام، مونگ اور گھی سے پنیاں تیار کرواتے اور میری ماں کے سامنے بیٹھے بے شرمی سے اکیلے کھاتے اور اپنے رذیل حق کی سند دیتے۔

ترستہ کھمبی بدلی رن ملائی کھا

ادہ وڑے ادہ اُہڑے وار نہ خالی جا

دکالی گھنی گھٹا اور تر مال کھانے والی عورت کی صفت ہے کہ وہ ضرور برستی ہے اور وہ ضرور یار کے ساتھ بھاگ جاتی ہے)

وہ پتی کھاتے ہوتے اور کوئی دوسرا آجاتا، وہ اُس کی صلاؤں کرتے، ”یہ پتی زیادہ مُرغن ہے، تو کھائے گا تو ہضم نہ کر سکے گا۔ تو کہے تو میں تیرے لئے میٹھی لسی کا گلاس بنا دیتا ہوں۔“

بھائیاجی کے برعکس تایاجی عورت کی حمایت کرتے تھے۔ ”عورت میں جَہِزہ تَصَدَّقِ بُنیادی اور ابتدائی ہے۔ چوں کہ مردوں کے سماج نے اس کے ساتھ دوسرے درجے کا سلوک کیا اور علم و ہنر سے محروم رکھا، اس کی زندگی کا ہر گوشہ تاریک رہا۔ ہر کسی نے اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا جب کہ اُس کا اپنا رویہ لائق اصلاح تھا۔“

وہ عورت کو تخلیق کا سرچشمہ سمجھتے تھے اور اُس کی تعریف کئی طرح کرتے تھے۔ ”عورت سترٹی ہے۔

آدمی عورت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے، عورت کی کِرپا پر پلکتا ہے، عورت سے دوستی کرتا ہے، عورت سے گرہتی بساتا ہے عورت مِر جائے تو دوسری کی تمنا کرتا ہے۔ نظمِ حیات میں عورت اُشمرہ و اتا (حاجت روا) ہے اور آدمی اُنْثِرِت (مجتنب)

اتنے سارے کردار اُسی کی خوبی ہوتے ہیں جو تخلیق کار ہو۔ اور تخلیق کار کتنا ہی ادنیٰ ہو، عام آدمی سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ ایک بارتیا جی ناری کی تعریف کر رہے تھے کہ اُن کی لڑکی امر کو لے کر اُن سے رُوٹھنے کے سے انداز میں سوال کیا، ”بھائیاجی! آپ ناری کو پرش سے بُرا مانتے ہیں لیکن مجھے میرے بھائیوں جتنی آزادی کیوں نہیں دیتے؟ وہ اُسے پیار سے دیکھتے رہے اور پھر سر پر ہاتھ پھیر کر بولے، ”بیٹا! ناری سمو چا دھن ہے، اس لئے“ یقینی نہیں سمجھی، ذرا بستر سے کہیے ”اُس نے لاڈ لڑاتے ہوئے کہا۔

”کرمان اپنی دھرتی سے زیادہ کھیتی کی رکھوالی کرتا ہے اور اُس سے زیادہ گھلیان کی، کیوں کہ گھلیان، سمو چا دھن ہوتا ہے، جو آسانی سے ٹوٹا جاسکتا ہے۔“

یہ راز امر کو رہی جانے کہ وہ اُن کی بات کہاں تک سمجھی، وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی جیسے مزید تفصیل کی تمنائی ہو۔ تایا جی بے کار سے بے کار چیز کو بھی دھن کہتے تھے اور صبح کہتے تھے۔

ایک بار میں اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا، مجھے حاجت ہوئی۔ میں پڑوس کے کھیت میں حاجت رنج کرنے جا رہا تھا کہ بھائیاجی نے روک لیا اور کہا، ”تو اپنا کھیت چھوڑ کر دوسرے کے کھیت میں گویہ پھرتا ہے۔ پاگل! کھیت میں گویہ، دھن ہوتا ہے۔“

تایا جی ناری کو ایک عجیب طریقے سے پرش سے برتر بتاتے تھے۔ وہ یوں کہ اگر کسی حادثے سے دنیا کے سارے پرش مرجائیں تو بھی مانس جاتی کا سلسلہ چلتا رہے گا کیوں کہ ناری، پرش کے بیج کی رشک ہے۔ ہاں اگر اس کے برعکس ہو تو مانس جاتی کا سربِ ناش ہو جائے گا۔

کوئی بھو یا مٹی گر بھ دیتی ہوتی، وہ اُس کے لئے خاص طور پر سبزیاں لاتے اور رات کو بیت کھتا اور اُٹھاتی کہانی، سنا تے۔ وہ کہتے تھے، ”گر بھ دیتی کی حالت ہوئی ہوئی دھرتی کی سی ہوتی ہے۔ جیسے دھوپ اور پانی، بیج کی پورن اُبیج سے جڑے ہوئے ہیں ویسے ہی حایلہ کی جسمانی اور نفسیاتی ہم آہنگی حمل کی کامل نشوونما کی ضمانت ہے۔“

اور تائی اپنی بہوؤں کے ساتھ جیسا سلوک کرتی تھی، اُس کی ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ تایا جی ہریانہ سے کیلے لائے۔ اکیلی تائی گھر میں تھی اور باقی سارے خویلی میں۔ وہ جتنے کیلے کھا سکتی تھی، کھاٹی جو بچ گئے وہ مسل کر رکھ دیتے۔ میرے بھائیاجی کو شکاری گتے پالنے کا خبط تھا۔ وہ گتے کا بھول لیتے، اُس میں سے صرف مادہ پلوں کو رکھتے، نروں کو مار دیتے یا کسی کو دے دیتے۔ وہ کہتے تھے کہ گتوں کے گتے تیز رفتاری میں رُکاوٹ ڈالتے ہیں انہوں نے اپنی منطق کے خلاف صرف ایک بار شکاری گتے پالا لیکن آخر اُسے عین منطق کر دکھایا۔ وہ اُسے سلوتر خانے لے گئے اور اُسے آختر کروا لائے۔ چوں کہ وہ گتوں کو شجاعت و آفرائش سے محروم کرتے تھے اس لئے عورت کو پیدا انشی بڑوں قرار دیتے تھے۔ وہ پلوں کو بکری کے دودھ پر پالتے اور اُن کی رات ب مقرر کرتے۔ گھر میں بکری نہ ہوتی تو بکری خرید لاتے،



جُٹانی، بوائی، کٹانی اور گہائی کے وقت بیلوں پر کڑی گزرتی۔ اُن کی محنت کا خیال رکھتے ہوئے میری ماں اٹا پیچتی پر بیستی۔ وہ اُس مشکل کام کو سونپلا گا کر آسان کرتی۔ چیکنی کا ساز سوتلے میں ایسا سوز بھرتا کہ درو دیوار تک سنجیدہ و متوجہ لگتے۔ اُس کی سی نعر اور گھڑگر بنیاں کہاں ہوتی ہیں! وہ اس دھن کی پتی تھی کہ مرد، گھر کے کاروبار سے آزاد ہو تاکہ وہ رزق کمانے کا کام بے فکری سے کر سکے۔ سارے گھر یو کام وہ مجروم سے پہلے ہی کر لیتی اور ناحید امکان باہر کے کام میں بھائیاجی کی مدد کرتی۔ وہ کھیتوں میں بھائیاجی کے ساتھ شانہ بر شانہ کام کر رہی تھی کہ فرید خان اُدھر سے گزرا۔ اُس نے ٹک کر بے اختیار کہا۔ ”رتن سیال! یہ بات اب سمجھ میں آئی ہے کہ تجھے ساہوکار سے کیسے چھٹکارا ملا! جب کہ میں پھنسا ہوا ہوں۔ تیری بیوی تیرا یار و مددگار ہے اور میری مصارف کا بار!“

پوچھ لے چو کے سے وقت بچانے کے لئے، میری ماں دال، توڑی (مٹی کی ہانڈی) میں بھڑولی (بند چڑھل) میں بناتی، جو نہ کبھی جل کر لکھ ہوئی اور نہ کھڑی رہی۔ اُس کی مسلسل کامیابی کا راز ادھن اور ایندھن کا صحیح انداز تھا۔ اُس کی لگاتار مہر و فیت کے باوجود، اُس کے چہرے پر تھکن دکھائی دیتی اور نہ ہی ماتھے پر بل، جیسے کام سے اُس کی طاقت کی تجدید ہوتی ہو۔ وہ کام کو مسرت کا سرچشمہ نہ جانتی تھی اور جو کوئی کام کرتی تھی، اُس کا سونپلا گاتی تھی۔ میرے قارئین شاید حیران ہوں، پنجابی بھاشا میں ہر کام کا سونپلا ہے۔ بہار سا کام ایسے پورا ہو جاتا جیسے سونپلا، کام کرنے کا جتن تھا۔ ماں کی خوش اسلوبی اور خوش مزاجی دائمی تھی۔ جیسے نئے کی دل کشی اُس کے زیر و بم میں ہے ویسے ہی ماں کی خوش سلیقگی اُس کے لہجے میں تھی۔ وہ آئی جی کہہ کر کسی حکم کی تعمیل کرتی تو محسوس ہوتا جیسے کام کرنے سے پہلے ہی پورا ہو گیا تھا۔ اُس کا ضبط غم! وہ اپنی بد نصیبی کا دکھ انہ کسی سے کہتی اور نہ کسی کو سنانی۔ اُس کی بے نوری میں زلالا نور تھا! وہ روتی روتی اٹھ کر کسی سے ملتی تو لگتا کہ سورج دھند میں سے جھانک رہا ہے۔ اُس کی ہم عمر عورتیں بچے جتنے جتنے مر جھا گئی تھیں۔ اُن کے پیٹ اُن کی چھاتیوں کی طرح کڑھک اُٹے تھے اور پیٹ اور زانو کھاک سی اُسے بد نما لگتے تھے۔ اُن کے سامنے میری ماں کٹواری لگتی تھی۔ وہ غسل کر کے کنگھی پٹی کرتی، مُرمہ کا جل لگاتی، سسک مٹی ملتی اور دھلے ہوئے کپڑے پہنتی تو دُہن لگتی۔ اُس کا رنگ کنول کا سا تھا جس پر ہلکی سی سیندوری چھاپ ہو۔ پانچ بچوں کی ماں ہو کر وہ گیان کور سے زیادہ خوبصورت تھی، جو نئی بیہوشی میں ماں کو مجبور کرنا کہ وہ گیان کور کی طرح دو چوٹیاں کرے، ایک چوٹی آگے رکھے اور دوسری پیچھے۔ وہ مسکرا کر میرا منہ چوم لیتی، اور کہتی، ”بیٹا! میں نوٹی دُہن نہیں ہوں جو شہانی مہندی لگاے اور رنگیلی چوڑیاں پہنے بیٹھی رہوں!“ اُس کے انکار سے انسرودہ ہو کر میں سوچتا کہ کاش میری ماں دُہن ہوتی! بن سنور کر بیٹھی رہتی اور میری آنکھوں سے لگی ریتی۔ فنونِ لطیفہ کی ترقی کے لئے آزادی اور جاہلیت کی زندگی ضروری ہے۔ میں حیران ہوں کہ روز کے



جھگڑوں، نت نئی کدورتوں، سُلتی نفرتوں کے درمیان میری ماں کی فنکارانہ وضع داری کیسے قائم رہی؟ وہ دوسری دہائی عورتوں کی طرح ستیزہ خوار و عیب جو کیوں نہ بنی، اُس کی انتقامی جہالت کیسے نابود رہی؟ کوئی مہمان آتا تو ماں کے رنگ رچاؤ دیدنی ہوتے۔ وہ لالٹین کو اٹلی مل کر چمکاتی اور چمنی کو راکھ سے چھنی جلا کر بُرش سے رگڑتی اور پہلے ہی صاف برتنوں کو کھٹی لسی سے دھو کر کپڑے سے سُکھاتی۔ کانٹے کے برتن کندن کی طرح دمک اُٹھتے۔ وہ اُلتی جھوٹی دال سبزی کٹوریوں میں بھرتی، اُن کے کنارے صاف کرتی اور تھال کے اندر کے سرے کے ساتھ سجا کر رکھتی اور اُن کے بیچ روٹی پر دستی۔ عمارے کی طرح گول مٹول روٹی پورے تھال پر چھا جاتی۔ جیسی بھجوں کی سجادوٹ ویسی سگند، زبان سے پہلے آنکھ اور آنکھ سے پہلے ناک کھانے کا لطف اُٹھاتی۔ کوئی بے قرار ہو کر جلدی کرتا تو ہاتھ جلا لینا۔ اُس کے سُکھنے کی بات پوری کرنے کے لئے بات دوہرانے کی ضرورت ہے۔ وہ مہمان کے ہاتھ دھلاتی ہوئی ایک ہاتھ جگ کے دستے پر رکھتی اور دوسرا پیندے پر اور پانی اتنی دوری سے ڈالتی کہ چھینٹے نہ اُڑتے۔ ایک سے زیادہ مہمان ہوتے تو وہ ہاتھ دھلاتی اور میں تو لبیا پکرتا۔ میں تو لیے کا سرا بدلنا بھول جاتا تو وہ یاد کروانے میں کوتاہی نہ کرتی۔ اُس کی طبعِ سلیم! وہ ایسے موقعوں پر سُکھا بائن چھانٹ کر جلاتی اور گھر کو دھوئیں کے آزار سے پاک رکھتی۔ بالکن گیلا ہوتا اور دھواں پریشان کرتا تو اُدھر سے دھیان ہٹانے کے لئے وہ کہانی گھڑتی، جسے دھواں لگتا ہے وہ اپنی ساس کا جھیتا ہوتا ہے!“

اس بات کی تصویری معنویت! میں دھوئیں کی کھٹیں میں سُکون محسوس کرتا اور اُٹھ کر اُس طرف بیٹھ جاتا جدھر دھوئیں کا رُخ ہوتا۔

میں کسی کارن سکول سے جلدی لوٹ آتا اور اپنی روٹی ساتھ اُٹھا لاتا۔ وہ باسی روٹی، ماں مجھے کھانے نہ دیتی۔ وہ شگفتہ لہجے میں ترغیب دیتی، ”تو ہاتھ منہ دھو کر تازہ پانی کی بالٹی بھر لا، تب تک میں تیرے لئے ایک چائنی (چاند جیسی بڑی روٹی) سیک دیتی ہوں، مکھن سے کھا لینا۔“

چائنی ایسی لذیذ ہوتی تھی کہ بس! ماں روٹی پکانے میں اتنی ماہر تھی کہ اُس کی پکانی ہوئی عام روٹی مکیا (چندیا) کے عیب سے پاک ہوتی تھی اور پوری پھولتی تھی۔ اُس کے دہی کا تو کہنا ہی کیا تھا! وہ میرے دہی کا برتن اکو پرات میں اُلٹو تو پورا دہی چکا بند نکل آئے۔

سورن کور کا بیابا ہوا، ماں نے اُس جوڑے کو کھانے پر بلایا۔ دکن سنگھ کا ریگر آدمی تھا۔ اُس کے پتھر جیسے ہاتھوں کو کھانا قابلِ برداشت لگا۔ اُس نے روٹی سے نوالا توڑا، گول کیا، دال سے بھرا اور منہ میں رکھ لیا۔ وہ منظر دیدنی تھا! دکن سنگھ منہ اوپر کئے ہا ہا کرنے لگا اور بھاپ پھونکنے لگا۔ وہ چاہتا تو نوالا اُٹھو ک سکتا تھا لیکن اُس نے ایسا نہ کیا، اس طرح جب تک اُس نے نوالا حلق سے اُتارا، اُس کا نقشہ ہی بگڑ گیا۔

”بیٹا! تم اوپر کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس کی ہٹ سے متاثر ہو کر ماں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

اپنی غلطی چھپانے کے لئے اس نے پھر اوپر دیکھا اور کہا، ”چاچی! میں دیکھ رہا تھا کہ کاریگروں کا گھر اور چھت پر شہتیر اور بالے ان گھڑت!“

”جلدی میں ہر کام خراب ہوتا ہے، اسے پچھلے سال برسات میں بنایا تھا۔“ ماں نے مسکرا کر کہا۔

میری ماں سے دنگ تک پہلے ملے تھے۔ اس نے انہیں پیارے پیارے نام دے رکھے تھے۔ وہ انہیں بلاتی، ان سے باتیں کرتی تو لگتا جیسے وہ اپنوں سے محو کلام ہو۔ وہ ان کی بیماریوں کے علاج جانتی تھی، ان کی نفسیات پہنچتی تھی۔ کوئی بھینس کا بھن ہوتی تو وہ اس کا خاص خیال رکھتی، جو ہی اسے ساتواں ماس لگتا، وہ اسے چراگاہ میں بھیجنا بند کر دیتی۔ اس کے بچہ دینے، جیرا (اول نال) گرانے اور جیر سیٹنے تک وہ اسے آنکھوں کے سامنے رکھتی۔ بچہ دینے کے سوا ہمیں بعد تک وہ اسے سونٹھ، اجوائ اور گڑ کے کاڑھے پلاتی، پڑوں (موشی) کی دم سے نیچے اور باکھ سے اوپر کا جھٹہ، اور باکھ کو فینائل کے پانی سے دھوتی اور اسے ناک سے لے کر دم تک یوں پاک اور صاف رکھتی جیسے گھڑ دانی، رچہ کو۔ جب تک بھینس بوہی (بیوی) دیتی، وہ پاڑے کو بیٹ بھر کر پوچھنے دیتی، وہ کہتی تھی کہ اس پاڑے بیماری سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کی بات کی سچائی عین آزمائی ہوئی تھی۔ اس کی بھینسوں کے پاڑے مرتے نہ تھے اور تین چار سال میں جوان ہو کر طویل کی شان بن جاتے تھے۔ اس کی اس دودھ دینی کی بدولت کبھی یہ نوبت نہ آئی جب کہ بھینس کے آگے کرتی (کھائے یا بھینس کے مرے ہوئے بچے کا چمڑا جس میں بھوسا بھر کر بھینس کو دکھاتے ہیں اور دودھ دہتے ہیں) رکھنی پڑی ہو۔ ماں کی ہر گائے، بھینس برس یا دو تھی اور اس کے سارے موشی اس سے سدھالیوں کا سا برناؤ کرتے تھے اور آواز پر لگے ہوتے تھے۔ دودھ دوہنے کا وقت قریب آتا، بھینس دروازے کی طرف دیکھ کر آتی۔ ماں کو دیر ہو جاتی، وہ بیٹائل ہو کر کھوڑو کرتی کو یا زور شور سے دودھ دوہنے کی جیتاؤنی دیتی۔ ماں بالٹی لئے نمودار ہوتی، وہ شانت ہو کر جھگالی کرنے لگتی۔ اپنی دودھیل کا دودھ دوہنے کے لئے ماں کو نہ بانٹ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہی نیلے کی۔ (دنیا نا، وہ رتی جس سے شریر گائے، بھینس کی پھلی مانگیں باندھتے ہیں تاکہ وہ اپنے نہ جائے)۔ دودھیل کی آنکھوں میں وہ سنجیدگی ہوتی تھی جو بچے کو دودھ پلاتے وقت ماں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ اپنے تھنوں پر ہاتھ محسوس کرتے ہی دودھیل ذرا سی دم اٹھاتی اور مانگیں پھیل کر کھڑی ہو جاتی۔ ماں باکھ دھو کر اسے نہایت آواز لگاتی۔ ”لجھی!“ وہ گروں گھا کر ماں کو دیکھتی اور آتی۔ اس کی آواز کی نرمی اور نازکی کبھی کوہ کسی رعایت کی تمنائی ہے۔ وہ منہ کھولتی۔ ماں اسے دودھ کی دھار دیتی اور پھر دودھ دوہتی۔ لجھی باہیں چاٹی چاٹی جھگالی کرنے لگتی اور جب تک ماں پورا دودھ دوہ نہ لیتی۔ پاؤں نہ لیتی۔ ماں اسے تعجب کر جانے لگتی۔ وہ دم بٹاتی، تھوٹھنی جھٹکتی۔

کان جھکاتی، پہلو بدلتی اور پیاری پیاری، میٹھی میٹھی آوازیں نکالتی جیسے مزید دودھ دینا چاہتی ہو۔ ماں طویلے پاس سے گزرتی، موشی ادھر کان لگا کر اُس کی چاپ کو سننے اور اُڑاتے گویا اُسے بلارہے ہوں۔ ہر دودھیل ماں کے ہاتھ پڑی ہوئی تھی (ہاتھ پڑنا، دودھیل کا ایک ہی آدمی کو دودھ دینا اور کسی دوسرے کو پاس نہ آنے دینا، جس وجہ سے وہ کہیں مہمان نہ ہو سکتی تھی۔ کہیں ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی اور اُسے جانا ہی پڑتا، اُسے دن دودھیل کا سارا دودھ اُس کے بچے کو چونگھانا پڑتا۔

میری دادی کئی سال تک اندھی رہی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ کبڑی ہو کر جنین کی طرح سمیٹ کر رہتی تھی۔ اُس کی مزاج پُری بڑی بات ہے، بھائیاجی اُس بات نہ کرتے تھے۔ وہ اُسے دیکھ کر منہ بناتے جیسے اچانک کہیں درد اُٹھ پڑا ہو۔ اُن کی چاپ یا آواز پہچان کر اُس کے مُردہ چہرے پر زندگی دوڑ جاتی، افسردہ شکلوں میں خوشی ناچ اُٹھتی اور وہ بے ساختہ لہجے میں اُنہیں بلاتی لیکن وہ گونگے اور بہرے بنے رہتے، کبھی بات کرتے تو یوں ریزل! وہ حروف کو ایسے گھیٹتے کہ اُن کی طوالت اپنی لغوی رذالت سے کئی درجہ بڑھ جاتی۔ اِس کے باوجود اُن کے فطرتاً ذات کی تسلی نہ ہوتی اور وہ پورا زور لگا کر بولتے، ”جانے سے تو اُوکب مرے گی!“

میری دادی کا چہرہ ایٹھ کر نرم پڑتا جیسے چوٹ کھانے سے ہوتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں اُن روحانی رشتوں کو تازہ کرتی لگتی جو اُس کی زندگی کا حاصل تھے لیکن ایک طرف ہونے کی وجہ سے نامکمل تھے۔

اُن کی غیر ضروری برہمی پر حیران ہو کر تایا جی فکرمند سے کہتے، ”اِس کے پاس زبان نہ ہوتی تو اِس کی بے رحمی بے اندازہ ہوتی!“

ایک بار ایسا ہوا کہ بھائیاجی اپنی ماں کی چار پائی کے پاس کھڑے تھے۔ اُس کی مٹا کا اعجاز! اُس نے اپنی تاریکی میں اُن کی روشنی دیکھ لی اور اُٹھ کر ادھر چل پڑی لیکن پہلا قدم لیتے ہی گر پڑی۔ وہ منہ بناتے ہوئے اور خود کو سنبھالتے ہوئے وہاں سے اُچھل کر پرے ہٹے جیسے کسی غلاظت کی زد میں آ رہے تھے۔

دادی اتنی کمزور تھی کہ کر دٹ لیتے ہوئے اُس کی ہڈیاں ڈھیلی چار پائی کی طرح کھڑکھڑکتی تھیں اور وہ زرد سے کراہتی بھی تھی۔ بھائیاجی کی موجودگی کی خوشبو پاتے ہی اُس میں اتنی طاقت آجاتی کہ وہ چھرتی سے اُٹھتی اور صبر وہ کھڑے ہوتے ادھر منہ کر کے بیٹھ جاتی۔ وہ ایسے منہ کھولتی اور بند کرتی جیسے کوئی خوشی سے بات نہ کر سکے۔ وہ اپنی اندھی آنکھیں جھپکنے سے گریز کرتی جیسے اُس کی چشمِ نظارہ میں خلل پڑتا ہو۔ اُس کی ٹھٹھری آواز سے جذبات کی گرمی پھلکتی اور مرقعانی جلد کے نیچے سے تازگی پھلکتی۔ ایک بار اُس نے میرے بھائیاجی سے اپنی مٹا کا اظہار یوں کیا ”منیب! میں نے تجھے جنم دیا، تیرا گوہ موت اُٹھایا، تجھے بڑا کیا اِس لئے کہ...

”تو مجھے جنم نہ دیتی تو اور کیا کرتی؟ ساری عمر پیٹ میں لئے گھومتی، گوہ موت اِس لئے اُٹھایا کہ اُسے

گھر میں رکھنا ممکن نہ تھا۔ اور بڑا تو مجھے ہونا ہی تھا! اُسے کون روک سکتا تھا؟ انہوں نے اُس کی بات بچ میں کاٹ کر اپنی منطق بگھاری۔

اُن کے بے حس رویے پر دادی رونے لگی اور منہ پیٹنے لگی۔ وہ وہیں کھڑے رہے اور مسکراتے رہے جیسے اُس دردناک منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ وہ جب اپنی ماں سے مخاطب ہوتے، اُسے بڑھیا کہتے اور اکثر بڑھیا کہنے سے بھی گریز کرتے جیسے وہ حقیر شے بے نام بھی ہو۔ کئی بار اُن کا رویہ برف سے زیادہ ٹھنڈا اور پتھر سے زیادہ بے حس ہوتا۔

لیکن وہ اُمی گھر کی چار دیواری تھی جہاں زمین اور آسمان ملتے تھے۔

میری ماں میری دادی کی مالش کرتی، اُسے نہلاتی اور ممکن ہوتا تو اُس کا من بھاتا پکاتی۔ دادی کا پوپلا منہ ٹھوس غذا کھانے کے ناقابل تھا۔ ماں اُس کے لئے زیادہ تر گلتھی بناتی ورنہ روٹی شوربے میں مسل دیتی۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے سے روٹی، گلتھی ہی کی طرح نرم ہو جاتی۔ اپنے عناصر کی لڑائی میں میری دادی کو اعصاب پر اختیار نہ رہا تھا۔ وہ بستر پر چرک دیتی اور کبھی پیشاب کر دیتی، پھر اپنی ندامت چھپانے کے لئے میری ماں پر الزام لگاتی، تو وقت پر مجھے اٹھاتی بٹھاتی تو میں ایسا نہ کرتی۔! میری ماں اُس کی بے کسی سمجھتی اور جانی بوجھی تہمت کو نظر انداز کر کے مسکرا دیتی۔ وہ اُس کی دیکھ بھال نئے جتنے بچے کی ماند کرتی۔ اُسے تنہائی کے احساس سے بچانے کے لئے گاہے گاہے آواز دیتی، آتی جاتی اُس کی اور مٹھی دُرست کرتی، اُس کے پاس بیٹھتی، دوپٹے کے پھاہے سے اُس کی آنکھوں کو بچھا کر دیتی، آنکھیں صاف کرتی اور پاس سے اٹھ کر جاتی ہوئی اُس کے کال پر چٹکی بھرتی جیسے کوئی دودھ پیتے بچے کی دل داری کرتا ہے اور اُسے چپلیں کرنے پر اکساتا ہے۔

میری ماں اپنے کام سے کام رکھتی تھی اور لگائی لٹری سے اجتناب کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ بدگوئی بیکار ذہن کی اوباشی ہے۔ اُس کا یہ خیال تباہی کے خیال کا عکس ثانی تھا۔ وہ کہتے تھے۔ "کثرتِ حیات سے لطف اٹھانے کے لئے لازم ہے کہ انسان تنگ نظری اور کم ظرفی سے دور رہے۔"

میری ماں شاید ہی بیکار بیٹھتی اور کام نہ ہوتا تو کام ایجاد کر لیتی۔ وہ آناج سُکھاتی، آناج صاف کرتی، نمکدان ترتیب دیتی۔۔۔ اور کپڑے دُرست کرتی۔ اُس کی یہ خوبی کتنوں کے لئے بے ہودگی کا درجہ رکھتی تھی کہ وہ جھاڑی پونجی چیزوں کو پھر سے صاف کرنے لگتی ہے۔ ایک دن پُر بھی نے کہا۔ "میلو! میں تیری طرح صفائی نہیں کرتی پھر بھی میرا گھر ننگی سے پاک ہے۔"

ماں نے اُسے حیرت سے دیکھا اور کچھ دیر سوچ کر کہا، "پُر بھیئے! صفائی کرنے ہی سے گندگی آتی ہے"

پُر بھی میری ماں کی بات میں الجھ گئی اور کہنے لگی، "یہی تو میں کہتی ہوں!"

ہمارے گھر کے بھنڈار کی ترتیب قابلِ ذکر ہے۔ اُس چھوٹے سے کمرے میں ہر وہ چیز موجود تھی، جو روزمرہ کی ضرورت ہے جیسے گندم، جوار، باجرہ، چاول، پھلیاں، اسی، اگر، شکر، نمک، مریچ، سرسوں، ماش، ماش کی دال، مسور، مسور کی دال، پختے، پختے کی دال، اٹا، گھی... مطلوب مقدار کے مطابق مٹیوں، چاٹیوں اور کوزوں میں محفوظ تھا۔ سب سے بڑا برتن نیچے گھڑونچی پر تھا اور سب سے چھوٹا برتن اوپر برتن پر جس پر ڈھکن تھا۔ باقی کے برتن ایک دوسرے کا ڈھکن آپ تھے۔ اوپر سے نیچے بڑھتی ہوئی اور نیچے سے اوپر گھسی ہوئی تیل اپنی سچ دھج آپ تھی۔ اُس بھیڑ بھار میں سے کوئی چیز نکالی اتنی ہی آسان تھی جتنی شیش لکڑی تھی۔ اُس معنے کا حل وہ گھڑونچی تھی جو ایک کونے میں خالی رکھی رہتی تھی۔ اوپر سے برتن اٹھا کر گھڑونچی پر رکھو، مطلوب برتن تک پہنچو، جنس نکالو اور وہی سلک الٹی پھراؤ۔ وہ ترتیب و ترکیب اس قدر مکمل تھی کہ اُسے جان بوجھ کر بگاڑو تبھی بگڑتی تھی۔ نہ تو اُسے مزید سنوارنا ممکن تھا اور نہ ہی بگاڑنا۔ وہ کمرہ گھل سے لپکا پوتا تھا اس لئے اُس کی سجاوٹ سارے گھر سے الگ اور مقامی تھی۔ اُس ذخیرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُسے کیرنا نہ لگتا تھا۔ اُس کی روک تھام کے لئے ماں جیسے طریقے استعمال کرتی تھی، اُن کا ذکر بعد میں ہے۔ گندم اور چاول تھوڑے پرانے ہو جاتے تو وہ انہیں سکھا لیتی اور گھی مل دیتی۔ لیکن دالوں کے بارے میں وہ زیادہ احتیاط کرتی تھی، انہیں ہر ماہ سکھاتی تھی اور اُن میں لون کی ڈلیاں رکھتی تھی۔

کوئی اُگ لگاؤ عورت میری ماں کو میری دادی کے خلاف اُگساقت یا اُس کے بے اختیار رویے پر بھجوت کرتی تو ماں دُور کی کہتی، ”کل مجھے بھی بوڑھی ہونا ہے بہن! میں اپنی ماں کی سیوا کروں گی تو اپنی بیٹی سے امید رکھوں گی؟ اُس وقت میری ماں کی کوئی بھون تھی لیکن وہ آنے والی بھون کو بیٹی ہی سمجھتی تھی۔ وہ محبت اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی تو ماں اُسے سمجھاتی، ”بچے اور بوڑھے ایک سماں ہوتے ہیں! ان کی دیکھ بھال ایک ہی ذمہ داری سے ہوتی ہے۔“

دادی کی زندگی کے آخری دنوں میں میری ماں نے نرک بھوگا۔ وہ ہاتھوں اور پیروں اور سانسیوں گندگی میں رہی اور اُس جان لیوا سیوا کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی رہی۔ کسی نے اُس کے چہرے پر نہ کراہت دیکھی اور نہ زبان پر ر شکایت۔ دادی کے ساتھ اُس کا لگنا تار بہتر سے برتر سلوک اُس کی روح کی پاکیزگی کا آئینہ تھا جو کبھی نہ دھندلایا۔ میری دادی مری تو لکتوں نے میری ماں کو بدصالحی دی۔ ”میلو! تو پر سادہ چڑھا ا تجھے گلے گلے دکھ سے نکلتی ملی ہے۔ میلو، تو شکر کر! ست گرنے تیرے بندھن کاٹے اور سنکٹ مٹا ہے ہیں! لیکن میری ماں ایسے چھوٹ چھوٹ کر روتی جیسے اُس کا اپنا اکلوتا بچہ مَر گیا ہو۔“

آد میرے بھائی جی کی انتہائی دیا کاری کی بات سنئے۔ سب جانتے تھے کہ وہ اپنی ماں سے برا سلوک کرتے تھے اور اُس کے سائے تک سے دُور بھاگتے تھے لیکن وہ لوگوں سے کہتے پھرے۔ ”میری ماں نے آخری سانس میری گود میں لیا، عین اُس وقت جس وقت میں اُس کے منہ میں گنگا جل ڈال رہا تھا!“ انہوں نے اپنی جیب سے

دشمنوں نے پورے گروہ کو مار دیا۔ ”میری ماں نے مرث کال کے وقت وان دیا تھا۔“ یہ دکھاوا ان کی کم اصلی کی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے اپنی ماں کی راتھی پر سے بکھیر پھینکی، بچتا میں چندن کا ٹکڑا رکھا اور اُسے گائے کے گلی سے سلگایا۔ انہوں نے اُس کے بھولوں کو کیرت پور میں رسو آب کیا، اُس کی نجات کے لئے ہاتھ کرایا اور غریب غربا کو کھانا کھلایا۔

میں اس وقت تقریباً اسی حدی کے بعد اپنی کہانی لکھ رہا ہوں اور یادوں کے درپن میں اپنی ماں کو دیکھ رہا ہوں۔ میری آنکھیں اُس کی تمام جھریوں، تمام سلوٹوں، تمام مرنیوں میں اُس تر و تازگی کو تلاش کر رہی ہیں جو اُس کے جسم کی دلکشی تھی۔ وہ گداز ہونٹ، جن کے بوسوں میں مٹا کی گئی تھی، وہ خوبصورت ہاتھ، جن کی تھپکی میں لوریوں کی ترنگ تھی، وہ سڈول بازو، جن کے بھولے خوشی کی اڑان تھے، وہ سندر جہرہ جسے میں دیکھتا نہ تھکتا تھا، وہ بھرپور چھاتیاں، جن سے میں پسر پسر دودھ پیتا تھا اور پیٹ کی تسکین پڑاتا تھا! وہ تمام اعضاء، حیات آفریں اعضاء! ڈھینکروں کی طرح سوکھے ہوئے ہیں، الجھی اینٹوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں، پُرانے کپڑوں کی طرح چڑے ہوئے ہیں۔ میری ماں میرے بچپن کی چند حسین یادوں میں سے ایک تھی۔

اُفسوس! وہ بھی ایک طرح سے مسخ ہو گئی ہے۔

## باب ۶

میری ہستی ہے جسٹوئے تمام

اک یہی وقف مجھیں کیا کم ہے

(شاہ)

کہاوت ہے، سانپ کا بچہ پیویا ہوتا ہے، لیکن آدمی کے تعلق سے یہ کہاوت بالکل غلط ہے اور تباہی کا کہا درست، ”نباتات و حیوانات میں سے ایک آدمی ہی ہے جسے ترجیح جنس سے نسبت ہے۔“ میں ان کی فرانت کو اپنے طریقے سے بڑھاوا دے رہا ہوں۔ ”آدمی کا نشوونما وہ پیچیدہ عمل ہے جس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا، بھول کرنا ہے۔ یہ کسی وقت کسی بھی کا یا پلاٹ سکتا ہے اور اپنے بارے میں ساری پیشین گوئیاں رد کر سکتا ہے۔“

میرے جسمانی و روحانی نشیب و فراز میرے راہبر تھے، اس لئے میری زندگی میری ہی طرح پروان چڑھنے لگی۔ میں گھیلوں میں، کھیتوں میں، باغوں میں، چراگاؤں میں، گرنی میں، سردی میں، سوکھے میں، برسات میں،

اندھیرے میں، اُجالے میں... ایک لاکھوٹا، گروہ میں کھیلتا، کسی سے دوستی کرتا اور کسی سے دشمنی۔ بار بار نصیحت سُنے کے باوجود کچوری کرنا بڑی بات ہے، میں چوری کرتا، پنج نکلتا تو خوش ہوتا اور اپنی عیاری پر ناز کرتا، میں پکڑا جاتا تو مزایا تا، وقتی طور پر شرمندہ ہوتا اور مکرو فریب کے نئے طریقے سوچتا۔ جس کام سے مجھے روکا جاتا میں وہی کرنا کیوں کر میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے جس کا جاننا میرے لئے ضروری ہے۔ میں کسی فعل سے باز آتا تو وہ میرے تجربے کی ہدایت کا نتیجہ ہوتا نہ کہ دوسروں کی روک ٹوک کا۔ میں مویشی چراتا اور کاندھوں پر ڈنڈا رکھ کر بڑوں کی نقل اُتارتا اور انہیں کی طرح مویشیوں کو گالیاں دیتا۔ میں بڑوں کے بُوٹے پہن کر ٹھپ ٹھپ چلتا اور سوچتا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں، مجھے وہ سب کرنے کا حق ہے جو بڑے کرتے ہیں۔ میری خود پسندی اتنا باجی کی اخلاقی کہانیوں سے مجھے چروا ہوں کے خالق و ناجز قسے زندگی کے قریب اور بھر پور لگتے۔ میں انہیں زیادہ اہماک سے سُنتا اور اپنی نگرانی سے اپنی روانی میں تسلی پاتا۔ میں اُن فطری وجدانوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا جن کا مظاہرہ مجھ سے بڑے چروا ہے کرتے تھے۔ میں یہ بات پسند کرتا اور کبھی وہ، ہر جذبہ عارضی ہوتا اور ہر واقعہ وقتی۔ میری زندگی ایسی کُترتی تھی جو یہاں کچلی جاتی تو وہاں سر اٹھاتی، وہاں روندی جاتی تو وہاں اُبھرتی۔ میری ملاست میں میری ہسٹ تھی اور میری تعریف میں تحریک۔ مویشی چراتے ہوئے مجھے پانی پینا ہوتا تو میں ریت میں چھری لگاتا اُس میں پانی رسنے لگتا اور میں درانتی سے نرسل کاٹ کر ٹلکی بنانے لگتا۔ ٹلکی تیار ہونے پر میری بے صبری بڑھتی اور میں چھری پر بیٹھ کر سیڑھ کو بے چینی سے دیکھتا جو اپنے ساتھ ریت بہا کر لاتی اور چھری کا دائرہ بڑھاتی۔ میری بے چینی میں کھوج کا عنصر سما جاتا اور میں چھری کو غور سے دیکھتا۔ پانی پر ابرق کی نامعلوم سی نہ جی ہوتی۔ میری پیاس پر اُسرار طریقے سے بچھ جاتی اور میں اُن پہاڑوں کو دیکھتا جن پر سے ابرق ملی ریت بہہ کر آتی تھی۔ میں پہاڑ دیکھنے کی خواہش کرتا۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ اُس پہاڑ پر شیوہی پاروتی کا مندر ہے۔ پہاڑ کے پیچھے پہاڑ تھا اور اُس کے پیچھے پھر پہاڑ، وہ کس پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے تھے، میری سمجھ میں نہ آتا۔ میں اپنی جان کاری کے لئے پھر پوچھتا اور وہی جواب سُنتا جو سُنا آیا تھا۔ میری تحقیق پسند فطرت کی تسکین نہ ہوتی، میں کڑھ کر رہ جاتا لیکن میرا تجسس بدستور قائم رہتا۔ اُس تعلق سے میں کئی واقعات تفصیل سے بیان کر سکتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرے پڑھنے والے موضوع کی یکسانیت سے اُگتا جائیں گے، اس لئے میں ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

”تایاجی! وہ کیا ہیں؟“ میں لمبی قطار میں اُڑتے پاکھیوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھتا۔

”مہان پاکھی ہیں، گونجیں۔“ تایاجی آسمان پر دیکھ کر کہتے۔

”یہ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”ہمالہ سے پرے دور دیش سے۔“

”آپ پہلے کہتے تھے کہ ہمالہ سے پرے کوئی دیش نہیں ہے؟“  
 ”وہ میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔“

”آپ نے یوں ہی کیوں کہہ دیا تھا؟“

”کئی باتیں بچوں کو یوں ہی بھی بتائی جاتی ہیں۔“

”آپ مجھے یوں ہی کچھ نہ بتایا کریں، میں بچہ نہیں ہوں!“

میں دُشوک سے کہہ رہا ہوں کہ میری تحقیق طلبی میری سرگرائی رہی ہے، اُس کی شدت کچھ بھی ہو۔  
 جھری، پانی سے بھر جاتی۔ میں گھٹنے ٹیک کر جھری پر بٹھکتا اور نلکی پانی میں رکھتا۔ اُترق کی تہہ پٹی اور  
 جڑ جاتی جیسے اُس کے دُڑوں میں ہفتا طیس کی شش ہو۔ میں نلکی سے ہلکے ہلکے گھونٹ بھرتا، گہرا گھونٹ کھینچنے سے پرہیز  
 کرتا۔ اِس لئے کہ تیزی سے چڑھتا ہوا پانی اپنے ساتھ ریت سمیٹ لاتا۔ میں پھیکے شربت کا سا پانی پی کر منہ ستواتا، گھنٹوں  
 پر سے ریت جھاڑتا اور اپنے دُنگروں کو دیکھتا، وہ چرتے چرتے دُور نکل گئے ہوتے۔ میں اُن کی جانب بھاگتا، ہاتھوں  
 کو پَر پرواز کی طرح پھیلاتا اور اُڑنے کی تمنا کرتا ہوا اُپر اُچھلتا، زمین پر گرتا اور نئی تب و تاب سے اُٹھ کر شتر مرغ کی  
 طرح بھاگتا ہوا لگتا،

میں اُڑ کے گراں دے جاؤں

جسے کھنڈ بلد سے ہوں بزاریں

(اگر پر پرواز بازار میں ملتے ہوں تو میں اُڑ کر گرو کے پاس چلا جاؤں،

میرا شوق مجھے آسمان پر اُڑاتا جو عملی طور پر میری پہنچ سے باہر تھا۔ میں نخیل و عمل سے یکساں مرغوب  
 تھا۔ دونوں خوبصورت تھے لیکن تایاجی کی ذراست میں الگ الگ معنی رکھتے تھے۔ پہلا دست بیزاری تھا اور دوسرا  
 دست کاری۔ میں روایتی سکول سے دُور تھا لیکن میری معلومات تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ تایاجی ٹھیک کہتے تھے،  
 ”زندگی سب سے بڑا مدرسہ ہے اِس لئے کہ علم کی تجربہ گاہ ہے۔“

اُن کی باتوں کی سچائی میں بارہا آزمایا چکا تھا۔ ایک چھوٹا سا تجربہ بیان کرتا ہوں کیوں کہ اُسے کئی طرح سے  
 دوہرایا گیا تھا۔ ہماری تحسین منسی نے اپنی زنجیر کھولنے کا فن سیکھ لیا۔ ہر کسی کو تا کی دھکی کر دُمنسی کو باندھتے ہوئے زنجیر  
 کو دوہرا لگاواں دے لیکن منسی کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہو گئی اور دوہرا لگاواں بھی کھولنے لگی۔ بھایاجی نے ایسا کھٹا گاڑا  
 جس کے سر پر دو شاخہ تھا اور زنجیر کو تالا لگا دیا۔ پہلی مصیبت دُور ہوتے ہی دوسری آپڑی، تالے کی چابی گم ہو گئی  
 اور تالا توڑنا پڑا۔ بھایاجی نے ایک تھم گاڑا جس کی اُونچائی منسی کے سر سے اُونچی رکھی۔ وہ شریر زنجیر دھیلی کر لیتی  
 لیکن اُسے اُٹھا کر تھم سے باہر نہ نکال سکتی۔ اُس سے یہ دشواری پیدا ہوئی کہ پیچھے اُسے تھم سے نہ کھول سکتے اور نہ



باندھ سکتے۔ تایاچی نے اس مشکل کا فنی حل نکالا اور زنجیر کے کُنڈے میں مزید آنکڑا ڈال دیا جو خود بخود مقفل ہوتا تھا لیکن دبائے سے کھلتا تھا۔

کالے ام کے پاس دھبی میں بھڑوں کے چھتے تھے۔ وہ بیساکھیں پرانے چھتے چھوڑ کر نئے چھتے بنائیں اور آندے دیتیں۔ جوان بھڑیں پیدا ہوتے ہی بندر ہوتیں اور پاس سے گزرنے والوں پر چلے کرتیں۔ ماگھ میں ان کا رنگ بدلتا اور وہ سُست اور تھکی ماندی لگتیں۔ پوس میں ان کے پیچھے موٹے ہو جاتے، دُنگ گر جاتے اور وہ کھلے کھلانے لگتے میں انہیں پکڑتا، ان کی کمر میں دھاگا باندھتا اور کیسوں کو ایک ساتھ اڑاتا اور خوش ہوتا۔

میں نے کب اور کیسے تیرنا سیکھا! یہ بتانا مشکل ہے کیوں کہ میں نے جب سے ہاتھ پتیر نکالے تھے، پانی سے میری فطری دوستی تھی۔ کڑا کے کی سردی ہو یا بھلساتی گرمی، غسل کرنا معمولِ سحر تھا ورنہ ماں سحری نہ دیتی تھی۔ میں جاڑے میں آب جو میں ڈھم (آب جو میں تالاب) میں نہاتا یا کُنویں پر۔ ڈھم کا گہرا پانی آب جو کے بہتے پتلے پانی سے گرم ہوتا لیکن کُنویں پر نہانے کا مزہ ہی اور تھا۔ کُنویں کا پانی قضا کے مقابلے میں گرم ہوتا، گیلے بدن سے بھاپ کے مڑوٹے اٹھتے جو ایک منظر ہوتے۔ جس کسی نے برفیلی سردی میں کُنویں پر تازہ پانی سے نہایا ہے اُسی نے وہ لطف اٹھایا ہے۔ پانی کا پہلا ڈول ڈالنے سے پہلے جو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ رہتی ہے وہی ایک ناگوار صورتِ حال ہے، پھر توجی چاہتا ہے کہ نہاتے جاؤ اور نہاتے جاؤ۔ میں گرمی میں آب جو میں نہانا پسند کرتا تھا۔ یہاں نہانا اول سے آخر تک مسرت تھا۔ میں پہلے کوئی خوبصورت مقام چُنتا، کپڑے اتار کر کنارے پر رکھتا اور پتلے بہتے پانی میں گرکھا کھوتا۔ میرے گرکھا کھونے کا انداز خوش طبعی تھا۔ میں ایک جگہ پر ناچتا، ناچتا اور ناچتا۔ ریت پانی میں گھل کر بہتی، میرے ناچ کی تال بدلتی جو گرکھے کی بڑھتی ہوئی گہرائی کا سراغ دیتی۔ ایک مخصوص تال سُنتے ہی میں ناچنا بند کرتا اور گرکھے سے باہر نکل کر کھڑا ہو جاتا اور گدے پانی کو دیکھتا۔ وہ جس طرح خود کو نکھارتا، اُسے دیکھ کر میں نہایت لطیف انداز میں سوچتا کہ فطرت میں ہر چیز اپنے آپ کو سنوارنے میں مصروف ہے۔

تایاچی مناظرِ فطرت سے لطف اٹھاتے ہوئے کہتے تھے، ”فطرت رنگارنگ کارواں کی طرح رواں دواں ہے، جس کا سب سے بڑا ناظر، کسان ہے۔“

ہمارے گھر سے دو اڑھائی سو گز کے فاصلے پر ہریاد شام چوراسی سڑک تھی۔ میں اُدھر مویشی چراپانسند کرتا تھا۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اُدھر صاف ستھرے لوگ دیکھائی دیتے تھے جو ہریاد کو جاتے آتے رہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اُدھر بیلا تھا اس لئے موڑی (دنگروں کو اُدھر اُدھر بھٹکنے سے روکنا) کم لگانی پڑتی تھی، سڑک کے پار دیوبی دولا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ دولا اُس گاؤں کا تھا جو ڈوبیا نہ لگاں آباد ہونے سے پہلے، کون جانے کب؟ برباد ہوا تھا۔ اُس دوالے میں صرف باوے جاتے تھے لیکن گاؤں والے اُس کے اطراف کی ہر شے کو متبرک سمجھتے تھے۔

اُس کے تالاب میں اتنی مچھلیاں تھیں کہ کوئی ماپ لے تالاب میں اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے بورا بھر لے لیکن لوگ اُن کو جلائی مچھلیاں کہتے تھے اس لئے پکڑتے نہ تھے۔ ادھر سب سے پر اُسرار چیز ست رکھا تھا جس پر اُم، جامن، کھنور، میری، گونا، بڑ اور پیسل پھلتے تھے۔ اُس کے پھلوں کو لوگ پر ساد مانتے تھے لیکن اوپر سے توڑتے نہ تھے اور گرا ہوا ہی اٹھا کر کھاتے تھے بڑے بڑے کہتے تھے کہ وہ انوکھا درخت کوڑو، پانڈو کے زمانے سے ہے اور بھگوان کرشن کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ پانڈو کے اکیات باس (پانڈو کے بن بانا کا تیرھواں سال جو انہوں نے چھپ کر گزارا تھا) میں وہ وہاں اُم کھا رہے تھے۔ اُم جتنے سندر تھے اُس سے زیادہ میٹھے! دروپدی کے دل میں خیال آیا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ اُم میری کرشن بھی کھاتے! اور کرشن آپدھاسے اور اپنا حصہ مانگ کر کھانے لگے۔ دروپدی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”سرب کامی! اُم کیسے ہیں؟“

”بہت اچھے ہیں! ایک پھل میں سات پھلوں کا سواہ ہے!“ بھگوان کرشن نے خوش ہو کر کہا اُد جو اُم کھایا تھا اُس کی گٹھلی کو بودیا اور گنگامیتا کو آواز دے کر کہا۔ ”گنگامیتا! ہم ست رکھا بورہے ہیں، اسے ہرا رکھنا!“ اور گنگامیتا نے پرگھٹ ہو کر وعدہ کیا، ”بھگوان، تیری مرضی میری خوشی ہے!“ اُسی دن سے وہاں گنگا بہنے لگی۔ پنج دہائی دھو شیار پور اور اُس کے اوپر ترانی کا علاقہ، کی رانی کو پتا چلا تو اُس نے دہاں دولا اور گھاٹ بنوا دیا۔ وہ ہر پورنیا کو وہاں اشنان کرنے آتی تھی اور دوالے میں پوجا کر کے جاتی تھی۔

ایک بار برسات میں آبِ جو نے پیٹا بدلا اور ست رکھے کی جانب کھا لگا دی۔ بادے کندن نے آواہ پھیلا دی کہ گنگامیتا، ست رکھے کے پاؤں پونے کے لئے آگے بڑھ رہی ہے لیکن گنگامیتا نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ”تایا جی کہتے تھے،“ جذبہ پریش کی نفسیات عجیب ہے۔ یہ اپنے عمل کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے خدا کو قربانی کا بکرا بناتا ہے۔“

دُہی بات ہوئی، لوگ کہنے لگے کہ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔

اُس زمانے کو گزرے ہوئے زمانہ ہوا ہے لیکن اُس کے پل جین ذہن میں ایسے آرہے ہیں جیسے غنچے کھل کر مکتے لگیں۔ میری یادوں کی کارفرمائی! میں اُن جگہوں کی سیر کرتا ہوں جو وقت کے جاگرت (جگن ناتھ مندر) کا رہ، جس کے بارے میں روایت ہے کہ اُس کے نیچے اگر مرنے سے ممکتی ملتی ہے، نے روند ڈالی ہیں۔ میں اُن چروا کو دیکھتا ہوں جو مٹ کر مٹی ہو گئے ہیں۔ میرے قارئین شاید حیران ہوں! میں اُن ناپائیدار مناظر کو بھی دیکھتا ہوں جو دیکھتے دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتے تھے اور اپنی ہر بناوٹ میں پہلے سے زیادہ دل فریب لگتے تھے۔ وہ جن جاں گداز یوں کو جنم دیتے تھے، وہ اس وقت بھی میری رگوں کا بھرنا ہوا حصہ ہیں۔

کبھی کبھی چوپال میں نقال آتے اور نقالی کرتے۔

ماں گئی ہے  
راگ لیا ہے گی  
چھک چھن نن نن ۔

وہ یہ تینوں مصرعے دوہراتے اور دوہراتے اور میزاری کی حد تک دوہراتے۔ اُن کا ایک آدمی  
تماش بینوں میں بیٹھا ہوتا، وہ اُٹھ کر اُن کو گالی دیتا، ”حرام زادو، پھر آگے کیا ہوا؟“  
نقالوں کی منڈلی اُسی موقع کی تاک میں ہوتی۔ اُن کا اُگو آگے بڑھتا اور منہ لٹکا کر کہتا۔ ”چوہ بھری جی،  
ماں گئی ہے۔ اتنی نہیں! وہ آئے گی تو راگ لائے گی“ یہ کہہ کر وہ بندر کی طرح پیٹوسی لگا کر اپنی منڈلی میں جا ملتا اور  
چھک چھن نن نن کی رٹ پھر سے شروع کر دیتا۔

اُن کو دیکھنے سے لگتا کہ وہ مستی میں بے خبر ناچ رہے ہیں لیکن کوئی بیل دینے کے لئے جیب میں  
ہاتھ ڈالتا تو وہ اُس کا جائزہ ایسے لیتے جیسے گدھ مُردار کو دیکھ لیتے ہیں، خواہ کوسوں کی دُوری پر ہو۔  
”تیرا نام؟“ نقالوں میں سے ایک نقال تھانے دار بن جاتا اور وہ کسی دوسرے کے چوتھوں پر  
پھٹا ہوا بانس مار کر پوچھتا جو زور سے آواز پیدا کرتا۔

”جوگا جناب!“ وہ عاجزی سے جھک جاتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔  
”تیرے باپ کا نام؟“

”جوگا جناب!“

”تیرے باپ کے باپ کا نام؟“

”جوگا جناب!“

”تیرے باپ کے باپ کے باپ کا نام؟“

”جوگا جناب“

”تیرے باپ ...“

”جوگا، جوگا، جوگا جناب!“

تھانیدار پریشان اور گھبرایا ہوا کہتا۔ ”ہماری سمجھ میں نہیں آیا“

”اُس میں سمجھنے کی کیا بات ہے جناب؟ جیسے گدھے کا بیٹا گدھا، جوگے کا بیٹا جوگا!“

گوگا پیر کے تیوہار پر ماں سوتیاں بناتی۔ رنگ برنگی جو سوتیاں وہ گھڑے کے پیندے کی مدد سے  
بناتی اور سادہ سوتیاں گھوڑی سے جو سوتیاں بنانے کے لئے یس ماں کی نقل کرتا لیکن ویسی نہ بنا سکتا۔ میری کوشش

کا نتیجہ میدے کے بد نماوندے ہوتے تھے۔ ماں میدے کے گولے سے لمبی ڈوری بناتی، اُسے کھتے ہاتھ میں پکڑتی، پھر انگوٹھے اور انگشت شہادت اور بڑی انگلی اور، تھیلی کی مدد سے اُسے آگے سبجے ہاتھ کی طرف وقفے وقفے سے ایسے سرکاتی کہ ہر بار اُس کی پٹی لمبی لمبائی ہی آگے بڑھتی۔ وہ اُسے انگوٹھے اور بڑی انگلی سے توڑتی مڑتی اور نیچے چھانچ میں گراتی۔ اُس کی سوتیاں ایک جیسی لمبی، ایک جیسی موٹی اور ایک جیسی بِل دار ہوتیں۔ میں کوشش پر کوشش کرتا لیکن وہ نہ کر سکتا جو کرنا چاہتا۔ ماں گھوڑی دیر تک مجھے برداشت کرتی اور پھر مجھ سے اٹھا چھین لیتی۔ میں کڑھ کر رہ جاتا۔ وہ میرے دل بہلاوے کے لئے مجھے ترغیب دیتی، ”جو سوتیاں بنانی سیکھنی ہیں تو پہلے چٹسکی بجانا سیکھ، یوں! وہ چٹسکی بجا کر دکھاتی۔ میں نے چٹسکی بجانا سیکھ لی لیکن میں جو سوتیاں بنانے میں ناکام رہا۔ میں اپنے اور ماں کے عمل کا تجزیہ کیسے کروں؟ میرے عمل کا حاصل چٹسکی تھی اور ماں کے عمل کا حاصل سوتیں۔

ماں گھوڑی پر سوتیاں بناتی تو میں خوش ہوتا کیوں کہ اُسے میری مدد درکار ہوتی۔ میں بھاگ بھاگ کر زمین پر چادریں بچھاتا، ان پر چار پائیاں اُلٹی رکھتا، پالیوں کو عمودی، متوازی، قطری رسیاں کس کر باندھتا لیکن ماں ہدایت پر ہدایت کرتی جاتی، ”رستی کس کر باندھ!“

”ہاں ماں! میں رستی کس کر ہی باندھ رہا ہوں۔“ میں رستی کو تنکا مار کر اُس کی جانچ کرتا اور وثوق سے کہتا۔  
”اور کس کر باندھ کر!“ وہ اٹھ اٹھتی ہوئی دُور سے دیکھ کر کہتی جیسے اُس کی نظریں میرے ہاتھوں سے زیادہ مشتاق اور بھروسے مند ہوں۔

میں رستی کھولتا اور اپنا پاؤں پائے کے مقابل رکھ کر زور لگاتا اور رستی کستا۔ ماں دیکھتی اور تنویش بھرے لہجے میں کہتی، ”بس! بس! پایہ ٹوٹ جائے گا۔“

اُس کی نکتہ چینی سے مجھے لگتا کہ چھوٹے جو کرتے ہیں اُس میں نقص نکالنا بڑوں کی عادت ہے۔  
میں کالا لگاتا تو ماں گھوڑی چلاتی اور میں گھوڑی چلاتا تو وہ کالا لگاتی جو کالا لگاتا وہی سوتیاں توڑ کر پھیلاتا میری سوتیاں توڑنے کی باری ہوتی تو میں لمبے سے لمبا تار نکالتا لیکن ماں مجھے روکتی، ”زیادہ لمبا تار مت نکال، سوتیاں توڑ کر ہی کھانی ہیں۔“ اُس کی بات درست ہوتی لیکن مجھے بُری لگتی کیوں کہ اُس سے میری میٹھی ہوتی۔ علاوہ ازیں سوتیوں کے لمبے تار مجھے بھلے لگتے تھے۔ جب میں بڑوں کے ساتھ ہوتا، عجیب کش مکش میں مبتلا رہتا۔ کوئی موقع ایسا نہ ہوتا جب میری کارگزاری پر حملہ نہ ہوتا۔ میں چوہا چلانے کے لئے گھاس چھوس لاتا تو بھی مجھے بُرا بھلا سُنا پڑتا۔ اتنے سارے چھوس سے تین بار چوہا جلے گا! ماں اُس میں سے دو تہائی چھوس نکال کر الگ، بکھدیتی اور کہتی، جاؤ، اسے وہیں رکھ دو!

ایک بار ماں نے مجھے چوہا مسلگانے کو کہا۔ میں نے چوہے میں پُرال ڈالی، اُس پر لکڑیوں کا بھیلنا لگایا، مٹی کا تیل ڈالا اور دیاسلانی سے جلادیا۔ میری کارگیری بھائی جی نے دیکھ لی۔ وہ چپکے سے میرے پاس آئے اور مجھے ٹانگوں سے اٹھا کر چوہے میں جھونک دیا۔ میں خوف سے دباڑا، جیسے کیسے اُن کی پکڑ سے چھوٹا، بھاگا اور جا کر ماں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے گالیاں دیتے ہوئے کہا، ”تُو نے جو کیا ہے اُس سے مجھے اتنا دکھ پہنچا ہے۔“

گوگا پیر کی چھڑی ایک عجیب چیز تھی۔ ہتر موٹے لمبے باس کو دودھ سے نہلاتے اور اُسے چھڑی مبارک کہتے۔ وہ چھڑی پر جو گیا غلاف چڑھاتے اور پھر اُس سے جو شے باندھتے اُس کے ساتھ مبارک کی افست لگاتے جاتے۔ وہ چھڑی کے پتلے سرے پر مور کے پنکھوں کا مٹ سجاتے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کلیرے (کلاوے) میں پروئے ہوئے کھوپرے اور کوڑیوں کے ہار (باندھتے اور پنج پنج میں رنگ رنگے رومال) چھڑی کو سجادہ سجا کر وہ اُسے کسی درخت کے سہارے کھڑی کر دیتے اور باری باری پوست ملتے، جو پہلے سے باس میں بھگو یا ہوا ہوتا۔ وہ پوست ملتے ہوئے گاتے۔

پوستا وے دل دوستا وے

تیرا سونے چے ٹھہا داں بوٹا،

سو سوتوں دودھ گلاں تیریاں

لکھ لکھ توں دودھ جھوٹا،

(اے پوست، تُو میرا دل دوست ہے۔ تیرے گنوں کے صدقے! میں چاہتا ہوں کہ تیرے

بوٹے کو سونے کا غلاف پہناؤں۔ تیری بات کرنا تیرے گنوں کو کم کرنا ہے۔ تجھے پی کر جو

جھوٹا آتا ہے اُس کی قیمت لاکھوں سے بڑھ کر ہے)

مکمل کے کپڑے میں وہ پوست چھانتے، ٹوٹرو میں میٹھا ملا کر بانٹ کر کھاتے اور پھر رس پیتے۔ بڑے سائے میں لیٹ جاتے اور جوں ہی بینک محسوس کرتے، اٹھتے، گونگے کی جے بلاتے اور گاؤں کا رخ کرتے۔ ایک پہلوان قسم کا آدمی گونگا کی چھڑی کو اٹھا کر گونگھی (کر کے گرد باندھنے کا پنکا، جس میں جیب ہو) میں رکھ لیتا اور اپنے ٹولے کے آگے آگے چلتا۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ ایک کے بعد ایک گھر میں جاتے، گونگا کا قصیدہ گاتے اور خیر مانگتے۔ عقیدت مند خیرات دیتے اور چھڑی کو منّت کی ڈوری باندھتے اور سجدہ کرتے۔ پیڑوں کا بیٹا مہندی اتنا دہلا، پتلا اور لمبا تھا کہ پا جامہ پہنے ہوتا تو پا بانسوں پر چلتا لگتا۔ باپ اور بیٹا ساتھ ساتھ کھڑے ہوتے تو باپ اپنے بیٹے کی ناف سے کچھ ہی اوپر پہنچتا۔ مہندی جتنا باسرا تھا، پیڑو اتنا ہی بے سرا۔ اُسے عادت تھی

کہ وہ گاتا ہوا ہندی کے منہ کی طرف دیکھتا تھا۔ اُن کی بے جوڑ جھکی بندی میں یوں لگتا، گیت کے بول ہندی کے منہ سے پیرو کے خلق میں گر رہے ہیں اور وہ انہیں ننگلے کے بدلے اُگل رہا ہے۔ اُن کے مختصر سے ساز کا نئے کی کٹوریاں ہوتے تھے، جنہیں وہ، تھیلیوں پر رکھ کر لوہے کی سلائیوں سے بجاتے تھے۔

ویسے تو گو کا پیر دھرتی پر پیدا ہوا تھا لیکن اُس سے منسوب کرامات آسمانی تھیں۔

فصل پکنے کے قریب آتی تو ہریا ز سے برہمن آئے اور کھیتوں میں کُشار رکھتے پھرتے۔ کُشا ایک قسم کی گھاس ہے، جس کے بارے میں کہات ہے کہ اُس گھاس سے لو کا بھائی کُش پیدا ہوا تھا۔ اِس لئے اُس میں کسی بھی چیز کا حاصل بڑھانے کی شکست ہے۔ جب کھلیاں تیار ہوتے، برہمن اپنا حصہ لینے کے لئے آتے روایات کی فرہنگ میں کچھ نمبروں کو مبارک اور کچھ کو نامبارک سمجھا جاتا تھا۔ مبارک نمبر بار بار بولا جاتا تھا اور نامبارک کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ایک کو 'برکت' بولا جاتا تھا، دو کو دو، تین کو 'زائد' اور چار سے لے کر بارہ تک کے نمبروں کے توں، تیرہ کو بار بار دوہرایا جاتا تھا۔ تیرہ نمبر کو پوری دُنیا نامبارک مانتی ہے لیکن رکھ اسے مبارک خیال کرتے ہیں۔ اِس کے بارے میں مشہور ہے کہ جب گرو نانک سلطان لودھی کے ذخیرہ خانے میں نوکر تھے، انہوں نے تیرہ، تیرہ، تیرہ کرتے ہوئے اناج کا پورا بھنڈا غریب غراب میں بانٹ دیا تھا اور پھر جب اُس کی جانچ پڑتال ہوئی تھی تو اناج حساب کے مطابق پایا گیا تھا۔

تایاجی ایسے ہر خیال اور بات کا کھنڈن کرتے تھے جو روایات و کرامات کی تائید کرتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ایک بار میرے پاس دھن راج باسن آیا اور کھیتوں میں کُشار رکھنے کا انعام مانگنے لگا۔ میں نے کہا، پرہت جی میری فضل کا حامل میرے لحاظ سے بچاں میں کم ہوا ہے۔ ایک بار پھر کُشا رکھو، منتر پڑھو، گھاٹا پورا کرو اور انعام لے جاؤ۔ "منہ دار جی، ایسے کیسے ہو سکتا ہے!" اُس نے کہا۔

"پرہت جی، پھر ویسے کیسے ہو سکتا ہے!" میں نے پوچھا۔

"آپ بڑے ادھر ہی ہیں! دھرم پتا (خدا) آپ کو دُند دے گا!" اُس نے مرآپ دیا۔

"پرہت جی! اِس سے پہلے کہ آپ کا دھرم پتا، مجھے دُند دے۔ میں نے آپ کو دے دیا ہے۔

دُست گیر نیچے، باپ کی مصیبت میں برابر کے حصے دار ہوتے ہیں۔ میں نے اُسے زندگی کا راز سمجھایا۔

ادھام پرستی کے گھوڑا اندھیرے میں کسی کے پاس اپنی روشنی تھی تو وہ تایاجی تھے۔ بھگدڑ کے خلاف چلنے میں کچلے جانے کا یقین ہے لیکن وہ چلتے تھے اور اپنے اکیلے ہونے کو خن بجا نب قرار دیتے تھے۔

سوچے بوجھے گیانی ہوئے ۛ اپنا آپ بچھانے سوئے

(سوچ سمجھ کر کام کرنے والا گیانی ہوتا ہے اور دُہی اپنی حقیقت کو پہچانتا ہے)

انسان کی کاوش تلاش کو وہ یوں بیان کرتے تھے۔ ”فطرت کائنات میں جو تخلیقی اُنفل ہے، وہ فطرتِ انسان کا تحقیقی عمل ہے۔ پہلے میں زمانی ولا زمانی اصلیت کے اسرار میں اور دوسرے میں زمانی ولا زمانی حقیقت کے مظاہر۔ یہ دونوں متوازی قوتیں ہیں جو صرف اپنے نقطہ کمال پر ملتی ہیں اور پھر الگ ہو جاتی ہیں۔“

تایاجی کی آزادہ روی اور لوگوں کی تنگ نظری یوں تھی جیسے اندھیرے کے ساتھ اُجالا۔ میں ادھر کھینچتا اور کبھی ادھر۔ اُن کی باتوں میں تصور کا عنصر بالکل نہ تھا لیکن میری محرمیوں نے مجھے تصور کا شیدائی بنا رکھا تھا میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین تھا لیکن اُس ماحول میں ذہانت کو ایسے دخل تھا جیسے چوہے میں پانی کو۔ وہاں جو طاقتور تھا وہی ذہین تھا، وہی خوبصورت تھا، وہی شریف تھا۔ ایک طاقتوری ہزاروں خوبوں پر بھاری تھی۔ لوگ جہاں بیٹھے تھے، وہاں بہادروں اور جانباڑوں کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے ساکھ اور نرم نامے بچوں اور فداؤں میں سازوں پر گائے جاتے تھے۔ سننے والے بیرس سے سرشار جے کارے ہلاتے جیسے اُن تاریخی بہادروں کی ظہریابی اُن کی ذاتی کامیابی ہو۔ ایسے اثر انگیز ماحول سے متاثر ہو کر تایاجی پہلے انسانی زندگی کو شارتر بنا کے لحاظ سے بیان کرتے اور پھر اپنے طریقے سے۔ شاستروں کے لحاظ سے زندگی نورسوں سے تعبیر کی گئی ہے۔

۱	شنگار رس	جذبہ جو آرائش ذات کی تحریک ہو۔
۲	ہاسیہ رس	جذبہ جو ہنسی کی تحریک ہو۔
۳	کردن رس	جذبہ جو جرم و کرم کی تحریک ہو۔
۴	رودھ رس	جذبہ جو قتل و غارت کی تحریک ہو۔
۵	بیرس رس	جذبہ جو ظلم سے لڑنے کی تحریک ہو۔
۶	بھیانک رس	جذبہ جو بھے کی تحریک ہو۔
۷	ادبھوت رس	جذبہ جو آہنہ کی تحریک ہو۔
۸	بیجھتیا رس	جذبہ جو کسی سے نفرت کی تحریک ہو۔
۹	شانتی رس	جذبہ جو شانتی کی تحریک ہو۔

وہ عمل جو جذبہ رواداری سے عبارت ہو، تایاجی اُسے بھی شنگار رس کہتے تھے۔ ”اپنی بے ضبط طاقت کی مہم آزمائی اور اُس سے لطف اُٹھانے کی خاطر انسان نے کھیل کود ایجاد کئے ہیں۔ کھیل کود ایسا ہنر ہے جو بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔“

میں بیرس کو پسند کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایشور سنگھ مجھے دیکھ کر کہتا تھا، ”کاکا، تیرے میں کچھ ماہست دم خم، نہیں ہے، تو بڑا ہو کر کیا کرے گا، اپنی ماں سے بول کر تجھے کھلایا پلایا کرے ورنہ

تیشے کھارے کی جگہ کاسر پکڑنا پڑے گا۔

میں طاقتور اور جاننا زبنا چاہتا تھا۔ میں تیل ماش اور کسرت کرنے لگا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑا تو میں دودھ گھی چرا کر کھانے لگا۔ چوں کہ میں اعتدال پسندی سے ناواقف تھا، میں بدہضمی کا شکار رہنے لگا اور میری صحت گرنے لگی۔ آخر ماں نے میری چوری پکڑ لی۔ اُس نے مجھے سزا دی اور کھانے میں اعتدال برتنے کی نصیحت کی۔ ”زیادہ کھانے سے آدمی تکرنا نہیں ہوتا۔ جتنا کھاؤ، اتنا بچاؤ اور پھر کھاؤ، نہ کہ کملے کی طرح کھاتے رہو اور ساتھ ساتھ بگتے رہو۔“

تیا جی نے اپنے انداز میں سمجھایا، ”بڑھی ماں انسان، بلوان سے زیادہ بلوان ہوتا ہے کیوں کہ یہ اپنے بل کو وگیا تک طریقے سے بڑھالیتا ہے۔ اپنے سہائے کے لئے اس نے ہل بنایا اور اکیلا کئی معروف ہاتھوں کا کام کرنے لگا۔ تم بڑے ہو کر وگیاں پڑھنا، ہنر سیکھنا اور مورکھ بلوان کو اپنے دھنگ سے کچھاڑنا۔“

ماں اور تیا جی کی بات درست تھی لیکن انسان ایسی محو بالذات طاقت ہے جسے بیوقوفی اثر سے متاثر کرنا نہایت مشکل کام ہے۔

ایشر سنگھ کے سارے لڑکے بہتے کتے تھے اور میرے میلانِ خاطر پر پورے اترتے تھے۔ میں اُن کے رہنے پہنے کے طور طریقے غور سے دیکھتا اور اُن پر عمل پیرا ہونا چاہتا تاکہ اُن جیسا بن سکوں۔ اُن کے اور ہمارے رہن سہن میں ایک ہی نمایاں فرق تھا، وہ زیادہ تر پیازوں کی ترکاری کے ساتھ کھانے پکھانے تھے۔ میں نے اُن کے ہٹا کٹا ہونے کا راز پایا اور ماں سے ویسی ہی روٹی اور ترکاری بنانے کو کہا۔ اُس نے مجھے بھجھایا لیکن میں نے ضد کی اور اُسے ویسی روٹی اور ترکاری بناتے ہی بنی۔ میں اپنے معمول سے چار گنا زیادہ کھا گیا لیکن بھوکے کا بھوکا رہا۔ اُس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کوسا اور چوکے سے اٹھا دیا اور پھر بھول کر بھی ویسا کھانا نہ بنایا۔ میرے تعجب نے مجھے عبادات و مناجات کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ میں بھیت یاد کرنے لگا اور وقت بے وقت گانے لگا لیکن میں جہانی اعتبار سے وہی رہا جو کہ تھا۔

جسٹا سنگھ کی وارتا (رزئیہ) بڑی جوشیلی تھی، مجھے سنتے ہی یاد ہو گئی۔ میں وارٹا گاتا ہوا غمخوس کرتا تھا۔ میں جسٹا سنگھ ثانی ہوں جسے بھگوان نے دشمنوں کا صفایا کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔

سنت گرجن سنگھ بھگتی رس کو سب رسوں سے اتم مانتا تھا اور دن رات بھگوان کا نام جپا کرتا تھا۔ تیا جی اُس سے کہتے تھے، ”گرجن رسیاں، کوئی کام کیا کر! کلام میں سرب رس ہیں۔“

تیا جی کہتے تھے، ”شنگار رس، سرب رس ہے اور علم و ہنر اس کی اعلیٰ ترین صورتیں ہیں۔ جنم کے وقت بچے کی جات دیکھتے ہیں، پھر جھت اور پھر صورت، بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے، اُس کی عقل کی



اہمیت بڑھنے لگتی ہے اور پھر ایک مقام آتا ہے جب اُس کی پہچان صرف دہنر سے ہوتی ہے۔“

## باب ۷

میں نے عنوان دیا ہے ہر شے کو

زندگی کیا ہے؟ میرا طرزِ نیاں (شاطر)

اجیت سنگھ سے میری گہری دشمنی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میرے پیٹ میں مروڑے پڑتے، ٹانگیں کانپتیں اور خلق میں چھوڑا سا اگ آتا۔ میں اُس سے بدلہ لینا چاہتا تھا، اُنکیلیاں گھسانے کا، گچھوں میں موتنے کا، گال توڑنے کا بدلہ! لیکن میرا بال کسی طرح نہ نکلتا تھا۔ اجیت سنگھ میرے ہنام گیان سنگھ سے ڈرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اُسی کی طرح ٹکڑا ہو جاؤں۔ میں اپنی کمزوری کی شکایت ماں سے کرتا تو وہ مجھے ایک بٹھاؤ دیتی، ”تم گرو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیکو اور دل سے دُعا کرو، تمہارے منور تھ پورے ہوں گے!“ میں گرو گرنتھ کے آگے ماتھا ٹیکنے جاتا اور اُس کی جسامت اور شوکت سے اس قدر مرعوب ہوتا کہ میں خوشی سے سرفوٹا لیکن سر اٹھاتا ہوا خوف کھاتا۔ میں ڈرتا کہ اگر میں نے صحیح طریقے سے اور عقیدے کے ساتھ سجدہ نہ کیا تو گرو، مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور مجھے سراپ دے دیں گے۔ میری یہ نفسیات دھار مک کتھاؤں کی پیدا کردہ تھی۔ میں لمبا سجدہ کر کے اٹھتا اور اپنے آپ کو دیکھتا اور محسوس کرتا کہ میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ میں تھا۔ میرا عقیدہ! میں زراس نہ ہوتا اور امید کرتا کہ گرو کرپا سے میرا گوہر مقصود مجھے مل کر رہے گا جیسے ہر بھگت کو ملتا تھا۔ چوں کہ بھگوان سرب شکتی مان تھا وہ ناری کو پرش، نربل کو بلوان اور گاک کو ہنس بنا سکتا تھا۔

میرے دودھ کے دانت ٹوٹ گئے۔ اپنا کھونڈا بن مجھے بد نما لگتا اور میں ماں سے پوچھتا،

”ماں ماں! میرے دانت کہاں گئے؟“

”چوہا لے گیا!“

”چوہا کیوں لے گیا؟“

”تو زیادہ میٹھا کھاتا ہے اور جو میٹھا زیادہ کھاتا ہے، اُس کے دانت میٹھے ہو جاتے ہیں۔“

”میں میٹھا نہیں کھاؤں گا! چوہے سے کہو کہ میرے دانت مجھے لوٹا دے۔“

”میں گرو جی سے کہوں گی کہ وہ چوہے سے کہے کہ تیرے دانت واپس کر دے۔“

”تم گرو جی سے کیوں کہو گی؟ سیدھا چوہے سے کیوں نہیں کہتیں؟“

”گرو جی سے ساری خلقت ڈرتی ہے؟ اس لئے اُس کا کہا جلدی مانتی ہے۔“

”گرو جی سے ساری خلقت کیوں ڈرتی ہے؟“

”وہ سب سے طاقتور ہے اور سب کا رکھوالا ہے۔“

میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ماں گرو کو دیر سے کہے اور وہ پھر چوہے سے، میں گرو دوارے گیا سجدہ کیا اور عرض گزاری، ”گرو جی، میری بھول معاف کرو! میں اب میٹھا نہیں کھاؤں گا۔ آپ چوہے سے کہیں کہ وہ میرے دانت واپس کر دے۔“

میں اُرداس کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھول گیا کہ مجھے میٹھا نہیں کھانا ہے۔ میں میٹھا کھاتا رہا لیکن اس کے باوجود میرے دانت مجھے واپس مل گئے۔

بیساکھی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میں کارسیوا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ گرو دوارے کے احاطے کی نئی دیوار بنائی جا رہی تھی۔ میں اینٹیں تر کر کے چرن سنگھ اور سیوا سنگھ کو پکڑا رہا تھا۔ وہ دونوں دھرم ارتھ کام کر رہے تھے، جس سے میرے جذبات متحرک ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ دکھ رہے تھے لیکن میں بھگوان کو من میں بسا رکھا تھا۔ میں حقیر سے حقیر کام پختے دل اور سد بھادنا سے کر رہا تھا اور اپنے ایمان سے اُس کے گھناؤنے پن کو خوبصورتی میں بدل رہا تھا۔ میں نے سنگت کے جوڑوں کو اپنے سر کے رومال سے صاف کیا تھا اور اُسے ویسے ہی سر پر باندھ لیا تھا۔ یہ دھارمک کتھاؤں کا نفسیاتی اثر تھا۔ سنگت سیوا (خدمتِ خلق) اور نام دان (وہ پراسرار کلمہ جو گرو اپنے پیچیلے کی خدمت سے خوش ہو کر اُس کے کان میں کہتا ہے) سے ایسے ویسے لوگ کیسے کیسے بن گئے تھے۔ گرو اور سکھ کے رشتے کی بنیاد روحانی اصلاح پر ہے جو اپنے کمال میں خدا سے ملتی ہے اور اُسے قدرتِ کاملہ کی وارث بناتی ہے۔ ایک سکھ نے گرو کی بھوٹن کھائی تھی جس سے اُس میں اتنی طاقت آگئی تھی کہ اُس نے مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے ایسا کر ہی دیا ہوتا اگر گرو نے اُسے وقت پر نہ روک لیا ہوتا۔ یہ کتھائیں نے از سر نو سنی تو اس کی جادو اثری آوری تھی۔

دلیل کا رشتہ دلیل سے ہے اور اعتقاد کا اعتقاد سے۔ آخری حق و باطل میں فرق بنادیتا ہے اور انسان کو مشکل کام آسان طریقے سے کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور صحیح مقصد کے لئے غلط طریقہ کار آزمانے پر اکساتا ہے کیوں کہ اعتقاد کی انتہا یہ ہے، جو ہے، وہ نہیں ہے اور جو نہیں ہے، وہ ہے۔

میں اپنے بھائی کی بھوٹن کھائی میں کھانا نہ کھاتا تھا لیکن جوں ہی نگر سمایت ہوا اور بھوٹن ایک جگہ

بھنکی گئی، میں نے جھوٹن کی مٹھی بھری اور کھالی۔ میری نفسیاتی کیفیت! مجھے لگا کہ مجھ میں بے حساب زور بھر گیا ہے۔ میں ادھر ادھر بھاگنے لگا اور مٹکا، ہوا میں لہرانے لگا۔ اُس کی طاقت اور ضرب کچھ اور ہی تھی۔ راج مل کے کارخانے کے باہر اجیت سنگھ کوڑیاں کھیل رہا تھا، میں وہاں پہنچا۔ اُسے دیکھ کر مجھے بالکل ڈر نہ لگا جب وہ اپنی بلادی کھیلنے کے لئے جھک کر کوڑیاں اٹھانے لگا، میں نے اُس کے پیچھے سے اُسے زور سے گھسٹا مارا اور نیچے گرادیا۔ میں اپنی طاقت کے مظاہرے پر خوش ہوا اور جیم کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کپڑے جھاڑتا اور گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور کوڑیاں پھینک کر مجھ پر پلٹا۔ میں نے جسے کارہ بلا کر مٹکا لہرایا، اُس میں وہی زور تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے محسوس کیا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کے جھٹکے سے میرا وارنا کارہ کر دیا اور مجھے کیسوں سے پکڑ لیا۔ میں بہت کسماسیا لیکن اپنے کیس اُس سے چھڑوا نہ سکا۔ اُس نے مجھے چرخے کی طرح گھمایا اور دوڑ پھینک دیا۔ میرا ستر زمین سے ٹکرایا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے ہوش آیا تو میرے ماتھے پر گوڑا ابھرا ہوا تھا۔ میں وہاں اکیلا پڑا تھا، ذلیل کیا ہوا، ہارا ہوا جیسے کوئی بے دست دبا۔ میں نے اپنے سارے عمل پر غور کیا اور اپنی شکست کو اپنی عقیدت کی نامافی سے تعبیر کیا۔

بیساکھی کی رات ڈیڑوں (دُزرگوں) کی سادھی پر چراغ جلایا جاتا تھا۔ دوسری ریت رولج کی طرح تیا جی اُسے بھی واہیات سمجھتے تھے۔ چراغ جلانے کے لئے بھایا جی جاتے تھے یا تایا ملکھی رام۔ شام ہو رہی تھی اور ماں پوجا کا تھال تیار کر رہی تھی۔ اُس نے تھال کے وسط میں 'ست بنجا' رکھا، پانی کی بالٹی میں جھگوئے ہوئے چراغوں میں سے ایک چراغ نکالا، جھٹکا، اُس میں فتیلہ لگایا اور 'ست بنجے' کے پنج میں رکھ کر اوپر سے دبایا۔ چراغ کے اوپر ہاتھ رکھنے سے وہ 'ست بنجے' میں ایسے دھنسا کہ چاروں طرف کناروں تک دھک گیا اور یوں لگا کہ اُسے کسی ٹھوس چیز میں سے کھروچ کر بنایا ہے۔ بھایا جی پیڑھے پر بیٹھے رومال تہ کر رہے تھے اور کبھی تہ بر تہ رومال کو کھول رہے تھے۔ وہ رومال سے کھیلے ہوئے اُس اہتمام پر نظر رکھے ہوئے تھے جس کا مظاہرہ ماں بڑے قریب سے کر رہی تھی۔ تھال میں مشک پورا اور گھی کی کٹوری ساتھ ساتھ رکھی تھی اور اُن سے کچھ دوری پر آگ پیٹی، جسے بھایا جی ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ ماں نے سر دھنک کر پوجا سمگری کو نسکار کیا اور بھایا جی کی طرف دیکھا جیسے کہا کہ پوجا کا تھال تیار ہے، آپ لے جاسکتے ہیں۔ بھایا جی پیڑھے پر سے اٹھے اور تھال کے پاس جا کر اُگڑوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے آگ پیٹی اٹھا کر چھنکانی اور پھر وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھانی تھی۔ انہوں نے رومال پھیلا کر جھٹکا، تھال کو ڈھانکا، جھگو ان کا نام لیا اور تھال اٹھا کر کھیتوں کا رخ کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے چنا تھا اور میں گنگا ساگر لئے دروازے میں کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر میں پانی چھڑکاتے ہوئے آگے چل پڑا اور وہ میرے پیچھے ہم نیاٹیاں

اگندہ، پار نہ کئے تھے اور بھیڑ کو نمبردار کے کھیت کی لمبائی سے نیچے آب جوں اتر رہے تھے کہ وہاں تایاجی کھیتوں سے آتے ملے۔ وہ چادر کی ڈھیلی سی گانٹھ میں تھوڑا سا گھاس کھٹے کی طرح اٹھائے جھکے جھکے پڑھائی پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اُسے اتار کر نیچے رکھا اور سیدھے کھڑے ہو کر کہا، ”رتن! ساری ساری دھرتی پر کھوں ہی کی بستی ہے۔ اُن کی مٹی سے ہم رہنے کے لئے گھر بناتے ہیں اور کھار کھانے کے رتن۔ ہم اُن کی مٹی پر کھڑے ہیں! تم کون سی مٹی کو روشن کرنے جا رہے ہو؟ یہ چراغ خود اُن کی مٹی سے بنا ہوا ہے۔ یہ روشن ہو گا تو اپنے ساتھ ہمیں بھی روشنی دے گا۔ اسے گھر میں جلاؤ، گھر میں اُجالا ہو گا، راستے میں جلاؤ مسافر کا بھلا ہو گا! اسے دیرانے میں جلائے سے کیا فائدہ؟“

”یہ جو ریت رواج ہیں؟“ بھائیاجی نے دو دلی سے پوچھا۔

”یہ آدمی کے دورِ جہالت اور خوفِ مرگ کی پیداوار ہیں۔ ہم اُن کی پیروی نہ کریں گے تو یہ اپنے آپ مَر جائیں گے! تایاجی نے میرے پاس اکڑوں بیٹھے ہوئے کہا، جب کہ بھائیاجی تذبذب میں کھڑے رہے۔ یہ بنے کیسے؟“ بھائیاجی نے پوچھا۔

”فرضی اوتاروں کے سوا کتنی سمجھاؤ سے! کوئی ہے جو اپنے ماں باپ کی تن، سن، دھن سے سبوا کرتا ہے؟ لیکن جب وہ بذاتِ خود اُس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے تو اپنی اولاد سے اُس خوبی کی توقع کرتا ہے جو کسی وقت اُس پر فرض تھی۔ ایسے لوگ انسان کے اس متضاد برتاؤ سے واقف تھے، انہوں نے پتر پوجا کی رسمیں ایجاد کیں اور اُن کی تائید کے لئے کتھائیں۔“

”بیٹا! پانی چھڑکانے سے کیا پوتر ہوتا ہے؟ گندگی دیں کی دیں پڑی ہوئی ہے۔“ تایاجی نے استغفاراً پوچھا۔

”میں بھائیاجی کے حکم کا پالنہ کر رہا ہوں۔“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔  
تایاجی کی یہ بات قابلِ تحسین تھی کہ وہ زندگی کے راز دنیا سمجھاتے تھے لیکن کسی کو عملی طور پر روکتے نہ تھے۔ میری بات سن کر وہ مسکرا سہ اور بولے، ”تم بڑے ہو گے تو روایت اور حقیقت میں فرق کرنا سیکھنا لیکر کے فقیر نہ بننا۔“

تایاجی اپنا بوجھ اٹھا کر چلے گئے، بھائیاجی اور میں کچھ دیر رُکے، اُن کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے جیسے ہم اُن کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن پھر اپنی راہ چل پڑے۔

وہ گھڑی لاکھوں گھڑیاں پرانی ہے لیکن میری آنکھوں میں اُسی کوائف و لطائف سے تھرک رہی ہے۔ چرواہے گھوڑوں کو لوٹ رہے ہیں۔ اُن کی چال میں گھر پہنچنے کی بے قراری ہے۔ وہ اپنے ریوڑوں کو دوڑاتے ہوئے

چلتے ہیں۔ گھسیاریاں گھاس کی گھڑیاں اٹھائے چبھتی ہیں اور پانی میں سے گزرتی ہوئی پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی ہیں۔ وہ اپنی شلواروں کو اس احتیاط سے اوپر اٹھاتی ہیں کہ ان کی تنگی پنڈلیاں پانچوں تک پانی میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ عدالت بار کی بانسری کی مدھم مدھم یہ تصدیق کرتی ہے کہ وہ آبِ جو کے اُس پارہے گیدڑوں کی سلطانِ اعلیٰ شروع ہو گئی ہے اور اُسی طرح جھینگروں کی لے، جس کا مطلب ہے جہاں آدمی نہیں بستا ہے وہاں جنگل کا قانون چلتا ہے کچھار کی ہوا میں خوشگوار خوشبو، شفق کی آب و تاب قابلِ دید ہے جگنوؤں کی روشنی بے رعونت ہے لیکن اپنی جمالِ بانی کے لئے گہری تاریکی سے ساز باز کر رہی ہے۔ آسمان پر ایک ہی ستارہ ہے۔ اُس کا اکیلا وجود اُس نقیب کا سا ہے جو اپنے پیچھے آتے ہوئے نئے زمانے کا اعلان کرتا ہو۔

کیار کے کنارے بزرگوں کی سادھی تھی، جس کی نشان دہی کے لئے اینٹوں کی بُرجی بنائی ہوئی تھی۔ بھایاجی نے تھال بُرجی کے سامنے رکھا، واگرو کا جاپ کرتے ہوئے تھال پر سے رُو مال اٹھایا، اُن کے چہرے پر نرمی، اُگاہی اور سنجیدگی کے لیے جملے جذبات چھا گئے۔ انہوں نے چراغ کو بُرجی پر جمایا اور اُس کی تہ سے اٹھا ہوا فتید انگلی سے نیچے دیا۔ گھی کی کٹوری اٹھا کر انہوں نے اُس کے کنارے سے انگلی لگائی اور اُسے چراغ پر دھیرے دھیرے بٹھکایا۔ گھی کی پستلی سی دھار انگلی کے ساتھ بہنے لگی اور چراغ میں گرنے لگی۔ چراغ گھی سے بھر کر انہوں نے کٹوری، تھال میں رکھی اور اپنی ترا نگلی فیتلے کے منبر پر لگائی، اُس کا منہ سفید سے ریشمی ہو گیا۔ انہوں نے انگلی، دائرہ میں ملی اور اُس کی باقی ماندہ تری، بالوں میں جذب کر لی پھر ست بجائے کر بُرجی کے گرد بکھیر دیا۔ انہوں نے آگ پٹی اٹھائی، کھولی، دیا سلائی نکالی، آگ پٹی بند کی اور دیا سلائی مسالے پر رگر گڑی۔ اُس نے آگ پکڑی ہی تھی کہ ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا آیا اور اُسے بٹھا گیا۔ انہوں نے بھیجی ہوئی دیا سلائی پھینکے ہوئے ادھر ادھر دیکھا، تھوڑا سا بدلا، نئی دیا سلائی نکال کر مسلائی اور مسگلتے ہی ہاتھوں کے دائرے میں لے لی مسالا جلا، شعلہ تیز ہوا، انہوں نے ہاتھوں کا پردہ پھیلایا اور شعلے کو فیتلے کے منہ کے نیچے کیا۔ اُس نے پڑ پڑ کرتے ہوئے جب تک آگ پکڑی، سلائی لگ بھگ جل چکی تھی اور آگ، ہاتھ جلا نے لگی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر اُسے پھینکا تو چراغ کی روشنی مدھم مگر مسلسل تھی۔ انہوں نے جوں ہی مُشک پور جلا یا، میسا کھ کی گرم مُشک ہوا، جھک سے جھلک اٹھی۔ وہ لطیف ماحول اُسی لطافت سے میرے ذہن میں موجود ہے۔

بھایاجی واگرو کا جاپ کر رہے ہیں اور اپنے خیال میں اُڑتے ہوئے لگتے ہیں۔ اُن کے الفاظ کی نرمی و نازکی دُرو مند مس کی سی ہے۔ وہ اوپر دیکھتے ہیں اور اُسی طرح یس۔ آسمان دیا لودل کی طرح وصال ہے۔ یہ مقام کیسا مقام ہے! مقام امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ کائنات گھومتی دکھائی دیتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اُس کا محور، میں ہوں۔ اُنی، تاریکی میں ڈوب گیا ہے لیکن میں چراغ کے اُجالے

گندہ، پار نہ کئے تھے اور بھیڑیہ نمبردار کے کھیت کی لمبائی سے نیچے آب جو میں اتر رہے تھے کہ وہاں تایا جی کھیتوں سے آتے طے۔ وہ چادر کی ڈھیلی سی کانٹھ میں تھوڑا سا گھاس کھٹے کی طرح اٹھائے جھکے جھکے پڑھائی پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اُسے اُتار کر نیچے رکھا اور سیدھے کھڑے ہو کر کہا، ”رتن! ساری ساری دھرتی پڑکھوں ہی کی جتنی ہے۔ اُن کی مٹی سے ہم رہنے کے لئے گھر بناتے ہیں اور کھانا کھانے کے برتن۔ ہم اُن کی مٹی پر کھڑے ہیں! تم کون سی جی کو روشن کرنے جا رہے ہو؟ یہ چراغ خود اُن کی مٹی سے بنا ہوا ہے۔ یہ روشن ہو گا تو اپنے ساتھ ہمیں بھی روشنی دے گا۔ اسے گھر میں جلاؤ، گھر میں اُجالا ہو گا، راستے میں جلاؤ مسافر کا بھلا ہو گا! اسے دیرانے میں جلائے سے کیا فائدہ؟“

”یہ جو ریت رواج ہیں؟“ بھائیاجی نے دودلی سے پوچھا۔

”یہ آدمی کے دورِ جہالت اور خوفِ مرگ کی پیداوار ہیں۔ ہم اُن کی پیروی نہ کریں گے تو یہ اپنے آپ مَر جائیں گے!“ تایا جی نے میرے پاس آکر اُن سے بیٹھے ہوئے کہا، ”جب کہ بھائیاجی تذبذب میں کھڑے رہے۔ یہ بنے کیسے؟“ بھائیاجی نے پوچھا۔

”فرضی اوتاروں کے سوا کچھ سبھاؤ سے! کوئی ہے جو اپنے ماں باپ کی تنہا، بھین سے سیوا کرتا ہے؟ لیکن جب وہ بذاتِ خود اُس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے تو اپنی اولاد سے اُس خوبی کی توقع کرتا ہے جو کسی وقت اُس پر فرض تھی۔ ایسے لوگ انسان کے اس مُتضاد برتاؤ سے واقف تھے، انہوں نے پتھر جو جاکر رسمیں ایجاو کیں اور اُن کی تائید کے لئے کتھائیں۔“

”بیٹا! پانی چھڑکانے سے کیا پوڑا ہوتا ہے؟ گندگی دہیں کی دہیں پڑی ہوئی ہے۔“ تایا جی نے استفساراً پوچھا۔

”میں بھائیاجی کے حکم کا پالن کر رہا ہوں۔“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

تایا جی کی یہ بات قابلِ تحسین تھی کہ وہ زندگی کے راز دنیا بھاتے تھے لیکن کسی کو عملی طور پر روکتے نہ تھے۔ میری بات سن کر وہ مسکرائے اور بولے، ”تم بڑے ہو گے تو روایت اور حقیقت میں فرق کرنا سیکھنا لیکر کے فقیر نہ بننا۔“

تایا جی اپنا بوجھ اٹھا کر چلے گئے، بھائیاجی اور میں کچھ دیر رُکے، اُن کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے جیسے ہم اُن کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن پھر اپنی راہ چل پڑے۔

وہ گھڑی لاکھوں گھڑیاں پرانی ہے لیکن میری آنکھوں میں اُسی کوائف و لطائف سے تھرک رہی ہے۔ جہاں گھوں کو لوٹ رہے ہیں۔ اُن کی چال میں گھر پہنچنے کی بے قراری ہے۔ وہ اپنے ریوڑوں کو دوڑاتے ہوئے

چلتے ہیں۔ گھسیاریاں گھاس کی گٹھڑیاں اٹھائے چمکتی ہیں اور پانی میں سے گزرتی ہوئی پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چمکتی ہیں۔ وہ اپنی شلواروں کو اس احتیاط سے اُپر اٹھاتی ہیں کہ ان کی ننگی پنڈلیاں پانچپوں تک پانی میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ عدالت یار کی بانسری کی مدغم دھن یہ تصدیق کرتی ہے کہ وہ آبِ جو کے اُس پار ہے۔ گیدڑوں کی سلطانِ اعلیٰ شروع ہو گئی ہے اور اُسی طرح جھینگروں کی لے، جس کا مطلب ہے جہاں آدمی نہیں بستا ہے وہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ کچھار کی ہوائیں خوشگوار خوشبو، شفق کی آب و تاب قابلِ دید ہے۔ جگنوؤں کی روشنی بے رُخوت ہے لیکن اپنی جمالِ بانی کے لئے گہری تاریکی سے ساز باز کر رہی ہے۔ آسمان پر ایک ہی ستارہ ہے۔ اُس کا اکیلا وجود اُس نقیب کا سا ہے جو اپنے پیچھے آتے ہوئے نئے زمانے کا اعلان کرتا ہو۔

ریکار کے کنارے بزرگوں کی سادھی تھی، جس کی نشان دہی کے لئے اینٹوں کی بُرجی بنائی ہوئی تھی۔ بھایاجی نے تھال بُرجی کے سامنے رکھا، واہگرو کا جاپ کرتے ہوئے تھال پر سے دُمال اٹھایا، اُن کے چہرے پر نرمی، اُگاہی اور سنجیدگی کے طے جیسے جذبات چھا گئے۔ انہوں نے چراغ کو بُرجی پر جمایا اور اُس کی تہ سے اٹھا ہوا فتید انگلی سے نیچے دِبا یا۔ گھی کی کٹوری اٹھا کر انہوں نے اُس کے کنارے سے اُنکلی لگائی اور اُسے چراغ پر دھیرے دھیرے جھکایا۔ گھی کی پستلی سی دھار انگلی کے ساتھ بہنے لگی اور چراغ میں گرنے لگی۔ چراغ گھی سے بھر کر انہوں نے کٹوری، تھال میں رکھی اور اپنی ترانگلی فیتلے کے منبر پر لگائی، اُس کا منہ سفید سے ریشمی ہو گیا۔ انہوں نے انگلی، دائرہ میں ملی اور اُس کی باقی ماندہ تری، بالوں میں جذب کر لی پھر ست نجائے کر بُرجی کے گرد بکھیر دیا۔ انہوں نے اُگ پٹی اٹھائی، کھولی، دِیا سلائی نکالی، اُگ پٹی بند کی اور دِیا سلائی سارے پر رگڑی۔ اُس نے اُگ پکڑی ہی تھی کہ ہوا کا کوئی اُدھر جھونکا آیا اور اُسے جُھٹکایا۔ انہوں نے جُھٹی ہوئی دِیا سلائی پھینکے ہوئے ادھر ادھر دیکھا، تھوڑا سا بدلا، نئی دِیا سلائی نکال کر سلائی اور سُکھتے ہی ہاتھوں کے دائرے میں لے لی۔ مسالا جلا، شعلہ تیز ہوا، انہوں نے ہاتھوں کا پردہ پھیلایا اور شعلہ کو فیتلے کے منہ کے نیچے کیا۔ اُس نے پُر پڑ کرتے ہوئے جب تک اُگ پکڑی، سلائی لگ بھگ جل چکی تھی اور اُگ، ہاتھ جلانے لگی تھی۔ انہوں نے گہرا کر اُسے پھینکا تو چراغ کی روشنی مدغم مگر مسلسل تھی۔ انہوں نے جوں ہی مُشک پور جلا یا، بیسا کھ کی گرم مُشک ہوا، جھک سے جھٹک اٹھی۔ وہ لطیف ماحول اُسی لطافت سے میرے ذہن میں موجود ہے۔

بھایاجی واہگرو کا جاپ کر رہے ہیں اور اپنے خیال میں اُڑتے ہوئے لگتے ہیں۔ اُن کے الفاظ کی نرمی و نازکی دَرد مند مس کی سی ہے۔ وہ اُپر دیکھتے ہیں اور اُسی طرح ہیں۔ آسمان دِیا وِ دل کی طرح وِ شال ہے۔ یہ مقام کیسا مقام ہے! مقامِ امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ کائنات گھومتی دکھائی دیتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اُس کا محور، میں ہوں۔ اُفتی، تاریکی میں ڈوب گیا ہے لیکن میں چراغ کے اُجالے

میں کھڑا ہوں۔ بھائیاجی آنکھیں موندے، ہاتھ جوڑے ہر نام سنگھ، صوبہ سنگھ، شیو سنگھ کے نام لے کر ان کی کھچی کی دعا کرتے ہیں۔ وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اُٹھتے نہیں ہیں۔ میں سجدہ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا ہوں اور ان کے سجدہ کی طوالت پر حیران ہوں۔ وہ اُٹھتے ہیں اور مجھے دیکھتے ہیں۔ اُن کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا ہے لیکن آنکھوں میں شمرائے کی چمک ہے۔ وہ بیک وقت بے وقور اور خود سمر ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔ اُن کے چہن میں زرا لی کشش ہے۔ وہ میری آنکھوں میں سیدھا دیکھتے ہیں اور میں اُن کی آنکھوں میں، مجھے اُن سے دُور نہیں لگتا ہے۔ اُن کی نظر پُر اسرار ہو گئی ہے۔ مجھے لگا ہے کہ وہ میرے پیچھے دیکھتے ہیں۔ میں گردن پیچھے گھماتا ہوں، تا حدِ نظر ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔ اُس ویرانے میں تہذیب و تمدن کا کوئی سراغ ہے تو وہ ہم سے ہے یا نہیں پھر بھائیاجی کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ ویسے ہی اکڑوں بیٹھے بیٹھے میری طرف بڑھے ہیں اور مجھے کمرے پر کمرے سراپے کو دیکھنے لگے ہیں، تسلیم و تکرم سے، حُجّت و ضمانت سے۔

اُن اینٹوں کے نیچے کوزے ہیں ہمارے پرکھوں کی مٹی ہے۔ میں مرجاؤں تو میری مٹی لاکر اُن کی مٹی میں ملانا، اسی طرح چراغ جلانا اور دعا کرنا کہ میری کل کو جلا ملتی رہے اور میری بیڑھی چلتی رہے!

کل جولائی ۱۹۷۸ء کی چار تاریخ تھی، میں نے یہ واقعہ لکھا تو رات سو رہی تھی۔ میں نے اگے لکھنا جاری رکھنا چاہا لیکن مجھ پر بھائیاجی کے سے جذبات مُسلط ہو گئے اور میں تسلیم نفس کے سحر میں گرفتار ہو گیا اور اپنی ذات کے عیشِ دوام کے خواب دیکھنے لگا۔ میرے خواب جوں ہی میری حقیقت سے ٹکرائے، میں بے ساختہ دھاڑ مار کر رو پڑا۔ بونی (میرا پالتو پومیرین کتا) اُچک کر اُٹھا اور چھلانگ لگا کر میرے پاس آیا۔ میں نے اسے پیار نہ کیا، وہ مجھ پر بھونکنے لگا گویا اپنی ناراضی کا اظہار کرنے لگا۔ اُس کے لگاؤ سے متاثر ہو کر میں نے اُسے پُچھکارا۔ وہ اسی اشارے کا منتظر تھا، اچھل کر میری گود میں چڑھ گیا۔ اُس کی پریشانی نرم نگاہی میں بدل گئی اور اُس کے کان، جو تشویش سے کھڑے تھے، بالوں میں بیٹھ گئے۔ وہ اپنی حُجّت کا مظاہرہ کرتا ہوا اور ٹہکتا ہوا میرے چہرے کی جانب پلکنے لگا۔ میں اُسے روکتا، وہ پورا زور لگا کر میرے ہاتھوں سے پھسلتا، میرا مُنہ چاٹتا اور اپنے انداز سے میرا غم بانٹتا۔ حیوان کے پاس اتنا شفیق دل ہے! میں اس خیال سے شنبھل گیا اور مطمئن ہوا۔ سُریندا اور پونم دونوں جاگ پڑیں اور گھبرائی ہوئیں میرے مطاہرے کے کمرے میں آئیں۔ بونی نے انہیں دیکھا لیکن دُور نہ ہلانی جو اُس کا دل رُبا معمول ہے۔ وہ میری ذات میں کھویا ہوا مجھے پیار کرتا رہا اور اُن دونوں کو غیر چُلمپ لگا ہوں سے دیکھتا رہا۔

میرے قارئین میرے رونے کی وجہ جاننا چاہیں گے۔ یہ میں اس لئے سوچتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ جب سے آپ میری کہانی پڑھ رہے ہیں، آپ سے میرا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ لگاتار و یقین کی اس



دنیا میں، میں دو ہی رشتوں کا قائل ہوں، پہلا فراست کا اور دوسرا جذبات کا۔ میری اپنی سرشت! میں فراست کے رشتے کو جذبات کے رشتے سے افضل و دائم مانتا ہوں۔ لیکن میری بے سرو پائی جذبات! وہ خون کے رشتے کی بات ہے جس نے مجھے رُلایا ہے، یوں کہنے بہکایا ہے۔

وجہ میں آگے بیان کروں گا، یہاں بس اتنا ہی کہوں گا کہ پونم کی پیدائش کے فوراً بعد میں نے دھاگا ڈلوا لیا، میرا مطلب ہے کہ وہ سکٹونی اوپریشن کروایا۔ رشتہ داروں اور دوستوں کے نزدیک میں نے اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ماریا۔ اُس جذباتی بیجان میں، میں سوچنے لگا کہ میرے مرنے کے بعد میرا نام کیسے چلے گا؟ میری نجات کے لئے کون دُعا کرے گا؟ مجھے کون یاد کرے گا؟ .... ایسے ہی اور کئی ناقابلِ اعتبار جذبات تھے جن کی تندی مجھے اڑالے گئی تھی۔

ہونی کی غسکاری سے میری جذباتی بدحواسی رُمکی اور میرے خیال کی ایک رُنجی ٹوٹی۔ میں نے اپنے کھونٹے ہوئے حصے کو دوبارہ پایا اور اپنے رویے پر غور کیا۔ میں نے پہلے خود کو بُرا بھلا کہا اور پھر ان کم ظرفوں کو۔ کاش! وہ کھرنڈ کے کیڑے اپنی گھٹن سے باہر نکلتے اور وسعتِ انسان کو دیکھتے تو مجھے اپنی تنگ دلی کا نشانہ ہرگز نہ بناتے۔ انہیں کیا معلوم کہ اُس وقت میں کہاں تھا اور کہاں ہوں!

”تم کہاں ہو؟ میرے ضمیر نے مجھ سے سوال کیا ہے۔“

میرے غور و فکر میرے بچتے ہیں اور میرے ہم خیال میرے رشتے ناطے۔ میرے بچے خوش نشوونما سے مُنسلک ہیں، اس لئے خوبصورت ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے نقش و نگار وقت نے سنوارے ہیں اور وقت ایسی دایہ ہے جس کی گود میں خالص ترین چیز ہی پختی ہے۔

آویہ خونری رشتے! دقتی لگاؤ ہیں، عارضی گھاؤ ہیں۔ انسان ہر وقت اور ہر گھڑی کسی نہ کسی طریقے سے ان کی بھیڑ میں اپنی آنکھوں تک گھرا رہتا ہے اور اپنی اصلیت دیکھ نہیں پاتا ہے۔

بھائیاجی اپنے وہم کے ظلمت کدے سے نکلے تو رات کے اندھیرے بڑھ چکے تھے۔ اور اندھیرا کوئی بھی ہوا! اُس کی نفسیاتی ماہیت ایک ہی ہوتی ہے، خوف! میں اندھیرے سے ڈرنے لگا اور بھائیاجی کے ساتھ رگڑتا ہوا چلنے لگا۔ انہوں نے مجھے احساسِ خاطر سے دیکھا اور میرا اتھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جیسے وہ چراغِ نوی حفاظت کے ہوئے تھے۔ میں اُن کے سہارے چلتا رہا، راستہ جانچتا ہوا اور اپنے گرد نظر دوڑتا ہوا، وہ کھیت جو کچھ دن پہلے سرسبز و شاداب تھے، دیرانِ دیریاں پڑے تھے۔ یہی ہوا آٹا تھا! پرائی کھیتی کاٹی اور نئی کھیتی بوٹی جاتی، پت جھڑتا اور موسمِ بہار آتا، جہاں پرانا پھول مڑھتا وہاں نیا پھول کھل پڑتا۔

## باب ۸

ہم اُسے آدمی نہیں کہتے،  
جس نے ٹھوکر کبھی نہیں کھائی  
(شاطر)

قارئین! میں اُس خود رو پودے کی طرح ہوں جسے حالات پلٹتے پڑتے ہیں لیکن اُس کے پھول جس  
کسی کی نظر بڑتے ہیں وہی انہیں نوچنے اور کھسوٹنے لگتا ہے۔  
دہقانی کہاوت ہے۔

گورارنگ نہ کہے نوں رب دلوے!  
سارا پنڈ بیری ہو گیا

(خدا کسی کو گورارنگ نہ دے! اُس کا ہر کوئی چاہنے والا ہوگا اور نتیجے کے طور پر اُس کا دشتی)  
اس کہاوت کے مطابق مجھ پر ظلم ڈھانے کے لئے میرا گورارنگ ہی کافی تھا لیکن میری بدقسمتی!  
میرا چہرہ مہرہ بھی خوبصورت تھا۔ جو کوئی مجھے دیکھتا، پسند کرتا اور چومنے چاہنے لگتا اور جو کوئی ایسا کرتا وہ اپنی  
آنکھوں کے ذریعے اُڑ کر مجھ سے لپٹ جاتا۔ اسی تاک جھانک سے شرما کر میں سُک جاتا، آنکھیں جھٹکالیتا اور اگر وہاں  
سے چلا نہ جاتا تو مجھے لگتا کہ دیکھنے والا مجھے دیکھ نہیں رہا ہے بلکہ نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ پورے گاؤں میں میرا  
ثانی نہ تھا۔ میں آئینہ دیکھ کر اپنی صورت آنکھوں میں بساتا اور اپنا مقابلہ دُسمروں سے کرتا۔ اپنے سامنے مجھے ہر کوئی  
بے مناسب اعضا کا پلندہ لگتا اور تمنائے تخلیق کی ناقص کوشش۔ جو کوئی تھوڑا بہت چچتا، میں اُسے غور سے دیکھتا  
کسی کے اُبروؤں میں فرق ہوتا اور کسی کی آنکھوں میں، کسی کے نتھنے چھوٹے بڑے ہوتے اور کسی کے ہونٹ ترچھے۔  
گالوں کے زاویے تو کسی کے بھی ایک سے نہ ہوتے، جہاں تک کانوں کا سوال ہے، وہ کسی کے چہرے سے متناسب  
ہوتے ہی نہ تھے۔

میرا چہرہ ایسا تھا جیسے مہسور نے مرکزی لکیر کھینچ کر اُس کے گرد ہر دو نقش جس تناسب سے بنائے  
ہوں۔ میری صورت نے مجھے خود پرست بنادیا تھا۔ میں آئینہ دیکھتا ہوا خود پر فریفتہ ہو جاتا اور آئینے کے بوسے  
لینے لگتا۔ یہ زلزلہ رشک مجھ پر ایسی کیفیت طاری کر دیتا کہ میں خود کو چھوٹا، پیار کرتا، شوقِ وصل سے بے قرار ہو کر  
آئینے کے پیچھے دیکھتا اور وہاں کسی کو موجود نہ پا کر غم زدہ ہو جاتا۔ میں آئینے کا دلدادہ تھا اور جیب میں اُس کا

ٹکڑا رکھا کرتا تھا۔ وہ پیارا ٹکڑا گم ہو گیا اور دوسرا مجھے مل نہ سکا۔ اُس کرب سے نجات پانے کا میں نے اُلکھا طریقہ نکالا۔ میں مویشی چرانے جاتا اور اُب جو کے کنارے ایسے زاویے پر بیٹھتا جہاں سے میں خود کو پانی کے آئینے میں دیکھ سکتا۔ ست رُکھے کے کچھ اوجھرشیشم کا کُبڑا درخت تھا جو درنگ پانی پر جھکا ہوا تھا اور اس کی طرح ہو کر بھی اس نہ تھا۔ وہ پانی سے موج بھر اُٹھتا تھا اور میرا من پسند مقام۔ میں وہاں بیٹھ کر پانی کے درپن میں اپنا ٹکھڑا دیکھتا اور کنول (ہندو دیو مالا کا ایک دیوتا، اُس نے اپنا چہرہ پانی میں دیکھا اور دیکھتے ہی اپنی صورت پر فریفتہ ہو گیا اور ہر وقت پانی میں بیٹھا رہنے لگا۔ اُسے سو آتھی پا کر بھگوان نے اُسے سراپ دے دیا جبکہ وہ جُون بھوگ رہا ہے) کی کہاوت تازہ کرتا۔

میں لڑکیوں کا چہیتا تھا۔ وہ مجھ پر واری واری جاتیں، میرے چاؤ جو چلے کرتیں اور جہاں میں ہوتا وہاں سے مجھے اُٹھا کر لے جاتیں۔ پرکاش کور اور سورن کور کے ساتھ یہ مسئلہ درپیش آتا کہ میں کسے خوش کروں اور کسے ناخوش۔ اُن کی خوشی، ناخوشی کا فیصلہ میری قرعہ اندازی پر ہوتا اور میں جس کے حصے پڑتا وہ مجھے ہاہوں میں سمیٹ کر ایسے سوتی جیسے مجھے چور پُرا کر لے جانے والے ہوں۔

کرپال کور میری ہم عمر تھی اور میری دیوانی بھی۔ وہ میرے بغیر کسی اور سے کھیلتی ہی نہ تھی، جب دیکھو میری تلاش میں ماری ماری پھرتی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آئینے کی طرح دیکھتی، چومتی اور بدن پر پھیرتی۔ میں اُس سے پوچھتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ وہ سراپا امید بن کر کہتی، اس سے تیرا رنگ مجھ پر چڑھ جائے گا۔ وہ مجھے چُتے دیتی۔ میں اُس کے چُتے اس لئے نہ لیتا کہ اُس کا سا نوا رنگ مجھ پر چڑھ جائے گا۔ وہ اپنی آرزو پوری کرنے کے لئے مجھے طرح طرح سے بھرماتی، میرے لئے دانے بھنا کر لاتی، کبھی دال، کبھی مرمے، کبھی مڑدا، کبھی گڑ کی ڈلی، کبھی گندیریاں اور کبھی پُرل۔ وہ کچھ نہ لاسکتی تو پھول ضرور لاتی اور اُسے میرے جوڑے میں سجا کر کہتی، ”تو میرا کرشن کھیتا ہے اور میں تیری را دھا!“

میں کھڑا ہو کر موت رہا تھا۔ اُس کی دلچسپی! وہ آگے بڑھی اور دریافت طلب نظر سے دیکھنے لگی۔ وہ خوش تھی اور حیران بھی۔ اُس نے میری نقل اتاری لیکن اُس کی دھار اُس کے پاؤں سے آگے نہ پڑی۔ میرے لئے یہ نرالا انکشاف تھا۔ میں نازاں ہوا اور وہ پیشانی! میں نے اُس کے ساتھ کھیلنے کا عہد کیا، ”تو میری جتنی دُور دھار مار کر دکھا تبھی میں تیرے ساتھ کھیلوں گا!“

میری ہوڑ بازی اور میری ہنٹ اُس کی الجھن بن گئی۔ وہ مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے کوشش کرتی، اپنی جانگھ آگے بڑھاتی، سر پیچھے جھکاتی اور پُورا زور لگا کر موتی۔ اُس کا رنگ گہرا قرمزی ہو جاتا لیکن اُس کی دھار میری دھار کے آغاز کو بھی نہ پہنچتی۔ وہ جیت نہ سکتی، نراس ہو جاتی اور پُوچھتی، ”میرے ہاں تیرے جیسا کیوں

”نہیں ہے؟“

”یہ صرف لڑکوں ہی کے ہوتا ہے!“ میں پھٹو کو ہاتھ لگا کر فخر سے کہتا۔

اُس کی کمزوری جان کر میں اُسے کیسے کیسے مرعوب کرتا! میں موتتا ہوا گھومتا، کبھی دھار سے کمائی بناتا اور کبھی دائرہ۔ میں پھٹو کا رخ اوپر کرتا، سیدھی دھار بلندی کی طرف پرواز کرتی اور پھر قوس کی صورت نیم دائرہ میں بدل جاتی۔ کربال کوریہ منظر دیکھ کر بے اختیار ہو جاتی اور جذبہ تجسس سے ایک ہاتھ میں میری پھٹو پکڑ لیتی اور دوسرا ہاتھ اپنے چڑے پر پھیرتی اور محرومیت کے احساس سے بچھ جاتی۔ اُس کی افسردگی زیادہ دیر نہ رہتی، وہ جذبہ امید سے بھول کر مجھے ترغیب دیتی کہ میں پھٹو اُس کے چڈوں پر گرڈوں شاید وہاں اُس جیسی کوئل پھوٹ پڑے۔ میری پھٹو کی گھنٹی اور بڑھتی آوازانی کو دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کوئی پود ہے جسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لویا جاسکتا ہے۔ وہ میرے نیچے لیٹنا پسند کرتی، میرے بوجھ سے تکلیف میں پڑ جاتی، اُلجھے اُلجھے سانس لیتی لیکن مجھے اوپر سے اٹھنے نہ دیتی۔ وہ مجھے ننگا دیکھ کر خوش ہوتی۔ میں اُس کی خواہش تا حدِ مسرت پوری نہ کرتا، وہ شوق سے کہتی، ”تیری عریانی مجھے بہت بھاتی ہے۔ دل کرتا ہے کہ تجھے زندگی بھر یوں ہی دیکھتی رہوں!“

لشکر سنگھ سرگودھ سے آیا اور چھوٹی سی موٹر لایا جو کمائی کے زور پر چلتی تھی۔ وہ موٹر بچوں میں یوں مقبول ہوئی کہ ہر کوئی اُسی کا چاپ کرنے لگا۔ اُس کے حویلی سے موٹر نکالتے ہی بچے کھیلنا چھوڑ کر اُسے گھیر لیتے اور موٹر کی سواری کا مزہ لوٹنے کے لئے اُس کی منت سماجت کرتے۔ وہ ہر کسی پر مہربان نہ ہوتا لیکن اجن پر ہوتا اُن میں میرا نام سر پرست تھا۔ صبح کا وقت تھا اور میں جنگلی سے لوٹ رہا تھا۔ لشکر حویلی کا ایک دروازہ بند کچکا تھا، دوسرا بند کر رہا تھا اور زنجیر ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر زنجیر لگاتے لگاتے رُک گیا اور بڑے پیار سے بولا، ”موٹر پر چڑھو گے؟“

اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی! موٹر ایسی پیز تھی جس پر چڑھنا اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر اڑنا تھا۔ میں بے اختیار دوڑا اور دروازہ دھکیل کر اندر گھس گیا۔ میرا خروش اتنا اچانک تھا کہ عین وقت پر لشکر سنگھ زنجیر نہ چھوڑتا تو دروازے کے ساتھ اندر لڑھک جاتا۔ موٹر سامنے برآمدے میں پڑی تھی، میں بھاگ کر اُس پر سوار ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پیاری موٹر پوری کی پوری میرے لئے تھی اور میں اُس کے لئے۔ میں اُس پر جی بھر کر چڑھنا چاہتا تھا اور اُسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن بھیڑ میں اُس سے نہ ملتا تھا۔ میں موٹر پر سے اتر کر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس پر ہاتھ پھیر پھیر کر اُس کی بناٹ کو سراہنے لگا۔ اُس چھوٹی سی موٹر کے اندر ہو بہو بڑی موٹر کا سا منظر تھا۔ شو فر کی سیٹ پر آدمی نہ لکڑی کا پتلا تھا اور دوسری سیٹوں پر کالے کارک چپلا

تھے جو سفید رنگ کے پس منظر میں سواریاں لگتے تھے۔ سیٹوں کے بیچوں بیچ دروازے سے لے کر پچھلے حصے تک فرش پر چوڑی لال لکیر، قالین سے مشابہ تھی۔ چھت کے اوپر لوہے کی چادر لگی تھی جو آئینے جیسی تھی۔ میں اس میں منہ بنا کر دیکھنے لگا۔ یہ بڑا مین ہرن تجربہ تھا! الگ الگ زاویے سے مجھے الگ الگ چہرہ نظر آتا تھا۔ اتنے میں شکر سنگھ میرے پیچھے سے میرے پاس آیا اور چٹخارے سے میرا منہ چوم لیا۔ مجھے برا لگا، میں گال پر سے تھوک صاف کیا اور اُسے غصے سے دیکھا۔ اُس نے پیار سے کہا، ”مجھے موٹر پسند ہے؟“

”ہاں، بہت پسند ہے!“ میرا غصہ جاتا رہا اور میں نے لاٹھ سے کہا، ”مجھے اس پر بہت سے جھوٹے دو! میں نے ہاتھ پھیلا کر جھوٹوں کی مقدار بتاتے ہوئے اپنی بات کو پورا کیا۔

اُس نے موٹر کو برا کہنے سے باہر نکالا، اُس کا رخ باہر کے دروازے کی طرف کیا، مجھے اوپر اٹھایا۔ کمائی کسی اور چھوڑ دی۔ موٹر تیزی سے بھاگی، بھاگتی بھاگتی رکی، میں ہڈیوں کے گودے تک ہلک چکا تھا۔ میں موٹر کو کھڑی کر رہا تھا کہ شکر سنگھ بھاگ کر آیا اور موٹر کی کمائی کس کر اُسے چھوڑ دیا۔ چوں کہ ادھر دھلان تھی موٹر مجھے لے اُڑی اور پہلے سے زیادہ دُور جا کر رکی۔ جب تک وہ مجھ تک پہنچا، میں موٹر کا رخ موٹر کس پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر مسکرانے لگا اور چابی کو اُس کے دستے کے گرد گھمانے لگا۔ میں نے اُسے موٹر چلانے کے لئے کہا، وہ مجھ پر جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”یہ موٹر، میں تجھے دے دیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔“

”کیا شرط ہے؟“

”میرا دل خوشی سے اس زور سے دھڑکا کہ مجھے صاف سُنائی پڑا۔“

”مجھے پانچ چھٹے دو!“

اُس نے ہاتھ کھول کر پتہ دکھایا۔

”ٹھیک ہے!“

میرا قبضہ مجھ سے رخصت ہو گیا اور میں نے گال اس کی طرف بڑھا دیا۔ میں اس قدر بے ساختہ تھا کہ اُس کے کہنے اور میرے ماننے میں کوئی وقفہ نہ تھا۔ چھٹے لیتے لیتے اُس نے مجھے نیچے گرا لیا۔ مجھے اپنی ترنگ میں لگا کر وہ مجھے پیار کر رہا ہے اور میں نے اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا۔

قارئین! بچپن، نا تجربہ کاری اور احساس کی سادگی کا ایسا آئینہ ہے، جس میں کسی کے پیار میں بے ہودگی کا عنصر دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔

میرے چوتروں میں چیز بنا ہوا درد اٹھا اور مجھے لگا کہ میں سیون پر پھٹ رہا ہوں۔ میں اتنی زور سے

جیجنا کہ سارا ماحول گونج پڑا۔ اُس نے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا اور مجھ سے دُور جا کھڑا ہوا۔ میں روتا ہوا اٹھا اور باہر کے دروازے کی جانب پل پڑا۔ وہ میرا دستہ روکنے لگا اور اپنا وعدہ دہرانے لگا۔ وہ جوں ہی میرے قریب آتا، میں اُس سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا جیسے وہ کوئی بھیانک دَرنده ہو۔ میرا رونا دہشت ناک نہ ہوتا تو شاید وہ دروازہ نہ کھولتا۔ وہ میرے سامنے تھا تو میں اُس کی شکایت کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا اور بے تحاشی طور پر ہاتھ اُس سے دُور ہوتے ہی مجھے عجیب سے خوف نے دُکیر لیا اور میرا اُبال ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں گھری بھینچا تو بیمار سا تھا۔ میں نے ایک اندھیرے گوشے میں دیوار کا سہارا لیا اور پھر اچک کر اُس سے دُور جا کھڑا ہوا۔ مجھے لگا، میں جس چیز کو چھوؤں گا وہ مجھے مجروح کر دے گی۔

جہ نازک عمر! وہ گھناؤنا حادثہ!! وہ قَبْطِ نَفْس!! ایا میری فطرت کی ریاکاری انسانی نطفے کا جُز و ناگزیر تھی؟

میں اس وقت اُس توہین آمیز حادثے اور بدنام واقعے کی تشہیر کر رہا ہوں اور یہ میری ریاکار فطرت کے خلاف ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ یہ کون سا جذبہ ہے جو میری ریاکاری پر غالب آ رہا ہے!

قارئین، یہ کوئی جذبہ نہیں! یہ کرہائی تخلیق کی شندی ہے جو اپنے دُور خود نمائی میں تحریکِ ظہور بنی ہوئی ہے! یہ محض اتفاق ہے کہ اُس شان و جود کا وسیلہ نمود، میں ہوں۔ اور یہی شوکتِ اظہار، دَرنِ نہ کی مسترِ آفرائش ہے۔ اگر اس میں یہ فحش نہ ہوتی تو کوئی ماں اپنے بچے سے پیار نہ کرتی! وہ اپنی اذیت کا بدلہ اپنی تخلیق سے لیتی اور اُس کے پیدا ہوتے ہی اُسے ہلاک کر دیتی۔

عمروں کے تضاد اور غیر فطری جنسی تجربے نے مجھے پرہیزگاری کر دی جو ڈھال کی طرح میرے ساتھ رہی اور میری آئندہ زندگی میں مجھے اُرد پرستوں سے بچاتی رہی۔ میرے احساس کی صداقت پر کوئی یقین کرے گا کہ اس راز کا انکشاف کر کے، میں اُمی روحانی تکلیف سے گُڑا ہوں جو اُس حادثے کی خوش خواری تھی۔ میں نے جب جب اس واقعے کو یاد کیا ہے اس نے مجھے زہریلے سانپ کی طرح ڈسا ہے۔ اُس وقت میری صورت میں پری زاد کی ہی کشش تھی اور پہاڑی سن جیسی معصومیت۔ میرا وجود نرمی و نازکی کا ایسا منظر تھا کہ مجھے بھوکا دَرنده دیکھتا تو وہ بھی پیار سے چائٹا اور کھول کرتا۔ لیکن انسانی جُوس وہ کہ یہ جذبہ ہے جو اپنے جنونِ نمائش میں بھیانک سے بھیانک تصور کو حقیقت ثابت کر سکتا ہے۔ میری برسوں کی حالات پروردہ توبت برداشت اُس قحط ناک حادثے کو نئے سرے سے جانچتی ہے اور اُس انسانی زندگی کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتی ہے۔ اُس مجرمانہ زیادتی

کے اثرات کتنے بدترین ہو سکتے تھے !

اُس حادثے کا راست اثر یہ ہوا کہ میں کسی سے تحفہ نہ لیتا۔ کوئی مجھ سے بڑا لڑکا مجھے تنہائی میں بلاتا تو میں اُس سے دور بھاگ جاتا۔ میں عدالت یار سے بھی تحفہ قبول نہ کرتا۔ وہ میری ٹھوڈی پکڑ کر میری آنکھوں میں جھانکتا اور قصور وارانہ انداز سے کہتا، ”میرا جگکا مجھ سے ناراض لگتا ہے۔“

## باب ۹

اتنی سی ستر گزشت ہے بزمِ حیات کی  
کوئی ہنسنا خوشی سے کوئی غم سے رو دیا  
(شاطر)

جس طرح کوئی غنیچہ موسم کی نرمی و سختی بھیلتا ہوا کانٹوں کے درمیان کھل اٹھتا ہے، کچھ اُسی طرح میری تعلیم کا آغاز ہوا۔

اُن دنوں بچوں کو سکول میں داخل کروانے کے لئے ماں باپ، سکول نہ جاتے تھے بلکہ سکول ماسٹر، بچوں کے ماں باپ سے مل کر انہیں بچوں کو پڑھوانے کی ترغیب دیتے تھے۔ ہریانہ میں انگلش میڈیم کے دو سکول تھے، ڈی۔ اے۔ وی۔ ہائی سکول اور ہندو مسلم ہائی سکول، لیکن بھایا جی نے مجھے اردو میڈیم کے ڈسٹرک بورڈ مل سکول میں داخل کروایا۔ اُن کی دلیل تھی کہ جو زبان ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے اُسے پڑھنا فضول ہے۔ ہریانہ میں ہماری مثال تھی جہاں میں کئی بار جا چکا تھا، اپنی ماں کے ساتھ، کبھی اپنے بھائیوں اجیت سنگھ اور درشن سنگھ کے ساتھ اور کبھی اکیلا۔ میں اپنا ہم سفر آپ ہوتا تو میری ہم سفری میری شان تو نگری ہوتی۔ میں قدم قدم بے قرار ہوتا اور نظر نظر شاہد۔ گاؤں کے فوراً باہر کھجوروں کا جھنڈ، ٹکیہ کھانا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں اگن کُند تھا، جس کی دیکھ بھال ایک فقیر کرتا تھا اور اُس کی دیکھ بھال گاؤں والے۔ اگ پٹی کی ایجاد کے ساتھ اگن کُند ٹھنڈا پڑ گیا۔ جب وہ فقیر مر گیا، اُسے وہیں دفن دیا گیا۔ اب کئی لوگ اُس کی قبر پر پھول چڑھاتے تھے اور منت مانگتے تھے۔ اب جو کے پار سڑک پر چھوٹی اینٹوں کا باندھ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں سے نہر نکلتی تھی جو کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی بگے وال کی سرحد سے کچھ ادھر پھر آب جو میں مل جاتی تھی۔ اُس نہر کا آبِ نہر لا لیا تھا! ہر سال برسات کے بعد آب جو پر باندھ باندھنے میں حصہ لینا اور نہر کو صاف کرنا پڑتا تھا۔ اُس مردہ نہر کے شمال

میں آموں کا بُرا باغ تھا، جیسے بھایا جی نے فیروز شاہ سے خرید کر کاٹا تھا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا  
 بوٹا بطور یادگار چھوڑا تھا۔ وہ بوٹا پیوندی تھا اور پھلتا تھا۔ اُس کے آم موٹے رسیلے تھے اور ایک سیر میں  
 دو بھاری تلتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور شیشم کے درختوں کا سلسلہ ہر باغ تک جاتا تھا۔ ہر درخت  
 کے تنے پر سے چھ ایخ مریت چھال کاٹ کر اُس میں اُس کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ اب جو سے اُدھی فرلانگ کی دُوری  
 پر بانی تھی اور وہاں سے دو فرلانگ پر باہتوں کے کوٹھے۔ میری ماں، تانی ماں اور تانی، بانی پرگو کا پو جنے  
 جاتیں تو نایا جی کہتے،

گھر آئے جے ناگ تاں ماریں  
 بانی پو جن جائیں

باہتوں کے کوٹھوں سے روڈ، ٹلسی، داسو، گوپال (اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کے  
 سانپ لڑ جائے تو سانپ مَر جاتا ہے) اور کئی لوٹھی مانگنے آتے تھے اور لائیں کے مال پر ناپتے ہوئے  
 دیہڑے (محسن) پلا دیتے تھے۔ وہاں سے چند کھیت آگے دوار کا ناتھ کا دور بٹا (ایک کنواں جس پر دو رہٹ  
 ہوں) تھا۔ اُس سے دو تین کھیت آگے سڑک کی طرف رانگھڑوں کا رہٹ تھا جس کی پیٹری (رہٹ چلانے کے  
 لئے بیلوں کے گھومنے کی جگہ) کے کنارے پر جان کا پیڑ تھا جو زمین سے گز بھر اُپر دو شاخے میں پھیل کر جھکا  
 جھکا اُپر اٹھا تھا اور شاخوں تک دیسا ہی رہا تھا، اس لئے اُس پر چڑھنا اور جامن توڑنا آسان تھا۔ رہٹ سے  
 پہلے اُس کنویں پر لاؤ چلایا جاتا تھا۔ چرس، پاٹ کے برابر آتا تو چرسی، چرس پکڑتا ہوا 'اندھیلی' کا نعرہ لگاتا  
 بیل ہانکنے والا بیلوں کو روک کر جوئے سے لہاس کھول دیتا اور پھر جوگ دیلوں کی جوڑی (کو نیچی سے اُپر پاٹ  
 کی جانب اُٹے پاؤں لاتا۔ یہ وقت کھپاؤ عمل تھا اور اس سے پانی کا بہاؤ لگتا رہتا تھا۔ ان کے پاس دوسری  
 جوگ خالی ہوتی تو وہ دو جوگوں کا استعمال کرتے اور جوگ اُٹے پاؤں پیچھے موڑنے کے بجائے سیدھی آگے نکال  
 لے جاتے اور گھما کر کنویں کے پاس لاتے۔ اس طرح ایک جوگ جو ہی نیچی کے آخر میں پہنچتی، دوسری اُس کے  
 آغاز میں جتنے کے لئے تیار کھڑی ہوتی۔ وہ رانگھڑ، پاہی تھے اور ہر باغ میں رہتے تھے۔ ان کی ایک عورت کی  
 نرالی عادت تھی! وہ اپنے سب سے ہاتھ میں مٹی کی ڈلی رکھتی اور اُسے انگوٹھے سے کریدتی ہوئی چلتی، جہاں ڈلی ختم ہوتی  
 وہاں رُک جاتی اور نئی ڈلی اٹھا لیتی۔ اُس کے چلنے اور ڈلی کے کریدنے میں ایک تال میل تھا، لگتا تھا کہ انگوٹھا کوئی  
 پَرزہ ہے، جیسے ٹانگیں حرکت دے رہی ہیں۔ جامن کے پاس سے کبڑا آم صاف دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے پھل  
 ہرے کالے ہوتے تھے، پک کر دیسے ہی رہتے تھے اور بٹوں میں دکھائی نہ دیتے تھے۔ اُس کی جڑوں میں بھٹ تھا  
 جس میں گوہ رہتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے منہ پر سنگھ یاد آتا جو کہتا تھا کہ گوہ کے چڑے کی جوتی پہننے والا کبھی بیمار



نہیں پرتا ہے۔ اُس کلمات پر مِس سوچتا کہ میں بڑا ہوں گا، گوہ ماروں گا اور اُس کے چہرے کی جوتی خوا کر پہنوں گا۔ کبڑے آم سے پانچ پچاس قدم آگے میل تھا اور اُس کے برابر دین دار کا ڈیرا۔ وہاں سڑک کی مٹی چھٹی تھی برسات میں اُس میں سے ننھے ننھے کھنڈر نکلتے اور اپنے نیچے چھپے لاوے کا سُراغ دیتے۔

تایا جی کہتے تھے کہ دھرتی اپنے اندر پگھلے ہوئے لوہے کی طرح ہے، جہاں اس کی سطح کمزور ہے وہاں یہ اپنے اندر دھنی دباؤ سے پھٹتی ہے اور بھونچال لاتی ہے۔ اُن کی یہ بات سنت گرجن سنگھ کے بیان سے الگ تھی، جو کہتا تھا کہ دھرتی کو کھائے نے سنگسیر اٹھایا ہوا ہے، وہ تھک کر سنگ بدلتی ہے تو بھونچال آتا ہے۔

میں وہاں سے گزرتا اور ناقابلِ ادراک طریقے سے محسوس کرتا کہ دھرتی کا وہ ٹکڑا اُس کے اندر کھولتے لاوے سے سیدھا بڑا ہوا ہے۔ بارش میں وہ تیل کی گھائی کی طرح چمکتا ہو جاتا تھا اور اُسے پار کرنے کے لئے پاؤں کو پیچنے کی طرح گاڑ کر چیلنا پڑتا تھا۔ میں اپنی لاپرواہی سے وہاں کئی بار پھسلا اور گرتا تھا۔ دین دار کا ڈیرا گھنی اور اونچی جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا، جن کے بیج میں سے تنگ سا راستہ اندر جاتا تھا۔ راستے کے منہ پر کئی کتے بیٹھے اونگھتے رہتے تھے۔ کوئی ڈیرے کے پاس سے گزرتا، وہ چونکے ہو کر بھونکنے لگتے جیسے ڈیرے پر منڈلاتے ہوئے خطرے کو ٹال رہے ہوں۔ ڈیرے کے اندر کیا ہے؟ دین دار کے سوائے کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ اپنے ڈیرے ہی کی طرح پُر اسرار تھا۔ وہ ٹخنوں سے نیچے تک لمبا کالا چوغا پہنتا اور سر پر کا سرنما جوئے کے رنگ کی ٹوپی، جو سر پر سلسلے سے چمکی ہوئی لگتی۔ ٹوپی کے رویتے سے اُس کا کھڑکتا پن ابھرتا اور کانوں پر اُس کے بال بڈی کے ٹھاسوں کی طرح دکھائی دیتے۔ وہ گردن اور شانے جھکائے، ہاتھوں کو کمر کے پیچھے پکڑے ہوئے چلتا اور ایک آدھ گز سے آگے نہ دیکھتا جب اُسے اپنے سے دُور کسی شے کو دیکھنا ہوتا، وہ رکتا، گردن کا بال نکالتا، شانے اوپر اٹھاتا، آنکھوں پر ہاتھ رکھتا، دیکھتا اور پھر اُمی غل کو اُٹا دُہراتا۔ جب وہ سیدھا کھڑا ہوتا، اُس کا چوغا ٹخنوں سے اونچا اٹھ جاتا اور اُس کے ٹخنوں پر پیاز کے گٹھوں جیسے بڑے بھورے گومڑے نمایاں ہوتے جو بصورتِ دیگر نظر نہ آتے تھے۔ اُس کا چہرہ کدو جیسا گول تھا اور بھرکٹی بالوں سے بھری ہوئی ہونے کی وجہ سے اُو جیسا لگتا تھا۔ لمبی خضابی دائرہ، سینے پر توس کی طرح اٹھی رہتی تھی۔ وہ مونچھیں منڈواتا تھا اس لئے ہونٹ صاف دکھائی دیتے تھے۔ اُس کا بالائی ہونٹ اس قدر آگے بڑھا ہوا تھا کہ نیچے کا ہونٹ، لکیر سا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بات کرتا تو لگتا کہ ایک ہی ہونٹ سے بولتا ہے۔

میل کے ادھر سڑک میں سے گڈے لیک بھڑکتی تھی جو آگے چل کر دو لیکوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک لیک سیدھی کوٹھے جٹاں کو جاتی تھی اور دوسری ہمارے گاؤں کی سرحد پر سے ہوتی ہوئی لامبرٹے پہنچتی تھی۔ دین دار کا ڈیرا اُموں کے باغ میں تھا جو آریوں کے ڈیرے سے دس کھیت ادھر ختم ہوتا تھا۔ اُس ڈیرے کے مشرق میں سینھ پیارے لال کی زمین تھی جو ٹوئیاں والا کھوہ، کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ آریوں کے ڈیرے سے لگتی ہوئی گڈے

لیک بوجہ خانہ کے قریب سے گزرتی تھی اور ہریانہ میں داخل ہوتی تھی۔ بوجہ خانہ سے آگے کی ایک کے دونوں طرف گندگی اور کوراکرکٹ کے جھبھوکے ہوئے ڈھیر تھے، جن کے پاس سے آرام سے گزرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ پہلا، دلی لگاؤ اور آگے نکل جاؤ۔ دوسرا، ناک دبا کر پکڑو اور منہ سے سانس لیتے ہوئے چلو۔ ٹوہاں والے کھوہ سے چار کمیت آگے سنبھل تھا، جس کے پاس پہنچ کر میں یہ دوا ضرور گاتا، مَن ہی مَن میں یا اوچی آوازیں۔

سنبھلا گھمان نہ کریں،

پھل نیسیاں رکھاں نوں متھے لگدے۔  
(اے سنبھل! تو اپنے اونچے اور بڑے ہونے پر گھمنڈ نہ کر۔ یاد رکھ! میٹھے اور رسیلے پھل صرف چھوٹے درختوں ہی کو لگتے ہیں)

سنبھل کر گسوں کا گھر تھا۔ اُس کے اطراف ہر طرح کے درختوں کی بھرا تھی لیکن کرگس ہی جانیں کرکیوں؟ وہ سنبھل پر بیٹھا پسند کرتے تھے۔ اُس کا شاید ہی کوئی پتا ہوگا جو کرگسوں کی بیٹ سے بچا ہوگا۔ کئی مَن چلے آپس میں شرط لگاتے تھے کہ جو کوئی منہ کھولے اوپر دیکھتے ہوئے سنبھل کے ساتھ چکر لگائے، وہ یہ انعام پائے۔ سنبھل کی مکروہیت میں ایک خاص دل کشی تھی۔ اُس پر بیٹھے اور اُڑتے لگدے، اُس کے کچے غنچے گراتے جو بنی بنائی جھنجھیر یا ہوتے۔ مٹی کے مہینے میں سنبھل ایک بڑا ڈھینگرا (سوکھی ہوئی خاردار جھاڑی) نظر آتا۔ اُس وقت اُس کے دوڑے پھٹتے اور فضا میں رونی پھیلتے۔ دُور سے دیکھنے سے لگتا کہ برف کے گالے برس رہے ہیں۔ وہاں سے سو قدم پر کھتے ہاتھ کی طرف ڈچی کشنر کا مزار تھا۔ اُس کے ارد گرد کی اور قبریں تھیں جو اُس کے سامنے مٹی کے ڈھیر لگتے تھے۔ وہاں ایک عجیب اور رہتا تھا جو گہرا سبز لباس پہنتا تھا۔ اُس کے دراز گیسو، پگڑی کے نیچے سے کمر تک لٹکتے رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ اُس نے مرنے بس کر رکھے ہیں۔ درختوں اور قبروں میں گھرا ہوا وہ مقام پر اُس کا مزار تھا جسے عجیب اور کاحلید اور اُس کا اللہ ہو، کاحلید دراؤنا بنا دیتا تھا۔ جہاں وہ مزار ختم ہوتا تھا وہاں سامنے دی۔ اے۔ دی۔ ہائی سکول شروع سکول سے لگی ہوئی ایک سڑک تھی جو سکول کے گرد گھومتی اور منشی رام کے بچے کو سکول سے الگ کرتی ہوئی اُسی سڑک میں جا ملتی تھی جس کی وہ شاخ تھی۔ بچے پر ہمارے گاؤں کا آسا سنگھ حکیم کام کرتا تھا۔ اُس کے پاس جل گھڑی تھی جس سے وہ ایندھن ڈالنے کے وقفے کا تعین کرتا تھا۔ وہ جل گھڑی کیا تھی؟ اس نے کی ایک کٹوری تھی جس کے پندے میں باریک سا چھید تھا۔ بچے میں تازہ جھوکا دیا جاتا تو کٹوری کو پانی پر تیرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا اور اُس کے ڈوبنے اور تیرانے کے ساتھ جھوکے کا عمل دوبارہایا جاتا۔ بچے کے ارد گرد کے کھیتوں میں پتھیرے لگے رہتے تھے جو کھویا ایسے کاتے تھے جیسے گھڑا، مستن آٹما۔ بچے کے مالک اپنے گاؤں کو کس سادگی سے فریب دیتے تھے!

اینٹیں گنتی سے بکتی تھیں اور بچوں میں رکھی ہوتی تھیں۔ اوپر کے چھتے رُوسے کو پر مٹکھ (سند) مان کر عمودی ردوں

سے ضرب دو تو اینٹوں کی تعداد زیادہ بنتی تھی، نسبتاً اس کے برعکس۔ سکول میں ایک ہال تھا جو اُس کی ساری تعمیر پر چھایا ہوا تھا۔ وہاں پر میرا تائیرا بھائی آسا سنگھ پڑھتا تھا۔ پچھلے سال وہ مجھے سکول کے سالانہ جلسے میں لے گیا تھا اور میں نے اُس ہال کو اندر سے دیکھا تھا۔ اُس کی چھت پر جو گاڈر تھے وہ ایئر سیک کے خراس کے گولے سے کئی گنا بڑے تھے۔ گولے کو بیل پائیوں پر چڑھایا گیا تھا تو کم سے کم پچاس آدمی لگے تھے۔ اس کے باوجود یہ حادثہ ہوا تھا کہ رمضان علی کا دایاں بازو اُس سرکش بوجھ کے نیچے اُچکڑا گیا تھا اور اُسے کا ٹنٹا پڑا تھا۔ اُن گاڈروں کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا اور میں نے بے اختیار ہو کر آسا سنگھ سے پوچھا تھا، ”بھیا! اتنے بڑے گاڈر اوپر اتنی دور کیسے چڑھائے تھے؟ کتنے آدمی لگے تھے؟“

”یہ گاڈر لیوروں سے اوپر چڑھائے تھے اور زیادہ آدمی نہیں لگے تھے۔ ایک لیور پچاس آدمیوں کا کام کر سکتا ہے۔“ اُس نے یہ کہہ کر لیور کے موجد یونانی حکیم ارشمیدس کا قول سنایا تھا جس نے مجھے بالکل حیران کر دیا تھا، ”میرے پاس اتنا لمبا اور اتنا موٹا لیور ہو تو میں پوری دنیا کو اٹھا سکتا ہوں۔“

اُس ہال میں دبے لہجے سے بھی بولو تو آواز گونجتی سنائی پڑتی تھی۔ میرے جی میں آیا تھا کہ میں وہاں زور زور سے بولوں لیکن آسا سنگھ نے مجھے روک دیا تھا۔

شام چوراسی، ہریانہ سڑک رام لیل کی آب جو میں دو شائے میں بدل جاتی تھی جو شاخ ہریانہ میں داخل ہوتی تھی اُس کے آغاز میں سانیوں کے مکان تھے، پھر سیٹھوں کے گھر اور اُن سے کچھ آگے ٹھیلوں کا کارخانہ۔ اُن کا ہنر، کاریگری اور دشواری کی آپ اپنی نظیر تھی۔ وہ بھٹی کے منہ پر سے ڈھکن اٹھاتے، جس میں سے شعلے پلکتے انہیں خاطر میں نہ لاتے ہوئے، وہ بھٹی میں زبور نما سنسنی گھساتے، گٹھالی باہر نکالتے اور گھیلی ہوئی دھات ساپچوں میں ڈالتے۔ اُس منظر کو دیکھنا، نظر بھر کر آفتاب دیکھنے کے برابر تھا۔ لیکن ٹھیلے سخت کار تھے اور ساتھ ساتھ روپ کا، آواز کی دھار کی طرح جو وقت عمل اپنی اور اپنی تخلیق کی حفاظت پوری چوکسی سے کرتی ہے۔ جب ساپچے ٹھنڈے ہوتے، وہ ساپچے توڑ کر اُن میں سے برتن نکالتے انہیں چھینی سے تراشتے، خراڈ پر چڑھاتے، نوک پلک سنوارتے اور رابی سے کھچ کر اُن میں دھندلی چمک پیدا کرتے۔ جیسے جیسے برتن شکل بدلتا جاتا ویسے ویسے اُس کا نام، ایسا برتن کورا کہلاتا۔ پھر کورے پر مٹار بندی (پیتل اور تانبے کے برتنوں پر گول نشان) کا کام شروع ہوتا۔ ہر بڑھڑاؤ مرہون ساز ہے لیکن وہاں برتن، بستار اور ہتھوڑا، مضراب تھا۔ ٹھیلے بے تاب چون کو بوری پر اکٹھی کرتے لیکن اُس کا کچھ حصہ زمین پر بکھر جاتا، جسے اٹھا کر ناممکن نہ تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے کسی خاص زادیلے سے زمین کا وہ حصہ سونے کی کان کا دہن نظر آتا۔

سڑک کی دوسری شاخ، ہندو مسلم ہائی سکول کے سامنے ہوشیار پور، ہریانہ کی پچی سڑک میں مل کر نابود

## گیان سنگ شاہ

ہو جاتی۔ ان دونوں سڑکوں کے ملاپ سے جو زاویہ بنتا، اُسے ہریانہ سے باہر نکلنے والی سڑک کا ٹی آؤٹے متساوی الاضلاع مثلث میں بدل دیتی۔ وہ ٹکون برابر کے تین حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصہ شام چوراسی کی سڑک سے لگتا تھا، وہ مولے میاں کے قبضے میں تھا اور دوسرے دو حصے میرے بھائی جی کے۔ ہماری ٹال کے سامنے سا دھوڑا کا باغیچہ تھا اور پیچھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی۔ ہندو مسلم ہالی سکول سے آگے بسوں کے آؤے کی طرف پادری کی کوٹھی تھی، پھر امرودوں کا باغ اور پھر سلو ترخانہ۔ سلو ترخانے اور میرے سکول کے درمیان ایک سڑک تھی جو فزیر دی بسی کو جاتی تھی۔ میرے سکول کے مغرب میں دیال سنگھ کا کارخانہ تھا جہاں وہ خریاں، برنجیاں، گل میخ، قفل بناتا تھا۔ اہل سالوں کے بھتیوں پر ہال پڑھاتا تھا۔ اُس کے سامنے سڑک کے پار تھا نہ ہریانہ تھا۔ سکول کے شمال میں سر اسے تھی جس کی ساری تصویر چھوٹی اینٹوں پر بنی تھی۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ اپنے سکول کے محل وقوع کا روج پرورد پہلو تو میں بھول ہی چلا تھا۔ میں خوش ہوں کہ وہ عین وقت پر

یاد آیا ہے اور میری روحانی مسرت کی پذیرائی کا باعث ہوا ہے۔ تمھانے کے پیچھے کھلے میدان میں جتا سنگھ رام گرھیا اور اُس کے ارکان خاندان کی سادھیاں تھیں۔ ان کی طرز تعمیر اکڑا اور پارہ تھی، جو سنگ تراشی اور استرکاری اور نگہ سازی کا کامل نمونہ تھی۔ ان کا زوال بھی ایک طرف کمال کی کہانی تھی اور ان کی فراموش شان و شوکت کی بے لوج سرکشی۔ چلیچلاتی دھوپ، کرکٹی سردی، طوفانی بارش، تیز آندھی، ناخواندہ سیلانیوں کی دست درازی .... وہ کون سی بلا تھی جو ان کے سر پر سے نہیں گزری تھی پھر بھی ان کے بستی رنگ کی چمک بھکی نہ پڑی تھی، جہاں روشنائیوں اور دروازوں کی کمانوں کی لگری کہیں کہیں ٹوٹی ہوئی تھی۔ لیکن اُس تعمیر کی باقی ساری خوبیاں جوں کی توں تھیں۔ کوئی اُسے ٹھیک سے جھڑپوچھ ہی دے تو وہ نئی کی نئی لگے۔ اُس شوکت رفتہ سے اپنی نسبت ملا کر میری نفسیات ہی بدل جاتی۔ میں دوسری ذات کے لوگوں کو بدترین اور آذلل مخلوق شمار کرتا اور یہ خیال کر کے خوش ہوتا کہ میں کتنے بڑے آباؤ اجداد کا وارث ہوں۔ وہ سادھیاں دو سو سال قدیم ہوں گی لیکن مجھے لگتا کہ وہ سنت جگ سے، تریا جگ سے، دو آپر جگ سے .... جگا جگ سے وہیں ہیں اور گل جگ بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ میں اپنی بڑائی میں مجھ سے کرتا کہ جگ، ان سے ہیں نہ کہ یہ جگوں سے۔ میں اپنے خیال میں اُس دنیا میں پہنچ جاتا جہاں زندگی اور موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، صرف ابدیت ہے، جس پر ہر مذہبی آدمی اپنے انداز میں ناز کرتا ہے۔

سکول میں میرا نام نئی جماعت چڑھنے سے پہلے لکھوایا گیا تھا۔ میڈما سٹرنی بخش گھر آئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ بیٹا ہریانہ آنا اور اپنا سکول دیکھ جانا۔ اور ایک دن جب سورج رونی کے گالوں سے بادلوں کو بریلے پہاڑوں کی طرح چمکا رہا تھا اور ان کا پردہ دھرتی کو عجیب طریقے سے روشن بنا رہا تھا، میں اپنے سکول کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا، "سکول کے اندر کیا ہوگا؟"

سکول کی کرسی، سرک سے قد آدم اُچی تھی، جس کے اوپر پہنچنے کے لئے سینٹ کی میزھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے غماتے پر دوستوں پر محراب تھی جو ہری کالی بیل سے ستونوں کے نیچے تک دھکی ہوئی تھی محراب سے آویزاں لاگروں (بیل کی شاخوں) کو محراب ہی کی شکل میں کاٹا گیا تھا۔ میں اُس حُسن کاری سے لطف اٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھا اور ایک بھر پور منظر میں گھر گیا۔

میں مناظر کا دلدادہ ہوں اور مجھے حسین منظر ایسے پسند ہے جیسے پیٹو کو لذیذ کھانا۔ منظر کا نظارہ کرنے سے مجھے جو خوشی ملتی ہے اُس کی راحت ابعادِ شلاش کی ہی ہے۔ میں اُس کی داد دینے سے احتراز کروں تو میری روک میری روحانی کو قوت بن جاتی ہے لیکن میری طبیعت میں میری خوشی ایک تخلیقی تحریک ہوتی ہے۔

اُس صورت کی نرالی خوبصورتی یہ تھی کہ وہ کار ساز فطرت کے برعکس انسانی فکر و کاوش کی پیداوار تھا۔ سرور بھی کی ایک رنگی پر اپنی ہمدانی ظاہر کرنے کے لئے مالی نے پودوں سے پھرتیاں، گل دان، سپاہی، ہل دار ترانے، بوے تھے جن پر اُفلی ہونے کا گمان ہوتا تھا لیکن مہندی کی ٹٹی ہو ہو دیا کرتی تھی۔ اُس کی اونچائی میرے قد سے اتنی نیچی تھی کہ میں اُس کے پار کیا ریاں دیکھ سکتا تھا۔ بڑی روش سکول کے صحن کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی اور پھر چھوٹی چھوٹی روشوں میں ایسے بٹ جاتی تھی جیسے کیا ریلوں کو آغوش میں لے رہی ہو۔ روشوں پر اینٹوں کا لال سفوف بچھایا ہوا تھا۔ وہ نظر گاہ اپنی جگہ یوں لگتی تھی جیسے لطف دید کے لئے جسٹ گلس کی رگیں کھلی چھوڑ دی گئی ہوں گی تھ کے بڑھکیلے رنگ، آنکھوں کو چندھیا رہے تھے۔ ذیلیے مستی شباب میں خود کو سنبھال نہ پا رہے تھے اور آڑو اڑوں کے سہارے بھی اڑھکتے لگتے تھے۔ اور گلاب!

سارے دیشال دے وچوں دیش پنجاب نی سیو

سارے پھلاں دے وچوں پھل گلاب نی سیو

اے سکھی، سارے دیشوں میں سے کوئی سُندر دیش ہے تو وہ پنجاب ہے

جیسے پھولوں کا سرتاج گلاب ہے)

محلی داویوں کی کیا ریلوں پر کہکشاں کا گمان ہوتا تھا۔ کیا ریلوں کے باہر روشیں تھیں اور روشوں کے باہر سبزے کا فرش۔ جہاں بڑی روش ختم ہوتی تھی وہاں سفیدے کے دو درخت تھے۔ اُن کے تنے ایسے تھے، جیسے انہیں خراہ پر چڑھایا گیا ہو۔ وہ سکول نہ تھا، نگار خانہ حُسن تھا!

میں بیرری کے نیچے بیرجن رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے گرد سیڑھیوں پر سجائے پھولوں کے گملوں کو سہرا بہا تھا کہ نئی بخش اُدھر سے گزرے۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اور میں نے انہیں۔ میں نے اُس کے بڑھ کر سلام کیا۔ انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھالیا اور اپنے ساتھ دفتر میں لے گئے۔ اُن کے کہنے پر میں نے

انہیں پیٹتے سنا۔ میرے پیٹنے سنانے کا انداز انہیں اس قدر پسند آیا کہ مجھے سنانے کے لئے انہوں نے دوسرے استادوں کو بلایا اور مجھے ان سے متعارف کروایا۔ میں سکول سے واپس آیا تو میں اپنے انداز میں فاتح تھا۔ اس واقعے سے دلچسپ وہ واقعہ ہے جس کا تعلق میرے پہلے سفر سے ہے۔ میری ماں ہریانہ جانے کے لئے تیار ہوئی۔ میں نے اُس کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ زانی۔ اُس کے انکار کی وجہ وہ بوجھ تھا جو اُسے اٹھانے کے لئے ہریانہ کو لے جانا اور لانا تھا۔ میں کسی صورت راضی نہ ہوا تو وہ اس شرط پر راضی ہوئی۔ ”میں راتے میں گود میں نہ اٹھاؤں گی! چلنا ہے تو چل!“

مجھے ہریانہ کا میٹھا سا خیال یہ تھا کہ ماں وہاں جاتی تھی اور مٹھائی لاتی تھی۔ میں اُس کی منظوری پر کھل اٹھا اور بھاگ کر دروازے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ گھر سے روانہ ہوئی، میں اُس سے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے میرے دل میں لڈو بھوٹ رہے تھے۔ میں آگے بھاگتا ہوا پیچھے مڑ کر دیکھتا جیسے اُس کی سست روی پر طنز کرتا۔ میں ایسے چمک رہا تھا جیسے اُس دیوار کی روشنی بڑھانے جا رہا تھا۔ لیکن جوں ہی میں نے گاؤں کی سڑک کو پار کیا میرا خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا گاؤں، باغوں سے گھرا ہوا تھا۔ اپنی جستجو میں، میں جس کسی سے پوچھتا کہ باغوں کے پرے کیا ہے؟ وہ مجھے کچھ اس طرح کا جواب دیتا۔

”لامبر ہے!“

”سین پور ہے!“

”کولہ ہے!“

”ادوآل ہے!“

”شیر پور ہے!“

”ہریانہ ہے!“

ہمارے کھیتوں میں سے کوٹھے جہاں اور کوٹھے باہتیاں دکھائی دیتے تھے اور دوسرے سارے مقامات کو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ باغوں کے پرے ہریانہ نہ دیکھ کر میں مایوس ہو گیا۔ میرا دل بوجھل اور قدم بھاری ہو گئے اور میں نے ماں سے پوچھا، ”ماں، ہریانہ کہاں ہے؟“

”اُن باغوں کے پرے ہے۔“ اُس نے اُمی بے توجہی سے کہا جس کا مظاہرہ وہ کرتی آئی تھی۔

ہمارے گاؤں سے ہریانہ تک باغوں کا سلسلہ جڑنے کے لئے ٹوٹتا تھا۔ میں نے گرتے ہوئے حوصلے کو سہارا دیا، قدموں کو تیز کیا اور اگلے باغوں کے پار جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کچھ نہ دیکھ کر میری ہڈیاں ٹھٹھکی گئی۔ اُس وقت ہم دین دار کے دیر سے کے برابر پہنچ چکے تھے۔ میری حالت پالتو کتے کی سی تھی جو اپنے علاقے کی بونپاکر

پریشان ہو جاتا ہے اور کچھ سمجھ نہ پڑے تو چاروں طرف سونگھتا ہوا وہیں دیک کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی سمت مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں بوجھ سے عاجز تھی، وہ میرے آریل پن سے بوکھلا گئی اور مجھے کوسنے لگی لیکن میرے ارادے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ گٹھڑی پھینک کر مجھے اٹھالے۔ اُس نے ایسا نہ کیا تو میں ایسٹریاں رگڑ کر بات منوانے کا فن آزمائے لگا۔ وہ پھسلاتے پھسلاتے چڑھ گئی اور مجھے میرے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ ہریانہ کی دل کشی میری بے دلی میں گم ہو گئی اور میں گر کر لوٹنے لگا۔ وہ کچھ دور جا کر رُکی اور مجھے بلانے لگی جس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے ایسٹریاں رگڑنے اور چلانے کی رفتار تیز کر دی۔ اتنے میں دین دار کے ڈیرے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ میں نے دہل کر اُدھر دیکھا اور ایسٹریاں رگڑنا اور رونا بھول گیا۔ کتے بھونکتے بھونکتے میری جانب بڑھے، مجھے لگا کہ مجھ پر لپکے۔ میرا ہٹلایا ہوا ہوتا رہا۔ میں اُچک کر اٹھا، ماں کے پیچھے بھاگا اور اُسے جالیا۔ اُس کی شرن پا کر میں نے کتوں کو دیکھا، وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے باغ کی پہنائی میں گم ہو گئے تھے۔ وہ کتے، نرالے کتے تھے! وہ کہیں چلتے، کہیں بھاگتے، کہیں چھپتے، کہیں سامنے آتے، کہیں خاموش کہیں بھونکتے، کہیں ہمارے آگے اور کہیں ہمارے پیچھے ہریانہ کی طرف بڑھتے رہے اور سنبل کے پاس سے بوچر خانہ کو مڑ گئے۔

میں باقاعدہ سکول جانے لگا تو وہ نگار خانہ، میرے لئے دہشت کدہ بن گیا اور میں آزرده و آفسرودہ۔ بڑی جماعتوں کے طالب علم، میرے گالوں پر چٹکیاں بھرتے، میرے چوڑوں میں انگلیاں گھساتے اور میرے چٹے زبردستی لیتے۔ میں لاکھ چاہتا لیکن اپنی حیفا ظلت نہ کر سکتا۔ میں بے معذور بے مقدور اپنے بے ہمت اور بے عزت اعضاء کو دیکھتا جن پر میرے دشمنوں کے حملے، ڈستے ناگوں کی طرح پلٹے ہوتے۔ میں انہیں، جسم سے نوچ کر پھینکنا چاہتا لیکن ویسا نہ کر سکتا، اگر کر سکتا تو میں بہت پہلے اپنے ہی ہاتھوں ختم ہو گیا ہوتا۔ میرے تنہا غم حواری، میرے آتشو تھ لیکن وہ، تجھی کو جلاتے تھے۔

## باب ۱۰

شاطر نگاہ شوق کا محرم آزل سے ہوں  
آدم ہوں کوئی لالہ صحرا نہیں ہوں میں

ماں کے دودھ اور ماں کی زبان کی شیرینی قدرتی طور پر بے مثال ہے۔ پنجابی، میرے لئے ہوا

پانی، روٹی کپڑا، سوچ و چار، تن، من، دھمک، آہنگ، ترنگ، آئندہ سو گنت تھی، مختصر یہ کہ میری زندگی تھی۔ میرے استاد پنجابی آمیز اردو بولتے تھے اور ویسے ہی پڑھاتے تھے۔ اردو میں میری زبان نہ کھلی۔ میں اردو میں بات کرتا جو مجھے کسی اور ہی دنیا کی زبان لگتی۔ اردو اور پنجابی میں گد مڈ شروع ہوتی اور میں دوغی زبان بولنے لگتا۔ اردو الفاظ کی ادائیگی کے لئے میں پورا زور لگاتا پھر بھی صحیح نہ بول پاتا۔ میری زبان کی فطری بے ساختگی جاتی رہتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ میں کوئی غیر حقیقی کام کر رہا ہوں۔

میرے سکول کے کمروں میں تختیاں آویزاں تھیں، جن پر طرح طرح کے اشعار لکھے ہوئے تھے۔ چند اشعار جو مجھے پسند تھے، رقم کرتا ہوں۔

ناک میں انگلی، کان میں تینکا، مت کر، مت کر، مت کر  
آنکھوں میں آنجن، دانتوں پہ منجن، زنت کر، زنت کر

وطن کی بھوک کرباں اداں مصیبت آنے والی ہے  
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی آمد  
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

اول جماعت کو بطور نواس اور باقی طالب علموں کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دودھ اور گڑ چنے پلے تھے۔ میں جب تک پڑھتا رہا مجھے دودھ ملتا رہا۔ دودھ اس قدر گرم ہوتا تھا کہ چھوٹکیں مار کر نہ پیو تو دودھ پینے اور گلاس دھو کر رکھنے میں پوری تفریح گزر جاتی تھی۔

مجھے صفے کی گڑ گڑا ہٹ اچھی لگتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سونا ماروں اور حقہ گڑ گڑاؤں لیکن مجھے موقع نہ ملتا تھا۔ مسلمان استاد، حقہ پیتے تھے اور مسلمان طالب علموں ہی سے حقہ تازہ کروا لیتے تھے۔ جو کوئی حقہ تازہ کرتا وہ خنجر سے کہتا، "جیسا میں حقہ تازہ کرتا ہوں دیا کوئی کر کے دکھائے" حقے کے بارے میں دو الگ الگ مضمون کی منظوم کہانیاں تھیں۔

حقہ ہر کا لاڈلا سب کا رکھے مان  
بھری بھالیں یوں پھرے یوں گویوں میں کان



اور

حَقِّہ کُفرِ خُدا دا چِلَم، حَقِّہ دی رَن  
جِتھے حَقِّہ دیکھتے اوتھے سِیٹے بھَن

(حَقِّہ خُدا کا کُفر ہے اور چِلَم، حَقِّہ کی بیوی ہے۔ اِن دونوں ملعونوں کو جہاں دیکھو

غارت کہ دو)

مجھے حَقِّہ تازہ کرنے میں باریکی دکھائی نہ دیتی۔ میں تمنا کرتا کہ میں بھی حَقِّہ تازہ کر کے اُستادوں کی خوشنودی حاصل کروں لیکن وہ مجھے موقع نہ دیتے۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی کہ میں سکھ تھا۔ اور سکھوں میں کیا حرام ہے اور کیا حلال ہے؛ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، ہاں روایتاً حَقِّہ پینا حرام ہے۔

میں نلکے پر پانی پی رہا تھا کہ حمید حَقِّہ تازہ کرنے کے لئے لایا۔ اُس نے میری مدد چاہی اور میں نے اُس کی بات بخوشی مان لی۔ اُس نے حَقِّہ زمین پر رکھا، ایک ہاتھ میں طاس پکڑا، دوسرے میں قُفلی اور دونوں کو ایک دوسرے کے اُلٹ گھمایا۔ پیچ ڈھیلا ہوا، وہ حَقِّہ اٹھا کر آنکھوں کے برابر لایا اور اُسے کھولتے ہوئے ایسے دیکھنے لگا جیسے بازی گر، منہ میں بانس پکڑ کر بانس کو دیکھتا ہے اور اُس کے توازن پر نظر رکھنے کے لئے آنکھ نہیں چھپکتا ہے۔ آخری چوڑی کھول کر اُس نے نیچہ اچھال کر نیچے گرایا اور مُسکندستی سے اُسے درمیان سے پکڑ لیا۔ اُس کی کار سازی میری دلچسپی اور بڑھا گئی۔ طاس، فرش پر رکھ کر وہ نیچہ تازہ کرنے لگا اور میں نلکا چلانے لگا۔ اُس کا دوبارہ میں میری حیثیت ضمنی تھی اور حمید کی پہلی۔ وہ کاہے کاہے مجھے مسکرا کر دیکھتا جیسے مجھے شہ دیتا۔ نیچے کی مٹھی چپانی کرتے ہوئے وہ نے میں پانی بھرتا اور گال پھلا کر اُسے باہر پھونکتا۔ میں نلکا چلانے میں مصروف تھا لیکن میرا دھیان اُس کے ہاتھوں اور آنکھوں میں اُلٹا ہوا۔ اُس نے ایک آنکھ بند کر کے نے کے اندر جھانکا اور مجھ سے پوچھا:

”تجھے معلوم ہے، میں نے نے کے اندر کیا دیکھا؟“

مجھے کیا معلوم کہ اُس نے اندر کیا دیکھا! اُس کی بات سے میرا شوق بڑھ گیا اور میں نے اُسے جھک کر نے کے اندر دیکھنا چاہا۔ اُس نے نیچہ اوپر اٹھالیا جیسے اُس کی دیکھی ہوئی شے میرے دیکھنے کی چیز نہ ہو۔ وہ نیچہ اٹھائے ہوئے باڑی طرف گیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے باڑے کے اندر باہر دیکھتے ہوئے لوہے کا تار دھونڈ نکالا، اُسے نیچے کی نے اور میروے میں باری باری فلترو کی طرح پھیرا اور پھر انہیں دھویا۔ اُن کے اندر سے گاڑھ پھیلا پانی نکلا جس میں نیکوٹین کے دَرے تیر رہے تھے۔ حَقِّہ کی ہلکی ہلکی باس جو تجھے خوشبو سے مہمانی لگ رہی تھی، تیز ہو گئی۔ وہ نے اور میروے میں باری باری تار گھساتا، نکالتا، پانی بھرتا اور پھونکتا۔ جب تک نیچا دھون (آدوگی) اُگلتا رہا وہ اُس عمل کو دوہراتا رہا۔ اُس نے طاس اُٹا، اُس کا پانی دھون ہی

کا نمونہ تھا سوائے اس کے کہ اُس میں نیوٹن کے مُعلق ذرے نہ تھے۔ طاس تازہ کر کے اُس نے نیچہ لگایا، منہنال کو مٹھی میں دبا کر پُوچھا، ہاتھ منہ دھویا، بائیں تار کو چھپایا اور چلم کے لئے روڑے سے نئی گئی تراشنے لگا۔ یس جیسے اُسی گھڑی کے انتظار میں اُس کی مدد کر رہا تھا۔ میری بے قراری اور اشتیاق پریری ہاتھ کو پہنچ گئی اور میں نے لپک کر کش کھینچ لیا۔ پانی کی دھار سیدھی تالو سے ٹکرائی، کچھ ٹوٹ کر حلق میں اتر گئی، کچھ منہ میں پھنس رہی اور کچھ ناک میں سے باہر نکلی۔ میرے حلق میں پھندا پڑ گیا جسے میں نے کھوکھو کر کے نکالا۔

”اُسے پاگل! حُقّہ ایسے پیتے ہیں کیا؟ طاس بھر کر پہلے اُسے پھونکتے ہیں۔“

حمید نے میرے سامنے حُقّہ پھونکا، زیادہ پانی نکالا اور حُقّہ گڑا کر ڈیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس نے میں وہ دل کشی نہیں ہے جو مجھے اچھی لگتی ہے۔ اُس نے پھر حُقّہ پھونکا اور میری حس کی تصدیق کر دی۔ وہ حُقّہ پھونکتا اور گڑا کر ڈاتا، پھونکتا اور گڑا کر ڈاتا رہا، جب تک اُس نے وہ نمہ نہ سُنا جسے میں بھی سُنتا چاہتا تھا۔

لیمپ سگریٹ کی سُناوی زور شور سے ہو رہی تھی۔ سُناوی کرنے والے لیمپ سگریٹ کے ٹپنے والے کپڑے پہنے سڑکوں پر گھومنے اور چھٹکنے بجاتے ہوئے یہ گیت گاتے،

پانی پیسے پمپ دا

سگریٹ پیسے لیمپ دا

سُناوی کرنے والوں کا آواز، اُونچے پابانوں پر ہوتا تھا جو چلتا ہوا اُچتا اور اُوپر سے سگریٹ کے نمونے پھینکتا جو جس کے ہاتھ لگتے، لگتے۔ سو لگ سگھ اور میں وہ سگریٹ اٹھاتے اور دیال سگھ کے کارخانے سے کوئلے کر کہیں چھپ کر بیٹے۔ ہم دھوئیں کی بدترنگی میں مَرہ لیتے اور فخر محسوس کرتے کہ ہم وہ کام کر رہے ہیں جو بڑوں کا حق ہے۔ میں فالسے کے نیچے چھپ کر سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے گہرا کش لیا جس سے مجھے اُچھو آگیا۔ پر ماتما سگھ، جو بڑی کلاس کا طالب علم تھا، قریب سے گزر رہا تھا، اُس نے دیکھ لیا۔ میں نے ڈر کر سگریٹ پھینک دیا لیکن اُس نے مجھے پکڑ لیا اور کھینچ کر ہیڈ ماسٹر کے پاس لے جانے لگا۔ میں نے مسکین صورت بنا کر غوغا نہ کیا، اُس نے کہا، ”ٹھیک ہے، چھوڑ دیتا ہوں! میری بات مان!“

اُس کی بات ستر اتر تفویض ذات کی تجویز تھی، میں نے اُسے منظور نہ کیا۔ اُس نے میرا ہاتھ تکلیف دہ حد تک مروڑ دیا اور مجھے بے بس کر کے میرے گال توڑنے لگا۔ میں دزد سے چلا یا۔ اُس نے مجھے چھوڑا لیکن مجھ پر نیا ضرب آرمایا۔ وہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے تک جاتا، میری طرف دیکھتا اور مجھے خوف زدہ پا کر لوٹ آتا اور میرے ساتھ زبردستی کرتا۔ میں اُسے روکتا تو وہ پوری دھمائی سے اُسی شیطنت کو دہراتا۔ سکول بند ہوا، وہ گھاتیا میرے پیچھے پیچھے مال تک آیا لیکن بھائیاجی کو سامنے دیکھ کر اُس کے بھی گیا۔ وہ یوں ہی مجھے کئی دن تک دراتا رہا اور اپنا مطلب

نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر بڑی تنگ و دو کے بعد میں نے اُس سے چھٹکارا پایا۔

ہر موسم کے اپنے کھیل تھے لیکن ایک کھیل بے موسم تھا، کسی کا لوٹو بنانا۔ شریر لڑکے پُرزوں پر تحقیر آمیز جملے لکھ کر دوسروں کے پیچھے چپکاتے تھے اور انہیں حرفِ نلامت بناتے تھے۔ گرام، نقالوں کے لئے مخصوص تھا اور سرما، کھیلوں کے لئے۔ ریٹھیوں، کوڑیوں اور پتوروں سے نئی موٹھی اور گچی پالا کھیلا جاتا تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ نشانہ باز تھے لیکن الطاف حسین کا جواب نہ تھا۔ کوئی اُس سے اس شرط پر نہیں کھیلتا تھا کہ وہ بال کو نشانہ بنائے گا اور وہ چوٹوں کو۔ وہ ٹکڑا بھی تھا اور پچا بھی۔ جو کوئی اُسے کھیل میں شریک نہ کرتا، وہ خود بھی رکھیل سکتا۔ وہ اُس کی گچی میں موت دیتا۔ اُس کے من بھاتی اور حسبِ موقع حکایت تھی۔

نہ کھیلنا نہ کھیلنا دینا

گچی میں موت دینا

کھیلنے والے چھپ چھپا کر کھیلتے لیکن وہ تاک میں رہتا اور انہیں ڈھونڈ نکالتا۔ اُس کی شرارت پندری وہ ساری تفریح ہاتھ میں پکڑے گھومتا، نہ خود کھیلتا اور نہ کسی کو کھیلنے دیتا۔

بسنٹ پر پتنگ بازی کے مقابلے شروع ہوتے جو کئی کئی روز تک چلتے۔ کئی لڑکے پتنگ ٹوٹ کر لاتے اور کئی مانجھا۔ ہر کوئی اپنی ٹوٹ کی کہانی جیسے بیان کرتا اُسے داستان گو سنتا تو کان پکڑتا۔ کلاس ہو کر باہر، جہاں کہیں دو حریفوں کو وقت ملتا، وہ اپنی جیبوں سے مانجھا نکالتے اور گھنٹا میری کھیلتے۔

دوسری عالم گیر جنگ زوروں پر تھی فوجی افسروں اور رنکروٹوں کے وفد ہمارے سکول میں آتے، ان کے دل بہلانے کے لئے جلسے ہوتے۔ جھوڑی، قادر یار اور میں یہ کورس گاتے، آنترے کے وقفے میں جھوڑی منہ سے ڈھولک بجاتا، قادر منہ سے چکی کی آدیں اکتارا۔

بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنکروٹ بھرتی ہو جانا

ایتھے ملدے پھٹے پرانے

او تھے ملدے سوٹ

بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنکروٹ بھرتی ہو جانا

ایتھے بلدی روکھی سوکھی

او تھے ملن فروٹ

بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنکروٹ بھرتی ہو جانا

ایتھے پھردے ننکے یادوں

اوتھے ملے بوٹ

بھرتی ہو جانا، باہر کھڑے رنکروٹ بھرتی ہو جانا

عام طور پر جلسے کے خاتمے پر وفد کا انچارج اسکول آف فوج کے بارے میں چند نپے تلے مجھے کہتا اور تالیوں کے شور میں رخصت ہو جاتا۔ لیکن ایک بار اس معمول کے بالکل الٹ ہوا، وفد کا انچارج سارے پروگرام کی نئی اڑاکر سب کو منسا گیا۔ ”فوج میں کتنی مَوج ہے، ہم جانتے ہیں۔ خدا کرے، آپ جیسا سوچتے ہیں ویسا ہی ہو لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا ہوں،

دو پھلکے تاں کرچھا دال دا

ہور منگو تاں حولدار ماردا

دو روٹیوں کے ساتھ صرف ایک کرچھا دال کا ملتا ہے۔ اس سے

زیادہ مانگو تو انچارج حولدار مارتا ہے)

ماسٹر مئس راج ادنی دراموں کے ڈائریکٹر تھے۔ ساہوکار اور پھلوں کا مناظرہ، ان دو دراموں کی شہرت دوسرے سکولوں اور شہریوں تک تھی۔ میں پہلے میں کسان اور دوسرے میں سنگترے کا پارٹ کرتا تھا اور دونوں لیڈنگ کرکٹر تھے۔ میں کسان کے مٹکا لے بولتا ہوا ساہوکار کے پیروں پر گرتا اور فرط جذبات سے رو دیتا۔ پڑھائی لکھائی کے دوران کوئی وقت مجھ پر گراں گزرتا تھا تو وہ مہارنی کا گھنٹا تھا۔ میری کوفت کی وجہ تکرار تھی جس کے بن مہارنی کا لفظ بے معنی ہے۔

تایاجی خود تکرار ناپسند کرتے تھے۔ ”تحقیق، علم کی اعلیٰ تفسیر ہے کیوں کہ یہ علم کے جمود کو توڑتی ہے اور اُسے تحریک عطا کرتی ہے۔ علم کے ساتھ تحقیق کی خوبی منسبک نہ ہوتی تو اس کی حیثیت کلام خدا کی سی ہوتی۔“ تایاجی کہتے تھے، ”ہندسوں کا علم اپنی درستگی کی وجہ سے دل نواز ہے لیکن ہنر اپنی باریک بینی سے خیال ساز اور قصہ فرما ہے۔“ ان کی دانش اور میری فطرت کے لحاظ سے مجھے زراعت اور صنعت پسند تھیں۔ پودوں، پھولوں، پھلوں، اکوں، پرندوں کے نام میرے لئے نہ تھے لیکن ان کی دیگیاں تفصیل شوق آمیز تھیں۔ میں حیران تھا کہ کسی چیز کا کوئی حصہ نہ تھا، جس کا کوئی نام نہ ہو۔ کام نہ ہو۔ سننا سنگھ جس حصے کے بارے میں بات کرتے اُس کی لفظی تصویر کھینچ دیتے۔ کوئی چیز بڑی ہوتی تو وہ طالب علموں کو اُس کے پاس لے جاتے اور چھوٹی کو کلاس روم میں اٹھالاتے۔ جو چیز کھولی جاسکتی اُسے کھولتے اور دوسری کو چیر بھاڑ کر میز پر رکھ دیتے اور اُس کے افعال و فوائد بیان کرتے۔

وزخوں کی کروڑوں لقمہ نام ہیں۔ دیو قامت اور دراؤنے برگد سے لے کر، نازک اور پیارے پھولوں

کے بودے تک ان کے زمرے میں آتے ہیں۔ میں نے ہریانہ کے حکیم پردھان کی زبانی سنا ہے کہ حقیقہ گھاس بھی انہیں کے خاندان کا ایک نہایت کارآمد فرد ہے۔ ان کی بات نیم دریافت شدہ تہذیب و ثقافت کی حقیقت ہے۔ اس تہذیب میں ہر شہری کی انفرادیت لائق جواب ہے۔ اس کے اپنے حسبِ نسب، طور طریقے اور رنگ و دھنگ ہیں۔ یہ اپنی کیفیت و ماہیت کی حفاظت جس احتیاط و اہتمام سے کرتا ہے، اُس پر غور کرنا علم و تحقیق کے پوشیدہ نکتے پانا ہے۔ ملک نباتات کا ہر شہری دوسرے شہری سے لاگ رکھتا ہے لیکن نوعِ انساں کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ، جو مضر صحت ہے، لیتا ہے اور آکسیجن، جو صحت کے لئے اکیر ہے، دیتا ہے اور ہوا کو مہلک آلودگی سے صاف کرتا ہے۔ اس کی ساخت آدمی کے برعکس ہے لیکن ہے بالکمال! پتے اس کے پھیس پھڑے ہیں اور گودا، گوشت، ریشہ، رگیں ہیں اور تاریر ٹھکی ہڈی، چھال، کھال ہے اور جڑیں، ہاتھ جو کیا کر ہیں۔ وہ زمین کے نمکداں میں سے بھانت بھانت کے نمک چختے ہیں، ان کی ترکیب بدل کر مفید مرکب تیار کرتے ہیں اور انہیں دُرخت کے الگ الگ حصوں میں جمع کرتے ہیں، اسی لئے تو پھل، پھول، پتے، چھلکا، گودا ... ہر حصہ اپنے طور پر مکمل دوا ہے۔ یہ انوکھے شہری، اُطبا و ادویہ دونوں ہیں اور مزید فطرت کے خیراتی شفا خانے اور ان کے بے اجرت کارندے۔ ہر کسی کی کتنی ایسی خوبیاں ہیں جن کے بارے میں حکمانے کیا ہیں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں اور ہر بار کچھ نہ کچھ نیا انکشاف کر رہے ہیں۔ اس سے دُرختوں کے پُر اسرار کردار کا نشانہ ملتا ہے۔

پیسپل کی ایک خوبی ایسی ہے جس پر حکما کے بجائے ماہرِ نفسیات کی رائے دے کر رہے۔ یہ کُنوار یوں کا ہمہ قد ہے۔ یہ ان کے لئے ان کی پسند کے دوا بے تلاش کرتا ہے اور بدلے میں اپنی پوجا کرواتا ہے۔ پھولوں میں نر اور مادہ ہیں اور تتلیاں، شہد کی مکھیاں، بھونرے، ہوا کے جھونکے ان کے پھولے۔ یہ اپنے جھمانوں کو آپس میں ملاتے ہیں اور ان کی جامد حسِ آفرائش کو متحرک بناتے ہیں۔ ان کے بیج ان کے روحانی دنیاوی وارث ہیں جو ان کی سیرت، خصوصیت، کیفیت، ماہیت ... کو قطعی طور پر اپناتے ہیں اور ان کے نسلی تسلسل کی ضمانت بننے ہیں۔ قارئین! آپ اپنے بچپن ہی سے پھول دیکھتے آئے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے! وہی پھول، شاخ سے اپنے آپ گرتے ہیں جو اکھرے ہوں اور ساق رکھتے ہوں۔ پھولوں میں کچھ پھول مائل خود ہوتے ہیں۔ ان کی فطری ماہیت دوسرے پھولوں سے بالکل الگ ہے۔ ان کے حاملِ زر، پنکھڑیوں سے اونچے ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے پھولیوں کو کھا جاتے اور ان کے ساتھ خود بھی نابود ہو رہتے۔

تایاجی کے کہنے کے مطابق دُرختوں کا وجود، نوعِ انسان کے برعکس ہے۔ آدمی کی ناتمامی ہی اس کی نارسائی ہے اور سارے دکھوں کی جڑ مूल۔ فطرت میں ہر شے اپنے لئے سرشار نظر آتی ہے کہ وہ اپنی جگہ کا مل ہے

یا مائل بہ کمال ہے۔“

پھول کے تمام حصے اپنے اپنے طریقے سے اُس کے پالن پوس میں شریک تھے لیکن دیکھا گیا طریقے سے پنکھڑیاں بیکار شے تھیں۔ میں اس انکشاف پر حیران ہوتا اور سوچتا کہ ماسٹر جی کہیں بھول نہ کر رہے ہوں پنکھڑیاں پھول کا روپ ہیں، سُروپ ہیں، بناؤ ہیں، سنگاریں۔ پنکھڑیوں ہی سے پھول پھول ہے تمام وکال اور مدلل نظم فطرت میں مجھے پنکھڑیوں کی بے آبروئی اچھی نہ لگی۔ میں اُن کے حسی وجود میں معنی تلاش کرتا لیکن ناکام رہتا۔

سکول کا سالانہ جلسہ تھا۔ ہنس راج نے مجھے اقبال کی ایک آرزو یاد کرنے کے لئے دی۔ یہ نظم ہمارے نصاب میں تھی، وہ اُسے کسی دوسری کتاب سے نقل کر کے لائے تھے۔ میں یوں ہی اس مصرعے پر پہنچا،

سُرخ لے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

گویا میں نے فطرت کا بڑا راز پایا۔ میں بھاگا بھاگا سنٹا سنکھ کے پاس گیا اور بے اختیار کہا، ”ماسٹر جی! ماسٹر جی! پنکھڑیاں فضول شے نہیں، پھول کا لباس ہیں۔“ اور انہیں اقبال کا شعر سُنا دیا۔

رہندی لگائے سورج جب شام کی دہن کو

سُرخ لے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

سنٹا سنکھ کچھ زیادہ ہی دیکانی تھے۔ وہ میری دریافت پر خوش نہ ہوئے اور میری بات کاٹ کر بولے ”شاعری میں ٹھیک ہے کیوں کہ شاعری تو ایک فضول چیز ہے۔“

وہ شاعری کے مداح تھے اور اکثر خوبصورت اشعار سُنا تے تھے۔ وہی جانیں! انہوں نے میری بات کو کیوں رد کیا؟ میں جس قدر مغرور مغرور اُن کے پاس گیا تھا اُس سے زیادہ شرمندہ شرمندہ واپس آیا۔

چنانچہ سنگھ فارسی پڑھاتے تھے لیکن تعریف پنجابی کی کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پنجابی، فارسی سے بڑی زبان ہے۔ وہ فارسی اشعار کے ہم معنی پنجابی اشعار سُنا تے تھے، جو یاد کرنے میں آسان ہوتے تھے۔

فارسی شعر ہر جا کہ ردِ قدم شریفا

نہ فضلِ ریح بود نہ خریفا

(یہ ایسے شریف ہیں کہ جہاں قدم رکھتے ہیں وہاں ریح کی فصل ہوتی ہے اور نہ خریف کی)

پنجابی شعر جدوں دے جتے چند رہان

چھلے آگ نہ منجے بان

(جب سے چند رہان پیدا ہوا ہے، گھر کی یہ حالت ہے کہ نہ چولہے میں آگ ہے اور نہ

نہ چار پائی میں بان،

فارسی شعر از مکافاتِ عملِ غافلِ مشو

گندم از گندم بر وید جو ز جو

(اپنے عمل کی سزا سے غافل مت رہ! گندم سے گندم اگتا ہے اور جو سے جو)

پنجابی شعر خربوزے خربوزہ پھلدا تھے پھلدا تمّا

شاہاں دے پت شاہ کہاوندے مجھے داپت جُما

(خربوزے کے بیج سے خربوزہ پیدا ہوتا ہے اور حنظل کے بیج سے حنظل،

ایسی طرح شاہ کا بیٹا شاہ کہلاتا ہے اور موچی کا بیٹا موچی)

فارسی قطعہ زنانِ بارور اے مردِ ہشیار

اے مردِ ہشیار، اگر حاویہ عورت

اگر وقتِ ولادت مار زاید

سانپ کو جنم دیتی ہے

از ان بہتر کہ نزدیکِ خرد مند

تواہلِ خرد کے نزدیک یہ اس سے بہتر ہے

کہ فرزند ان ناہنجار زاید

کہ وہ گمراہ بیٹے کو جنم دے۔

پنجابی قطعہ ہے جھنی جے توں جئے

جَن داتا جال سور

نیں تاں جھنی باہنجھ رہ

کا ہے گنوائے نور

(اے ماں! تو جھنے پر بھند ہے تو فیاض پیدا کر یا بہادر! ایسا نہیں کر سکتی تو

بچے جن کر اپنی بدنامی نہ بن)

## باب ۱۱

پاتا ہوں اپنے پر تو مستی سے کم اُسے

گرمی تو ہے شعور نہیں آفتاب میں (شاعر)

میں نے انوکھے بالکل انوکھے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ میرے مدد سے روایتی مدرسوں سے نرا لے تھے۔ قدرتی مناظر میرے صحیفے تھے اور درخت، پھول، پھل، پتے، پرندے، بچھرنے... ان کے اوراق ان کی وضع، ان کی عبارت تھی اور نظارگی، معنی بیانی۔ ان کے درمیان میری زندگی، تحریک ہم رنگی تھی اس لئے مرہونِ بیاں نہیں ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں تو یہ میری کاوش خود آرائی ہے۔

آسمان پر آفتاب، آتش انوار ہے اور گیتی پر وجہ لیل دنہار۔ دھڑکی گئی اُسے دیوتا سمجھ کر پوچھتے ہیں اور اُسے خوش رکھنے کے لئے اُس کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ لیکن اُسے اپنی حمد و ثنا سے سروکار نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنا سُن و کمال بھی آپ ہے اور اپنا جاہ و جلال بھی آپ۔ اُس کی روشنی اُس کی خود نمائی کی آن بان ہے۔ اُس کی بے پایاں خوبی! وہ اپنی جانب داری میں غیر جانب دار ہے اور اپنے اعلان میں بے اعلان! میں ہوں!! میں رہوں گا!!!

آر آدمی کی وضع داری اس کی غیر وضع داری ہے۔ یہ ظاہری طور پر گروہ پسند ہے لیکن اندرونی طور پر شیدائے تنہائی۔ باہمی مفاد میں خود غرضی کا حامی ہے اور دوستی میں دشمنی کا۔ اس کی اپنی گون ہو تو یہ پہاڑ کھودتا ہے ورنہ پاس پڑا تنکا نہیں اٹھاتا ہے۔ اس کی بیکاری اس کی بیماری ہے اور مصروفیت، بصیرت۔ اپنی بصیرت میں یہ چاند تاروں کی خبر لاتا ہے اور بے بھری میں اپنے ہی وجود سے بے خبر رہتا ہے۔ آسمانی آفتاب کے برعکس یہ دھرتی پر آفتاب ہے اور اس کی روشنی، ہنر ہے۔ آدمی اور ہنر کا نشوونما تو اُم ہے اس کے تاریخی ساتھی حیوانات و نباتات ہیں، جن کا وجود، یارانِ ایثار پسند کا ساتھ ہے۔ ان کی خاموشی کا مفہوم، وفاداری ہے جس میں حُسنِ تسلیم کا پرتو ہے، لیکن جسے دیکھنے کے لئے دُور مند دل کی آنکھ ضروری ہے۔ میں اپنی بے کسی کے لمحوں میں مویشیوں اور پیڑوں سے لپٹ کر دُما اور دُھارس پاتا۔ میرے وہ ساتھی، مجھے اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں سے زیادہ اچھے لگتے۔ باہمی موافقت کے فلسفے کی وہ پہلی کنگ تھی جسے میں نے ناموافق حالات میں اپنے طور پر محسوس کیا تھا۔ رُتوں کا سِلِیلہ ایسا سِلِیلہ تھا جو سِلِیلہ در سِلِیلہ چلتا تھا۔ بسنت میں گریشم تھی اور گریشم میں ورشا، ورشا میں شَرِشہ تھی اور شَرِشہ میں ہم، ہم میں شَرِشہ تھی اور شَرِشہ میں بسنت۔ تابا جی موسم کی گردش کو کاوش انسان سے یوں منسوب کرتے تھے۔

گھم گھم چڑکھڑیا،

توں گھمے، میں تند پادواں

(اے چرخِ گھوم اور گھومتا جا۔ تو گھوم رہا ہے تبھی تو میں کات رہا ہوں)

گر می عروج پر ہوتی اور پُرب کی ہوا چلتی، پیچھم میں دھنک دکھائی پڑتی تو تابا جی، اُس درش سے



رہنمائی کرتے، برکھارت آ رہی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بادل اُمنڈ گھنڈ کر آنے لگتے۔ انہیں دیکھ کر لگتا کہ پُرب میں اکاش سے اُڑے کالے برس رہے ہیں جنہیں ہوا اُڑا کر پچھم میں لا رہی ہے۔ کسان کہتے، بیاسی دھرتی کی پیکار سُن کر مندر سے ہوا پانی پی کر آئی ہے۔“ بادلوں کے اُڑتے ہوئے پہاڑ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لئے آپس میں دھکم دھکا ہوتے اور گرجتے جیسے مقابلے کی چیتاؤنی دیتے۔ اُن کا نظارہ دل دہلاتا اور رگوں میں ترنگ بھلی دوڑاتا مین ناچتا ہوا لگتا،

رَبَّارَبَا مینھ برسا

میری کوٹھی والے پا

اُگے ہی اُگے بڑھتا ہوا بادل ایسے پیچھے مُڑتا جیسے پہاڑ نے اُسے راستہ نہ دیا ہو۔ وہ منظر دیدنی رہتا! موردوں کی تیکھی چہکار سے باغ کو بجتے اور پیسیہ کی مدھرتی ہوئے پھنچ چپکتے۔ بُجارات سے بوجھل بادل برحقوں کی چوٹیوں سے اُلجھتے اُڑتے۔ مین چھت پر چڑھ جاتا اور اُچھل اُچھل کر بادلوں کو پکڑتا اور اُن میں اُٹتا وافر محسوس کرتا۔ مینھ کیا برستا، زنگ برستا! بڑول بھاگتے ہوئے پناہ ڈھونڈتے اور مستانے بھگتے ہوئے تان راتے۔ فضا یوں ہلکتی جیسے عطارِ فطرت، خوشبو لٹا رہا ہو۔ گھروں کی رونق کلیوں میں آجاتی، بچے شور مچاتے، اپنی اُڑاتے، پتوں کی کشتیاں تیراتے اُن کے پیچھے بھاگتے، جان بوجھ کر گرتے اور خوش ہوتے۔ انہیں دیکھ کر جین ہوتا کہ دنیا میں کہیں مستی و ترنگ ہے تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہے۔

میں بھینکتا ہوا لگتا،

ساؤں کے نظارے ہیں، آہا آہا!

عدالت یار ہارمونیم پر پہلار کا الاپ کرتا،

”مدنا تجھ بن ساؤں اُگ لگائے“

اُس مدھرتے کا اثر! میں اپنی شوخی بھول جاتا اور کھیلنا چھوڑ کر عدالت یار کے پاس پہنچ جاتا۔ اپنے الاپ میں مگن اُسی جذبے کی آگ میں جلتا لگتا جس کی وہ سادھنا کر رہا ہوتا۔ ماں کا ہلکا سا بلاوا سنائی دیتا۔ درمیں پہلار لگتا ہوا گھر کو بھاگتا۔ ہوا کی تاثیر ہی بدل گئی ہوتی۔ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی لہر کی سی ہوتی اور سونہری سونہری و شبوئے خالی۔ خفی پرنالا، جنگی پرنا لے کی طرح بہتا ہوتا۔ ماں اُس کی طرف اشارہ کرتی اور حکم و التجا سے کہتی، جا بڑنا لے کے نیچے نہالے، پت مر جائے گی۔“

سویا ہوا ماحول ایک دم جاگ پڑتا۔ مینڈکوں کی گڑبگڑیں، جھینگڑوں کی ریں ریں، بوندوں کی

ریم جھم.... اور کتنے ایسے نغمے سنائی دیتے، جنہیں نام نہیں دیئے جاسکتے۔ ہر نغمہ اپنا جادو جگاتا اور اپنے طور بگھاتا، لگتا کہ برکھارانی اپنی راجدھانی کے ہزاروں گلوکاروں کے ساتھ دھرتی کی سیر کر رہی ہے۔ وہ خوش اطوار اور وفادار گلوکار گاتے، گاتے، گاتے.... اور اپنا پورا وقت اُسی دھن میں گزارتے۔ رات اور دن اپنی اپنی لطافت کا تماشا اپنے اپنے طریقے سے کرتے۔ رات اپنے آفاقی مہمان کی دل نوازی کے لئے اُڑتے ہوئے فانوس روشن کرتی تو فضا آسمان در آسمان نظر آتی۔ وہ کوئی کم خیال تھا جس نے اُڑتے ہوئے فانوس کو جگنو کہا تھا۔ اُس دل نواز ماحول کی شان بڑھانے کے لئے رات کے جاں باز سپاہی، پروانے اپنی بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگ سے لڑتے تو تاریخی جو دھاؤں کے ساکھ پھیکے لگتے۔

نباتات و جمادات کے روپ ایسے نکھرتے جیسے بیمار عسلِ صحت کر کے نئے پکڑے پن لیں۔ پانی، مٹی کی روحانی طاقت کو تخلیقی تحریک میں بدل دیتا۔ سیدھے سادے درے اپنی حقیقت پہچانتے، کایا پلٹے اور رنگ و بو کی صورت ظاہر ہوتے۔ انکھور، لطیف نظاروں سے پھیلتے اور بدولت برگ و بار انتہائے کمال کو پہنچتے۔ چشمِ نظارہ میں میں احساسِ شعور کی کسک ہوتی تو حُسنِ آفرائش کے وہ اسرارِ ظہور پزیر ہوتے جو بصورتِ دیگر تحقیقِ آدم پر منسوع ہیں۔ ہوا چلتی تو لہرائی ہوئی کھڑی کھیتی، ٹھانھیں ماتا دریا لگتی۔ کچھوؤں، ہزار پائیوں، مکلوں، بتیلوں، بھوئروں، گھونگلوں، مکڑوں، مکوڑوں، چیونٹوں.... کے دل گھومتے، جیسے الگ الگ راجدھانیوں کے راجے نئی نئی زمینوں کو فتح کرنے کے لئے نکل پڑیں۔ خود رو پودے، جیسے چوکا (ترشہ)، اکلفہ (خُرنف)، اگوکھرو (خار خنسک)، کلمی، بتھوا، مینا، کھمب، کھکھی، اذخر، کاک، ماچھی.... اپنی بہار آپ ہوتے۔ اُن کے بارے میں تایا جی کہتے تھے، ”یہ جڑی بوٹیاں نہایت شدہ آزمودہ مُستعمل دوائیں ہیں“ لیکن کھیتی کے لحاظ کو اُن کی جتنی ضرورت ہوتی اتنی ہی رکھتا اور باقی اکھاڑ کر بھینک دیتا۔ تایا جی اُس عمل کا جواز پیش کرتے، ”اچھی چیز بھی ضرورت سے زیادہ ہو تو بُری ہے۔“

الگ الگ مینھ کی الگ الگ اہمیت ہے۔ بھوئیاں بھوئیاں مینھ کے بارے میں کہاوت ہے کہ رحمت برتی ہے۔ کھیتی کے لئے پھوار واقعی کھا دچھڑکنے کے برابر ہے۔ جھڑی کو ہر کوئی ملٹون سمجھتا ہے۔ گرہنیاں اس لئے کہ مکان چوڑے لگتے ہیں اور ایندھن گیلے ہو جاتے ہیں، کسان اس لئے کہ بہاؤ میں کھیتوں کی زرخیزی بہہ جاتی ہے۔ لیکن بچوں کے لئے جھڑی، حُسنِ فطرت کے انمول تحفے لے کر آتی ہے۔ جوں ہی دن نکھرتا ہے گرمی کے ابال سے بیر بھوٹیاں پیدا ہوتی ہیں جو سبزے میں چلتی پھرتی، زندہ لالوں کے ٹکڑے لگتی ہیں۔ اُن کو سبج بھاد میں دیکھنا کتنا خوشگوار ہے لیکن بچے انہیں قید کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بیر بھوٹی کے بارے میں ایک چوپائی یاد آ رہی ہے۔

ایک نار کر تار بنائی  
سگرے تن پر لالی چھائی  
اور کہوں کیا اس کے آگے  
نام نہ لوں پر بھابی لاگے

آب و ہوا کی تغیر پذیری میں کائناتی حُسن ہوتا۔ مشرق ہو کہ شمال مشرق، شمال ہو کہ شمال مغرب، مغرب ہو کہ جنوب مغرب، جنوب ہو کہ جنوب مشرق۔۔۔۔۔ رنگوں کا نظارہ حُسن در حُسن ہوتا۔ لال میں گلابی پیلے میں نارنجی، ہرے میں مونگیا، نیلے میں آسمانی، سفید میں ڈھیلا، کالے میں سُرمئی۔۔۔۔۔ اور سُرمئی میں ہلکا سُرمئی ہوتا۔ اُس کینواس کی زرا لی خوبی یہ تھی کہ وہ نظر نظر بدلتا تھا اور پہلے سے زیادہ دل کش نظر آتا تھا۔

ٹانڈے (مکئی کے پودے) کا ٹھکڑا ٹھکڑا منجلی (پھول) تنک پہنچتے تو کیسا منجلی کاٹ لیتے۔ اُن کی روایتی سوجھ بوجھ میں یہ بصیرت، دیکھنا تنک اور فائدہ مند تھی۔ ٹانڈوں پر کئی کئی بھٹے بھٹتے۔ اُن کا سوت سفید سے پیلا، پیلے سے بھورا ہوتا اور اس بات کی خبر دیتا کہ دانے دودھ سے بھر گئے ہیں۔ میں مٹھانیا کرنے کے لئے مٹھا توڑ کر لاتا اور اُسے پردوں (بھٹے کے دانوں پر ہرے پتے) سمیت اُگ پر بھون کر چروندنا دانتوں سے نوچ کر کھانا، اور اس بولی کا مفہوم سمجھ بغیر بولی لگاتا۔

بلے بِلے، بھئی بابا تیری پچھیاں نے  
دوہ دے پنڈ دے چروندے سارے

(پنجابی میں جوان لڑکی کو طنزیہ کچھی (کچھڑی) کہتے ہیں اور کم سن لڑکے کو دودھا (جس بھٹے کے دانے، دودھ سے بھرے ہوں) چوں کہ دوہنے کے دانے اُکھارنے ممکن نہیں، اُسے دانتوں سے چوس اور چوڑ کر کھاتے ہیں۔ کوئی شاعر کسی بوڑھے سے مخاطب ہے۔ بابا، تجھے معلوم ہے! تیری لڑکیوں نے گاؤں کے سارے لڑکے چوڑ لئے ہیں)

پنجابی بولیاں فریبے بی کی حد تک دو مٹی ہیں۔ ان کے پہلے بول کسی خاص مفہوم کو ظاہر نہیں کرتے لیکن آخر میں بمب کی طرح پھٹتے ہیں۔ یہ کبھی سارے سماجی رشتوں کو مسمار کرتے ہیں، کبھی اُداس دلوں سے قہقہے لگواتے ہیں اور کبھی زن و مرد کی اُن پوشیدہ حرکتوں کو کنایوں میں کہتے ہیں، جن کا کھلا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔

لدی جاناں اے کرؤ دے ٹانڈے  
رس پی گئے پنڈ دے مُنڈے

(کوئی دلہا، نئی دلہن کے ساتھ جا رہا ہے اور کوئی من جلا اُس پر طعن کرتا ہے۔ تم بھوک لئے

## گیان سنگ شاہ

جار ہے موجب کرس (اس گادوں کے (لٹکے پیچھے ہیں)

سارا گھر چھان ماریا

لونگ سوہنے دی چھان چوں لبھیا

(میرا لونگ گم ہو گیا۔ میں نے سارا گھر چھان چھان مارا اور آخر لونگ ملا، کہاں سے؟

میرے پیارے کی مونچھوں میں سے)

دھور دنگر سوکھا چارہ کھاتے کھاتے ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے ہوتے۔ وہ ہر (سبزہ) کھا کر پگھرتے (صحت مند ہونا) اور ان کے پنڈے لٹکتے (چمکتے)۔ کہاں ادھا پیٹ کھانے کے لئے وہ پوری چراگاہ میں مارے مارے پھرتے تھے کہاں وہ جہاں کھڑے ہوتے وہیں سے پیٹ بھر لیتے۔

جس دن تجھڑی لگتی، ماں کھیر اور پوڑے پکاتی، رم جھم کا ساز محراب اشتہا ہوتا۔ میں کتنا کھاتا! نہ پیٹ بھرتا اور نہ ہی نیت۔

سادن جانا اور بھادوں آتا، بھرن کی بے ثباتی! مینڈے ادھر جل تھل ہو جاتا اور مینڈے ادھر سوکھا رہتا۔ ایسا نظارہ دیکھتے ہوئے میرا دل کرتا کہ میں جھالے پر کمند پھینکوں اور اُسے کھینچ کر اپنے کھیت میں لے جاؤں۔ جھالے کی آوارگی طرف تماشا ہوتی۔ میں اُس کے سائے کی بیسروی کرتا لیکن چند قدم سے زیادہ کامیاب نہ ہوتا۔

مکئی کاٹ کر کھیتوں میں کھلیاں لگایا جاتا۔ کھلیاں کی گرمی، مکئی کو ڈنڈی پر نرم کر دیتی جس سے اُسے توڑنے میں آسانی ہوتی۔ مکا توڑ کر الگ ڈھویا جاتا اور کرٹی الگ۔ کرٹی کے چارے کو موشی منہ نہ لگاتے جب تک کہ اُس میں برسم نہ ملایا جاتا۔

میں جو لکھتا ہوں، سریندر کو سناتا ہوں۔ وہ کئی بار مجھے کھری کھوٹی سناتی ہے اور کئی بار سرائتی ہے۔ میں نے اُسے یہ باب سنایا تو اُس کا رویہ الگ پایا۔ اُس نے مجھے بے اعتمادی ذات کی وہ نفسیات بتائی جو کام کی زندگی ہوتی ہے۔ میں گادوں میں تھی۔ ساؤنی آئی، اندر اور باہر مکوں سے بھر گیا۔ مجھے کھلیں کھانے کا شوق چرایا۔ میں نے دو مکے اُگھیرے (مکے کے دانے اُلٹوٹھے سے دبا کر نکالنا) اُلٹوٹھوں پر چھالے پڑ گئے۔ مجھے اس در سے تپ چڑھ گیا کہ وہ مارے مکے اُگھیرنے پڑے تو کیا ہو گا؟ دوسرے دن دو مزدور آئے، انہوں نے سونے مارا کر دانے الگ اور مکے (دانوں کے بغیر مکا) الگ کر دیئے۔ مجھے بڑا مزہ آیا اور میرا بخار اُتر گیا۔

گو آ کر جوڑے کا دوا کر کہا جاتا ہے۔ اُس میں موسم بدلنے لگتا اور ساتھ ہی ہواؤں کا رخ، پھر اچانک کعبہ کی جانب گھسائی اور ایسی حم کر رہی کہ آل سے آل ملا جاتی، کسان دین رات بے جلا تے، دہڑوں (پڑتے زمینوں)

کو قابل کاشت بناتے اور گندم بوتے۔

ہمالہ کی طرف سے اُرتی آتی کوئٹہ کی ڈار کے بعد ڈاریہ خبر دیتی کہ سردی بڑھ رہی ہے۔ جوں ہی ڈاروں کا سلسلہ بند ہوتا، ہمالہ کی چوٹیاں برف سے لد جاتیں اور آسمان کو چھونے لگتیں۔ مویشی برآمدوں سے کمروں میں باندھے جاتے۔ درخت، پتے ایسے گرا دیتے جیسے وہ غیر ضروری بوجھ ہو۔ ان کا بے مروت رویہ شانوں کو باہنھ ماؤں کی گود کی طرح سونا اور ویران بنا دیتا۔ میں جھارڈولے کر جاتا اور پتے اکٹھے کر کے لاتا۔ انہیں حیوانوں کے نیچے بچھانا اور تحشوں کر تاکر میں، ان کی انسان دوستی کا حق ادا کر رہا ہوں۔

پودوں اور گھاس پر سے شبخی موتیوں کے گجرے گئے غائب ہو جاتے جیسے مادرِ فطرت نے انہیں اکٹھا کر کے موزوں وقت کے لئے محفوظ کر لیا ہو۔ دھوپ میں ماں کی گود کی سی نرمی ہوتی جس سے جدا ہونے کو جی نہ چاہتا۔ چھوٹے دن، لمبے اور لمبی راتیں، چھوٹی لگتیں۔ دھند سے مریت سکر تکی اور فضا کا اندھیا راپن نئے طریقے سے منظر کشا اور اسرار افشا ہو جاتا۔ جیسے باؤل کے پیچھے نیلا اکاش زیادہ نیلا لگتا ہے اُسی طرح دھند میں نباتات کی صورت الگ طریقے سے دل پر زبر ہوتی ہے۔ ایسے میں چاندنی رات چھایا داد کی ایسی تصویر دکھاتی ہے جو مقصورِ فطرت کی شوکت پسندی کی کہانی کہتی ہے۔

کہادت ہے کہ ہارٹھی اور ساؤنی کے توڑے کسان، گئے کے رس اور سرسوں کے ساگ سے

جڑتے ہیں

دھرتی، جس کی کوکھ سے زندگی کے اُجالے اور موت کے اندھیرے ختم لیتے ہیں، پدارتھوں میں ایسے نفیس رس بھرتی نہیں کھا کر کام و دہن سرشار ہوا اٹھتے جو پالوں پر بکھری ہوئی رتنی بیلنوں پر سمٹ آتی میٹھا ٹھنڈا رس، کارٹھی نشیلی چھاچھ، گرم نرم گڑ، وہ نعمتیں ہوتیں جن سے بھوک مٹ کر تازہ ہو جاتی۔

میں جنوں کی کوئٹہ ہرے مسالے میں مسل کر کھاتا۔ پرکاش کور اور سورن کور کھیتوں میں ہوتیں تو میں ان کے ساتھ ساگ تڑوا کر ان کی مدد کرتا اور انہیں چھیڑتا،

نی مائیں دیکھ کون آگیا !

کھڑی ہارٹھ مینے سرسوں

(سرسوں مانگہ پچھاگن میں پھونتی ہے۔ ہارٹھ مینے میں سرسوں کا پھولنا انوکھی بات ہے۔ کسی بیبا

لڑکی، جس کا گونا نہیں ہوا ہے، کا شوہر اچانک آجاتا ہے اور گھر میں پہلے اپنی بیابا سے ملتا ہے۔

وہ اسے دیکھ کر شرماتی ہے، اندر بھاگ جاتی ہے اور اپنی ماں کو اپنے پیارے کے آنے کی خبر

سُنانی ہے۔ ادماں ! باہر نکل کر دیکھ کیا ان ہونی ہوئی ہے ! ہارٹھ کا مہینہ ہے اور سرسوں پھولی ہوئی ہے

## گیان سنگھ شاہر

ماہی میرا لٹھ ورگا  
میری گندل جہی جوانی

(گندل) (سرسوں کا شٹوڈ) کی خصوصیت ہے کہ اُسے ہلکا سا باد تو وہ لوٹ جاتی ہے۔ اپنے کرپل شوہر کو پہلی بار دیکھ کر نئی ماہی لڑکی اپنی ماں سے شکایت کرتی ہے۔ ادماں! میرے لئے لٹھ جیسا شوہر تلاش کیا اور میں گندل ہی کو ملی ہوں۔ میرا بڑ بچا کرتے وقت کچھ خیال کرنا تھا! میں انہیں گندل دکھا کر، دبا کر توڑ دیتا۔ وہ اوپر سے غصے سے مجھے تھپتھپا دھاتیں۔ میں ستا سنا بند نہ کرتا تو وہ میرے کان پکڑ کر کھینچتیں۔ میں اندر ہی اندر خوش ہوتا اور باہر ہی باہر رول رول کرتا۔ اڑتے پھولوں کی رنگینی شباب بہار کو شرماتی۔ وہ ضرور بے نکا تھا جس نے انہیں تتلیاں کہا تھا۔ میں کئی بار سوچتا کہ ان کا نام بدل دوں! کھیتوں میں سرسوں پھولتی تو حد نظر بستی چادر پکھی لگتی۔ دھرتی کے اُس درشن میں دوسرے کھیت نئے لباس میں بیوند لگتے۔ بسنت رُست، فضا کی تحریک بن کر آتی۔ درختوں سے خوشبو پھوٹی! کوئیلوں کی خوشبو، پھولوں کی خوشبو، موروں کی خوشبو..... جیسے دھرتی کی رُوح بزبان خوشبو، عظمت انسان کو تسلیم کہہ رہی ہو۔

عدالت بار کھیتوں میں گھومتا ہوا کہیں منڈیر پر کھڑا دکھائی دیتا اور کہیں رہٹ پر بیٹھا ہوا۔ لیکن وہ جہاں ہوتا بسنت کا قصیدہ گاتا سنانی دیتا۔

آنی بسنت سگر بن پھولے

دن لمبے اور راتیں چھوٹی ہونے لگتیں۔ ہمالی کی برف لدی چوٹیاں نظر نہ آتیں، کوئلیں ڈاروں میں اڑتیں واپس جاتیں اور سردی کے جانے کا مژدہ سناتیں۔

بھائیاجی مہروؤں دبھینسا، بھینس اور اُن کے بچے کو اُسٹری سے مونڈتے، اُن کی تیل ماش کرتے اور گوکوں (دیل) اگائے اور اُن کے بچے کو کھیرا کر کے نہلاتے۔ مہروؤں کی جلد شیشے کی سی اور گوکوں کی جلد شیشے جیسی لگتی۔ اُن کے سینک گیروے رنگ دیے جاتے تو وہ کھڑی کا سنگار دکھائی دیتے۔

بیساکھ آتا، رتن بھرے کھیت دیکھ کر کسان پھولانہ سماتا۔ گبر داپنی اُمنگ اور ترنگ کو اپنے طریقے سے ظاہر کرتے۔ وہ جوں ہی کام کاج سے فرصت پاتے، چوپال میں اکٹھے ہوتے اور بھنگڑا ناچتے اور مٹیاریں (دوشیزائیں) گھروں میں گدے۔ لاکھیلوں کی تالوں اور پیروں کی دھالوں سے درو دیوار تھرکتے۔ ہر شے اپنی چنگی اور بے غبی میں بکھری بکھری آدنی نئی نئی لگتی۔

ہاروں (فصل بدماں کھیت) میں گھومتے کسان اعتماد سے جھومتے لیکن آسمان میں بادل کا ٹکڑا بھی دیکھ

لیتے تو خوف سے کہتے، "اِس وقت سونے کے جھینٹے بھی پڑیں تو بُرے ہیں!" اُن کی اُڑنودہ بات، قدرت کے قہر و کرم کی بلی جلی کیفیت ہوتی۔

عدالتِ یار کی باسری پیار کے گیت چھوڑ کر کاروبارِ حیات کی باتیں کرتی،  
 مان کو رے کد گھنگرُو  
 جگے بلد خراسے جونا  
 (میری مان کو ر، گھنگرُو نکال کر لا، آج گورے بیل کو خراس میں جوڑنا ہے!)

کھیتاں وچ سونا اُگیا  
 آساں بیجیاں مان کو رے گنکناں

(اے مان کو ر، میں نے کھیتوں میں کنک بھی تھی لیکن جھنکار! وہاں سونا اُگ آیا ہے)  
 لوہار اور بڑھی کے کارخانوں پر رونق بڑھ جاتی۔ ہتھوڑوں، تیشوں، گھبراڑوں، آروں کی آواز بچھے  
 پہر تک سُناؤ دیتی، نئی درانتیاں بنائی جاتیں اور پُرانی تیز کی جاتیں، سانگے (دوشاخے)، تنگلیاں (کسی شاخے)  
 سبرکتے (اناچ) اکٹھا کرنے کے پھاوڑے، تنگل (رستی کی جال نما چادر) پر چھتی پر سے اُتارے جاتے، مرمت کئے  
 جاتے اور ضرورت ہوتی تو نئے بنائے جاتے اور اُمی طرح سانٹ (مخزنِ کوب)، گدڑوں کے دھڑے چلتاے جاتے  
 بیلوں کو نفل لگائے جاتے، اُنہیں گڑ پھینے کھلائے جاتے اور تیل پلائے جاتے۔ وہ کھری پر کھڑے باجھیں ایسے چلتے  
 جیسے کوئی لذیذ کھانا کھا کر منہ سنوارے۔ گھر بیلے پوتے جاتے اور اُمی طرح ذخیرہ خانے، کُپ کے لئے پُرال  
 کاٹے جاتے اور جوئے باٹے جاتے۔ وہ قبل از وقت تیاریاں کران کی دُور آندیشی کا ثبوت دیتیں کسی نے اُس  
 جاٹ کے جذبات کی خوب عکاسی کی ہے جو باڈی (لالی) سے پہلے کھیتوں میں گشت لگا کر آیا ہے۔

اک کوٹھی ناں گزارہ نہیں ہونا  
 کھتے رپ چار سبیتے

(جاٹ اپنی گھروالی سے کہتا ہے کہ اِس بار نفل اتنی اچھی لگی ہے کہ ایک ذخیرہ خانے کام  
 نہ چلے گا! کم از کم چار کھتے رپ پرت کر تیار رکھ!)

جوں ہی گندم کے گدے دبانے سے ٹوٹنے لگتے، بچے سے لے کر بوڑھے کران، کھیتی سنبھالنے  
 میں لگ جاتے۔ مزدوری کا طریقہ نہرالا ہوتا! لاوے (وہ مزدور جو کھیتی کاٹنے کے لئے لگائے جاتے ہیں) لاؤنی جنس  
 میں لیتے اور ادنیٰ (مدد کے طور پر کام کرنے والے) دعوت کی شکل میں۔ مقابلے کے کام میں ہمت اور برداشت کے  
 اُن تھک مظاہرے دیکھنے میں آتے۔ درانتیاں کھیت میں ایسے چلتیں جیسے رن جموں میں کٹاریں۔ اِس میدان

میں زخمی ہونے والے جو دھے اپنے معالج آپ ہوتے اور ان کے علاج برائے۔ یہ اپنی پگڑی کے لٹے پٹی پھاڑتے، زخم پر باندھتے، اسے پیشاب سے تر کرتے اور جا کر محاذ پر ڈٹ جاتے جسے وقتی طور پر اپنے راہی کے بل بوتے پر چھوڑ آئے تھے۔ کھیت میں مکوے (گدھم کاٹنے والے کے پیچھے کچھ فاصلے پر لگے ہوئے لائی کے ڈھیر) کھیت آئے جو دھوں سے لگے۔ کامکاروں کی سرگرمی کو دیکھ کر چمچلاتی دھوپ پھینکی پڑ جاتی۔ مسلسل کڑی محنت کھانے پینے کا مزہ بڑھا دیتی اور میند کی ترنگ کو نشلی بنا دیتی۔

لائی ساتھ ساتھ سنبھالی ضروری ہوتی۔ اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی نے خوب کہا تھا،  
جیدے لائی نہ چھجے  
اوہ ڈبے کڈ دے

(جس کسان نے کھیت کاٹ لیا ہے اور اسے باندھ کر گھلیان میں نہیں لگایا ہے وہ اس باقی کی طرح ہے جو بھتور میں ہے۔ ان دنوں اندھیاں بہت آتی ہیں اور اگر کاٹی ہوئی فصل سنبھالی نہ جائے تو کسی وقت بھی سال بھر کی محنت اکارت جاسکتی ہے)

اور پھر پیر گھڑے جاتے، گٹھے بکھیرے جاتے، سانٹ جوتے جاتے، کنڈ (گھلیان کو سانٹے اور تنگی سے اوپر نیچے کرنا)، دیئے جاتے، خرین لگائے جاتے، خرین اڑائے جاتے، اس میں دائیں چلائے جاتے اور پھر اس اڑا کر گھنڈیوں سے پاک کئے جاتے، کپ اُسارے جاتے اور برکتا (پہلے تول کو برکت سے برکتا بولتے ہیں، دوا، زیادہ (تین کو منوس مانتے ہیں اور اس کی جگہ زیادہ بولتے ہیں) کی بھاگ بھری آوازیں بول (صاف آناج کا ڈھیر جسے پہلی بار تولا جائے) تولے جاتے، بوریوں میں بھرے جاتے اور گدوں پر لا دے جاتے۔ ادھر گورے کو سراہا اور ادھر کالے کو لاکار جاتا۔ کوٹھیاں اور کھتے اناج سے چھلک چھلک پڑتے اور کسان تکمیل پزیری کی مسرت سے۔

پدارتھوں اور کھیتوں کی خوشبو گھل مل کر وہ رسیلا اور رنگیلا و اتا ورن (ماحول) پیدا کرتی کہ خوشبو کے سائے آؤجی، جی آیاں توں! کہتے لگتے۔ کام کاج سے فارغ گوریاں اس مدھر سنگیت کو سنتیں اور باغوں کا رخ کرتیں۔ وہ پسندیدہ شائو پر چھوے ڈالتیں اور سہاگ گائیں۔ کونلوں کی پیاری ترنگ، گوریوں کی اُمنگ کو جھولا جھلاتی، جس کا اظہار وہ طرح طرح سے کرتیں۔

ساڈا چڑیاں دا چمبا دے  
باہل اسیں اڑ جانا  
ساڈی لمبی اڈاری دے  
باہل کیہرے دیس جانا



اے باہل تیرے گھر میں ہمارا بسیرا چڑیوں کی طرح ہے! کچھ آتے ہی ہم نے اڑ جانا ہے۔  
 ہماری اڑان بڑی لمبی ہوگی۔ باہل! تجھے تو خبر ہے، کچھ تاکہ تیرے دیش سے جا کر ہمیں کس دیش  
 میں پناہ ملے گی!

آئیاں رانجھیا محل بنائیے  
 پائیے اُپر چُبّارا  
 تیری ہیر لیاوے اماں  
 تے تُوں ڈھویں گارا

(میرے پیارے رانجھ، آ! اپنے لئے گھر بناتے ہیں اور اُس کے اُپر چُبّارا۔ ہماری اس  
 جگہ جہد میں کسی اور کو دخل نہ ہوگا۔ میں گھر کے لئے اینٹیں ڈھوؤں گی اور تو گارا۔)  
 کنواریوں کی جمیلیں اور بینگوں کی اُرائیں، بیاہیوں کی پرانی یادوں کو تازہ کر دیتیں اور وہ ٹھوڑیوں  
 پر ہاتھ دھرے اپنے بیٹے دلوں کے سُندر پسنے دیکھتیں۔

ہارُھ دا مہینہ، دُھپاں پمندیوں کراریاں  
 کاہنوں میں بیاہی بُلے کُنن کنواریاں

(ہارُھ کے مہینے کی جلتی دھوپ تن اور تن دونوں کو جلا رہی ہے۔ میں گھر کے جمیلوں میں  
 الجھی ہوئی سانس لینے کو تڑپتی ہوں جب کہ آزاد کنواریاں مزے اڑا رہی ہیں)  
 اور نئی بیاہیاں اپنے دل کا غباریوں نکالتیں،

ہارُھ دا مہینہ، جی نہ کرے سوہرے جان تُوں  
 گبروہے آیا گدتی جوڑ کے تے جان تُوں

(ہارُھ کا مہینہ ہے اور میرا جی، سُمرال جانے سے ڈرتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ میرا گبرو،  
 گاڑی لے کر دروازے پر کھڑا ہے)

زمین پر رنگوں اور محفلوں کی گہما گہمی دیکھ کر آسمان پر اکیلا آفتاب رقابت کی آگ میں جل مرتا اور اُس  
 رنگ میں جھٹک ڈالنے کے لئے سر پر اُجھاتا۔ سائے، آگ اُگلتے، نالے سُکھ کر پیاسی زبانوں کی طرح پلگتے اور  
 تالاب سُکھ کر زیرِ پا کھجوں کی طرح پھٹ جاتے۔ ہوا جلتے دامن کی طرح خود جلتی اور دوسروں کو بھی جلاتی۔ درخت  
 نڈھال اور جھاڑیاں بے حال ہو جاتیں۔ چوپائے پورائے سے گھومتے اور اُسی طرح پرندے۔ اُن کی  
 ڈر کر سبزہ دھرتی کے اندر منہ چھپا لیتا اور اُسی طرح ساگ پات۔ آسمان گیر گیوں کو دیکھ کر تا۔

کہتے، ”روحِ نباتات، ابرِ رحمت سے فریاد کر رہی ہے۔“

وہ حسرتناک منظر دیکھ کر بادل کا دل بھراتا اور بجلی تڑپ اٹھتی۔ ماں کی چھٹی حسرت جاگ پڑتی، وہ باہر پڑا سالن اٹھا کر اندر کھتی اور تندہ زور کو کڑا ہی سے دھپانتی۔ جب تک وہ اٹھاؤ جو لھا اٹھا کر اندر رسوئی میں لاتی رہتی سو دھسے ست سے پہننے لگتی۔ میں گہرے سانس لیتا، بانو تولتا، بچوں پر ناپچتا اور رس میں پھیکتا۔ ماں وہلیز پر کھڑی نظارہ کرتی اور مسکراتی۔ اُس کی مسکراہٹ کے سامنے دھنگ کے رنگ پھیکے لگتے۔

کہیں دُور سے ساؤن آیا، ساؤن آیا، کی اڑتی ہوئی تان آتی گویا ساؤن کو جھولا جھلاتی۔ میں آنتر اگاتا ہوا محسوس کرتا کہ عدالت یار کے ساتھ میں بھی ساؤن کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔

## باب ۱۲

ہر گام پہ ٹھوکر سے گرا دیتا ہے

ہر ہزیم سے بے فیض اٹھا دیتا ہے

جس میں نہ ہنر ہو یہ زمانہ اُس کو

مانندِ غلطِ حرفِ مٹا دیتا ہے (شاطر)

سکول جانے کے ساتھ ساتھ ہی تحریکِ آزادی سے روشناس ہوا ورنہ ہمارا اُونگھتا ہوا گاؤں ہر لحاظ سے زمانے سے پیچھے تھا۔ گاؤں کی سادگی، گاؤں پر اس قدر حاوی تھا کہ نئے لباس کی چمک دمک بڑی بات ہے کوئی دھوبی دھلے اور استری کے کپڑے ہی پہن لیتا تو اُس پر مہمان کا دھوکا ہوتا۔ میں پاکستان کا نام جانتا تھا لیکن پاکستان بننے کی صورت میں جو گھٹنا گھٹنے والی تھی اُس کا تھوڑا سا قیاس مجھے اس واقعے سے ہوا تھا۔

طالب علم تختیاں اور سیٹیں بھڑایا کرتے تھے۔ میری گھر کی بنائی تختی، کالی شیشم کی تھی اور بازاری تختی سے موٹی۔ مجھ سے سب تختی بھڑانے سے ڈرتے تھے۔ نذیر احمد ہی تختی لایا اور مجھے تختی بھڑانے کے لئے لگاوا۔ تختیاں بھڑیں اور مہی ہوا جس کی میرے حریف کو امید تھی۔ اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لئے وہ میرا ٹھٹھا اُڑانے لگا اور مجھے لڑنے پر اکساتے لگا۔

بھائی جی دی گئی دچ گوہ بڑ گئی

اد ہنوں کڈیا تاں اک ہوند بڑ گئی

(بھائی جی کے چوڑے میں گوہ گھس گئی، پہلی کو نکالا تو دوسری گھس گئی)

میں نے بُرا مانا، وہ بولا، ”سکھڑے، پاکستان بن جانے دے! تیرے ٹکڑے کر کے کُتوں کو کھلائیں گے۔“

ہمارے گاؤں میں آزادی کی تحریک موڈن کی آذان کی طرح آئی۔ کسی نے سُنی اور آن سُنی کر دی، کسی نے سُنی اور چیخ دیکھ کر سمجھی، کسی نے آزاد مجسٹس اُس میں معنی تلاش کے مگر کلمہ سختی سے نا آشنا ہونے کے باعث کسی نتیجے پر نہ پہنچا اور اپنی بے بصیرتی کا شکار رہا۔

تایاجی کا سیاسی شعور اُن کے دوسرے خیالوں کی طرح انوکھا تھا۔ ”جو انسان اپنے خیال اور عمل کو پُر غلوں طریقے سے جانچتا ہے، وہ کہیں رہے، آزاد ہے۔“

میں نے انگھڑوں کا رہٹ پھیر کر پانی پینے کا جتن کر رہا تھا لیکن کامیاب نہ ہو رہا تھا۔ رہٹ کا کُتّا نہ تھا۔ میرے دوڑ کر پارچہ (رہٹ کے منہ میں رکھا ہوا) وہے کا برتن جس میں پانی گر کر باہر حوض میں پہنچتا ہے پر پہنچنے تک وہ خالی ہو جاتا اور مال (وہ زنجیر جس پر ٹنڈیں جڑی ہوتی ہیں) اُلٹی گھوم جاتی اور پانی بھری ٹنڈیں واپس کُنویں میں دُوب جاتیں۔ یس ٹنڈوں میں سے پانی پی سکتا اور نہ ہی پارچے سے۔ پارچے سے گرتے ہوئے آؤر کا چند قطرے میرے ہاتھ لگتے، جن سے میں صوف ہونٹ ترکر سکتا۔ میری تراس اور بھڑک اُٹھتی اور میں لپجائی ہوئی نظروں سے کُنویں کے اندر بھاگتا جو میرے لئے بھرا ہوا ہو کہ بھی خالی ہونے کے برابر تھا۔ میں نے گاری پر اینٹ کاٹنا لگایا لیکن ٹوڑیا (گاری کا دانت) اینٹ کا کونا توڑ کر نکل گیا۔ میری ہوشیاری میری ناکافی ثابت ہوئی، اور ناکافی، مکمل مایوسی۔

”عقلاں باہجوں کھوہ خالی! مٹورکھ کے لئے کُنواں خالی ہوتا ہے۔“

اپنے دل کی بات کسی اور کی زبانی سُن کر یس حیران ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں ٹنڈی لاٹ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ کُنویں پر پانی پینے آیا تھا اور میری ناکام کوشش دیکھ چکا تھا۔ اُس نے کُنویں کی منڈی پر پڑی اینٹ کھٹے ہاتھ سے اُٹھائی اور حوض میں دھو کر پارچے کے منہ میں رکھ دی اور پھر مجھ سے فخر سے کہا، ”چندا، اب رہٹ چلا“ میں نے ایک چیکر پُورا نہ کیا تھا کہ پارچہ بھر کر چھلک گیا۔ ٹانگوں کو گاہدی (پاٹ) کی زد سے بچاتے ہوئے میں نے اُسے چھوڑا، پارچے پر پہنچا جس میں سے پانی کی پتی سی دھار بہہ رہی تھی۔ ہم نے کُنیاں کر کے ہاتھ منہ دھویا، آنکھوں میں چھینٹے مارے، پانی پیا لیکن پانی ختم نہ ہوا۔ نیوٹوں کو پانی پلا کر منڈی لاٹ روانہ ہوا اور میں اُس کے ساتھ ہویلا۔ اُس کا نام ہر نام سنگھ تھا۔ میں نے پہلی بار اُس سے کچھ کہا سنا تھا لیکن اُسے پہلے سے جانتا تھا۔ میں اُس کے بارے میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کا ما، گاتا، مارو، بھری جہاز کا ایک انقلابی رکن تھا اور اُس تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں اُس کا سجا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا۔ اُس کی شہرت کی ایک وجہ اور تھی۔ اُس نے نیولے پال رکھے تھے جو اُس کے کاندھوں پر سوار

رہتے تھے یا اپنے گھلے کی رسمی کی لمبائی کی حد تک اُس کے آگے پیچھے گھومتے چلا کرتے تھے۔ وہ اتنے تیز رفتار تھے کہ کتھے پل کی طرح دزدِ سر نہ تھے۔ باتوں باتوں میں بات میری تعلیم تک پہنچی۔ اُس کے کہنے پر میں نے اُسے اپنی من پسند نظم ”پھول کی فریاد“ سنائی۔ اُس نے خوش ہو کر میری بیٹھ تھپکی اور کہا ”لاٹ پتر ہو! میرے باپ کا نام سُن کر اُس کا ردِ عمل جانا ہی نا تھا، ”رتن سنگھ! تو اُس کا بیٹا ہے!“ میرے باپ دُور دراز تک کی ناموں سے مشہور تھے۔ وہ کہیں شکاری تھے، کہیں کنکوت، کہیں آرٹنی اور کہیں بیوپاری۔ وہ جن گاؤں کے نام لیتے تھے وہ اُس وقت تو خیر اُس بھی جاؤ نگری معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے نئی آل بیلان، گھوڑے باہا، بچو دتہ، سنگڑی والا، شام چور اسی جو اپنے نام کے انگریزی ترجمے ”ایونگ ان ایٹی فور“ سے بھی مشہور تھا۔

گاؤں کے پاس اپنی راہ لینے سے پہلے، میں نے نیولے کو چھو کر دیکھنا چاہا۔ ٹنڈی لاٹ نے اُسے پکڑ کر اُس کا منہ اپنی طرف کیا اور مجھے بیٹھ سے لے کر دم تک چھوئے دیا۔ ریشمی بالوں کے اندر اُس کا ڈھانچہ کتنا نرم تھا! میں حیران ہوا کہ وہ نرم سی جان سانپ سے مُوڈی سے کیسے لوہا مٹاتی ہے! میں نے چراگاہ میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھی تھی۔ نیولا، سانپ کا سامنا پیچھے سے کرتا تھا اور اُس کے پلٹنے ہی دُور جا کھڑا ہوتا تھا۔ اُس کی گھات تاک تب تک جاری رہتی تھی جب تک سانپ زخمی ہو کر پھن پھیل کر نہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ نیولے کا آخری وار دہینی ہوتا تھا! وہ ہولے ہولے سانپ کی جانب بڑھتا، اُسے جھکاتا اور وار کرنے پر اُکساتا، وہ جھول ہی وار کرتا، نیولا اُسے تھر سے دلوچ لیتا۔ وہ بہتیرے بل بھرتا لیکن نیولے کی گرفت کے آگے بے بس رہتا اور آخر کار دم توڑ دیتا۔

کہاوت ہے کہ تند رست سانپ، شیر اور زخمی ہو تو دھیر۔ سانپ کے زخم کو جیوٹیاں لگ جاتی ہیں اور اُسے جیتے جی کھا جاتی ہیں

اُن دنوں ٹنڈی لاٹ میرا مطیع نظر تھا۔ میں اُسے شہر جاتے آتے دیکھ لیتا تو اگر ڈونڈی (پیچھے سے بھاگے آگے ہونا) ہو کر اُسے ست سری اکال بلاتا، نیولوں کو پیار کرتا، اُس کی باتیں سنتا اور اپنے ساتھیوں میں شان بکھارتا۔ اُن کمینوں کا تصور اُن کی کمینگی کی گندگی سے باہر نہ نکلتا۔

آدرش (مطیع نظر) کی بات اتنی ہے تو میں کچھ مزید کہنا چاہتا ہوں۔ میرا آدرش کبھی ستھر (ٹھہرا ہوا) نہیں رہا ہے، بدلتا رہا ہے۔ اُس کی نوعیت کوئی بھی رہی ہو، اُسے نسبت کسی ممتاز شخصیت سے رہی ہے۔

تایا جی نسبت کے بارے میں طرح طرح کے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اُن کے خیالات کا ایک دُخ یہ بھی ہے، انسان کے تصور کی راز جوئی! یہ اپنے محدود دائرہ فعل کو لانا محدود دیکھنا چاہتا ہے جو اس کے برعکس فطرت کا لائحہ عمل ہے۔ اس کی عظمت پسندی کے پاگل پن نے اس سے مافوق الفطرت کردار تخلیق کر دئے اور پھر اُن سے نسبت کے جذبے۔ اس جذبے کی انتہا! کئی انسان ہو ہو بھگوان بن بیٹھے اور کئی اُس کے اوتار۔

میرے ماحول کا یہ پہلو دلِ فکار تھا کہ کوئی کسی سے سبقت لے جاتا تو اُس کی خوبی میں خرابی نکالنے کے نامعقول طریقے گھڑے جاتے تھے۔ مجھ میں بھی یہ خرابی تھی لیکن میری بڑی میری رکاوٹ تھی اور میرا ضبطِ نفس بھی۔ میں کلاس میں اُدُل آیا۔ عام طور پر محبوب اُدُل آتا تھا اور انعام بھی پاتا تھا۔ اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لئے اُس نے مجھ پر طنز کی، ”تو اُدُل آیا ہے تو کیا؟ ہے تو سکھڑا تر کھوٹا (سکھڑا تر کھان کی تذلیل)؛ میں سید ہوں!“ وہی جانے کیسے؟ اُس نے میری ماں کا نام جان لیا۔ وہ وقت بے وقت میری ماں کا نام لیتا اور میں خونِ پی کر رہ جاتا لیکن اُسے اُس بزمینری سے روک نہ سکتا۔ ہنس راج غیر حاضر تھے اور کلاس میں ہر بونگ مچا ہوا تھا۔ محبوب میری ماں کا نام بلیک بورڈ پر لکھ رہا تھا کہ نبی بخش اُدُل آگے اور چپ چاپ دروازے میں کھڑے ہو گئے، جس نے دیکھا اُمی نے دم سادھ لیا۔ محبوب بلیک بورڈ سے پیچھے ہٹا تو اپنے سر پر نبی بخش کو کھڑا پایا۔ اُس نے بلیک بورڈ صاف کرنا چاہا لیکن نبی بخش نے اُسے گردن سے پکڑ لیا اور عبارت کا مفہوم سمجھ میں نہ آنے پر انہوں نے اُس سے پوچھا۔ اُس نے ایک ہی بات پکڑ لی۔ ”کچھ نہیں جناب! کچھ نہیں جناب!!“

”کچھ تو ہے، ورنہ تو کیوں لکھتا؟“

یہ کہہ کر انہوں نے کلاس کی طرف دیکھا گویا خاموش سوال کیا۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر رو پڑا اور سچ سچ کہہ دیا۔ انہوں نے محبوب سے کہا، ”گیان کی ماں کے نام کے سامنے اپنی ماں کا نام لکھ!“ اُس نے غصہ کیا۔ انہوں نے اسے فرش پر گرالیا، اپنا پیر اُس کے ایک ٹخنے پر رکھا اور دوسرے سے پکڑ کر اوپر اٹھایا جیسے وہ اسے سیڑیوں سے چیر رہے تھے۔ اُس اچانک صدمے سے وہ کچھ میں ہلک دیا اور درد سے یوں بلبلیا یا کہ مگرہ گوج گیا۔ وہ آخری دن تھا جب اُس نے میری ماں کا نام لیا۔

اُس دن نبی بخش صاحب نے ہماری کتاب میں سے ایک سبق پڑھایا جس کا عنوان تھا، پہلے بات کو تو پھر منہ سے بولو۔ سبق پڑھا کر انہوں نے انسانی زندگی کی ایک فلاسفی بیان کی۔ ”ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا نام، زندگی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ سرگرم عمل بنو، آگے بڑھو اور اپنے حریف کو کچھا دو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حریف کو جان سے مار کر مقابلہ ہی ختم کر دو۔ پہلا طریقہ عالموں کا ہے اور دوسرا جاہلوں کا۔ یاد رکھو! اُم سب یہاں عالم بننے کے لئے آئے ہو۔“

میں جب کبھی ٹنڈی لاٹ سے ملتا وہ خواہش کرتا کہ میں اُسے کچھ سناؤں۔ اس سے میرا نظمیں اور غزلیں یاد کرنے کا شوق بڑھا۔ میں اُسے ہر بار نئی چیز سناؤں اور وہ خوش ہو کر داد دیتا۔ ”واہ کیا خوب حافظ ہے!“

ہندوستان اور پاکستان کا پر ایسی گنڈہ زوروں پر تھا۔ علاقے کی ہوا بدل رہی تھی اور عام چرچا تھا کہ ہوشیار پور، پاکستان کے حصے میں آئے گا۔ اُس چرچے کی وجہ وہ بسیاں تھیں جن کی نوے فیصدی آبادی مسلمانوں کی تھی۔

اُن تمام بےسوں کے نام شخصی تھے، جیسے عمر خاں دی بےسی، وزیر دی بےسی، سیدے دی بےسی... نور خاں دی بےسی۔ عمر خاں دی بےسی ہریانہ کے مشرق میں آدھے میل کے فاصلے پر ہے۔ میں جس رات ٹال پر رہتا، سویرے بھاگ کر اُس کی فصیل کو ہاتھ لگا کر آتا۔ چھوٹی اینٹوں کی اس فصیل کی چوڑائی نیچے زیادہ اور اوپر کم تھی لیکن اتنی تھی کہ اُس پر گھوڑا دوڑایا جاسکتا تھا۔ اس فصیل میں رند رکھے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ فصیل کے گرد خندق بھی تھی، جسے بھردیا گیا تھا۔ اس فصیل کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ذبیہوں نے بیگار میں بنائی تھی۔ اُن بےسیوں کی تاریخی اہمیت میں نے گرو دواروں میں دھاری جتھوں سے سنی تھی۔ اورنگ زیب نے انہیں سکھ تحریک کو کچلنے کے لئے برابیا تھا۔ جن ناموں پر وہ بےسیاں بےسی تھیں وہ سب پانچ ہزاری، دس ہزاری، بیس ہزاری... کے رتوں کے مالک تھے۔ سکھ تواریخ میں ان بےسیوں اور ہندوؤں کی کہانی غلاموں، زنا بازوں، اغواؤں، قتلوں، ظلموں، معصیتوں، آفتوں... کے عنوان سے لکھی ہوئی ہے۔ میں ان کے ناموں سے زیادہ اس قوم سے نفرت کرتا تھا جس کے اسلاف اُن جرائم کے مرتکب تھے۔ جویشی تقریروں، ٹون کھولتے ٹونوں، رزمیہ بیانوں اور راج کرے کا خالصہ اُکی رہے نہ کوئے، کے دُعا زائیدہ نفسیاتی ماحول کے درمیان میں شدت سے محسوس کرتا کہ میں خالصہ پنڈتہ کا داعی اور سپاہی ہوں اور دھرم یدھ لڑنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اپنی نامزدی کے باوجود، میں اپنے آپ کو اُن اتہاسک جودھوں سے منسوب کرتا، جن کی تیغ کے ایک وار نے ترکوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے تھے اور جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے ترکانیوں کے حمل گرا دیئے تھے۔ اُن میں سے ہری سنگھ نلوا کا نام قابل ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ افغانستان کے مسلمان اس کا نام لے کر روتے بچوں کو ڈراتے ہیں اور انہیں چپ کر دیتے ہیں۔ مجھے اُن سکھوں پر غصہ آتا جو سنکٹ اور آزمائش کی گھڑی میں گرو گوبند سنگھ کو یکساں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ میں سوچتا کہ اُن کے ساتھ میں ہوتا تو اُن کے اس قول پر پورا اُترتا۔

سُور اُس کو جانے جو لڑے دین کے بیت

پُر زہ پر زہ گٹ مرے کبھی نہ چھوٹے کھیت

اپنی ذاتی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے میں نے تصور میں لڑائی لڑنی سیکھی تھی اور بہت پہلے سیکھی تھی۔ اس میں جو خون خرابے ہوتے تھے، وہ، چار سے نہ بڑھتے تھے لیکن قوم کا بدلہ قوم سے لینے کے لئے میں نے پہلا قتل عام ایک ایسی ہی کسی گرو سنگت میں بیٹھے ہوئے اپنے خیال میں کیا تھا۔

مسلم لیگ کے مقامی لیڈر کا نام ناصر علی تھا۔ اُس کی چھوٹی سی کار لاڈو سپیکر لگائے دھا کے کرتی اور دین بھر میں کہیں نہ کہیں نظر آتی جاتی۔ جیسا کہ لیڈروں کی خصالت ہے، وہ بھی وائش مندانہ تقریر نہ کرتا تھا۔ کسی نے اُس پر یہ شعروں کو رکھا تھا۔

نام کا ناصِر ہے لیکن ہے صفت ناصِر کی  
مُوچھ ہے داڑھی نہ اُس کی شکل ہے لنگور کی

میں شاعر کے مشاہدے کی تعریف کرتا۔ ناصِر کی طبیعت میں نو دس کا فرق ہو تو ہو، شکل میں فرق نہ تھا۔ اُس کے چہرے کو کسی صحیفے کی آیتوں کی طرح پڑھو تو اُس کے نقوش تنبیہ کے کلمے نظر آتے تھے۔  
ناصر کی کار، کچی سڑک کے رُتے (گوڑے)، سے ٹکرا کر خراب ہو گئی تھی۔ ڈرائیور اُس کا نقص دُور نہ کر سکا تو اُس نے اُسے باہتیوں کے دیرے سے جوگ لانے کے لئے بھیجا تاکہ وہ کار کھینچ کر ہریانہ تک لے جا سکیں۔  
راہی خوش تھے کہ انہیں کار کو قریب سے دیکھنے اور انجن میں جھانکنے کا موقع ملا ہے۔ اُن کی تاک جھاک کا ناصِر پر عجیب اثر ہوا! وہ اُن سے ایسے مخاطب ہوا جیسے کوئی پیر کسی رنر کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ ”بھائیو! پاکستان“  
پاکستان ہو گا! وہاں ہر کوئی محنت اور محبت سے کام کرے گا اور جو نہ کرے گا اُسے قریب ہی کے درخت سے لٹکا دیا جائے گا۔ وہاں شیشے جیسی سڑکیں بنوائی جائیں گی۔“

ٹنڈی لاٹ وہاں سے گز رہا تھا، وہ ناصِر کی فتویٰ مُمابا ت اُس کی سُن کر رُک گیا۔ اسی وقت باہتیوں کے دیرے سے ناصِر کا ڈرائیو آیا، اور یہ غبر لایا کہ باہتی روپے لے کر بھی جوگ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ ٹنڈی لاٹ نے آگے بڑھ کر ناصِر سے کہا، ”ناصر میاں! شیشے کی سڑکیں بنوانے اور کام چوروں کو درختوں سے لٹکانے کے لئے ہمیں پاکستان کی ضرورت ہے۔ اس وقت تم کار کے آگے جتو اور اسے کھینچ کر ہریانہ لے جاؤ۔“

تماشائیوں نے ٹنڈی لاٹ کو ایسے دیکھا جیسے وہ اُس کے بروقت سمجھاؤ پر آخری باد بھر رہے ہوں۔ ناصِر اور اُس کے ساتھی پہلے ہی تماشائیوں سے تنگ تھے اور ایک آدھ بار انہیں بھگانے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ ٹنڈی لاٹ کی طش سے برہم ہو کر ناصِر نے کہا، ”تم غم نہ کرو! ہم جانتے ہیں، ہمیں کیا کرنا ہے!“

جانتے ہوتے تو ابھی تک ہریانہ پہنچ گئے ہوتے۔ ”ٹنڈی لاٹ نے بچوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹنڈی لاٹ وہاں سے جانے لگا تو سارے کے سارے لڑکے اُس کے ساتھ ہوئے اُس کے گرد بھیر ڈیکھ کر نبولے اُس کے کاندھوں پر سوار ہو گئے تھے۔ راستے میں ٹنڈی لاٹ نے رُک کر سَن آموز انداز میں کہا، ”میں تنظیم کی بنیاد مذہب پر ہو، وہ تنگ نظر ہوتی ہے اور ارتکابِ خودکشی کے مترادف۔“

اس کا تجربہ تو خود بھی کر چکا تھا۔ میری زیادہ تر مصیبتیں میرے اپنوں کی وجہ سے تھیں لیکن مذہبی ماحول میں میری اپنوں سے نفرت مٹ جاتی تھی اور بیگانوں سے جاگ پڑتی تھی۔ اُس نفرت کی ظاہری وجہ صرف اتنی ہوتی تھی کہ آج سے صدیوں پہلے کسی کے پُرکھے میرے پُرکھوں سے لڑے بھڑے تھے اور میرے پُرکھے ہار گئے تھے۔ میں اُن کی شکست کو اپنی شکست سمجھتا تھا۔

تایاجی کہتے تھے، "ماضی مَرَدہ ہے، حال زَندہ ہے اور مُستقبل نازا ایدہ۔ زندگی، سفر بے لُزائے، مسافر! اور جو مسافر پیچھے دیکھتا ہوا آگے چلتا ہے، وہ گڑھے میں گرتا ہے یا صبح راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ یہ اپنے اطراف دیکھتا ہوا آگے چلے اور اپنی سنت پر تنقید بھی کرے۔"

میں جن لوگوں کا حقہ تھا وہ ماضی پرست، حال دشمن اور مُستقبل سے بے تعلق تھے۔

لوگوں کی اپنے اسات سے عقیدت زرا لی ہے۔ وہ انہیں جیسے جی دھنکارے ہیں لیکن اُن کے مرنے پر انہیں سوگ باسی، مَرُوم کہتے ہیں اور اُن کے نام کے قہیدے اور وظیفے پڑھتے ہیں۔

پنجاب کی تاریخ میں لاکھوں آدمی محض اس لئے قتل ہوئے کہ وہ حکمران بادشاہ کے ہم مذہب نہ تھے۔ پرچارک، سنگت میں چنچ چنچ کر دوہراتے تھے: "اورنگ زرب کے راج میں ہندوؤں کو جزیہ بھرن پڑتا تھا اور وہ سوامن جینیو سامنے رکھ کر کھانا کھاتا تھا۔ وہ جینیو اُن ہندوؤں کے ہوتے تھے جو حاکمانِ وقت کے ظلم و ستم سے ڈر کر مسلمان ہو گئے ہوتے تھے یا کافر کا فتویٰ دے کر مار دیئے ہوتے تھے۔ مسلمان روپیہ بونے کے لئے جھوٹے جینیو لکھے کرنے لگے تو اورنگ زرب نے نیا حکم صادر کیا کہ ایسے کافروں کے کان بھیجے جائیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندو مردوں میں کان بال کا رواج پڑا تھا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں ختم ہوا تھا۔"

اقبال میرا پسندیدہ شاعر تھا۔ اُس سے میری نفرت کا آغاز، اُس کا شکوہ اور ترانہ ملی پڑھ کر ہوا تھا۔ اُن نظموں کے اشعار اِس نظر سے کی وکالت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے سوائے ہر کوئی کافر ہے اور گردن مارنے کے لائق۔

تایاجی کی حویلی کے پاس گرو دوارہ تھا جہاں سادھو سنسوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اُن میں سے کسی کسی سے تایاجی کی بھینٹ ہوتی رہتی تھی۔ ایک سنت نے تایاجی سے پوچھا: "آپ کے گھر کے ساتھ پوٹر استھان ہے لیکن آپ اس سے لایچ نہیں اٹھاتے ہیں۔"

"اُس سے بھی پوٹر استھان ہے اور میرے پاس ہے۔" تایاجی نے ادھورا جواب دیا جو اُن کی فطرت تھا۔

"کون سا؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا سن! تایاجی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اِس کا مطلب ہے کہ آپ تیرتھوں میں بھی یقین نہیں رکھتے؟" سنت نے بات کو طویل دیا جیسے وہ تایاجی کے رویے کی اہل دیکھنا چاہتا ہو۔

"میں تیرتھوں میں یقین رکھتا ہوں!"

"کون سے تیرتھوں میں؟"

میرے تیرتھ ہیں گرتھ، کرم، نستو کہ، سنت، دِچار! آپ لوگ کبھی تیرتھ نہاتے ہیں، میں تو



مائس مائس تیرتھ آستان کرتا ہوں۔“

مائس جیون کے بارے میں تایاجی کے وچار شاستروں سے الگ تھے۔ وہ کہتے تھے، ”دوسری جوں کی طرح مائس جوں ایک جوں ہے! یہ نہ بھگوان کے کرم سے ملتی ہے اور نہ اُس کے تہرے غارت ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری جوں جوں کی توں برقرار رہتی ہیں، مائس جوں اپنے کرم سے اپنے آپ کو سنوار بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی سکتی ہے۔ تیرتھ آستان کرنے سے سدھار ہوتا اور مکتی ملتی تو لنگائیں رہنے والے کیرے محوڑے وہی گندگی نہ کھاتے جو دکھاتے آئے ہیں اور اپنی طرح کیڑوں محوڑوں کو جمن نہ دیتے۔“

ٹنڈی لاٹ کو ٹو نہر سنگھ کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں میرے گاؤں سے ایک میل دور شمال مشرق میں مرزا پور اور ڈویان خورد کے درمیان واقع ہے۔ درشن سنگھ شرط لگاتا تھا کہ ڈویان کلاں کو مرزا مان کر دائرہ لگا دو تو کوٹلوہ نہر سنگھ، ڈویان خورد، آدودال، شیرپور، کوٹھے جٹاں، بگتے وال، لامبڑا، سین پور اور مرزا پور دائرے کے گھیرے پر پڑیں۔ ٹنڈی لاٹ کا قدمبا، رنگ گندمی آذناٹ تک پہنچی ہوئی پتلی سفید دار تھی۔ وہ سیدھی سادی چھوٹی سی پگڑی باندھا اور شلوار قمیض پہنتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سنجیدگی کی گہرائی تھی اور یہی تلی بات حیت سے تحقیق و ظرافت جھلکتی تھی۔ اُس کے لہجے کا زیر و بم اُس کے خیال کی اہمیت کو اُبھارتا تھا اور جامدو اثر رکھتا تھا۔ اُس کی پہلی ہی بات نے مجھے ہکا بنگا کر دیا تھا اور میں کتنی دیر اُس الجھن میں گرفتار رہا تھا جو اُس کے آزاد رویے کی پیدا کردہ تھی۔ میں نے اُسے تایاجی کہہ کر بلایا، اُس نے مجھے فوراً ٹوک کر کہا، ”اپنے بے بڑے سے بات کرنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ اُسے رشتے دار بنایا جائے۔ تو مجھے سردار جی یا ہر نام سنگھ جی کہہ کر بلائے گا تو مجھی چلے گا۔“

اُس کی اور میری عمر میں کم سے کم پچاس سال کا فرق ہوگا۔ اُس کی یہ بات سن کر مجھے لگا کہ میں اُس کے جتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے بے دھڑک سوال کیا، ”آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن تایاجی کہنے میں کیا بُرائی ہے؟“

”بچے کے دل پر کسی کی بڑرگی کا بوجھ پوتا اُس کی جدت پسندی اور خود روی کچلی جاتی ہے اور ذہنی نشوونما متاثر ہوتی ہے۔“ اُس نے بلا توقف کہا تھا جیسے میرے سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا ہو۔

ٹنڈی لاٹ کی بات درست تھی، بچوں پر بڑوں کا سایہ کم اور بوجھ زیادہ تھا۔ میں کیا کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا کیوں کہ اُن باتوں کا بتانے والا کوئی نہ تھا، خاص کر ایسی باتیں جن کا تعلق ادراک نفس سے تھا۔ قارئین! وہ باتیں جو قلمِ مشاہدہ نفس کے لئے آکا جی ضمیر میں وہ عام طور پر بڑگوں کے لئے بے ہودہ اور خلافِ فطرت ہیں۔ رسولوں، رواجوں اور روایتوں کی زنجیر اس وقت بھی اتنی ہی تنگ ہے جتنی کہ اُس وقت تھی۔ آدمی کی دور نظری اس برائی حاوی ہے کہ اسے پاس کی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے۔

بزرگوں کے سامنے میری حالت گونگے اور بہرے مویشی کی سی تھی۔ میرے دُموے میرے خوف تھے اور

میری لاعلمی میری بے بسی۔ اُس میں تلاش کا عنصر تھا اور بار بار کچلے جانے پر بھی زندہ و فعال تھا۔ اُس کا یہ سہارا تھا۔ جسمانی ضرورت سے تھا، آدمی کی بنیادی جبلت سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس ضرورتِ حیات کو غیر اخلاقی بات سے تو مٹا کر کیا جاتا ہے۔

میں اپنے ایام طفلی کی ایک واردات بیان کرتا ہوں۔ میرے بھائی باجی باہر صحن میں نہا رہے تھے۔ میں اُن سے کچھ دُوری پر کھیل رہا تھا۔ اُنہوں نے نہا کر گیل پکھا بدلا، میری نگاہ اُن کے ننگے سَروں پر پڑی۔ اُن کا آکار برکار دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور بے اختیار ماں کی جانب بھاگا اور پوچھا، ”ماں ماں! میری پھلی بھائی باجی سے چھوٹی کیوں ہے؟“ میرے تجسس میں خرمی کا احساس تھا۔ مجھے لگا کہ اعضا کی تقسیم میں میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اُس نقصان کی تلافی ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہ میری ماں میری تحقیق پسند فطرت کی کسی طرح تسلی کرتی، بھائی باجی مجھے پرچھپے اور میرے اس زور سے طہانچہ مارا کہ میرا کان جھٹک گیا اور میں چپکرا کر گر پڑا۔

ہندو لڑکوں کے مقابلے میں مسلمان لڑکوں کی پھلیاں صاف ستھری ہوتی تھیں۔ وہ اُن کا مظاہرہ جس شان سے کرتے تھے، وہ اپنی شوکت آپ تھا۔ میرا دوست قادر یار پھلی کھڑی کر کے دکھاتا، جس پر میں رشک کرتا۔ حالانکہ میں پھلی کے لذت افزا پہلو سے بے بہرہ تھا میں قادر کی پھلی سے پھلی ملا کر محسوس کرتا کہ میری میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ میں اُس خرابی کو جاننے کے لئے پھلی کا ہر زاویے سے معائنہ کرتا اور اس نتیجے پہنچتا کہ اُس میں کوئی خرابی نہ تھی چوں کہ اُس کا گھونگٹ پیچھے نہ سرکتا تھا اُس کا اصلی روپ دکھائی نہ دیتا تھا۔ میری پھلی پردہ پوش خاتون تھی، جس کے قد و قامت اور عمد و خال لوپ ہو کر بھی الوپ رہتے ہیں۔

میں بڑوں کے سامنے پھلی سے یوں بے خبر رہتا تھا جیسے وہ ہو کر نہ ہو لیکن اکیلے میں اُس سے کھلونے کی طرح کھیلتا تھا۔ جسمانی تحریک ابھرتی اور گھونگٹ پیچھے سرکنے کی کوشش کرتا لیکن تانتوا اُس کی رکاوٹ بن جاتا۔ گھونگٹ کے نیچے گیدی جی رہتی جس کی بدبو مردہ جوہے کی سی گھناؤنی ہوتی۔ اُس بدبو سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ گھونگٹ پیچھے سرکاؤ اور اُس کندے مواد کو دھوؤ۔ ایک دن سوگ نے مجھے اُسیا اور میں نے گھونگٹ کو جھٹکا دے کر تانتوا توڑ دیا۔ درد تو زیادہ نہ ہوا لیکن تازہ خون دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ تانتوا پورا نہ ٹوٹا تھا لیکن میں دوسرا جھٹکا نہ دے سکا۔ سوگ نے پہلے ہی سے پی تیار رکھی تھی۔ اُس نے گھونگٹ پیچھے سرکا کر گھاؤ پر پی باندھی اور کہا، ”اسے کاہے بنگاہے بھگوتے رہنا ورنہ کھولتے وقت گھاؤ آلا ہو جائے گا۔“

سوگ کا اپنا تانتوا دیسراج سے بند بھڑکا کھیلنے ہوئے ٹوٹا تھا۔ ناواقفیت کی وجہ سے اُس نے گھونگٹ پیچھے سرکا کر زخم پر پٹی نہیں باندھی تھی اس لئے اُس کا تانتوا دوبارہ جڑ گیا تھا۔ اُس نے دیسراج کی مدد سے وہی تجربہ کیا تھا جس سے میں مستفید ہوا تھا۔

جہاں تک میں جانتا ہوں میرے گاؤں میں میرے ہر ہم عصر کی پھلی کا تانتوا باہم بند بھڑکا کھیلے ہوئے  
 ہوتا تھا۔ جاگیر سنگھ کا تانتوا لٹا تھا تو اُس کی پھلی سوج کر پٹا ہو گئی تھی۔  
 ٹنڈی لاٹ نزاعی حد تک پوجا پاٹھ کے خلاف تھا اور مذہبی روایات کی ہنسی اڑاتا تھا۔ وہ یہ شعر ایسے  
 لگنا مانتا تھا جیسے کوئی مذہبی آدمی، وظیفہ۔

کرد نہ کام کرد آرد اس  
 بھوک لگے تو کھاؤ گھاس

تیا جی اور ٹنڈی لاٹ کا بنیادی کردار ایک تھا۔ دونوں فرسودہ قدروں کے خلاف تھے لیکن ٹنڈی لاٹ  
 بات تیر کی طرح لگتی تھی۔ مذہبی لوگ اُسے کافر کہتے تھے۔ اُس کی بڑائی! وہ خود اعتراف کرتا تھا کہ وہ کافر ہے لیکن پروفیسر  
 بن سنگھ کے الفاظ ہیں۔

لالی لگ مومن دے کولوں  
 کھو جی کافر چنگا

(روایت پرست مومن سے تحقیق پسند کافر بہتر ہے)

وہ ایسی کتابوں کے نام لیتا تھا جو سکولوں اور کالجوں کے کورس میں نہ تھیں۔ وہ ممنوع کتابیں، بدیش سے  
 پک کر اور چھپ چھپا کر دیش میں آتی تھیں۔ نرنجن سنگھ کامریڈ اور ٹنڈی لاٹ لال انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔  
 روس میں انقلاب آیا ہے جس نے چھوٹے بڑے کا فرق مٹا دیا ہے۔ ہر کوئی اپنی قابلیت کے مطابق کام کرتا  
 اور اجرت ضرورت کے لحاظ سے پاتا ہے۔ تعلیم بالکل مفت ہے اور اُسی طرح صنعت و حرفت کی تربیت۔ ذاتی  
 تہتم ہو گئی ہے اور اُس کے ساتھ باہمی جھگڑے بھی۔

تیا جی اُس نظام کے بارے میں کہتے تھے، ”اگر وہاں ایسا نظام حکومت قائم ہوا ہے تو بہت اچھا ہے!“  
 مجھے بھی یہ باتیں زندگی سے قریب لگتی تھیں کیوں کہ راوی کے اس بیان کی تصدیق کرتی تھیں،

زور، زمین، زر  
 تینوں فساد کی جڑ

میں اُس سماج کا تصور کرتا جو ان تینوں بُرائیوں سے پاک تھا۔ وہاں کوئی اس لئے چھوڑا نہ تھا کہ وہ چھوٹی  
 نہ سے تھا۔ ہمارے گاؤں میں زمین کے لئے آئے دن فوجداریاں ہوتی رہتی تھیں۔ چار، آرائیں، ترکھان، مسلمان  
 فتلوں کے مورث تھے۔ کبھی زمانے میں مورثوں کی شادیوں میں گھوڑے جوڑے کی رسم جاری تھی، وہ یہ کہ جو مورثی  
 رے وہ اپنے مالک کو بندھا لکھانڈا نڈا ادا کرے۔ کہتے تھے کہ اس رسم کا آغاز بڑا شرمناک تھا! مورثی کو اپنی بیوی

## گیان سنگھ شاہ

کا اندرانہ دینا پڑتا تھا۔ یہ رنہم، دوسری اور کئی رنہموں کی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں بنی تھی۔  
بابر کے زمانے کے پُر آشوب حالات اور گرتھ میں اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

آد پرکھ کو اللہ رکھے، سیکھاں آئی داری

دیوی دیوتیاں، کر لاکا ایسی کیرت چاری

پو جیا، بانگ، نواج، مہلتی، نیر پوپ، بنواری

گھر گھر میاں سبھناں جیاں بولی اور تمھاری

(آج کل شیخوں کا دورِ دورہ ہے، بھگوان کو اللہ کہتے ہیں۔ ایک نیا دستور رائج ہوا ہے!

دیوی دیوتاؤں کے مندروں پر ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔ اب لوٹا، نماز اور مصلیٰ ہی ممتاز

ہے۔ بھگوان کا رنگ نیلا ہو گیا ہے اور باہمی بات چیت میں میاں کا لفظ استعمال

ہونے لگا۔ بولی ہی بدل گئی ہے۔)

دوسری جنگ کے دوران جاگو لہر، اٹھی۔ سہمی سہمی، ڈری ڈری، دینی دینی جاگو لہر۔ ہمارے گاول میں  
اُس لہر کا بانی رنجن سنگھ کا مرید تھا۔ وہ اور اُس کے کچھ ساتھی گلیوں میں گاتے پھرتے۔ اُن کی آواز سن کر لوگ دروازے  
بند کر لیتے جیسے وہ چھوٹ کی بیماری پھیلا رہے ہوں پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے دروازے بند کرنے بند کر دیئے اور  
وہ دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر تانے جھانکنے لگے۔ کامریڈوں کے گیت مشہور ہونے لگے، اُن کے ساتھ  
بچے گھومنے لگے اور گیتوں کے آنترے اُٹھانے لگے، اکاؤ کا جوان اور بوڑھے چوہال میں جا کر اُن کے گیت سننے لگے۔  
پھر تو کوئی ہی چمار، ہتہر، جولاہا، ترکھان اور باہمی ہو گا جو جیلے میں شرکت نہ کرتا ہو گا اور اپنا بے سُر اُمر اُن کے سُر  
میں نہ ملاتا ہو گا۔

سُن بھینے سُن جاگو آئی ہے

جاگو آئی ہے مساں بُلائی ہے

اٹھ اوئے رن سیاں، اٹھ اوئے چن سیاں

اٹھ اوئے تمکھن سیاں، اٹھ اوئے وطن سیاں

جاگو آئی ہے پریت لیائی ہے

سُن بابو سُن مساں بُلائی ہے

(مساں، بڑی مشکل سے، رننت سماجت سے)

ایسے نعروں سے چوہال گونجنے لگا،

مزدور اور کسان ایک ہیں۔

”ہم بیکار نہیں کریں گے، وقت پڑے تو چھین مریں گے۔“  
”کوئی لالچی کھائیں گے، آگے بڑھتے جائیں گے!“

مالکوں اور مویشیوں میں ٹھن گئی۔ ساری بارہ راجپوتوں کی تھی جہاں لوگ رفع حاجت کرتے تھے۔ راجپوت لائیں لے وہاں بیٹھے رہتے اور کسی کو ادھر جانے نہ دیتے۔ کامریڈز حواجات مزدوری کے مسائل سے بڑی ہوشیاری سے نپٹے، انہوں نے گھروں میں گرٹھے کھود لئے۔ مالک بے لحاظ ہوئے تو کئی (کامکار کی تحقیر) بے نیاز ہو گئے۔ کہاں مالکوں کی آہٹ پاکر وہ راہ چھوڑ دیتے تھے اور جب تک مالک گزرنے جاتے تھے، ہاتھ جوڑے ادب سے جھکے کھڑے رہتے تھے۔ اب وہ مالکوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے جیسے امیر لنگے، غریب کی ہونٹوں کو تاکتے ہیں۔ پھر ایک عجیب بات سننے میں آئی۔ کئی راجپوت سویرے گھروں سے باہر نکلتے تو اپنے دروازوں پر گوہ پڑے دیکھتے، جس کے بارے میں لوگ کہتے کہ بھوت پریت لگ گئے ہیں۔ کامریڈز (جن کو راجپوت نفرت سے امکڑے دھمکے کہتے تھے) کے نئے حربے راجپوتوں سے برداشت نہ ہوئے۔ انہوں نے تھانیدار سے ساز باز کر کے بودورام، بنتا سنگھ، دسوندھی رام اور امیارام کو تھانے میں بلوایا اور انہیں تڑوایا۔ پولیس کی ناانصافی، بے رحمی، زیادتی... سے کامریڈز اور متحد ہو گئے۔ وہ چاروں نوجوان تھانے سے زندہ مردوں کی طرح اٹھا کر لائے گئے۔ وہ بستر معیبت پر ہی گل مٹر جاتے لیکن جوانی کی ہڈیوں کی قوت شفا! وہ رینگتے رینگتے اٹھ بیٹھے، بیٹھے بیٹھے کھڑے ہوئے اور ایسا کھیلوں کے سہارے چلنے لگے اور آخر کار وہ سہارے بھی جاتے جاتے چلے گئے لیکن وہ ان شخصوں کو چرلے گئے جو عہد شباب کی جولاںیاں ہوتی ہیں۔

زراعت کو محنت سے وہی نسبت ہے جو بیمار کو دوا دلاؤ سے۔ ساوئی ربا دہو گئی، ساڑھی ربا دہو گئی، نظر آئی تو راجپوتوں کو امکڑوں دھمکروں سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ مزدوروں کی مزدوری نقد طے ہوئی تب ساڑھی بچی۔ اُس تحریک کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ گاؤں میں ایک جاگرتی آئی جو بصورت دیگر ممکن نہ تھی۔ لوگ باہر کھیتوں میں بھی گرٹھا کھود کر مٹی پھرتے اور پھرا سے پاٹ دیتے۔ وہ بدجو جو اس تحریک کے تالو سے تلوں تک خلافت تھے، وہ بھی اس کی یہ خوبی مزدور سراہتے۔

مٹی اور میل کامکاروں کے بدن کا اتنا ہی لازمی حصہ ہے جتنا مٹی، مٹی کا اور میل، میل کا۔ ہمارے گاؤں کے کامکار زمانے سے الگ نہ تھے۔ ان کے گھروں میں صابن کی پدوی آشیائے عیش و عشرت کی سی تھی لیکن جوں ہی وہ ان کی تلاش میں نکلے انہوں نے اسے اپنے پاؤں کے نیچے انجانہ دھرتی کی طرح پایا۔ انہیں کوئی دھرتی میں سے یہ ریل اور بنجر میں سے گو گو ایک طرح کی مٹی جسے قلعی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، پانی کی فراوانی تھی ہی، بیرونی ماحول کے

ساتھ گھربلو ماحول بھی سُور نے لگا۔ اپنے مخصوص جذبے کے ساتھ، کامکار جس چیز پر توجہ کرتے، اُس کی صورت بدل دیتے جیسے اُس میں نئی زندگی مضمّن تھی لیکن ظاہر ہونے کے لئے اُن کے دستِ محنت کی منتظر تھی۔

”میں کامریڈوں کو جتنا سُنا وہ اتنے ہی حیرت انگیز لگتے۔“

”مذہبوں اور نسلوں کے نام پر جتنا اُہو بہا ہے، پنجاب کے دریاؤں سے آتا پانی نہیں گزرا ہے۔“

”آدمی کے لئے دھرم ایسے ہے جیسے افیم کے لئے افیم! اور دھرم استھان، افیم گھر ہیں۔“

”اپنا گھر آدمی کا اطراف صاف رکھو، پورا گاؤں اپنے آپ صاف ہو جائے گا۔“

”ذاتی ملکیت سب فسادوں کی جڑ ہے۔“

ان خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ ان کے موجد کارل مارکس کا نام لیتے اور اُسے عصرِ نو کا مسما کہتے۔ اُن کی سب سے نئی بات یہ تھی کہ وہ کالجوں، کارخانوں، ڈیموں، نہروں، بجلی گھروں کو قوتِ وقت، تقدیرِ جیت، سرمایہ متقبل کے خیال خیز نام دیتے تھے۔ اُن کی کڑی سچائی یہ تھی کہ وہ پیغامبروں کے برعکس انسان کے ساتھ دھرتی پر انصاف کرنا چاہتے تھے اس لئے رُوحانیت کی بجائے معیشت کی باتیں کرتے تھے۔ تایاجی کی طرح وہ بھی رزمیوں پر ملامت کرتے اُن کی دلیل تھی کہ رزمیے، انکی نفرت کو تازہ کرتے ہیں اور ہم ذاتِ پات کے دشمن ہیں۔ وہ جس جہاد کے حق میں تھے وہ لاعلمی، غریبی اور بیماری کے خلاف تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان ایسا حیوان ہے جس پر تعلیم و تربیت کے ساتھ رواداری لازم ہے۔ وہ جو کہتے تھے، کرتے تھے، جو کرتے تھے اُس کا پھل آپس میں بانٹ کر کھاتے تھے۔ وہ پتھاریوں کے رویے سے بالکل پاک تھے اور اپنی کٹر سادگی کو یوں سراہتے تھے، کم کھانے سے انسان صحت مند اور ہلکا پھلکا رہتا ہے۔“

ہر مہینے کے آخری ہفتے سکول میں ادبی جلسہ ہوتا تھا۔ ہر کسی کو سُنے سُنانے کی آزادی تھی، اگیت، مچھلے، نظمیں، غزلیں، ربوئیاں... کچھ بھی سُناؤ، چلتا تھا۔ لیکن جب میں جاگو سُنانے لگا تو نبی بخش نے مجھے پہلے ہی بند پر روک دیا اور غصے سے پوچھا، ”یہ شرا انگیز گیت تو نے کس سے سیکھا؟“

میں ڈر گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ روایت کسی بھی ہو جائز ہے اور اُس سے انحراف جرم۔

اُن دنوں پنجاب کی سرزمین پر سرچھو ڈرام کا نام آفتاب کی طرح اُبھرا تھا۔ کسان اُس کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ کوئی اُس کے بارے میں بُرا بولتا تھا تو وہ اُس سے لڑ پڑتے تھے۔ سرچھو ڈرام کسی کسان کا بیٹا تھا جو پڑھ لکھ کر وزیر کے مرتبے تک پہنچا تھا۔ وہ کسانوں کی افسوس ناک حالت سے واقف تھا۔ اُس کی آن تھک کوشش سے پنجاب میں ایک انقلابِ اراضیات اور ویسے ہی کچھ اور قانون بھی بنے، جن کی رو سے کسان، ساہوکاروں کے نفعے بنتے بچ گئے، زمین نامے رد ہو گئے، جائیداد مرہونِ بلامعا و فائدہ کسانوں کو واپس مل گئی۔ غیر کاشت کاروں سے

زمین خریدنے کے متعلق چھین گئے اور کسانوں کے قرضے مُعات ہو گئے۔ اُس ایک آدمی کی وجہ سے وہ انقلاب آیا جو لاکھوں محنت کشوں کی محنت اور اُن کی زندگی کے تحفظ کی مُعات تھا۔

جس دن اُس ایکٹ پر عمل دخل ہوا، ہندو رنگھ اپنے کھیت کی مٹی اٹھا کر ایسے سونگھنے لگا جیسے اُس میں سرور پرور عناصر چھپے ہوں اور محض اُمی پر عیاں ہوئے ہوں۔ وہاں لیکر کا درخت تھا۔ وہ اُس سے لیٹ کر کھردری چھال کو بے اختیار بار بار چومنے لگا جیسے وہ محبوبہ کے ریسے ہونٹ ہوں۔ وہ جوشِ جذبات سے بھرک اٹھا، اُس کا پیازی رنگ شہابی عکس سے جھلکنے لگا جیسے ہاتھ کے نیچے لائٹ جلاتے سے ہوتا ہے۔ روڈا باہتی کھیت میں جھنڈی پر لیٹ گیا اور اُس سے کال مَس کرنے لگا جیسے وہ بسترِ استراحت کے پھول ہوں۔

غلام حیلانی اپنی فیل پانی کے باوجود بطّخ کی طرح چلتا ہوا اُس زمین کو دیکھنے چل پڑا جس پر اُس کا لڑکا جمال قبضہ لے کر آیا تھا۔ جمال اُس زمین کا کو لمبس تھا! فرق یہ تھا کہ کو لمبس نے اپنی دریافت اپنے عُسن فردی ناد، اراٹکا کے بادشاہ کے نام دُفع کر دی تھی جب کہ جمال کی دریافت اُس کی اپنی ذات کے پالن پوسن کے لئے تھی۔ اُن کے گھروں میں اُن ہوتی ہوئی تھی، وقت واپس لوٹ آیا تھا! اُن کی بیویاں بن سُنور کر نیاز دینے کے لئے گھر سے نکلیں تو دُہنیں لگ رہی تھیں۔ اُس دن دھرتی کے اُنق سے نیا آسمان پھوٹا تھا جس کا آفتاب کسان تھا۔

## باب ۱۳

اک شخص سے رستے میں ملاقات ہوئی

دل چسپ طریقے سے مدارات ہوئی

شرما کے نگاہوں کو جھکایا پہلے

پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات ہوئی (شاطر)

قاریبیں! میں ایک انوکھا انکشاف کر رہا ہوں۔ میرا وجدان مجھے یقین دلاتا ہے، میں اچھوتا ہوں! اس سے پہلے میں نے خود کو نہ کسی پر ظاہر کیا اور نہ ہی کسی کو اپنی حقیقت سمجھنے کے قابل پایا۔ میں ازل سے تیرا ہی مُنظر تھا! تیرے ہی نور سے میرے وجود کو ظہور ملا ہے اور میں اس کا احسان مند ہوں۔

تو لوچن سینگ کے بیاہ پر نانا کمیل (دہ لڑکیاں جو بیاہ پر نہیںال سے آئیں) نے جو اودھم مچایا اُس کا

چڑچاٹی سال تک رہا۔ وہ مست اور نڈر دو شیرازیں اس گھر پر اور کبھی اس گھر پر دعاوا بولتیں اور کہتی، گھٹی، دودھ، دہی، چھین، بھیت کر کھا جاتیں۔ انہوں نے دوپٹوں کی ٹنگریاں باندھ رکھی تھیں اور کھیتوں میں کلاریاں مارتی گھوم رہی تھیں۔ مزد، برات کے ساتھ پتھیاں گئے ہوئے تھے اور کہیں کوئی اکا دکا تھا تو وہ کھیتوں میں کام کر رہا تھا جس گھر کی مالکن نے انہیں روکا ٹوکا، انہوں نے اس کا زیادہ نقصان کیا۔ ان کی قابل ستائش خوبی ان کے رنگیلاں منانے کا فن تھا، جس کا مظاہرہ وہ کئی طریقوں سے کرتی تھیں۔

وریام رنگہ کے گھر میں وہ ناجیتی ناجیتی اور گاتی گاتی رک گئیں۔ ان میں سے ایک مٹیابا (دو شیرہ) آگے بڑھی اور انہیں ادھر ادھر دھکیلتی جوتی کہنے لگی۔ ”دائرہ بناؤ، دائرہ! ناکھ کریں گے۔“ دائرہ بن گیا تو اس نے اپنا دوپٹہ سر سے اتار کر کمر سے باندھ لیا اور جھوڑا کھول کر بال بکھرا لے اور میر تقی کی طرح گھومتی ہوئی پھارنے لگی۔

”جوگی آیا، بھینو جوگی آیا۔ باہروں دیکھنا تاں اندر دی دسدا۔“

(بھنو! جوگی آیا ہے۔ باہر سے دیکھتا ہے لیکن بات اندر کی بتاتا ہے)

اس نے ایک پٹاخہ بھی مٹیابا کو ہاتھ سے پکڑ کر آگے دائرے کے بیچ کھینچ لیا اور اس کا ہاتھ دھکتی ہوئی جوگی کی زبان میں باتیں کرنے لگی۔

”بی بی میں سدا جوگی اس!“ (بی بی میں کال جوگی ہوں)

”میں لکیراں پڑھدا اس!“ (میں لکیریں پڑھتا ہوں)

”تیریاں اُپر دیاں لکیراں ایوں اس!“ (تیری اوپر کی لکیریں ایسی ویسی ہی ہیں)

”تیرے تھنے دی لکیر ہی سب کچھ اے!“ (تیرے نیچے کی لکیر ہی سب کچھ ہے)

”تیرا رب کمال دارب اے!“ (تیرا رب کمال کا رب ہے)

”اونے تیری قسمت دو تھال کھ دتی اے!“ (اس نے تیری قسمت دو جگہ لکھ رکھی ہے)

”ادھی اوتھے!“ (ادھی وہاں، اس نے مٹیابا کی جانگھ کی طرف اشارہ کیا)

”ادھی ایٹھے!“ (ادھی یہاں، پھر اس نے اپنی جانگھ کی طرف اشارہ کیا)

کسی لڑکی نے شرمناک اور تکی نے کھلے بندوں اس کی جرأت کو سراہا۔

ہندو رنگہ کے گھر میں کوئی دوسری لڑکی بولا ہوا نہیں گئی۔ اس نے ہندو رنگہ کی بیوی پر تہم کو رکھا ہاتھ پکڑا اور

اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔ پر تہم کو نے اپنا ہاتھ پھڑکانا چاہا لیکن اس نے زچھوڑا۔

”بی بی اڈر کا ہے دا؟“ (بی بی تو ڈرتی کیوں ہے؟)

”میں ہاں تیرے پندو جلا ہا!“ (میں تیرے گاؤں کا جلا ہا ہوں)



”سانی بوالے“ (تو تانی بوالے)

”آگے پوالے“ (آگے ڈوالے)

”پچھے پوالے“ (پیچھے بھی ڈوالے)

”بی بی میرے متھے دل نہ دیکھ؟“ (بی بی میرے ماتھے کی جانب کیا دیکھتی ہے؟)

”ایدھر دیکھ!“ (ادھر دیکھ)

لہریا! ایک قسم کی مٹی (ڈیزائن)

اُس نے اپنے ہاتھ کا سانپ بنا کر پریم کور پر لہرایا۔

ویسے نالک میں نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ میں خود ایسی کتنی بولیاں جانتا تھا جنہیں عورتوں کے سامنے

لگانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مجھے ”پیسٹر“ یاد تھی جسے پنجابی لوگ گیتوں کا سرتاج مانا جاتا ہے۔ لیکن ان رمزوں اور نقلوں کے معنی مجھ پر تبھی کھلے تھے جب میری مستور فطرت نے ہویدا ہونا پسند کیا تھا۔

تروچن سنگھ کا منکلاوا (گونا) گرمیوں میں آیا اور وہ میاں بیوی چھت پر سونے لگے۔ ان کی، اُسانگھ کی اور ہمارے گھروں چھتوں کو صرف منڈیر جڑا کرتی تھی۔ وہ اپنی چھت پر ایک چار پائی اور ایک مسہری لگاتے اور جتنا ممکن ہوتا، ہماری منڈیروں سے دور رکھتے۔ چار پائی بس نام کے لئے ہوتی تھی۔ جوں ہی دوسری چھتوں پر خاموشی اُرتی۔ امر کور تروچن سنگھ کی مسہری پر جا چڑھتی۔ وہ یہ کام لاکھ نرمی سے کرتی لیکن مسہری کی بدتمیز چولیں اُس کی بل جل کا اعلان کرتیں۔ تروچن نے چولیں ٹھونکیں، انہیں تیل دیا لیکن ان کی زبان بند نہ ہوئی۔ چولوں کی پکار سن کر میری آنکھیں مجھروانی کا احاطہ کرتیں اور اُس کے اندر ان میوہوں کو دیکھتیں جو چولوں کے ساز پر ناچ رہے ہوتے۔ تن و جاں کے اتحاد کا وہ منظر جب تک ختم نہ ہوتا، میں روحانی طور پر مجھروانی کے ساتھ چپکا رہتا۔

امر کور دلدار مٹیارتھی اور ہر وقت ٹہلیں کرتی رہتی تھیں۔ میں کچھ ہی دنوں میں اُس سے گھل مل گیا۔ میں نے

پوچھا، ”بھابی، کل رات آپ ادبھائی صاحب چار پائی پر لڑ رہے تھے۔ اگر چار پائی ٹوٹ جاتی؟“

”مجھے کس نے بتایا؟“ اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

”میں نے خود دیکھا ہے! میں نے فخر سے کہا۔“

”اوہ!“

اُس نے مجھے کان سے پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے ڈانٹ کر کہا، ”بڑوں کو لڑتے دیکھتا۔“

چلیے! پھر ایسی حرکت کی تو تیرا سر دوکانوں کے بیچ کر دوں گی!“

”وہ تو اب بھی ہے!“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ابھی تھوڑا باہر ہے! وہ کان مروڑ کر جھل نما غصے سے بولی۔

میں نے سر کو جھٹکا دے کر کان چھڑوا لیا اور بھاگ گیا۔ آسا سنگھ مجھ سے روز پوچھتا تھا، ”ترلوچن سنگھ رات کو سارنگی بجاتا ہے، تو نے سنی ہو تو بتا؟“

”ہاں، سنی ہے!“ اُس کے دوہرے مطلب سے بے خبر میں کہتا۔

”لیکن ایک بات ہے!“ وہ ادھر ادھر دیکھ کر میرے کان میں بولتا۔

”کیا بات ہے؟“

میری بے قراری بڑھ جاتی۔

”اُس سارنگی کو سنا ہے تو تجھے ترلوچن سنگھ کے بستر کے نیچے چھپنا پڑے گا!“

اُس کی بات میں ترغیب ہوتی۔

”تو نے ایسا کیا ہے؟“

میں پکڑے جانے کے ڈر سے گھبرا جاتا۔

”ہاں، کیا ہے!“

وہ میا حوصلہ بندھاتا۔

میں ترلوچن سنگھ کی چار پائی کے نیچے چھپ کر اُس انوکھی سارنگی کو سنا چاہتا جو صرف اُمی کے نیچے چھپ کر سنی جاسکتی تھی لیکن میں پکڑے جانے کے ڈر سے ویسا کرتا۔

ترلوچن سنگھ کی شادی ہوئے تین سال ہونے کو تھے۔ اُس کی بیوی پہلے سے زیادہ موٹی ہو گئی تھی لیکن اُس لحاظ سے نہیں جس لحاظ سے اُس کی ساس چاہتی تھی۔ اُس کی ساس بیرو اُسے اوسر کہتی، کبھی تنجر اور کبھی پھنڈر (وہ گائے جو بہار پر ذائے) لیکن امر کو ایک لٹرا اور بے پروا جوانی تھی۔ وہ امر کو سے ٹوٹا ٹوکنا کر دانا چاہتی اور اُسے دو مونہے (ایک سانپ جس کے دو مونہ ہوتے ہیں) پر نہلانا چاہتی۔ وہ بھولی سی صورت بنا کر کہتی، ”ماں! یہلے ایک مونہے پر جی بھر کر نہلنے دو، اُس سے ابوؤں گی تو دوسرے کا منہ دیکھوں گی۔“

اُس کی شوخی پر بیرو اُسے پھٹکارتی، ”وہ اُس کا منہ چڑاتی، دو مونہا! ناں ماں ناں! اب مجھے ایک مونہے ہی سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یقین ذائے تو اپنے بیٹے سے پوچھ لے۔“

بیرو نے اُس سے ترابے پر ٹوٹنا کر دانا چاہا۔ اُس نے پوچھا، ”ماں! اس سے کیا ہو گا؟“

”تیرا راستہ کھل جائے گا!“ روایت پرست بیرو نے اُسے سمجھایا۔

”ماں! تیرا مطلب ہے کہ ایک کے تین راستے ہو جائیں گے؟ میرے لئے تو ٹھیک ہے ماں! اپنے

بیٹے بے پوچھ لے۔ وہ میرے ایک ہی راستے سے ڈرنے لگا ہے اور دودھ سے حویلی میں سوتا ہے۔“ اپنے نٹ کھٹ انداز سے اُس نے اُسے ارایا۔

”بے شرم! زبان کچھ نکالا کر! بیرونے ڈانٹا۔

”تو کہتی ہے تو ٹھیک ہے ماں! لیکن تیری باتیں ہی ایسی ہیں!

اپنی سنگفٹ مزاجی سے اُس نے اُسے لاجواب کر دیا۔

ایک بار وہ قے کرنے لگی اور اپنی ساس کو امید افزا پا کر کہنے لگی، ”ماں، ماں! میری دودھیاں میں بھی

زور کا درد ہوتا ہے اور پھوڑے کی طرح دکھتی ہیں۔“

اُس نے اُس کی بتائیں لی اور خوش ہو گئی، ”شکر ہے! تجھ پر بھی بھگوان کی کرپا ہوئی ہے!“

دوسرے ہی دن امر کو رنے جن علامتوں کی تصدیق کی تھی، اُن سے دست بردار ہو گئی۔ اُس کی ساس نے

پوچھا تو اُس نے منہ بنا کر کہا، ”مجھے نہیں چاہیے ایسا بچہ! لوگ کیا کہیں گے؟ جو کام تیرے بیٹے کی کرپا سے ہونا تھا وہ

بھگوان کی کرپا سے ہوا ہے۔“

وہ مجھ سے ددنی پہیلیاں بچھواتی، جیسے

”بلنا بلونا بل ٹھنڈ پونا، میرے لئی دیورا اک بلنا لیا دنا۔ اُس کا نام بلنا ہے۔ وہ بلنا ہے تو خوشگوار لگتا

ہے اور جی کی ملن بچھاتا ہے۔ میرے دیور! میرے لئے ایک بلنا لے کر آؤ۔“

ایک بار اُس نے یہ پہیلی بچھوائی،

سگری رین چھتن پر را کھا، رنگ رس سب اُس کا چاکھا

بھور بھئی جب دیا اتار، بوجھ سکھی کر سوچ و چار

میں ان پہیلیوں کے جو معنی بوجھتا وہ انہیں غلط بتاتی۔ میں اُسے بوجھنے کو کہتا تو وہ بہانہ کرتی، میں تھکی ہوں

میری ٹانگیں دبا تو بوجھوں گی۔“

وہ رنھورو (وہ استری جس کی ٹانگیں کیلے کے تنے سمان ہوں) قسم کی نارٹھی۔ وہ چاروں شانے پت لیٹ

جاتی اور میں اُس کی ٹانگیں دباتا۔ وہ میری پکڑیں ذاتیں اور میں انہیں اوپر اوپر سے داتا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے

دبانے کو کہتی اور میں جتنا زور لگا سکتا، لگاتا۔ وہ کچھانہ پہنتی تھی۔ شلوار کا آسن بدن سے چپک جاتا اور جھانگھوں کی بکون کو

ٹمپایاں کر دیتا۔ اُس پردہ دری سے گھبرا کر میں اپنے ہاتھ گھٹنوں سے کچھ ہی آگے لے جاتا۔ وہ ’اوپر‘ اور ’اوپر‘ کی رٹ لگاتی

ہوئی کراہتی۔ اُس کے چہرے کے بھید بھاد ایسے بدلتے جیسے وہ کرب و نشاط کے دونوں جذبوں سے ایک ساتھ گڑبڑی ہو۔

میں پہیلیاں بچھول کر اُس کے کراہنے کے سنگیت سے جھومتا ہوا ٹانگیں دباتا رہتا جب تک کوئی دروازہ کھٹکھا کر ہماری

حفصل کو درہم برہم نہ کر دیتا۔

آسا سنگہ مانجھے بیٹھا، اس کی بھابھیاں اُسے لنگنا باندھ کر اُٹن ملنے لگیں اور ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں اُسے ستانے لگی اور طنز و مزاح کا نشانہ بنانے لگی لیکن امر کوڑ کی بات ہی اور تھی۔

”وہا میاں! اوہن لارہے ہو۔ پاس مال بھی ہے؟“ امر کوڑ نے آسا سنگہ سے پوچھا۔  
”بالکل ہے! آسا سنگہ اُسی بے حیائی سے بولا۔

”درا دکھاؤ! امر کوڑ نے اس کے ناڑے پر جھٹکا دیا۔

”تجھے کیوں دکھاؤں؟ جسے دکھانا ہے اُسے ہی دکھاؤں گا!“

آسا سنگہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اُس نے ناڑے کو گول کاٹھ دے رکھی تھی اور اطمینان سے پیڑ سے پر بیٹھا تھا۔ یہ داؤ بیچ اُسے پیار سنگہ نے بتایا تھا جس کے مانجھے پر اس کی بھابھیوں نے اُس کا ناڑا گھول کر اُسے تنکا کر دیا تھا۔ مانجھا جاری تھا اور اُسی طرح ہنسی بڑا۔ آسا سنگہ، امر کوڑ کی شلوار پر پیکا، وہ ہرنی کی گود کر پیچھے ہٹ گئی لیکن اُسی وقت بے انت کوڑ نے جلدی سے آسا سنگہ کے ناڑے پر پھری چلا دی۔ اُس کا پکھانچے گرا۔ جس کی بجائے ایک ساتھ پڑے اور اُس کے ٹکڑے کر گئے۔ آسا سنگہ ننگا ہو گیا۔ وہ ایک ہاتھ اُگے رکھے اور دوسرا پیچھے، وہاں سے بھاگا اور کمرے میں جا کر چھپ گیا۔

ہماری میری، دیوار کے اوپر سے امر کوڑ کے صحن تک پھیلی ہوئی تھی۔ میری پر کچھڑی اتنی، شاخیں جھک کر دیوار سے جا لگیں اور جب وہ پھلتیں زمین تک نہچی ہو جاتیں۔ امر کوڑ چاہتی تو ہاتھ سے میر توڑ کر کھا سکتی تھی۔ اوچھے پکے میر توڑنے کے لئے میں نے اُسے شہتوت کی لمبی پھڑی لادی تھی لیکن وہ مجھ سے میر توڑا کر کھاتی تھی۔ اُسے خوش کرنے کے لئے میں کانٹوں سے الجھتا، اُس کی پسند کے میر توڑتا، کچھ کھانا اور کچھ اُس کے پلو میں پھینکتا۔ کوئی واہ واہ لال سو با میرین تو میں اُسے دُکھا دُکھا کر کھاتا۔ وہ نیچے کھڑی دامن پھیلائے التجا کرتی، ”مجھے ایسا ہی میر دو! میرے اچھے دیوار۔ ایسا ہی میر!“

میں ویسا ہی میر توڑتا اور نشانہ بدل کر اُس کے سینے پر مارتا جو اُس کے منہ کی طرح گول مٹول اور لبریز تھا۔

میر اچھل کر دوڑ گرتا جسے ہم ایک دوسرے کی کوتاہی ٹھہراتے۔ میر نشانہ ٹھیک لگتا تو میر چھاتی اور چوٹی کی درمیانی ٹھانی میں گم ہو جاتا۔ وہ مجھے تھپتھپ کر کھاتی، اگے جھکتی، میر نکالتی، میر کھاتی، خوش ہوتی اور ن لال لال میروں کی طرف اشارہ کرتی جو میری پہنچ سے باہر تھے۔

مجھے زن و مزد کے رشتے کا صرف لفظی گیان تھا اور وہ بھی ان بولیوں کی بدولت زمین کو میں لا تعداد تعداد میں جانتا تھا۔ وہ بولیاں جو اُسے نفس کی دھکی چھپی تفسیر ہیں کہ کتنی دھڑکی تصویر۔ میں صرف ایک ہی نمونے پر اکتفا کرتا ہوں۔

منڈیاں دی عید ہو گئی

بالے بیاہ مٹیاریا ندی

(جوانوں کی عید ہو گئی کیوں کہ بوڑھے نے جس سے شادی کی وہ جوان لڑکی تھی)

امر کو رہنمائی بے پروا واقع ہوئی تھی۔ وہ سویرے بستر سے اٹھی تو اکثر اٹنی شلوار پہنے ہوئی۔ اُس کی چھت کی بیڑھی میری چھت کے قریب تھی۔ وہ میرے پاس سے گزرتی، میں شلوار کی طرف اشارہ کرتا۔ وہ اُوھر دھیان نہ دیتی اور بھڑپڑکتی۔ اگر میں بکڑا جاتا، وہ میرا کان مروڑتی اور مسکراہٹ روکتی ہوئی کہتی، ”میں شلوار تو پہنتی ہوں، اُٹی ہی ہے! تیری بیوی سستی سے ننگی لکھو مارے گی۔“ وہ میرا کان نہ چھوڑتی تب تک کہ میں اُس کے بیونچی کاٹ کر اُسے بے بس نہ کر دیتا۔ امر کو رگولیاں سننے کا شوق تھا۔ میں اُسے بولیاں سناتا، اونچی آوازیں گاتا تو وہ مجھے آہستہ سنانے کو کہتی۔ وہ کسی کسی بولی پر بھڑک اُٹھتی۔ اُس کے کال، گولان چھڑکے سے ہو جاتے اور اُن پر گڑھے گہرے ہو کر خوب تر لگتے۔ وہ مجھے باہوں میں جکڑ لیتی اور بوجھتی، ”یہ سب تو کس سے سیکھتا ہے؟“

”پڑوا ہوں سے!“ میں سیدھا سادا جواب دیتا۔

”تو ان کا مطلب جانتا ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں گہرا جھانک کر پوچھتی۔

”جانتا ہوں! میں وثوق سے کہتا۔“

”نہیں، تجھ ان کا مطلب معلوم نہیں! میرے بانکے، میرے شیلے!“ وہ آپے سے باہر ہو کر میرا منہ چوم کر کہتی۔ میں پھر ہاں کہتا۔ وہ بے قابو ہو کر مجھ سے پلٹ جاتی اور ہنسی ہنسی میں میرا کاچھا ٹٹولتی اور وہاں کوئی حرکت نہ پا کر زور زور سے ہنستی۔

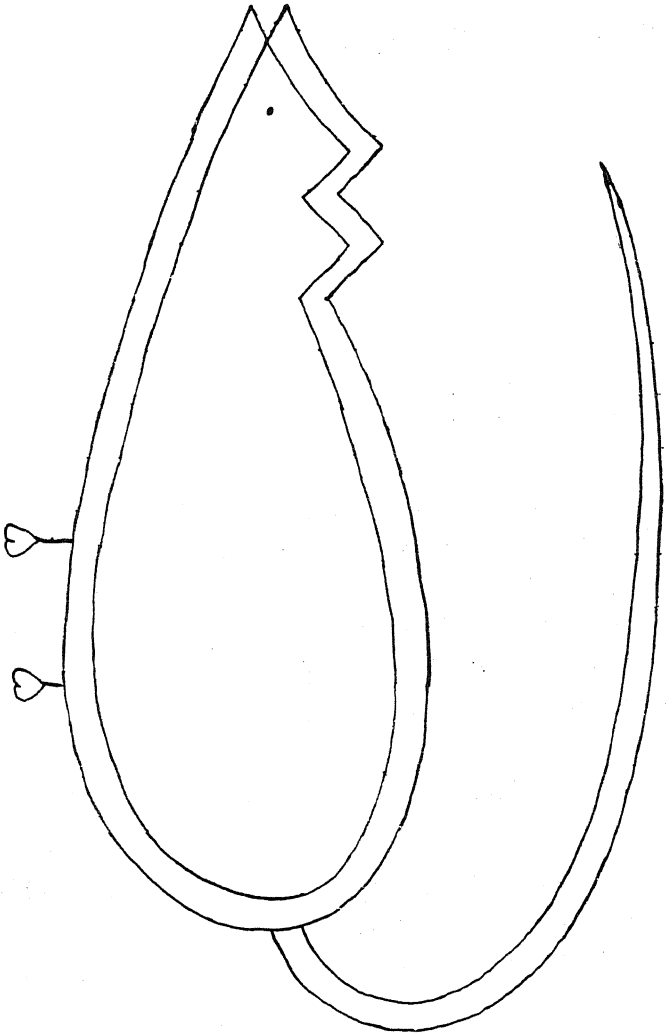
میں سیٹ پر حساب کے سوال کر رہا تھا، امر کو میرے پاس آئی اور مجھ سے سیٹ کا قلم لے کر بولی،

”آج میں پڑھاتی ہوں تجھے!“

قلم بٹھوڑی پر رکھ کر وہ سوچنے لگی۔ پھر سیٹ پر لکھتے ہوئے بولی، ”میں نے کسی کو ستر (۷۰) روپے دیے اور ایک کام کرنے کو کہا، اُس نے روپے لے لیے لیکن کام نہ کیا۔ میں نے اٹھاسی (۸۸) روپے دیے لیکن اُس نے کہا کہ کم ہیں کچھ اور دو۔“

”وہ کام کیا تھا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”پہلے ادھر دیکھ پھر بتاؤں گی!“ اُس نے سیٹ کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ ستر اور اٹھاسی ہندسوں میں لکھ چکی تھی۔ اُس کے کہنے پر میں نے اُسے ایک چادر دی اور گیارہ روپے ساتھ دیے۔ میرا نرم رویہ دیکھ کر وہ اگر کیا اور زیادہ مانگنے لگی۔ میں نے خیال نہ کرتے ہوئے گیارہ میں پچیس (۱۵) روپے دیے۔ اُس نے میرے ہجڑے سے فائدہ



اٹھایا اور اپنا مطالبہ بڑھا دیا۔ مجھے ناؤ ہی آگیا۔ اُس ڈیڑھے کو سیدھا کرنے کے لئے میں نے ایک بڑا سا بانس لیا اور اُس کے چوڑوں میں گھسا دیا۔

”یہ تو چوہا ہے!“ میں خوشی سے چلایا۔

”اسے تو نے بوجھ لیا ہے، اسے بوجھ گاتا تو جانوں گی!“ اُس نے مجھے جنونی دے کر کہا۔

اُس نے سیٹ پر تھوکا، اُسے رگڑ کر صاف کیا اور مجھ سے چھپا کر اُس پر کچھ بنانے لگی اور جب مجھے سیٹ دکھائی اُس پر آدمی کا خاکہ تھا، میں نے جھٹ بوجھ لیا۔ اُس نے میری بات کو رد کرتے ہوئے کہا: ”نہیں، یہ عورت ہے!“ میں نے اُس کے ہاتھ سے سیٹی لی اور خاکے کے بسنے پر دو دائرے بنا کر کہا، ”عورت یوں ہوتی ہے!“ میرے ایسا کرتے ہی امر کو بے اختیار چلائی، ”چاچی، گیان جوان ہو گیا ہے!“ میں اس کے لئے رشتہ لاتی ہوں، منظور ہے تو بل!“

امر کو رک کر چلیا روئے مزیدارتھا۔ سون کو رک کی شادی میں گیان سنگھ حوالدار ملل کا کرتہ پہنے ہوئے تھا، جس کے نیچے پن استین کی سفید بنیان صاف دکھائی دے رہی تھی۔ گرمی میں ایسا لباس مزید دیتا ہے لیکن سردی میں اپنی بسکی آپ ہے کسی نے اُسے اڑایا، ”اوہ! کیا گرمی ہے!“

”ہاں بھی تو چلتی ہے!“ حوالدار نے اُسی دھڑائی سے بات بنائی۔

برائی کھانے کے لئے بیٹھے، اُس پر لڑکیوں کی نظر پڑی اور وہ اُسے ٹھنئیاں دینے لگیں۔

اُگ لگی گیان سنگھ دے

کوئی آوے اینوں بچھا دے

(گیان سنگھ کے اُگ لگی ہوئی ہے، کوئی ہے جو اسے بچھائے)

امر کو بڑا پنکھالے آئی اور اُسے جھٹنے لگی۔ اُس کی یہ دل لگی ہر کسی کو پسند آئی۔ وہ وہاں سے واپس ہوئی تو دو پہلے کا جوتا اٹھا کر لے گئی جسے اُس نے نینگ لے کر ہی لوٹایا۔

امر کو رکے نہانے کے وقت میں گھر میں ہوتا وہ مجھے پیٹھ تلنے کے لئے بلاتی۔ وہ غسل خانے میں بیٹھ جاتی اور ٹھٹی بیٹھی سارے کپڑے اتار پھینکتی، چولی کی باری آتی تو پچھایا مجھی سے کھلواتی۔ میں جوں ہی کاٹھ کھوتا وہ گھٹنے اٹھا کر سینے سے لگا لیتی اور کیس آگے پھیلا لیتی، میں ان میں پانی ڈالتا اور وہ ان پر صابن لگاتی۔ اُس کے کیس اتنے بڑے تھے کہ پٹھرے پر بیٹھے ہونے کے باوجود زمین کو چھوتے تھے۔ میں شرارت کرتا ہوا اُس کی پیٹھ پر پانی گراتا اور وہ اپنی چمبلاٹ پر قابو پا کر میری سرزنش کرتی، ”نہانے دے، تجھے ٹھیک کرتی ہوں!“

”میں ٹھیک ہی ہوں! تیرے پلنے سے ایسا ہوا ہے۔“ میں خود کو حق بجانب ثابت کرتا اور پھر وہی شرارت

کرتا اور اُس سے چھڑکی کھاتا۔ وہ مجھ پر پانی پھینکتی، میں کام بیچ میں چھوڑ کر جانے کی دھمکی دیتا اور انہیں سمجھوتے پر رکتا کہ نہ مجھ پر پانی ڈالے گی اور نہ میں اُس پر، لیکن وہ سمجھوتہ اتنا ہی عارضی ہوتا جتنا لوٹے میں پانی بھرنے کا وقفہ۔ وہ کیس دھو کر جھٹکتی اور سینے پر پھیلاتی اور اُس سے آسن لاکر بیٹھ جاتی۔ میں اُس کی پیٹھ پر ہاٹ لگا کر جھانپوں سے ملتا اور کن آنکھوں سے اُس کے ننگے سسروں کو دیکھتا جو ننگے ہو کر بھی ننگے نہ ہوتے۔ ایک بار میں نے اُس کی بنگلوں میں گندگئی کر دی۔ وہ ہنسی سے بے دست و پا سی ہو گئی اور چت لیٹ گئی۔ میں دنگ رہ گیا! اُس کا بدن، بچکے کی طرح بے مومتا۔

بوتلوں کے موسم میں ہوئے بھونا کرتے تھے۔ امر کر کے آنے سے ہوئے کھانے کے ساتھ ساتھ دل لگی کا سامان بھی پیدا ہو گیا۔ جب تک ہوئے گرم رہتے، ہم ہوئے کھاتے پھر ایک دوسرے کے منہ پر کا لک لگتے۔ وہ نرم و نازک احساسات اور اُدھورے کھلنڈرے تجربات اُدھر سے ہو کر رگوں تک گہرے اور خون کی طرح گرم تھے۔ احساس، انسان کے اندرونی تضاد کو کم کرتا ہے۔ چوں کہ اندرونی تضاد ہر حرکت کا سرچشمہ ہے اس لئے احساس سے جوئی صورتِ حال ظہور میں آتی ہے وہ گونا گونی میں یک رنگی ہے۔

تایاجی کے احساس کا تخیل، عملِ فطرت کی ترجمانی کرتا تھا، ”دھرتی کو جڑ سے، جڑ کو تنے سے، تنے کو شاخوں سے، شاخوں کو پتوں سے، پتوں کو پھولوں سے، پھولوں کو بیجوں سے اور بیجوں کو دھرتی سے محبت ہے اور یہی جنم مرن کے سلسلے کا راز ہے۔“

وہ حیوانات و نباتات کی نفسیات بیان کرتے تھے، حیوانوں اور پودوں کی نفسیات بچوں کی طرح ہیں! جو انہیں پیار کرتے ہیں اور ہمارا دیتے ہیں یہ اُمی کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور باہمی رفاقت میں زیادہ بچھوٹے پھلتے ہیں۔ اپنی اُمی نفسیات کی بنیاد پر جنگلی زندگی تیاگ کر گھر بون زندگی کے قابل ہوئے ہیں۔“

اُن کی اور ماں کی حیوان دوستی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی اور پودوں کے بارے میں اُن کی دانائی آتماقی تھی۔ جو بی بی منڈو سے پرگھیا لکڑی کی پل چڑھی ہوئی تھی۔ اُس کی کچھ لانگریں (شاخیں) پھیلنے پھیلنے کے جوش میں منڈو سے جھٹک گئی تھیں۔ میں نے ساری لانگریں کا رخ منڈو سے کی طرف پھیر دیا اور ایک کو ویسے ہی رہنے دیا۔ میں نے دو ڈنڈے لئے، ایک لانگر کے قریب اور دوسرا اُس سے کچھ دور کاڑ دیا۔ حالانکہ لانگر کا منہ دُور کے ڈنڈے کی طرف تھا وہ رات کی رات میں قریب کے ڈنڈے کی طرف مڑ گئی۔ اُس کے موت مضبوطی سے ڈنڈے سے پٹ گئے جیسے خطرے میں بچہ، ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ بیل کی یہ نفسیات جان کر میں اُس سے کھیتا، جدھر لانگر کا رخ ہوتا اُس کے دوسری طرف ڈنڈا کاڑ دیتا، وہ ادھر پلٹی تو ڈنڈے کی جگہ بدل دیتا۔ میں اُس کا مطلوب سہارا دُور ہٹا دیتا تو وہ بے بسی سے زمین پر ڈھسے پڑتی۔



رمضان کے باغیچے میں شہتوت کا پسیدہ تھا جس کے پھل پک کر سیاہ ہو جاتے تھے اور رس ٹپکاتے جان پڑتے تھے۔ میں شہتوت دیکھ کر بیتاب ہو جاتا لیکن کچھ نہ کر سکتا۔ میں نے شہتوت چرانے کا منصوبہ بنایا اور سکول سے گھر آتے ہوئے اب جو میں اپنے ساتھیوں سے جنگل جانے کے بہانے الگ ہو گیا۔ احمد کے یکار کے گرد بن سوئی ڈھنگی پودا ہے جسے کھیتوں کی بار کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اسے چارپتی والے بیگھے کے پردوں جیسے سفید پھول لگتے ہیں۔ پتیوں کے نیچے موت بھر مونا اور اناج بھر لبا ساں ہوتا ہے جسے چوسنے سے دھونکتا ہے کے پھول دعوت شہتوت دے رہے تھے۔ میں رگ گیا اور پھول توڑ کر چوسنے لگا۔ جسے چوستا اس میں سے شہتوت پوچھیں ہی مٹی۔ میں نے بن سوئی کے اندر جھانک کر کچھ پھول توڑ کر چوسے۔ ان میں سے ایک پھول سے گھونٹ بھر شہتوت ملا اور منہ حلق تک میٹھا ہو گیا۔ میں نے دیر ہی ایک اور پھول ڈھونڈنے کا قصد کیا لیکن ناکام رہا۔ اس ناکافی کارِ عمل! میں رمضان کے باغیچے کی طرف چلا تو میرا شہتوت چرانے کا ارادہ پہلے سے زیادہ پکا تھا۔

باغیچے کی گھنی بار میں سے اندر جانا ممکن نہ تھا۔ میں شہتوت چرانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ میں نے بار کو دھکا دے کر دیکھا، وہ پیروں میں گلی ہوئی تھی۔ تختی کی دو تین ضربوں نے اوپر کی بار اوپر اور نیچے کی بار نیچے کر دی۔ میں نے رخنے میں تختی گھسا کر ڈھینگروں (موکھی شاخوں) کو اوپر اٹھایا اور رنگ کر اندر گھسنے کے لئے راستہ بنایا۔ میں شہتوت پر چڑھ کر شہتوت کھانے لگا اور ساتھ ساتھ جیب بھی بھرنے لگا۔ میں اپنی موج میں پھول گیا کہ میں چوری کر رہا ہوں اور مجھے جلدی بھاگنا ہے۔

”اوپر کون ہے؟ ایک نسوانی آواز آئی۔“

چور کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں! میں شہتوت پر سے جلدی جلدی اترنے لگا۔ گھائی میں پیر رکھ کر میں نیچے چھلانگ لگا رہا تھا کہ جینا نے مجھے باہوں میں دوپٹ لیا اور پناک سے میرا چمٹالے کر بولی، ہائے! کیا پھول سا چہرہ ہے! مجھے سینے سے دباے ہوئے وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ میں نے اسے دیکھا لیکن اس کی بیباکی کی تاب نہ لاسکا۔ میں ان آنکھوں کو پہچانتا تھا۔ میں نے انہیں بار کے اوپر سے جھانکتے اور مسکراتے دیکھا تھا اور خاموشی سے بات کرتے سنا تھا۔ کئی بار چاہا تھا کہ میں ان کے پاس جاؤں اور انہیں قریب سے دیکھوں لیکن ایسا نہ کر سکا تھا۔ اب وہ میرے سامنے تھیں لیکن میں ان سے آنکھیں چڑا رہا تھا۔ شہتوت جسموں کی زردیوں میں اکڑ مٹے گئے۔ اُسے گیلا لگا ہوگا، اُس نے باہوں کی زنجیر کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ میرے دل میں کمزور سا خیال آیا کہ میں بھاگ جاؤں لیکن جینا کے نرم رویے نے میرے کمزور خیال کو کمزور بنا دیدر بس کے کرتے پر گہرا دھبہ دیکھ کر وہ اُس کے ہونے کا راز جاننے کی کوشش کرنے لگی، جان نہ کی تو میری طرف متوجہ ہوئی۔ میری جیب سیاہ رس سے پٹکتی تھی اور میری شرارت کا اعلان کرتی تھی۔ منتر جمی ناراضی دکھاتے ہوئے اُس نے میری جیب سے مٹے ہوئے شہتوت نکال کر پھینکے، رس رنگے ہاتھ سے میرے

نرم نرم طمانچے لگائے اور پھر چٹک کر میرے گال چوم لئے۔

تو تو جگتا ہے! اُس کی بے ساختگی سے ظاہر تھا کہ اُسے میرا نام اچانک یاد آیا ہے۔ میں حیران ہوا کہ اُسے میرا نام کیسے معلوم تھا؟ اُس نے اپنے بازوؤں کو میرے کاندھوں پر رکھا اور اپنے بوجھ تلے دیں گھاس پر بٹھالیا۔ ”تو جو بھی ہے؟“ اُس نے آنکھیں سنکا کر کہا۔

اُس بہتان سے گھبرا کر اور کچھ شرمائیں نے آنکھیں جھکالیں۔ اُس نے جھک کر میری آنکھوں میں دیکھا، دیکھ نہ سکی تو میری ٹھنڈی میں ہاتھ دے کر میرے منہ کو اوپر اٹھایا۔

”لولو، پُچپ کیوں ہو چورچی؟“ اُس نے ”جی“ پر زور دیا۔

”میں چور نہیں ہوں! میں نے آنکھیں اٹھائیں لیکن اپنی بات کہہ کر پھر جھکالیں۔

واہ! تو چور نہیں تو آدرا کیا ہے؟ سامنے دیکھ کر بات کر! چور نہیں تو بھاگ کیوں رہا تھا؟ وہ میرے کال پر چٹکی بھر کر بولی۔ وہ سنجیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے بات کرتی لیکن اُس کی شوخی اُسے بے نقاب کر دیتی۔ میں اُس سے آنکھیں نہ ملایا رہا تھا۔ یہ میرا ڈرنہ تھا، اُس کی تیز نگاہی کا اثر تھا جو میری شرم کے حصار کو اور مضبوط بنا رہا تھا۔

”تو چور نہ ہوتا تو بار نہ توڑتا، سامنے کے دروازے سے آتا اور پوچھ کر شہوت کھاتا؟“ اُس نے مجھ پر الزام لگایا۔

”غلطی ہو گئی!“

میں نے بلاتال اپنا قصور مان لیا۔ کسی طرح مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ وہ میری شکایت نہیں کرے گی۔ ”مجھے اس کی سزا ملے گی، بول ٹھیک ہے؟“

اُس کے طرزِ کلام سے ظاہر تھا کہ وہ فقط دل لگی کے لئے مجھ سے پوچھ رہی ہے ورنہ اُسے جو سزا مجھے دینی ہے، وہ اُس کے بارے میں ٹھان چکی ہے۔ میں نے خاموشی سے سر ہلایا۔ اُس نے مجھے کھینچ کر آغوش میں بھینچ لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر گاڑ دیئے اور شدتِ جذبات سے کانپنے لگی۔

میں نے جس طرح کی تفصیر پر ہمیشہ سزا پائی تھی، جینا اُسے سزا ملتی تھی۔ وہ میرے بازوؤں نے اور اُس کے سینے سے رینگ کر اندر آنے میں جرأت اور ندرت دیکھتی تھی۔ وہ میرے کیسوں میں انگلیاں ڈال کر کھلانے لگی۔ اور اُن کی ملائمت پر اٹھلانے لگی جیسے وہ اُس کے اپنے ہوں۔ وہ اپنے فُندق لگے ہاتھوں سے میرے گالوں اور ہونٹوں کو مس کر کہتی، ”میں چاہوں تو ان میں سے خون نچوڑ لوں لیکن مجھے اس پیارے چور پر ترس آتا ہے۔“

جینا اور میں نے مل کر بار کی فرمت کی، جب میں گھر روانہ ہوا تو میرا کیسا تازہ شہوتوں سے بھرا ہوا

تھا۔ کہاں میں شہسوتوں کو ترسا کرتا تھا اور کہاں میں پورے باغیچے پر قابض تھا۔ جینا میری دل جوئی کرتی تھکتی اور میری اس میں بے قرار رہتی۔ مجھے دیر ہو جاتی تو وہ مجھے چٹوں کی سزا دیتی جو کبھی ختم نہ ہوتی۔ وہ اپنی بے صبری میں میرے گال پر کاٹ لیتی۔ میں مزید چٹے دینے سے انکار کرتا، وہ مجھ پر الزام لگاتی، تو نے ٹھیک سے چٹے نہیں دیئے، پھر سے دے۔“

”میں نہیں دیتا، تو گال کاٹی ہے۔“

میں احتجاج کرتا۔

”مجھے غلطی ہوگئی، اب آہستہ اور احتیاط سے لوں گی۔“

وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے مجھے ترغیب دیتی۔

اُس کا چومنا چاہتا مجھے اچھا لگتا، خاص کر زبان کا چومنا۔ اُس سے مجھے جو تسکین دہن ملتی اُس کی لذت انگوٹھا چوسنے کی سی تھی۔ اُس کا گال کاٹنا مجھے ناپسند تھا۔ جب وہ ایسا کرتی، میں بھاگ جاتا لیکن ایسے بھاگتا کہ وہ مجھے آسانی سے پکڑ سکے۔ وہ میرا چہرہ، اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے آئینے کی طرح دیکھتی اور دیکھتی دیکھتی کھوسی جاتی، لگتا کہ وہ اپنے خیالوں کے ساتھ دوڑ نکلی گئی ہے۔ وہ میرے ساتھ کھیلنے کے نت نئے طریقے سوچتی، میرے جھوٹے شہوت کھاتی اور اپنے جھوٹے مجھے کھلاتی۔ ہم اس کھیل میں ایک دوسرے کی انگلی پر کاٹتے۔ میں کتنی ہی نرمی سے کاٹتا لیکن وہ قزو سے بلبلہ کر ہاتھ جھٹکتی، مجھے لپٹتی، پیٹتی پیٹتی چومنے لگتی اور مدھ ہوش ہو جاتی۔ میں خود بھی جھوٹا ہوا محسوس کرتا۔ اُس کے اعضا پہلے سے زیادہ دل آفریں، متین اور حسین لگتے۔ میرے اندر کچھ انوکھے اور ان سمجھے جذبات جاگ پڑتے، میں چاہتا کہ وہ مجھے یوں ہی توڑتی اور مردتی اور چومتی رہے۔ میں اُسے دلی آرزو نہ بتاتا اور نہ ہی کسی بات میں پہل کرتا لیکن میری سپردگی ممکن ہوتی۔ وہ مجھے چھوڑ چھوڑ کر چومتی چومتی، اُن بوسوں کی نرمی اور گرمی اور ہی ہوتی۔ اُن نازک لمحوں میں اُس کی مستانی آنکھوں سے لگتا کہ وہ جسمانی طور پر میرے ساتھ ہے لیکن روحانی طور پر کہیں دور۔ وہ میری ٹانگوں کو اپنی جاگھوں میں دبا کر مجھے قریب سے قریب کھینچتی، اپنے اوپر نیچے روندتی، بے قراری کی انتہا کو پہنچ کر کراہتی اور بے دست و پا لیٹ جاتی۔ اُس وقت مجھے لگتا کہ میں پگھلتا جم گیا ہوں۔

میں اپنے گھر جانے لگتا۔ وہ باہر کے دروازے تک میرے ساتھ آتی اور خدا حافظ! خدا حافظ! کہتی نہ تھکتی جیسے مجھے شیطان اٹھا کر لے جانے والا تھا۔ اُس کے حسنِ بیاں کا ایک نادر پہلو تو میں بھول ہی گیا تھا، خوب وقت پر یاد آیا ہے! اُس نے ایک مصرعِ ایجاد کیا تھا جو پنجابی ثقافت میں اضافہ ہے۔ میں رخصت ہوتے ہوئے کہتا کہ میں جا رہا ہوں تو وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور غصے سے کہتی، ”جانا بد شکونی ہے! کہہ کر میں آ رہا ہوں۔“ میں جاتا ہوں، میں جا رہا ہوں، میری زبان پر اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ میں بار بار غلطی کرتا اور سزا پاتا۔

یہ بالکل دوسری بات ہے کہ وہ نرمل میری پسند تھی۔ جینا کے اندازِ اظہار کی جاؤ انری آب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ تھی۔ یہ سطور لکھ کر میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنی پیاری جینا کے پاس گیا تو تھا لیکن لوٹ کر نہیں آیا۔

اُس کے جذبات کی تازگی میرے احساس کی نازکی تھی اور باتوں کی نرمی، اسودہ خاطر۔ اُس کی بے اعتدالی میری دل داری تھی اور رواداری میری خیال سازی، جس کی طرف اُس غریب بچے کے جذبات کی ہی تھی، جس نے پہلی بار نئے کپڑے پہنے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کو دکھانا چاہتا ہے، ہر کسی کی نگاہ کا مرکز بننا چاہتا ہے، لیکن اُس کی تقدیر لالہ صحر کی سی ہوتی ہے۔

اُس بانٹے سے کچھ دور آب جو بہتی تھی۔ اُدھر کی ہوا سحر طراز ہوتی تھی۔ ہرے بھرے سبزے اور سائے میں ریشمی کچھونے کا سا آرام تھا، جس پر بیٹھنے سے اُنھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اُس خوبصورت ماحول کی گرفت میں وہ پروا تھی جو آرمی جنڈوں کو آسانی تصور عطا کرتی ہے۔ اُس حُسن گناہ میں ایک بے گناہی تھی۔ اُس کی بغاوت میں اطاعت اور شراکت میں موافقت تھی۔ وہ مُردت ایسی تحریک تھی جو رُوحِ تخلیق کو ختم دے کر اُسے جو ہر رگ جاں بناتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسا ہی مناسب وقت ہو گا جب کسی نے اپنے ایسے جذبے کے لئے محبت کا لفظ ایجاد کیا تھا۔

میری دوست ہر ملاقات پر نئی راس رچائی اور مجھے نئے طریقے سے لُبھاتی۔ وہ گل بیتاں (گلے میں باہیں) ڈال کر مجھے بادام کھلاتی۔ بادام کڑوا ہوتا تو میں مُنہ بنا کر اُس کی کڑواہٹ ٹھوکتا۔ میری دل آزاری اُس کی دل آزاری ہوتی اور میری بد مزگی اُس کی بد مزگی۔ وہ ہائے رُبا، ہائے رُبا کرتی ہوئی اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیتی اور میری زبانا کی ساری تلخی چوس کر اُس میں شیرینی بھر دیتی۔ اُس کا یہ طرزِ عمل اس قدر لذت آفریں ہوتا کہ دیر تک بادام کڑوا نہ نکلتا تو میں جھوٹ موٹ ہی اُس کے کڑوا ہونے کی شکایت کر اُٹھتا۔ وہ میری جیتی جاگتی اور ہنستی بولتی ملکیت تھی اور میں اُس کا مالک۔ وہ میری خواہش پر نیچے سے اُٹھ کر شہوت، زرد آؤ، جامن ... وغیرہ توڑتی، ٹہنی اُس کے ہاتھ نہ لگتی، میں خوش ہونا اور تالی بجا کر اُسے اُکسانا۔ وہ نئے خردش میں زور سے اور زور سے اُچھلتی۔ اُس کی اور ہنی نہ سکتی، دھسکتی زمین پر گر جاتی۔ وہ اُس سے بے پروا رہتی اور اپنی کوشش جاری رکھتی۔ میں اور ہنی اُٹھا لیتا اور تھوڑا اور، بس ذرا سا اور، اُسے شہ دیتا۔ وہ اُبھر کر لہرائی اور لہرا کر سُستی۔ اُس کے سینے کا اُبھار غنر غنوں کو تر کے حُسن کا منظر پیش کرتا۔ میں حُسنِ حال بولی سُنانا۔

فی جنگی کبوتر نے

تیری ہلکے آہلنا پایا

(او گوری، تو جانتی ہے کہ تیرے سینے پر جنگی کبوتر نے گھونسلنا بنالیا ہے)

میری شوخی سے ترنگ پا کر وہ مجھ پر لپکتی۔ میں بھاگ اُٹھا، وہ میرا پیچھا کرتی۔ میں اس درخت کے

گرو اور کبھی اُس کیاری کے اطراف دوڑتا ہوا اُسے تھکا دیتا۔ اُس کی سانس پھول جاتی اور وہ اپنی پھر پھرتی چھاتی کو تھام کر گری پڑتی اور مجھ سے روٹھ جاتی۔ اُس بپتے، بپکتے، بپکرتے تال کا کرنا مجھے اچھا نہ لگتا۔ میں اُسے منانے اور از سر نو چیل کرنے پر اُس نے اُس کے لئے اُس کے پاس جانا، اور پھر جھٹک کر اُس کے سر پر بھیلانا اور جھانکنا۔ وہ میری شرارت سے تحریک پاتی اور مجھے اور مہنی میں سمیٹ لیتی۔ اُس کی سانس اکھڑی اکھڑی اور دھڑکنے کی تیز تیز ہوتی اور چہرہ ٹٹکتا ہوا۔ وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ میری سپردگی اُس کی گرتی کو سرشاری میں بدل دیتی، جس میں اُس کی بے قراری کا قرار مضمر تھا۔ اُس کی قربت میں وقت کا احساس نہ رہتا۔ میں اُس سے پھر کر گھر جانے لگتا۔ میں محسوس کرتا کہ میں ابھی آیا ہوں اور ابھی جا رہا ہوں۔

ایک دن میں گھر سے دور ہی تھا کہ مجھے بھائیاجی کی گھن گرج سنائی دی۔ مجھے جانے میں دیر نہ لگی کہ وہ مجھ پر تحفا ہو رہے ہیں۔ میں تھوڑا آگے بڑھا اور دیکھا، وہ دہلیز پر کھڑے، اودھا اور واہ رو کے، باہر تاک رہے تھے۔ جیسے میرا منت دیکھ رہے ہوں۔ اُن کی نظر، تانی ہوئی، جیسی کی طرح کلی کے آغاز تک کبھی ہوتی تھی۔ میں وہاں قدم رکھتے ہی چھید گیا۔ اپنے انجام سے گھبرا کر میں نے اُل پھرنے لگا لیکن اُن کی نظر کی پکڑ مکڑی کے جالے کی سی تھی میں لوٹتا اور پھر ٹٹکتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور آخر کار اُس تک پہنچ گیا۔ وہ مقام سب سے دشوار گزار تھا، میں نے بھگا کر پار کرنا چاہا۔

جیسے بھگدڑ کی بنیاد، نجوم کی بے اختیاراری میں ہے ویسے ہی بھائیاجی کے مزاج میں بے ساختگی تھی۔ انہوں نے اڑنگا مارا اور مجھے اوندھے منہ کر دیا۔ میری ٹھوڑی پچک گئی اور دانتوں نے زبان کاٹ لی۔ جیسا میں تھی نہ تھی کہ میری صوح کو ایذا پہنچی۔ "حرام خور! تو کہاں مرا ہوا تھا؟"

"میرے پیٹ میں دزد تھا، راہ میں بگاڑ لگ گئی تھی۔" میں نے گھڑا گھڑایا جھوٹ بولا۔ اُن کے سوال کا ایک دم جواب نہ دینا کسی دوسری مصیبت کو مول لینا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ کھیتوں سے چارہ لانا ہے۔ تو اب وہاں جائے گا تو میرا یہ کات کر لائے گا؟" انہوں نے اچھے کے پانچے میں سے نکال کر کہا۔

میری ماں اور بہن پاس ہی کھڑی تھیں۔ اُن کی بدتمیزی سے گھبرا کر انہوں نے منہ پھیر لیا اور اندر چلی گئیں۔ میرے بھائیاجی کا منہ گندگی کا اُلبا ہوا گڑھا تھا جس کے پاس سانس لینا رگ جال کو محروم کرنا ہے۔

کُتے کو بھی مضبوط نفس سے تعلق ہے۔ کمزور کتا طاقت ور کے سامنے دم دبا کر لیٹ جاتا ہے تو وہ اُسے مغلوب جان کر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن میری مغلوبی بھائیاجی کی درندگی کو زوال دیتی تھی۔ اُن کی آنکھوں کے گوشے سٹ کر خمد اور عقاب کی ٹمٹکی بن جاتے اور ہاتھ پھیل کر آہنی پنجے۔ وہ مجھے گلے سے پکڑ کر اٹھاتے، دیوار سے ٹکراتے اور مرنے

کے لئے چھوڑ دیتے۔ میرے جسم میں کوئی خاص جاں سا زعفران تھا جو مجھے مرنے نہ دیتا تھا۔

اس سے پہلے کہ اُن کے خوفناک ہاتھ اپنے آزمائے ہوئے عمل کو دوہراتے، میں اپنے دُرد سے لڑتا ہوا اٹھا۔ درانی اور چوڑا اٹھا کر کھیتوں کو بھاگا۔ میں بھاگتا جا رہا تھا، بھائیاجی کی گالیوں کی آواز میرا ثواب ایسے کر رہی تھی جیسے وہ خود میرا پیچھا کر رہے ہوں۔ میں اُن سے بچنے کے لئے تیزی سے اور تیزی سے بھاگ رہا تھا، بھاگتا جا رہا تھا۔ میرے اور اُن کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا لیکن اُن کی خوفناک آواز کی شدت دُہی تھی جو قریب سے تھی۔ میں اس دقت لاکھوں کروڑوں دھڑکنوں کے طویل سفر میں اُس جان لیوا ماحول سے کئی جگہوں کی دُوری پر ہوں لیکن اُس کے درمیان کھڑا ہوں۔ میرا دل وہ آتش کدہ ہے جو میری مظلوم یادوں کے ایندھن سے جلتا ہے۔ میں وہ سب کچھ محمول جانا چاہتا ہوں لیکن مجبور ہوں۔ کاشس! میرا حافظہ غارت ہو جاتا!! میرا باپ گندگی کا ایسا گڑھا ہے، جس میں دقت کا دھارا، بد روکی طرح بہتا ہے۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال نے اُس کی بے ہودگی اور بڑھادی ہے۔ کچھ عرصہ قبل، میں دس سال کی طویل مدت کے بعد گاؤں گیا۔ کیوں؟ وہاں میری جڑیں ہیں! یہ جڑیں رشتوں کی طرح انسان کی آزادی، دانش وری، وسیع النظری پر تھمت ہیں کیوں کہ اس کی بالیدگی کو روکتی ہیں۔ لیکن میں انہیں کاٹ نہیں پایا ہوں۔ مجھے قیام کے دس دن نہ ہوئے تھے کہ دُہی ہوا جو اُس گھر میں ہوتا آیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب انسان سوتا ہے اور شیطان جاگتا ہے، میری بیوی سر بندرنے کسی شور کی بھنک سُنی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا، مجھے خبر نہ ہوئی اُس نے تشویش بھرے لہجے سے مجھے جگایا۔ کسی آنجانے خطرے کا خیال کرتے ہوئے میں نے منڈا سا باندھا، کونے میں رکھا ہوا نکوا اٹھایا اور دروازے سے آہٹ لے کر گنڈا کھولا۔ میں برآمدے کے اندھیرے میں بھانکتا اور کھٹکنا محسوس کرتا ہوا آگے بڑھا اور دبے پاؤں بھائیاجی کی خواب گاہ کے باہر پہنچا لیکن وہاں اندر اُجالا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ میں نے کواڑ کی دراڑ میں سے دیکھا۔ ماں گم گم بستر پر بیٹھی تھی اور بھائیاجی پیچھے ہوئے ساند کی طرح ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کھوم رہے تھے۔ اچانک وہ پاؤں بیٹھنے کے سے انداز میں چلنے لگے اور اگر دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دُہی جانیں کر انہیں کیسے خبر ہوئی کہ میں دروازے سے لگا کھڑا ہوں! انہوں نے فوراً جنت لگا کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے سنبھلنے کا جتن کیا لیکن سنبھل نہ سکا اور میں لڑھک کر اُن کے آگے گر پڑا جیسے کوئی مجرم منصف کے پاؤں پر زکرم و زکرم کی بھیک مانگے۔ انہوں نے مجھے ٹھوکر مار کر کہا، ”تو افسر ہوگا تو اپنے گھر ہوگا! یہ گھر میرا ہے، میرا! انہوں نے چھاتی پر ہاتھ مار کر مجھے میری ماں کی گالی دی اور زمین پر پاؤں مارا، ”اس گھر میں تو کون ہوتا ہے؟“ انہوں نے میری ماں کے مقدس اعضا کا نام اس ناپاک انداز سے لیا کہ وہ مجھے عشق بازی کا آدھ لگے اور میری ماں، رنڈی۔ اپنی اصل کا آؤل ماخذ جان کریں خود مذمتی غصے سے بھر کا اور آدمی کی قدیم حیوانی جبلت کے

زیر اثر لپک کر اٹھا لیکن اپنے دشمن کا سامنا کرتے ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اپنے اُس نامزد درِ عمل پر مِس غور کرتا ہوں۔ وہ کون سا امتناعی جذبہ تھا، جس نے میری پیش قدمی کو روکا تھا؟

میرے قارئین! وہ کوئی جذبہ نہیں ہے، میرا خوف ہے۔ میں قتل کر کے قانون کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا ہوں اور نہ مفرور ہونے کا۔ تشدد کا حاصل دو طرفہ ہے۔ یہ بیک وقت آزادی اور غلامی کا پیش کار ہے۔ میری بزدلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے محکم دیا، ”دفع ہو جا یہاں سے! وہ بہا تیرا سامان۔“ انہوں نے باہر کے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو چوٹ کھلا پڑا تھا اور مجھے بلارہا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف واپس جاتے دیکھ کر انہوں نے مجھے اپنی ازلی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کہا، ”اُدھر کدھر جا رہا ہے؟ راستہ اُدھر ہے۔“

”سُنجو! رات کا....“ میری ماں نے میری حمایت میں کس اتنا ہی کہا تھا کہ وہ اُس غریب پر برس پڑے، کتیا تو چپ بیٹھ! میری بات میں ناگاہک اڑاے گی تو توڑ کر رکھ دوں گا!“

قارئین! میں پیدائشی بے ہمت اور بے غیرت ہوں، میں گھر سے نہ نکلا۔ اُس حادثے کی وحشت انگیزی میں اِس قدر شکستہ اور کمزور تھا کہ میرے کمرے کا چند قدم کا فاصلہ میرے لئے ہزاروں میل کی مسافت بن گیا۔ میری لرزاں ٹانگیں میرا لمٹون بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ میں نے کواڑ کا اُسرا لے کر سُریندر کو دیکھا۔ وہ میری طرف پہلو بدل کر اپنے ساتھ لیٹی ہوئی تنھیں سی جان، پونم کو تھپک رہی تھی جو اپنے نازک ہاتھوں سے اُسے تھامے ہوئے تھی، جیسے دنیا کے ہنگامے میں اُس کے گم ہو جانے کا خطرہ ہو۔ آف! افسوس!! میں سکون و تحفظ کے احساس ہی سے محروم رہا جو بچپن کا پیدائشی حق ہوتا ہے۔

میرے بال پن میں میری ماں مجھے میرے ظالم باپ کے جبر و تشدد اور جور و جفا سے نہ بچاتی تو میں بے ہمت ہی مارا جاتا۔ جب وہ مجھے دیوانہ وار پیٹنے، میری ماں اپنے کسی ناخوشگوار احساس کی طرف داری کرتی ہوئی ہمارے درمیان کھڑی ہو جاتی۔ چوٹ اُسے لگتی لیکن جینٹائیں۔ بھائیاجی پیتر بدل کر مجھ پر پلکتے۔ ماں میرے اطراف ڈھال کی طرح پھیل جاتی اور میری مظلومیت کو دلاسا دیتی۔ مار جتنی زور سے پڑتی، وہ اتنے ہی زور سے مجھے آغوش میں سمیٹتی جیسے دِسا کرنے سے وار کی چوٹ بے اثر ہوتی ہو۔

اُس ڈراؤنی رات میرا سامان باہر اوس میں بھیگتا رہا اور میں بھی پتھر آنسوؤں میں۔ میں سویرے حیدر آباد روانہ ہوا تو میری بے گھری کا احساس شدید تھا۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ میرا اپنا گھر ہونا چاہیے تاکہ میں وہاں جیسے چاہوں گزر بسر کر سکوں۔

ہمارے گاؤں میں باپ سے بیٹے اور بھائیوں سے بھائی الگ رہتے تھے۔ میں انہیں کم ظرف سمجھتا تھا کیوں کہ میں رشتوں کے طلسم میں آسیر تھا۔ بونا سنگھ کے تین لڑکے تھے لیکن وہ اپنی پکاتا تھا، اپنی کھاتا تھا اور لطف کرتا تھا

”اپنا گھر، گھر ہوتا ہے اور پرایا گھر، قبرا! جو صرف مردے کو اماں دے سکتی ہے۔“

سایا جی رشتوں کے بارے میں کہا کرتے تھے، ”رشتے تبھی پیٹتے ہیں جب انسان ست بھاؤ کا ارتھ سمجھے اور اُس پر عمل کرے، انسان کے مزاج کی گونا گونی کا تقاضا ہے کہ جیسے ہندو اپنے ہنر پر نظر ثانی کرتا ہے، ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے رویے پر مکرر غور کرے۔ جو کوئی اپنے اس جذبے کو تازہ رکھتا ہے، وہی وقت پر اصلاح کن قدم اٹھاتا ہے۔“

میں نے رشتوں کو کئی طریقوں سے سمجھا ہے اور اُن سے سمجھو تاکیا ہے۔ روحانی پیشواؤں نے دنیاوی مسئلوں کا حل جیسے نکالا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ خدا، ماں باپ ہے اور ہم اُس کے بچے۔ اُمی کی کپاسے زندگی میں نسکھ ہیں، ورنہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔

کیا یہ فراست، زندگی کی کبھی مشکل کو حل کرتی ہے؟ کیا یہ سماجی ذمہ داری سے فرار نہیں ہے؟ ممکن ہے، آپ قارئین اسے ناپسند کریں کہ میں اپنی زندگی کے ایک واقعے میں دوسرے خیالات گھسٹ رہا ہوں۔ یہ ضروری ہے! زندگی اتنی بے پناہ، کثیر الوقوع، پُر افراط۔ نزاعی انسان ہے کہ ایک سانس اور دوسرے سانس میں آغاز و انجام کا متنازعہ ہے۔ اس کا سلسلہ وار بیان مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کچھ نہ کچھ قصور میرا بھی ہوگا جو میں بے دقت متعجب ہوں۔ ہاں جناب! میں قصور وار تھا اور ناقابل معافی مجرم! میرے کئے کی سزا مجھے ملنی ہی چاہیے تھی۔ اُن کی غیر حاضری میں، میں نے ٹھیلیاں پکڑنے والا جال، ناقہ رام کو اُدھار دے دیا۔ اُس بد ذات نے ٹھیلیاں پکڑ کر گیلیاں جال، بوری میں بند کر کے واپس کیا اور میری کوتاہی کہ میں نے دھیان نہ دیا۔ بھائیاجی گھر میں نہ تھے، وہ رات گئے گھر آئے اور ٹھیلی کی بوپاکر کھوجی کئے کی طرح سونگھتے سونگھتے جال تک پہنچ گئے۔

میرے بھائیاجی کے مزاج کی خصوصیت ہے کہ وہ کاہلی اور غفلت شعاری پسند نہیں کرتے۔ اُن کا اپنا قانون ہے کہ ہر کام دھڑا کے سے ہو اور فوراً ہو۔ وہ حکم دیتے ہوئے اکثر اپنی ضرورت کی وضاحت کرتے تھے۔

”وہ چیز فوراً سے پہلے لاؤ!“

”وہاں جا کر فوراً سے پانچ سینٹ پہلے آؤ!“

اُن کے فوراً کا کیا پیمانہ ہے؟ وہی بتا سکتے ہیں! ایسا کر کے وہ اپنی اولاد سے اُس قدر قیمت کا تقاضا کرتے تھے جسے وہ خود چکانے میں ناکام رہے تھے۔ بھاگ بھاگ، مار دھاڑ، تندی و تیزی.... میرے والد کی خوبی ہے۔ وہی بہتر جانتے ہیں کہ وہ اپنے تخم کو نو مہینے کے طبع عرصہ تک میری ماں کی لکھ میں کیسے پٹینے دیتے رہے۔ عدول محکم پر وہ تھپڑ، مکے، لائیں، گھونٹے، دُندے، ٹکالیاں.... کیا کیا بن کر برستے۔ کوئی عزیمت و ہمت سے کام نہ کرتا تو وہ اُس پر ڈھیلے لام کی پیدائش کی ٹہمت لگا دیتے۔ اُن کی سخت گیری اور بدزبانی مجھے بالکل



نہ بھاتی۔ میں تقدّر و ملامت کا نشانہ بن کر کسی گوشہ تنہائی میں چھپ جاتا اور اپنی مطلوبی پر آنسو بہاتا۔ میرا اباں نکلنے پر، یہی ٹھنڈے دل سے پورے حادّ ثلے کی چھان بین کرتا۔ میرا ضمیر مجھ سے کہتا کہ تو قصور وار ہے تو میں کان پرکھتا اور آئندہ ویسا نہ کرنے کا تہیہ کرتا۔ دوسری صورت میں، میں گرو دوارے میں جا کر گرو گرتھ کے آگے ماتھا ٹیکتا اور اُداس کرتا، ہے گرو! کار ساز گرو! میرے باپ کا ہاتھ ٹوٹ جائے! اُس کی ٹانگ ٹوٹ جائے!

میں اپنے باپ کو ایک نظر برداشت نہ کر سکتا۔ اُسے دیکھ کر میرا دل درد سے ٹپکتا، جیسے پیپ سے بھرا پھوڑا۔ اُس سے میری نفرت کی خوفناک انتہا یہ ہے کہ میں نے کئی بار آنتر دھیان ہو کر اُس کے مرنے کی منت ماننی اور اپنے طویل سجدوں اور گہری دعاؤں کے دوران صدائے غیب تک سُنی، تو گھر جا! تیری دعا قبول ہوئی ہے۔ میں سجدے سے اُچھل کر اٹھتا اور نجات پر در حالات کا تجزیہ کرتا ہوا دوڑ کر خوش و خرم گھر پہنچتا لیکن اپنے باپ کو زندہ دیکھ کر مکمل ہو جاتا۔

قارئین! ہر کام کی اپنی خصوصیت ہے۔ کوئی محنت و بصیرت سے پورا ہوتا ہے اور کوئی جبر و تشدد سے! لیکن خدا کے نائب اُسے مکمل کرنے کے کیسے کیسے مجھوں طریقہ بتا گئے ہیں! میں اُن کے بارے میں سوچتا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ عقلمند تھے، بے خوف وہ ہیں جو انہیں کار گر سمجھ کر اُن پر عمل کرتے ہیں۔

## باب ۱۴

آندھی میں گھرا ہوا شجر ہو جیسے، صوفان کی زد میں کوئی گھر ہو جیسے (شاہ)  
اُف، شورشِ انفاس بہ ہنگامِ وصال، کہہ سار سے ندی کا گز ہو جیسے  
ایک خاص عمر تک آدمی معصوم اور صلح کل ہوتا ہے۔ اس پر میرے باپ جتنے آنسو رلاتے تھے، ماں اتنی ہی اٹک شونی کرتی تھی۔ اُس کی مطلوبیت نے اُسے زیادہ ہی رحم دل بنا دیا تھا۔ ویسا نہ ہوتا تو اُس پر عذاب ماحول میں دم لینا مشکل تھا۔

مکاؤں اور اُس پر کسان کی زندگی! میں اپنی مصروفیات گنواؤں! میں منہ اندھیرے اٹھتا، کھیتوں سے چارہ لاتا، چارہ کھاتا، مویشی چراتا، اہل چلاتا، نلائی کرتا، فصل کاٹتا، کھلیان سنھاتا.... ضرورت ہوتی تو رات کو ہریانہ میں کسی نہ کسی کو کھانا بھیج کر آتا۔ وہاں لاتعداد کام تھے جن کا رشتہ لا محذور محنت سے منسک تھا۔ اُن تمام کاموں سے اہم کام سکول میں وقت پر حاضر ہونا ہوتا تھا ورنہ پانچ بیڈ کھانے پڑتے تھے۔ شاید ہی کوئی دن ہوگا جب میں سکول

کے لئے دلکی نہ لگاتا تھا۔ اس کے باوجود میں من مانی کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔ دکان پر دیر ہو جاتی تو میں شام ہریانہ سے لطف اٹھاتا۔ شام ہریانہ ایک اچھوتی تلمیح ہے، اس لئے وضاحت ضروری ہے۔

سورج اندر باہر ہوتا۔ ہریانہ کی دو شیرازیں اٹھاتی، اتراتی، چمکتی، لہکتی.... سیر کو نکلتیں۔ اُجلے کپڑوں میں اُجلے چہرے ایسے لگتے جیسے چاند ستارے دھرتی پر اتر آئے ہوں۔ اُن کے ناز و ادا سے زیادہ اُن کی زندہ دلی کا پرچا تھا۔ وہ بھولے بھالے راہ گیر کسانوں پر پھبتیاں گتیں اور کوئی برا ماننا تو اُسے ہنس کر ہنسا دیتیں۔ یوں لگتا کہ غصے چمک کر باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں کہیں تیز آد کہیں اُستہ کسی نہ کسی جھڑپ کا بیچا کرتا اور خود کو ٹٹ کھٹ گھنیا سمجھتا۔ بید ماسٹر بنی بخش شہری اور دیہاتی زندگی کا موازنہ خوب کرتے،

شہر میں بسدے دیوتے، قصبے میں بسن منکھ

پنڈیں بسدے بھوتے وہ وہ کھاؤں رکھ

(شہروں میں دیوتا بستے ہیں اور قصبوں میں انسان۔ گاؤں میں بھوت پریت بستے ہیں جو اپنا گزارہ درختوں پر کرتے ہیں۔)

وہ دو شیرازیں شہر کی حدود سے نکل کر سڑک کے کنارے بے لجیوں کی طرح پھرنے بیٹھ جاتیں اور اپنے ادھ ننگے چہروں اور ستروں کی نمائش اس احتیاط سے کرتیں کہ اُن کے اپنے ادھر سے گزرتے تو انہیں پہچان نہ سکتے۔ لیکن ہریانہ کا بے لکھا دستور تھا کہ جدھر عورتیں باہر جاتی تھیں ادھر اُن کے مزدجرات نہ کرتے تھے۔ شفق کے بدلتے رنگ اور ستروں کو یوں نکھارتے جیسے دھکتا ہوا کوندہ ہوا کی زد میں آجائے۔ بدن کا ایک ادھ حصہ دیکھ کر میں تمام حُسن کا تجربہ کرتا جو اکثر درست ہوتا۔ کوئی میرے اوعا کو سراہے یا اس میں مزاح کا پہلو تلاش کرے، میں اس بلا کاستر شامس تھا کہ اُن کی دید سے اُن کی بالکن کے گھر کی نشان دہی کر سکتا تھا۔ میں کئی دو شیرازوں کو پسند کرتا تھا لیکن اُن سے بات نہ کر سکتا تھا۔ میں اُن سے اپنے طریقے سے ملا کرتا تھا! میں اُن کے پیچھے چلتا ہوا پیمروں کے نشان دھیان میں رکھتا اور اُن پر اپنے پاؤں جما کر عجیب سی تکیہیں محسوس کرتا۔

وہ معصوم خطائیں یاد آتی ہیں تو میں خیالوں کے شہر پردوں پر اُترتا ہوا ہاں جا نکلتا ہوں جہاں جہکتی اور چمکتی یادوں کے ہجوم میری حیاتِ رواں کی رونق ہیں۔ میں اُن راستوں سے پھڑپھڑے ہوئے یاروں کی طرح ملتا ہوں جن پر میں اُن کہے اور انجانے جذبات کا سیلابی بن کر آوارہ گھومتا تھا اور اپنی آوارگی پر ناز کرتا تھا۔ میرا عہد گزراں میرے عہد حاضر کا آئینہ نما ہے۔ قارئین! اُہنگِ طبیعت سے زیادہ لذت پذیر کوئی شے ہے تو وہ اُہنگِ طبیعت کا سلسلہ ہے۔ میری زندگی ایک لحاظ سے مجھ پر بڑی مہربان رہی ہے۔ وہ یوں کہ اس نے مجھے فطرت پسندی اور فطرت بینی کے شوق سے نوازا ہے۔ وہ چیز جو اُرتی، رینگتی، چلتی، پھدکتی، تیرتی، ڈوبتی، لہکتی، جہکتی.... ہوتی تھی، میری دلچسپی

کا مرکز رہتی تھی۔ اور میری دل چسپی کا لاابالی پن! ایک بار میں باذل کے مکڑے کے سائے سائے چلنے لگا اور پھر بھاگنے لگا اور تب رکا جب میں اُس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکا۔

خوشی ہو کہ غم دونوں حالتوں میں میرا رویہ انتہائی شدید ہوتا تھا۔ میری سب سے بڑی خوشی عروسِ سحر کی دید تھی۔ میں منہ اندھیرے اٹھتا اور اُس کے جلوہ گر ہونے تک کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ ہر شے نور سے معمور ہوتی، اپنی آواز مانگ میں اپنے حُسن پر نازاں لگتی اور کئی بار چشم تماشا میں پودوں کو گالوں سے لگاتا، غنچوں کو دیکھتا، پھولوں کو مونگھٹا، اُن کے ترس سے ہلک اٹھتا اور اُن کی خود پسندی کی داد اپنی خود رفتگی سے دیتا۔ شبنمی آئینوں میں کرنوں اور پھولوں کے پرتو، نورنگ کے گلیستاں تھے۔ اُس نظارے سے جدا ہونا ہرے اُس کی روانی چھینتا ہے۔ جیسے میری عشرتِ طبعیت میری تلاش میں تھی، حُسنِ فطرت کی حصولِ کمال میں ہے۔

میں اپنے غم میں اندھیرے میں پناہ لیتا اور اُس کی موت جیسی گھٹن میں زندگی محسوس کرتا۔ میں لونی پھوٹی چیزوں کو ابھی سمجھتا کیوں کہ وہ جہاں پڑی ہوتیں، آرام سے ہوتیں، کوئی اُن کے سکون میں فتنہ نہ ڈالتا۔ لیکن آدمی کی سوچ و چار وہ عجیب راستہ ہے جو کبھی بھی کہیں بھی مڑتا ہے اور کبھی بھی کہیں بھی جاناکتا ہے۔

جینا سے تجریدِ ملاقات کی رات فسانہ پڑو تھی۔ افسردہ چاندنی جاں گذار تھی۔ میں چھت پر لیٹا دور آسمان کے دل میں جھانک رہا تھا۔ ستاروں میں گھرا ہوا چاند، مجھے اکیلا دکھائی دیتا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے لگتا کہ وہ میری ہی طرح خلوت پسند ہے۔ میں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو ہی بادلوں کے حلقے میں گھرا، پریشان ہو جاتا جیسے اُن کے درمیان اُس کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ اُن سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُس کی پریشانی بادلوں سے دور ہو کر ہی دور ہوتی۔ وہ اکیلا ہوتے ہی اپنے اُداس آئند کو پالیتا اور آہستہ خرابی کو اپنا لیتا۔ مجھے چاند پر ترس آیا اور بادلوں کی چاند دشمنی پر غصہ، میں انہیں گرم نگاہی سے دیکھنے لگا۔ ناگہاں میرا رویہ اُن کی جانب بدل گیا۔ اس کی وجہ بادلوں کا حُسن خود زائیدگی تھا۔ وہ آپس میں گھلتے ملتے ایسے پیارے پیارے خاکے بناتے کہ اُن پر اُٹھتی ہونے کا گمان ہوتا۔ ایک مجھر ہوا! میں جس چیز کا خیال کرتا، باذل اُسی کی صورت اختیار کر لیتا۔ اپنی معموری میں مجھے محسوس ہوتا کہ وہ تصویر میری ہی طبع زاد ہے۔

میری کیفیت سرودِ خاموش کی سی لطیف اور نظارہ رنگیں کی سی خیال خیز تھی۔ میرے خیال حُسن کار نے جو آخری تصویر بنائی وہ میری پیاری جینا کی تھی۔ اُس کی منام میری بے قراری بن گئی۔ میں بستر پر سے اٹھا اور بامِ بام ٹپٹنے لگا۔ میں ایک جگہ کھڑا ہو کر سنان گلی کو دیکھنے لگا جو میری ہر منزل کی راز دار تھی۔ اُس نازک رشتے کا احترام کرتے ہوئے، اُس نے مجھے اشارے سے بلایا۔ میں دبے پاؤں والا ان کے دائرے دھل جوڑا سے آنگن کی دیوار پر اترا، گھٹنوں پر جھکا، ذرا دیوار کا سہارا لیا اور اُچھل کر گلی میں جا رہا۔ گلی کے کتے بھونکے لیکن میرے بچکانے پر مجھے ہیجان لگے اور پھر غراتے

ہوئے چپ ہو گئے جہاں تک نظر جاتی تھی ہر شے سرخی تصویر نظر آتی تھی۔ چاندنی اور سائے کے نمایاں فرق سے چھوٹی سے چھوٹی چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی روڑا راہ میں پڑا نظر آتا، میں اُسے اٹھا کر راہ سے دور پھینک دیتا۔ ایک روڑا پھینک کر مجھے کمان ہوا کہ اگر میں پورا زور لگاتا تو اُسے کئی گنا دور پھینک سکتا تھا۔ میں نے اتنا ہی بڑا دھماکا روڑا تلاش کیا اور اُسے اُسی جگہ سے پورے زور سے پھینکا، لیکن وہ پہلے روڑے سے کچھ ہی پرے گرا۔ مجھے لگا کہ میں پوری طاقت نہیں لگایا ہوں۔ میں نے ایک اور روڑا اٹھایا، خود کو جھنجھوڑا گویا اپنی بھری ہوئی توانائی کو یکجا کیا اور اُسے پھینکا۔ میری اس کوشش کا ذی نتیجہ نکلا جس کی مجھے امید تھی۔ میں بائوس تہ ہوا کیوں کہ میں ہنومانی تصور میں تھا۔ رام سنگھ کے کارخانے کے باہر شہتیر پڑا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اُسے ایک ہاتھ سے اٹھا سکتا ہوں لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے بھی نہ ہلا۔ میں بالکل شرمندہ نہ ہوا۔ اس کی وجہ! میری روح اُس نئے کو گنگنا رہی تھی جس کی لے قطعی نئی تھی اور دماغ سے الگ موجِ خوں سے متعلق تھی۔

گلی سے صحن کی دیوار ہاتھوں کی پہنچ سے اونچی تھی۔ میں نے ایک بار اٹھل کر سٹندیر کو چھو اور دوسری بار پکڑ لیا۔ میں پیٹ پر رینگ کر اور بان دوں اور پاؤں کا پورا زور لگا کر دیوار پر چڑھا۔ ماس کی جگہ سے پھل کر جتنے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ اُن خراشوں میں عجیب سی تحریک ہے۔ میں دائرے کی سیر بھی سے چھت پر چڑھا، چاروں طرف نظر ا دوڑا کر دیکھا اور خود کو ایسا پا کر پھیل گیا، آسمان پر اُڑنے لگا۔ میں اُس وقت دھرتی پر آیا جب میں نے پگھلنے کی پھر پکڑا ہٹ سنی۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے درد مندی سے دیکھنے لگا۔ چاندنی راتوں میں وہ بہت بے قرار رہتا تھا اور اپنی چونچ اور جھلی بری طرح بخروخ کر لیتا تھا۔ چند مہینے پہلے جب اُسے تیار لکھی رام کوٹے سے رے تھے، اُس کی بے زاری نو گرفتار کی تھی۔ گنبد کی چھت کا وسط، جہاں سلاخیں پائیں سے اوپر اٹھ کر بڑتی تھیں، کھردراتھا، جس سے رگڑ لگا کر اُس کا سر بری طرح زخمی ہو جاتا تھا۔ جب تک وہاں موٹا کپڑا نہ کر کے نہ سیر کیا نہ اُس کے زخم بھرے اور نہ سر پر بال آئے۔ میں نے اُسے اُس کے نام سے بلایا، اکاش! اکاش! پنجرے پر تھپک کر اُسے شانت کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ وہ سلاخوں سے لڑھکتا تھا اور لڑھکتا تھا جیسے انہیں توڑ کر اڑ جانا اُس کی زندگی کا واحد مقصد ہو۔ وہ سلاخوں سے لڑنا لڑنا پائیں سے گنبد تک جاتا اور راہِ فرار نہ پا کر پھر اُٹا مڑا آتا۔ مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی اور میں نے اُسے آزاد کرنے کی ٹھان لی۔ پنجرے کا دروازہ نہ تھا، اُس کا تابی دروازہ تھا جسے دو عمودی قطروں پر رستی سے چار جگہ گنبد کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ میں نے دوبند، ناخن سے کھولے، تیسرا نہ کھلا، اُسے روڑے سے رگڑ کر توڑ دیا۔ گنبد کو تھوڑا اوپر اٹھایا، اندر ہاتھ ڈالا اور اکاش کو مانگوں سے پکڑ لیا۔ وہ زور سے پھر پھر آیا۔ میں نے جھٹ گنبد کو پورا اٹھا دیا اور دوسرا ہاتھ شانوں پر رکھ کر اُسے قابو میں کر لیا۔ وہ مہم کر سکا گیا جیسے ایک قیدے نکل کر دوسری میں پھنس گیا ہو۔ میں نے اُسے پیار کیا، باہوں کو بٹھلایا اور اُسے اوپر ہوا میں پھینک دیا۔ وہ دیسے ہی پر سیسے رہا اور نیچے گرنے لگا۔ میں نے آخری فری میں سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ

ہمیں رہتے رہتے یہ اڑنا بھول گیا ہے! لیکن اچانک اُس نے برپردہ اُڑا پھیلائے، پرزور اڑان بھری اور پیل سے اُگے نکل گیا۔ میں اُس کے پیچھے بام تک بھاگا جیسے مجھے اُس کی مزید مدد منظور ہو۔

میں بستر پر دراز ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ سویرے آکاش کو پنجرے میں نہ پا کر گھر والے کیا کہیں گے؟ میں نے پنجرہ اٹھا کر پچھلے صحن میں پھینک دیا اور منہ اندھیرے اٹھ کر شور مچا دیا، آکاش کو بلی کھا گئی ہے۔

کوئی کب تک کسی کو قید کر سکتا ہے؟ کب تک کسی کو کھلوانا بنا سکتا ہے؟ جینا کی گائے کا مقصوم سا ہڑا، جس کے گلے میں باہیں ڈال کر وہ، اُسے پیار کرتی تھی، اُس سے سنٹھالے نہ سنٹھالتا تھا۔ وقت مہل اور بے معنی اڈوں کا ڈھیر ہے لیکن انسان کی بدولت یا معنی اور رواں دواں ہے۔ یہ اسی روا داری اور روا روی کا اعجاز ہے کہ میرا نمبر و عدلان میری زندگی میں داخل ہوا اور مجھے پیاری پیاری خیانتیں بھی سکھا گیا۔ درس گاہ فطرت کی یہ خوبی قابلِ داد ہے کہ حسی معاملے میں ہر جاندار خود آموز ہے۔

میں چتر گاہ سے مویشی چر کر لوٹ رہا تھا۔ میں اب جو میں نہا کر آیا تھا لیکن بدن میں الاؤ سا بل رہا تھا جو نہایت کھردور پہر دھل چکی تھی لیکن دھوپ کی پلنگ کم نہ ہوئی تھی۔ میرا سایہ مجھ سے کچھ اُگے چلتا نظر آ رہا تھا جیسے میرا باطنی وجود، کم ہی ہمی، اپنی نمائندگی کرنے پر مصروف ہو۔ میں نے نہا کر تمیض نہ پنی تھی، دھوپ سے پنجنے کے لئے سر پھیلایا تھی۔ کچھار لے باہر ریت کے ذرے پر فشاں انگاروں سے اُڑ رہے تھے اور جہاں ٹکراتے تھے، داغے چلے جاتے تھے۔ پاؤں کا جانا برداشت نہ کر سکا اور اچک کر بھینس پر سوار ہو گیا۔ وہ کم بخت بدگئی۔ میں تھوڑی دیر تک اُس کی پیٹھ سے چپکا رہا لیکن فر گیا۔ میں غصے سے اٹھا اور اُسے دندوں پر دھریا۔ وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُسے بھاگتا دیکھ کر سارے مویشی بھاگنے لگے اور بارے تک سر پٹ پیچھے۔ میں نے کسی کے گلے میں زنجیر باندھی، کسی کے پاؤں میں کورائی، بارے کے منہ پر ٹیٹا مڑی کی اور گھر کی راہ لی جو کچھ کم گرم نہ تھی۔ میں اُس کے کنارے کنارے پھوس پر چلنے لگا جو قدرے آرام دہ تھا۔ بارہا نل سے خالی تھا۔ البتہ سڑک کی حویلی کا موڑ مڑتے ہی جینا کے گھر کا دروازہ نظر آیا، فاضل کم کرنے کے لئے، میں راہ چھوڑ۔ مینڈ مینڈ ہویا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن اُسے میں باہر سے کھولنے کی ترکیب جانتا تھا۔ ایک کواڑ اُگے کھنچ کر مے نے دوسرا پیچھے دبایا۔ کواڑوں کی درمیانی دراڑ میں میں گرتی ہوئی پھیلی جیسے اُسے پھیلنے میں تکلیف ہوئی ہو۔ مے نے رنگ اُڑدے بھڑوں کو کڑی نگاہ سے دیکھا گویا انہیں اپنے رازیں شریک کرنا چاہا، پھر اندر ہاتھ گھسا کر گنڈی میں سے ملی اگل لکڑی جس کے سرے پر ٹوپی ہوتی ہے تاکہ چھید میں سے پھسل نہ سکے۔ اسے جوئے میں بیلوں کی گردن پھانسنے سے بھی کام میں لاتے ہیں، انکالی، زنجیر اتاری، کواڑ اُگے دھکیل کر کھولے، چوکھٹ پاری، پیچھے مڑ کر کواڑ بند کئے، زنجیر لگائی، گنڈی میں اُری گھسائی اور اندر کی راہ لی۔ یہ سارے کام میرے لئے جینا کرتی تھی تو اُس کی نزاکت اور لطافت نا اور ہوتی تھی۔ میں نے اُس کے گھر میں پاؤں رکھا تو مجھے لگا کہ وہ کسی دراز میں سے مجھے اُتے دیکھ رہی ہے۔ میرا رویہ میرے

ساتھ یکسر بدل گیا۔ اپنی جوان مردی کا ثبوت دینے کے لئے میں تپتی دھرتی پر اہستہ اہستہ چلنے لگا اور خود سائنہ مصیبت سے لطف اٹھانے لگا۔ اگے پہنچ کر میں نے دیکھا، جینا جاسن کے پیڑ کے نیچے سو رہی ہے چوں کہ میری جرات بے کار گئی تھی، میں کچھ مایوس ہو گیا۔ لیکن اگلی ہی گھڑی میری خود اعتمادی لوٹ آئی۔ میں جینا پر دھیان دیے بغیر نکلے پر پہنچا، سر سے قمیض اتاری، جھٹک کر غسل خانے کی دیوار پر رکھی اور نلکا چلایا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پانی گرم ہے، اُس کے نیچے ہاتھ کر دیا۔ اس طرح جان بوجھ کر ہاتھ ملا کر میں نے وہ توانائی محسوس کیا جو خرمستی کی نفسیات ہے۔ جینا نلکے کی آواز پر بڑبڑا کر جاگی اور پھر مجھے دیکھ کر مسکرا پڑی۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی تر بھی لکیر، مسکراہٹ سے زیادہ ہی بھی لگتی تھی۔ اُس نے جہاں لی اور اور صحنی دو ہیں چار پانی پر جھٹک کر میری طرف چل پڑی۔ وہ جوں ہی سائے سے باہر نکلی، اُس نے جلن محسوس کی اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُس کی چھاتی، جو اور صحنی کے نیچے سے بے حجاب رہتی تھی، ننگی لگی۔ میرے جذبے کی دشمنی، سردی میں پہلے تاپ کی کمی تھی جس میں لذت اور جرات کا عنصر برابر ہوتا ہے۔ میں اسے اُسی کم حیاتی سے دیکھنے لگا جس سے وہ مجھے دیکھا کرتی تھی۔ اُس نے میرے ہونٹ چومے، اُس کے ہونٹوں کا مزہ نازہ کالے میوں کا سا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان بھیر کر بوسے کا مزہ دوبارہ لیا۔ بوسے کی طاحت کم ہوئی لیکن اُس سے رگوں میں پھیل اٹھی وہ بدستور رہی بلکہ تحریک پکڑ گئی۔ نلکے کے نیچے جہت کا بڑا بیضہ ٹمٹم رہا تھا وہ لہر کر اُس میں بیٹھ گئی، ادھا بھرائب، کناروں سے چھلک گیا۔

”مجھے گرمی نہیں لگتی؟ میری تو جان نکلی جا رہی ہے!“ اُس نے احساسِ خاطر سے پوچھا۔

میں نے اُس کی بات سنی لیکن اُن سنی کر دی کیوں کہ اُس وقت میں ایسے سنگیت کو سُن رہا تھا جو میری رگوں کا پیدا کردہ تھا۔ میں نے اُس سنگیت کو پہلے بھی سُنا تھا لیکن اب اُس کی لطافت کچھ زیادہ ہی اثر انگیز تھی۔

”نلکا چلا، میں نہاؤں گی!“ اُس نے پانی سے کھیلے ہوئے کہا۔

میں نلکا چلانے لگا لیکن میرے خیال کا مرکز جینا تھی۔ وہ سر ٹیڑھا کر کے نلکے کی دھار سے پانی پیتی اور کبھی پلٹے۔ گردن کا کرتہ بھیگ کر جسم سے چپکنے لگا۔ اُس نے چوٹی کھول کر بال جھٹکے اور شانوں پر پھیلا لئے۔ اُنہیں پوری طرح بگھو کر اُس نے جوڑا باندا، جس سے گردن لمبی اور ماتھا کشادہ دکھائی دینے لگا۔ گردن سے سینے کے مخروطی سرے تک اور وہاں سے پیٹ تک جو زویر بنتا تھا وہ اُس کے پیکر کا سب سے دلکش حصہ تھا۔ وہ بدن کو کرتے کے اوپر سے ملتی جو بدن کے کنارے چھاؤں میں کہیں ڈوبتا اور کہیں ابھرتا، سینہ دھڑ دھڑاتی چٹائیں نظر آتا اور کبھی ایک غیر ہموار لیکن پُر اسرار آئینہ۔ وہ بے میں اتنی پالتی بھیجی تھی۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے شلوار اتاری اور دوزانو ہو گئی۔ شلوار ایک طرف بھینک کر اُس نے کرتے کا برسر پکڑا، کھسٹ کر اوپر اٹھایا جیسے وہ کرتے کے ساتھ اپنی جلد نوچنے کی منائی ہو۔

نلکے سے جھکے ہوئے مئے، اُن کی چوٹیوں پر رُجھاتے ہوئے کتھی داسرے، اُن کے بیچ براجمان چوہیل کے پیارے مکھڑے، سینے اور پیٹ کے خوبصورت زاویے، صاف شفاف پردے، گولوں کی مرغوب قویں چٹوں میں تحقیق انگیز تنکوں، اُجلی رانوں کے درمیان حیرت افزا ہندلی لکیر، جلد کی دوشیزگی کی پاکیزگی .... وہ تمام مقدس شے ایک وقت میری آنکھوں میں سما گیا۔ میں اُس نور سے چنڈھیا گیا جس کے پس منظر میں پانی کے قطرے سُسکارتے اور بھپکتے لگتے تھے۔

میرے معصومانہ اشتیاق میں تجسس کا جزو ابھرنے لگا۔ میرے خون کا دباؤ بڑھنے لگا اور اعضا کا رویہ بدلنے لگا۔ اُس کی عریانی نے میرے اعصابی نظام میں لچل مچادی۔ میں نلکا چلاتا چلاتا رُک گیا لیکن نلکے کے ہینڈل سے لمبی جلتی حرکت میرے کاپھے میں شروع ہو گئی۔ میری بڑھتی ہوئی لغت میں وہ حرکت، کاچھے کی جان، کہلاتی تھی۔ میری وارننگ جینا نے دیکھی اور دیکھتی دیکھتی سنجیدہ ہو گئی۔ اُس کی چوچیاں پہلے سے زیادہ نمایاں اور رنگت میں گہری ہو گئیں۔ اچانک وہ چھپاک سے اُٹھی اور مجھ سے پیٹ گئی۔ پھر میں نہ کچھ دیکھ سکا، نہ کچھ سمجھ سکا، بس اتنا محسوس کر سکا کہ میں اُس کی گہرائی تک اُس کے اندر اتر گیا ہوں جہاں وہ پانی سے الگ نیم گرم تیل کی طرح گیلی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اُس صورتِ حال کو اپنے طریقے سے دریافت کرتا اور کوئی حرکت کرتا، وہ کراہتی اور تڑپتی ہوئی نڈھال ہو گئی اور چاروں شانے چت لیٹ گئی۔

اُس کی بے وقت اور ناروا پسائی مجھے بُری لگی۔ میں نے اُسے اپنی انوکھی کیفیت میں دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے ہوئے آرام سے لیٹی تھی اور میں اُسی تناؤ میں کھڑا تھا جو جینا کی عریانی سے مجھ میں نفوذ کر گیا تھا۔

میرے آغاز نے میری معصومیت کو میرے انجام تک بے قرار رکھا۔ تھرب کی عسرت، مجھے معلوم نہ تھی۔ میرا فطری وجدان اُدھورا اور جینا کا فطری میلان پورا تھا۔ میں اُسے سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچتا۔ میں الفاظ کے محدود اور غیر واضح مفہوم پر حیران ہوتا لیکن کسی طرح بھی اپنے تقاضائے ایقان کی تسکین نہ کر سکتا۔

جینا کا فعل بھی وہی تھا اور میرا بھی وہی! لیکن اُس کا اسلوب و مفہوم اُس پر عیاں تھا اور میرا مجھ میں نہاں! اُس جوہرِ آدم کی طرح جسے حسنِ نمود تک پہنچنے کے لئے آئینہ سازیِ وقت کا انتظار تھا۔

## باب ۱۵

اپنے عمل کا جس نے کیا تجزیہ صحیح،

(شاہ)

دیکھا ہے اُس نے بھر کے نظر آفتاب میں

میں نے کئی ایسے کام کئے ہیں جن پر معلم اخلاق کوئی بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہوا تو میں مجھوں گا کہ میرے علوم تنقید ذات میں کمی رہ گئی ہے۔ میری کہانی انسانی نشیب و فراز کی کہانی ہے اور اخلاقی قدیں، سماجی پابندیاں جنہیں میں نے اپنے انداز میں توڑا اور اپنے چمن کوختی بجانب سمجھا۔ تایا جی کہتے تھے، ایک باریک لکیر انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے۔ یہ کس وقت کیا کر گزرے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اُن سے متاثر ہو کر میں نے پانچ سنہری اصول لکھے جو کچھ اس طرح تھے۔

۱ چوری نہ کرو

۲ سچ بولو

۳ اپنی بانی بولو

۴ ہر کام محنت سے کرو

۵ غیبت نہ کرو

بے شوری میں ضبط نفس، قتل نفس کے برابر ہے۔ میں انسان بننے کی کوشش میں اپنے ہی اصولوں کی گرفت میں آیا۔ مجھے گڑکھانے کی عادت تھی۔ میں ماں سے گڑ مانگتا، وہ گڑ کی چھوٹی سی دلی دیتی جس سے زبان بھی پوری طرح نمی نہ ہوتی میں کھانے پینے کی چیزیں چرانے میں اختراعی صلاحیت رکھتا تھا، اس لئے کھانے سے زیادہ چرانے میں لطف اٹھاتا تھا۔ میں تائی ماں کے گھر سے مکھن چراتا تھا اور وہ بھی اُس کے سامنے۔ میں اُس کے پاس اُس وقت تسی لینے جاتا جب وہ صحن میں کسی کام میں مصروف ہوتی۔ اُسے کہتے ہی بنتی، تو اندر جالی (کڑی کا چار گوشہ دھنا چن) جس میں کھانے پینے کی چیزیں رکھتے ہیں، میں سے اپنے آپ لے لے۔ میں مکھن دان میں سے مکھن نکالتا، اُس کا گولا بنا کر گلاس کی تہ میں چپکا کر، اوپر تسی بھرتا اور تائی ماں کا بھر دسار کھنے کے لئے اُسے تسی کا گلاس دکھا کر لاتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جب میں اُسے تسی کا گلاس دکھا رہا تھا، مکھن کا گولا گلاس کی تہ سے جھوٹ کر تسی پر تیرنے لگا۔ اُس نے مجھے جو نمزا دی، دی اور ساتھ ہی مجھ پر مکھن چور کی تہمت لگا دی۔ میں نے چند دن پہلے اصول پر عمل کیا پھر یکسر چھوڑ دیا۔

میرا دوسرا اصول، میری جان پر آیا۔ دسہرے کے میلے میں جڑی بوٹیوں کا مرکب اور ساندے کا تیل بکتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لطف شہوانی بڑھاتا ہے۔ اُسے بیچنے والوں کی زبان، حُسن بلاغت کا ایسا آئینہ تھا جس میں ہر کوئی اپنی حقیقت کا مبالغہ آمیز عکس دیکھتا تھا۔ بھائی جی نے وہ دونوں چیزیں چوری چھپے خریدیں لیکن میں نے گھر میں رکھی دیکھ کر پہچان لیں۔ ساندے کا تیل وہ کب استعمال کرتے تھے، وہی جانیں! ہاں مرکب وہ رات کو دودھ کے ساتھ کھاتے تھے۔ کوئی پوچھا کہ وہ کیا ہے، تو وہ کہتے کہ پیٹ کے درد کی دوا ہے۔ اُن کا جھوٹ میں نے میرے پیٹ میں کچھ بوتا۔ میری ماں کے پیٹ میں پیڑا بھٹی اور اُس نے اُن سے وہ دوا مانگی۔ انہوں نے اُسے یہ کہہ کر ٹخا دیا کہ



یہ دوا صرف مردوں کے لئے ہے۔ میرے جوشِ ایمانی کے اُبال کھایا اور میں نے سچ بول دیا، ماں! یہ بوڑھے کو جوان بنانے کا کشتہ ہے، نہ کہ پیٹ کے درد کی دوا!“

بھائیاجی نے اُس کشتے سے کیا فیض اٹھایا؟ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں لیکن میں نے سچ بولنا چھوڑ دیا۔ میرے ماحول کی بول بانی اتنی بازاری تھی کہ وہاں تیز سے بات کرنا بدترینی تھی۔ میں اُصول پروری کی خاطر کم بولت۔ میرا چلن بدلتے ہی ہر کوئی مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے مجھے کچھ ہو گیا تھا۔ میں خود بھی ادھورا ادھورا اور الگ الگ محسوس کرتا۔

اُصولوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا یائن پوسن ٹین بے اُصولی پر مبنی اور تایاجی کے معیار سے میں اُس لکیر کو نہ مٹا سکا جو اچھائی اور بُرائی کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ اُس بے اُصولی زندگی کے بارے میں ایک اعتراف لازم ہے، وہ کام جسے میں اچھا سمجھ کر کرتا تھا وہی کوئی دوسرا کرتا تو مجھے برا لگتا۔

کوئی شہتیروں اور بالوں کا خریدار آتا، بھائیاجی اُسے کیسے پھانستے، ”یہ لکڑی تین برسات پُرانی ہے! جتنی ٹیڑھی بنگی ہوئی تھی ہوگئی، اب تو نہ لہا ہے نہ لہا! اسے پتہ بھر میں کاٹا ہے۔ بہار میں کاٹے درخت کی لکڑی بڑی ہوتی ہے، اُسے دیمک اور گھن لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔“

وہ لکڑی تین برسات پُرانی ہوتی اور نہ ہی پتہ بھر میں کاٹی ہوئی، پُرانی اس لئے لگتی تھی کہ اُسے چیر کر کچڑ سے بیپ دیا گیا ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ لاکھ کچھ سوچا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ بھائیاجی اُسے پھر کھیر لیتے، لکڑی کے بارے میں یہ بُنکتے کتنوں کو معلوم ہیں؟ آج کل ہر ایریا غیر انتھو خیرا لکڑی کا بیوپاری بن گیا ہے۔ میں خاندانی برصھی ہوں؟ لکڑی کی صورت دیکھ کر اُس کی قسم اور عمر بتا سکتا ہوں۔

اُن کی پرتب زبانی! وہ لاکھ کہ سوچنے اور بولنے کا موقع ہی نہ دیتے۔ کوئی قیمت پوچھتا، وہ جھٹ پکتے، قیمت کیا پوچھتے ہیں جناب؟ آپ سے زیادہ لوں گا! آپ میرے اپنے آدمی ہیں اور پھر آپ کی تو بونہی کر رہا ہوں۔ اُس وقت تک وہ لاکھ کا گاؤں اور نام جان گئے ہوتے۔ وہ اُن لوگوں کے حوالے دیتے جو اُن کے پُرانے لاکھ تھے۔ میں ایک بیوپار کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔

”بالے کیسے کوڑی ہیں؟ سردار جی!“

ایک لاکھ نے جاتے جاتے قیمت دریافت کی۔

”پندرہ روپے کوڑی“

بھائیاجی کی خود روی سے ظاہر تھا کہ وہ اُس قیمت کے سوائے کسی دوسری قیمت سے ناواقف ہیں۔

”قیمت ٹھیک ہے!“

گاہک کے رویے میں دہی بے دلی تھی، جوتھی۔

”چار اچھٹ اور چھٹ لمبے شیشم کے بالوں کی قیمت پوسٹ کارڈ کی طرح ہے۔ مجھے نیند سے جگا کر پوچھو گے، تب بھی یہی کہوں گا!“

بھائیاجی کے کہنے سے ظاہر ہے کہ وہ سودا بازی کے خلاف تھے۔

”بھاگ سنگھ اہی ناپ کے بالے بارہ روپے میں کوڑی دیتا ہے۔“

گاہک کو قیمت کچھ ٹھیک لگی اور وہ رک گیا۔

”آپ کا مکان کتنا لمبا ہے؟“

بھائیاجی نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے سودے کو نیا موڑ دیا۔

”بتالیس فٹ۔“

اُن کے اچانک سوال پر گاہک سوچ میں پڑ گیا۔

”بتالیس فٹ! چھ فٹ کے لحاظ سے پورے سات خانے بنتے ہیں۔ آپ کو چھت پر چاہا دہی اڈالنا ہے کہ فرش لگانا ہے؟“

”چاہا ڈالنا ہے۔“

دیکھئے، میرا مال سوت چھوڑ کر چیرا ہوا ہے، سودھنے کے بعد ماپ پر پکا اثر ہے گا۔ چاہے کسے لئے بھاری مال ہی کھڑا رہتا ہے، ہلکا بھٹک جاتا ہے۔ دوسرے بیوپاری مال، سوت پر چیرتے ہیں۔ اُن کا مال، ماپ سے کم ہوتا ہے۔ یہ لیجئے دو فٹ، بھاگ سنگھ کا مال، ماپ کر آئے پھر فیصلہ کیجئے۔“

انہوں نے بیوپاری کے ہاتھ میں دو فٹ پکڑ دیا جسے اُس نے لوٹا دیا اور اُن سے مال خریدنے کا ارادہ کر لیا۔

اور اسی طرح جوں ہی گاہک پہنستا، وہ اپنی بُرائی جگت لڑاتے، اُس کی آنکھ بچا کر اُس کے ساتھ آئے بڑھی کی تمھی گرم کر دیئے۔ وہ بڑھی ملتی جلتی لکڑی میں ناتھ لکڑی بھی چھنے لگا۔ کسی لکڑی میں کوئی نقص نمایاں ہوتا اور گاہک کی انارڈی آنکھ میں کھٹکتا اور وہ اُس پر انگلی رکھتا۔ اُس وقت بڑھی کی چترانی دیدنی ہوتی! وہ یہ آنکھ بند کرتا اور کبھی وہ مشکوک لکڑی کو ادھر سے دیکھتا اور کبھی ادھر سے اور اُسی نتیجے پر پہنچتا جس پر وہ پہلے پہنچ چکا ہوتا، اتنی سی ٹیڑھ گھڑنے اور زندہ رہنے میں نکل جائے گی۔ آپ فکرن کریں اور وہاں آرام سے بیٹھیں۔“

”مستری جی! لکڑی دیسے ہی تیر کی طرح سیدھی ہے۔ میرا ہر ماپ پکے ماپ سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کو سودھنے کے بعد چھ کا چھ اور چار کا چار پورا ملے گا۔“ بھائیاجی مستری کی بات میں اضافہ کرتے۔

ایک بار ایک بڑھی نے مٹھی بھر گرم کروالی اور لکڑی بھی اچھی جینی اور بھائیاجی کی ایک نہ چلنے دی۔  
وہ اُس کے انتخاب میں اپنی مرضی سے کوئی لکڑی رکھتے تو بڑھی اُسے اٹھا کر الگ رکھ دیتا اور اُس سے کہتا۔ ”آپ تکلیف  
نہ کریں! میں آپ ہی کا کام کر رہا ہوں۔“

وہ سودا جیسے سیسے بھگتا اور بھائیاجی نے خود کو یوں مطمئن کیا۔ ”اس بڑھی کے نطفے میں فرق ہے!“  
ہماری مال چیل اور سال کی لکڑی سے بھری پٹی تھی، جس کی نکاسی کم ہوتی تھی۔ وہ لکڑی جلاہے کے آلات  
کے لئے مؤدوں ہے۔ میرا پھوپھیرا بھائی بھگت سنگھ اس کام میں ماہر تھا اور اتفاقاً بیکار تھا۔ اُس نے بھائیاجی کو رائے  
دی کہ وہ جلاہوں کا سامان بنا کر بیچیں۔ کانگریس کے پرچار سے کھادی مقبول ہو رہی تھی۔ غریب کسان تو کھادی پہنتے ہی  
تھے، امیر لالے اور بنیے بھی کھادی پہننے لگے تھے۔ اس سے انہیں واضح فائدہ یہ ہوا کہ دھیلے دھالے کتوں اور پاجاٹوں  
میں اُن کے موٹے اور بھدے جسم پہلے کے مقابلے میں کم بد وضع نظر آتے۔ بھائیاجی کو بھگت سنگھ کی تجویز پسند آئی۔  
ٹال کے ایک کونے میں موٹی لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ اُس جگہ کو اڈے کے لئے چنا گیا۔ بھائیاجی نے اُن لکڑیوں کو ہاتھ  
(سردی کے موسم میں کشمیر سے مسلمان آتے تھے، جو لکڑیاں پھاڑنے کا کام کرتے تھے) سے پھڑو کر بائیں بنالیا اور کونا  
خالی کر دیا۔

چار بلیاں سیدھی گاڑی گئیں اور اُن پر چار اڑی باندھی گئیں۔ بھگت سنگھ نے اڈے کے پائے آپ چنے  
اور روڑوں اور گارے سے اینٹوں اور سینٹ کا کام لیا۔ تیشی، کرنی اور ساہل موجود نہ تھی لیکن اُس کے جوش و خروش  
میں اختراع و ایجاد کی کیفیت تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں ربے اور ہتھوڑے کے نام ڈبی رہے لیکن اُن کے معانی بدل گئے۔  
اُن کے لچکدار رویتے سے تحریک پا کر آنکھوں نے اپنا کردار بدلا اور خود کو ساہل ثابت کر دکھایا۔ پالیوں پر شہتیر رکھا،  
ہموار کیا، دونوں سروں کو ترچھی آڑواڑ مار کر جکڑا اور بھگت سنگھ نے اڈہ ہلا کر دیکھتے ہی خوشی سے ہونک کر کہا۔ ”م  
ماجی! اڈہ گاڈر کی طرح ٹھوٹھوس ہے۔“

بھائیاجی نے بُرائی بورلیوں کو ٹال میں سیا اور اُسے بلیوں پر پھیلا دیا۔ ٹال کا جھول کھینچنے پر کم نہ ہوا  
تو اوپر کی بلیوں میں دو کا اضافہ کر دیا گیا۔

بھگت سنگھ نے ایک دن آوارہ درست کرنے پر لگایا اور دوسرے دن کام پر ڈٹ گیا۔ اُس کے ساتھ  
دو بڑھی دہاری پر لگا دیے گئے۔ فرصت ہوتی تو اجیت سنگھ اور درشن سنگھ کام میں ہاتھ بٹاتے۔ میں سکول سے آتا  
اور جیسے بن پڑتا، مدد کرتا۔ سامان بننے لگا اور ہاتھوں ہاتھ کینے لگا۔ راجھوں، تروں، نالوں اور چرخوں کی پیشگی پر  
پیشگی آنے لگی۔

بھگت سنگھ کو گانے بجانے کا شوق تھا۔ وہ ایک رات اپنے گاؤں ماناں گیا اور صبح کو سارنگی اور ہارمونیم

لے آیا۔ نال دن کو کارخانہ ہوتا اور رات کو نعمہ خانہ مولے میاں کال کا چراغ علی، بھگت سنگھ کا ہم عمر تھا اور اچھا گلا رکھتا تھا۔ وہ محفل میں پہنچنے میں دیر کرتا تو بھگت سنگھ اُسے مزاحیہ انداز میں پُکارتا، ”او علی کے چراغ، جلدی!“ تیرے بن محفل اندھیری ہے۔“

میں جس دن نال پر رات بسر کرتا محفل ساز و مُرُود میں جھست لیتا۔ بھگت سنگھ کے کلی (ہنجاری لوگ گیت) گانے کا انداز نیارا اور پیارا تھا، گاتا تو سماں باندھ دیتا۔ وہ بات کرتا ہوا ہرکلاتا تھا لیکن گانے میں ہرکلاتا جاتا رہتا جیسے شوقِ نعمہ میں سلاستِ زبان کی صلاحیت ہو۔ میرزا صاحبہ، سستی پٹوں، جُجگی، بہیر.... وہ کون سی تان تھی جس میں اُس کی زبان لپک نہ رکھتی تھی۔ وہ سارنگی پر لہرا بجاتا تو میں نایاب ہی اٹھتا۔

بھائیاجی لدڑاں میں چھری (کمی قسم کے بے ثمر درختوں کا باغ) سیٹ رہے تھے۔ وہ مال پرکھنے کھڑے آتے تھے اور لوٹ جاتے تھے، سارا کام بھگت سنگھ اور آجیت سنگھ کی مرضی سے چل رہا تھا۔ ایک مہلاہے نے بھگت سنگھ سے اپنی دشواری روتے ہوئے کہی، ”میں دور نکا دھا کا بنتا ہوں تو ہانے کی ناربد لے میں بننے سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ تم اپنے آپ کو ماہر فن سمجھتے ہو، میری مشکل کا حل نکالو تو جانوں!“

بھگت سنگھ باریک بین ثابت ہوا۔ اُس نے دو ناردوں والا راجھہ ایجاد کیا اور اُسے ایک ناروالے راجھہ کی قیمت پر فروخت کر دیا۔ اُس کی فراخ دلی کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اُس مہلاہے نے اُسے نیا خیال دیا ہے جس سے اُس کا علی رُحمان بکھرا ہے۔

وہ بامراد مہلاہا، راجھہ لے کر دکان سے باہر جانے ہی والا تھا کہ بھائیاجی آندر آئے۔ اُن کی چال میں دہی بے چینی تھی جو اُن کی حیوانیت آمیز حرکات کی پیش خیری ہوتی تھی۔ انہوں نے بھگت سنگھ پر الزام لگایا، ”تو میری دکان لٹا رہا ہے!“

بھگت سنگھ کی نفسیات خوش بیاں سے الگ ہے! ابد خیال کی رعنائی اُس کی تحریک ہوتی ہے لیکن حسنِ اظہار کی نارمانی، الجھن جو اُسے احساسِ کمتری کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ جذبے کی عدم مساوات، جسمانی تفاوت ہی کی طرح ہے جس کا نتیجہ شکست ہے۔

دوسرے دن میری بوا بھگت سنگھ کی وکالت کرنے کے لئے آئی اور گالیاں کھا کر روتی ہوئی چلی گئی۔

## باب ۱۶

ابھی تک قلب مضطرب سے صدائے غم نکلتی ہے  
 ہوئی مدت کہ چھیرا تھا کسی نے دل کے تاروں کو  
 کھانڈ اور کپڑے پر کنٹرول تھا اور اس طرح کے گانے مشہور ہو رہے تھے۔  
 مینوں ٹافٹے واسٹوٹ لیا دے  
 سو ف داسلا دے گھر گرا

مکھنا ! مکھنا دے ڈیپو چوں لیا دے کپڑا بے مینوں رکھنا۔

(ایک لڑکی اپنے خاوند مکھن سنگھ سے کہتی ہے، مکھنا ! مجھے ٹیفیڈا کاسٹوٹ اور سو ف کالنگا

سلا دے، ورنہ میں روٹھ کر میکے چلی جاؤں گی۔ یہ کپڑا صرف ڈیپو میں ملتا ہے)

ہمارے علاقے کا ڈیپو ذیلدار محمد حسن رانا کے پاس تھا۔ بھائیاجی نے تایا ملکھی رام کا راشن کارڈ اڈھار لیا اور مجھے ساتھ لے کر ہریانہ روانہ ہوئے۔ گھر میں کھانڈ زیادہ نہ لگتی تھی کیوں کہ کھانڈ صرف مہانوں کی آؤ بھگت میں خرچ ہوتی تھی اور گھر یلو مصرف کے لئے گھر کا گڑ شکر بہت تھا۔ زیادہ کھانڈ کی ضرورت اس لئے پڑی کہ بھاگ نونی (جو اجیت سنگھ کی مشاطہ تھی) اجیت سنگھ کے بیاہ کی تاریخ لے کر ہی ٹلی تھی۔ بھائیاجی نے مجھے گھر ہی میں توتے کی طرح رٹا دیا کہ میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔ لیکن جیسے انہیں میری اعلیت پر شک ہو! ہریانہ جاتے ہوئے یہ ریاض گاہے بگاہے جاری تھا۔

”تو کس کا بیٹا ہے؟“ بھائیاجی چلتے چلتے رُک کر اچانک پوچھتے۔

”میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔“ میں بڑے بھروسے سے کہتا۔

”وہ آپ کیوں نہیں آئے؟“

”وہ کسٹے میں ہیں۔“

”میں تیرا کیا لگتا ہوں؟“

”چاچا!“

بڑوں کو جی کہہ کر بلاتے ہیں۔ کول میں پڑھتے ہو اور نرے گدھے ہو! وہ بولتے بولتے رُک گئے، میری جانب مڑے جیسے مجھ پر جھپٹنا چاہتے تھے لیکن پھر آگے چل پڑے اور اپنے غصے کو زبانی نکالنے لگے،

”رے گدھے! گدھے! گدھے!“

میری ناکامی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے ہریانہ کی آبِ جو میں خبردار کیا۔ ”تو وہاں چوکا تو تیری ہڈی پہلی ایک کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے جھنجھوڑا جیسے میری سخت جانی کا اندازہ لگا رہے ہوں۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے اسیل بچھڑے کی طرح چل رہا تھا اور دبے دبے لہجے میں رٹ لگا رہا تھا، ”میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔ میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔“ ہم ذیلدار کی قلعہ نما حویلی کے سامنے پہنچ کر رُکے۔ بھائیاجی نے جوتا اتارا، اٹھایا اور تلے پر تلامار کر غبار جھٹکا، پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹکا، کاندھے پر سے پاجامہ اتار کر پہنا اور پھر جوتا۔ انہوں نے وارھی مونچھ نوا کر صاف دُرست کیا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا، ”یاد ہے؟“

میں حویلی کا تروپو لیا غور سے دیکھ رہا تھا۔ درمیان کے دروازے سے دو ہاتھی برابر گزر سکتے تھے۔ وہ دروازہ بند تھا جسے کھولنے کے لئے زمین پر ریل بچھانی گئی تھی۔ دروازے پر مُنہبت کاری کی ہوئی تھی۔ ایک بار میں تابیاجی کے ساتھ وہاں سے گزرا تھا، انہوں نے بتایا تھا، ”یہ دروازہ دو کاریگروں نے ایک سال میں تیار کیا تھا۔ اُن میں سے ایک تیرا تایا مارا سنگھ تھا اور دوسرا گھنکھناں کا ہزام سنگھ۔“ میں ذیلدار کی شان و شوکت سے زیادہ اپنے پُرکھے کے کمالِ ہنر سے مرعوب تھا، جس نے تراش و خراش سے سادہ سی لکڑی کو شاہ کار بنا دیا تھا۔ بھائیاجی نے مجھ سے سوال کیا تو میں اپنے دھیان میں کھویا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر کالی دے کر ہلایا۔ اُن کے سبھاؤ کو جانتے ہوئے کہ وہ جس کسی کے پیچھے پڑتے ہیں، ہاتھ دھو کر پڑتے ہیں، میں بے سوچے سمجھے بولا، ”یاد ہے۔“

”کیا یاد ہے؟“ انہوں نے تینوں لفظوں کو لمبا کھینچے ہوئے سوال کیا جیسے کہ وہ اپنے ایک سوال کے جواب میں وہ سب کچھ سُنا چاہتے ہوں جو انہوں نے مجھے پڑھایا تھا۔

”میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں۔ وہ کوسٹے میں ہیں۔ آپ میرے چاچا جی ہیں۔“

اپنے سوال کا ٹھیک جواب سُن کر بھائیاجی اپنے آپ میں بند ہی رہے۔ اُن کی بے لوجِ فطرت کائنات کی طرح تھی۔ وہ دیکھنے میں خوبصورت ہوتا ہے لیکن لگ جائے تو جان پر آتا ہے۔ ہم بغلی دروازے سے حویلی کے اندر داخل ہوئے۔ سڑک پر چھڑکا دیا ہوا تھا۔ مٹی کی خوشبو، ہوا میں جھول رہی تھی۔ اندر بہت سے درخت تھے جو باہر سے کم دکھائی دیتے تھے۔ ذیلدار صاحب اپنے گھر کے سامنے دیوان پر گاؤٹیکے کے سہارے نیم دراز تھے۔ اُن کا بھاری گھر کم سرید سارے دیوان پر چھایا ہوا تھا۔ خدمت گار پنکھا لے کھڑا تھا اور الکسی سے جھل رہا تھا۔ اگے دری بھی ہوئی تھی جس پر کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ذیلدار نے مکمل کا سفید کرتا پہن رکھا تھا جس کے اندر بغیر بازوؤں کی بنیں صاف نظر آ رہی تھی۔ کُرتے کی آستینوں پر چُنٹ ڈالی گئی تھی، کاجوں میں سونے کے ٹن جھللا رہے تھے جن کی باریک زنجیر بچی سے نیچے تک لٹک رہی تھی۔ ذیلدار کا چہرہ ایسا تھا جیسے کسی دائرے کے مرکز سے ہٹ کر اُسے کاٹتی ہوئی کم قطر

کی توں لگاؤ اور پھر اُس توں کو کاٹی ہوئی ایک توں آدر۔ گردن، کانڈھوں میں دھنسی ہوئی تھی اور اُس پر غیب تین تہ لگا کر طرح نمایاں تھی۔ ذیلدار کے دیوان کے ساتھ ایک اور دیوان تھا، جس پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ دیوان پر کچھ مٹی جھالدار چادریں زمین کو چھو رکھی، چھو رہی تھیں۔ اُن کے درمیان اُسی اونچائی کا میز رکھا ہوا تھا جس پر دیوانوں کی چادریں سے ملتا میز پوش بچھا ہوا تھا۔ اُس پر چاندی کے لگن میں صراحی رکھی تھی جس کے منہ پر ریش قاضی باندھی ہوئی تھی۔ میز پر چاندی کی ایک کٹوری تھی جو چاندی کی پلیٹ میں اونڈھی پڑی تھی۔

اُس بیٹھک کے پس منظر میں گھر تھا جس کے سبھی دروازوں پر تیلیوں کے پردے چھوڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھائیاجی کے پیچھے ذیلدار کو سلام کیا۔ میں پچھلے پاؤں دَری کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ ذیلدار نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے آگے بلایا۔ میں ڈر گیا اور سمجھا کہ وہ مجھے پہچان گئے ہیں۔ میں سُکر کمر سمٹ گیا جیسے خود کو اُن سے چھپایا، لیکن میرا چور چُھپ نہ سکا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے چلایا، ”میں ملکھی رام کا بیٹا ہوں!“ ایک بے ساختہ قہقہہ اُٹھا اور فضا کو جھولا جھلا گیا۔ ذیلدار کی توند ڈانواں ڈول گھرے کی طرح ہلنے لگی اور دوسرے نقوش اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے انداز سے پھدکنے لگے۔ اُنہوں نے کاؤتکیے کے بیچے سے کچے دودھ کی سی تہ نکال کر جھٹکی، جو لہرا کر رومال بن گئی۔ اُنہوں نے اُسے چہرے پر پھیلایا، جب اُسے چہرے پر سے اتار، چہرے پر نور کے تڑکے کا سماں تھا۔

میں اپنی بات میں ہنسی کا پہلو تلاش کر رہا تھا کہ ذیلدار نے دم نبھانے کی کوشش میں دم روک کر کہا، ”تم ملکھی رام کے نہیں، رتن سنگھ کے بیٹے ہو۔ ادھر میرے پاس آؤ۔“ میں اپنا جھوٹ پکڑے جانے پر شرمندہ سے زیادہ خوفزدہ تھا۔ میں جھجکتا ہوا آگے بڑھا، میرا دل دھک دھک دھک رہا تھا۔

”تم کون سے سکول میں پڑھتے ہو؟“ ذیلدار نے میری پیٹھ تھپک کر کُلت بھرے لہجے میں پوچھا۔ اُن کا نرم رویہ حوصلہ افزا تھا۔ میرا تناؤ جاتا رہا اور آتم و شواش لوٹ آیا۔ میں نے بے جھجک جواب دیا ”سُرک بورڈ کے سکول میں۔“

”کس کلاس میں پڑھتے ہو۔“

”چوتھی کلاس میں۔“

”تمہارا جھوٹ ہم سُن چکے ہیں، اب کوئی نظم سناؤ۔“ اُنہوں نے مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔ اُن کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میرے اندر کا فنکار جاگ پڑا، اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنا منہ سامعین کی طرف کیا اور اشاروں، کنایوں میں حقیقتِ حُسن سنانے لگا۔ وہ الفاظ کو ایسے

تعبیر کرنے لگا جیسے وہ خود، حسن ہو اور آسمان، خدا۔ نظم ختم ہوئی اور وہ فنکار پس پردہ چلا گیا۔ میں نے دیکھا ہر کسی کے چہرے پر حیرت و مسرت کے طے جملے تاثرات تھے۔ ذیلدار نے میرا بازو تھام کر مجھے نگاہ تحسین آفریں سے دیکھا اور بھائی جی کو ڈانٹتے ہوئے کہا، ”رتن سیاں! تم نے چھوٹی سی بات کے لئے اپنے بچے سے جھوٹ بلوایا ہے۔ جس چیز کی جتنی ضرورت ہے، لے جاؤ! یہ کہہ کر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور حاضرینِ محفل سے کہا، اس بچے میں اولیا کی نوح ہے، آفرین!“

میرے سنگے وصول بھرے پاؤں پر دھیان نہ دیتے ہوئے، انہوں نے مجھے دیوان پر بٹھالیا اور دوبارہ بھائی جی سے مخاطب ہوئے۔ ”تمہارے بھائی ماڑا سنگھ نے ہمارا ڈرشنی دروازہ بنایا تھا۔ وہ بڑا کارگر تھا اُمید ہے ہمارے پاس آتے اور جو کہتے، ہم خوشی سے دے دیتے۔“

انہوں نے میرا ہوسہ لیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے احساسِ مسرت سے کہا، ”تم نے ایسا نہیں کیا تو اچھا ہی کیا! ورنہ ہم اس پیارے بچے سے کیوں کر ملتے؟“

انہوں نے اپنے منشی کے نام چٹھی لکھی، تہ کر کے میری جیب میں ڈالی اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دُعا دی، ”عمر دراز ہو! بڑھو پھلو۔ آمین!“

بھائی جی اُنھ کو سلام کرنے کے لئے آگے بڑھے، اُن کے چہرے پر جو روشنی تھی وہ رفیع الشان مہذبِا ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ہم حویلی کے اندر ہی تھے کہ بھائی جی نے وہ چٹھی مجھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لی اور میری تسلی کے لئے کہا، ”تیرے پاس گم ہو جائے گی!“

ڈپو، بازار میں پیارے لال کی دکان کے پاس تھا۔ بھائی جی نے منشی کو چٹھی دی، وہ اُسے پڑھ رہا تھا کہ میں نے دیکھا، جس بوری میں سے کھانڈی جا رہی ہے اُس پر خالی بھیگی بوری رکھی ہے۔ کھانڈی بھی بھوری اور گیلی تھی اور اُس پر نگھیاں بھٹک رہی تھیں۔ منشی نے ہمیں نئی بوری میں سے اُسی بوری کھانڈی جو سوکھی اور پسید تھی۔ اس سے پہلے کہ بھائی جی کھانڈ کے دام چکاتے، انہوں نے مجھے مال پر سے سائیکل لانے کے لئے بھیج دیا۔ میں سائیکل چلائی جانتا تھا لیکن میرے پاؤں پیڈلوں تک پورے نہ پہنچتے تھے۔ میں فریم کی سنٹر ہب پر پاؤں رکھ کر کاسٹی پر بیٹھ جاتا اور پھر گھومتے ہوئے پیڈلوں کو وقفے وقفے سے مار کر کام چلا لیتا۔ میں نے سائیکل لاکر سینڈ پر کھڑی کی اور بوری لانے کے لئے کیرئیر کا سپرنگ اٹھایا۔ بھائی جی نے دیکھ کر کہا، ”اے سینڈ پر سے نکال، بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔“ میں نے سائیکل کے پیچھے کھڑے ہو کر اُسے اپنی ٹانگوں میں جکڑا، سپرنگ اٹھایا اور بھائی جی نے ڈپو کے مزدور کی مدد سے بوری اٹھا کر کیرئیر پر رکھی۔ میں نے سپرنگ چھوڑ کر بوری نیبھالی اور بھائی جی نے سائیکل۔ ہم سائیکل



دھکیلے ہوئے گھر پہنچے تو سوج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے ماں کی مدد سے سائیکل پر سے کھانڈ اتاری اور اندر رکھی۔ اُس نے اُسی رات تھوڑی کھانڈ کا بُورا بنالیا اور باقی کو ویسے ہی رہنے دیا۔ ماں، دن رات بیاہ کے کام میں مشغول تھی اور جب دیکھو سُہاگ لگتی رہتی تھی۔ ایک دن میں سکول سے واپس آیا اور دیکھا کہ گھر میں کپڑوں کا انبار لگا ہوا ہے اور امر چند میلر انہیں کھول کھول کر دیکھ رہا ہے۔ سب بھائیوں کے لئے ایک جیسے کپڑے لائے گئے تھے۔ مجھے پتا چلا تو میں نے امر چند کو ناپ دینے سے انکار کر دیا اور حقارت سے فیصلہ کن لہجے میں کہا، "میں سب جیسے کپڑے نہیں پہنوں گا، میری انفرادیت پر حرف آتا ہے۔" پہلے تو ہر کسی نے میرے احتجاج کی جی نہیں اُٹائی لیکن جب بھائیاجی نے میری ہٹ دھرمی میں سچائی دیکھی تو انہوں نے مجھے ڈرایا، "ٹھیک ہے، تو برات میں نہیں جائے گا، گھر میں رہے گا۔"

اُن کا فیصلہ میرے حق میں غذاب تھا لیکن میں اپنے ارادے پر اڑ گیا۔ میں حالات سے سمجھوتا کرنے کے بارے میں سوچتا، میرا منیر مجھ سے کہتا، "تُو اس بھیسٹر کا حصہ نہیں ہے! اگر یہ تجھے خود الگ کرتی ہے تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

میں ماما کشن سنگھ کا لاڈلا تھا۔ وہ آئے، میری ہٹ پر حیران ہوئے اور خوش بھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہریاد لے گئے اور میرے لئے میری پسند کے میوَن کپڑے اور بانا کے بوٹ خرید کر لائے۔

جس دن بیاہ کا ساہا آیا گھر میں ہریالے اور گھوڑیاں گائی جانے لگیں۔ ایسے چوان پکائے جانے لگے جو روزمرہ کے کھانے سے الگ تھے جیسے گھٹلے، پکڑیاں، گھنٹھنٹھیاں اور کانجی۔ بازی رچھانڈی کا آنا جانا شروع ہو گیا، وہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ دھول بجاتے ہوئے آتا اور چند کرتب دکھا کر چلا جاتا۔ وہ پہلا آدمی تھا جسے میں نے اپنی ہی بات کو سراہتے اور پھر کاسٹے دیکھا تھا۔ اُس کی خرافات کے پردے میں حُسنِ مطلب دیدنی تھا! وہ اپنے پھوں کو ادنیٰ سے اعلیٰ اور پھر اعلیٰ سے اعلیٰ تر کرتب دکھانے پر اُگسا تھا اور جب تک وہ اُس کے قائم کردہ معیار کو نہ پہنچتے، وہ یہی کہتا، "خوب ہے! لیکن قابلِ داد نہیں ہے۔"

بھابی کی بری کے لئے تحمل کا گھاگرا بنایا گیا۔ اُس کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ لگا، جس کا میں نے صوف بنالیا اُس کو خوبصورت صوف کا انصیاتی اثر! میں پہلے سے زیادہ احتیاط سے لکھتا، حروف کی ساخت پر غور کرتا جس سے میرا خط، خوش خط ہو گیا۔

اجیت سنگھ کے سُسرال، نلوا میں ہوئے، جو شوالک پہاڑ کے دامن میں ہے۔ کوئی براقی ہو گا جس کے ہاتھ میں تلوار، لاٹھی یا دُڈنارہ تھا۔ کچھ براقی گدے پر سوار تھے اور زیادہ تر پیدل۔ اجیت سنگھ گڈی (منجھولی) پر سوار تھا اور اُس کے ساتھ درشن سنگھ، جو اُس کا شاہ بالا تھا۔ عدالت یار اور نصیر احمد اُونٹ پر تھے اور ساجن سنگھ گھوڑی پر۔

براتی آپس میں محول بازی کر رہے تھے۔

”دنِ سیاں! میں چنتو سے کہہ آیا ہوں کہ برات سات دن رہے گی۔ ٹھیک ہے ناں!“

ایشہ سنگھ جانتا تھا کہ برات دوسرے دن لوٹ آئے گی لیکن اُس نے بھائیاجی کو چھیڑا۔

”بالکل ٹھیک ہے! لیکن اُس کے چھلّے (عصمت کی حفاظت کے لئے ایک آلہ) ڈال آنا تھا۔“

بھائیاجی نے اُس کی بات کی تائید کرتے ہوئے، اُسے رائے دی۔

”چھلّے اُس کے واسطے ہیں جو خالی رہتی ہو۔ میری بیوی ادھر خالی ہوتی ہے اور ادھر میں بھر دیتا ہوں!“

ایشہ سنگھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”پھر تو ضرور سات دن رہیں گے! سمدھی یاد کریں گے کہ کن بھوکوں سے پالا پڑا!“

بھائیاجی نے پھر اُس کی بات کاٹی۔

اس بار ایشہ سنگھ داڑھی کھلتا ہوا خاموش رہا اور لال سنگھ کو دیکھنے لگا جو تایا جی سے کہہ رہا تھا،

”کیوں بھائیاجی! ایک دن کی برات کوئی برات ہوتی ہے؟“

”ایک دن کی برات بھی زیادہ ہوتی ہے! لگن کے فوراً بعد گھر لوٹ آنا چاہیے۔“ تایا جی نے اُس

کی بات پر سنجیدگی سے غور کر کے کہا۔ اور پھر گُن گُن کرتے ہوئے بولے۔

بُلیا، جَم نالوں بُری جنیت

تھلے سونا پھکنی ریت

(اے بُلے شاہ! برات میں جانا ایک سزا ہے۔ نہ اپنی پسند کا کھانا اور نہ اپنی پسند کا

رہنا، زمین پر سونا اور ریت پھانکنا)

ہریانہ میں ہمارے گاؤں کی لڑکی پر سنی سیاہی ہوئی تھی۔ وریام سنگھ، ایشہ سنگھ، تایا جی اور بھائیاجی

اُس کے گھر اُسے شگُن دینے گئے جب تک براتی ہریانہ کے ہسپتال کے برابر رُکے رہے۔ وہیں سے نلوا کو سڑک

پھوٹی اور مہنتوں کے ڈیرے سے گدے لیک میں بدل گئی اور وہ بھی سانپ کی لکیر کی طرح اڑھی ڈیر تھی۔ وہاں سے آگے

نرسل کا جنگل شروع ہوا، جس میں سو، پچاس قدم پھرا ہوا ہم سفر دکھائی نہ دیتا۔ میر و نے اپنے بیلوں کو بھانجھ اور

سنگوٹی پہنائی تھیں اور نصیر احمد نے اپنے اونٹ کو چھانگل۔ اُس گھنے جنگل میں مسافروں کا شور ایسے سنائی دے رہا

تھا جیسے آذانوں کی کچھڑی پک رہی ہو کئی بار جنگلی چرندے چرتے اور پرندے چُپکے دکھائی دیتے۔ اُن کے فطری مامول

میں غلّ پڑتے ہی وہ چوکس ہو کر ادھر ادھر دیکھتے اور پھر اپنا کھانا انا ڈھونڈنے لگتے۔ اُن کی اُن گنت گنتی پر حیران

ہو کر ہر کوئی اپنے انداز میں تبصرہ کرتا۔

خرگوش! کہتے خرگوش ہیں!!  
نیل گاتے کے پیچھے پھڑپھڑا ہے!

مور!

تیتروں کے جھنڈ ہیں!

کہتے بٹیر ہیں!

اگر کوئی اُن کا پیچھا کرتا، اُن کی رفتار دو پرواز سے پُر خطر لمحوں کا منظر جھلکتا۔ ایک برساتی آبِ جو کا سُکھا پاٹ آیا۔ جس کے کنارے پر سے تیتروں کا جھنڈ دوسرے کنارے کی طرف اُڑا۔ اُس کے اُڑان بھرتے ہی 'ساں ساں' کی مسلسل آواز سنائی دی جیسے خانہ زُبور برہم ہو گیا ہو۔ میں نے ہوشیاری ادھر ادھر دیکھا، کچھ نظر نہ آیا۔ تاہاچی نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ ایک شاہیں سیدھا جھنڈ پر آ رہا تھا۔ اُس نے جس تیتروں نشانہ بنایا وہ جھنڈ سے کچھ پیچھے اکیلا تھا۔ شاہیں پَر پرواز سمیٹا اور نیچے کھولتا تیتروں پر جھپٹا، اُس کی 'تیس تیس' کی قابلِ رحم آواز کے ساتھ چند پنکھ گرے اور شاہیں کی پرواز کی طرف اُن کو ایں کو ایں کے ساتھ بکھر گئے۔

ترلوچن سنگھ گڈے کی بیٹی پر کھڑا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر ہش ہش کرتا ہوا تیتروں کو شاہیں سے پھرنے کے لئے دوڑا۔ اُس نے اپنے گرد چوکسی سے دیکھا اور اپنے شکار کو گھسیٹتا ہوا لے اُڑا۔

ایک جگہ ایک تنگ پاٹ آیا۔ اُس کے دونوں طرف اُونچے نیچے تھے اور وہ جو ہڑ بربند ہوتا تھا۔ اُسے دیکھ کر بھائیاجی نے منجھے ہوئے شکاری کی طرح کہا، "یہ جگہ اوگی لگانے کے لئے کئی ٹوٹوں ہے!"

ہرے بھرے کھیت دکھائی دیئے، بڑے بوڑھے کہنے لگے۔ "نلو آقرب ہے!" اُن کھیتوں کے گرد دوسری چوڑی باز تھی۔ ڈھینگ (کائی ہوئی ٹہنی) گمارے ہوئے نہ تھے، اُن کے گٹھے پاس پاس پھینکے ہوئے تھے۔ ہر راہی کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ وہ زندگی اندیشہ بھری تھی لیکن اُس جذبے کی طرح خوبصورت تھی جو کسی خطرے کو تسخیر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہنگام سفر میں تیزی اور تحریک تھی۔ میری پھریری میں ایسی توانائی تھی جو راہِ لوکی رعنائی ہوتی ہے۔ گڈے ایک کہیں کہیں دوسری ایک نے کائی تھی لیکن گاڑی وانوں کے لئے صحیح ایک کا تعین کرنا آسان تھا۔ وہ جس پہاڑی کی سیدھ میں چل رہے تھے، اُس کی اہمیت قطعی سارے کی سی تھی۔ میں گڈے پر کھڑا ہو گیا، اُس منظر کا نظارہ کرنے لگا جو تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا اور اپنے حسنِ بیکتا پر نازاں لگتا تھا۔

اچانک بینڈ کی آواز سنائی دی۔ بینڈ والے برات کو ہریانہ پار کر داکر گم ہو گئے تھے اور دکھائی نہ دیئے تھے۔ ایک آدموں کے باغ کے پار نلو دکھائی دیا اور وہیں بینڈ والے اور کئی براتی۔ میری حصار کی گوی جوتی (بیلوں کی جوٹ جس کے سینک نوکیلے ہوں) کی پٹھ (دُم اور کوہان کے اندر کا حصہ) نہیں تھی۔ عام گڈے میں بیلوں کے گٹھے،

بہیتوں سے بھرتے تھے اس لئے اُس نے اُن کے لئے نیا گڈا بنوایا تھا، جس کے جوئے اور جوتوں کو پیش کی کیلوں سے منڈھایا تھا۔ بیکل ایسے تیز طبع تھے کہ بدن پر مکھی بیٹھنے سے جھرجھی لیتے تھے۔ میرو نے راستے میں کہیں انہیں ہانکا نہ تھا بلکہ روکتے ہوئے چلا یا تھا۔ وہ انہیں کبھی چھچکیرتا تو وہ دلکی بھرنے لگتے۔ اُس نے بیلوں کو پچکار تے ہوئے اُن کے پیچھے کھینچے، تانیا جی کو پکڑا اے اور سانگی سے جوئے اور جوئے سے اونٹنے (Z) شکل کی لکڑی جو گڈے کے تیروں کے درمیان ہوتی ہے۔ اُن تینوں لکڑیوں کے جوڑ پر جو آ بیٹھا ہے۔ اونٹنے کے دو فائدے ہیں۔ اول گڈے پر چڑھنے اور اُترنے کے کام آتا ہے، دوسرا، بیلوں کو جوتے وقت گڈے کو اٹھانے کے لئے زیادہ جھکنا نہیں پڑتا ہے۔ پر پاؤں رکھ کر نیچے اُترا۔ تروچن سنگھ پہلے ہی گڈے پر سے اتر چکا تھا۔ گڈے کا تو ازن بگڑا اور الار گیا۔ میرو نے اوشا پکڑ کر گڈا دیا اور تروچن سنگھ سے الاروا (الارو کی لکڑی جو گڈے کے پیچھے لگی ہوتی ہے) لگانے کو کہا۔ میرو پھر گڈے پر چڑھا، پیچھے سے کچھ سامان اٹھا کر آگے رکھا، گڈے کو دبا دیکھا اور نیچے اُترا۔ اتنے میں نصیر احمد اور عدالت یار اونٹ پر آ پہنچے۔ نصیر نے ہمار کھینچتے ہوئے اور ہش ہش کرتے ہوئے اونٹ کو بٹھایا، اپنی ٹانگوں کو ایک طرف کیا اور سرک کر اُترا، اُسی طرح عدالت یار۔ براتی اکٹھے ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ضروری حواج سے نہٹ رہے تھے۔ بینڈ والے اپنے ساندوں میں بے مری چھونکیں مارنے لگے اور سُست رفتار براتیوں کو جلدی پہنچنے کی چیتاؤنی دینے لگے۔ جیسے ٹروم لون، ٹرم پٹ اور کورنٹ پر سورج مکھی چھایا ہوا تھا اُسی طرح چھوٹے ڈھولوں پر بڑا ڈھول۔ بینڈ ماسٹر فرادکی رونی ٹوپی اُس کے ساز کھلے ری نٹ، جیسی نئی تھی۔ جب تک براتی اکٹھے ہوئے میرو نے بیلوں پر لال جھول ڈالے۔ کوہان کے لئے جو غلاف تھا وہ جھول ہی کا جھد تھا اور اُس پر سفید ریشم کا پھندا جڑا ہوا تھا۔

ملٹی چوپال میں ہوئی۔ ایسے شہد گائے گئے جن کا مطلب ایک دوسرے کو نئے رشتے کی ناز کی سے آگاہ کرنا ہے۔ میرے بھائی جی اپنے سمدھی سے گلے ملے تو سب کی زبان پر یہ پوتر شلوک تھا۔

ہم گھر سا جن آئے

رہت پھڑے میل لگائے

عین اُس وقت ابریاراں کا ایک ٹکڑا کہیں سے آیا اور پھوار برساتا ہوا گز گیا جیسے وہ اُس مبارک گھڑی کو دُعاے خیر دینے کے لئے ہی اُدھر آن پہنچا ہو۔

رات کے کھانے کا انتظام شامیانے کے نیچے چاندیوں پر کیا گیا۔ کھانا پروس کر بھوگ لگانے کی ارداس کی ہی تھی کہ کوئی آواز بگولا، شامیانے اور قنات کو اڑا لے گیا۔ چاندیوں کے کناروں پر میر فرمش رکھے ہوئے تھے، اس کے باوجود چاندیاں اُتر گئیں اور کھانا، ریت ریت ہو گیا۔ کچھ براتی بندوبست پر نعن طعن کرنے لگے اور کچھ قدرت

کی بے دُردی پر۔ سمجھی نے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی اور تتر بتر نظام کو درست کرنے لگے۔ برات ڈیرے لوٹ رہی تھی کہ لال سنگھ نے تایا جی سے کہا، ”بھائی جی! آپ کا کہا ٹھیک نکلا۔“  
 تایا جی کھلی اور پُر سکون فضا کو دیکھتے اور کچھ بڑبڑاتے ہوئے چل رہے تھے جیسے اُس کے بھونڈے سلوک پر کُتہ چیں ہوں۔ راہ میں نالی پڑتی تھی۔ انہیں اُس سے بے خبر دیکھ کر، میں نے خبردار کیا۔ انہوں نے اپنا قدم معمول سے لمبا اٹھایا، نالی کو پار کیا اور لال سنگھ سے کہا۔ ”میں نے جلتے شاہ کا تجربہ بیان کیا تھا، بھوش بانی نہیں کی تھی!“  
 برات کے کھانے کا انتظام دوبارہ کیا گیا۔ دوسرے دن پانچ سہاگنیں سہاگ گاتی آئیں اور دُہن کے لئے سہاگ پیاری لے گئیں۔ اجیت سنگھ کا بیاہ کرو گرتھ کے پاٹھ کی گونج میں ہوا، جس کا بخور یہ ہے،

ہریر بھٹھا کر کاج رجسایا

دھن ہردے نام وگاسی

(یہ کام بھگوان کی منظورِی اور مہربانی سے پورا ہوا ہے۔ وہ دل قابلِ تحسین ہے۔ جو اپنا

سام اُس کا مبارک نام لے کر شروع کرتا ہے،

یہ گاؤں ہمارے گاؤں کی طرح گنجان آباد نہ تھا۔ مکان ہمارے مکانوں سے اونچائی میں چھوٹے تھے لیکن صحن، صحنوں سے بڑے۔ نیائیاں بالکل نہ تھیں اور نہ ہی چابی کھیتی۔ جہاں کہیں کٹواں تھا، چاہ در چاہ تھا۔ ایک چھوٹے قطر کے کٹوں کا پانی رستارے کی طرح ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد لوگ گھروں سے کم نکلتے تھے کہتے تھے کر باگھ پڑتا ہے۔

دوسرے دن برات نے دو پہر کا کھانا کھایا اور پتا چکانے کا وقت آیا۔ بھائی جی نے جتنا دیا، انہوں نے اُس سے زیادہ مانگا اور دونوں فریق اپنی اپنی بات منوانے لگے۔ ماما کشن سنگھ کی شامت آئی، وہ بھائی جی سے کہہ بیٹھے، ”دے بھی دو جی جی، خوشی کا موقع ہے!“ اُن کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بھائی جی، انہیں تنگی گالیاں دینے لگے۔ وہ اُسی وقت دیں سے اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ بھائی جی کی کنجوسی اور بد طبیعتی پر سمدھنوں نے نہایت لطافت آمیز سٹھیاں دیں، جس سے وہ اور بھڑک اُٹھے۔ سمدھیوں نے نیگ کی مانگ واپس لی تو دُہن بدامنی ہوئی۔ ہر کوئی انہیں اس اُمید سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اب بکھیر پھینکیں گے اور شگن کریں گے لیکن وہ ہر نازک جذبے سے عاری گم سم چلتے رہے۔ ڈولا، سمدھیوں کی نظر سے اوجھل ہونے لگا تو لال سنگھ نے بڑھ کر اُن سے کہا۔ ”رتن بییاں! ایک دو ہاتھ شگن کے لئے پھینک دے۔“  
 ”میرا پھینکتا ہے یہ!“ وہ اپنے چدے پر جھپٹے۔ اُن کا بس چلتا تو وہ ننھے رتن سنگھ کو اکھاڑ کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ وہ جتنی تیزی سے آگے بڑھتا تھا اتنی ہی سست رفتاری سے پیچھے رہ گیا۔ بھائی جی کی بری گاؤں تک بدستور رہی کیوں کہ تایا ملکھی رام انہیں مسلسل درغلالتے رہے کہ گھر میں پہلی شادی کے سارے اخراجات تنہا کی

ذمہ داری ہوتے ہیں۔ دُہا دلہن باہر دروازے پر کھڑے تھے اور ماں پانی اُتارنے کی تیادگی گھر رہی تھی کہ بھائی جی نھیال پر برس پڑے۔ وہ اُسی وقت جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تایا جی نے بیج بچاؤ کیا لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ اور پھر اجیت سنگھ کا مکلاوا (گونا) آیا۔ میں نے بھائی گرجن کو روپ درشن (رُونمائی) دینے کے لئے ماں سے ایک روپیہ مانگا، اُس نے نہ دیا تو میں بسور نے لگا۔ بھائی کو خبر ہوئی، وہ میرے پاس آئی، گھونٹ اٹھایا، مجھے بکری دی اور بولی، ”یہ ہے میری منہ دکھائی دیو جی! میں نے روپیہ کیا کرنا ہے!“

گرجن کو رُنبک دست، خوش مزاج اور حاضر باش قسم کی لڑکی تھی۔ اُس کی بری کی تہ نہ لٹوئی تھی کہ وہ ماں کا ہاتھ بٹانے کے بہانے کام میں حصہ لینے لگی۔ ماں اُسے روکتی تو وہ اپنی لوج وار آوازیں اُسے فریب دیتی، ”ماں جی، میں کام کر نہیں رہی ہوں، پرکھ رہی ہوں!“ اُس کے پرنائے کال (ایام عروسی) کا خیال کرتے ہوئے ماں اُسے غصہ کرتی۔ وہ رُوں آؤں کرتی ہوئی اُس سے پیٹ جاتی اور اُسے اپنے ارادے میں مداخلت کرنے سے باز رکھتی۔ جانتے جانتے ماں نے اُس کا سُبھاؤ جان لیا اور اسے سست بچن کا نیا نام دے دیا۔ سست بچن کی آواؤں میں حُسن تسلیم تھا اور انکار میں اقرار دلبری۔ اُس کی مسکراہٹ اُڑتی ہوئی خوشبو تھی، وہ موجود وہاں ہوتی اور محسوس یہاں۔ وہ اُن تھک تو تھی ہی، خوش اُسلوب بھی تھی اور گھر میں سُلکھیاسی بھرتی رہتی تھی۔ اُس کی آواز کی فطری تہ، دلربا سُلگیت سے مشور تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اُسے حکم دیتے رہو اور وہ حکم بجالا لاتی رہے۔ ماں کی طرح بھائی بھی کام ایجاد تھی لیکن جو چیز اُسے ماں سے ممتاز کرتی تھی وہ اُس کا نگاہِ جدت طراز تھی۔ وہ جھوٹے برتنوں کو پانی کے ٹب میں اکٹھا کرتی جس سے برتنوں پر جھوٹ نہ سُکھتی اور انہیں صاف کرنے میں آسانی رہتی۔ وہ برتن صاف کرتے وقت ہاتھوں پر کھیسے چڑھالیتی جس سے ہاتھوں کا سنگار خراب نہ ہوتا۔ پہلے دو تین مہینے میں برتن قلعی کروانے پڑتے تھے اب انہیں قلعی کروانے کا وقفہ بڑھ گیا۔ وہ کڑھی بناتی تو ہانڈی کو تالا دے کر چوہے پر چڑھاتی اور ہانڈی کے کنارے چکناٹی سے چُپڑ دیتی۔ کڑھی کا اُبال مشہور ہے! اس طرح وہ کڑھی کے اُبال کو قابو میں رکھتی جو بصورت دیگر کڑھی رتکھے (کڑھی کا اُبلنا بند ہو کر اکسار کھولنے کی حالت) پڑنے تک رسوں کا دزدہ نہ ہوتا ہے۔ اُس نے گوزے میں کھریا بگھو کر رکھ دی تھی۔ وہ کھانا پکا کر چوہے پر کھریا پکڑتا پھیر دیتی، چوہا ایسے لگتا جیسے دکھاوے کی شے ہو تقریباً ہر لگتی کاٹھی ہوئی تھی، اُس نے نئی انگلیاں باندھ دیں۔ وہ تازہ دھلے گیلے کپڑے چھٹک اور کپڑے کھینچ کر پھیلاتی اور اُن میں ذرا نمی ہوتی تو اُتار کر تہ لگالیتی۔ کپڑے وقت پر اُتار نہ سکتی اور کپڑے کرارے سُکھ جاتے تو وہ اُن پر پانی تروٹک (چھڑک) کر انہیں نرم کرتی، تہ لگا کر فرش پر جھاتی اور اوپر سُتھر رکھ دیتی۔ وہ جب کپڑے وہاں سے اُٹھاتی، الماری میں سلپتے سے جمادیتی۔ میں وہاں سے کپڑے لے کر پہنتا، مجھے لگتا کہ وہ دھوبی دھلے ہیں۔ ایک دن گیان کو رُائی اور الماری میں قہینے سے رکھے کپڑے دیکھ کر احساسِ قصور سے بولی۔ ”گرجن! ہمارے گھر کی الماریاں کھولنے سے چیزیں منہ پر گر گئی ہیں۔ انہیں ترتیب جینے کے لئے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ تو یہ سب اکب سجاتی ہے؟“

جب ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے پہلی بار سبھانے میں وقت لگتا ہے پھر یہ کام بہت آسان ہے۔ اُس نے اپنی ایک زُلف پریشان کو سنوارتے ہوئے کہا۔

میرے پاس ایک ہی پگڑی تھی۔ اُس نے اپنی سفید اور سفید، باندھوے لال اور پہلی رنگ کر مجھے دے دی۔ اُس پگڑی سے میری انفرادیت پسند طبیعت کو تقویت ملی۔ پورے سکول میں کسی کے پاس ویسی پگڑی نہ تھی۔ پگڑی دھو کر نکھانے کے لئے مجھے ہمیشہ کسی دوسرے کی مدد لگتی تھی ورنہ پگڑی میں چنت پڑ جاتی تھی۔

بھابی نے دیوار میں آٹھ لاکھ لاکھ، اُس کے ساتھ پگڑی کی چوڑائی کا ڈنڈا درمیان میں باندھ کر لٹکایا اور اُس کے دونوں سروں پر دھاگے باندھ کر لٹکتے چھوڑ دیئے، عین ترارو کی دُڈی کی طرح۔ میں نے رنگ ریز کو ویسے پگڑیاں اور دوپٹے نکھانے دیکھا تھا لیکن میں اُس کی تقلید نہ کر سکتا تھا۔ میں بہت خوش ہوا اور بھابی سے پوچھا، ”بھابی، اس کا نام کیا ہے؟“

”نیل گر اسے ڈنڈا کہتے ہیں لیکن میں اسے ساکھی کہتی ہوں۔“

بھابی کے حسن انتخاب کی دل کشی مرہون بیاں نہیں ہے۔

ایک اکیلا اور دو گیارہ گھر کے پورے کام آدھے رو گئے۔ اب ماں، بھابی کو کسی کام سے روکتی تھی تو وہ تھا گوبر سمیٹنے کا کام، لیکن بھابی اُس کام میں بھی قابل قبول طریقے سے ہاتھ بٹانے لگی۔ وہ گوبر کے ٹوکے بھرتی اور ماں انہیں اٹھا کر ڈھیر پر پھینکتی۔ جب تک ماں دوسرے چھوٹے موٹے کاموں سے نجات پاتی، بھابی چولہا چولہا سنبھالے ہوتی۔ وہ سب سے پہلے آٹا گوندھتی اور پھر دال سبزی بناتی۔ روٹی پکانے سے پہلے وہ گوندھا ہوا آٹا دوبارہ گوندھتی۔ اُس سے آٹے کی کئی مر جاتی اور اُس میں چکنائی اُبھرتی جو آٹے کی تون گوندھا ہوا آٹا جس سے تھوڑا تھوڑا لے کر لونی بناتے ہیں، پر صاف دکھائی دیتی۔ بھابی کی لونی، ماں سے چھوٹی ہوتی اور اُسی طرح روٹی۔ ماں پاک صاف ہو کر روٹی پر ہوتی اور روٹی دیکھ کر بھابی سے کہتی، ”بیٹی اُتو کھترانی جیسی روٹی بناتی ہے، پیٹرا تھوڑا بڑا رکھا کر، تیرے بھائیاجی ہلکی روٹی پسند نہیں کرتے“ وہ ہماری اور بھائیاجی کی پسند کا خیال رکھتی، ہمارے لئے ہلکی اور بھائیاجی کے لئے بھاری روٹی پکاتی۔

گھر میں ایک سٹکا ماش پڑے تھے جنہیں ماں اس لئے نہ پکاتی تھی کہ اُن میں چور ماش زیادہ تھے بھابی نے انہیں خرچ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح میرے چڑھایا۔ وہ اُن ماشوں کو پکا کر ایسے بٹھارتی کہ چور ماش الگ ہو جاتے اور دوسرے ماش الگ۔ وہ چاولوں کی سنگ شونی کرتی کہ بیسنی بناتی، مسکتی اور لہکتی ہوتی۔ کام سے اُس کا وہ رشتہ تھا جو بادِ نسیم کا باغ سے ہے۔

تبدیلی کوئی بھی ہو، بلا شک و شبہ انتشار پیدا کرتی ہے اور اکثر ناچاقی کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ماں کی کام سے علیحدگی اور بھابی کی کام سے وابستگی ایسے ہوئی جیسے پھول میں پھل آتا ہے اور پھر وہ ہولے ہولے بڑھتا ہوا پھول کو یکسر غائب کر دیتا ہے۔ ماں کی تقدیر یہی بدل گئی۔ وہ گھر کی نوکرانی سے گھر کی رانی بن گئی لیکن وہ اس سے خوش نہ تھی۔ وہ بھابی

کو سمجھاتی، بیٹی! کام میرے لئے ضروری ہے! میں بیچارہ ہوں گی تو بیمار پڑ جاؤں گی۔“ لیکن بھابی تھی کہ اس بارے میں اس کی ایک زسنتی تھی اور یہی بات ماں کو کھشتی تھی۔ ماں میلے کپڑے دھو رہی تھی، بھابی نے اُسے دیکھ لیا اور اُسے اُٹھا کر خود دھونے لگی۔ ماں ناراض ہو گئی اور غصے سے کپڑے پنک کر کے پھینکے۔ ”کئی بار تو تو گئے ہی پڑ جاتی ہے!“

بھابی کام چھوڑ کر اُس کے گلے سے پیٹ گئی اور اُس کے منہ کے آگے گال کر کے لاڈ لٹا رہے ہوئے بولی،  
 ”ماں! گلے نہیں پڑتی ہوں! گلے لگتی ہوں!“

اُس کے عنایتِ امیز اصرار اور خوش کن اظہار پر ماں کو مسکراتے ہی بنی۔ اُس نے اُس کو خسار چھوڑ دیا اور عادی، دُودھوں نہاد، پوتوں پھلوں، جُگ جُگ بنو۔“

بھابی کی نفاست سے گھر میں ایک بے لکھا قانون نافذ ہو گیا۔ کسی چیز کو ادھر سے ادھر ہونا ہوتا یا دھول کو کہیں ڈیرہ جمانا ہوتا تو اُسے بھابی سے اجازت لینا پڑتی۔ اُس کی مستعدی کا اعجاز، وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی وہ ظہورِ آمیز حرکت سے تھرکتی نظر آتی اور اُسی طرح وہ خود بھی۔ اُس کے اعضا کی کام سے وہ دوستی تھی جو سنگیت کی سُروں سے ہوتی ہے۔ کپاس کی ساکھ اتنی تو ماں کی 'بیاری' اور ناراضی، دونوں ہی کا حل نکل آیا۔ ماں نے گالے، دھوپ میں کھٹکا گرزے پھٹکے اور اونٹنی پر اوٹ لئے۔ ایک دھنیا راچھا ٹنکارتا اور ہانک لگا تاگو م رہا تھا، یس اُسے بلالایا۔ اُس نے اپنے کام کے لئے برآمدہ پسند کیا جو ایک طرف سے کھلاتھا، ادھر پردہ لگا دیا گیا۔ اُس نے راچھا چھت سے بانڈھا، سر منہ کپڑے میں لپیٹا اور رُوئی دھونکنے لگا۔ دھنیا، آدمی نما جتر لگتا۔ وہ جس ترکیب سے راچھے کی تانت پر ہتھی مارتا۔ تانت سے رُوئی لپیٹتا، لپیٹ لپیٹ کر تانت ٹنکارتا، وہ ایک دل رُباتاں تھی۔ سنگیت کے مُوجِد نے کہا ہے کہ سات سُروں یعنی سا، رے، گا، پا، دا، نی، یس ہر تال کی تفسیر ہے۔ یس سوچتا ہوں کہ کیا وہ مالِ ان سُروں میں سما سکتی ہے؛ یس کوشش کرتا ہوں۔ سارے، سارے، دانیا پا، دانیا پا، دانیا پا، دانیا پا، دانیا پا، دانیا پا، سارے۔

تو ہی ہوئی رُوئی سے برآمدہ بھر گیا۔ ماں نے کانٹنی اکٹھی کی اور بھابی نے رُوئی سنبھالی۔ ماں نے کانٹنی کو گتے اور کھریا بیٹیں میں گوندھا اور اُسے گوڑے سے کمیندے پر تھاپ کر اُس سے گولا بنایا۔ وہ سوکھ گیا تو بھابی نے اُس کے اندر اور باہر لال اور پیلے رنگ سے لکیریں کھینچ دیں۔ اُسے اُٹا کر کے دیکھنے سے وہ خربورہ نظر آتا اور سیدھا دیکھنے سے کھلا ہوا گلاب۔ اپنے دھبے میں، بھابی رنگیلا جڑاؤ پیر تر لائی تھی جو دیے ہی رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اُسے جتنی باندھی، مال ڈالی۔ چمر خیں نکائیں۔ تنکلا بٹھایا اور تیل دے کر رہا۔ تنکله کا دُمرک کہیں نہ ملا۔ یس بھاگن بوا گیا اور تایا جی سے لکڑی کا دُمرک بنوا لایا۔ بھابی نے پہلا دُمرک کات کر چرنے کا شنگن کیا اور پھر چرخہ پیر بٹھا ماں کو سونپ دیا۔ ماں نے اپنی زندگی نئے طریقے



سے باہلی۔ قہر خیز کاتھی، سہاگ لٹائی اور اپنے آپ میں مست رہتی۔

تیرے محلاں دے درج باہلا، کون کتے کا پتھر خد؟

میری سگھر پوتریاں، دھیسے توں گھر جا اپنے!

کوئی لڑکی اپنے سسرال جانے سے پہلے اپنے باپ سے کہتی ہے۔ اے باہلی! میں تیرا

گھر چھوڑ کر اپنے سسرال جا رہی ہوں۔ اب تیرے گھر میں چرخہ کون کاتے گا؟ اُس کا باپ

اُس سے کہتا ہے۔ وہ تیرا سسرال نہیں گھر ہے! تو میرے گھر کی فکرت نہ کر، میری سگھر

پوتریاں میرے گھر میں چرخہ کاتیں گی اور اس کی رونق بڑھائیں گی!

گھر بلو معمولات اکثر ناگوار ہوتے ہیں، اُن میں سہانی دل کشی پیدا ہوگی۔ گھر کی فساد دہرے حُسن سے بکھر

آئی۔ مجھے کسی کام میں حمایت کی ضرورت ہوتی، میں بھابی کو آواز دیتا، وہ "آئی دیور جی" کی رنگ میں ناچتی ہوئی آتی اور

مسکراہٹ کی روشنی بکھیرتی ہوئی پورا کام نبھاتا جاتی۔ میں چوہے کے پاس بیٹھ کر روٹی کھاتا، اتفاق سے تواہستہ، وہ ٹھٹھا

کرتی، دیور جی! تمہاری شادی کا فال نکل رہا ہے۔ کوئی پسند کر رکھی ہے تو بتاؤ ورنہ میں تمہارے لئے لڑکی ڈھونڈتی ہوں۔

بھابی بہت کم جھیز لاتی تھی۔ تائی بیرو، اُس کا مقابلہ ہر نام کو رکی ہوئے کرتی، جو اپنے ساتھ سلائی مشین

سے لے کر چولہا، پیڑھا، توا، چکلا، بیلنا، چمٹا، چھوٹنا، نمکدان، چنگیری..... سوئی، دھاکا تک لاتی تھی۔ اُس کی

اپنی ساس سے بھی رشتہ تھی، جو اُس کے بارے میں گھر گھر کہتی پھرتی تھی۔ "کھائی وات، رہ گئی کم جات۔" اس کے باوجود

تائی بیرو، میری ماں کے سامنے ہر نام کو رکی ہوئے کے جھیز کی بات کرتی جسے سُن کر بھابی دل گیر ہو جاتی، تائی بیرو جب آتی،

بھابی اُس سے منہ چھپاتی۔ ایک دن ماں، چرخہ کاتتی تھی اور بھابی کشیدہ کاڑھتی تھی کہ تائی آئی۔ اُسے دیکھ کر بھابی کشیدہ

لے کر اندر جانے لگی۔ ماں نے اُسے روکا اور وہیں بیٹھ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ تائی باتوں باتوں میں اُسی بات پر اُگنی جو بھابی

کو نا پسند تھی اس بار اُس نے قہر کر دی۔ بولی، "خالی بات، آئی کم جات۔"

بھابی یہ مہناسٹن کر رونے لگی۔ ماں نے گریچن کا منہ اپنے ہاتھوں میں لیا، اُسے چوما اور سر پر ہاتھ پھیر کر

اُس کا دھیرج بندھایا پھرتائی سے کہا، "بھابی! بھلائی اسی میں ہے کہ اسی بات سے تیرا دل کراو! کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہارا

مذہب نہ پائے۔ میری بہنو میری بیٹی ہے! دنیاوی چیزیں، میں اس پر درارتی ہوں! ماں نے اپنے گلے سے سونے کی

زنجیر تیری، بھابی کے گلے میں ڈالی اور سہاگ لٹانے لگی۔ وہ سہاگ، میں بھول گیا ہوں لیکن اُس کا مفہوم یاد ہے میرے

گھر کی تقدیر، میری بیٹی لے گئی تھی جسے میری بہن لاتی ہے۔

بھابی کو کوئی کام نہ چلتا، وہ ماں کے پاس جا بیٹھتی۔ پون سلائی پر پونیاں بناتی، بوتیاں رکھتی اور کوئی

سہاگ لٹاتی۔ اُس کا منہ ماما روپ اور مہر آواز! لگتا کہ گندھرب گنیا ساک شات (دھوبو،) براجمان ہے، کچھ نگڑیاں

جوری گئیں تو بھائی نے اٹھ کر نکال لیا۔ وہ حسبِ ضرورت پونیاں بناتی اور کبھی گڑیاں اٹیر کر انیاں۔ وہ کام کی رسیا تھی اور کسی کے بٹانے پر بھی کسی کے گھر نہ جاتی تھی، اگر جاتی تھی تو ماں کے ساتھ۔ وہ ایک دن تانی ماں کے گھر میں گئی اُس کی بہو سمرن کو روسیٹر بن رہی تھی۔ بھائی نے سویٹر کی بنی دیکھ کر اُس سے کہا، ”سمرن، تیری بنی ایک جیسی نہیں کہیں دیکھتی ہے اور کہیں کسی ہوئی ہے اور کہیں کہیں بنی میں فرق بھی ہے۔“

”میں نے بڑی کوشش کی ہے، ہاتھ ایک سا نہیں رہتا اور بنی میں غلطی ہو جاتی ہے۔“

سمرن کو رنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے سویٹر پھیلایا۔

”تیرا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے، بس دھاگے کو یوں پکڑا کر اور سلائی چڑھا کر بنی دیکھ لیا کر۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر گرسے گا ایک دم پتا چلے گا اور اُسے اٹھانا آسان رہے گا۔“

گرچہ بنی نے دلہنے ہاتھ کی چھنگلی کے اوپر سے دھاگے کو بٹل دے کر دکھایا۔ اُس کے بیٹھے بیٹھے سمرن کو نے چند سلائی چڑھائیں اور اُس بنی کی صفائی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس کی گرم جوشی! اُس نے بنا ہوا سارا سویٹر اُدھیر اندر سے برے سے بننا شروع کر دیا۔

”تو تو کبھی بنی نہیں، تجھے یہ سب کیسے معلوم ہے؟“ سمرن کو رنے نے گرجن کو ٹولا۔

”کام کی باریکیاں کام کرنے ہی سے کھلتی ہیں یا کسی کے بتانے سے۔ میں سلائی اور سوئی کے کام میں ماہر ہو گیا۔ ماں اُن کا ت رہی ہے۔ میں پہلا سویٹر بھائی جی کے لئے بناؤں گی۔ بھائی نے بھائی جی کے لئے اپنا پیار جتاتے ہوئے کہا۔“

”تو سارا وقت گھر میں پڑی کیا کرتی رہتی ہے؟ کبھی مل بیٹھنے کے لئے آیا کر۔“ سمرن نے اپنی ٹوہ میں رائے دی۔

وقت کہاں ہے سمرن! جب کہیں تھوڑا ملتا ہے میں ہزارہ (وہ پھلکاری جس میں ہزار بچھول ہوں) بناتی ہوں۔“

”تجھے ہزارہ کیا کرنا ہے؟“ سمرن نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

”کل تریک کور کے لئے ضرورت پڑے گی۔ بھائی نے دور اندیشی سے کہا۔“

”اُس کے لئے! انجی سے! سمرن نے متحیر ہو کر سوال کیا۔

بھائی! لڑکی ترقی کی طرح برصغیر ہے۔ اس کے بارے میں آج سے سوچنا چاہیے۔ اپنی دور اندیشی کی ضلالت میں بھائی نے مثال دی۔

پھلکاری، پنجابی تہذیب کا ایسا باغ ہے جس کے گل بوٹے کپڑے پر دھاگوں سے اُگلے جاتے ہیں۔

بچوں کہ بھلاکاری کو لڑکی کا شہاگ سمجھتے ہیں، اور ماں باپ سے بچھڑنے کی نشانی، اسے کاڑھتے ہوئے لڑکیاں کیسے درد انگیز اور حسرت آمیز شہاگ گاتی ہیں! ان کے کلمے کتنے مخصوص، کتنے نادر، کتنے کبریٰز ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شدت بقدر احساس ہے۔

گھڑیا سنار یا سونے دے تاروے (اوسنار! میرے لئے سونے کے تار بنا کر لا،  
اسیں وچھڑ جاناں، گونجاں دی ڈاروے (قازوں کی ڈار کی طرح ہم نے بچھڑ جانا ہے،  
کئی اچھے گئیاں، کئی لئے گئیاں (کئی بہت ادھر گئی ہیں اور کئی بہت ادھر گئی ہیں،  
کئی گئیاں سمندروں پاروے (اور کئی سمندر کے پار گئی ہیں،  
گھڑیا سنار یا سونے دے تاروے، (اوسنار! میرے لئے سونے کے تار بنا کر لا،  
گھڑیا سنار یا سونے دا ڈھولنا، (اوسنار! میرے لئے سونے کا ڈھولنا، پیار سے پریم کو کہتے ہیں، بنا کر لا،  
اسیں وچھڑ جاناں مکھوں نہیں بولنا، (ہم نے اپنے ماں باپ سے بچھڑ جانا ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا ہے۔  
کئی اچھے گئیاں، کئی لئے گئیاں، (کئی بہت ادھر گئی ہیں، کئی بہت ادھر گئی ہیں،  
کئی گئیاں سمندروں پاروے (اور کئی سمندر کے پار گئی ہیں،

اسیں تیرے باگاں دیاں کلیاں وے بائلا (اے بائل! ہم تیرے باغوں کی کلیاں ہیں  
امبری دا ویرا چھڈ چلی آں وے بائلا، (اے بائل! ہم اپنی ماں کا گھر چھوڑ چلی ہیں  
تیرے گھر دیکھی کسی چیز دی نہ بھکھ وے (تیرے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔  
تیرے گھر یاے ساری دنیا دے مکھ وے (تیرے گھر میں ہم نے سارے جہاں کے مکھ پائے ہیں  
اسیں تیرے باگاں دیاں کلیاں وے بائلا (اے بائل! ہم تیرے باغوں کی کلیاں ہیں۔  
چوڑیاں وے چبے وچوں دور تر چلی آں (میں تیرے خاندان سے بہت دور جا رہی ہوں  
رماں توں ہوئی مجبور تر چلی آں (ریتوں، ارواجوں سے مجبور ہو کر جا رہی ہوں  
راجیاں توں ریتاں نہیں ملیاں وے بائلا (اے بائل! ریتوں، ارواجوں کو راجے بھی مال نہ لے  
اسیں تیرے باگاں دیاں کلیاں وے بائلا (اے بائل! ہم تیرے باغوں کی کلیاں ہیں

بھابی کے شہاگوں کی جاں گدازی اور کُل سازی ایک دوسرے کے متقابل تھی۔ سوزن کاری کے کام میں،  
سُوئی میں دھا کا ڈالنا، بے حقیقت ساعمل ہے لیکن بھابی کے ہاتھ اُسے ہنر بنا دیتے تھے۔ ماں، سُوئی میں دھا کا ڈالتی  
تھی جب کہ بھابی، دھاگے میں سُوئی، پھر دھاگے کو ناکے میں سے ایسے کھینچتی کہ لمبی تر پُرن بھرتی لگتی۔ بھلاکاری کے حاشیے

پر چھوٹی چھوٹی کمانوں کی بار تھی، جن میں اُن کی حسامت کے لحاظ سے گل لالہ تھے۔ پھلکاری کو کئی کئی اریوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر پیل اکیاری کے ایک ہرے سے دوسرے ہرے تک جاتی تھی۔ پیل کے دونوں طرف شاخیں، گندوں کی طرح پھوٹی تھیں اور اُن میں سے بیتیاں اور پھر پھل۔ جہاں شاخ ختم ہوتی تھی، وہاں پھول کھلتا تھا۔ چوں کہ وہ پھلکاری رنگ در رنگ کچے ریشم سے کاڑھی ہوتی تھی، اس لئے ہرے میں لال، لال میں پیلا اور پیلے میں ہر رنگ دوڑتا دکھائی دیتا تھا۔

لیکن بھابی کی دور اندیشی اور ہنروری کسی کام نہ آئی۔ ایک شام ماں برآمدے کے چولہے پر روٹی پکا رہی تھی۔ بھابی چولہے کے سامنے بیٹھی روٹی سیک کر اجیت سنگھ کو پرس رہی تھی، جو پاس ہی چار پانی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کوئی بات چوٹی اور بھابی کھڑکھڑا کر دوہری ہو گئی۔ اُس کے ساتھ ماں بھی ہنسنے لگی۔ کہتے ہیں کہ ہنسی متعدی ہوتی ہے اور اکثر روکنے سے رکتی نہیں ہے۔ وہی بات ہوئی۔ ماں اپنے رس میں روٹی پکانی بھول گئی اور بھابی روٹی پر ہنسی۔ اُس کی اور ہنسی نیچے ڈھلک گئی اور جوانی کی ساری بے ججابی، سینے پر ناپچنے لگی۔ عین اُس وقت، جب گھر کی فضا مستی و سرشاری سے جھول رہی تھی، بھابی باجی باہر کے دروازے میں دکھائی دیے۔ اپنے جذبات کی زوداداری میں کسی نے اُدھر دھیان نہ دیا۔ پردے کا رواج تھا اور بڑوں پورھوں پر فرض تھا کہ وہ اپنی آمد کی اطلاع کسی نہ کسی طریقے سے کریں، کھانس کھنکار کر کسی بچے کا نام پکار کر، دروازہ کھٹکھٹا کر..... تاکہ بہو بیٹیاں پردہ کر سکیں۔ اِس رواج کی طرفداری میں کسی نے خوب کہا ہے۔

گھر بڑا کھڑک نہیں کر دیا

بابے گل ٹل پا دیو

(بوڑھا، گھر میں دبے پاؤں چلا آتا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی اِس کے گٹلے میں گھنٹا باندھ دے)  
اسی طرح کوئی بہو اپنے سُسر کی تاک جھانک کا شکار ہوئی ہوگی۔ اُس نے اپنے مجروح جذبات کو جِن سخت لفظوں میں بیان کیا ہے، اُن سے بے رحمی ٹپکتی ہے۔

کورے کورے کچے چوچ مرچیاں میں رگڑاں  
سوہرے دیاں اکھاں روچ پاؤں لگی  
گھنڈ کڈھنے دا ریڑ کا مٹاؤں لگی

(میں کورے کورے میں اِس لئے مرچیں رگڑتی ہوں کہ میں انہیں اپنے سُسر کی آنکھوں میں

ڈالنا چاہتی ہوں۔ وہ آندھا ہو جائے گا تو گھونگٹ نکالنے کا کٹش جاتا رہے گا)

میں کھری (ناند) پر کھڑا سانی کر رہا تھا۔ میں نے بھابی باجی کو آتے دیکھا اور بھابی کو آواز دے کر خبروا کیا

تب تک وہ اندھے سُر کی طرح دھس دیتے ہوئے، جو کہ میں پہنچ گئے۔ انہیں یہ ایک سامنے پا کر بھائی بوکھا گئی۔ اور ہنی اُس کے زانو پر پڑی تھی، جو اُسے ہر بڑی میں نظر نہ آئی۔ وہ آخر اتھری میں اٹھی، اور ہنی میں الجھ کر گرتی گرتی کچی اور اپنا بھر پور سینہ ہاتھوں سے ڈھانپتی ہوئی، دالان کے اندر بھاگ گئی۔

خوں خوار جذبے کی انوکھی خصوصیت ہے! یہ تب خوں خواری پر آمادہ ہوتا ہے، جب اس میں درندگی کا عنصر ملتا ہے۔ غضب ناک کے اُس مقام پر پہنچنے کے لئے عام آدمی کو صورتِ حال کے مطابق کئی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن درندگی میں میرے بھائی جی کا ان مدارج سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ وہ طبعاً خوں خوار تھے۔

وہ اجیت کے گھلے پر پلکے، اُس نے روکا، اُنہوں نے چار پائی الٹ دی۔ وہ بلندی پر سے لڑھکے ہوئے پتھر کی مانند دیوار کے خلاف ٹکرا کر رکا۔ اُس کی تھالی جھنجھٹاتی ہوئی میری کے پاس گری، سالن کی توڑی (مٹی کی ہانڈی) گھر بچی پر ٹوٹی اور بانی کی مراچی دیوار پر۔ روٹیوں کا چھابہ اُٹتی ہوئی ہشتری کی طرح گھومتا ہوا گھر سے باہر گلی میں پڑا اور دُبی حشر اُٹے کی پرات کا ہوا۔

ٹائیکر ڈم ہلاتا ہوا بھائی جی کے ساتھ چوکے تک پہنچا تھا۔ وہ پہلے دھماکے پر چوکتا ہوا اور پیچھے ہٹا لیکن خاموش رہا جیسے تصادم کا راز سمجھ رہا ہو۔ بھائی جی کا توڑنا پھوڑنا جاری رہا تو وہ اُنہیں بھونکنے لگا۔ اُس کے سوائے ہر کسی کی زبان پر فالج گر گیا۔ اُس کی جراتِ فریاد اُن پر ناگوار گزری۔ اُنہوں نے اُسے نوں گھوٹنا مارا۔ وہ وار بچا گیا اور پہلے سے زیادہ شدت سے بھونکنے لگا۔ اُس کے احتجاج کو پورا بھونکنے کے لئے، اُنہوں نے پھاؤڑا اٹھایا اور اُس کو پیچھا کیا۔ ایک بالٹی لانگھن میں پڑی تھی، وہ اُس سے ٹکرائے اور گر پڑے، بالٹی کو کوستے ہوئے اُٹھے اور دوبارہ ٹائیکر پر پلکے۔ وہ بھاگتا، رکتا، بھاگتا، رکتا بھونکتا رہا اور اپنی آواز بلند کرنا رہا۔ وہ اُسے خاموش نہ کر سکے، پلٹ آئے اور اپنی ناکامی کا بدلہ اوٹے سے لینے لگے۔ ایک اینٹ چوہے میں جلتی لکڑی کے پچھلے سرے پر گری، جو اُڑ کر اُن پر پڑی۔ اُنہوں نے اُسے غضب ناک ننگا ہوں سے دیکھا، اٹھایا اور اُسے چوہے پر توڑ دیا۔

اُن کے پیچھے پیچھے ٹائیکر بھونکتا ہوا لوٹ آیا اور اُن کی شدتِ ناروا پر احتجاج کرتا رہا، جو کسی اور کا مقدور نہ ہوا تھا۔

میرے والد کا نطفہ تخلیق ہوا تو اُس کے خالق نے جہاں اُسے ہر مادی خوبی سے مالا مال کیا وہاں اُس میں ہر روحانی نزاکت کا فقدان رکھ دیا۔ اُن کا ہر انگ، انسانی جذبے کی مخالفت میں شیطان کی طرح صفا کر رہتا تھا اور یہی اُن کی خوں ریز سفاکی کا راز تھا۔ اُس نطفے کی تقدیر! وہ پیدائش ہوتا تو جہنم راج ہوتا۔

گھر میں ایسے جاں و گار لمحے آتے تھے تو ہر کوئی خوف زدہ ہو کر یا اُس بربادی کی تاب نہ لا کر اٹھیں نہ

کر لیتا تھا۔ کوئی اعتراض کرتا تھا تو ٹائیگر! وہ اپنے دوتے سے اس کہاوت کی تائید کرنا کہ کتا موت کے فرشتے کو دیکھ لیتا ہے، اُسے بھونکتا ہے اور انسان پر وار کرنے سے روکتا ہے، روک نہیں سکتا ہے تو اپنی بے بسی پر روتا ہے اور یوں اُس نوالے کا حق ادا کرتا ہے جو اُسے گھر گھر سے ملتا ہے۔

اجیت سنگھ غم کے لونڈھے کی طرح وہیں پڑا تھا جہاں وہ گرا تھا۔ یہ فطرت ہیبت کا اثر تھا کہ وقتی طور پر ٹائیگر کے سوا ہر چیز مر گئی تھی کسی طرح اجیت سنگھ میں جان پڑی۔ وہ آنکھیں جھکائے اٹھا اور سامنے پڑی بگڑی کی جانب دیکھنے لگا جیسے ایسا ہیج ہو۔ اُس نے کانپتے ہوئے پگڑی اٹھائی، گھسیٹیں پر مجبور سی نگاہ کی اور باہر کی راہ لی۔ اُس کی حرکت سے ہر کوئی بے نیاز رہا لیکن ٹائیگر دم ہلاتا آگے بڑھا اور اُسے چاٹتا ہوا ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں سہمے سہمے اور کمزور کمزور صحن سے برآمدے اور برآمدے سے گلی میں اترے، داہنے مڑے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں نے بھینٹس کے پیچھے دیکھے ہوئے وہ خونخوار تماشا دیکھا اور چاہتے ہوئے کسی کی کوئی مدد نہ کر سکا بھابی کی گھٹی گھٹی چیخوں سے کمرے کے اندھیرے دہل رہے تھے اور ماں کے بیجانی بیٹوں سے باہر کے اُجالے۔ وہ اپنی بُری تقدیر کے ساتھ اُس ابھائی گھڑی کو بھی پیٹ رہی تھی جب اجیت سنگھ، دکان جلدی بند کر کے گھر چلا آیا تھا۔ اُس ویران شام کی کہانی لمبی ہو کر بھی چھوٹی ہے!

گھر کی فصاحت و جملہ اعضا کی طرح نلی نلی تھی۔ درو دیوار طوفان میں گھرے درختوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ میری نوح کی پستی اُس تاریک غار کی طرح تھی جس کی ابتدا ہو لیکن انتہا نہ ہو۔ کینوں کی حالت افسوس ناک سے زیادہ عبرت خیز تھی۔ بھائیاجی کے باولے پن سے بوکھلا کر مویشی جگالی کرنا بھول گئے تھے اور میری پرہیزگار پختہ پختہ ڈر کر چپ سادھ لئے تھے جیسے کسی مال اندیشی سے خوف زدہ ہوں۔ ماں کے بین، درو دیوار سے ٹکرا کر ایسے لوٹ رہے تھے جیسے وہ اُن کی شدت کو جذب نہ کر پار ہے ہو وہ خاموش ہوئی تو گھر میں بے چین سناٹا تھا جس کی دہشت انگیزی، شور و فغاں سے زیادہ ہولناک تھی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، وہیں بیٹھی تھی، سہمی سہمی، سُکڑی سُکڑی، ڈری ڈری۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے بوجھ کے ساتھ ہزاروں نادیہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہے لیکن کسی اندرونی شکتی سے خود کو ٹوٹنے سے بچائے ہوئے ہے۔

آدھ بھائیاجی، صحن کے درمیان کھڑے ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی انسان نما ٹھنڈھ نہ زمین میں سے اُگ آیا ہو اور اپنے بے حس وجود پر نازاں ہر نازک شے کو حقارت سے دیکھ رہا ہو۔

آدھ صبح بے کوری بے نور تھی! خانہ داری کے سارے حیات پر درمغول ہو لہان پڑے تھے۔

بھینٹس دودھ دینے کے لئے بیتاب زمین دل رہی تھی۔ بھوکے بیل دروازے کی طرف منہ اٹھائے دیکھ رہے تھے۔ صحن کوڑے کرکٹ اور روندے ہوئے گوبرے آٹا پڑا تھا، چوہا ٹھنڈا تھا اور دھیرا (وہ برتن جس میں دی جلیا

جاتا ہے) پیسہ بھی سے بندھا تھا۔ میں بھوکے پیٹ سکول روانہ ہوا تو میری آنٹریاں موت کو پکار رہی تھیں۔  
 مائیکر گھر میں تھا لیکن اجیت سنگھ کا مطلق آنا پتا نہیں تھا۔

افسوس، ہزار افسوس! وہ بربادی ہمارے غم کی حد تھی۔ بے رحم وقت کے ترکش میں ٹھیک تیرا در بھی  
 تھے، صرف ہمارے ہی رنجوں کو اُن کی فُلاکت کا اندازہ نہ تھا۔

سب نے اُنڈھیرے کے کپڑے کی طرح اُجالے کا منہ دیکھنا چھوڑ دیا۔ اُس کا باغ و بہار چہرہ، اُنسوؤں  
 سے مڑھا گیا جیسے آبِ زندہ سبزہ۔ بڑا سانحہ یہ ہوا کہ وہ خود کو اُس بدبختی کی بنیاد سمجھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں نے پانی  
 کی مہین سی چادر اور ڈھلی، وہ دیکھتی تو اُسی چادر کے پیچھے سے جھانکتی لگتی۔ اُس نے نہانا، کپڑے بدلنا اور کنکھی پٹی کرنا  
 چھوڑ دیا۔ اُس کے کالے گھنے ریشم سے بال، کھردری جٹاؤں سے ہو گئے۔ وہ بات کرتی آہ بھرتی لگتی، سُست سُست  
 چلتی جیسے بوڑھی ہو گئی ہو۔ ماں کی کوئی دلِ ربائی اور خاطر داری کام نہ آئی۔ بھابی اپنی زندگی، بیوہ کی طرح گزارنے لگی۔  
 ماں کی اپنی حالت غیر طبعی تھی۔ وہ کئی بار کام کرتی کرتی رک جاتی اور اُسے غیر مانوس نظروں سے گھورتی۔  
 وہ چلتی پڑھتی تھی، مجھے بے اعتبار سی لگی۔ میں نے اُس کی آنسو بھری اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں دیکھا، اُسے ہلایا اور  
 تشویش سے کانپتی ہوئی آوازیں پوچھا، ”ماں! ماں! تم ٹھیک ہو!“

میرے سنبھالتے سنبھالتے، وہ اُس طرف گر گئی جدھر تھوڑی بھکی ہوئی تھی۔ اُس کے دنیادی رنجِ روحانی  
 عذاب بن گئے۔ ہماری خوشیوں کے پھول کھلتے ہی مڑھ گئے۔ میری ماں بھایا جی سے اجیت سنگھ کے بارے میں  
 پوچھتی۔ وہ اُس کی پوری بات سُننے بغیر کہتے، ”وہ کوئی لڑکی ہے جس کا تجھے راسا چڑھا ہوا ہے! جہاں ہوگا ٹھیک ہوگا“  
 کوئی اور بھایا جی سے اجیت سنگھ کے بارے میں پوچھنے کی ہمت کرتا تو وہ پوری بے حسی سے کہتے،  
 ”جب تک اُس کے مرنے کی خبر نہ آئے، وہ زندہ ہے!“ بھایا جی زور زور سے زین پر پاؤں مارتے اور بے حس میٹھن  
 سے کہتے، ”ارے وہ جائے گا کہاں! اُس کی جڑیں یہاں ہیں! یہاں! یہاں! یہاں!!“

بوٹا سنگھ کو دیکھنے سے لگتا تھا کہ تاریخی کہانیوں کا کوئی سفید ریش درویش، تاریخ کے اوراق سے نئی دنیا  
 کا نظارہ کرنے کے لئے نکل آیا ہے۔ فرق اتنا تھا کہ اُس کے بدن پر چولا، پادوں میں کھڑاؤں، بغل میں بیراگا اور ہاتھ میں  
 تسبیح نہ تھی۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ جاتا اور اونچی آوازیں بھایا جی سے پوچھتا، ”تن رسیاں! بیٹے کی خبر  
 سارلی ہے کیا؟“

ہر نقطہ نشان امتیاز ہے اور اپنی جگہ نیک علامت لیکن یہ جس نیت سے برتا جائے اُسی حقیقت کی  
 ترجمانی کرتا ہے۔

”بوٹا سیاس! خبر سار کیا کرنی ہے؟ پانچ ہیں! ایک مڑ بھی گیا تو کیا فرق پڑے گا؟“

بھائیاجی کا بے جس انداز اس بات کی گواہی دیتا کہ وہ گھر کے پشتوں یا پکشیوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

”ارے بہو کا کیا ہوگا؟!“

”بڑا سنگھ بظاہر محرم کی طرح دل کو موسساتا لیکن اُس کا ارادہ اور ہوتا۔“

”اُس کا کیا ہوگا؟ اُس پر چھوٹا چادر ڈال لے گا!“

بھائیاجی اس اطمینان سے کہتے جیسے اُن کی بہو، منقولہ جاناوتھی جسے وہ کسی کو بھی سوچ سکتے تھے۔  
”یہ ہے مردوں والی بات! یہ ہے مردوں والی بات!!“

بڑا سنگھ، اُن کی بے دردی کو سراہتا ہوا چھت سے نیچے اُتر جاتا۔ بھائیاجی اپنے آپ کو ایسے دیکھتے جیسے کوئی کتا اپنے بہتے ہوئے زخم کو دیکھتا ہے اور اُسے چاٹ کر غمخس کرنا ہے کہ وہ، اُس کی لذت دہن کا وسیلہ ہے۔  
مظلوم آدمے کس بھابی ایسے روح فرسا جملے سُن کر کلیجہ پکٹتی، گرتی اور پچھاڑیں کھاتی۔ اُس کے منہ سے جھاگ سی بہنے لگی اور وہ یوں تڑپتی جیسے کوئی شکار، شکاری کا تیر کھا کر تڑپتا ہے۔

آدھر پھر بھابی کو متنی ہونے لگی۔ ماں نے اُس کے حایل ہونے کی تعذیب کر دی اور اُس کے میکے سندھیا بھیج دیا۔ اُس کا بھائی اُسے لینے آیا اور وہ دونوں مال کے رستے گھر گئے۔ بھائیاجی سُنان مال میں ایک لکڑی پر بیٹھے تھے جیسے دیرانے میں اُلو۔ بھابی شلوار کے اوپر لہنگا پہنے اور گھونٹ کاڑھے جلدی سے لٹی اور اُن کو ماتھا ٹیک کر چلی گئی۔ عداوت پسند انسان کے لئے محبت ایسے ہے جیسے گتے کے لئے خوشبو۔ بھائیاجی اُسے دیکھ کر گھبراہٹ سے تملائے اور بڑبڑا کر اُٹھے جیسے اُس پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ یں پاس ہی کھڑا تھا، اُن کی آدم شکار فطرت پر کسمسا کر رہ گیا۔ اُن کی اذیت خواہی، اذیت ایجادی تھی۔ میرے پیٹ میں سے غم کا غبار اُٹھا اور دل سے نکلا کر طوفان بن گیا۔  
اُس کی تندی جانے مجھے کہاں اڑا کر اُتی اگر بھابی میرا بازو تھام کر مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔ اُس کا نفیس لہجہ حیرانی سے زیادہ میری پریشانی کا باعث تھا۔ میں نے زخم کی طرح چیخ کر کہا، ”بھابی! آپ یہاں کیوں آئی تھیں؟ اس پانی کے پاؤں چھوئے بغیر آپ میکے چلی جاتیں تو کیا آسمان ٹوٹ پڑتا؟“

میری بات اُس کی دکھتی ہوئی رگ کو چھو گئی اور وہ مجھ سے پیٹ کر رونے لگی۔ میں بھی رونے لگا۔ ہم دیر تک روتے رہے۔ اُس کی راہ کھوٹی ہونے لگی تو اُس کے بھائی نے ہمیں دلاسا دیا اور ایک دوسرے سے جدا کیا۔ وہ خود غم گرفتار تھا۔ بھائی نے دوپٹے سے پہلے میرے اُنسو پونچھے، پھر اپنے آدے سے ہونے رک رک کر بولی،  
”کون جانے! میں ٹوٹ کر آؤں، نہ آؤں! میں بد اخلاقی کیوں کر دوں؟ میں نے ....“

میں اُس کے غم انگیز جذبات و آداب کی تاب نہ لاسکا۔ وہ کچھ اور بھی کہتی اگر میں، اُس کے منہ پر ہاتھ



نہ رکھ دیتا۔ میرے روکنے سے وہ بے قابو ہو گئی جیسے دل کا ابال نہ نکلنے سے ہوتا ہے۔ اُس سے متاثر ہو کر میں پھر بے قابو ہو گیا۔ ہم سیلاب زدہ کناروں کی طرح تھے جو طغیانی ہی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور دیرانی میں جدا ہو جاتے ہیں، جدائی کے صدمے میں ایک دوسرے کو حسرت سے تکتے ہیں اور اُس طوفان کا انتظار کرتے ہیں جو اُن کے وصال کا وسیلہ ہو تھا۔ بھابی چارونا چار چلی گئی۔ وہ اُنکے چلتی چلتی پیچھے مڑ کر دیکھتی جیسے واپس آنا چاہتی تھی۔ میں وہیں کھڑا رہا، کمزور کمزور اُداس اُداس۔ اُس کا سراپا چھوٹے سے چھوٹا اور مذہم سے مذہم ہونے لگا اور ہوتے ہوتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا گویا ایک سلسلہ ٹوٹ گیا۔

میں ڈانوں ڈول حالت میں اپنی راہ نہ پار رہا تھا کہ بھایا جی ٹال سے باہر نکلے۔ وہ مجھے دیکھتے دیکھتے گھورنے لگے جیسے میرے وہاں کھڑے رہنے کا سبب پوچھنے لگے۔ اُن کی نظروں کی گرفت! میں اُدھر کھینچنے لگا۔ اجیت سنگھ ہی جانے! وہ اُس گرفت سے کیسے آزاد ہوا تھا؟

کہاوت ہے، ”روتے گئے موئے کی خبر لائے۔“  
میری بھابی اس کہاوت اور اپنی بات پر کھری اُتری۔ وہ واقعی لوٹ کر نہ آئی اور اپنے بچے کے ساتھ زنجی میں مر گئی۔

## باب ۱۷

خدا کیسا، کہاں کا دیرو کعبہ!

(شاہر)

یہ آدم ہی نے سب فتنے جگائے

اُدھر ماتموں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی بند ہو گیا۔ بھایا جی بھابی کے گریا کرم پر نلو اُگئے اور سمدھی سے صاف لفظوں میں کہہ آئے، ”اور آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے!“

اجیت سنگھ کی جڑیں، عین اُنقین رتن سنگھ کے گھر میں تھیں۔ وہ مرا بھی نہ تھا اور اپنی بیوی کے مرنے پر زندہ لوٹ بھی آیا تھا۔ اُسے ممنوم دیکھ کر بھایا جی اُسے پرسا دیتے، ”کام وہیں کا سوا بدلتا رہے تو خوشی کی بات ہے! تو کم بخت کس لئے رنجیدہ ہے؟“

دھارمک اصولوں کی بنیاد پر اپنی بیوی کی آگنی کریا کر کے، کپال کر یا، اجیت سنگھ ہی نے کی تھی۔ وہ اُس کے پسینے میں آتی اور اُس سے کہتی، ”میں مری نہیں تھی تو نے مجھے زندہ چلایا ہے!“

اجیت سنگھ بیمار بیمار رہتا، خواب میں ڈرتا، اور چیختا ہوا اُٹھ کر بھاگتا۔ بڑی بوڑھیاں کہتیں، ”منحوس چلے میں مری ہے اور جڑیل کی جُون پڑی ہے۔ میلو! ننٹے چمار سے گھر کیلو۔“

تایا جی ایسی خرافات کہنے والوں کو سمجھاتے، ”ہر حادثے کا نفسیاتی ردِ عمل ہوتا ہے جو مٹتے مٹتے ہی مٹتا ہے۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا، اسے اس کے حال پر رہنے دو اور کام میں دل لگانے دو۔“  
زندوں کی نسبت مردوں سے مصالحت آسان ہے۔ کہیں بھابی کا ذکر آتا تو اُسے مُرگ باسی کے نام سے یاد کیا جاتا اور احترام سے اُس کی ہڈیوں کو پھول کہا جاتا، جنہیں گنگا میں بہایا گیا تھا۔

## باب ۱۸

ہجومِ شوق کے پردے سے شاطر  
کوئی کیسے حقیقت دیکھ پائے  
(شاطر)

میری زندگی میں کسی ایسے آدمی کو دخل نہیں ہے جسے اہلِ علم و فن جانتے ہوں، میں اُن لوگوں کے ساتھ بڑا ہوا جن میں سے کئی گاؤں کی حدود کے باہر اجنبی تھے۔ وہ لوگ جیسے بھی تھے، میرے شب و روز کا اس قدر اہم حصہ تھے کہ اُن سے دور رہنا، سانس روکنے کے برابر ہے۔  
جھیروں کے گھر میں بھیانک غریبی تھی۔ وہ ابالا سالا کھاتے تھے اس کے باوجود ہٹے کٹے تھے۔ میں بکڑے بچوں پر رشک کرتا تھا اور اُن کی طاقت کا راز جاننے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ اُن کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے میں نے رام کرشن سے پوچھا، ”تو کیا کھاتا ہے؟ جو اتنا موٹا تازہ ہے!“  
”مرد مکھن!“ اُس نے بے ساختہ کہا اور اپنی پھٹی ہوئی آستیں میں سے ڈولا پھلا کر دکھایا، ”ادھر دیکھ! مرد مکھن کا اثر۔“

مینڈک کے غددوں جیسے پھولے ڈولے دیکھ کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ بھاگا بھاگا ماں کے پاس گیا اور اُس سے شکوہ کیا، ”ماں ماں! میں اس لئے تکرانا نہیں ہوتا کہ تم مجھے کھانے میں مرد مکھن نہیں دیتیں!“  
”کس نے کہا تجھ سے؟“ ماں نے پچکار کر پوچھا۔  
”رام کرشن نے“ میری معصومیت! میں نے جھٹ بتا دیا۔

”کہاں ہے وہ؟“

”باہر گلی میں“

میری جان بچ گئی اور رام کرشن کی شکجی میں اگئی۔ ماں نے پوچھنا چھ کسے بغیر اُس کے ترانہ تھپتھر بڑے دیے اور چیخ کر کہا، ”پھر بچوں کو خرافات سکھانا، تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی!“

دیسراج، رام کرشن کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ جو کچھ تھا آزاد مر د تھا اور مجھ سے تین چار سال بڑا تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا،

ناک میں نتھ نہ پیر میں پگلا

سب سے بھلا کھار کا گدھا

وہ کسی رستے جوگی کے ساتھ نکل جاتا اور مہینوں لوٹ کر نہ آتا۔ میں اُس کے بے ضابطہ چلن کا مذاق تھا۔ اُس کے کردار کی دلکشی اُس کی انوکھی باتیں تھیں جنہیں وہ پوری سنجیدگی سے سناتا تھا۔ اُس نے مجھے بہادر بننے کا نسخہ بتایا، ”تو کسی بچے کو مار کر اُس کا خون پی لے اور کلیجہ کھا لے، تجھ میں دس آدمیوں کا بل آجائے گا!“

”تُو نے ایسا کیا ہے؟“ میں نے کچھ ڈر کر اور کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا ہے!“ اُس نے دھڑتے سے کہا۔

”کہاں! کس کو مارا تھا؟“ میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔

”جائیدھر کے پاس ایک گاؤں میں پانچ سال کے بچے کو مار کر اُس کا خون پیاتھا اور کلیجہ کھایا تھا۔“

اُس نے کچھ بے ہوشی سے کہا۔ ”جیسے اپنے خیال میں اُس دیرینہ عمل کو تازہ کر رہا ہو۔“

”کسی کو جان سے مارنا اتنا آسان ہے؟“ میں نے ڈر کر پوچھا۔

”بالکل آسان ہے!“ اُس نے لاپرواہی سے کہا جیسے کسی کو جان سے مارنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔

”کیسے؟“ اُس کے نڈر رویے سے میری دہشت، حیرت میں بدل گئی۔

”تو کسی چھوٹے بچے کو ہلا چھلا کر جنگل میں لے جا اور وہاں اُسے چھرا گھونپ دے۔“ اُس نے اپنا ہاتھ آگے

بچھے ہلا کر کہا۔ ”زبان اندر باہر نکالی جیسے زبان سے پانی والا جانور، پانی پیتے وقت کرتا ہے۔ میں اُس کے مظاہرے سے

بہت مرعوب ہوا اور اُسے دیکھتا رہ گیا مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اُس نے بڑے فخر سے کہا۔ ”جمعی تو میرا کلیجہ اتنا بڑا ہے!“

وہ بیٹھے بیٹھے اٹھا اور پورے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا جیسے اُس کا کلیجہ اُس کے سینے سے کئی گنا بڑا تھا۔

”میں جہاں چاہوں، جس وقت چاہوں جا سکتا ہوں۔ تُو ایسا کر سکتا ہے؟“

اُس نے سانس روک کر سینے پر زور سے منکا مارا جس سے دھماکا ہوا جو دُور تک سنائی پڑا۔

اُس کا کلیجہ واقعی بڑا تھا! وہ جب چاہتا، جدھر چاہتا چلا جاتا اور کوئی اُسے روکنے کی جرات نہ کرتا۔ اُس کی

آواز دھوی ہی اُس کی بڑائی تھی۔ وہ جتنے دن گاؤں میں رہتا اپنی روٹی آپ کماتا، منڈی میں بوجھ دھووتا، قفل لگاتا، بھری

بیچتا، برتن مانجھتا.... کھیتوں میں کام کرتا۔ وہ جو کام کرتا اُس کی زبان بولتا اور اُس پیشے میں پُرانا گھاگ لگتا۔

”مجھے خبر ہے؟ بھان سنگھ کا کلیجہ میرے کلیجے سے سو درجہ بڑا تھا۔“

اُس کے لب و لہجے کا انداز، چشم دید گواہ کی طرح تھا۔ درِ اہل وہ جو بات کرتا تھا اُس کی سچائی کی ضامنی بھرتا تھا اور اُس کے چلن سے لگتا تھا کہ وہ پہنچ بولتا ہے۔

بھان بنگھ مشہور ڈاکو تھا جس کے معرکوں کے منظوم قصے میلوں اور چوپالوں میں گائے جاتے تھے۔ وہ تین منزلی مکان کی بلائی منزل میں تھا کہ اُسے پولیس نے گھیر لیا۔ پولیس سیر بھی کے راستے اوپر چڑھی اور وہ پیر بھی پر بیٹھ کر نیچے کود گیا۔ پیر بھی ٹوٹ گئی لیکن اُسے اپنچ نہ آئی اور وہ کلکاریاں مارتا ہوا پولیس کے سامنے فرار ہو گیا۔

”واہ! کیا آدمی تھا وہ! اتنا دلیر اور نڈر! میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا لیکن اُس کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ”تایا جی کہتے ہیں کہ آدمی جو بنتا ہے، اپنے دماغ سے بنتا ہے، نہ کہ اعضا سے!“

”آدمی اپنے دماغ سے کچھ بھی بنے لیکن دلیر اور نڈر کیلئے ہی سے بنتا ہے! اور کلیجہ اُسی کا بڑھتا ہے جو بچپن ہی سے ماردھاڑ اور خون خرابا کرنا سیکھتا ہے۔“ اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

وہ کہتا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑا کلیجہ بھان کا ہوتا ہے اور سینے میں اس پاسب سے اُس پاسے تک پھیلا ہوتا ہے۔ وہ مومیائی کھاتے ہیں جس سے کلیجہ بڑھتا ہے۔ وہ مومیائی بنانے کا طریقہ بتاتا تھا جو کس قدر بھیانک ہے! پٹھان غیو پٹھان کو اٹھا کر لے جاتے ہیں، اُس کا سر ٹوند کر اُسے گرم تیل کی کڑاہی پر اٹا لٹکاتے ہیں اور کھوپڑی پر استرے سے پچھنے لگاتے ہیں۔ اُن میں سے جو خون گرتا ہے وہ تیل میں پک کر مومیائی بنتا ہے۔

سویگ سنگھ بڑھنے لکھنے میں ایسا دوسرا ہی تھا۔ میں اُس کے بعد سکول میں داخل ہوا اور اُس کے آگے نکل گیا۔ وہ اکثر فیل ہوتا، اُس کا باپ لال سنگھ مجھ سے کہتا، ”میرے بیٹے کی نقل مارنے والے پاس ہو جاتے ہیں اور میرا لال فیل!“

وہ اپنے طور پر سویگ کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ نالائق ہے لیکن دوسروں کے سامنے اُس کی بڑائی ہی کرتا تھا۔ وہ اُسے مبالغہ آمیز طریقے سے سراہا کرتا تھا۔ ”سویگ کے استاد اُس کی قابلیت کو نہیں پہنچ پاتے ہیں اس لئے اُسے فیل کر دیتے ہیں۔“

لال سنگھ میری کامیابی پر بے سرفہ کرتا، ”تو نے پڑھ کر جو اٹھا ڈنابا ہے، مجھے معلوم ہے! بڑھی کیا اور بڑھائی کیا! پڑھنا لکھنا برہمنوں اور کھتریوں کا کام ہے۔“

میں کئی بار چاہتا کہ اُس سے پوچھوں کہ تو اپنے لڑکے کو کیوں پڑھاتا ہے؟ لیکن پوچھ نہ سکتا۔ ”سویگ سنگھ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا، جس کی وجہ عجیب ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میرا باپ چوری کا دھن لاتا ہے جسے کھا کر میری بدھی بھر شٹ ہو گئی ہے۔“

دیسراج اور سویگ سنگھ اور میں دوست تھے اور آپس میں کیسے کیسے رازوں میں شریک تھے!

بیلارام مرگیا، لٹو کا اور دیسراج اُسے نہلانے گئے۔ دیسراج اُسے نہلا کر واپس آیا اور راز دارانہ لہجے میں بولا، "بیلارام کی رُوح نرک میں گئی ہے!"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟ سوگ نے متجسس انداز میں پوچھا۔

"اُس کی رُوح، پوتروں میں سے نکلی ہے! اُس نے ایسے یقین سے کہا جیسے اُس نے رُوح کو وہاں سے نکلے دیکھا ہو۔

"رُوح نے وہاں کوئی نشانی چھوڑی تھی؟" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سوگ نے جلدی سے پوچھا۔

"اُس کی ٹہنی نکلی ہوئی تھی! دیسراج اُسی ڈٹوک سے بولا۔

میں یہ بات کئی بار سُن چکا تھا کہ مائس کے شہر میں نو اندریاں ہیں اور دسواں ڈار۔ جو آتما دسواں ڈار کھول کر شہر سے نکلتی ہے وہی پر ماتما سے ملتی ہے اور ممکتی پاتی ہے۔ لوگ کتھاؤں میں ایسے کئی کہان پرشوں کی کہانیاں تھیں جن کی آتما کو پر ماتما لینے آیا تھا، سُرگ میں دُکھے بچے تھے اور دھرتی پر سُنائی دیئے تھے۔

"مگر تایاجی تو کہتے ہیں کہ رُوح نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے!" میں نے اُس کی بات کو کاٹا۔

"تیرے تایا نے کون سا شاستر لکھا ہے؟ یہ شاستروں کی بات ہے۔ اگر آتما نہیں تو پر ماتما بھی نہیں اور پر ماتما نہیں تو کچھ بھی نہیں! یہ سرشٹی کس کے سہارے کھڑی ہے؟

"تایاجی کہتے ہیں، اپنے سہارے کھڑی ہے، جیسے ہم کھڑے ہیں۔"

"تیرے تایا کو کیا معلوم ہے؟ وہ معلوم بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا، شاستر، ساوہوؤں، سنتوں یا برہمنوں ہی کی سمجھ میں آتے ہیں۔ شور و پڑھ سکتے ہیں، سمجھ نہیں سکتے۔ انہیں برہما کا سراپ ہے، چلو سنت سے پوچھ لو!"

تایاجی کے بارے میں ایسی باتیں مجھے بُری لگتی تھیں لیکن میں انہیں برداشت کر لیتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ تایاجی کی وجہ دھارا سے جدا گاہ تھیں، اس لئے کہ پتھر، میز تھیں، ہم تینوں سنت گرجن سنگھ کے پاس گئے۔

عام ہشواش تھا کہ اُسے شاستروں پر عبور حاصل ہے۔ اُس نے دیسراج ہی کی بات کو سچ ٹھہرایا اور یہ بھی کہا کہ جو مائس بھگوان کو زمانے وہ ناسک ہے اور نرک کا آدھیکاری ہے۔ اُس نے ہرناکشک، جبرا سندھ، راقن کی مثال دی جو بھگوان کے بھگت تھے لیکن نرک میں پڑے تھے کیوں کہ وہ اپنے گیان پر گھنڈ کرنے لگے تھے اور برہما کے لکھے ویدوں میں مین میخ نکالنے لگے تھے۔

میں نے سنت سے پوچھا، "جب آدمی کے مرتے ہی اُس کی رُوح کو کرموں کے سُننے پر جنت یا دوزخ میں ڈال دیا جاتا ہے تو لوگ اُس کی ممکتی کے لئے پوچھا پاٹھ کیوں کر داتے ہیں؟"

پر ماتا چاہے تو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔ بگیر تھ کی سات نرک میں پڑی تھیں اور پھر بگیر تھ کی بھگتی سے اُن کی مکتی ہوئی تھی۔

سنت نے وہی بات کہی جسے میں کئی بار سن چکا تھا۔ بگیر تھ، پرلاو، دھروو۔۔۔۔۔ اور کیتوں کے بارے میں ایسی کہانیاں تھیں، جن کی سچائی اتنی تھی کہ کہنے والے کی بات پر یقین کرو، شک کرو تو نرک میں پڑو۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہ کرتا تھا لیکن خدا کے تعلق سے میرے دل میں خوف بیٹھا ہوا تھا، اس لئے میں اُس کے دُجو دے منحرف نہ تھا۔

گرچرن سنگھ پر چار کیا کرتا تھا کہ ماس اپنی نو اندریوں جیسے دو آنکھوں، دو کانوں، دو متھنوں، ایک منہ ایک موتی اور ایک گہنی کی وجہ سے ذلیل ہے۔ جسے اندریوں پر اختیار ہے وہ اوتار ہے۔ اوتاروں کے بارے میں ایسی کئی کہانیاں گردش میں تھیں کہ اُن کی گندگی اُس بھوئن سے اچھی تھی اور پر اعجاز بھی، جو عام انسان کھاتا ہے۔ پورے گاؤں میں سنت گرچرن سنگھ ہی سنوارا تھا۔ وہ ہاتھ میں سمرنی رکھتا تھا، گھٹ گھٹ رام نام جپتا تھا اور یہی دھرم کے عین مطابق تھا۔ سنا ستر کہتے ہیں کہ جیسے تَن کے لئے صابن ہے، مَن کے لئے رام نام ہے، اپنے مَن کی طرح وہ تَن کو اجلا رکھنے کے لئے ہزار جتن کرتا تھا لیکن اُس کی بد صورتی بدستور تھی۔ اُس کے متھنوں کے زاویے، جو عام طور پر کانوں کی طرف ہوتے ہیں، آنکھوں کی طرف تھے، اس لئے بانسے پر اُگے بال، مڈی کی مونچھوں کی طرح نظر آتے تھے۔ کانوں کے سپوں پر کالی پھپھوندی جھی ہوئی تھی۔ ابروؤں کے بال، اُن کانٹوں سے مشتابہ تھے جن کے منہ ہر طرف ہوں۔ وہ بالوں کو مقدس مانتا، غیر ضروری بالوں کی تراش خراش سے پرہیز کرتا، اور انہیں رومال سے چھوٹا تھا۔ وہ نگھا کرتا اور جتنے بال بھڑتے انہیں اٹھا کر کے اُگ میں جلاتا۔ وہ سمجھتا کہ بالوں کو زمین پر پھینکا اُن کی بے عزتی کرنا ہے۔ کوئی کام نہ دھام، وہ رام نام نہ جپ رہا ہوتا تو کوئی انگ سنوارا رہا ہوتا۔ وہ گھڑاؤں پہنتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھ کو تاپہنے سے پاؤں کی پوتنا بھنگ ہوتی ہے کیونکہ پاؤں کا رشتہ سیدھا دسویں دُار سے ہے۔ اُس کا غسل کرنا اور کپڑے بدلنا ایک بالترتیب طریقِ عمل تھا جس سے چونکہ وہ گناہ سمجھتا تھا۔ وہ ناک میں پانی چڑھا چڑھا کر بار بار نذر نور سے سیکتا اور کراہت آمیز آوازیں نکالتا۔ وہ دانتوں پر انگلی پھیر کر کُلی کرتا اور پھر گلے میں پانی لے کر غرارہ۔ وہ پیٹ پر دباؤ دے کر گلا صاف کرتا تو گلتا کہ حلق میں پھنسے ڈاٹ کو نکال رہا ہے۔ وہ کپڑے کو صابن لگا کر اُس سے گھائیوں، گوروں اور ناخنوں کو ایک ایک کر کے رگڑتا۔ کٹوں پر غسل خانہ نہیں تھا اس لئے اُس کی ہر حرکت دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ بدن پر پانی نہ دیتا، ڈول نیچے رکھتا، پھرتی سے کاپھے میں ہاتھ گھساتا، ستروں کو اوپر نیچے ملتا اور کئی بار لگتا جیسے اُس کا ہاتھ کسی چیز میں اٹک گیا ہو۔ اُس کے کاپھا بدلنے کا طریقہ نیا تھا۔ وہ گیلے کاپھے کو جانگھوں اور کولھوں پر دبا دبا کر بخورتا اور اُس کے اوپر سے سوکھا کاپھا چڑھا لیتا۔ وہ جھکتا، اٹھتا، بل کھاتا، سیدھا ہوتا خاص قسم کی ورزش

کرتا تھا، جیسے تیسے گیلے کا چھکے کا ایک پائینچہ ٹانگ میں سے نکالتا اور پھر دوسرا۔ اُس کھینچا تانی میں اُس کا سُکھا کاچھا تقریباً بیگ جاتا لیکن وہ کرتا دُہی جو اُسے کرنا ہوتا۔ وہ چاہتا تو کمر کے گرد تولیا باندھ کر گیلا کاچھا اتار سکتا تھا اور ستروں کو سُکھا کر دوسرا کاچھا پہن سکتا تھا لیکن اُس کے نزدیک وہ ادھر م تھا۔ وہ کسی پیتا، جس کا پھوک مٹھوں میں پھنس جاتا جسے نکالنے کے لئے وہ منہ سے سانس پھونکتا اور مٹھوں کو ملاتا، اُس وقت وہ منہ کے آگے کپڑا رکھتا تو پھوک اُڑ کر دوسرے پر گرتا۔ وہ پاخانہ پھر کرام دیہاتیوں کی طرح گنسر گھسنی نہ کرتا بلکہ وہیں ہاتھ دھو کر پاک ہوتا اور خود کو ایسے لوگوں سے برتر سمجھتا۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس کا پادریکل جائے تو وہ آشنان کر کے کپڑے بدلتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک دُہی تھا جس نے امرت چھکا ہوا تھا۔ وہ اپنی مادی ضرورتوں کے لئے جن کا محتاج تھا، انہیں روحانی اعتبار سے دلیل سمجھتا تھا۔ وہ تایاجی کے سامنے دہقانوں اور اُن کے رہن سہن پر طعن کرتا، وہ اُس سے کہتے۔ ”گرچن ریا! تم اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہو اور دوسروں کو ناپاک، لیکن اُن کا بیدار کیا ہو اُکھا ہے، پہنتے ہو! کیا جسمِ روح سے الگ ہے؟ انسانی زندگی کی سچائی فقط عمل سے ہے کیوں کہ عمل، ناپاک شے کو پاک بنانے کا اسلوب ہے۔ بے عمل زندگی کیسی بھی ہو، ناپاک ہوتی ہے اور اوصوری بھی، جیسے تمہاری!“

تایاجی کی باتوں کا اُس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”تم سناری لوگ گیان دھیان کی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے اس لئے اس موضوع پر بات نہ کیا کرو۔“

روح میرے لئے ایک ممتہ تھا جس کا میں چاہتا تھا۔ میں تایاجی سے پوچھتا، وہ روح کی تشریح جس طرح کرتے وہ سمجھنے میں آسان ہے لیکن شاستروں کے برعکس ہے۔ وہ کہتے تھے، ”اُنکھوں کی روح، قوتِ باہر ہے، کانوں کی قوتِ سماع، دماغ کی قوتِ حافظہ، پیٹ کی قوتِ ہاضمہ، ہاتھوں کی قوتِ تخلیق..... ٹانگوں کی قوتِ رفتار“ وہ روح کے بارے میں یہ کہتے تھے اور کبھی وہ۔ وہ کہتے تھے کہ بے جان چیزوں میں بھی روح ہے۔ درانی کی روح اُس کے دانتوں میں ہے اور تیشے کی اُس کی دھار میں۔ روح کے بارے میں اُن کا مجموعی تاثر، فہمِ فطرت سے شروع ہو کر تسخیرِ فطرت پر ختم ہوتا تھا۔ ”ادھی میں کی رُوحیں ہیں جو ہم آہنگ ہوں تو قوتِ تخلیق بنتی ہیں۔ جس ہنرور کی قوتِ تخلیق اچھوتی ہے، اُس کی روح اعلیٰ تر ہے۔“

تایاجی کی باتیں تسخیرِ خیز اور خیال آرا تھیں لیکن اُن کی ابتداء انتہا خود آکا ہی پر موقوف تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اعلیٰ علم و ہنر، کتابوں سے باہر انسان کے دماغ میں پوشیدہ ہے۔

مجھے مافوقِ الفطرت باتیں زیادہ مرغوب کرتی تھیں کیوں کہ وہ حاصلِ مقصود تک پہنچنے کا آسان طریقہ بتاتی تھیں۔ میں دھار مک کتھاؤں کے کرداروں کی طرح اڑنا چاہتا تھا، مجھ سے کرنا چاہتا تھا، ایسے کام کرنے چاہتا تھا جو

صرف دیوتاؤں ہی کی مہمت تھی۔

میں رُوح کو دھرم کے طریقے سے سمجھنا چاہتا تھا، ممکن ہوتا تو دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم نے بکڈم لڑائی کر اگریم راج کو جہنم تک نہ پہنچنے دیا جائے تو جہنم مرنہیں سکتا۔ اس خیال کی سچائی آزمانے کے لئے میں نے لکڑی کا ڈبّا بنایا اور اُس کا ایک پاسا کھلا رکھا، ہم نے پہلے کانٹے سے پھٹی پکڑی مگر ڈبے میں منتقل کرتے کرتے وہ نچھو ہو گئی، لیکن پھر کپڑے سے کئی پھیلیاں پکڑیں، ان میں سے ایک ڈبے میں ڈالی اور کھلے پاسے کو کیلوں سے بند کر دیا۔ یہ دیکھنے کے لئے ڈبّا مہر بند ہے کہ نہیں، ہم نے ڈبے کو اینٹ باندھ کر پانی کی تہ میں رکھ دیا، دوسرے دن اُسی وقت کھولا اور پھٹی کو مڑا ہوا پایا۔ میں نے تایا جی سے اپنا تجربہ بیان کیا، انہوں نے مسکاکر کہا، ”پچھلی کی رُوح، پانی ہے جیسے آدمی کی رُوح کہو۔“ نہ پچھلی، پانی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے اور نہ آدمی، ہوا کے۔“

اُوروہ جو کہتے ہیں کہ رشی مٹی یوگ ودیا سے سانس روک کر عمر کو ہزاروں سال بڑھایا کرتے تھے، کئی سنجیونی کھا کر اُمر ہو جاتے تھے، کیا وہ جھوٹ ہے؟ میں نے دریافت کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

”بالکل جھوٹ ہے!“ انہوں نے بالکل پر زور دے کر کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”سنجیونی ایک فرضی بڑی بوٹی کا نام ہے جیسے امرت! یہ سچ ہوتا تو دھرتی پر رشیوں، مٹیوں کے سوا کوئی دوسرا نظر نہ آتا اور عام آدمی کا جینا مشکل ہو جاتا۔ یوگ ودیا کوئی دیا نہیں، جہنم کو نروگ رکھنے کے لئے پر یوگ ہے۔ یوگ لا حاصل عمل ہے اور انسان کے زندہ رہنے کے لئے ناموزنوں ہے اسی لئے یوگی بھیک مانگتے پھرتے ہیں یا دان پُن پر جیتے ہیں۔ اُٹھلی یوگ کام ہے۔ کام، سیر حاصل ہے اور نیک عمل کا ضامن بھی!“

تایا جی ایک بات کو کئی کئی طریقوں سے بیان کرتے تھے اور دھرم کے بارے میں بالکل ارضی نظریہ رکھتے تھے،

کر سے کرت، کرت سے کرنا  
مَاس جاتی ایکو دھرم

(آدمی کے ہاتھ تقدیر تخلیق میں اس لئے آدمی اپنی تقدیر کا خالق آپ ہے۔

مَاس جات کا ایک ہی دھرم ہے اور وہ ہے کرَم)

انہیں اتنے شلوک یاد تھے کہ وہ اپنے خیال کی تائید کے لئے کئی کئی شلوک سنا سکتے تھے۔

دیسراج بھوتوں کو بس میں کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کی غریبی اڑے آرہی تھی۔ اُس کام کے لئے اُسے پانچ

بکڑے اور پانچ شراب کے پیپے درکار تھے۔ اس سے آگے کی تفصیل دل دہلا دینے والی ہے۔ شمشان گھاٹ میں اماؤں کی رات دیسراج کا اکیلے جانا، اپنے گلے میں مَاس کھوپڑیوں کی مالا پہننا اور کلمہ پڑھنا۔ گلے کے زور سے ٹوفانا



بادشاہ کا آنا، بھوتوں کا پرگٹ ہونا، اُس کا اپنے استھان پر ڈٹے رہنا، بھوتوں کا خوش ہو کر رند مانگنا، اُس کا بچنے کے زور سے سامنے پڑی رند کی کیل توڑنا، بھوتوں کا رند کھانے کی کرنا چنا اور اُسے وردان دینا۔

وہ جاڑے میں بندر کی طرح ٹھہرتا ہوا کس اُمید سے کہتا تھا، ”میں بھوتوں کو کس میں کروں تو ساری دنیا

کا بادشاہ بن جاؤں۔“

اُس کی باتوں سے متاثر ہو کر سوگ سنگھ اُس کا ہاتھ تھام کر التجا آمیز احترام سے کہتا، دیسراج، ”تم بادشاہ

بنو تو مجھے اپنا وزیر ضرور بنائیو! اپنے بچپن کے ساتھی کو بھول نہ جایو۔“

اُس کی بات سن کر دیسراج اُسے کسی کریم کی طرح دیکھتا اور پھر اُس سے ایسے بات کرتا جیسے کوئی کُیرا

اپنی لوٹ کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں مخصوص کرے۔

”دیسراج، تو رند خریدنے کے نااہل ہے لیکن جو خرید سکتے ہیں وہ بھوتوں کو کس میں کر کے بادشاہ کیوں نہیں

بن جاتے؟ میں زندگی کے نشیب و فراز کو اپنے طریقے سے سمجھنے کے لئے اُس سے سوال کرتا۔

”ایسا خطرناک کام کرنے کے لئے میرے جیسا تو صلہ چاہیے! ورنہ جان کا خطرہ ہے۔“

وہ تیز تیز قدموں سے ادھر ادھر چلتا، بدن جھٹکتا اور وقتی طور پر بھول جانا کو وہ سردی سے ٹھہر رہا ہے۔

نام دیو کے گھر کے مغرب میں پورن سنگھ کا ویران کھیت تھا جس میں سرسے اُونچا اور گھٹا جھار جھنکار

تھا۔ کہتے تھے کہ وہاں بھوتوں کا ڈیرا رہتا ہے۔ وہاں سے نام دیو کے گھر میں سیندھ لگی تھی جس سے وہ جگہ اور بھی ڈراؤنی

ہو گئی تھی۔ میں رات کو ادھر سے گزرتا تو اتنے راستے کو بھاگ کر پار کرتا۔ جاڑے میں دھونی جلانے کے لئے وہاں ایندھن

ہی ایندھن تھا جسے ہم تینوں ایک ساتھ یا اکیلے دیسراج اٹھا کر لاتا تھا۔ وہ وہاں جا کر آتا ہوا پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا اور ہم

پر رعب جھماتے ہوئے کہتا، ”پیچھے مڑ کر وہ دیکھتا ہے جوڑتا ہے۔ اور بھوت سے ڈرنا، مرنے ہے۔“

ہمارے گاؤں کے اطراف کتنے گڈریا پیر تھے جو پوجے جاتے تھے جیسے پیر پھلاہی، مقام، بکیر، ست

رکھا.... وغیرہ۔ دیسراج کا باپ جو گارام موٹھ چلانے میں نام رکھتا تھا۔ اُس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ اپنے دشمن

کی موٹھ سے مرا تھا۔ اُس کی اولاد میں سے جاگر رام نظر اُتارتا تھا اور چھلوری (اُنکلی بڑا) باندھتا تھا۔

بھوتوں کی باتیں سن کر گھر لوٹے ہوئے مجھے لگتا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ میں مڑتا، میرے ساتھ وہ چاب

بھی رک جاتی، بھاگتا تو میرے پیچھے بھاگتی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا لیکن بھوت کا خوف مجھے ایسا نہ دیتا۔ میں سر

سے پاؤں تک رضائی اور کھڑکھڑاتا، اس کے باوجود مجھے گھر کے اندر بھوتے نظر آتے۔ میں پاٹھ کرتا لیکن میرا خوف کم نہ

ہوتا۔ میں اُسی نفسیاتی کیفیت میں سوتا۔ نیند میں میرا دم گھٹتا اور میں چلاؤں۔ جو کوئی میرا شور سننا وہ مجھے جھنجھوڑ کر جگاتا

اور مشورہ دیتا، ”بھگوان کا نام لے، تجھ پر بھوت پریت کا سایہ ہے!“ میں بھگوان کا نام جپتا لیکن میرا خوف کم نہ ہوتا۔

میری حالت اُس مظلوم کی سی ہوتی جو کسی کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے، اُسے خود روک نہ سکے لیکن کسی دُور اُفتادہ رفیق کو مدد کے لئے پکارے اور اپنی مہیبت میں مجبور و معذور رہے۔

جب دیس راج کسی مہم پر جاتا، بہ اواز بلند نعرہ لگاتا۔ ”جَل تُو جَلال تُو، اَلی بَلاکو مال تُو!“ اگر وہ ناکام لوٹتا خود کو یوں تسلی دیتا، ”گھر سے نکلے ہوئے پیرو مہتر منہ لگا تھا، اُس پر نعت پڑے۔ جب کالی بلی راستہ کاٹی مجھے واپس گھر لوٹ آنا چاہیے تھا۔“

وہ خواجہ خضر کا بیجاری تھا۔ برسات میں آب جو شباب پر ہوتی، وہ چھڑیوں اور گھاس پھوس سے بیڑا تیار کرتا، اُسے آب جو کے کنارے کم گہرے پانی میں رکھتا، پانچ مرتبہ جُلو میں پانی بھر کر اپنے اوپر سے پھینکتا، بیڑے میں اُلے کا چراغ روشن کرتا، اُسے دھکیلتا ہوا گہرے پانی میں لے جاتا اور بہاؤ پر چھوڑ دیتا۔ جب تک بیڑا دکھائی دیتا، وہ اُس پر نظریں کاڑے عمل پڑھتا اور جھومتا جیسے اُسے خواجہ خضر کا ورد ان ہو اُس کے الفاظ، میرے پتلے نہ پڑتے۔ میں پوچھتا، وہ اتر کر کہتا، ”یہ عربی کلمہ ہے، تیری سمجھ میں نہیں آسکتا!“

وہ کہتا تھا کہ خضر نے پانی پر کلمہ لکھا ہوا ہے جو اُسے پڑھ لے گا وہ پانی اور پانی کے اندر رہنے والی ہر شے پر حکمرانی کرے گا۔ وہ آنکھیں سمیٹ کر غور سے پانی پر دیکھتا جیسے اُس نے اچانک کچھ نوشتہ دیکھ لیا ہو اور اُسے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”تو پانی پر کلمہ دیکھ لے گا تو پڑھے گا کیسے؟ عربی تجھے آتی نہیں ہے!“ میرے سوال میں شک کا شائبہ ہوتا۔ یہی تو بات ہے! خواجہ جیسے کلمہ دکھاتے ہیں، اُسے پڑھنے کی صلاحیت دیتے ہیں۔ ”وہ ایمان و اعتقاد سے کہتا۔“

ایسی ہی کئی باتیں میں سنکت میں سن چکا تھا۔ کتنے اوتاروں نے گونگوں اور آن پڑھوں کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اُن سے گیتا پڑھوا کر اُس کا ارتھ کروایا تھا۔ مانس تو پھر بھی مانس ہے! اوتاروں اور سنتوں نے پشوروں اور پکاشیوں سے ویدوں کے ارتھ کروائے تھے، جو صرف برہمنوں ہی کا حق تھا۔

میں اُس کی بات پر یقین نہ کرتا، وہ مجھے خواجہ خضر کے عتاب سے ڈراتا۔ میں کئی بار خواب میں دیکھتا کہ کوئی سبز پوش سفید ریش مجھے پکر پکر بانی میں ڈوب رہا ہے۔ خواجہ خضر کی بیعت، وہ دہسی ہی بتاتا تھا۔

اِس کے باوجود میری نشوونما میں ہلکا سا تغیر رونما ہونے لگا تھا۔ جن رسموں، رواجوں، روایتوں، اندھی قدروں کو لوگ اُل بچھتے تھے اور اُن سے ذرا سے انحراف کو گناہ، میں انہیں تحقیق کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور یہ تھا تایا جی کی باتوں کا اثر۔ وہ بار بار سمجھاتے تھے، ”آدمی کی سچائی وہ نہیں جس کا یہ ادعا کرتا ہے۔ آدمی کی سچائی وہ ہے جس کا یہ ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کسی کی کسی بات کو یں پر کھے تسلیم کرنا اپنی بے ہودگی ہے۔ زندگی کی حقیقت، اپنے

عرفان سے بے نقاب ہوتی ہے نہ کہ اعتقاد سے۔ اعتقاد، آدمی کے جہل کا حاصل ہے اور عرفان، عرفان کا۔“

وہ بچوں کو ڈراتے نہ تھے، اُن کے ساتھ دوستوں اور اُستادوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن میرا دل خوف پروردہ تھا اور یہ میرے بھائی جی اور ہم عقروں کے تشدد کا ردِ عمل تھا۔ اس سے بڑھ کر مذہبی روایتیں اور حکایتیں تھیں، اُن سے کتنا گریز کرو، وہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود تھیں۔

دھرت راسٹر اس لئے آندھا تھا کہ اُس کی ماں نے ویاس رشی سے نیوگ (کسی عورت کا کسی غیر مزو سے اولاد کے لئے جسمانی رشتہ قائم کرنا) کرتے وقت آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور اُس نے اُسے سراپ دے دیا تھا کہ اُس کا بیٹا نیر بن ہوگا۔ دھارمک کتھاؤں میں سراپ اور وردان کو بڑا دخل ہے۔ مایا سے موہ کرنے والے کو سراپ جو بھوگنی پڑتی ہے اور بڑبڑو لے کو کوئے کی۔ یہاں تک کہ کھانا کھانے سے پہلے اُس کو کھانے کے بعد بھگوان کا احسان نہ ماننا اور شکر یہ آواز نہ کرنا اپرا دھ ہے جس کی سزا، نرک ہے۔ کسی اور گناہ کا کوئی خدا معاف کر دے تو کر دے، ناشکر ناقابلِ معافی ہے۔ کہتے ہیں کہ بھگوان بندے کو عبرت دلانے کے لئے گربھ میں نو ماہ تک اُلٹا لٹاتا ہے، اس کے کان میں نام پھونکتا ہے پھر اسے پیدا کرتا ہے، لیکن اس کا غرور! یہ پیدا ہوتے ہی نام بھول جاتا ہے اور میں! میں! چلانے لگتا ہے جیسے پردوں بن پچھی بیٹا ہے، پھل بن ترور بیٹا ہے..... نام بن بندہ بیٹا ہے۔ اور یہ کہاوت ان سب سے ہمیت ناک تھی۔ بھگوان ماں باپ کے گناہوں کی سزا اُن کے بچوں کو دیتا ہے۔

قارئین! اگر بھگوان ہے اور اُس نے ایسے قانون نافذ کر رکھے ہیں تو اُس سے بڑھ کر انسان دشمن کون ہے؟ انسانی قانون کتنے ہی سفاک سہی، بھگوان کے بنائے ہوئے قوانین سے زیادہ انسان دوست ہیں۔

میں جوں ہی کسی روایت سے انحراف کرتا، میرا بچھ مجھے دس لیتا۔ میری حالت اُس پندے کی ہی ہوتی جس نے پر پرداز اسیری میں نکالے ہوں اور وہ اُن کے مصروف سے بے خبر ہو۔ لیکن تباہی کی ایک بات میرے روتے پر صادق آتی تھی، ”مشاہدہ وہ افکھائیج ہے جو ہر شاہد میں نئے طریقے سے اُگتا ہے اور نئے بھول کھلاتا ہے۔“

میں یہ تذکرہ ہزار بار سن چکا تھا کہ گوتم بدھ راج پاٹ اور رشتے ناطے تیاگ کر جنگل میں چلا گیا اور بڑے نیچے کی برس تک بھگتی کرتا رہا اور یوں اُسے گیان اور نروان پراپت ہوا۔ اسی طرح آدمی بڑے نام تھے جو گھر سے بھاگ کر ہی کچھ بنے تھے کیونکہ اُن کے ماں باپ اُن کی سمجھ بوجھ کو پیٹنے نہیں دیتے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں عقل و دانش میں کیٹا ہوں اس لئے کوئی مجھے سمجھ نہیں رہا ہے۔ اپنی بڑائی منوانے کے لئے مجھے گھر سے بدیس بھاگ جانا چاہیئے۔ آنکھوں سے پرے ماحول کی سنجیدگی سے متاثر ہو کر مجھے لگتا کہ کوئی مجھے ملارہا ہے۔ اُس عالم اسرار کی تعبیر جاننے کے لئے میں گھر سے بھاگ جاتا۔ لیکن جوں ہی جانی پہچانی حدوں سے اُگے بکھتا، کیا ہوا کے

جھونکے اور کیا پرتندوں کے چہچہے! مجھے ڈراتے اور گھر لوٹ جانے کی تلقین کرتے جیسے وہ میرے انجام سے واقف ہوں۔ میں دو قدم آگے بڑھتا اور ایک قدم پیچھے ہٹتا، میری بے حوصلگی میری ناکامی ہوتی۔ میرے پاؤں منوں بھاری ہو جاتے۔ پہرے داروں کے سے درخت، میرا راستہ روکتے اور جھنڈ، مجھے خوف دلاتے۔ میں بھائیاجی کی اٹنی ہوئی تنبیہ سنتا، ”تو بھاگ کر کہاں جائے گا؟ فریلس! ایک دن یہیں لوٹ کر آئے گا، اُس وقت میں تیری کھال کھینچ لوں گا!“

قارئین! میرے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا، میرے سب بھائیوں نے بھائیاجی کو اپنے ظُوق کے مطابق چھیلا ہے۔ میں اُن سب کے بارے میں لکھوں گا تو اپنی کہانی ختم نہ کر سکوں گا۔ اس کے باوجود میں ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں، تاکہ اُن کی خوں آشنائی کا ایک زرا لاپہلو سامنے آ سکے۔

دیدار سنگھ گندم کی ٹلائی کر رہا تھا، شام کو بھائیاجی آئے اور اُس کے کام کا تجزیہ کر کے گھایاں دینے لگے اور اُسے کاٹتے ہوئے کہنے لگے، ”جتنا کام تو نے سارے دن میں کیا ہے، اُتنا میں سویرے گھٹا گھٹا کر سکتا ہوں،“

”پھر کر لینا تھا! مجھے کرنے کے لئے کیوں بھیجا تھا؟“ اُس نے چڑ کر کہا۔  
”تو سوال جواب کرتا ہے، خرابی! بھائیاجی سلامت کرتے ہوئے غصے سے بولے۔

”کرتا ہوں،“ وہ تھوڑا بد دماغ تھا، اگر پڑا۔

”تو گھر سے نکل جا، ابھی!“ انہوں نے حکم دیا۔

دیدار سنگھ خیم کر کھڑا رہا۔ انہوں نے جوتا اُتار کر اُس پر پھینکا اور تحکم سے بولے، ”جاتا ہے کہ دھٹکے ماروں، حرام خور!“

اُس نے تھوڑا سا اُدھر چل دیا۔ بھائیاجی اُس کی جُرأت پر ہتکے گئے رہ گئے اور کھڑے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد لاٹھی اٹھائے اُس کے پیچھے دوڑے اور اپنے کھیت سے دو کھیت پرے اُسے جالے اور پیٹنے لگے، ”تیری یہ ہمت! تجھے اس دن کے لئے پالا ہوا تھا کہ تو کمانے کے قابل ہوتے ہی پیٹھ دکھا جائے! آج تک تجھ پر جتنا لگایا ہے، اُس کا حساب چکا اور جہاں جانا ہے، جا! احسان فراموش! میں تیری بدی پسلی تو کر تجھے اپنا بیج بنا دوں گا تاکہ تو کوئی کام نہ کر سکے اور مرتے دم تک دوسروں کا ادھین رہے، بھیک مانگتا پھرے!“

میں خوف سے کانپ جاتا، نئی فضاؤں اور نئی کھوتوں کا ولولہ، میرا ساتھ چھوڑ دیتا۔ پُرانے راستے میرے پاؤں کی بیسٹیاں بن جاتے۔ بن کو میں جانی پہچانی خدوں سے کچھ ہی آگے تک اٹھا کر لے جاتا، لیکن توڑ کر

آزاد نہ ہو سکتا۔

سوینگ سنگھ نے گھر سے بھاگنے کا ارادہ کیا اور بھاگ گیا۔ اُس کے چرچے گھر گھر ہونے لگے۔ کوئی اُسے جواں مود کہا اور کوئی بڑیل اور کوئی بھگوتا! دیسراج کے گھر والوں کے برعکس اُس کے گھر والوں کی حالت غیر تھی۔ وہ رشتہ داروں کے پاس دوڑے، تھانے میں رہت لکھوانے پہنچے لیکن اُس کا سُراغ نہ ملا۔ وہ اُسے روپیٹ چکے تھے کہ وہ واپس آگیا۔ اُس کے گھر میں چراغاں ہوا لیکن وہ بچھا بچھا رہا۔ وہ اپنی زندہ دلی اُن انجانی راہوں میں گنوا آیا تھا جہاں سے دیسراج نئی زندگی دھونڈ کر لاتا تھا۔ ہم کہیں ملتے تو وہ چپ گرٹ رہتا۔ اُس کی خاموشی میں بے چینی تھی جیسے اُس نے ناگوار شے نگل رکھی ہو اور وہ اُسے اُگلنے کے لئے مضطرب ہو۔ آخر اُس نے قے کر ہی دی، گھر سے بھاگ کر اُس نے ہریاں بیلان میں پناہ لی اور نہنگ بن گیا۔ وہ طرز حیات، جسے وہ تقدیس پروردہ اور بے پروا سمجھتا تھا، اپنے طریقے سے نکلون تھا۔ اُس ظاہرہ تقدیس کے پیچھے وہ جنسی جھوک پوشیدہ تھی جس کا اُسے گمان نہ تھا۔ اُس کے ساتھ وہاں ڈبی ہو جو ساندوں کے جھنڈ میں ایک گاڑے کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

پنجابی زبان کی لطافت مجھے اُکسا رہی ہے کہ میں بر محل خوبصورت مثال پیش کروں۔

اُن داڑھیاں منڈارن ورگا

داڑھی اُدے سنگھ بن جاوے

(بے خط لڑکا، لڑکی جیسا ہوتا ہے، خط آنے ہی سے وہ مرد بنتا ہے)

عملی زندگی کو خیالی زندگی کے برعکس پا کر میں تایا جی سے پوچھتا، تایا جی! آدمی کی حقیقت کیا ہے؟

”آدمی کی کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے! اس کی حقیقت وہی ہے جس کا یہ عملی طور پر ثبوت پیش کرتا،

وہ اپنا فلسفہ بگھارتے۔ میں اُن کے بیان کی روشنی میں اپنی زندگی کو دیکھتا اور معلوم کرتا کہ میں زندگی کے ہر شعبے میں ناتمام ہوں اور کہیں بھر پور ہوں تو اپنے تصور میں۔

ایک دن سوینگ سنگھ اور دیسراج نے انکشاف کیا کہ وہ ہمہ رسی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شوق کو پُر اصرار نام دے رکھا تھا اپنا ہاتھ جگن ناتھ، اُن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنا ہاتھ آزما لیا لیکن میں کسی نتیجے پر نہ پہنچا۔ انہوں نے بیک زبان فیصلہ سنایا، ”تیرا لہو پتلا پانی ہے!“ وہاں شیشے کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے اٹکھٹا زخمی کیا اور انہیں دکھایا۔ زخم سے لال کاڑھا خون نکلا اور بہتے بہتے ختم گیا۔ وہ میری جرات پر تشدد رہ گئے اور اور خود بھی۔ اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوا کیوں کہ انہوں نے فیصلہ نہ بدلا اور مجھ پر مزید تہمت لگائی، ”تو ابھی بچہ ہے اور تیری مٹی ٹھنڈی ہے!“

پہلے میں احساسِ کمتری کا شکار تھا، اُن کے الزام سے میں الجھن میں پڑ گیا۔ میں بچہ ہی، ایسا بچہ

بھی نہیں تھا۔ میرے جذبات اور اعضاء وہی تھے۔ میری مٹی بھی ٹھنڈی نہ تھی جس کی نفی میری چھوٹھری ہو کر کرتی تھی۔ لیکن ہاں، اُس کا نازہ، جسم کے اُس حصے تک نہ پہنچتا تھا جو لذتِ بسیار کا سرچشمہ ہے۔ اُس کا وجود، آندھی لگی کی طرح تھا جسے چھوٹی سی دیوار، شاہ راہ سے جدا کرتی ہو۔

اُن کے سیدھے اور سپاٹ چمکے، میری شکستہ خاطر کی سبب ہوتے۔ ایک طرف وہ اور دوسری طرف فطرت میرا تمسخر اُڑا رہی تھی جس نے میرے خون میں لذتِ نفس کی بجائے افسوسِ اضطراب پھونک رکھا تھا۔ جس خیال سے لطفِ نفس کی تجدید ہوتی، میں اُسے طرح طرح سے نازہ رکھتا۔ میری آرزو، دھڑکن کی تیزی بن کر رگوں میں پھیلتی اور پھر روح کی پھریری میں بدل کر کاچھے میں سمٹ آتی۔ میں جس عضو کو چھوتا وہ اپنے بے لطف جہل سے جاگ کر مڑور اُگھی سے سرشار ہو جاتا اور میرے دل کے قریب ترین لگتا۔ میں اُس جوہر کا تصور کرتا جو میری رگوں میں دفن تھا لیکن اُس تک میری رسائی نہ تھی۔ میں اپنے ستر کو حیران حیران دیکھتا۔ میری حالت اُس پتے کی ہی ہوتی جو اپنا کھلونا رکھتے ہوئے اُس سے دکھیل سکتا ہو، نہ دل بہلا سکتا ہو۔ میری رنجوری و صیوری قابلِ رحم تھی ایں رات کو اِس آمان کے ساتھ سونا کر سورا ہونے تک میری طفلی و جوانی میں فاصلہ مٹ جائے اور میں وہاں جاؤں جہاں نئی زندگی ہو، آجی خوشی ہو اور آنجانی لذت ہو۔

میں اپنے اور جینا کے رشتے پر غور کرتا، جس میں دونوں کا حاصل الگ الگ تھا۔ وہ مجھ سے کھلتی تھی جب بھی اچھی لگتی تھی اور نہ کھلتی تھی تب بھی۔ میں اُس سے پوشیدہ اعضا کی بات کرتا اور اُن کی اہمیت سمجھنا چاہتا۔ وہ مجھے گندی بات کہہ کر چپ کر دیتی۔ میں حیران ہوتا کہ جو اعضا جسم کا ضروری حصہ ہیں، اُن کے بارے میں بات کرنا، بُری بات کیوں ہے؟ میں محسوس کرتا کہ وہ اعضا اپنے عمل میں اپنی ساخت سے جدا ہیں اور حقیقت میں وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ اُن کی اپنی باطنی سچائی ہے جو اپنے مخصوص عمل میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر دُپوش ہو جاتی ہے۔ میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا موافق و مخالف قدروں میں گھرا ہوا بدحواس تھا۔ میں روایتوں کو حقیقتوں سے اور کتابوں کو عملی باتوں سے الگ پاتا تھا۔

اجیت سنگھ ٹال پر رہنے لگا تھا اور اُس کے کمرے میں میں۔ ایک دن پلنگ بھارتے ہوئے میں نے نواڑ کے بیچ ایک کتاب دیکھی۔ میں حیران ہوا کہ وہ دہلیا کر رہی ہے؟ میں نے اُسے نکالا اور دیکھا۔ وہ کوک شاستر تھا جو دسہرے کے میلے میں بٹر پیپر کے لفافے میں مہر بند کیا کرتا تھا۔ مبادا کوئی دیکھ لے، میں نے کمرہ بند کیا اور اُسے کھولا۔ اُس میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں تھیں، جن میں بے قید طرزِ حیات کی تلقین کی گئی تھی، اس لیے کہ اُس سے جنسی جذبہ تروتازہ رہتا ہے۔ اُن کہانیوں کی زبان ننگے اعضا سے زیادہ ننگی تھی۔ اُس میں عورتوں اور مردوں کی عریاں تصویریں تھیں اور کئی جگہ انہیں جھوگ بلاس کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ حلال کہ وہ کاغذ پر بے جان مورتیں تھیں، مجھے محسوس ہوا کہ

وہ شدت جذبات سے تھرک رہی ہیں اور روبرو عمل ہیں۔ جینا کو ننگے نہاتے دیکھ کر میں اس قدر بدحواس نہ ہوا تھا جتنا ان تصویروں کو دیکھ کر۔ اتنے میں ماں نے مجھے پیٹھے کترنے کے لئے مشین پر بلایا۔ میں نے جلدی سے کوک شاستر وہیں چھپایا اور ادھر ادھر ٹہل کر اپنے نفس پر قابو پایا پھر ماں کے پاس گیا۔ اس دن پیٹھے کترتے ہوئے میری رفتار ہی الگ تھی۔ ماں مشین کو کالادیتی ہوئی بار بار ہدایت کر رہی تھی، ”ہولے چلا! اور ہولے چلا!“ لیکن میں تھا کہ مشین دورائے جا رہا تھا جیسے مجھ میں نئی طاقت آگئی ہو۔

اُس رات میں کوک شاستر نیفے میں اڑس کر دیسراج اور سوگ سنگھ کو دکھانے کے لئے گیا وہ دونوں پہل کے نیچے دھونی جلائے میرے منتظر تھے۔ وہاں سے ہم سوگ سنگھ کی چوٹی میں آگئے، جہاں وہ سوتا تھا۔ وہاں لاشیں کی روشنی میں انہوں نے کوک شاستر دیکھا۔ اُن دونوں کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری بار مقابلہ کرتے، میں ماں کا بلاد اُس کو گھر لوٹ آیا۔ اُس کے بعد میں نے کوک شاستر کو کبھی نہ دیکھا۔ انہوں نے مجھے باور کروادیا کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب میں کتابوں کی طرف رجوع ہوا۔ میں نے سکول کی لائبریری چاٹ لی لیکن مجھے ایک کتاب زلی جس کے کردار میرے جانے پہچانے ہوں۔ اُن کے رہن سہن ہی الگ نہ تھے، جذبات بھی جدا گانہ تھے۔ سچے کردار ڈھونڈنے کے لئے میں کتابیں پڑھتا لیکن ہر کتاب، ہر ورق، ہر لفظ، سر بہتہ راستے کی طرح پاتا۔

سنایا جی انسانی زندگی کے ہر مسئلے کا حل بتاتے تھے لیکن جنسی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کہتے تھے۔ اس تعلق سے وہ مجھے ریاکار لگتے تھے۔ میں چاہتا کہ وہ اُن رموز حیات کو بھی موضوعِ سخن بنائیں جو انہوں نے اپنے وقت اپنے انداز سے سمجھے ہوں گے۔

میں جن لوگوں سے قریب تھا وہ کتابوں سے کھرے تھے حالانکہ وہ ہمہ جذبات زندگی چاند جلوں میں گڑا رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے کام پروردہ اور کام زائید کردار کو بیش لفظوں سے سروکار ہی نہ تھا۔ وہ اپنی ضرورت کی تسکین، کام میں پاتے تھے۔ اُن کے پاس وقت کا ایک ہی مفہوم تھا، کام! چوں کہ وہ وقت کو کام سے ناپتے تھے کام کے بغیر ادھورے رہتے تھے جیسے بے برگ و بار شجر۔ وہ بیرونی طور پر ادبچی قدروں کے طرفدار سہی، اندرونی طور پر مخالف تھے۔ وہ کسی قدر کے بارے میں دیسج مشرب تھے تو وہ اُن کی مصروفیت تھی، ورنہ اُن کی تنگ دلی روتا تھی۔

کمربناں گھڑم

(جہاں کام نہ ہو وہاں گڑبڑ ہے، ہر شے اوندھی ہے)

اُن کی تنگ دلی میں کہیں فراخ دلی نظر آتی تھی تو صرف توالد و تناسل کے میدان میں۔ کثرتِ اولاد سے

ہر ماں کی حالت، نہال میں ملکہ کی سی رہتی تھی۔ لیکن ملکہ کے برعکس وہ اپنے بچوں کو دھتکارتی، پھٹکارتی اور دُور بھٹکاتی تھی لیکن وہ اُسے بُری طرح چمٹے رہتے تھے۔ اپنی رُوحوانی تکلیف میں، وہ انہیں چڑیاں کہتی اور مر جاد تک کا سراپ دے دیتی۔ ان میں سے کوئی مَر جاتا تو اُس کے بین سُن کر کیلجے پھٹ پھٹ جاتے۔ صاف سُتھرے بول اور میٹھے پیارے الفاظ سُننے کے لئے کان ترستے رہتے تھے۔ مَن موہنی زبان گیتوں میں تھی یا اخلاقی کہانیوں میں، اچھے جذبے اُتق کے رنگوں کی طرح ناپاؤدار تھے۔ اُن کے کاروبارِ حیات اور کاروبارِ جہاں صرف نفسی سمجھوتے کے تحت چلتے تھے۔ یہ اُسی سمجھوتے کا کمال تھا کہ باہمی نفرتوں، کینوں، کدورتوں .... کے باوجود زن و مرد اُجالے میں ایک دوسرے سے لڑتے اور آندھیرے میں باہیں پسارے انتظار کرتے۔ اُن کا نفس وہ موافقِ عنقریب تھا جو اُن کے باہمی انحراف کو ختم کرنے میں مُمد و معاون تھا۔ اِس حیاتِ آفریں جذبے کو لوگ گیتوں میں کس شدت اور نفاست سے بیان کیا گیا ہے۔

اولے جدوں ہتھ پھیریا

مینوں دکھ جندڑی دے بھل گئے

( اُس نے جوں ہی میرے بدن کو سہلایا، میں رُوح کے سارے دکھ بھولی گئی )

سو ہنسا پچھوں گل کردا

پہلاں ہتھ میاں تے رکھدا

( میرا پیارا بات پیچھے کرتا ہے لیکن پہلے تمہوں پر ہاتھ رکھتا ہے )

جس جذبے کا برملا ذکر مثنوی اخلاق ہے وہی درد پر وہ اُن کے وجود کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچانے جوئے ہے۔ یہ اعجازِ امی پر کُترش جذبے کا ہے کہ وہ اپنی ہڈیوں اور رگوں کو کھرچ اور پخوڑ کر اُن میں سے پکتے جھتے اور اُن کی حقیقت میں اپنے جھوٹے سُلسل کے خواب دیکھتے اور اپنی دل بستگی کے حسین لمحوں میں اُن فانی وجودوں کو اپنے نشان کہتے۔ اِس معقول جذبے میں انتہائی نامعقول بات یہ ہے کہ وہ اپنے بے رُخوت اور مُستقبل نا آشنا بچوں کے نام غامبی صحیفوں میں سے چُن کر اعلیٰ اور خوش آئند رکھتے جو اُن کی صورتوں اور مصیقتوں کے اتنے برعکس ہوتے کہ انہیں دیکھ کر خیالوں کے آئینے چور چور ہو جاتے۔



## باب ۱۹

وَضَلِّمِیْ بے خودی کا وہ عالم  
گویا خود سے جدا ہو گئے تُم

(شاطر)

کتا ہیں پڑھنے کا خاص فائدہ یہ ہوا کہ میرے الفاظ کا ذخیرہ کئی گنا بڑھ گیا۔ میں نے کئی ایسی نظمیں یاد کر لیں جو سینکڑوں اشعار پر مشتمل تھیں۔ اُس رواروی میں مجھے ایک احساس ہوا جو بدستور ہے۔ میری کیفیت کے ساتھ الفاظ کے معنی بھی بدل جاتے۔ وہی مضمون جو میری رگوں میں کھلبلی مچا دیتا کبھی ناکارہ اور پھیکا لگتا۔

ہمارے گاؤں کا کچھار جگنوؤں کی دھرتی تھا جو سہر شام آسمان در آسمان نمودار ہوتا تھا۔ میں اُس کی دل کشی کا قائل تھا لیکن مجھے اُس لطیف افتاد کا احساس نہ تھا جو اُس کی روکشی میں تھا۔ اُس کی وہ تُوہنی، مجھ پر اُس دن آشکار ہوئی جس دن میں نے اقبال کی نظم 'جگنو' پڑھی۔ میں کچھاریں گھومتا ہوا ایک ٹیل پر بیٹھ گیا اور یہ نظم کا تا ہوا بے تشریح جذبات میں کھو گیا۔

او آفاقی لحو! او مہا آندو!! تُم سے پھرے ہوئے جگ بیت گیا ہے۔ میں تُم سے بٹنے کے لئے ترستا ہوں! کیا تُم اُس پر لطف آنجن کی آرزو کرتے ہو؟ جس میں تُم برابر کے شریک تھے۔ جیسے میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تُم بھی میرے بارے میں سمجھتے ہو؟!

میں پچھلی بار گاؤں گیا تو مجھے 'گیان سنگھ شاطر' کا خیال نہیں تھا۔ ایک رات، چاند گھل کر رنگ و نور کی صورت بہہ رہا تھا۔ میں خراماں خراماں، آوازہ آوازہ اُدھر جا بیکلا جدھر کچھار ہوتا تھا۔ اُس علاقے کو آج بھی پا کر میں وہاں اُس ٹیلے کو ڈھونڈنے لگا جس سے میری شناسائی تھی لیکن وقت کی اٹھل پھل نے اُسے مٹا دیا ہے۔ میری رنگ نے میرے جذبہ تلاش کو چین زلینے دیا جب تک اُس نے جو (ندی کے بہاؤ میں بہہ کر آئی ہوئی ریت) میں وہ مقام نہ ڈھونڈ لیا۔ میں نے وہاں کی مٹی اٹھا کر سونگھی، وہ میرے مافی کی تہک سے رسی بسی تھی۔ میں اُس جہان میں پہنچ گیا جہاں لہراتے چشمے، گاتے جھر نے اور اہلہاتے سبزے تھے۔ اُن مناظر کی مجموعی خوبصورتی بڑھانے کے لئے رستارے پکھڑا لگا اُرتے آتے تھے لیکن بھولے بھالے دہراتی اپنے بھولپن میں انہیں جگنو سمجھ لیتے تھے۔

وہ عالم واقعی حسین تھا یا میرا حسن تصور اُسے رنگین بنا رہا ہے۔ اُس یاد کی رعنائی کا جادو دُلتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی عظمت کی بلندی سے نہامت کی پستی کی طرف لڑھکتا ہوں۔ میری خود کفایت مجھے لاچار کرتی ہے کہ میں ان پیاری پیاری یادوں میں کھویا رہوں جو میری چاہتوں کی سرخوشی اور سانسوں کی سرسستی میں جن کی بدولت

وقت کی رفتار بھی ٹھوٹی ہے۔

لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے !

اضطرابِ عناصر، شرطِ حیات ہے ! جیسے دل کی دھڑکن گردشِ خوں میں منتقل ہو کر اُس کا لافانی حصہ بن جاتی ہے ! ایسے ہی مجھے اپنی کہانی کو آگے بڑھانا ہے۔ ایسا نہ ہوا تو میری کہانی اپنے انجام کو کیسے پہنچے گی ؟ ایک رات میں جُگنو پکڑنے لگا اور پکڑی کے لڑ میں باندھنے لگا۔ جُگنو کو پکڑنا نئے بار ساز کو چھو کر اُس کی ننگی ٹوٹنا ہے۔ میری بے ہودہ حرکت کی وجہ میرا خوبصورت خیال تھا جو اپنی دنیا میں نرالے منظر کی تشکیل کر رہا تھا۔ میں مٹھی بھر جُگنو لئے جینا کے پاس گیا۔ وہ اتنے سارے جُگنو دیکھ حیران رہ گئی اور مجھے ڈرانے لگی، یہ جہاں پیشاب کر دیں، وہاں غارش ہو جاتی ہے، تو انہیں چھوڑ دے !

میں اُس انجام نے خطرے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ میں اُسے ایسے آئینے میں ڈالنا چاہتا تھا جس کا اُسے گمان نہ تھا۔ میں اپنی ضد پر اڑ گیا اور اُسے اپنی بات منوا کر ہی رہا۔ میں نے جُگنو اُس کے سر میں ڈالے اور اُن پر دوپٹا باندھ دیا۔ وہ نظارہ کیا نظارہ تھا ! وہ اس قدر خوبصورت اور دل پذیر ہو گا، مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ میرے قارئین ! آپ ایسا منظور دیکھتے تو اُسے کیا کہتے ؟

میری جدت طرازی کی داد مجھے ویسی ہی ملی جیسی عام حالات میں ملتی تھی۔ میں انجام آشنا نہ سہی وہ زود آغاز ضرور تھی۔ وہ جلد ہی اُس کیفیت سے گزر گئی جو اُس کے شوقِ ہوس کی تلاش تھی۔ میں اپنے سازِ عناصر کو سنتا تھا لیکن اُس کی لے نہ سمجھتا تھا۔ میری تعمیرِ نفس کی خودکاری میرے اعفا کے جوان ہونے کی رفتار سے کم تھی۔ میرے دل کی دھڑکن میرے سانس کی دم ساز تھی لیکن اُس کی ہم راز نہ تھی۔ میری خلوتِ نشینی کو میرے آب و گل کی جلوتِ آفرینی منظور تھی، وہ تشکیل جاری تھی لیکن اُس کی آہستہ خراچی میری ناگواری تھی۔ میرا ہوا، شعلہ مضمر کی طرح تھا۔ وہ اپنی بیباکی نمود میں میری رگوں اور پٹھوں اور ہڈیوں میں دوڑ رہا تھا لیکن کوئی راہ نہ پا کر اپنی ہی گردش میں اسیر تھا۔

دراصل میرا وجود میرا غنیہ آرزو تھا۔ وہ اُس خوشبو سے بے بہرہ تھا جو اُس کی مٹھی میں بند

ہوتی ہے۔

## باب ۲۰

طاری ہے اک مجھ کو سا بزمِ حیات پر

مرنے کا حوصلہ ہے، نہ جینے کا بائکین (شاہ)

اُدھی عناصر سے زیادہ خواہشات کا پتلا ہے۔ میں نے جو بھی خواہش کی ہے اُس کا ذکر گا ہے بگا ہے جاری ہے لیکن اُس کے بارے میں جو بات میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میری خواہش کی نوعیت جیسی بھی رہی ہو اُس کی کار فرمائی ایک تھی کہ وہ اپنے کمال کو پہنچے لیکن ویسا ہوتا نہ تھا۔ میں کسی اور اونچ نیچ کا رشکار ہوا تو ہوا لیکن میری خواہش کا یہ ضبط قائم و دائم ہے۔

کہتے ہیں کہ کوئی ایک سنگین واقعہ انسان کی پوری اٹھان کو کچل سکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ میری کون سی رگِ آفرینش تھی جو میرے وجود کے ٹوٹے تانے بانے کو جوڑتی اور سنوارتی رہی۔

میں گاؤں میں تھا تو میرے ہم عصروں کی دست درازیاں اور بھائیاجی کی زود درخیاں میری تقدیر تھی۔ میں شہر میں اٹھ آیا تو کامگاروں کی کڑی بول بانی اور کارخانوں کی زندگی، میرا اور ٹھکانا بچھونا بن گئی۔ میں اپنے ماحول کے دو متضاد پاٹوں میں پس کر گیا ہوں لیکن ماضی کا حال سے موازنہ کرتے ہوئے، میں دیانت داری سے تسلیم کرتا ہوں کہ میرا ماضی اپنی تمام تر بے ہودگی، آبستری، بدخواہی، بے راہ زدی . . . کے باوجود میرے حال سے بہتر تھا۔ دراصل وہ بہتر نہیں تھا لیکن میں بہتر نظر کرتا ہوں۔ کیوں؟ اُن حالات کو رقم کرتے ہوئے، مجھے عجیب سی تسکین ہوتی ہے۔ ذلت خواہی، ماضی پرستی کی پیداوار ہے۔

وہ جھومتے ہوئے سبزہ زار، بیلوں کے گھنگھروؤں کی جھنکار، رہٹ کے پاٹ کی لوریاں، باغوں میں جھولے جھولتی گوریاں، گریال میں مت پرند، ہندی میں چھلپ کر تے پرند، ناجاتی فاختاؤں کی آلاپ، چوکس ٹیڑیوں کا دلاپ، اپنی لے میں سرشار مور، برکھا کی ریم جھم میں جھرنوں کا شور، بڑکی داڑھی کے جھولے، اکھیت کھیت سرسوں جھولے، قدم قدم ہی نہرت گاہ، نظر نظر زبالی جلوہ گاہ، سحر کی تھک، چڑیوں کی چہک، شفق کے بڑھکیلے رنگ اور اُن کی دید سے پیدا ہوتی ہوئی ترنگ . . . ہر منظر کی طرح یہ منظر بھی اپنا جواب آپ تھا۔

برسین کو پانی دینا مقصود ہوتا، میں رہٹ جوت کر بیلوں کو اندھیری لگا دیتا اور بوڑیوں (گراری کے دانت) پر کتا گرا دیتا۔ میں بیل ہانکتا اور جہاں وہ دھیمے ہوتے اُن پر چمکے سے برس پڑتا۔ اُن پر بے اعتباری چھاتے ہی وہ چال پکڑ لیتے اور میں کسی اٹھا کر نکلوں (ایک کیاری میں سے دوسری کیاری میں پانی پہنچانے کی راہ) پر توجہ کرتا۔

پانی کیاری میں پھیلتا ہوا آگے بڑھتا اور میں مینڈر پر کھڑا ہو کر پڈیوں کی چوکی کا نظارہ کرتا۔ کیاری کا پھیلاؤ، اُن کی جوچوں میں بٹھا ہوا نظر آتا۔ ادھر پڈیاں دو بنے سے بچنے کے لئے چھکتیں ادھر پڈیاں اُن پر پکیتیں۔ ایک کی کامیابی اور دوسرے کی ناکامی میں ٹھونگ بھر ہی کا فرق ہوتا۔ وہ سرگھماتی اور دم ہلاتی اور اٹھلاتی ایسی بھلی لگتیں کہ بس !

بھائیاجی کے گھناؤنے سائے اور میری بزدلی سے دور ہر قدم انکھی دید اور پیاری نوید تھی۔ میرے خیالوں میں یادوں کا میل لگا ہوا ہے، سہانی یادیں، ڈراؤنی یادیں ! میں اُن کے دیرینہ لمس سے کبھی خوشی سے مژدہ ہوتا ہوں اور کبھی غم سے آزرده۔

ایک جانا پہچانا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کہتا ہے ”جگیا ! تو مجھے بھول گیا ہے کیا ؟“

میں چاچا کریم کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ وہ مجھے یاد ہے لیکن شاید اُسے میری بات پر اعتبار نہیں ہے۔ اس میں اُس کا کیا قصور ؟ اُسے، مجھ سے اُسی جلدی کی توقع ہے جو کبھی مجھے، اُس سے ہوتی تھی۔ میرے اچھے چاچا کریم ! کون جانے تو کہاں ہے اور کس حالت میں ہے ؟ میں تیری یاد کو حیات جاوید دے رہا ہوں، وہ تیری فیاضی کی شانِ سرفرازی تھی جسے ناداریِ دورانِ رد نہ کر سکی تھی۔

چاچا کریم ہماری مال کے پاس کبڑی شیشم کے نیچے اُردو اور موسمی پھل بچا کر تا تھا۔ اُردو اندر سے لال اور باہر سے سنہری ہوتے تھے۔ اُردوؤں کی چھانٹ چھانٹ میں اُسے کوئی داعی دانا ملتا، وہ اُس کے اچھے حصے کی پھانکیں بنا کر بچوں میں بانٹ دیتا۔ وہ سریر اُن سے دوہرا کام نکالتے، پہلے اُن سے ہونٹ رنکتے پھر انہیں کھاتے۔ کریم کی آواز اُس کے تیر نما چہرے کی سی تھی جو کانوں کو خاطر میں نہ رکھتی تھی اور سیدھی دل سے ساز باز کرتی تھی۔

آمب رسیئے،

لے کے کھاؤ آمب رسیئے

(آموں کی طرح رسیلے، آموں کی طرح رسیلے لے کر کھاؤ)

وہ اُردوؤں کو ٹوکری میں ٹیلے کی طرح سجاتا اور ایک اُردو بتارے سا کٹ کر چوٹی پر رکھ دیتا اور اپنے میلے کچیلے صافے سے مکھیاں جھلٹا ہوا رسیلے انداز میں گاتا اور راہ گیروں کو جھاتا۔ وہ اُن کی چال سے اُن کا ارادہ بھانپ لیتا اور اُردوؤں کا قصیدہ گاتا مچا، اُن کی ریچھ کو جوا دیتا۔ کوئی اُس سے دانت بچاتا تو اُس کے گانے اور مکھیاں جھلٹنے میں یکساں بیتابی ہوتی۔ ماؤں کے ساتھ بچے دیکھ کر چاچا کریم کے بلاوے میں نئی آنگ اور نئی ترنگ ہوتی۔

## گیان سنگ شاطر

نِت نِت نیتیں بزاریں آؤنا  
 مُنڈے نوں لے دے اُمب ریا  
 روز روز بازاریں کہاں آیا جاتا ہے! اپنے بیٹے کو ام کی طرح ریلے خرید دے  
 بی بی بی لے دے اُمب ریا  
 سوہنے نوں لے دے اُمب ریا  
 پیارے نوں لے دے اُمب ریا  
 (اے بی بی، اپنے بیٹے کو اُمب ریا لے دے، اپنے سندر کو اُمب ریا لے دے،  
 اپنے پیارے کو اُمب ریا لے دے!)

وہ گانے کے مصرعے حسب ضرورت تبدیل کرتا اور کاکھ کو لٹے دیکھ کر جگمگا اٹھتا۔ کسی کا بچہ روتا  
 لیکن وہ امر دودوں کی طرف مائل نہ ہوتا تو چاچا کریم کا مسک مٹھل مٹھل ہوتا۔

لے دے مُنڈے نوں اُمب ریا

کر دے مُنڈے دا دل راضی

اپنے بیٹے کو اُمب ریا لے دے وہ ایک دم خوش ہو جائے گا۔

جو کوئی اُس کے بلاؤں اور پھلاؤں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے، اُن کی حالت غیر ہوتی۔ اُن کے بچے  
 اُن کا راستہ روکتے، اُنچل کھینچتے، رُوں اُدں کا جاپ کرتے، رُکتے بڑھتے اور بڑھتے رُکتے واپس آتے لگتے تو کئی لوٹ  
 ہی آتے۔

میں نے ٹال کی باڑ کے ساتھ بلو بڑ لگا رکھے تھے۔ سادھو رام کے باغیچے میں دھرم ارتھ رہٹ لگا تھا  
 جسے ضرورت مندوں کے آرام کی خاطر سانجھ سویرے جوتا جاتا تھا۔ میں وہاں سے پانی ڈھوتا اور بلو بڑ کو سیراب کرتا۔  
 اُن کی جھالرسی لانگریں (وہ شاخ جسے بڑھنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو) باڑ کے سہارے سہارے دوڑتک نکلیں  
 گئی تھیں۔ میں اُن کی نلانی کرتا، کیاری پر مٹی چڑھاتا، مڑھائے ہوئے پھول پتے چننا گویا تازہ پھولوں پتوں کا مٹن نکھارتا۔  
 میں کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا اور دھرسے گزرتا تو وہ مجھے بلاتے لگتے۔ میں اپنے احساس سے لبریز موہن سنگھ کی  
 یہ نظم گاتا،

اَسیں نہانے سادے پتھر

سانوں کون خیالے

دو دن چھاں پھلاں دے سستے

## گیان سنگ شاہ

جاگے ساڈے تالے  
سوہنے دے گلدستے خاطر  
جان جدوں ادھ لگے  
کھا کے ترس آساں دے اُتے  
لے گئے سانوں نالے

(ہم بے مقدور ہرے پتے تھے۔ ہماری کوئی پہچان نہیں تھی لیکن چھلوں کی قربت سے  
ہماری قسمت ہی بدل گئی۔ وہ اپنے محبوب کے گلدستے کے لئے جا رہے تھے کہ  
انہیں ہماری بے مقدوری پر ترس آیا اور وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گئے)

میرا جذباتی لگاؤ دیکھ کر چاچا کریم، اُمب رسیوں کا لا رو بار بھول جاتا اور گہری بھرائی آواز میں یہ  
دردناک اشعار گاتا،

سدا نہ باگیں بلبُل بولے  
سدا نہ موج بہاراں  
سدا نہ مل بیٹھن مٹیاراں  
سدا نہ صحبت یاراں

(بلبل کے ترانے ہمیشہ بارغ کی رونق نہیں رہتے اُسی طرح کسی کے اچھے دن! جیسے  
سہیلی، سہیلیوں سے نہ ملنے کے لئے پھرتی ہے ویسے ہی یار، یاروں سے)

میں جب کبھی چھلوں کو پانی نہ دے پاتا، وہ کلا کر لڑھک جاتے۔ میں انہیں تشویش سے دیکھتا، وہ مجھ  
سے شکایت کرتے لگتے، ہماری دیکھ بھال سے منہ موڑنا تھا تو ہمیں بویا ہی کیوں تھا؟ میری تشویش، احساس میں  
بدل جاتی اور میں خود پر غلامت کرتا، شرمندہ ہوتا، بالٹی اٹھاتا، رہٹ کو بھاگتا، کیاری بکاب بھرتا اور اُن پر  
چھڑکاؤ کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے مکھڑے یوں کھل اُٹھتے جیسے کوئی ردوؤں کو گدگدا دے۔

بھائیاجی تعلیم کے خلاف تھے اور نئی جماعت کی پُرانی کتابیں تب خرید کر دیتے جب استاد جماعت سے  
باہر نکالنے لگتے۔ میری نفاست پسندی گوارا نہ کرتی کہ میں اُن کتابوں کو اُسی بُری حالت میں پڑھوں۔ میں اُن کی مرمت  
کرتا اور اُن پر مینی والی جلدیں باندھتا جو اُن کا حسن نکھار دیتیں جیسے گوریوں کے بڑھے ہوئے رنگین ناخن۔ کتابوں کو  
رسورفیش اور جیمک سے بچانے کے لئے میں اُن میں سانپ کی کینچی رکھتا اور خوبصورت پرتندوں کے پروں کو ترک  
کے طور پر استعمال کرتا۔ میں کتابوں کی جلدیں ماندی کی بجائے گوند سے باندھتا جسے میں لیکروں سے اتار کر لاتا۔ کتابوں

کے درتے غائب ہوتے تو میں دوسروں کی کتابوں سے نقل کر کے اپنی کتابیں مکمل کرتا۔ کسی کتاب کے کوئے مڑے ہوتے، اُس کا حجم بڑھ گیا ہوتا، جو بھدی لگتی، اور بد نما بھی۔ میں ایسی کتاب کے کوئے کاٹ کر گول کر لیتا۔ کئی بچہ طالب علم، میری نقل کرتے اور اپنی نئی کتابوں کے کوئے کاٹ دیتے۔

میں گوند اکٹھا کرنے کے لئے گھر سے نکلا، کھیرے کی لیکروں سے کچھ حاصل نہ ہوا، میں نے کھروں کا رخ کیا۔ شاہ بیٹے ہی کوچل رہی تھی۔ میں آب جو کے لمبے مگر ٹھنڈے راستے پر ہولیا کہیں ٹخنوں اور کہیں گھٹنوں پانی میں سے ہوتا ہوا، میں فیروز شاہ کے راس پر پہنچا۔ وہاں گہرا ڈھم (آب جو کا تالاب) تھا۔ میں نے پگڑی، ٹکڑے سے لپیٹی، اُسے گھما کر دوسرے کنارے پر پھینکا اور کپڑوں سمیت پانی میں گھس گیا جیسے دوں اور تونس کا مارا کوئی بھینسا۔ میں کتنی دیر تیرتا اور ڈبکیاں لگاتا رہا۔ باہر نکل کر میں نے جوڑا کھولا، بالوں کو شانوں پر بکھرایا اور ٹکوا اٹھا کر چل پڑا۔ کپڑوں سے پھرتا ہوا پانی مجھے تلوں تک بھگونے لگا۔ میری جدت طرازی سے دھوپ کا عذاب، آرام میں بدل گیا۔ کھروں سے بھی گوند نہ ملا لیکن میں خوش ہوا کیوں کہ میری ناکامی نے مجھے میری دور اندیشی تک پہنچا دیا۔ میں نے ٹکڑے سے لیکروں پر کاٹ لگا دیئے جو میری اُندہ ضرورت کی قنات تھے۔ کیش موکھ کر پینے لگے تھے اور پاؤں جلنے۔ میں نے جوڑا کر کے پگڑی باندھ لی اور وہاں سے مینڈ مینڈ کالے آم کا رُخ کیا۔ وہ راستہ ناک کی سیدھ میں آدھے سے آدھا تھا لیکن میں ننگے پاؤں ہونے کی وجہ سے جھنجھوٹوں سے ڈر رہا تھا مینڈ پر کھل گھاس (دھاگے جیسی موٹی گھاس جو تپڑ کی طرح پھیلتی ہوئی بڑھتی ہے) ہونے کی وجہ سے وہ دوسری دھرتی سے قدرے ٹھنڈی تھی۔ کالے آم کے پاس لامبرے کی سرحد پر لیکروں کی لمبی قطار تھی جو پیر پھلا ہی سے آگے ختم ہوتی تھی۔ آفتاب اس قدر درخشاں تھا کہ اُس کے پرتو سے ٹھس دھرتی، شیشے کی طرح چمکتی تھی۔ کرنیں دھرتی سے ٹکرا کر اوپر اُٹھتیں اور ہوا کے رُخ پر خاموش لہروں جیسے بہتیں۔ احمد علی کے بھجریں وہی منظر الگ خصوصیت کا حامل تھا۔ وہاں زمین کی سطح، پیالہ نما تھی۔ ذرات ریگ، انگاروں کی طرح چمکتے اور بل کھاتے ہوئے اوپر اُٹھتے۔ وہ چھوٹا سا خط، آگ کے دریا میں گرداب آتش لگتا۔ سانس میں شعلے کی سی پلک تھی۔ دوپہر ہو رہی تھی، کسی طرف جلو آنکھیں پُندھیا رہی تھیں۔ میں نے پگڑی اتاری، کڑ لیا رکھ کر باندھی اور رڈ کو چہرے پر پھیلا دیا۔ ایسا کرنے سے میری نظر کا دائرہ سُکڑ گیا لیکن میں اپنی سمت اور اونچا نیچا بھجوتی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے شوخی سوجھی! میں نے آنکھوں کو بند کیا اور سو قدم چلنے کا عہد لیا۔ مینڈ کافی چوڑی تھی لیکن آنکھیں بند کر کے اُس پر سے گزرا، شبدہ گار سے پر چلنا تھا۔ میں آدھے سے کم فاصلہ چلا ہوں گا کہ میرا پاؤں، چوہے کے بل میں دھنس گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں دہل گیا اور جوں ہی سنبھلا، میں نے دیکھا، ٹخنے پر ہلکا سا زخم آیا ہے۔ میں مسکرایا پھر آنکھیں بند کر کے چل پڑا جیسے کرنا پڑنا، چوٹ کھانا میری شوخی کا لازمی آخر تھا۔ فضا، جُس سے عاری تھی اس لئے تو، پلٹ جیسی تھی۔ میں دوبارہ گرا

تو میں نے راستے سے آنکھ چولی کھیلنا بند کیا۔ دریا سنگھ کا رہٹ میرے راستے میں پڑتا تھا۔ میں وہاں پہنچا اور اُسے اُڑ (کھیت میں پانی دینے والی نالی) میں چادر بچھائے اُموں کے سائے میں لیٹا ہوا دیکھا۔ وہ مارے ہوئے نٹلی تھے جن کے پھل ایک سیر میں دو تلتے تھے۔ پچھلے سال اُن درختوں کے اُم، گو جڑ ہلوں (بھٹی ہار کھیل کرانا) کر لے گئے تھے اس لئے دریا سنگھ اُنھوں پہر پہرا دیتا تھا۔ وہ میرے بھائیاجی کا ہم عصر تھا لیکن میں اُسے دیر جی کہہ کر بلاتا تھا اور وہ مجھے پڑھا کو بابو۔

”پڑھا کو بابو! ایسے میں شیر اپنے بھٹ سے باہر نہیں نکلتا، تو کدھر مارا مارا پھر رہا ہے؟“ میرے پیروں سے پتے کھرکے، اُس نے میری طرف پہلو بدل کر دیکھا اور کہا۔

”اُس لئے کہ شیر، شیر ہے اور میں گیان سنگھ ہوں“

میں نے اُس کی بات سے تضحیک کا پہلو نکالا۔

”وہ رے گیان سنگھ جی! لیکن اسی کی ضرورت آپری کہ گیان سنگھ شیکھر دو پہر کو نکلا ہے؟“

”وہ اپنی مسکراہٹ روکتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔“

”گوند چاہیئے، کتابوں کی جلدیں باندھنی ہیں۔ زکھیرے سے کچھ ملائے اور نہ ہی کٹروں سے۔“

اُس کے سامنے ہل پڑا ہوا تھا، میں اُس پر بیٹھ گیا۔

”اُدھر بیٹھ! اُس نے مینڈ پر پڑی اینٹ کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بُزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا،

”اُونار پر بیٹھے سے اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔“

اینٹ پر بیٹھا تکلیف دہ تھا، میں اُٹھ کر زمین پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ حالاں کہ وہاں زیادہ درخت

نہ تھے لیکن ہوا کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ چھاؤں کا دھوپ سے دہی رشتہ ہے جو پانی کا آگ سے۔ میں اپنے بچپن میں کھیتوں کو دھوپ میں جاتے آتے ماں کے سائے سائے چلتا تھا تو اُس میں بھی آرام پاتا تھا۔ مجھ سے قریب ہی پڑانا لدا رنگستہ حالت میں کھڑا تھا جس کے ساتھ بیل باندھے ہوئے تھے۔ میں نے اُسے دیکھ کر کہا۔ ”دیر جی، آپ اس کا بان کیوں نہیں بنا لیتے؟“

اپنے جھتروں کے بارے میں ایسا سوچنا رکھوں کے تبرکات کی بے حرمتی کرنا ہے! اُس نے مجھے لوں

دیکھا جیسے اُسے مجھ سے اُس سوال کی امید نہ تھی۔ ”کیا تجھے سکول میں بھی پڑھاتے ہیں؟“ اُس نے طنز یہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں بھی پڑھاتے ہیں!“ میں نے پورے اعتماد سے کہا اور اپنی بات کو جاری رکھا، ”ستیا سنگھ زراعت

ماسٹر کہتے ہیں کہ نظم فطرت کی خود آرائی کا راز، باز گردی میں ہے۔ دیکھئے ناں! آپ گدے کا ایندھن نہیں بنائیں گے تو



اسے دیمک کھا جائے گی! میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا، گڈے کے پاس گیا اور پہننے پر ابھری ہوئی مٹی کو چھوا جس کے اندر دیمک چپ چاپ اپنا کام کر رہی تھی۔ میرے ہاتھ لگاتے ہی بھر بھر مٹی جھڑکی اور اندر سے دیمک نمودار ہوئی۔ اسارھ میں چٹے بگھے، بھورے ہو جاتے ہیں لیکن دیمک اسی طرح شفاف رہتی ہے جیسے وہ ہوتی ہے۔ اُس کے آریار دیکھا جاسکتا ہے۔ دیمک دو متضاد سمتوں میں جا آ رہی تھی یہاں وہاں آپس میں ٹکراتی، جڑکتی، مٹنے اور مچھ ہلاتی جیسے باہم کارگزاری اور جلد بازی کی داد دے رہی ہو۔

”ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا!“ اُس نے لیٹے لیٹے کہا۔ اُس کے چہرے کے بھاؤ سے لگا کر اُس نے میری بات کو پسند کیا ہے اُس نے اٹھنا چاہا اور پھر خیسے ارادہ بدل لیا اور میری تائید میں کہا۔ ”چونی، دانہ دانہ کر کے کھتا لے جاتی ہے اور یہ ذرہ ذرہ کر کے لکڑی کو مٹی کر دیتی ہے۔ میں کل ہی اسے بھاڑ کر ایندھن بناتا ہوں۔“

”ویرجی، میں چننا ہوں۔ دھوپ بڑھ رہی ہے۔“ میں نے ٹکوا اٹھاتے ہوئے کہا۔  
 ”اموں میں جالی پر لگی ہے۔ لے، طلبی کے لئے کچھ آم لے جا۔“  
 وہ اٹھا اور تھانو لے میں سے چند آم نکال کر مجھے دیئے جو شاید کل رات ہوا سے گرے تھے۔  
 رہنے دیجئے! میرے پاس ڈالنے کے لئے کپڑا نہیں ہے۔ میں نے اپنی رضامندی میں بے بسی کا اظہار کیا۔

”میں جالی میں ڈال دیتا ہوں۔“  
 اُس نے کھڑی کے اوپر پڑی جالی اٹھائی اور تقریباً آدھی اموں سے بھر دی۔  
 ”اتنے کیا کرنے میں؟ تھوڑے کم کر دیجئے۔“  
 ”تھوڑے راج کی کے گھر میں دے دینا اور کہنا کہ میں نے بھیجے ہیں۔“  
 میں نے شکریہ ادا کیا، جالی لے کر روانہ ہوا تو اُس نے کہا، ”لامبرے کی سرحد پر جاؤ۔ وہاں لیکروں پر گوند کے ڈھیر ہیں۔“

”یہ بات ہے تو لڈا لے جاؤں آپ کا؟“  
 گڈے کے ساتھ باندھے ہوئے بیلوں کی طرف دیکھ کر میں نے کہا، جو کربال کر رہے تھے۔  
 ”بد معاش ہے تو! پورا بد معاش۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔  
 ”جو کچھ ہوں، آپ کا چھوٹا بھائی ہوں!“  
 میں زیر لب مسکرایا اور اُس کی بات سے بات پیدا کر کے خوش ہوا۔

”اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ تو پورا بد معاش ہے! میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔“  
اُس نے میری بات سے لطف اٹھایا اور اپنی بات میں نیا معنی پیدا کیا۔

اتنے میں عطر سنگھ دکھائی دیا جو دریا م سنگھ کا بھتا لے کر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر دریا م سنگھ نے مجھے  
دعوت دی، تھوڑا مٹھاپنی کر جاؤ!

”وہ آپ کے لئے ہی کافی ہو گا!“

اُس کی پیش کش پر میں نے نہ اقرار کیا اور نہ انکار۔  
”مٹھا اور جھگڑا بڑھانے میں کیا دیر لگتی ہے؟“

اُس نے ٹھیٹ دھتانی کہاوت دہرائی۔

عطر سنگھ قریب آ پہنچا تھا، میں نے اُسے ست سری اکال بلائی۔ اُس نے گھٹی سی آواز میں میری  
ست سری اکال کا جواب ست سری اکال میں دیا اور دریا م سنگھ سے بولا۔ ”کیا گری پڑ رہی ہے!“  
”اساڑ میں بیست پڑے گی کیا؟ گری ہی پڑے گی!“ اُس سے بھتا لے کر دریا م سنگھ نے اُس  
پر چوٹ کرتے ہوئے کہا اور کُنویں کی جانب بیل پڑا۔ اُس نے گوزے پر سے ڈبّا اتار کر ایک طرف رکھا اور  
مٹھے پر سے پانی نِٹارا، جب تک میں نے تازہ پانی کا ڈول نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اُس نے کونے  
کے اطراف پانی ڈال کر اُسے ٹھنڈا کیا اور اُس تقریب میں سارا پانی بہا دیا۔ میں نے دوبارہ پانی نکالنے کے  
لئے کُنویں میں ڈول ڈالا، اُس نے کہا، کُنویں کی تہ سے ٹھنڈا پانی نکال!“  
میں نے ساری نیچ کُنویں میں چھوڑ دی لیکن ڈول تہ کو نہ لگا۔ میں نے آزارِ تجسس پوچھا۔ ”ویرجی!  
کُنویں میں کتنا پانی ہے؟“

”کیوں؟ پورا میں ہاتھ ہے۔“

اُس نے دبیں سے کُنویں میں جھانکا جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔  
”میں نے ساری نیچ چھوڑ دی ہے، ڈول تہ میں نہیں لگا۔“

میں نے کُنویں میں گہرا جھانکا اور ڈول کی گہرائی کا اندازہ لگایا لیکن لگا نہ سکا۔

یہ ڈول تہ میں لگانا ہے تو اتنی نیچ اور چاہیے۔ اُس نے پورے اعتماد سے کہا جیسے اُس نے  
نیچ اور کُنویں کی گہرائی پائی ہوئی ہو۔

میں نے ڈول کو کئی بار اوپر اٹھایا اور نیچے گرایا۔ پانی میں ڈول کا وزن نہ ہونے کے برابر تھا اور میرے  
اِس علم کی تصدیق کہ اگر کوئی مادی وجود، پانی میں رکھا جائے تو اُس کا وزن اتنا کم ہو جاتا ہے جتنا پانی وہ ہٹاتا ہے۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوا، ڈول ہاتھ نکالا اور وریام سنگھ کو دیا۔ اُس نے مٹھے کو تازہ پانی سے کوزے کی گردن تک بڑھایا، اُس میں کوہستانی نمک گھولا۔ انگشت شہادت سے مٹھا اٹھایا، منہ میں ٹپکایا اور بے تکلف دعوت دی۔ ”لے پی جتنا پینا ہے! لون کم لگے تو بتا دینا۔“

میں نے ہاتھوں سے اوک بنائی اور منہ سے لگائی۔ وہ کوزے سے اوک میں مٹھا ڈالنے لگا اور میں پینے لگا۔ میں نے سر ہلایا تو اُس نے کوزہ ہٹایا۔ مٹھے میں کوزے کی ہلکی سی میٹیلی ٹپک تھی۔ اُس نے اٹلی مڑے کو لطیف حد تک بڑھادیا۔ اُس کے مزیدار اصرار پر میں نے کہا۔ ”ویرجی! پیٹ، خلق تک بھر گیا ہے! اور کہاں ڈالوں؟“

”ارے مٹھے کا کیا ہے؟ ایک بار موت کیا اور مٹھا ہم قہم! اُس نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

وریام سنگھ نہانے کے لئے کپڑے اتارنے لگا اور میں نے کیکروں کا راستہ لیا۔ میں چند قدم ہی گیا تھا کہ عطر سنگھ کا اداس اور خاموش چہرہ، میری آنکھوں میں پھر گیا اور اُس کے ساتھ جڑا ہوا قصہ بھی۔ اُس کا بیابا پہاڑ کے کسی گاؤں میں پورے دھارمک رسم درواج کے ساتھ ہوا تھا۔ اُس کے سسرال والوں نے اپنی بیٹی کی بری کے ساتھ پچاس تو لے سونے کی مانگ کی تھی جو پوری کی گئی تھی۔ رات تو ترے کے جنگل میں واپس آ رہی تھی کہ کچھ گھوڑ سوار تلواریں سونے گھوڑے دوڑاتے آئے اور مار دیکر دو کا شور مچاتے براتیوں پر ٹوٹ پڑے۔ جدھر کسی براتی کا منہ تھا وہ ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑ سوار پسپا ہوئے، براتی تاکتے جھانکتے جھار دیوں میں سے نکلے، کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن بری غائب تھی اور اُسی طرح ذہن اور گوہار۔ جب اس حادثے کی خبر عطر سنگھ کے سسرال میں دی گئی تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔ پھر باتوں باتوں میں یہ بات مشہور ہوئی کہ عطر سنگھ کے سسرال والوں نے کنیا کی جگہ کنور کے ساتھ پھیرے دیئے تھے اور گوہار کے بھیس میں بھی لڑکے کو بھیجے تھے اور پھر دونوں کو جنگل سے بھاگ لے گئے تھے۔

اُن دنوں پنجاب میں لڑکیاں کم تھیں جس گھر کے سارے لڑکے بیاہے جاتے تھے، اُس کا بڑا نام ہوتا تھا۔ زیادہ تر بٹے کے رشتے ہوتے تھے۔ جاٹوں کے بارے میں مشہور تھا کہ اُن کے گھر میں صرف بڑے بھائی کا چوہا جلتا ہے اور باقی سب اُسی میں پکاتے کھاتے ہیں۔ یہ نقلیں اتنی عوام پسند تھیں کہ بس!

کوئی لڑکی پہلی بار سسرال جاتی ہے، وہ کچھ دن لاج شرم میں کی شوہر کو برداشت کرتی ہے اور پھر بوکھلا کر اپنی ساس سے پوچھتی ہے، ”ماں ماں! میرا شوہر کون ہے؟“

ہو! تو، مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟ مجھے خود معلوم نہیں کہ میرا شوہر کون ہے!“

بچو! اپنے سچان کو خوش خبری سناتا ہے۔ ”شیریاں! میں تیرا بیابا پکا کر آیا ہوں۔“

”دھن باد پروہت جی، بہتا دھن باد! ہاڑی آنے دو پہلے آپ کا کھتا بھڑوں گا اور جو بچے کالے اپنے گھڑاؤں گا۔“

”لیکن!“

”یہ لیکن کیا؟“

”لڑکی کے ساتھ گیلڑ، ریبب ہے۔“

”تو کیا ہوا! جہاں دس حیوان پلتے ہیں وہاں ایک آدم زاد بھوکا مرے گا کیا؟“

”لیکن!“

”یہ پھر لیکن کیا؟“

”لڑکی ذرا کالی ہے!“

”کالی ہے تو کیا ہوا! رنگ کوئی کھانے کی چیز ہے جو وہ بے سواد لگے گی؟“

”ایک بات اور ہے!“

”اب کیا بات ہے؟“

”لڑکی کافی ہے!“

”کافی ہے تو کیا! چار پانی کافی ہو تو نیچے تھوڑے گراتی ہے! سونے ہی کے کام آتی ہے۔“

”شیر ریاں!“

”پروہت جی ایک بات بتاؤ، لڑکی نیچے سے ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے! مجھے اوپر سے کیا لینا ہے؟“

میں نے کالے ام کے سارے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرے بائیں پاؤں میں سول ٹوٹ گئی اور میں لنگڑا کر دبیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے نسال (کائے کا وہ حصہ جو ماس کے اندر ٹوٹ کر رہ جائے) ٹٹولا اور اسے مانتوں سے پکڑ کر کھینچنا چاہا۔ اس کی بیٹھ، ماس سے زیادہ باہر نہ تھی اس لئے پکڑ میں نہ آسکا۔ گوند آرام، کالے ام سے دھبی دے کر بیٹھا ہوا تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اونچی آوازیں یقین سے کہا: ”کانٹ لگ گیا ہے کیا؟“

میرے سر کے اشارے سے ہاں، سن کر اس نے اپنی کمر سے گتھی کھولی اور اس میں سے سوئی، موچا اور چاقو نکالا اور مٹی میں رگڑ کر انہیں صاف کرنے لگا۔ میں لنگڑا آتا اور اڑی کے بوجھ پر چلتا ہوا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے نسال کو تھوک لگا کر صاف کیا اور اسے موچنے سے پکڑ کر کھینچ کر نکالا۔ میں دھوپ میں سے روڑا اٹھا کر لایا، پسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور زخم کو اچھی طرح داغ دیا۔ گوند آرام مجھ سے دو نسلیں بڑا تھا۔ میں نے اس کی دُور آندیشی کو سراہا اور ان آلات کی دستی بناؤٹ پہچان کر اس سے پوچھا: ”تایاجی! یہ آلات آپ کے اپنے بنائے ہوئے ہیں؟“

مجھے قدردان اور متوجس پاس پا کر وہ کسی پرانی یاد کو تازہ کرنے لگا۔ اُس نے اُن آلات کو ایسے دیکھا جیسے وہ اُن سے نیا نیا متعارف ہوا ہو۔ اُس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ اُس کا اُن سے جذباتی رشتہ ہے۔ وہ گویا ہوا تو اُس کا لہجہ زندہ ہوا تھا، ”یہ تینوں آواز میرے بھائی جی (داگر دُن کی روح کو چروں میں جگہ دے) کے بنائے ہوئے ہیں۔“ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن جذبات سے لبریز دل، گلے تک بھرا ہوا۔ اُسے چھلکنے سے بچانے کے لئے وہ پیچھے جھک کر اُپر دیکھنے لگا لیکن میں نے تیرے ہوئے آنسو دیکھ لئے جو آنکھوں کے گوشوں سے کانوں کی طرف لڑھک رہے تھے۔ اُس نے پگڑی کے کٹے آنسو پونچھے اور اپنے آپ پر قدرے قابو پا کر کہا۔ ”میرے بھائی اتنے طاقت ور اور کارگر تھے کہ وہ ایک تاؤ میں کمائی پیٹ کر پھال بنا دیتے تھے۔ وہ لوہے کو ایسی آب دیتے تھے کہ اُس سے ریشہ کاٹا جاسکتا تھا۔ وہ نالی پر ڈنٹر پلا کرتے تھے اور نالی، پسینے سے بکچڑ ہونے تک ڈنٹر پیلتے رہتے تھے۔“

اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور آنکھیں موند لیا جیسے کوئی ٹھانٹیں مارتا ہوا سمندر اچانک شات ہو جائے۔ آواز، اضطراب ہے اور خاموشی، ممانت۔ اپنے تکلیف دہ لمحوں میں تایا جی خاموش ہو جاتے تھے اور ایسے گوشے میں جا بیٹھتے تھے جہاں کوئی اُن کی تنہائی میں مُخل نہ ہو۔ وہ کئی بار مومن رکھتے اور کم سے کم بات کرتے۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ خاموشی اُن ساری باتوں پر بھاری ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اُن دنوں اُن کے چہرے پر روشنی سی ہوتی جیسے اُن کی روح منور ہو گئی ہو۔ کچھ ویسا ہی منظر میں نے گوئندرام کے چہرے پر دیکھا۔

میں اُس کے اس جذبے سے واقف تھا اور اُس کے کئی چہرے دیکھ چکا تھا۔ وہ خود کوئی ایسا کارگر نہ تھا لیکن اُس کی ساخت کہتی تھی کہ وہ جوانی میں کرل جو ان رہا ہوگا۔ اُس کی چوڑی چمکی کلائی، میری پنڈلی سے موٹی تھی۔ میں اُس اکھڑ ہتھان کے جذبات کی نفاست اور سعادت پر حیران ہوا۔ اُس کے ہر لفظ میں انسانی ورثے کی شان اور احسان ہندی کی ان تھی۔ اُس نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کے گوشے پونچھے اور مجھے نرم نگاہی سے دیکھا جیسے میں نے اُس کے جذبات میں شریک ہو کر اُس پر عنایت کی ہو۔ اُس کے چہرے پر جو تسکین تھی وہ کسی پر خلوص بیٹے کو اپنے باپ کا قرض چکا کر ملتی ہوگی۔

اس وقت گوئندرام کے چہرے کے ساتھ کئی اور چہرے میرے سامنے ہیں۔ میں اُن کے بارے میں الگ الگ لکھنا چاہتا ہوں، بچوں کو اُن کے جذبات ایک ہی نوعیت کے ہیں اس لئے میں انہیں اجتماعی طور پر بیان کرتا ہوں تاکہ تکرار سے بچ سکوں۔

وہ جفاکش لوگ سادہ لوح اور جاہل تھے اور اپنی جہالت کی وجہ سے خدا کے دالوں کے فریب کا شکار تھے۔ وہ اپنی زندگی کو رحمت حق کا منظر مانتے تھے اور چورامی (شائستروں کے لحاظ سے آتما کو صرف مانس جیون

ہی سے مٹھی مل سکتی ہے۔ پر ماتما کی کرپا سے آتما سخت نہ ہو تو پھر جینے اور مرنے کے چکر میں پڑ جاتی ہے اور چوراسی لاکھ جون بھوک کر ہی مائس جیون باقی ہے) کو اپنے ککڑوں (برے کرموں) کا پھل گردانتے تھے۔ مذہبی تعلیم اور روایات سے وہ انہوں کا پلندہ تھے۔ اور زندگی کی حقیقت سے بے بہرہ۔ وہ اپنے طور پر کچھ سمجھنا بھی چاہتے تھے تو سمجھ نہ سکتے تھے کیوں کہ انہیں بار بار یہی سمجھایا جاتا تھا۔

رام نام جب بندیا  
کاٹی جائے گی چوراسی تیری

کھانا جھوٹا کرنے سے پہلے وہ ایک گراس باہر رکھتے ہوئے سوچتے کہ اگر پر ماتما کی کرپا سے ان کے پُرکھوں کی چوراسی نہ کی ہوگی تو ان کی رومیں جیو جنت میں بھٹک رہی ہوں گی۔ وہ ان کی رومیوں کی بھلائی کے لئے تیرتھ نہاتے، پانٹھ کرواتے، دان کرتے، مرند (کھڑی فصل کا کچھ حصہ بطور خیرات چھوڑنا) چھوڑتے، سلائے جگتے اور اس رزق کو غریب غریب کے لئے رہنے دیتے۔ اُس وقت ان کے جذبات و اظہار ایسے ہوتے جیسے کوئی اپنا گھر لٹا کر اپنی تہی دستی پر ناز کرے۔ اُن رُوم مغفرت میں اُن سوڈل کا نذرانہ ان کی رُوح کی سخاوت کا آخری چارہ کار تھا جس کا صلہ، تسکین وہ سرِ عمل پاتے تھے۔ اُن کی بے اختیاری میں جو دیانت داری تھی، وہ مکمل برہم دگی کی سی تھی۔

میں نے گوند رام کا شکریہ ادا کیا اور اپنی منزل کا راستہ لیا۔ میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ اُس نے مجھے آواز دے کر کہا، ”کالا! میرے پشوا دھر ہانک دو۔“

اُس کے مویشی لامبرے کی طرف منڈ کر کے چر رہے تھے۔ میں نے اب جو کی اُگاہ سے ایک ٹہنی توڑی اور اُس سے پشوکس کو ڈرا اور چھچکار کر گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ میں اُن سے سو قدم آگے گیا اور دیکھا، ہری سنگھ ایک جھاڑی کے سائے میں سویا پڑا ہے اور اُس کے سانٹ لگے بیل، دلدل کے کنارے چر رہے ہیں۔ میں اُن کے پاس سے گزرا تو انہوں نے چرنا چھوڑ دیا اور کان پھٹپھٹاتے ہوئے چوکے ہوئے جیسے انہیں مجھ سے خطرہ ہو۔ وہ دونوں بیل، سر رکھنے تھے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، اُن کے پاس سے گزر گیا اور کیکردوں کے پاس پہنچ کر دم لیا۔ اُن پر گوند ڈھیلوں کی طرح جما ہوا تھا، جن پر تازہ رسا گوند، نگینوں سا چمک رہا تھا۔ جتنا گوند آسانی سے اُتر سکتا تھا، میں نے اتارا اور گھر کا راستہ لیا۔ اُس کے بعد میں نے گوند اکٹھا کرنا اپنا مشغلہ بنالیا۔ ایک کاٹ میں سے گوند رسنا کم ہوتا تو میں اُس سے کچھ دودھ دوسری کاٹ لگا دیتا۔ برسات میں گوند دوسرے موسموں سے زیادہ رسنا تھا۔ ماں کے ذخیرے خانے میں ایک بٹونی خالی پڑی تھی۔ میں نے اُسے گوند سے بھر لیا پھر گوند اکٹھا کرنا بند کیا۔ بھایا جی سیاہی اور سیلیٹی کے لئے بیسوں کے عوض گالیاں دیتے تھے۔ میں اپنی سیاہی لیکر کے کوئلے اور گوند سے تیار کرتا جو بازاری سیاہی سے چسلی ہوتی۔ میری مذرت پسندی! میں سختی کے لئے زیادہ گوند والی اور کاغذ کے لئے کم گوند والی سیاہی بناتا اور دودھ و اتیں

رکھا۔ جزدان میں دو دوائیں رکھنا مشکل تھا۔ میں نے اُن کے لئے لکڑی کا چھوٹا ڈبّا بنایا اور اُس کا قفل بھی۔ وہ قفل، طوطے کی چونچ جیسا اُنکڑا تھا جو مدار کے گرد گھومتا اور کیل کے ساتھ مقفل ہوتا۔ اُس میں دو پلپ بات یہ بھی کہ اُنکا گاؤ تو ملک کی آواز آتی تھی جو اُس کے مجمع بیٹھنے کی اطلاع کرتی تھی۔ دوائوں کے دھکن کے لئے میں نے ڈبے کے سرپوش کے اندر، ربرڈسٹائی تھی۔ ڈبّا اُٹا ہونے کی صورت میں ربرڈ، دوائوں کو بہنے نہ دیتی تھی۔ میری تحریر ایسے چمکتی تھی جیسے سیاہی میں گرد الماس ملی ہوئی ہو۔ میں سیاہی کا سیٹیوں سے مبادلا کرتا اور اپنا کام چلاتا۔ سکول کی فیس کا مسئلہ ناقابلِ برداشت حد تک ناخوشگوار تھا۔ اُس کے لئے بھائیاجی کے بندھے ٹکے جملے سننے پڑتے تھے۔ وہ انہیں بدلتے نہ تھے جیسے اُن کی تقدیر کے قائل ہوں۔

”فیس، فیس، فیس! تو ایک ہینے میں کتنی بار فیس لے جاتا ہے؟“  
 ”ارے تو فیس مانگتے ہوئے اوپر سویر کیوں نہیں دیکھتا؟“

”تُو نے پڑھ کر تحصیل دار نہیں بننا ہے! جمع تفریق کرنے اور خط لکھنے کے قابل ہو گیا ہے کافی ہے۔“  
 آج سے سکول جانا بند کر دے۔

مجھے کوئی وقت یاد نہیں آتا، جب میں نے فیس مانگی ہو اور بھائیاجی سے گالی یا مار نہ کھائی ہو۔ میں اُسی ایک ادبیت کا شمار کروں تو ہند سے کم پڑ جائیں جو کوئی بھکاری کو کچھ دیتا ہے وہ اُس کے کشکول یا ہاتھ کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ میری حالت اُس سے بری تھی۔ وہ دور ہی سے میری طرف پیسے پھینکتے جیسے کوئی آوارہ گئے کو روٹی کا ٹکڑا دالے۔ اُن کی یہ کمینی حرکت مجھے تڑپا کر رکھ دیتی۔ میں دل ہی دل میں انہیں دشمن کی طرح کوستا۔ اُن کا یہ رویہ اس قدر تکلیف دہ تھا کہ اُسے تسلیم کرنے اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے مجھے جان سے گزرنا پڑتا۔ بھائیاجی برآمدے میں آہو تھیں (چارہ گترنے کے لئے زمین میں گاڑی ہوئی لکڑی) پر کٹی کاٹ رہے تھے۔ فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی ورنہ پانچ دہدے سزا تھی۔ میں فیس لینے کے لئے آگیا۔ انہوں نے اول جلول بکتے ہوئے بندی میں سے پیسے نکالے اور مجھ پر پھینکے۔ میری بد قسمتی! ایک آدھ مجھ سے ٹکرا کر جھس میں جاگرا۔ میں نے جھو سا چھان مارا لیکن وہ منحوس نہ ملا۔ اُس ناخواسہ نقصان کا وہ میرے ہی سر آیا۔ ادھر میں اکیلا اور ادھر کالیوں، گھونسوں، ٹھپڑوں اور ٹھوکر دوں کی فوج! غیر سداوی محاذ! یہیں ہڈیوں تک پس گیا۔

وہ پڑھنے میں میری مدد کرتے تھے۔ چوں کہ اُن کا انداز انہیں کی طرح نہ آتا تھا اس نے اُس کا ذکر ضروری ہے۔ گرمی کے دن تھے اور چاندنی سے رات، دودھ کی طرح سفید تھی۔ میں چھت پر گھومتا ہوا جھرا نیے کا وہ سیت بول بول کر یاد کر رہا تھا جو زمین کی گردش سے پیدا شدہ نتائج بیان کرتا ہے۔ بھائیاجی نیچے صحن میں آرام کر رہے تھے، انہوں نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں نے چھت کے اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں بچو کر دھڑلے سے بولے، ”یہ بے

دھرتی کا دھڑا اس کے گرد دھرتی اور سریشی دونوں گھومتی ہیں۔ رات اور دن اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ انہیں پیدا ہونا ہے! موسم اس لئے بدلتے ہیں کہ انہیں بدلنا ہے! نطفہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اسے بچہ بننا ہے ورنہ وہ ٹوٹوں کے اندر جوں کا توں پڑا رہتا۔“

”کیا ہوا؟“ انہیں اچانک جلاتے سن کر ماں نے ڈرپوک سے لہجے میں پوچھا۔  
”کچھ نہیں! تیرے لاڈلے کو دھرتی کے کاروبار سمجھا رہا ہوں۔ دھرتی گھومے یا کھڑی رہے، جب تک اگائے گندم کا ہے کاغذ! لیکن ایسا نہیں ہوتا! اس لئے آدمی کام کرتا ہے اور جو کام کرتا ہے، وہ تھکتا ہے، جو تھکتا ہے، وہ سوتا ہے، جو سوتا ہے، وہ تازہ دم ہوتا ہے اور پھر کام کرنے کے قابل۔ میں تازہ دم نہیں ہوں گا تو کام کیسے کروں گا اور کام نہ کروں گا تو تم سب کو کیسے پالوں گا؟ بیکار پلے!“

ہمارے کھیت میں ایک پتھر تھا۔ بھائیاجی کھیت پہلے بیجتے تو اسے اٹھا کر دولت رام کے کھیت میں پھینک دیتے اگر دولت رام پہلے کھیت بیجتا تو وہ پتھر ہمارے کھیت میں پڑا ملتا۔ کوئی یہ نہ سوچتا کہ اسے مینڈ پر گاڑ دے یا فور کسی دیرانے میں ڈال آئے۔ باجرہ کاٹتے ہوئے وہی پتھر دکھائی دیا جسے بھائیاجی نے دولت رام کے کھیت میں پھینکا تھا۔ بھائیاجی نے اسے لٹھکا کر ایک طرف کیا تاکہ اس کے گرد اُگا ہوا باجرہ آسانی سے کاٹ سکیں پتھر کے نیچے سے وہ نکوسے نکلے جو اُس کے دباؤ کی وجہ سے ابھر نہ سکے تھے۔ وہ ادھورے پودے دیکھ کر تایاجی نے بھائیاجی سے کہا، ”رتن سیال! ماں باپ جاہل اور جاہل ہوں تو بچوں کی حالت ان انکوروں کی سی ہوتی ہے۔“

”ماں باپ اپنے بچوں کا اس قدر خیال کریں گے تو خود کیوں کر پیس لگے؟“  
انہوں نے پتھر کو ایسے دیکھا جیسے اُس کی بے حسی کی داد دے رہے ہوں۔  
”انسان کی بھی خوبی، آفاقی ہے! یہ کسی کو جتنا دیتا ہے اپنی ذات میں اُس سے زیادہ اضافہ کرتا ہے۔“  
تایاجی نے انسانی زندگی کے تخلیقی رجحان کا مثبت پہلو اجاگر کیا۔  
”پتھر کے دودھ کے دانت ٹوٹ جائیں تو کائے اُسے لات مار کر تھن چھڑوا لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج جا اور گھاس کھا۔ وہ بڑوں نہ کرے تو پتھر اُس کا خون بھی سرپ جائے!“

بھائیاجی نے اپنا فلسفہ بگھارا۔

”یہی وجہ ہے کہ حیوان کا بچہ ہمیشہ اُصل کی نقل ہوتا ہے جب کہ انسان کا بچہ، اُصل سے کم یا زیادہ!“

ایک انسان دوسرے انسان کا جواب دہ ہے۔“

تایاجی نے انسانی اور حیوانی زندگی کے نشوونما کا نازک فرق سمجھا یا۔

بھائیاجی کام کرتے کرتے اگے نکل گئے اور تایاجی اُن تمام انکوروں کو دیکھتے رہے جیسے اُن کے بارے



میں مزید سوچتے رہے۔

سر سبز کھیتی میں گھرے ہوئے، وہ ادھورے انکھور اس وقت میری نظروں کے سامنے ہیں، اُن کی نامی اس قدر مکمل ہے کہ دھوپ لگنے سے وہ بالکل ڈھیر ہو گئے ہیں۔

مجھے یہاں وہاں بے شمار واقعات یاد آرہے ہیں جو میری آنکھ پر بوجھ تھے اور اُس کی روک بھی۔ میں کبھی دھڑ سے کسی کو نظر انداز کرتا ہوں تو وہ مجھے کوستا ہے، ”تو میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گا تو اپنی سچائی سے انصاف نہیں کر سکے گا۔ خیر یہ تیرا معاملہ ہے! لیکن یہ یاد رکھیں اپنی بے قدری کا بدلہ مجھے ضرور لوں گا۔“

ادراستی میں جس واقعے کو نظر انداز کرتا ہوں وہ مجھ سے انتقام لیتا ہے۔ میرے قارئین حیران ہوں گے کہ کیسے؟ وہ ہٹلی مکھی کی طرح میرے ذہن پر بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے دق کرتا ہے اور میری سُرَت بھنگ کرتا ہے۔ میری مشکل! میں کسی واقعے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ میں اکثر ایسی روحانی اذیت میں گرفتار ہو جاتا ہوں جس سے بچنا ناممکن ہے۔ اپنی بچائی رکھتے ہوئے، میں جیسے نازک جذبات سے گزرتا ہوں، میں ہی جانتا ہوں! میری آنکھیں جوش گریہ سے طوفانی دریا کی طرح چڑھ اُتی ہیں اور کبھی ضبطِ گریہ سے صحرائی طرح مہلکی ہیں۔ میرا عذاب یکتا ہے اور دردِ نرالا۔ میرے اندھیرے میں اُجالا ہوتا لیکن وہ جھلک اتنی چھوٹی ہوتی کہ میں اپنی بدحواسی کا شکار ہو جاتا۔ میری ماں کی استقامت پسندی اور بُروبادی مجھے ہمارا نزدیک تو جانے مجھ پر کیا گزرتی؟ اُس نے جس طرح میری حفاظت کی بیچ اپنے انکھور کی کتاب ہے۔ میری کمزوری مجھے کڑواں و نیرزاں رکھتی لیکن اُس کی ایک نظر مجھے سنبھال لیتی اور میں پھر اُس منزل کی جانب چل پڑتا جسے بُزولِ قسمت کہتے ہیں۔

میرے سکھنے کا راستہ میرے حالات ہی کی طرح طُرفِ تماشا تھا۔ برسات میں وہ جوئے رواں کی طرح بہتا۔ اُس کے چمکنے کناروں پر پیسہ نہ جستے، جو اُن پر چھوٹے چھوٹے قدموں سے نہ چلتے، وہ پھسلے اور گرتے۔ وہ فاصلہ طے کرتے کرتے پاؤں دھکی پھٹی ہوئی رُوی کے گالے سے بن جاتے۔ ٹاٹ کی گھٹی میری برساتی تھی۔ وہ پانی جذب کرتے کرتے پچھڑنے اور کپڑے بھگونے لگتی۔ گھٹی کوئی دوسرا لے جاتا تو میں درختوں کی پھریوں کے سائے سائے پھٹتا۔ بھگتے کپڑے سوکھتے، سوکھتے، لیکن اُس بدبو سے تازہ رہتے جو رطوبت کی لعنت ہے۔ جارا اپنے عذاب لے کر آتا۔ اب جو میں سے گزرتے ہی کیلے پاؤں کو ہوا لگتی اور وہ سننا جاتے۔ دورانِ سفر وہ جیسے کیسے ساتھ نہا ہے لیکن دُعا کے لئے کھڑے ہوتے ہی وہ سونے لگتے اور جھٹکنے جھٹکنے پر بھی ہوش نہ سنبھالتے۔ سانسوں کی حالت پیسروں جیسی ہی نازک ہوتی۔ پھسپھسے اُن کی پوری گرمی پھوڑ لیتے اور اُن کی ہمت ہی بدل دیتے۔ وہ کُہرے کے باذل لگتے۔ آویزاں تجارتیں تنہوں پر بیٹھ کر کھجاتے اور چھیننے پر آمادہ کرتے۔ دُعا کے رُکے رُکے لمحے ختم ہونے پر پاؤں اٹھائے نہ اٹھتے۔ میں اُن برقیلے تودوں کو گھسیٹتا ہوا کٹوں تک نیچتا آ اور اُن پر تیرا دیتا۔ رگیں، برف کی کرچوں کی طرح ٹوٹیں اور پاؤں پر چیونٹیاں۔ نیگتیں۔ میں بے قرار ہو کر پاؤں جھٹکتا، کلاس۔ دم تک دلی لگتا، ڈیس پر آروں بیٹھ کر فیس کی بجلی

ناک تک چڑھاتا اور 'سی سی' کرتا ہوا اپنے گرد سہمی سہمی ٹھٹھری ٹھٹھری نظر دوڑاتا۔ مجھ آدم زاد پر اُس پرندے کا گمان ہوتا جو پروں میں چوچ گھسائے بیٹھا ہو۔

میرے قارئین! میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ ایسے افسردہ جذبات اور پست حالات کا تعلیم جی بلند و برتر شخص سے کیا رشتہ ہے؟

گرمی میں آبِ جو کا پانی چند قدموں میں مسکراتا اور باقی پاٹ، ریگ زار بن کر پھیل جاتا۔ اُس پر چلنا صحرا ٹوڑی کرنا تھا۔ میں کہیں ایریوں پر چلتا اور کہیں بیچوں پر، عین صحرائی گرگٹ کی طرح۔ جب اس سے کام نہ نکلتا، میں سر پیٹ بھاگتا، جہاں برداشت نہ کر سکتا وہاں سختی پر کھڑا ہو کر آرام کرتا اور پھر آگے بڑھتا۔ سختی چھٹی تو کچھار کی بھاریاں کام آئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ میں نے پاؤں پر پتوں کے پاتالے باندھ کر اُس پستے صحرا کو پار کیا۔

اول تو جوتا ملتا نہ تھا کبھی ملتا تو ادھوڑی کا پان والا جوتا، جسے گنوار پہنتے ہیں۔ وہ میرے نازک پاؤں کو ٹٹنا اور میرے عذاب میں نئے طریقے سے اضافہ کرتا۔ میں اُسے سرسوں کا تیل مل کر نرم بناتا اور پھر پہنتا لیکن چند ہی قدموں میں محسوس کرتا کہ میرے پاؤں، بھرپوں کے جھتے میں رکھے ہیں۔ میں جوتا اُتار کر دسے ہوئے پیروں کو دیکھتا، اُن پر چیریں، چرکوں کی طرح جلنے ہوتے۔ میں جوتا ہاتھ میں پکڑتا، ننگے پاؤں چلتا اور ہم عقروں کی طنزوں کا نشانہ بنتا۔ میں اُسے اُس موچی کے پاس لے کر جاتا جس نے اُسے بنایا ہوتا۔ وہ اُسے کالیوت دیتا، اُس میں مسکھ تلاؤ آتا لیکن اُس کی تعمیل میں فرق نہ پڑتا۔ اُس ذیل جوتے سے ننگے پاؤں رہنا آرام دہ تھا۔ ہریانہ کے بڑے بازار میں پیپل کے نیچے بیٹا رام موچی کی دکان تھی۔ وہ نری کا پتلی کمر کا جوتا بناتا تھا جو اُس وقت کا پہنواد تھا۔ بھائیاجی اپنا جوتا، اُسی سے بنواتے تھے۔ میں کبھی بازار سے بھائیاجی کے ساتھ گزرتا، وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھ کر اُن سے کہتا، "مردارجی! بچہ ننگے پاؤں ہے، اسے یہ جوتا لے دیجئے۔" وہ دیوار پر لٹکے ہوئے جوتوں میں سے میرے ناپ کا جوتا اُتار کر دکھاتا اور مجھے آگے پاؤں بڑھانے کو کہتا اور ساتھ ہی اُس کی تعریف کرتا، "اس کا چمڑا اور نری میں نے خود کمانی ہے اور سٹوکی سلائی کی ہے۔ کئی سال چلے گا۔"

میں جوتا پانے کے امکان پر بہک جاتا، بھائیاجی کی تنگ دلی کو بیکسر نظر انداز کرتا، جلدی سے ہاتھ سے پاؤں پونچھتا اور انہیں آگے بڑھاتا۔ بھائیاجی غصے سے دیکھتے اور مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہتے، "بچے کے پاؤں نری کی طرح بڑھتے ہیں۔ یہ جوتا دو مہینے میں چھوٹا ہو جائے گا اور پھینکا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے چل دیئے اور اُن کے پیچھے میں، اندر ہی اندر سہل کی طرح ترپٹتا ہوا اور انہیں موٹی موٹی گالیاں دیتا ہوا۔

وہاں کئی ایسے تھے، جو مجھے وہ ہر چیز خرید کر دینے کے لئے تیار تھے، جس کی میں خواہش کرتا تھا لیکن میں اُس کا بدل جانتا تھا۔

## باب ۲۱

ہرنے زخم کی قسم شاہر

زندگانی سے اور پیار جتا (شاہر)

پاکستان کا دھندلا سا تصور حقیقت بن گیا۔ ہمارے گاؤں کے کتنے لوگ کوئٹے، راولپنڈی، کراچی لاہور اور کتنی جگہوں سے گھر لوٹ چکے تھے۔ جہاں دو آدمی کھڑے ہوتے، امرتسر سے اُس پارخوں خرابے کی باتیں کرتے جنہوں نے ریڈیو نہ دیکھا تھا، وہ بھی ریڈیو کی خبر سناتے۔ ہمارے علاقے کی فضا قدرے پرسکون تھی لیکن بے اعتمادی کا تناؤ پیدا ہو رہا تھا۔

ترسیم سنگھ، فقیر سنگھ اور میں سکول سے لوٹ رہے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ چلتی سرنگ پر نہ کوئی ہمارا آگے تھا اور نہ کوئی پیچھے۔ آرائیوں کے ڈیرے سے پگ دھندلی بھوٹتی تھی جو ہمارے گاؤں کی طرف دو فلائنگ دور جا کر سرنگ میں ملتی تھی۔ وہاں سے 'علی علی، یا علی' کی دہائی آئی۔ ہم نے اُدھر دیکھا، کئی لوگ بچھے اور گنڈا سے تانے ڈیرے سے نکل رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ نادر علی سے مراد، طبل جنگ ہے۔ انہوں نے ہم پر ہتھیار لہرائے تو ان کے ناپاک ارادے صاف ہو گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے چلا کر کہا، "بھاگو! ورنہ مارے جاؤ گے" اور ہم بھاگ پڑے۔ حملہ آور کھیت میں سے سیدھے ہم پر آئے۔ ان کے تہمد باجرے میں اُلجھنے لگے۔ اپنی ابتدائی سازش کے مطابق وہ تیزی سے آگے نہ پڑھ سکے اور واپس پلٹ کر پگ دھندلی پر ہوئے لیکن اتنی دیر میں ہم کافی آگے نکل گئے۔ بھاگتے بھاگتے میرا بستہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا، میں نے رکنے اور اُسے اٹھانے میں تامل نہ کیا۔ وہ اپنے کھیتوں کے کنارے اکر رک گئے اور گالیاں دینے لگے۔ اُن کا رویہ پالتو کتوں کا سا تھا، جو اپنی حدود سے باہر نکلنے ہوئے ڈرتے ہیں اور وہیں کھڑے ہو کر راہ گیروں کو بھونکتے ہیں۔

اُس حملے کی خبر، دہشت بن کر پھیل گئی۔ طالب علموں نے سکولوں کو جانا بند کر دیا اور ہر سکول پر تالا پڑ گیا۔ اکاڈ کا آدمی ہریانہ جانے سے گریز کرنے لگا۔ ہریانہ کے راجہ احمد سعید خاں کی ہندو مسلم دوستی ایک مثال تھی اور یہ اُمی کے اُتر و رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہمارا علاوہ ابتری اور بد نظمی سے بچا ہوا تھا۔ دوسرے دن بھائیاجی، لال سنگھ، وریام سنگھ اور میں راجہ صاحب کے پاس شکایت کرنے گئے۔ انہوں نے اکائیوں کو بلایا اور ہمارے سامنے کھڑا کیا۔ اُن میں سے میں نے دو کو پہچان لیا لیکن وہ قرآن مجید اور رسول پاک کی قسم کھا کر مٹ گئے۔

مراد پور کے کچھ سکھ خاندان سب کچھ لٹا کر اور اپنے چند عزیز مراد کر پاکستان سے آئے۔ مراد رجن دیو کا شہیدی پُرب تھا، مراد پوریوں نے اپنے گاؤں کے مسلمان گوجروں کے گھروں کو آگ لگا کر پُرب مٹایا۔ وہ جان بچا کر بھاگے

تو انہیں مار کر آگ میں پھینک دیا۔

ایک قتل آپسی دشمنی کا نتیجہ ہے اور قانون کی رو سے جرم ہے لیکن قتل عام، گمراہ کی ساہتس ہے اور بناوٹ بھی۔ بناوٹ کی نفسیات مُتَمَدّی ہے! اسے فوری نہ چکلا جائے تو یہ حیرت انگیز سرکشی سے پھیلتی ہے اور بہت سے دوسرے جرائم کو ابھارتی ہے جو بے لکھے قانون بن جاتے ہیں۔ جوں کہ بے لکھے قانون، غلابِ قانون ہوتے ہیں اس لئے وقتی ہوتے ہیں۔ یہ اپنا کام کر کے پس پشت چلے جاتے ہیں اور پھر رزمیوں کی صورت نمودار ہوتے ہیں اور انسانوں کے اندنی مجرموں سے میل ملاپ رکھتے ہیں تاکہ کسی مناسب وقت پر انسانوں کے خلاف اپنی ناروا داری، قداوت، بے رحمی نفرت جتا سکیں اور امن پسند جندوں میں انتشار پھیلا سکیں۔

گرو دواروں، مندروں اور مسجدوں میں رز بیے کاے جانے لگے۔ جہاں انسان اور انسانیت کی ترقی کے لئے دعا ہوتی تھی اور دُعا گو اپنی حیات و حفاظت کے ساتھ مہربت (سب) کا بھلا چاہتے تھے وہاں دُسمروں کی فناء قضا کے منصوبے بننے لگے۔ لوگ اپنے خدا سے قتل و غارت کرنے کی ہمت مانگتے اور اُسے اپنے بے رحم عمل میں شریک کرتے۔ مجرموں کے حوصلے بڑھ گئے، اُن کے راہبر پیدا ہو گئے۔ مسلمانوں کی مسلمان جانیں! اسکھوں میں سے مانی ننگان کا جنوائی اور مندوؤں میں سے بھنداری ہوشیار پوری مشہور ہوا۔ روایت کے مطابق سکھ اور گھریال سُن کر لوگ رام نام، ست نام کا اُچارن کرتے تھے۔ اُن کی آواز کو نئے اور تھ دیے گئے۔ اُسے خطرے کی نشانی بتایا گیا اور سکھ، گھریال کا حسب معمول بجانا ممنوع قرار دیا گیا۔

نہ کوئی بیسری نہیں بیگانہ

سگل سنگ موہے بن ائی

(نہ کوئی میرا میری ہے اور نہ کوئی میرے لئے بیگانہ، میں سب کا بھی خواہ ہوں!)

جن گروؤں کا یہ پیغام تھا اور اخلاقی جھجاریہ کہ وہ بدگوئی کو قتل کے مترادف سمجھتے تھے، اُن کے نام قاتلوں سے جوڑے جانے لگے۔ حیوانی جذبہ، انسانی جذبے کو ہرپ کر گیا اور آدمی آدمی کو دُشمن کی طرح دیکھنے لگا۔ بندوں نے خدا کے گھروں میں مقس بنا دیے۔ گنگا جلی پاک اور انسانی خون ناپاک بتایا جانے لگا۔ زندگی، موت کی بددعا بن گئی۔ کھڑ گنت، سنت اور بے اتما، جہان مابن گئے۔ وہ جاہل، رذیل، بد معاشرے.... جو ہر انسانی قدر کے دشمن تھے، مذہب کے محافظ ٹھہرائے گئے۔ اُن میں سے کتنے اُمرت چھک کر پاک ہو گئے اور جو پاک نہ ہوئے اُن پر دباؤ ڈالے جانے لگے۔ اُس اور سرے فائدہ اُٹھا کر کئی چماروں نے بھی اُمرت چھک لئے اور مذہبی سکھ بھلانے لگے۔

پرانی کہاوت تازہ ہو گئی،

کھانا پینا لاہے دا پنہ باقی آخدا ہے دا

بقائے نفس اور اتلافِ ذات کی جلیبتیں، انسانی زندگی کی دو متضاد طاقتیں ہیں جو اپنے عروجِ کمال

میں یکساں ہیں۔

لوگ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے۔ جو بیس گھنٹے کھڑے پہرے دیئے جانے لگے۔ زندگی کے حاصلِ کام، موت کی آغوش میں سو گئے اور مرگ آسا کام، زندگی کے حاصل ہو گئے۔ ہاتھ کا دیوارِ رزق بھول کر ہتھیار بنانے میں جُٹ گئے۔ لشکرِ سنگھ کمائیں اور بندوقیں بنا کر بیچنے لگا۔ اُس کی پیشہ ورانہ لیاقت، اُس نے انہیں خوش نما نام دے دیے۔ ایک ٹانگ کی کمان، دو ٹانگ کی کمان، ایک توڑے کی بندوق، دو توڑے کی بندوق۔ تیروں کی دافر پیداواری کے لئے اُس نے سانچے بنا لئے۔ آئی کے لئے الگ، گز کے لئے الگ اور سونے کے لئے الگ۔ گھربار، جھار اور مورچے نظر آتے۔ لوگ شستر لئے گھومتے۔ شستر گیان دینے کے لئے گرو پیدا ہو گئے۔ اُن میں سے پیپرو، نام دیو سنگھ اور جرنل سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔ بوڑھے تھے کہ بچے، عورتیں تھیں کہ مرد، دفاعِ ذات کے گریختھے۔ کوئی تلوار دھاری، تلوار دھاری سبھوٹی لڑائی لڑتا اور کوئی تیر کمان لئے تو سے پریشاں پکارتا۔ چوپالوں میں رن بولتے۔ ذرے، زخموں اور جھونکے، لہو کی بو سے تھکتے۔ سیاسی اور مذہبی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

”سکھ ٹی پھرنے جاتے ہوئے کہتے، پاکستان جا رہے ہیں!“

”مسلمان پھر کر آتے آد کہتے، ہندوستان سے آرہے ہیں۔“

آدھی کا انسان مر گیا آد بقولِ تایاجی، انسان کا خون سفید ہو گیا،

مسلمان پشت در پشت سے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھائی چارے کی زندگی بسر کر رہے تھے، وہ

گھربار چھوڑ کر ہربانہ کیمپ میں جا کر رہنے لگے۔ سادو لوح انسان، جو رسیاستِ دالوں کے سیاسی کینوں سے ناواقف تھے، یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ راج بدلتے ہیں، رعایا نہیں بدلتی ہے! بلے اعتمادی کا غبار جلد ہی چھٹ جائے گا اور مسلمان اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے، لیکن جو کوئی گیا، وہ لوٹ کر نہ آیا۔

دولتِ خاں، فرید علی کا اکھوتا بیٹا تھا۔ جب یس کھلے دالوں کا گونگا تھا تب وہ گاؤں والوں کا دولت

تھا۔ ادھر میں بچپن کی گلیوں میں رینگتا، لڑھکتا، سنہلتا ہوا گونگے سے ہکلا اور ہیکلے سے جگتا بنا ادھر وہ لڑکپن چھوڑ کر جوانی کے شہر تہتا میں جا بسا اور عدالتِ یار کہلا یا۔ وہ غیبی خیالوں کو لفظوں میں ڈھالتا اور سرتال میں سجا کر گاتا۔ میں اُس کا سرتال کیا ہوا یہ گیت گایا کرتا تھا۔

میں وطن دا شہید ہاں

میری یاد بھلا دینی

عدالتِ یار کو مال کی پکائی مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بہت پسند تھا۔ پسند کیوں نہ ہوتا؟

ماں کے ساگ اور مکئی کی روٹی تیار کرنے کا عمل وجدانی تھا۔ وہ پہلی بار ساگ میں مٹھی بھر اُٹن ملائی اور اُسے گھوٹ کر چکھتی، اس کے بعد وہ رجنکار اور پرکھیا دونوں کا فرض ادا کرتی اور ساگ میں تھوڑا تھوڑا اُٹن ملا کر گھوٹی اور چکھتی، اُس کا عمل جہاں تعمیری ہوتا وہاں دیدنی بھی! اُس کی ساری حسیں اُس کے محکم کی منتظر ہوتیں۔ وہ اپنا اپنا کردار نبھا رہیں اور لذت کو لطافت سے تعبیر کرتیں جس کی بنا پر وہ اُٹن کی مقدار کی حد مقرر کرتی۔ جو ہی ساگ اُس کے احساسِ نفاستِ ذاتہ کی تائید کرتا، اُس کی آنکھوں میں وہ چمک ہوتی جو کسی خوبصورت چیز کی دید کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ میں مکئی کی روٹی کے تیار کرنے کی تفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن گریز کر رہا ہوں کیوں کہ یہ سمجھتا ہوں کہ الفاظ اُس فعل کے لطیف عمل سے انصاف نہیں کر سکیں گے۔ اُسے دیکھنا اور چکھنا ہی اُس کی پُر خلوص قدر دانی تھی۔ یہ سوغات میسر ہوتی تو ماں، عدالت یار کو کھائے بغیر جانے نہ دیتی۔ ماں روٹی پر دسنے لگتی، وہ کس لاڈ اور بے تکلفی سے کہتا، ”اُجی! ساگ دِچ مکھن میرے جیسے دے حساب دیاویں۔ ماں جی! ساگ میں مکھن ڈالتے ہوئے میرے ذہن کا خیال رکھنا!“

اور ماں مسکوا کر کہتی، ”ہاں پُستہ! لاڈیاں تے مناں مکھن نہار۔ ہاں پُستہ! لاڈوں پر منوں مکھن نہار ہے۔“

ماں تھالی میں جتنا ساگ ڈالتی، اُس پر اُس سے ادھا مکھن ضرور رکھتی۔

آواز کا لہجہ، الفاظ کے معنی کو دصوت عطا کرتا ہے اور اپنی رفعت میں ایسی لذت پیدا کرتا ہے، جس کا حاصل عشرت ہے۔ عدالت یار نغمہ سرا ہوتا۔ اُس کی آواز تاحیر رسانی ایسا جادو جگاتی کہ کام کرنے والوں کے ہاتھ اُس کے پر تھرکنے لگتے۔ گُنوں پر پہناریوں کی حرکت، سرگرمی کا کوئی سر ہوتی۔ ایک بار آخر کو نے پانی کا ڈول کھینچنے کھینچتے چھوڑ دیا اور دزد بھری آوازیں گانے لگی۔

ڈول پچھ دے ماہی دی یاد آئی

ہتھ دِچوں لُج چھٹ گئی

(میں گُنوں سے پانی کا ڈول نکال رہی تھی کہ مجھے اپنے دلبر جانی کی یاد آئی۔

یاد کی اچانک گتک! میں نے نیچ چھوڑ کر کھینچ پکڑ لیا)

کرسان کے پیشے کو حرفِ دصوت سے کیا نسبت! لیکن عدالت یار سنگیت کی دنیا میں ہوتا تو اُسی کا باشندہ لگتا۔ ایک دن عدالت یار کو باڈمرمت کرتے دیکھ کر سیواسنگ نے پوچھا، ”یار عدالت! کرسان کے کھردے پیشے میں تیرے پاس حساس دل کہاں سے آیا؟“

وہ دو کانٹے وار شاخوں کے بیچ کا رخ بند کر رہا تھا، رک گیا اور کہنے لگا۔ ”حساس دل ہوتا ہی کرسان کے پاس ہے! یہی وجہ ہے کہ کرسان کے عمل کی پاکیزگی مسئلہ ہے۔ کرسان پودوں، شوگنوں، آٹکوروں، پھولوں، پھلوں کی خالص بزم میں پیدا ہوتا ہے اور اُسی میں مرتا ہے۔ کرسان، فطرت کی دانی ہے اور ماں بھی۔ اور صرف ماں ہی عالم

انسانی کے شیرازے کو سنبھالتی اور سنوارتی ہے۔ ماں سے بڑھ کر کوئی حساس ہے تو وہ خود ماں ہے۔“  
اُس نے سیوا سنگھ کو مسکرا کر دیکھا، گھاس کا پولا کھولا اور بیگنوں کی پود کو پالے سے بچانے کے لئے سایہ کرنے لگا۔

تایاجی کہتے تھے کہ دھرتی اور کرمان (کرمان) دو مائیں ہیں، جو پاس پاس بیٹھی ہیں۔ پہلی، دوسری کو احساسِ خاطر سے دیکھتی ہے اور دوسری اپنے بچوں کو کھانا پر دیتی ہے۔

کئی کٹر مسلمان، عدالتِ یار کے ذوقِ سرود و نغمہ پر طعنہ زن رہتے تھے لیکن وہ جس مٹی سے بنا تھا اُس سے صانعِ ازل صرف فنکار ہی بناتا ہے۔ اُس کے طویلے کے گرد ناگ پھنی کی بار تھی۔ ناگ پھنی کے پھل پکتے، وہ انہیں توڑ کر خود کھاتا اور بچوں کو کھلاتا۔ اُس کے کبھی کاٹا لگتا، وہ اُس کی چھین کو سہلاتا ہوا ناگ پھنی کو ایسے دیکھتا جیسے رُخز حُسنِ فطرت کی پردہ کشائی میں مصروف ہو۔ وہ کہتا تھا کہ ناگ پھنی کے پھول اور پھل اس کی رُخ کے مُرد اور نال ہیں۔ جو آدمی، زندگی سے سفاک حد تک نفرت کرتا ہو اُس کا نازک جذبہ اور خیال آرائی سے کیا رشتہ؟ میرے بھائیاجی، عدالتِ یار کی دیکھا دیکھی، تُو بنے، اکتارے پر گاتے۔ تایاجی انہیں گاتے دیکھ کر مسکراتے۔ ایک بار بھائیاجی نے غصے میں اُن سے پوچھا، ”تیں گاتا ہوں تو تم مسکراتے کیوں ہو؟“  
”قدرت کی شعبہ بازی دیکھتا ہوں۔“

”گاتائیں ہوں اور تمہیں اس میں قدرت کی شعبہ بازی نظر آتی ہے؟“ بھائیاجی نے تلخی سے کہا۔  
”تو نبا کر دوا ہے اور اُسے کوئی مُنہ نہیں لگاتا ہے لیکن یہ جس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اُس سے میٹھے بول ہی بولتا ہے۔“ تایاجی جھکے ہوئے انداز میں بولے۔

تایاجی سنگیت، سنگیت میں فرق کرتے تھے اور شاستریہ سنگیت کو شور یہ گاتھا درزمیہ، پر تریجیت تھے وہ کہتے تھے کہ سنگیت ایسا ہنر ہے جو جذبے کو صرف دوڑاتا ہے۔ مشتعل جذبے میں تیسری سمت نہ ہو تو یہ تخریبی راستوں پر چل نکلتا ہے۔

عدالتِ یار کا اندرونی آدمی واقعی ناگ پھنی پر پھول تھا۔ کھیتی باڑی کے کام سے اُس کی انگلیاں کھردری تھیں لیکن وہ مُردوں پر چلتی تھیں تو اُن کی خوش حرکتی سے یقین ہوتا کہ وہ صرف سنگیت ہی کی عادی ہیں۔ اُس کے وجود کی ساری سختی، انگلیوں کی پچک اور زبان کی نزاکت، بن جاتی۔ وہ گاتا ہوا پہلو بدلتا، ہونٹ سنوارتا اور آنکھیں جھپکاتا تو اُس کا ہر لمبہ نغمے ہی کا کوئی پردہ محسوس ہوتا۔ اُس کے سراپے اور نغمے میں ایسا رشتہ تھا جیسے دو چاہنے والے ایک دوسرے کی تلاش کرتے ہوں۔

ایک اُواس شامِ عدالتِ یار ہمارے گھر میں ہارمونیم پر تانِ آلاپ رہا تھا،

ننگری میری گب تک یوں ہی برباد رہے گی۔

عین اُس وقت اُس کی نگری کو برباد کرنے کے لئے سکھ لیٹروں کا جتھا چڑھ آیا۔ جو بولے سونہال، ست سری الال، کے جیکاروں سے فضا کو بھننے لگی۔ عدالت یار کی انگلیاں جہاں کی تھیں رک گئیں۔ بھایا جی گھبرا گئے، اُچک کر اُٹھے اور ایک ایک جہت میں کالٹھ کی سیڑھی کے دو دو ڈنڈے پھلانگتے چھت پر چڑھے، ویسے ہی نیچے اترے اور عدالت یار سے بولے، ”جب تک میں گھرنہ لوٹوں، تم گھر سے باہر نہ نکلا۔“ یہ کہہ کر وہ تلوار اور ڈھال لے کر گھر سے چلے گئے اور دروازہ بند کرنے کو کہہ گئے۔ اجیت سنگھ اور درشن سنگھ تیرکان اور بھرمار لے چھت پر چڑھ گئے، ماں اور میں عدالت یار کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر ٹہنے لگا۔ اُس کے اضطراب سے لگتا تھا کہ وہ وہاں خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ ماں نے ہاتھ سے اُس کا منہ چوم کر کہا، ”بیٹا، تو فکر نہ کر! جب تک ہم ہیں، تم پر آنجنہ آئے گی!“

رضا کاروں نے لیٹروں کو روکا، انہوں نے اُن کو ٹوٹ میں حصہ دینے کا وعدہ کیا لیکن انہوں نے پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ تکرار ہوئی جو بڑھ کر توڑ، یس میں پڑی۔ لیٹریے پسپا ہو رہے تھے کہ ایک ذیل نے کچھ دور جا کر گولی بھادی جو گنڈا رنگ کے لگی۔ رضا کاروں نے اُس کا پیچھا کیا لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

بھائیاجی، عدالت یار کو اُس کے گھر پہنچانے چلے، وہ قرط مجذبات سے روپڑا اور اُن کے پاؤں چھونے لگا۔ انہوں نے اُسے دلا سا دیا اور صحن کا دروازہ کھولا۔ وہ اُسے اُس کے گھر پہنچا کر لوٹے اور کتنی دیر دروازے میں کھڑے ہو کر ادھر دیکھتے رہے جیسے کسی خطرے کا خوف ہو۔

ہمارے گاؤں کے مسلمان، گاؤں والوں کی ضمانت پر ہریانہ کے کیمپ میں نہ آئے تھے، وہ دوسرے ہی دن کیمپ میں چلے گئے اور جو کچھ ساتھ لے جاسکتے تھے، لے گئے۔ ان میں سے غلام نبی کی بیوی جو لے کر گئی، وہ حیران کن شے تھی۔۔۔ اوپلوں کی راکھ! اُسے اوپلوں کی راکھ کھانے کی لت تھی۔

برسات شروع تھی، کچھ دن بعد سائے کی جھڑی لگی۔ پانی کا تانتا بڑنے کے لئے ٹوٹا۔ چھینٹے، اولوں کی طرح پڑتے جیسے دھرتی کی چھاتی پیٹتے۔ برکھا کے دل میں سے صحن کی دیوار دکھائی نہ دیتی۔ بجلی کے کڑکنے پر ام کا شش پھٹنے لگا۔ لگان ہوتا۔ کالی گھائیں، زمین سے لپٹی گئیں جیسے آدمی کی سیاہ کابریاں، گھاؤں کا رُپ دھار کر اس کا وجود ختم کرنے پر تلی گئی ہوں۔ مکانوں کے چاہے (چھت پر مٹی کی تہ) گل گئے، بنیرے (بام) گھل گئے اور پرنا لے کر گئے۔ بد روؤں سے سوتے بہتے اور گلیوں میں کچھو تسلا تے۔ مکھیوں جیسے موٹے پتھر اور کچھوؤں جیسے بڑے مینڈک گھردل اور تالابوں کا کہرام بن گئے۔ جل کا تلی، سطح زمین تک چڑھ آیا اور کنوئیں، چشموں کی طرح بہنے لگی۔ اُن میں جل چر پیدا ہو گئے۔ لوگ پانی چھان کر پیتے۔ برساتی نالے، دائمی دریاؤں کی طرح بہتے۔ سارے کھیت پانی میں ڈوب گئے، جو نہ ڈوبے اُن کی



مٹی کاٹی کے نیچے دب گئی۔ اُفتی سے اُفتی تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا اور طوفانِ نوح کی کہادت تازہ کرتا کچھار میں کاٹ لگ گئی۔ پھس پھسی دھرتی، دُف سی بجتی۔ ہوا، سانپ سی پھنکارتی چلتی۔ اِکے دُکے درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ روہی (پانڈو) کی فصل ماری گئی اور میرے (بھوڑ) کی فصل پہلی ہلدی ہو گئی۔ روہی کے راستے گھاس کے نیچے دب گئے اور کھڑوں کے راستے، کوروں سے دُھل گئے۔ کچے مکان دُھس گئے اور پتے چھلنی ہو گئے۔ چھتوں میں سے رنگ دار پانی گرتا اور جہاں پڑتا نشان نہ کھاتا۔ صحنِ چینیٹوں سے اور فرش چوے (ٹپکے) سے چمپک زدہ جہرے لگتے۔ کہیں نالی رُک جاتی تو صحن پر تالاب کا گمان ہوتا۔ سُوکھے کپڑے پھینھوندی لگے اور گیلے کپڑے، کیچڑ رہتے۔ سیل کی گھنڈا دنی باس، سانس کا حصہ بن گئی۔ دروازے پھول کر ایک دوسرے کے اوپر جا پڑھے اور گنڈے بے معنی ہو گئے۔ دروازے بند کرنے کے لئے گنڈے، رستی سے باندھنے پڑتے۔ بند کھڑکیاں، کیل ماری جیسی ہو گئیں۔ دُندے (چارے کے انبار) گل گئے، کپ سیاہ ہو گئے اور بٹورے سر گئے۔ دیواروں پر سبزے اور کُکڑ سے اُگ آئے۔ ہوا، پانی جیسی ہو گئی اور پانی کیچڑ جیسا۔ بیرون ہر چیز پر پانی پھر گیا اور اندر ہر چیز کو پانی لگ گیا۔ منکوں میں رکھے گڑ شکو، شیرے بن گئے، بوریوں میں رکھے اناج بھوٹ پڑے، کھتوں کے اناج سر گئے اور گھر بھکرا اندر سے بھبھک اُٹھے۔

دن رات پوزوا ہوا چلتی اور راوی کی صداقت کی ضمانت دیتی۔

سادن وگے پُرا، ادہ بھی بُرا

جٹ بجاوے تڑا ادہ بھی بُرا

(گرمیوں میں بادِ مشرق چلتی ہے تو اُسے اچھا سمجھتے ہیں کیوں کہ داتا اورن (فضا) ٹھنڈا رہتا ہے سادن میں اُسے بُرا مانتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ بارش ہی بارش لاتی ہے اور لوگ بارش سے پہلے ہی میزار ہوتے ہیں۔ تڑا ایک ساز ہے۔ یہ دو ہاتھ لمبا بانس ہوتا ہے اور دونوں سروں پر کھلا۔ اُس کا بجانا سنگیت پیدا کرتا نہیں، پھیپھڑوں کا نور اُڑانا ہے۔ بچوں کو اُس کا پیسا نہ خیالی ہے، اس لئے میں جیتا، تو ہارا۔ تو ہارا، میں جیتا کرتے کرتے فریقین لڑ پڑتے ہیں۔)

تایاجی اُداس اُداس رہتے۔ کوئی قُدت کے قہر و ستم کی بات کرتا، وہ ہمدردی سے کہتے: "عالمِ فطرت میں ہر شے باہمی دُردمندی اور سانجھی ذمہ داری کے دلوں میں اسیر ہے۔ یہی مظہرِ فطرت ہے جس سے نظمِ فطرت میں توازن برقرار ہے کوئی بڑا سا بھگڑتا ہے تو اس کا نظم و نسق بگڑ جاتا ہے۔"

اس تعلق سے ذہ ایک مثال دیا کرتے تھے جو سمجھنے میں کس قدر آسان ہے۔ حساس انسان کسی مظلوم کی حالت سے متاثر ہو کر بیمار ہو جاتے ہیں، شدتِ غم سے مر بھی سکتے ہیں۔ اُن کی یہ بات، میری آزمائشی ہوئی تھی۔ میں اپنی

ماں پر بھائی جی کا تشدد برداشت نہ کر سکتا تھا اور مجھے دانت لگ جاتے تھے۔

تایاجی منڈلا لے ہوئے بازوؤں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں نہ جھپکاتے جیسے اُن میں سے کچھ ہوئے غفلتوں کی آہوں کو سُن رہے ہوں۔ وہ آہ بھرنے کے سے انداز میں آنکھیں نیچی کرتے اور کسی کام میں مصروف ہو جاتے۔ اُن کی عقل کے مطابق لگتا کہ انسان پر دوسری چیزیں لازم ہیں، کام اور نیک عمل!

ہر وقت ہر اچارہ کھانے اور کچڑ میں اٹھنے بیٹھنے سے مویشیوں کو موک (پیٹ کی بیماری جس میں مویشی پتلا گوبر کرتا ہے) کھڑے (ایک بیماری جس میں مویشی کے پیسے گھٹنے لگتے ہیں) اور اٹھان (ایک بیماری جس میں مویشی میٹھ کر اٹھ نہیں سکتا ہے) کی دبا پھیل گئی۔ موت نے طویلوں پر تنو تان لے کر سان ایک کامرہ باہر پھینک کر آتے اور دوسرے کو مارا ہوا پاتے۔ گدھ، مردار کھاتے کھاتے اتنا کھا جاتے کہ اپنا بوجھ لے کر اڑ نہ سکتے اور مردوں میں مردوں کی طرح پڑے رہتے۔ انہیں پھول لگی تو وہ پرانے مردے کو منہ نہ لگاتے اور اڑنے کے بجائے پھدکتے پھدکتے نئے مردے کے پاس پہنچتے۔ گتوں اور گرگسوں کی روایتی لڑائی دکھائی نہ دیتی، دونوں جدا جدا مردار کھاتے۔ گتے، گوشت قے کرتے پھرتے۔ کوئی انہیں روٹی ڈالتا، وہ اُسے سونکھ کر منہ پھیر لیتے۔ کسان کیکر کے پھلے اور پھسکری سے جو شانہ بناتے اور اُس سے مویشیوں کے پاؤں دھوتے۔ غریب کسان جانتے تھے کہ اُن کے مویشیوں کو دوا دارو سے زیادہ سوکھی دھرتی کی ضرورت ہے۔ لیکن دھرتی پر سوکھا مقام تھا کہاں؟ کوئی تھا تو وہ مظلوموں کی آنکھیں تھیں جن کا سارا پانی، اُنسوؤں کر بہہ گیا تھا۔

گھول والوں کا یہ حال ہو تو بے گھروں کی بے کسی کا کیا مقدمہ! جو آسمان اور دھرتی کے درمیان عناصر کے زخم و زکرم پر پڑے تھے۔

بارش میں ہر طرف پانی تھا لیکن ماحول صاف تھا۔ رگھی (لمبی برکھا کے بعد نکلنے والی دھوپ) نکلی تو زمین پیٹپٹر کی طرح دکھائی دینے لگی۔ مکان چھوٹ کی طرح چھٹ کر گرنے لگے۔ ہماری بیٹھک ڈھکے گی اور میری ماں مرتی مرتی بچی۔ دھرتی میں سے گندگی اور مری پھوٹ پڑی، جس نے دو ٹیٹیاں کیں اور دو ہلکیں ڈالیں، وہ چل بسا۔ کیسپ میں مرنے والوں کی رفتار تعداد اُبادی سے بڑھ کر تھی۔ کیسپ کے گرد قبریں کھودنے کے لئے جگہ نہ رہی۔ قبروں کے اوپر قبریں کھودی جانے لگیں اور لاوارث لاشیں بکھری پڑی سرٹنے لگیں۔ وہ دھرتی، جسے کسان اپنی سعادت میں دھرتی ماں کہتے تھے، اُن کی مصیبت میں کھلی قبریں لگی اور قبریں اس کہاوت کی مثال،

قبراں اڈیک دیاں، جیوں پستراں نوں ماواں

(قبریں، مردوں کا انتظار ایسے کرتی ہیں جیسے مائیں اپنے بچوں کا)

اگر جھوٹ پریت، زندگی کی حقیقت ہوتے تو وہ چنچنے پلاتے، منہ پھاڑے اور دانت نکالے، اُن

بچے کچھ انسانوں کو نگل لیتے جو کسی طرح موت کی ناپاک رسائی سے بچ گئے تھے۔ بھائی جی ہریانہ سے آئے اور یہ منحوس خبر لائے کہ عدالت یار ہیضے میں مبتلا ہے۔ یہ سن کر مجھے ایسا دم مہینچا کہ میرا تخیل ایک ہی خیال پر جم گیا کہ وہ مر جائے گا۔ میں نے اُس کی مدد کرنی چاہی لیکن کیسے کرتا؟ مجھے ایک ہی چارہ سوجھتا، دُعا! زیادہ نہ کم، دُعا! میں گرو دودارے میں جا کر گرو گرتھ کے آگے طویل سجدہ کرتا اور رو کر دُعا مانگتا۔ میں اپنی دھندلائی آنکھوں میں سے عدالت یار کو دیکھتا، وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا نظر آتا جیسے وہ مسکرایا کرتا تھا۔ میرا ایمان و اعتقاد جو کئی بار ٹوٹا تھا، جیسے میں نے اپنی بے ایمانی اور بے اعتقادی سے تعبیر کیا تھا، از سر نو تازہ ہو گیا۔ میں اُسے دیکھنے کے لئے کیمپ میں گیا۔ وہ نجیف و نزار بستر پر دراز تھا۔ جس زبان کی جادو گری دلوں کو اسیر آہنگ رکھتی تھی، سازِ شکستہ کی طرح خاموش تھی۔ جس چہرے کی تازگی سے ہرے بھرے کھیت شرماتے تھے، اجڑے دیار کی سی عبرت برسا رہا تھا۔ وہ عدالت یار وہ عدالت یار نہ تھا جس کے نغے سوئی ہوئی اداس رگوں میں خوشگوار زندگی کی تحریک جگاتے تھے۔ اُسے دیکھ کر پھر سے میرے اعتقاد کو جھٹکا لگا اور میں اندر ہڈیوں تک کانپ گیا اور ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ میری بے بسی پر ترس کھا کر اُس نے اپنا کمزور کمزور ہاتھ سر کا کر میری جانب بڑھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھنا چاہتا ہے۔ میں اُس کی مدد نہ کرتا تو وہ اپنی تمنا پوری نہ کر سکتا۔

کیا وہ دُہی ہاتھ تھا؟ جس نے پنجر لڑاتے ہوئے حریف کی کلانی توڑ دی تھی۔

کیا وہ دُہی کا ندھے تھے؟ جو دھڑے چکھنے کے لئے جھکڑا تول دیا کرتے تھے۔

کیا وہ دُہی بازو تھے؟ جن میں منوں بوجھ اچھٹا کوڑا دکھائی دیتا تھا۔

کیا وہ دُہی قد آدم تھا؟ جس کے سامنے عام قد و قامت کا آدمی، بونا لگتا تھا۔

وہ دُہی عدالت یار تھا! وہ دُہی سب کچھ تھا! بس اُس جوہر سے محروم تھا جو آدمی کے عناصر کا دم خم ہوتا ہے۔ وہ روپڑا، اُسے دیکھ کر میں روپڑا۔ رونا چھوت کی بیماری ہے، ہر کوئی روپڑا نا اُمیدی کا غبار چھٹا، ہر کسی کے ہاتھ اُس کی زندگی کی دُعا کے لئے اٹھے۔ ہر کسی نے اُسے دلاسا دیا، حوصلہ بندھایا لیکن وہ ہمت ہار چکا تھا۔ دوسروں کی خوشیوں کا اُجالا اپنے غموں کے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ میں اُس کے آنسوؤں کو پونچھنے لگا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سوچ سوچ کر رُک رُک کر کہا، ”یہ فضا سکون پرور ہے! ہر شے میری جانی پہچانی ہے! میں اس مٹی سے پیار کرتا ہوں! جب مرنا ہی ہے، میں یہیں کیوں نہ مروتوں؟ کہیں اور مرا تو آنجانے ماحول میں قیامت کا انتظار بے نور آند بے آہنگ ہو گا!“

اُس کے اظہارِ تمنا میں دُعا تھی، درد مندانه التجا تھی۔

کریں نہ خوار توں ربّا عدالت یار دی مٹی

بہر جس تھاں دی ہے مٹی اس نوں اُس مٹی پے ملے دے  
 (میرے رباً! تو عدالت یار کی مٹی خراب نہ کرنا! یہ جس جگہ کی مٹی ہے تو اسے اُسی مٹی  
 میں ملا دے تو اچھا ہے)

وہ بہار رب! وہ بے حس رب!! جسے میرے احساس کی پروا نہیں تھی، وہ عدالت یار پر سمجھ گیا  
 اور اُس نے اُس کی مٹی کو خوار ہونے سے بچا لیا۔  
 اُسے کھوکھلے اچانک احساس ہوا کہ میں اُس سے پیار کرتا ہوں۔ میری عمر کے ماہ و سال کھلے منظر کی  
 طرح میرے سامنے پھیل گئے۔ میری ہر بات میں اُس کا مفہوم تھا جس کا رشتہ اُسودگی نفس اور سرشاری ہاں سے  
 برابر تھا۔ میرا بچپن میری ماں کی غم خواری، تایا جی کی ناز برداری، عدالت یار کی فُسوں کاری کی تہلیت تھی۔ وہ میرا  
 انوکھا جُزد تھا، جو میرے نمنوں کے ذریعے مجھ سے متوصل تھا۔

## باب ۲۲

شاہِ طرہ درندے سے نہ حیواں سے ڈرو  
 دوزخ کے خدا بوں سے نہ شیطان سے ڈرو  
 ہر فتنہ دنیا کا ہے ماخذِ انساں  
 ڈرنا ہے اگر تم کو تو انساں سے ڈرو (شاہِ طرہ)

میری طبع آج پھر دواں نہیں ہے۔ میں لکھنے کی کوشش میں کاغذ پر بیٹھی بیٹھی لکھتی پھینچتا ہوں۔ سارے  
 واقعات میرے سامنے ہیں لیکن انہیں لکھنے کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے ہیں۔ یہ موزوں الفاظ بھی کیا بلا ہیں! ان کی  
 عدم موجودگی و تحریک و عمل اور اول و آخر کی صورت ہی بکاڑی ہے۔ میری بے بسی! میں کئی کئی دن تک ایک جملہ نہیں  
 لکھ پاتا جسے میں اپنے معیار سے مکمل کہہ سکوں۔ میز پر کتنے کاغذ پڑے ہیں، جن پر مگوئی کے جالے سے ملتے جلتے حلقے  
 بنے ہیں اور میں، اُن حلقوں میں الجھتا ہوں، لا حرکت ہوں۔ کل رات ہی سے میں ناموزونیت کا شکار ہوں۔ آج رات کا  
 پچھلا پہرا آنے کو ہے لیکن میری طبع کی روانی، رُکی کی رُکی ہے۔ میں پریشان اور غم زدہ ہوں اور اپنی ناکامی کے کُرب سے  
 قرار چاہتا ہوں۔ میری خاطر داری کا سامان میرے قلم کے پاس ہے لیکن وہ میرا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ مجھے ایک مقرر موبھا  
 ہے۔ میں افسانہ امروز لکھتا ہوں، ممکن ہے کہ میری طبیعت بہل جائے اور میری مطلوب کیفیت مجھے مل جائے۔  
 آج تیرہ اگست انیس سو اناسی ہے۔ گھڑی کے الارم نے حسبِ معمول پانچ بجے کا شور مچایا، میں بستر

سے ٹوٹ کر بیدار ہوا تو ادھوری نیند سویوں کی طرح چبھتی تھی۔ اور سونے کی خواہش کے باوجود میں اٹھا اور بجلی کا بٹن دھونڈتا ہوا کرسی سے ٹکرائیا۔ درد پوری تندی سے اٹھا۔ میں ہائے ماں، بیکار، درد ایسے گھٹا جیسے ہائے ماں کا لہجہ، درد کی اکیر تھا۔ میں غسل خانے سے فارغ ہوا اور پانی کا پورا گلاس چڑھایا، میری عادت صبحی ہے۔ میں روز کی طرح عادتاً لکھنے کے لئے بیٹھا لیکن کچھ نہ لکھ سکا آخر دل بہلا دے کے لئے کرسی پر سے اٹھا، جا کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا اور گرد و پیش کا نظارہ کرنے لگا۔ بارش میں نہاتی ہوئی ہوا، چمبل کر رہی تھی۔ چھینٹوں کی ضربوں سے پتے ذیلیوں کی طرح بچ رہے تھے۔ اندھیرے اُجالے میں پانی، چادرِ سیمیں لگ رہا تھا۔ ایک ٹھنڈا جھونکا آیا اور مجھے کپکپایا۔ حسنِ فطرت کی دل کشی کہوں کہ اپنی محویت! میری مجال نہ ہوئی کہ میں منظر سے نظر ہٹاؤں۔ میں نے پیچھے ہاتھ بڑھا کر پستریر سے چادر اٹھائی اور نکل ماری۔ اس کی گرمی نے لذتِ نظارہ لطیف ترکردی اور میری چشمِ شوق حقیقتِ حال کی محرم بن گئی۔ اس سال بارش کم ہونے کی وجہ سے مینڈک اپنے خوابِ گراں سے ابھی ابھی جاگے ہیں۔ پیپہا اور کوئل رات بھر جاتے ہیں۔ میں نے سونے سے پہلے ان کی مدھر آواز سنی تھی اور اب بھی سنتا ہوں۔ پیپہے کی پتی ہو! میں وہی دائمی لطافت ہے لیکن کوئل گاہے گاہے پستریر اور لپ جھپ بوتی ہے۔ چند دنوں میں یہ اپنی لے بالکل بھول جائے گی، اور کوس میں کوآ نظر آئے گی۔ یہ دو ہاتھ بھلے اختیار یاد آتے ہیں جسے تیا جی موسم بہار میں کوئل کی پہلی لے سن کر سناتے تھے۔

کوآ کالا کوئل کالی کی دونوں وچ پھیرے؟

کوآ کوآ، کوئل کوئل، بسنت رت اون دی دیر!

(کوآ کالا ہے اور کوئل بھی کالی ہے، ایک کی دوسرے سے کیا پہچان ہے؟ بسنت رت

آنے دو، کوآ کوآ رہ جائے گا اور کوئل کوئل ہو جائے گی!)

چڑیاں اور کوئے آمدِ سحر کے پیامبر تھے۔ چند گھنٹوں کی بارش میں ہنا کر ہریالی، دلہن کی طرح نکھر آئی تھی۔ مغرب کی ہوا چلنے لگی، بادلوں میں رخنے پڑنے لگے اور ان میں سے نیلا امبر جھانکنے لگا۔ سفید بادلوں کے پس منظر میں نیلا آکاش کچھ زیادہ ہی نیلا تھا۔ ستارے، چراغانِ سحری کی طرح بے رعونت تھے۔ دھن چڑیاں، بجلی کے تار پر بیٹھی تھیں، ایک ذرا کھسکتی، دوسری اس کے پاس سرک جاتی۔ دُبی جانیں کہ وہ آپس میں پیار جتاتی تھیں کہ صبح کی ٹھنڈک میں باہمی حرارت سے لطف اٹھاتی تھیں۔ بالکلارے (البابل) اپنے انداز میں سحر کو خوش آمدید کہتے تھے۔ کئی ٹبک رفتار تیرود کی طرح آنکھوں کے سامنے سے گزرتے اور پھر دُسمت فضا میں نقطے سے دکھائی دیتے۔ کئی اڑے، تیر چھ، اُدپر، نیچے وہیں اڑتے۔ میرے دل میں ترنگ اٹھی کہ میرے پرہوں تو میں بھی آسمان کی گہرائی ناپتا پھردوں۔ میرے ٹیلیفون کے تار پر ہرے رنگ کی پیاری سی چڑیا اکر بیٹھی۔ میں نے ٹھٹک سی سنی اور ٹیلیفون

کو دیکھا، وہ خاموش پڑا تھا۔ اُس مہر سُر کا ماتخذ جانے میں مجھے دیر نہ لگی۔ وہ چڑیا گاتی تھی گویا مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ بکلی کے تار کے بدلے سیلیفون کے تار کا انتخاب! میں اُس کے مذاقِ سلیم کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اور جھوم اٹھا۔ اپنے جھولاجھولاتے جذبات سے رُس لیتے ہوئے، میں اُس سرورِ نغمہ کو زبان میں ڈھالنے لگا لیکن بے بس رہا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ صوتِ پابندِ حروف نہیں ہوتی! لیکن میری دُعا آفرینی نے مجھ سے کہا، تُو اُس پیارے نغمے کو مضمون میں باندھ کیوں کہ وہ نغمہ، نغمہ نہیں! دورِ وجوں کی ہم آہنگی کے لئے راز و نیاز ہے۔“

”تو کہاں سے ہے!“

”میں یہاں سے ہوں!“

اُس مہر بلوے کے جواب میں بے اختیار ہو کر، میں پکار اٹھا۔ میری شوخِ طنساری کے کھلے اظہار سے سریندر جاگ پڑی۔ وہ انگریزی لیتے ہوئے کس پیاری ادا سے سُکرائی، وہ میری کمزوری جانتی ہے کہ لہکتے لمحے، مجھے بے قابو بنا دیتے ہیں۔

فیکٹری کے سارن نے جوں ہی چھ بجنے کا اعلان کیا ایک لاری (جس کا ڈفرنشل خراب تھا) شاہ راہ پر سے گزری۔ شور کی پھینکار لمبی اور تیز ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ مجھے یکایک خیال آیا کہ یہ اِس دوسری پرانا جان لیوا ہے تو سڑک کے اُس پاس رہنے والوں پر کیا گزرتی ہے؛ میں ابھی اِسی خیال میں اُبھا ہوا تھا کہ میرے سامنے پرکاش ملک کے باغیچے سے کالی بٹی نے سر نکالا۔ پرکاش کی بیوی ریشیلا ایک چیز ہے! اُس کے رسیلے ہونٹوں سے الفاظ، نغمے کی طرح نکلتے ہیں اور اُس کی ہنسی! بالکل صراحی کی قُلقل جیسی ہے۔ خیر یہ دوسری بات ہے! بٹی رُک کر باہر نکلی اور چوکتی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں میسر کر ایسے پھیلائیں کہ اُس کے پیلے دیدوں میں کالی لکیریں عمود کی طرح اُبھرائیں۔ بٹی ایک حُسنِ سراپا ہے! وہ کوئی بدذوق تھا جس نے اس کے بارے میں باطل عقیدہ پھیلا یا تھا۔ ایک جھاڑی کے پاس بٹی، زمین کھکھوڑنے لگی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہر کوئی جھوک کے عذاب میں گرفتار ہے۔ میرے خیال کے برعکس بٹی نے گڑھے میں پافان کیا اور اُسے ہنسی سے دھانپ دیا۔ میرا یہ مشاہدہ، مجھے گاؤں کے خشک میں اُڑا لے گیا جہاں درختوں کے کھوڑوں میں بڑے طوطے (ہورن بل) رہتے تھے۔ آندر بیٹھے بیٹھے انہیں ریٹ آئی، وہ اپنے چوترا کھوڑ کے منہ کے سامنے لاتے اور اِس زور سے بیٹھے کہ ریٹ پچکاری کی طرح کھوڑ سے باہر دُدا جا گرتی۔

تایا جی کہتے تھے، خیال سے مشاہدہ اور مشاہدے سے عمل خوبصورت ہے۔“ اُن کی بات اپنی جگہ درست ہے اور میرا مشاہدہ اپنی جگہ، کئی حیوانِ فطرتاً انسانوں سے حُسن پرست ہیں۔

”انوں شپ کی سڑکوں کی روشنی کبھی، انڈسٹریل سیکورٹی فورس کے جوانِ ڈیل کے لئے جانے لگے۔“

لیٹ لطف سزا کے در سے دگر دگر بھاگتے تھے۔ آواجانی بڑھ گئی اور پرندوں کی ڈائیں، جنگل کی طرف اڑتی دکھائی دینے لگیں۔ کتے، کان پھر پھڑپھڑاتے، انگڑائیاں لیتے اور سستیاں توڑتے، ٹکیوں میں نکل پڑے۔ مویشی، کچر گنڈیوں کا رخ کرنے لگے۔ اپنا حق لٹا دیکھ کر کتے ان پر بھونکتے اور وہ دفاعِ ذات میں سینکڑوں ہلاتے اور داؤ لگتے ہی دو تلی بھی جھاڑ دیتے۔ رات کی خاموشی کو صبح کے شور نے نکل لیا۔ مسٹر شرما کی نوکرانی بلما کام پر دیر سے آئی، وہ اُسے پھٹکارنے لگی۔ اُس نے چیخ مار کر بے دھڑک کہا، "اماں! میرا حساب کرو اور جسے چاہو نوکر رکھ لو۔" وہ دُٹ کر وہیں کھڑی رہی اور مسٹر شرما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ آخر وہ اُس کے راستے سے ہٹ گئی اور وہ ہونہر، کہہ کر اندر چلی گئی۔ بلما کی ہٹ دھرمی اور مسٹر شرما کی نرمی سے متاثر ہو کر میں نے سوچا کہ زندگی ایک جنگ ہے جو آدمی کو لڑ کر گزارنی ہے۔ اس جنگ میں ہزاروں معرکے ہیں اور جھوٹے سے جھوٹا معرکہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس وقت میں اپنے اُس خیال کو الگ طریقے سے پیش کرتا ہوں۔ زندگی کی جنگ میں ہر معرکہ بڑا ہے، مجھ جھوٹا لگتا ہے کیوں کہ میں اُس میں شریک نہیں ہوں۔

میں اپنے خیال میں اس قدر محو تھا کہ مرنے پر پندر چائے کا پیالہ لے کر آئی تو مجھے خبر نہ ہوئی، اُس نے پکارا تبھی مجھے اُس کی موجودگی کا علم ہوا۔ پیالے میں سے لہر اُڑھتی ہوئی بھاپ، نند لال نور پوری کی یاد تازہ کر گئی۔

رَن نہاوندی چھپڑوچ دیکھی

سُلفے دی لاٹ ورگی

(میں نے ایک عورت کو جو ہڑ میں نہاتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا سراپا سُلفے کی

لاٹ سے ملتا تھا)

اُس انجانی عورت کے تصور سے مزالیتے ہوئے، میں نے چادر اُتار بھیجی جو اچانک بوجھ لگنے لگی تھی۔ میں چائے بیٹھا ہوا سوچنے لگا، "زندگی کتنی کثیر الجہت ہے۔ ہر سانس، ہر زالی خوشی اور اُنوکھا غم ہے۔ یوں کہنے کو زندگی، دودھاری تلوار ہے۔"

میں چائے پی کر ویسے ہی ٹہلتا رہا۔ رسوائی میں سے برتنوں کی جھنجھاک میں سے مرنے والی آواز آئی جس میں ہلکی سی سمر زرخش تھی، "یار ملنگ! اب نہالو اور تیار ہو جاؤ، ورنہ فیکٹری جانے میں دیر ہو جائے گی!" میرا اندازہ مرنے پر ٹھیک نکلا ہے، ہر الجھن کا انجام، اچھا آغاز ہوتا ہے۔ میری رُکی ہوئی بطن کو روانی مل گئی ہے۔ کیسا تضاد ہے! پھول ہزار زبان رکھتے ہوئے خاموش ہے لیکن میری ایک زبان لاکھوں دلوں کی ترجمان ہے۔

تقسیم وطن سے تین چار ماہ پہلے مولارا نگر ٹھہر گیا۔ وہ غلام جیلانی کا بڑا بھائی اور لاؤلد تھا۔ پہلا جتن رکفایت شہار تھا دوسرا اتنا ہی کھاؤ اڑاؤ کہتے تھے کہ اُس کے بیٹے کی شادی پر روپڑی ریشم تونڈی کا پانچ ہوا تھا اور دو لہا ہاتھی پر چاندی کے میگڈ مبر میں بیٹھ کر بیٹھنے گیا تھا۔ غلام جیلانی کی بارگاہ میں بھانڈ، نقال اور گویئے حاضر ہوتے اپنا کمال دکھاتے اور انعام پاتے۔ لیکن اب وہ سب کچھ کٹا چکا تھا اور جیسے تیسے گزارتا تھا۔ حالانکہ اُس کی خرمیاں اپنی پیدا کردہ تھیں، وہ ان کا ذمہ دار اپنے بھائی کو ٹھہراتا تھا۔ جس دن مولامرا، غلام جیلانی نے اپنا اصلی رنگ دکھایا۔ اُس نے خاندانی قبرستان میں کھدا ہوا گرٹھا پاٹ دیا اور باغ سے کاٹے ہوئے برگے اٹھا کر گھر لے گیا۔ بھیکو نمبر دار نے اُسے سمجھایا لیکن وہ رام نہ ہوا۔ مولے کی قبر جہاں کھودی گئی وہاں کی مٹی ریلی تھی۔ قبر کھود کر گورن، ضریرج کریدر ہاتھ کر قبر ڈھسے گئی۔ اُس لاؤلد کے لئے نئی قبر کون کھودنا؛ اُسے اُسی قبر میں دفنایا گیا۔ برگوں اور پوٹ کی چادر وغیرہ کے لئے روپیہ، نمبر دار نے لمبا خرچ سے دیا۔

پھر وقت بدلا اور مسلمان اپنے ہی گھروں میں بے گھر ہو گئے۔ وہ زمین، جو ہر کس و نا کس کی زندگی تھی، موت کا اگھاڑہ بن گئی۔ بستیوں پر مہو کا عالم چھا گیا۔ آدمی اتنا بے آسرا ہو گیا کہ موت کے سوائے اُسے دوسرا آسرا نہ رہا۔

کہتے ہیں کہ بے کسی میں درو دیوار ہی سے دکھڑا رو تو دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ غریب مسلمان راجہ احمد سید خاں کے پاس اپنا دکھڑا رونے جلنے اور وہیں کے ہو رہے۔ وہ خدا ترس آدمی تھا، اُس نے ان دکھیوں کے لئے ننگر کھول دیا۔ مفت خوردوں کی فطرت، جراثیموں کی طرح ہے۔ موافق ماحول ملے ہی یہ اتنی تیزی سے بڑھتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے سہارے کو چٹ کر جاتے ہیں۔ ننگر بند ہو گیا۔ ہریانہ کی آبادی ایسے بڑھ کر گلیاں، سڑکیں، مضافات آدمیوں سے بھر گئے۔ ہریانہ کے درو دیوار، انسانی سمندر میں تیرتے لمبے کی طرح نظر آتے۔ اُس نمود و مخم و نجوم کی حفاظت کے لئے رکھ مٹری لگئی جس نے ہندو مسلم ہائی سکول میں ڈیرا ڈالا۔ ہریانہ کو کیپ کا نام پہلے ہی مل چکا تھا، اب اُس پر سرکاری ٹھپہ لگ گیا۔ سکول کے صفحہ میں ایک کھمبا کاڑا گیا جو درختوں سے کٹی گنا اونچا تھا اور دور سے دکھائی دیتا تھا۔ کیپ میں رہنے والے اُسے حیرت نما دلچسپی سے دیکھتے جیسے پاکستان جانے کا آسان اور سیدھا راستہ دی ہو۔ ہتھیار بردار سپاہی سکول کے گرد چکر لگاتے اور دروازے پر کھڑے پہرا بھی دیتے۔

سود مند اور بے چارگی، دونوں حالتوں میں آدمی رذالت اور نفاست کی انتہا کو پہنچتا ہے اس لئے زحمتِ حالات، حسنِ اخلاق کی کسوٹی ہے۔ ہندو اور سکھ متھی بھر رو پیے لے کر کیپ میں جاتے اور مال و اسباب کے چھکڑے بھر کر لاتے۔ خریدار، بیچنے والوں سے ضرر اڑا مہلک سود بازی کرتے، دام چپکاتے تو ان بے چاروں کے دل بھراتے۔ وہ اپنے سامان کو چھو چھو کر روتے اور کلیجے پکڑتے جیسے وہ بے جان سامان، ان کے جیتے جاگتے بدن



کا حصہ ہو جسے کاٹا جا رہا ہو۔ ایک ایسے ہی سودے کا دزدناک واقعہ میری آنکھوں میں ہے۔ ایک بیوہ اپنی پچھلیانی بھینس، بیس روپے میں بیچ کر اُس کے گلے میں بائیں ڈالے رو رہی تھی۔ اُس کے دو بچے بھی ملکتے ہوئے اُس سے لپٹے ہوئے تھے۔ اُس جذباتی ڈرامے کا سفاک انجام یوں ہوا۔ بس بھی بس! اپنے آنسو اپنے پاس رکھ، میں نے صرف پچھلیانی کے دام دیے ہیں۔

وہ دور بے اعتباری، بے کسی، بے رحمی .... کا کیسا دور تھا! جسم کا جان سے رشتہ صرف روٹی سے جڑا ہوا تھا۔ روٹی، اُس تھی! روٹی، آغاس تھی! روٹی، کانوں کی سماعت تھی! روٹی، آنکھوں کی بصارت تھی! روٹی، رگوں کی گرمی تھی! روٹی، زندگی کی روشنی تھی .... روٹی، وقت تھی اور وقت، روٹی۔

پیٹ نہ پیٹا روٹیاں

تاں سبھے گلاں کھوٹیاں

(پیٹ، روٹی سے خالی ہے تو زندگی کی ہر قدر کھوٹی ہے)

آدھ پھر وہ بھیانک برسات شروع ہوئی جس کا ذکر اس سے پہلے باب میں آچکا ہے۔ بھائیاجی نے گھن کھایا ہوا بائیں تک منہ مانگے داموں بیچا۔ مسلمان سوا کھا بائیں خرید کر گیلے کپڑوں میں ایسے چھپاتے جیسے کوئی اپنے ننھے کو نظر بد سے بچائے۔ مال پر دروازوں اور کھڑکیوں کی لکڑی کے سوا کوئی دوسری لکڑی دکھائی دیتی تھی تو وہ سب کو (بڑی لکڑی) کی ٹیڑھی میٹھی بٹی تھی۔

کیمپ میں کتنے تھے جو دن بھر محنت مزدوری اور جھوٹا موٹا کام کر کے کچھ کماتے تھے اور رات کو کھانے پکانے کا سامان خریدتے تھے۔ اُن کے کام ٹھپ ہو گئے اور چوہے ٹھنڈے۔ جن کے پاس کچھ رسد تھی وہ برسات کی بھینس چڑھ گئی۔ پن کال پڑ گیا۔ امیر، غریب ہو گئے اور غریب تہی دست۔ بھوک کی ڈان منہ پھاڑے گھومتی اور انسان نکلتی۔ جب جان بچانے کا کوئی راستہ نہ رہا، انسان اُن حیوانوں کے درپے ہو گئے جنہیں وہ غیر ضروری جان کا ادارہ چھوڑ آئے تھے۔ لیکن بھوک کا منہ بھرنے کا یہ طریقہ کار گر نہ ہوا! ماس رینڈھنے کے لئے بائیں نایاب تھا اور انسان کی پکلیوں کے ساتھ اُس کے معدے سے وہ سارے عرق غائب ہو چکے تھے جو کچا ماس پچانے کے لئے لگتے ہیں۔

کیمپ میں رہنے والے کیمپ کمانڈر کے پاس جاتے، صرف دو عرض گزار تے اور ایک ماتے کو کہتے،

ہمیں پاکستان لے چلو،

ورنہ گولی مار دو!

کمانڈر دونوں صورتوں میں بے بس تھا۔ کیمپ کی روائی کا حکم اُدھر تیار سے اُنا تھا اور پُر اُن شہریوں کو مارنے کا اسے اختیار نہ تھا۔ لیکن وہ تھا احمد سعید کی طرح دزد و مند! اُس نے قادر زدہ بچوں کے لئے کھانا مہیا کرنا چاہا۔ اُن کے

ساتھ بڑے بھی آندر گھس پڑے۔ سنتری کا ہالٹ، ہالٹ، کا حکم کام نہ آیا، ہٹریج کیا، جسے دبانے کے لئے فائر ہوا اور کتنے بھوکے پیٹ کے آزار سے آزاد ہو گئے۔ اس زیادتی پر شرمندہ ہو کر کمانڈر نے مسلمانوں کو سپاہیوں کی حفاظت دی تاکہ وہ اپنے گاؤں جاسکیں اور کھانے کی چیزیں لاسکیں۔ مسلمان ساوئی بیج کر کیمپ میں گئے تھے لیکن ان کے جاتے ہی لوگوں نے ان کے کھیت اور گھر لوٹ لئے تھے۔ وہ اپنی ضرورت، دوسروں کے کھیتوں سے پوری کرتے اور سپاہیوں کو باذر کرداتے کہ وہ صرف اپنی فصل کاٹتے ہیں۔ دراصل وہ بلا لحاظ تمیز ہر کسی کی فصل کاٹ لیتے تھے۔

وہ ایسا کرتے تھے تو بے قصور تھے!

روٹی، انسان کی کم سے کم ضرورت ہے اور جینے کے لئے بشرِ اول! اس کی عدم دستیابی خودی کی خود کشی کی تحریک ہے جو اپنی حرکت کی قوت آپ ہے۔ نہ اس کی نفی کی مثبت ہے اور نہ ہی پستی کی بلندی اس کے حلقہ اثر میں سلیقے قرینے، طور طریقے مہمل ہیں اور قانون، قاعدے باطل ہیں۔ چوں کہ یہ تہذیب و تمدن سے مقدم ہے اس لئے حیوان کی طرح انسان کی اول حقیقت ہے۔

ان بھوکوں کا تندی دل ہمارے گاؤں کے کھیتوں میں اُترا، ان کی لوٹ سے وہی کھیت بچا جو گاؤں کے قریب تھا۔ ہر زبان ہا ہا کار اور لالکار تھی۔ تایاجی کو خبر ملی، انہوں نے احساسِ احسانِ مندی سے اپنے بچوں سے کہا، ”اچھا ہوا! تم لوگ، ان کا جتنا لوٹ کر لائے ہو اُس کا کچھ تو ادا ہوا! افسوس اس بات پر ہے کہ جو ہمیں ان سے ممانی مانگ کر عزت کے ساتھ لوٹنا چاہیے تھا وہ انہیں چرانا پڑا ہے۔“

لیکن ان کے لڑکے بھڑک اٹھے اور ان پر الزام لگانے لگے، ”تو یا بکل ہو گیا ہے! تیرا بس چلے تو تو گھربار اٹھا کر مسلمانوں کو دے آئے اور ہمارے ہاتھوں میں بھیک کے کاسے پکڑا دے۔“ وہ ہتھیار اٹھا کر کھیتوں کو بھاگے اور ایک مسلمان کو اپنے کھیت میں جالے۔ وہ انہیں فریب دے کر بھاگ نکلا۔ ترویجن سنگھ نے اُس پر گنڈا سا پھینکا، جس سے اُس کا بازو کٹ گیا لیکن وہ سپاہیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ کسان پہلے ہی سپاہیوں کو گھیرے کھڑے تھے اور فصل لٹ جانے کی فریاد کر رہے تھے۔ سپاہی انہیں دلاسا دے رہے تھے اور مسلمانوں کو ان کی غیر اخلاقی حرکت پر کوس رہے تھے۔ اپنے آدمی کو زخمی کو دیکھ کر سپاہی بگڑ گئے۔ وہ غصے میں اپنی رائفلیں اور مشین گنیں اٹھانے لگے۔ جب تک کسی نے زخمی کا تندرستی سے کس کر باندھا، سپاہیوں نے آپس میں انگریزی میں مشورہ کیا اور ایشر سنگھ، عطر سنگھ اور گوبال سنگھ کو معاوضہ دینے کے لئے اپنے ساتھ لے لیا۔ انہوں نے کئی اور کسانوں کو بلایا لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ وہ تینوں ٹرک میں بیٹھ کر چند کھیت پرے گئے تھے کہ شام سنگھ کا لڑکا گرچھن سنگھ کھیتوں میں بیٹھا۔ اُس کا نقصان سب سے زیادہ ہوا تھا لیکن وہ موقع وار دات پر دیر سے آیا تھا۔ معاوضے کا ذکر

نستے ہی وہ ٹرکوں کے پیچھے بھاگا۔ وہ ایک ایک بھاگتا ہوا اُن تک پہنچ نہ پاتا لیکن اُس نے کھیتوں کا سیدھا راستہ اپنایا اور اُنہیں نالے میں جا لیا۔ سپاہی ٹرک روک کر اُسے ساتھ لینے لگے۔ ایشر سنگھ بچنے کو دپڑا اور پاخانہ کا بہانہ کر کے جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ سپاہی، اُس کے لئے کچھ درِ زر کے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ایشر سنگھ چھپتے چھپاتے اُن کا پیچھا کرنے لگا تا کہ موقع ملے تو وہ اپنے ساتھیوں کو بھاگ نکلنے کا اشارہ کرے۔ اُس نے سپاہیوں کی باتوں سے محسوس کیا تھا کہ اُنہوں نے اُن کو قتل کرنے کے ارادے سے ساتھ لیا ہے۔ کچھ دُور جا کر سپاہیوں نے اُن تینوں کو ٹرک پر سے اُتار دیا اور واپس جانے کے لئے کہا۔ وہ وہیں کھڑے رہے اور اُنہیں گایاں دینے لگے۔ ایشر سنگھ نے اُنہیں بھاگنے کے لئے پکارا، اس سے پہلے کہ وہ اُس کی بات سمجھتے، سپاہیوں نے اُن پر مشین گن سے فائر دیا۔ اُس بے آئینی کے دور میں دادرسی کیسی! اُس ہولناک قتل کے بعد مسلمانوں نے کیپ سے نکلنا بند کر دیا۔ وہ دُور، بھیانک دُور تھا! رخش قانون بے لگام تھا۔ فیمین کوڑیوں سے سستا تھا اور مَدَن نگانچ رہا تھا۔ عابد، عُدو اور مہاتما، بے آتما تھے۔ کٹھوردلوں کے سامنے پتھر، موم تھے۔ مانس کو کیسا شراپ تھا! جو جتنا گرا ہوا تھا اتنا ہی اونچا کھڑا تھا۔ گرمیِ حرم میں نازک جذبے کا یہ حال تھا جیسے تَتے تو سے پر پانی کا قطرہ۔

ہندوؤں اور سکھوں پر جو ہی آشکار ہوا کہ مسلمان لوٹ کر نہیں آئیں گے، اُن پر نادر شاہ کی روحِ مہمل ہو گئی۔ جو درتے کسی سے آنکھ سے نہ ملاتے تھے، وہ جرحا جرحی ٹیڑھے بن گئے۔ زمین پر سونے والے پلنگوں پر سونے لگے۔ مٹی کے برتنوں میں پکانے کھانے والے کانٹے اور تانبے کے برتنوں میں پکانے کھانے لگے۔ دودھ دہی کو ترسنے والے دودھ دہی میں نہانے لگے اور ننگے رہنے والے کپڑے پہننے لگے۔ کھیتوں، توبلیوں اور گھروں کے ساتھ دلوں کی حدیں بھی بدلیں، فرق بس اتنا تھا کہ وہ آدمی کے سینے میں چھپی ہوئی تھیں اور نظر نہ آتی تھیں۔

پیٹ کی آگ کا ایندھن، روٹی ہے، جس سے یہ آگ بجھتی ہے۔ لیکن ہوس کی آگ کا ایندھن، ہوس ہے جس سے یہ آگ بھڑکتی ہے اور انسان کو آتش فشاں بنا دیتی ہے۔

جسوت سنگھ اور اُس جیسے کئی اور، جو دُسمروں کے لئے کام کرتے ہوئے ایک آدھ مَن بوجھ اٹھاتے ہوئے رشکایت کرتے تھے، لوٹ مار کے منوں بوجھ کے نیچے آرام دہ لگتے۔ کوئی خیریت کا اظہار کرتا تو وہ خود پر اعتراض کرتے، چینیٹی اپنے وزن سے ہزار گنا زیادہ بوجھ اٹھالتی ہے، اُس کے سامنے یہ نہ ہونے کے برابر ہے! امر سنگھ پیارا سنگھ، کرتار سنگھ، آسا سنگھ، سیوا سنگھ، باوا سنگھ، ستا سنگھ..... میں کس کس کا نام لوں! میرے باپ رتن اپنے ہی گاؤں میں اپنے کو ریفوجی ظاہر کر کے مسلمانوں کی جائیداد پر قابض ہو گئے اور زین کی سرکاری الاٹ منٹ ہونے تک اُس پر اپنا غل دخل جمائے رہے۔ جب اصل ریفوجی مسلمانوں کے گھروں میں آئے تو اُنہیں رہنے کے لئے کھنڈر ملے۔ جس کسی نے جہاں قبضہ جایا، وہ وہاں کا سازد سامان اُتار کر لے گیا۔ ہمارے گھر کے پچھلے حصہ میں تو ٹیڑھے بے وجہ تائی

کم نہ تھی جتنی آب ہے۔ وہ کبھی بالکل سیدھی ہوتی اگر سننا سنگھ پور کو مور پڑے کے محاورے پر عمل نہ کرتا۔ ہمارے گاؤں میں جتنے رفیو جی آئے، اُن میں زیادہ سانی تھے۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے ملنے کی یہ شرط رکھی کہ یہ اپنے گرو دوارے کا نام بدل کر گرو دوارہ سنگھ بٹھا رکھ دیں۔ انہوں نے شرط نامنظور کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تنکیے کی مسجد کو گرو دوارہ میں تبدیل کر لیا گویا ایک محاذ کھول دیا۔

اخلاقی قدروں کے اُس فقدان میں کوئی اپنے آپ میں تھا تو وہ تیا جی تھے۔ وہ کہتے تھے: ”کاروبارِ فطرت میں ہر درے کی زندگی حسنِ اسلوب پر مبنی ہے۔ جسے جو بننا ہے وہ اُسی کے لئے سرگرم عمل رہتا ہے اور آخر کار اپنی بقا کے کمال کو پہنچتا ہے اس لئے ہر چیز کا نام، اُس کی پہچان ہے۔ اہل طینت آدم، حیوان ہے، انسان کہلانے کا حق اپنے اچھے عمل سے ملتا ہے۔“

وہ اپنے بچوں اور بھائیوں کو لوٹ مار کرنے سے روکتے۔ وہ اُن پر طنز کرتے، ”تیری ہڈیوں میں زور ہوتا تو سورا (جودھا) ہوتا تو یہی کرتا جو ہم کرتے ہیں۔“

”قتل و غارت اور جنگ و جدل انسانی گراوٹ کا آخری مرحلہ ہے اور دنیائے انسانیت کا آئندہ امیر۔ میری ہڈیوں میں زور ہوتا تو میں پہلے تمہارے خلاف کھڑا ہوتا اور یہ انسانیت سوز کام کرنے سے روکتا۔ تم جسے دلیرانہ عمل کہتے ہو، وہ ظالمانہ اور بیدردانہ فعل ہے! سورا وہ ہوتا ہے جو دکھیوں اور بے سہاروں کی مدد کرتا ہے۔ وہ بُردلی کا میلان خاطر ہے جو کمزور کو بے اُبرو دیکھنا چاہتا ہے اور اُس کی بے کسی پر برتری محسوس کرتا ہے۔“ اُن کے مذہبی جنون میں وہ انہیں کرپان کا ارتھ بتاتے، کرپان، کرپا بندھان ہے! اسے جس نے بنایا تھا، اپنی حفاقت کے لئے بنایا تھا۔ اُس کی حق کارانہ بعیرت کو اُس سختی، زیادتی اور بے رحمی کا اندازہ نہ تھا، جس کے لئے اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ تمہارا گھناؤنا عمل تمہارے ضمیر پر داغ بریاں کی طرح رہے گا، جس پر کسی پوجا پاٹھ اور پچھتاوے کا امرت کارگر نہ ہو گا۔“

تیا جی کی روحانی اذیت سے بھی انسانی محبت کی جھلک اور اخلاقی جذبے کی شدت دکھائی دیتی۔ وہ اپنی حرکتوں سے پابند آتے تو تیا جی ہارے ہوئے لہجے میں کہتے، ”دِرندے کا بچہ، دِرندہ نہیں بنتا جب تک کہ وہ اُسے دِرندگی کے طور طریقے نہیں سکھاتا۔ تم جو کر رہے ہو، وہ میری دی ہوئی تعلیم و تربیت کے عین برعکس ہے۔ میں اپنی کوشش میں پوری طرح ناکام رہا ہوں!“

وہ بے حیا اُن کی بات نہ سنتے، تیا جی خود کلامی کے انداز سے کہتے، ”سادھو بیاں! تو بھول رہا ہے کہ دِرندے کا بچہ کبھی نہ کبھی دِرندہ ہی بنتا ہے لیکن انسان کا بچہ کبھی بھی کچھ بھی بن سکتا ہے! اور اس کے منہ خون لگ جائے تو یہ دِرندے کو شرماسکتا ہے۔“ اپنی بات کی تائید میں وہ گربانی کا توالہ دیتے،

جسے رت لگے کپڑے، جامہ ہوئے پلپیت

جو رت پیوے مانسا ہن کیوں کر نرملِ رحیت

راگر لباس، خون سے لٹ پت ہو جائے تو اُسے غلیظ جانتے ہیں)

(جو انسان، انسانوں کا خون پیتے ہیں، اُن کے دل اور کام کیسے پاک ہو سکتے ہیں)

اُن کے لڑکے ہتھیایا اور چرایا ہوا مال لاکر گھروں میں رکھتے اور فخر کرتے۔ وہ اعتراف کرتے، ”تم

سمجھتے ہو کہ تم گھر بھر رہے ہو! حقیقت میں تم ایسے گڑھے بنے جارہے ہو جس کی گہرائی تمہارے شرمناک فعل سے

بیدھی جڑی ہوئی ہے۔ بادشاہوں کو ملک بس نہ ہوئے کیوں کہ وہ اُن کی لوٹ مار کا حاصل تھے۔ کوئی چیز اپنی جڑوں کے

بغیر نہ پٹی پتی ہے، نہ پھولتی پھلتی ہے! سماجی قدریں، انسان کی جڑیں ہیں! کاش تم جانتے کہ تم اپنی ہی جڑیں کاٹ

رہے ہو! تم انسان نہیں لیٹھے ہو اور تاریخی لیٹروں کے چھوٹے نمونے۔ تم جنہیں لوٹ رہے ہو، وہ مسلمان نہیں

انسان ہیں!“

وہ کئی بار اپنے آپ سے باتیں کرتے۔ ”ضرورت غیر محسوس طریقے سے بڑھتی ہے اس پر دھیان نہ

دیا جائے تو یہ جرم بن جاتی ہے۔ جرم، قارون اور نادیر کی تسلی نہ کر سکی کیوں کہ جرم کا ایک ہی چلن ہے، زیادہ

جرم! یہ تنگ دلی سے شروع ہوتی ہے اور اپنی مصیبت پر ختم۔“

زرمیہ گاتے اور جیکارے بلاتے لوگوں پر وہ تبصرہ کرتے، ”الفاظ صداقت نامہ سکوت ہیں اور پروانہ

ہلاکت بھی۔ یہ ایسے الفاظ کیوں چنتے ہیں جو بربادی کی ضمانت ہیں۔“ لیٹروں کے سرغنوں کی اشتعال انگیز اور حقارت

آمیز تقاریر سن کر وہ کہتے، ”جذبہ نفرت، اُتلاف و ابطال کی زندہ حقیقت ہے، اس جذبے کو تعمیری سمت دینے والے

ہی کا نام انسان ہے! نام نہاد انسان، دُرندے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیوں کہ یہ اپنے جرم میں اپنے جیسوں سے

ساز باز کر لیتا ہے۔“

تایاجی کے درد و غم، اُنسوؤں کی بہتے اور وہ میری ماں سے کہتے، ”فرض کرو، ہم ایسے حالات میں ہوتے،

لیٹرنے ہمیں لوٹے، قاتل ہمیں مارتے تو ہم کیسا محسوس کرتے؟ کتنی ہو بیٹھیاں گر بھرتی ہوں گی، جن کو طبی امداد

کی ضرورت ہے، اُن پر کیا گزرتی ہوگی؟“

اُن ابھانگوں کا خیال کر کے ماں رو پڑتی، انہیں روتا دیکھ کر میں رو پڑتا۔ تایاجی مجھے آغوش میں لیتے

اور سسکتے ہوئے کہتے، ”تم مجھ سے وعدہ کرو! تم بڑے ہو کر کوئی ایسا کام نہ کرو گے جو ننگ انسانیت ہو!“ میں اُن

کی بات کا کوئی جواب نہ دیتا اور بے اختیار اُن سے پٹ جاتا۔ وہ خود کو سنبھالتے اور مجھے ساتھ لے کھیتوں کو چل پڑتے۔

ہم وہاں پہنچتے اور کسی کام میں مشغول ہو کر اپنا اور مسلمانوں کا دکھ بھول جاتے۔

حالات کی اُس الٹا پلٹی میں کیا کیا نہ ہوا، انسانوں کی حیوانی جبلت نے دَرندوں کو بچھا دیا۔ مجھے لگتا کہ آدمی کی زخم دلی غیر طبعی ہے اور اذیت خواہی عین طبعی! کیمپ میں رہنے والوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گردش میں تھیں۔ ایک افواہ نہایت بے دردتھی کہ نوجوان، بوڑھوں کو بھوکا مار رہے ہیں۔ کیمپ نے کوچ کیا تو انسانی بے حسی کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔ مسلمان اپنے اُن لوگوں کو وہیں پڑے رہنے دیے جو چل نہ سکتے تھے۔ اُن میں سے کئی لنگراتے اور کئی بچوں کی طرح رینگتے قافلے کے ساتھ ہوئے اور جیسے جیسے ہمت ہارتے گئے، ڈھیر ہوتے گئے۔ انسانی زندگی کتنے تضادوں کا اتصال ہے! ہمارے گاؤں کا بھیگو نمبردار اپنی سینکڑوں ایکڑ اراضی پیچھے چھوڑ گیا لیکن اپنے پُرکھوں کی قبروں کی مٹی سے بوری بھر کر لے گیا جیسے وہ اُس کی اُمتدہ زندگی کی ضامن ہو۔

ہریانہ، ہوشیار پور کی سڑک پر درخت ویسے ہی ہرے بھرے تھے اور ویسے ہی آنے جانے والے لیکن نظر نہ آتے تھے۔ مُردوں کی سڑاندے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جہاں آنکھ اُٹھی، مُردوں پر پڑتی۔ ماحول کی وحشت سے گھبرا کر لگتا کہ موت منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہے اور ہر زندہ شے کو نگل رہی ہے۔

## باب ۲۲

اپنے لہو میں جب نہ رہی گرمی وفا  
کیوں عذرِ مرد مہری دنیا کرے کوئی

(دشاہل)

حادثات کی نفسیات متضاد ہے! کہیں یہ مصیبت در مصیبت، موافقت کو جنم دیتے ہیں اور کہیں موافقت در موافقت، مصیبت کو۔ میرے بڑے ماموں کشن سنگھ، جیانی کے مورچے میں مارے گئے۔ اُن کی بیوہ نے رُند سالا پہنا ہی تھا کہ اسے ضرورتوں نے گھیر لیا۔ اُس نے ضرورتاً اس کے آگے ہاتھ پھیلائے، کبھی اُس کے آگے اور جب اُسے ہر ضرورت مدام نظر آئی، وہ کسی مستقل وسیلے کے بارے میں سوچنے لگی۔ میرا چھوٹا ماما رام سنگھ، لنگرا، مجرّد اور منگلی تھا۔ منگلی کے بارے میں شاشتر لکھتے ہیں کہ اُس کی لگن گندلی منگلی سے ملتی ہے یا بیوہ سے۔ رام سنگھ کے لئے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ اُس نے اپنی بھابی کے آگے چاورد اُلنے کی تجویز رکھی جو اُس نے مان لی۔ نانی کو بُرا لگا اور اُس نے اُن دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ اُس کا یہ فیصلہ اور کئی دُکھوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ میرے نانا کا چھوٹا بھائی نارائن سنگھ بیساکھی کے میلے کی بھگدڑ میں کچلا گیا۔ اُس کے بیٹے بوٹا سنگھ کو مالی خویا ہو گیا۔ موسیٰ پیار کور کا خاوند کسی مُتعدی مرض سے مر گیا اور موسیٰ گیان کور کا گھر سے بھاگ گیا۔ موسیٰ شور کور، تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ میرے موسیٰ بھائی سرلوچن سنگھ کے سیدھے بازو پر زخم آیا جو زہر باد بن گیا۔ اُسے پچانے کے لئے

اُس کا بازو کاٹنا پڑا۔ غم کی مسلسل چوٹوں سے نانی ٹوٹ گئی، اُس نے چار پائی ایسی کپڑی کہ مَر کر چھوڑی۔ میرے بھائی اجیت سنگھ کی دوسری شادی کی بات چل رہی تھی۔ درشن سنگھ ایف۔ ایس سی میں نل ہو گیا اور بھائی جی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ بھائی جی کی بھائی ننکی اپنی بے عرقی کے باوجود اپنے حصے کی جائیداد سے دست بردار ہو گئی تھی۔ امر کو کو نربدال (پائی) لڑکی پیدا ہوئی جس کی تکلیف سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اُس کے مرتے ہی ترلوچن سنگھ کے لئے دوسرا رشتہ آیا تھا جسے تایاجی نے قبول کر لیا۔

گادوں کے شمال مشرق میں ہمارا بیٹھر بنجر تھا۔ وہاں برودا کاٹس، لونڈرا اور گوکھرو اکٹا تھا۔ بھائی جی نے اُسے توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ چھ مہینے تک لگا تا رہم اُس میں کل چلاتے، نیچے سے جڑیں رولتے اور مٹوا سے ہموار کرتے رہے۔ برودا اور کاٹس کی جڑیں لمبی ہوتی ہیں اور گہری بھی۔ ان دونوں کو جڑ سے مارنا، پہاڑ کھودنے کے برابر ہے۔ ہم نے دن کو دن اور رات کو رات نہ جانا، سمجھو کہ پہاڑ کھودا۔ گنوا ری دھرقی اور اُس پر کھاد کا زور اگندم اور چننا اس زور کا ہوا کہ سٹے اور ڈوڈے ترخ گئے۔ چوں کہ اُس ویرانے میں کھیتی باڑی کم ہوتی تھی اس لئے بھائی جی کی نیت وہاں باغ لگانے کی تھی۔ وہ کام، دھرقی توڑنے کے منصوبے ہی کی طرح مشکل تھا۔ کھیت کو یکساں حصوں میں تقسیم کیا، ہر نشان پر گز بھر گول اور گہرا گڑھا کھودا، گڑھے کی مٹی میں کھاد ملا کر گڑھا بھرا اور کئی کئی بار سینچا۔ پہلی برسات پر پوندی آموں کے بوٹے ہوشیار پور زمری سے لائے۔ گھر میں اچھی نسل کے آموں کی پمیری تھی، کچھ پودے اُس میں سے چنے۔ ان کی چاکلیاں (چاکلی) جڑوں کی مٹی کے ساتھ اکھاڑا ہوا پودا جس احتیاط سے نکالیں، پرال میں باندھیں گدے پر لادیں، کھیت میں پہنچائیں، پرال کھول کر اٹھائیں اور گڑھوں میں لگائیں، وہ تفصیل نطفے سے آئول نال تک کی ہے۔ چاکلی کے اطراف مٹی بھر کر اس طرح کوئی اور ترکی کہ چاکلی کی گل، گل در گل مل گئی۔ ہر پودے کی دیکھ بھال ایسے کی جیسے زچہ، بچے کی کرتی ہے۔ کھیت کی باڑ بندی ضروری تھی۔ جس کے لئے آگ کے دبے لگائے تھے۔ وہ جڑ پکڑتے ہی اس سرکشی سے پھیلے کہ انہیں قابو میں رکھنے کے لئے ایک طریقہ ایجاد کیا گیا جسے ہر کسی نے سراہا۔ انہیں آپس میں جُں دیا جاتا۔ وہ بیج وریج اُلجھتے ہوئے بڑھتے اور اپنے آپ کو ترتیب دینے کے ساتھ باڑ کے رخنوں کے ڈاٹ بھی بنتے جاتے۔ درزیں، پتوں نے ڈھانپ لیں اور باڑ ایسے ہو گئی جیسے ہری دیوار۔ کھیت میں ہل چلانا ہوتا تو پودوں کو بیلوں سے بچانے کے لئے ان کے منہ پر مُسکا چڑھانا پڑتا۔ فودھے سیراب کرنے کے لئے، ہم فلانگ بھر کے فاصلے سے پانی لاتے۔ بہنگی کے بوجھ سے کاندھے سلگتے اور تکان سے اعضا یوں شل جاتے کہ نمک چھڑکے زخم لگتے۔ اُس سمیت محنت سے گھبرا کر مین کوئی بہانہ گھڑتا، دامن بچاتا لیکن باقی سمجھوں کا فلوں، میرے منہ سے رویتے پر برا بھلا کہتا اور مین اپنی ذہنی کیفیت بدلنے پر مجبور ہو جاتا۔

سردی کی رت آئی، پودوں کو پالے سے بچانے کے لئے آڑکی، جس کی اونچائی ناپ کر پودوں سے

فٹ بھراؤچی رکھی۔ پت جھڑائی، بسنت رُت آئی اور آرٹھولی۔ پودوں کی کیفیت رُونمائی، مامتا کی کہانی تھی۔ لال نرم کو نیلیں، کالے ہرے پتوں کی آغوش میں نئے جننے پتوں کی سی تھیں۔ میں انہیں چھوتے ہوئے ڈرتا جیسے ہاتھ کی گرمی سے ان کے خل جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے دوسرے میرے لگاؤ کی اُرج تھی۔ انہیں ہزار نازک سہی، اس قابل تھیں کہ موسم کی گرمی اور سختی سہا سکیں۔ ہم نے پودوں کے گرد تھالے بنائے اور آب جو سے پانی ڈھو کر بھرے۔ ہماری سرگرمی ہی اور تھی۔ ہمارے آخری پھیرے میں پہلے پھیرے کی سی پھرتی تھی۔ ہر کوئی ایسے تروتازہ تھا جیسے توانائی کو ماندگی سے تحریک ملی ہو۔ بھائیابی کی حالت زالی تھی۔ میں نے پہلی بار انہیں چمکتے، دھکتے اور چمکتے دیکھا تھا۔ وہ پودوں کو پکڑتے اور جذبات سے چمک کر کہتے، "کل سے موٹے لگتے ہیں! وہ کھیت کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر سارے پودوں کو نظروں کی لپیٹ میں لے کر کہتے، "یہ اسی طرح بڑھتے رہے تو چند سال میں پھل لے آئیں گے۔" یہ احساس ان کے پھرے پر تسکین اور اطمینان کی لہر دوڑا جاتا۔ وہ ایسے منہ سنوارتے کہ آدموں کا مزہ لیتے لگتے۔ ام کے پیڑ کی لمبی زندگی کہاوت ہے، دادا لکائے اور پوتا کھائے۔ بھائیابی اس کہاوت کی ترمیم کرتے، "ان کا پھل، میری ساتویں پشت بھی کھائے گی!"

"بیٹا پالنے سے ام کا بوٹا لگانا زیادہ دشوار ہے۔" وہ جس سے ملے باغ کی باتیں کرتے اور اس طرح کی فراست جھاڑتے پھرتے۔

اڑ کے لئے ہم گھر کے درختوں کی شاخیں کاٹتے تھے۔ تقسیم وطن کے سال ایسا نہ ہوا، بھائیابی کا ارادہ کچھ اور تھا۔ ایک آندھیری رات بھائیابی نے اجیت سنگھ کو تبریدیا، درشن سنگھ کو آرا، مجھے رسوں کا گٹھا اور خود گٹھا ڈالا۔ ہر کوئی وقفہ وقفہ سے گھر سے نکلا اور الگ الگ راستے سے باغ میں پہنچا۔ وہاں سے ہم اکٹھے فیروز خاں کی بھڑی (شیشم کے کم عمر کے درختوں کا جنگل) میں پہنچے۔ بھائیابی درخت پر کند پھینکتے، پھانس کا جائزہ لیتے، درشن کو رسی پکڑاتے اور اجیت کے ساتھ مل کر درخت کے پیروں پر آرا چلاتے۔ درشن سنگھ اور میں کند کو کھینچتے۔ آرے کے چند رگڑے اور کند کے چند جھٹکے درخت کو زمین پر لے آتے۔ کوئی اسے کاٹا اور کوئی اکٹھا کرنا۔ آندھیرا گہرا تھا لیکن ہماری حرکات پر اثر انداز نہ تھا۔ ہم اپنے کام میں ایسے مصروف تھے جیسے ہماری آنکھوں میں الوؤں کی پتیلیاں جڑی گئی ہوں۔

مجھے کھنکار کر تھوکنے کی لت تھی اور لت، چپل کی طرح تکرار چاہتی ہے۔ میں کچھ سانسوں میں کھانس کھنکار کر تھوکنے لیتا تو مجھے لگتا کہ میرا دم، گلے میں اٹک گیا ہے۔ جب تک کاٹنا چھانٹنا جاری رہا، میرے کھنکھوؤں کا بے غورہ پن اس کے شور میں ڈوبتا رہا۔ جوں ہی وہ کام بند ہوا، بھائیابی نے میرا کھنکارنا سنا اور بھڑک کر کہا، "تیرے گلے میں میرا... اٹک گیا ہے؟"



میں پہلے ہی بھائیاجی کے رویے سے دل برداشتہ تھا۔ میں اُن کے بُرے عمل میں اس لئے شریک تھا کہ مجھ میں بغاوت کا مادہ نہ تھا۔ جہاں تک اُن کے طرزِ نخب کا سوال ہے، وہ اُس کتے کی طرح تھے جس کا بھونکنا، کھٹنے سے زیادہ تکلیف دہ ہو۔

میں کھتی (شاخوں کا گٹھا) اٹھائے باغ کی جانب چل رہا تھا۔ بھائیاجی میرے آگے جا رہے تھے اور گولا اٹھائے ہوئے تھے۔ میرا دم، میرے گلے میں رکھا اور میں اُسے صاف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بھائیاجی گولا پھینک کر پیچھے مڑے اور مجھ پر پکے۔ انہوں نے مجھے اڑنگا دیا، میں اندھے منہ کر کھتی کے نیچے دب گیا۔ انہوں نے کھتی گھیسٹ کر میرے اوپر سے ہٹائی اور مجھ پر چڑھ کر میرا گلابانے لگے۔ میری رگوں میں تناؤ بڑھتے ہی دیدے پھیل گئے اور وہ، جھاتی پر پہاڑ ساد کھائی دینے لگے۔ میرا دم ٹوٹنے ہی والا تھا کہ انہوں نے میرا گلاب چھوڑا اور میری کھتی میں گھونسا مارا۔ میرا رکھا ہوا دم، بجولے کی طرح نکلا اور اپنی تندہی میں میرا کلیجہ لے اڑا۔ میرا بدن جھوٹا پڑ گیا اور میں ہونکتے ہونکتے بے سوز ہو گیا۔ میں کتنی دیر کا پنتا رہا پھر سنسبلا کھتی کھینچ کر اُتارنے سے میرے ماس پر خراشیں پڑ گئیں۔ ہر خراش شعلے کی طرح ٹنگتی تھی اور اندھیرے میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ گھڑی انوکھے ضبط کی گھڑی تھی۔ میں مُسببت زدہ اور بے آبرو تھا لیکن رو نہیں رہا تھا۔ میرے اُنسو میری رگوں میں تیر رہے تھے لیکن آنکھوں تک نہیں آ رہے تھے۔ میری حالت اُس کبر پر سرخ کی سی تھی جسے چھلکنے کے لئے بس ایک مزید قطرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کھتی اٹھا کر بوچھل دل، بوچھل سانس، بوچھل نظر اور بوچھل قدم چل پڑا۔ اپنے ملعون بوجھ کے ساتھ اسنے سارے اور بوجھ اٹھائے میں ساری رات کندیں کھینچتا رہا درخت کا ستارہ اور چڑھتا رہا۔ اُس دوران کھانسنہ اور کھنکارنا بڑی بات ہے، میں نے ٹھیک سے سانس نہ لیا۔ میرا سینہ ٹنگتے ہوئے جذبات سے یوں بھرا ہوا تھا کہ وہاں سانس کی آہستہ دھویں کی سی تھی۔ میرے مظلوم دل نے مجھے بار بار اُگسایا، "تو اپنے ظالم اور چور باپ کا قتل کر دے"، لیکن مجھے حوصلہ نہ ہوا۔

مُرغانِ سحر کے شور کے ساتھ ہم نے جُڑائے ہوئے درختوں کی ٹھنڈیوں پر مٹی ڈالی، جھڑی سے باغ تک کے راستے میں گری پڑی پٹی اٹھائی اور ناحہ امکان وہ ہر نشانی مٹائی جو ہماری کالی کر توت کا سراغ دے سکتی تھی۔ ہم نے آوار باغ کی باڑ میں چھپائے اور اُسی طرح گھرواپس آئے جیسے باہر گئے تھے۔

ہر کوئی مسرور و مغرور تھا لیکن میں شرمسار اور آزرده تھا۔ میں چوری کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ میرے ستم گروں سے بڑھ کر میری بزدلی، میری بیری تھی جو مجھے میری نظریں ذلیل رکھتی تھی۔ میرے اُنسو، میرے ضبطِ غم سے رگوں میں بھاپ بن کر تیرتے تھے۔ میری چال میں بے کسی اور بے چارگی، داخلی و خارجی تحریک سے بے نیاز و ہر کنوں کی سی تھی۔ کیسا ٹھہراؤ تھا! مجھے اپنی سانس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ میری خاموشی میرے ہونٹوں کو جوڑ کر کرتی تھی۔ سحر اُس تھی جیسے میرے انسانیت سوز فضل پر غم زدہ ہو۔ سننا کیسا بھیانک تھا! درختوں پر پتے یوں

لے سکتے تھے، جیسے میرے انجام سے ڈر کر زبان ہی لئے ہوں۔ ہوا نابود تھی جیسے میرے شرمناک راز کو سمیٹتی ہوئی آندھیرے کے ساتھ دُور نکل گئی ہو۔ میں اب جو کے کنارے پہنچا۔ شبنم ہی شبنم دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ مادرِ فطرت میرے ننگ و وجود پر انگ بار ہے۔ اس نازک احساس نے میرے ضمیر کو چھو لیا۔ رگوں میں تیرتی ہوئی بھاپ، ڈھیلوں سے ٹکرائی اور پانی بن کر برس پڑی۔ سینے میں دباؤ گھٹنے سے کلیجہ پچکا اور میں درد سے بندھال ہو کر گر پڑا۔ میں سنہلے سنہلے تنہلا اور نفسِ زاد کی طرح گھر کی جانب چل پڑا۔ میری زندگی میرے گھر کی طرح نفاذ کا مجموعہ تھی۔ اُس کی نفرت انگیز خصوصیت یہ تھی کہ وہاں اخلاص و اخلاق کا درس دیا جاتا لیکن جب اُن کے علیٰ مظاہرے کا وقت آتا تو لگتا کہ اُن اکثر لوگ کا ارتھ، گیان کو ش سے الگ ہے۔

قارئین! یہی نہایت غصب ناک بیان دے رہا ہوں! بھلے تم اسے میری بد طبیعتی سے موسوم کر دو یا میری بد نحوئی سے! میری زندگی میں جتنے لوگ آئے، وہ میرے گھر کے لوگوں ہی کی طرح کم افضل تھے اور اندر سے کھوکھلے ظاہری رکھ رکھاؤ اُن کا چلن تھا۔ وہ اوپر سے کھرا کندن نظر آتے تھے لیکن ذرا کریدنے پر اُن کا کھوٹا پن، منہ چرلانے لگتا تھا۔ شریفانہ طرح داری اور سلیقہ مندانہ سنجیدگی، اُن کی مصنوعی زندگی کے زیور تھے جو انہیں درشنے میں لے تھے۔ حالاں کہ وہ دوسروں کی اُس اِطلاک پر طنز کرتے تھے لیکن اپنی پر خرافت نہ آنے دیتے تھے۔

اُس دیرانے میں ہمارا ہی کھیت ہر ابھرتھا۔ جو پڑوسی ہمارے منصوبے کو کم نظری سے دیکھتے تھے، وہ ایرکھا سے جل مرے۔ ہر کسی کی اپنی وجہ تھی! نام دیو کی یہ تھی کہ ہمارے درختوں کی چھاؤں اُس کے کھیت کی زرخیزی کو مار لے گی۔

پودوں کی اڑ کے لئے شاخوں کی ہنسات تھی۔ اُس کام میں گھاس بھوس بھی لگتا تھا جو کچھاریں جتنا چاہتا تھا۔ پودوں کو اڑ بڑی اور گھنی کی گئی۔ خزاں گئی، بہار آئی اور ہوا تازہ پھولوں، نئے پتوں کی خوشبو سے مہکنے لگی۔ ہم اُدھانے کے لئے باغ میں پیچھے جس اڑ کو ہٹایا اُس میں سوکھا ہوا پودا پایا۔ پوری تباہی کا راز جاننے کے لئے ہم نے پودے کھینچ کر دیکھے، وہ ہاتھ میں آگئے جیسے گاڑے ہوئے دھندے تھے۔ کسی حاسد نے پودوں کو جڑ سے کاٹ دیا تھا۔ ہر کسی کا اپنا غم تھا لیکن بھائیاجی کی ڈانٹ پچھکار سے اُس میں طرح طرح سے اضافہ ہونے لگا۔ وہ اُس حادثے کو ہماری بے توجہی سے منسوب کرتے حالاں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ چوروں اور بد معاشوں کے کئی ہاتھ ہوتے ہیں کوئی کس کس کا خیال رکھے۔

پہلے وہ کھیت کسی امیر کے دیوان خانے کی طرح تھا جہاں کوئی نہ کوئی آتا جاتا رہتا تھا۔ اب کوئی اُدھر نہ جاتا جیسے اُس کے انجام کا سامنا کرتا ہوا ڈرنا ہو۔ اُس کی حالت اُس دبا گرفتہ آبادی کی سی تھی جس کے سارے باشندے ڈر کر دوسری جگہ جا رہے ہوں اور اُسے ملعون سمجھ کر پھر اُدھر کا رخ نہ کرتے ہوں۔

## باب ۲۲

اُسی نے گھول دیا زہر سا خیا لوں میں  
اُسی کا ذکر مجھے زندگی سے پیارا ہے

(شاطر)

میرا دماغ میرے دل سے سوال پوچھ رہا ہے، تو اپنے باپ کی بُرائی ہی بُرائی کرتا جا رہا ہے جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آدمی مُادرِ ندے تھے۔ وہ واقعی مکمل درندگی، مکمل بے حسی، مکمل بے رحمی اور مکمل سرکشی کا مرکب تھے تو ان کے بے اعتبار سائے میں تیری زندگی کو دھوپ کیسے ملی؟ اور دل یاد کرنے پر مجبور ہے۔ ان تمام گھناؤنے، تمام سُنگتے، تمام کینے رشتوں میں اپنے پن کا احساس ہے لیکن میرے مجروح جذبات کی شدت و زور میں محسوس نہیں ہوتا۔

مجھے ٹال پر اکیلا چھوڑ کر وہ سردارِ سنگھ کی شادی میں چلے گئے، واپس آئے اور برنی کی دو رنگین ٹکڑیاں لائے۔ ہریانہ میں رنگین برنی دُسرے پر ملتی تھی، میں پوچھے بغیر نہ رکا، ”آپ یہ برنی کہاں سے لائے ہیں؟“ میں برات میں برنی کھا رہا تھا کہ تو، میری آنکھوں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور مجھے جھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں تیرا اُترا ہوا چہرہ نہ دیکھ سکا اور آنکھ بچا کر ان دو ٹکڑیوں کو تیرے لئے چُرا لیا۔ میں تجھ سے دُور تھا لیکن میرا دھیان تجھ میں تھا۔ ”انہوں نے اپنے جذبے کی حقیقت جوئی کی نوں بیان کی اور پھر اپنی قمیص کی آندری کی جیب سے ایک پُریا نکال کر مجھے دی، جس میں بازار سے خریدی ہوئی سفید برنی تھی۔ اتنی ساری برنی دیکھ کر میں خوش ہوا اور شادی کی تقریب میں شریک نہ ہونے کا غم بھول گیا۔ میں مزے سے برنی کھا رہا تھا کہ انہوں نے مایوں کن لہجے میں کہا، ”ماں باپ درجن بھر بچے پال سکتے ہیں لیکن درجن بھر بچے اکیلے ماں باپ کو نہیں پال سکتے!“ کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا اور برنی کھاتا کھاتا رُک گیا۔

”جب تو بڑا ہو گا تو اپنے آپ سے پوچھنا! انہوں نے میرا سوال مجھی پر لا دیا اور اللہ کر ٹہلنے لگے۔ میں پھر برنی کھانے لگا اور ان کی بات پر غور کرنے لگا۔ اچانک میرے دل نے اُچک کر تجھ سے کہا، اِس سے پوچھ! تو نے اپنے ماں باپ کو کیسے پالا پوسا تھا؟ لیکن میرا بیانا کھلا۔ قارئین! زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر میں اِس وقت وہی سوال تجھ تعریف کے ساتھ خود سے پوچھتا ہوں، ”بچے، بڑے ہو کر اپنے ماں باپ کو بوجھ کیوں سمجھتے ہیں؟“ اور میرا ردِ عمل یہ ہے کہ سمجھ نہ کوئی بھی ہو، وہی پیپتا ہے جو احساس و ادراک پر قائم ہو۔ جس

میل چول سے یہ عنقر غائب ہو وہاں اعتدال و استدلال کی فضا نابود ہوتی ہے اور جہاں ایسی صورت حال ہو وہاں جبر و تشدد کا دور دورہ ہوتا ہے اور فضا بے جبر و تشدد باغیوں کی صورت اعلیٰ ہے۔

ہذا ڈٹ برسی اور اُس کے ساتھ اوسے بھی پڑے۔ زمین، برف کی بل بن گئی اور ہوا، ٹھنڈی تلواہ۔ یس ناک کے آگے سے کھیس ہٹا کر سانس لیتا تو لگتا کہ نتھنوں پر برف کی ڈلی رکھی ہے۔ ہنسران نے کلاس روم کے درپچے اور دروازے بند کر دیے اور پاؤں کرسی پر رکھ کر سگڑ کر بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں پڑھنا اور پڑھانا کیسا وہ عمر عیار کا قہہ سنانے لگے۔ عین اُس وقت جب عمر عیار اپنے دوست امیر حمزہ کو شہر طلسم سے آزاد کروانے کے لئے اپنی زنبیل میں سے جادو کا توڑ نکال رہا تھا، دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنسران نے امیر حمزہ کو اُس کے حال پر چھوڑا، حیرانی سے دروازے کی جانب دیکھا اور کوسے ہوئے بولے، ”کون ہے؟ اس پالے میں کچھ آرام نہیں! اوروازہ ان کے پاس ہی تھا، وہ چاہتے تو ہاتھ بڑھا کر کھول سکتے تھے لیکن وہ صرف گردن کھانے کی حد تک پہنچے اور حمید کو دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ اُس نے اٹھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور اس انداز سے دروازہ کھولا جیسے اسے تمرا ملی ہو۔ سر سے پیروں تک ڈھکے ہوئے ہیولا نما ادنیٰ کو دیکھ کر ہنسران نے غصے سے پوچھا، ”کون ہے؟ کیا چاہیے؟“

درشن سنگھ نے منہ کے آگے سے دوسوٹی ہٹا کر دھیلی سی آواز میں کہا۔ ”میں درشن سنگھ ہوں جی!“

گیان کا بڑا بھائی۔“

میں اپنی قطار میں سب سے آگے بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے بولتے ہوئے سنا اور اس سے پہلے کہ ہنسران کچھ کہتے، میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دروازے سے ذرا پرے ہٹ کر اُس نے دوسوٹی کی بکلی سے کپڑے میں لپیٹا ہوا لوٹا نکالا اور مجھے تھما کر کہا، ”دودھ ہے، بھائیاجی نے بھیجا ہے۔“

اُس گھنٹے دودھ کی گنگنی گرمی انتوں سے دوڑتی ہوئی، رگوں میں پہنچی اور ناخنوں میں جا کر رکی۔ اُس نازک گھڑی، میں نے اپنے بھائیاجی پر فخر کیا اور اندر ہی اندر محسوس کیا، ”میں ان کا نہایت چہیتا بیٹا ہوں۔“

’رام بیلا کے جو میں کویلے کی بھٹیاں لگائی ہوئی تھیں، وہ جل گئی تھیں، ان کے موکھے و باد دیے گئے تھے اور انہیں سینے کے لئے بھائیاجی ہماری دُہرے کی چھٹیوں کے انتظار میں تھے جس دن چھٹیاں ہوئیں کچھ بھٹیاں اُسی دن بجھائیں اور کچھ دوسرے دن سویرے، اُس کے بعد پہلے دن کی بجھائی ہوئی بھٹیوں کا کوئد نکالنا شروع کیا۔ جلی مٹی کی بوباس، گرم گیلے کوٹلوں کی بھڑاس، اُڑتی چنگاریوں کا سنسپ، ہڈیوں پر کاس کی حالت سیخ پر چڑھے کباب کی سی تھی۔ پسینہ ایسے گرتا جیسے کباب کے آئسو۔ شام تک بدن، کالا کوٹلا ہو جاتا۔ ویدے اور دانت ایسے چمکتے جیسے اندھیرے میں سر مچھیا دینک بھل رہا ہو۔ ہم کام بند کر کے ٹال کی طرف جاتے، راہ گیر، ہمارے ٹولے کو

مڑ مڑ کر دیکھتے اور سہنے ملن جیسے بار بار ش پھبتیاں کتے،

”بھوتوں کا ڈیرا کدھر چڑھائی کر رہا ہے؟“

”مکھڑوں کو پنکھوں کے بجائے پیر لگ گئے ہیں!“

”کولوں کی دلالی میں منہ کالا! سنا تھا، دیکھا نہیں تھا۔“

اُن کی برجستہ تیشیلوں سے لطف اٹھاتے ہوئے اور کسی کامنہ چڑاتے ہوئے ہم کھٹ پر پہنچتے،  
لائف بوائے سے مل کر نہاتے، ایک دوسرے سے بدن کی جاپنچ کر داتے اور کہیں نہ کہیں کالک موجود پائے  
کانوں کے پیچھے کالک، کانوں کے آگے کالک، ناک کے باہر کالک، ناک کے اندر کالک، کوروں پر کالک، نائٹوں  
میں کالک اور گھائیوں میں کالک، یچیدوں کی کالک بالکل ٹیلی تھی، وہ اندر دُور تک گھس جاتی تھی اور کسی طرح نہیں  
نکل سکتی تھی۔ میں کالک کھاتا، کالک ٹھوکتا، کالک سُکتا اور کالک گھتا۔ کام کی یہ سختی خلاف معمول نہ تھی۔ بیجا جانی اور کٹائی  
کے موقع پر ایسی سخت مُشتّت، زندگی کی کڑوی حقیقت تھی۔ مجھے جس بات کا ذکر مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اُس  
کام کو سمیت کر بھائیاجی نے بکرا جھٹکایا اور ٹھرا منگوایا۔ ماس پک کر تیار ہوا۔ اُنہوں نے اپنے لئے زے ٹھہرے  
کا گلاس بھرا اور گلاس کا ایک چوتھائی میرے لئے۔ تابیاجی شراب نہیں پیتے تھے، کہتے تھے کہ انسانی جسم لذتِ سرور کا  
خلقی سرچشمہ ہے، اس میں بیرونی لذات ملاتے رہو تو اس کی اپنی لطافت مرنے لگتی ہے۔ بھائیاجی نے ٹھہرے کا  
گھونٹ پی کر چٹخارا بھرا گویا اُس کی لذت کی نفاست کو پرکھا۔ میں نے ٹھہرا چکھا، مجھے کڑوا لگا اور میں نے منہ  
بنا کر گلاس رکھ دیا۔

”تو مڑ دے؟“ امرت چکھ کر منہ بنا رہا ہے۔ ”بھائیاجی نے جھڑکا۔

”اس میں تھوڑا پانی ملا دیجئے کڑوا ہے!“ میں نے بد مزگی کا اظہار کیا۔

”اس کی تلخی میں چاشنی ہوتی ہے، اُنوے کی طرح اب کیسا لگ رہا ہے؟“ اُنہوں نے میری بے دلی

کو ترغیب شوق دے کر سوال کیا۔

جب تک ٹھہرے کی تلخی مزے کی سنسنہٹ میں بدل چکی تھی۔ میں نے اُن کے مشاہدے کی تائید کرتے  
ہوئے کہا، اچھا لگ رہا ہے!“

”تو پھر چل نکل، خوشیاں!“ اُنہوں نے گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔

میں نے اپنا گلاس اُن کے گلاس سے ٹکرایا، منہ سے لگایا اور غنا غٹ چڑھایا۔ میری رگوں میں شعلہ

پک گیا اور میرا دم روم چمک گیا۔ اُنہوں نے شاد باش کہا اور نلی کا گودا نکال کر مجھے کھلایا۔

انسانی رشتے کتنے سہل ہیں! کتنے مشکل ہیں! کتنے درد مندہ ہیں! کتنے ظالمانہ ہیں! کتنے محبت آمیز

ہیں! کتنے نفرت انگیز ہیں! کتنے اُونچے ہیں! کتنے نیچے ہیں! کتنے پورے ہیں! کتنے اُدھورے ہیں! مکمل بھول  
بھلیاں ہیں۔

ہم کھات کے لئے گڑھا کھود رہے تھے کہ وہاں بھائیابی آ گئے۔ انہوں نے سب کو کلامتوں پر  
دھریا کیوں کہ کام کا حاصل اُن کی امید سے کم تھا۔ ہم صُبح سے جان مار رہے تھے، ہمیں بے جا کلامت پر بہت رنج  
ہوا اور ہم نے کام کرنا بند کر دیا۔ اپنے اس رویے کے بارے میں، میں ایک بات تفصیل سے کہنا چاہتا ہوں، ہم سب  
بھائی کسی منصوبے کے لئے شاذ ہی متحد ہوتے تھے لیکن آٹ سانٹ کے لئے ایک دوسرے کے اشارے کے منتظر  
رہتے تھے۔

بھائیاجی بھڑک اٹھے۔ وہ گالیاں بکنے لگے اور جاتے جاتے تاکید کر گئے، ”شام تک گڑھا پورا نہ ہوا تو  
گھر میں نہ آنا، جدھر جی چاہے، چلے جانا۔“

تایا جی پاس ہی کام کر رہے تھے، وہ اگر ہمارے بیچ بیٹھ گئے۔ ہمارے پاس ہی ایک جوڑی تھی جو  
گڑھے میں سے کافی تھی اور اُس برگد کی تھی جس کا وجود کھوئی ہوئی صدیوں کا ایک سراغ ہے۔ تایا جی نے جڑ کو دیکھا  
اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس جڑ کو دیکھو، غذا کی تلاش میں کہاں سے کہاں پہنچی ہے! سوچو! یہ برگد سے کیا  
لیتی ہے؟ لیکن اُس کے لئے رات دن کام کرتی ہے اور نام و نموسے دور گمانی میں زندگی گزارتی ہے۔ وہ کون سا جذبہ  
ہے جو اسے دن رات مصروف کار رکھتا ہے؟“ وہ جڑ کو غور سے دیکھ رہے تھے جیسے اُس کی خاموش بیانی کو سن رہے  
ہوں۔ ہم نے انہیں سوالیہ انداز سے دیکھا، وہ بولے، ”یہ جانتی ہے کہ میں برگد کا آٹوٹ حصہ ہوں اور مجھے اُس کی  
ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ کتبے میں ہر فرد کی حسبِ توفیق ذمہ داری ہے! وہ اپنے فرض سے کوتاہی برتے گا تو کتبے کی  
ہم آہنگی میں خلل پڑے گا اور یوں وہ آفر تفری کا مُرنکب ہو گا۔ اُٹھو اور اپنا فرض پورا کرو!“ انہوں نے ہر کسی کی پیٹھ تھپکی  
اور جا کر اپنا کام کرنے لگے اور اُسی طرح ہم بھی۔

ایک بار بھائیاجی ہلکے پھلکے مزاج میں بیٹھے تھے، میں نے کہا، ”آپ گالیاں نہ دیا کریں تو آپ کی صحت  
پر اثر پڑے گا کیا؟“

”میری صحت پر نہیں، تیری صحت پر ضرور اثر پڑے گا! کیوں کہ ماں باپ کی گالیاں، سہالیاں ہوتی ہیں۔“  
انہوں نے تڑت گالی دے کہا۔

میں کبھی تایا جی سے بھائیابی کی زبان درازی کی شکایت کرتا۔ وہ انہیں کچھ نہ کہتے، مجھے ہی سمجھاتے،  
”بچے ناڑکِ دل اور ناڑکِ دماغ ہوتے ہیں۔ یہ بات کو جلد اور بلا عذر مان لیتے ہیں جیسے نرم شاخ کو جدھر جھکاؤ،  
جھک جاتی ہے۔ اس کے برعکس بڑے بے پلک ہوتے ہیں، انہیں کچھ کہنا، نہ کہنے کے برابر ہوتا ہے۔“ وہ میری پیٹھ

تھپک کر کہتے، "چنگا ناؤں رکھایا، کر کرت بھی چنگی! اسے انسان تو نے اپنا نام چن کر اعلیٰ رکھا ہے۔ تجھ پر لازم ہے کہ تیرا عمل تیرے نام کے ہم سر ہو۔"

## باب ۲۵

کوئی یقین کرے اس پہ یا ہنسے شاہ

(شاہ)

وہ زندگی ہے مری جس نے مجھ کو مارا ہے

میں کسی کسی دلتیں اور مصیبتیں جھیل کر سن بلوغ کو پہنچا ہوں یہ افسانہ ایک درویش ہے۔ جب تک میرا دل رورو کر ابر مردہ نہ ہو جائے یہ داستانِ گریہ جاری رہے گی۔ خوشی کے چند جھونکوں کے سوا میری زندگی تپتے ریگستان کی طرح ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کتنی جانوں پر مجھ سے بھی کٹھن گزری ہوگی! یہ محض اعجازِ وقت ہے کہ مجھے زورِ قلم اور میری طبعِ حقیقت پسند کو اپنے آپ کو رسوا کرنے کا حوصلہ مل گیا۔ ورنہ ہائے وہ لوگ جو اپنے ان کے غموں اور ان کھولے دلوں کو سینوں میں بچھپائے ماٹی میں سو رہے ہیں۔ اودھرتی ماں! تجھ میں کیسے کیسے غم گرفتہ اور مصیبت زدہ لوگ بستے ہیں لیکن تو خاموش ہے۔ اگر انسان کا ظرف، تجھ جیسا ہوتا تو دنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ انہوہ درد و غم اور بدنامی کے ڈر سے میری حالت عجیب ہے۔ ایک طرف میں حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوتا ہوں اور دوسری طرف دروغ گوئی۔ میں کہوں یا نہ کہوں کی رحمت سے بڑھال رہتا ہوں۔ میری جرأت بیانی بحال ہوتی ہے تو میں اپنی عیب جوئی کرنے لگتا ہوں۔ یہ کتنا مشکل کام ہے! اس نایاب عذاب کی انوشی زیادتی وہی جانتا ہے جو اپنی برائی آپ کرتا ہے۔

میرے غم گسارِ قادرین! آپ میرے ایک اور غم، بھیانک غم میں شریک ہو رہے ہیں۔ میرا یہ خاص غم یوں ہے جیسے پھول پر تیلیا (ایک مکھی کا ہنگامیٹھا جس سے پھول کی قوتِ تولید غارت ہو جاتی ہے) میں نے اس غم کو روپیٹ کر اپنے گوشت و پوست کے ڈھیر میں دفن کر لیا تھا۔ اس پر ریاکاری کا ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ اس تک میری روح ہی کی رسائی تھی۔ آپ اس سے اس غم کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں! میں اس کے تعلق سے محتاط سامتا تھا تھا! میری روح، زخمی شیرینی ہی چنگھاڑتی ہوئی، مجھے اس غم کی تشہیر کرنے سے روک رہی ہے اور میں ہوں کہ اپنے ارادے پر اٹل ہوں۔ آپ سوچئے! آپ، مجھے کس قدر عزیز ہیں! میں کس حد تک آپ کو اپنا سمجھتا ہوں!

میں تو عمری ہی سے 'شاطر' کے نام سے موسوم ہوں، حالانکہ مجھے شطرنج کھیلنی آتی ہے اور نہ ہی میں فطرتاً غیار ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو دھوکا ہو، میں مزید وضاحت کرتا ہوں۔ میں پیدا انشی شاعر بھی نہیں ہوں۔ اس نام سے مجھے بدنام کیا تھا ایک لونڈے باز نے! وہ پنجابی کا شاعر تھا اور بیتل خٹکس کرتا تھا۔ اس کا پہلی نام کس قدر مذہبی ہے، سری رام! اس کا حلیہ برا لگتا تھا۔ وہ سال میں بارہ مہینے اور مہینے میں تیس دن بھر اکڑاتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کا دل کسی پر آجائے تو وہ اُسے داماد بنا کر بھی زیر کر سکتا ہے۔ اس نے بھایا جی سے تیس روپے اُدھار لئے لیکن واپس نہ کئے۔ روپے اُگاہنے کے لئے بھایا جی، مجھے اُس کے پاس بھیجے۔ وہ مجھے طرح طرح سے بھرماتا، مجھ سے اشعار سُنتا، میرے حافظے کو سراہتا، مجھے شعر کہنے پر اُکساتا اور میرے نام سے مجھے شعر لکھ کر دیتا۔ وہ مجھ پر اشعار کہتا جن میں مجھے طرح طرح کے ناموں سے مخاطب کرتا۔ میں اُس کے بھرتے پر چڑھتا وہ کہتا، "آپ اپنے لئے کچھ بھی لے جائیں سرکار، اُس کھوسٹ کے لئے دھڑی نہ دوں گا۔"

اُس کا دوست گرداس سنگھ اُسے لونڈے باز کہہ کر بلاتا تھا۔ اپنے بھلے نام کے ساتھ اُسے یہ تحیر آمیز اضافت بُری لگتی۔ وہ اُس سے نہایت شائستہ انداز میں کہتا، "تم ہمارے ذوق کی توہین کرتے ہو! ہمیں شاہد پرست اور میرے پیارے کو شاہد مَقصود کہا کرو۔ یہ شاہانہ ذوق ہے! سکندر اور محمود جیسے بادشاہ اُسے اپنی ذکاوت کی علامت سمجھتے تھے۔"

عام طور پر شاعر ہونا، تہمت خریدنا تھا۔ حالانکہ لوگ، اُن کا کلام گاتے تھے۔ لیکن انہیں ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ شاعر، آمر دپرست ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بیان کی تصدیق میں اشعار سُنتا تھے، خاص کر، میر تقی میر کا یہ شعر،

میر کیا سادہ ہیں! بیمار ہوئے جس کے سبب

اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ہریانہ میں اتنے شاعر تھے کہ اُن کے بارے میں مشہور تھا، کُتے کے پتھر مارو تو شاعر کو لگتا ہے۔ شاعروں کے بارے میں گندی گندی آواہیں پھیلی رہتی تھیں۔ سوہنے ملن کی باولی پر ہر شام شاعر اکٹھے ہوتے تھے اور اپنے معاشقوں کے منظوم قصے سُنتے تھے۔ 'چنت پرنی' بیت بازوں کا ترنہ تھا۔ وہاں ہر سال میل لگتا تھا اور فی البدیہہ بیتوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ وہ باتیں اتنی خیال خیز تھیں کہ بڑے بڑوں کو لے اُڑتی تھیں۔

ہمارے علاقے میں لونڈے بازی اپنی انتہا پر تھی۔ جیسے ریوڑ میں خست لوک، بکریوں کو دم نہیں مارنے دیتے اُسی طرح لونڈوں کے پیچھے لونڈے باز لگے رہتے تھے۔

بیتل کی حویلی کے درو دیوار پر بدنام فقرے لکھے رہتے تھے۔ چوں کہ میں اُس کے پاس جاتا تھا، اُس



گھاؤں کے لڑکے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے۔ تیس ایک دن اُس کے پاس گیا اور دیکھا کہ اُس کے دروازے پر دو غلا کے بنے ہوئے ہیں، ایک پر گیان لکھا ہوا ہے اور دوسرے پر بیتل۔ اُس طرز کے خا کے بیت الخلاؤں اور پیشاب گاہوں میں عام ہوتے ہیں۔ اُس تہمت سے گھبرا کر میں نے اُسے مٹانا چاہا لیکن وہ بدنامی میری تقدیر کی سیما ہی تھی۔ سیما ہی کی انوکھی صفت ہے کہ یہ سفیدی کی سی تیزی سے پھیلتی ہے لیکن اُس کے برعکس بھیانک ہوتی ہے۔ وہ سیما دیوار دیوار، راستہ راستہ، درخت درخت ہوتی ہوئی میرے سکول میں پہنچ گئی۔ میں، بیتل کے گھاؤں جانے سے پرہیز کرتا، مجھے زبردستی بھیجا جاتا، میں ادھر ادھر وقت گنوا کر گھر میں لوٹ آتا اور سیما جی کو گھڑا گھڑا اچھا سنا دیتا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا! مجھ پر بیتل کے نوڈے کا نام داغ دیا گیا۔ اب تو شاطر کی قسمت ہی بدل گئی ہے! میں اسے غارِ گمنامی سے کھود کر بذاتِ خود اجالا دکھا رہا ہوں۔

بیتل کی لڑکی پیشیا مجھ سے عمر میں کچھ بڑی تھی، جس کی ساری خوبصورتی اُس کی آنکھوں میں تھی۔ اُن میں ایسا نمک تھا جو اُدھر کرگوں میں پہنچتا تھا اور نوں کا دباؤ بڑھاتا تھا۔ وہ پیشیا کے ساتھ شہر آتا اور جان بوجھ کر اُس وقت واپس جاتا جب میرے گھر جانے کا وقت ہوتا۔ وہ ہمارے ساتھ چلتا چلتا کسی نہ کسی بہانے پیچھے رہ جاتا اور ہم آگے نکل جاتے۔ زیادہ تر خاموش ہی رہتے اور گھاؤں کے پاس پہنچ کر اُس کا انتظار کرتے۔ میں دل ہی دل میں پیشیا سے بہت سی باتیں کرتا لیکن زبان سے کچھ نہ کہتا۔ اُس سے اپنی پوشیدہ محبت کو میں نے یوں ہویہ کیا کہ اپنے دائیں ہاتھ کی پشت پر اوم کھودوا لیا۔

مجھ میں اور کئی تبدیلیاں آ رہی تھیں لیکن میرا اثر میلان زیادہ نہ بدلاتھا۔ پیشیا اچھی لڑکی تھی اور میری ہی طرح معصوم لگتی تھی۔ اُس کی اندرونی حالت وہی جانے! میری حالت اُس ابرو بہار کی سی تھی جو اُڑنا اور منڈلانا جانتا ہو لیکن برسنے کے فن سے بے بہرہ ہو۔

میرے بارے میں پھر افواہ اُڑی لیکن اس بار اُس کی نوعیت دوسری تھی۔ میں، بیتل سے جتنی نفرت کرتا تھا وہ قدرے کم ہو گئی۔ ہر کوئی ہر صورت حال سے اپنا مطلب نکالتا ہے، وہی اُس نے کیا۔ میں اس وقت بھی سوچ نہیں سکتا ہوں کہ نفس پرستی جیسا لطیف جذبہ مکمل حیوانیت کے زیر اثر عمل پیر ہو سکتا ہے؟

مجھے دکان پر دیر ہو گئی۔ سوء اتفاق! آندھیری رات تھی۔ شام ہریانہ دیران ہو چکی تھی اور تہلی، کالا مٹی باس پہن کر بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ ننٹا سا ننٹا تھا! استارے سہمے سہمے دکھائی دے رہے تھے۔ درخت گھات میں بیٹھے ہوئے شکاریوں کی طرح دم سادھے ہوئے تھے۔ گرد و پیش میں وحشت کی ٹکرائی تھی۔ وہ شے جس کا رشتہ نظر سے ہے، اجنبی لگ رہی تھی۔ جانے بیچانے کو چر ڈراؤ نے مغہر م رکھتے تھے اور دل میں نشتر سے چبھاتے تھے۔ انوکھی ترزو اس نقیب کی سی تھی جو کسی آفت کی شہیر کرتا ہو۔ میں دوسو بی دوسو میں گھرا تھا۔

رجھینگر مجھے روکتے تھے۔ وہ میری آہٹ پا کر خاموش ہو جاتے جیسے میرے احساس کی تائید کرتے۔ مینڈل کے ڈیرے کے ادھر باغوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور کپڑے آم کے پاس ختم۔ میں ہول زدہ وہاں پہنچا۔ میرے سفر کے واحد ساتھی، رستارے باغوں کی پہنائی میں چھپ گئے جیسے میرے حال سے آنکھیں چڑا گئے۔ معلوم راستہ اور معلوم ہو گیا۔ میں آندھیرے میں ایسے چلتا تھا جیسے گہرے پانی میں۔ میرے پاؤں ایک ساتھ محاس اور جریب تھے میں نے کسی ساتھی کے انتظار میں رکنا چاہا لیکن میرے پاؤں آگے ہی بڑھتے گئے جیسے میری سلامتی سے زیادہ انہیں اپنی نینزل کی فکر ہو۔ انجانے خطرے پھیلنا شکلوں میں ڈھل کر میری آنکھوں کے سامنے آدھم مچانے لگے، مجھے سہا اور تنہا پا کر راستے کے دوسرے ہیولوں کی طرح پھیل گئے۔ میں سمٹ کر چلنے لگا۔ جیسے اس باغی اور وحشی مجموعہ میں میرے کچلے جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن یہ کیسا اتفاق تھا! ہوا میں اکسیر کی تاثیر تھی۔ سانس، رگوں کو توانائی پہنچا رہی تھی جیسے وہ، انہیں ناگہانی حادثے کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر رہی ہو۔ یہ اُسی توانائی کی ہم توانی کا اثر تھا کہ دیندار کے ڈیرے کے برابر میں نے گیت گنگنا کر شروع کر دیا۔ وہاں سے کچھ آگے قدام سے اونچی بن موٹی تھی، اس میں سے آدمی نما ہیولا نمودار ہوا۔ میں، اسے پریت سمجھا اور خوف سے چپ ہو گیا۔ میں داہر کو کا جا پ کرنے لگا۔ ماں بیتی تھی کہ داہر کو کا پوتر نام سن کر گندی روحیں بھاگ جاتی ہیں۔ وہ ہیولا آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ میں داہر کو کے نام میں اُلجھنے لگا اور آخر چپ ہو گیا۔ میں نے چلنا چاہا لیکن چلا نہ سکا۔ میری بے حوصلگی نے میری زبان مغلوب کر دی لیکن میری ٹانگیں اس کے ناکارہ اثر سے بچ گئیں۔ میں جدھر بٹتا وہ ہیولا ادھر پلٹا اور میرے آگے آ کر کھڑا ہو جاتا۔

”ڈر گئے دلبر جانی؟“

اُس کے مترنم لہجے سے میں نے اسے پہچان لیا، وہ بیکل تھا۔ میں جن حالات سے دوچار ہوا تھا میں نے اُن سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور غصے سے کہا، ”ہم میرے راستے سے!“

”میں کب تک ہٹتا اور تڑپتا رہوں گا؟“

اُس کی بے نیکی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، میں راستہ کاٹ کر نکل گیا۔ اُس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مروڑ کر کہا، ”آج نہیں جانے دوں گا! میرا حق مجھے دو اور جاؤ۔“ اُس نے میری کلانی پر اس زور کا دباؤ ڈالا کہ میں بے بس ہو کر اُس کی چھاتی سے جا لگا۔ میری جسمانی بے مقصدوری اور جذباتی پستی نے مجھے بڑھال کر دیا۔ میں زیادہ مزاحمت نہ کر سکا۔ اُس کی شہوت مست حرکتیں اور بیجان پرور سانسیں میرے سارے وجود سے لپٹ گئیں اور اسے اپنے اپنے طریقے سے مغلوب کرنے لگیں۔ میں اُس کی ہوس کا شکار ہونے ہی والا تھا کہ میں نے کسی کو گاتے ہوئے سنا۔ شدتِ ہانت اور شدتِ دہشت سے میرا وہ خود آفرینہ جذبہ مہر چکا تھا جو شکست خوردہ حالات میں انسان کی خود اعتمادی کو ابھارتا ہے اور اُس کی ہمت بندھاتا ہے۔ کسی طرح اُس جذبے کا احیا ہوا۔ اُس نے میری

بے چارگی کو سہارا دیا اور میرے معذور دل کو حوصلہ اور میں نے ”بچاؤ بچاؤ“ کا شور مچا دیا۔ اُس نے میرا منہ بند کیا اور مجھے اٹھا کر جھاریوں میں لے جانے لگا لیکن اُس وقت تک میرے ملاوٹے کا جواب اچکا تھا۔

”ٹھہرو ہم آتے ہیں!“

پنچہ آوازیں ایک ساتھ آئیں اور پھر زبر اُترنے لگیں۔ وہ بو اُپس گھرا گیا۔ اُس نے مجھے چھوڑا لیکن میرے نکال پر کاٹ کھایا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں درد سے سنبھلا نہ تھا کہ دو آدمی بھاگتے ہوئے میرے پاس پہنچے۔

”کون تھا؟ کیا ہوا؟“ وہ پے درپے سوال کرنے لگے۔ اپنی بدنامی کے ڈر سے میں صوفت اُتار کر سکا، شاید کوئی چور تھا۔ وہ جدھر گیا تھا میں نے ادھر ہاتھ اٹھا کر کہا، ”ادھر گیا ہے“۔ ایک آدمی نے سڑک کے کنارے کی جھاری کو ہلا کر کہا، ”حرام زادے، تیری تقدیر اچھی ہے کہ اندھیرا ہے! ورنہ تجھے مزہ چکھاتے۔“ وہ دونوں، چور اور اندھیرے کو گالیاں دیتے ہوئے میرے ساتھ چولے۔ میں چپکے کو سنبھلاتا، جو مجھے ٹھونکنی ہوئی کیل کی طرح لگتا۔ کیل اور زخم کی کارسازی ایک ہے، دونوں اپنا نشان نہیں گناتے ہیں۔ اُس چپکے کا نشان بصورت دیگر میرے دل میں ہے۔ میرے ساتھیوں کو میرے گاؤں سے آگے لگے گنو وال جانا تھا۔ میں اپنے گاؤں کے پاس اپنے راستے جانے لگا، اُنہوں نے ناصحانہ انداز میں کہا، ”اتنی رات گئے اکیلے مت آیا جایا کر! راستے میں سو طرح کا خطرہ ہوتا ہے۔“

قادر مبین! میں بارہا ذلیل ہوا ہوں، جذباتی طور پر روند گیا ہوں، رویا ہوں۔ میرا دل شاید ہے کہ اس ذلت کی سنگینی اور جذبات کی بے کلی بالکل الگ ہے اور ناقابلِ بیان۔ اپنی تذلیل پر بھائے جانے والے اُنسوؤں کی اُگ زالی ہوتی ہے۔ میں بظاہر اچھا بھلا تھا لیکن ہڈیوں کے مخز سے لے کر ہر بُن موم کے اندر تک جھلسا ہوا۔ جب کبھی میں ایسی صورتِ حال سے گزرتا، مجھے لگتا کہ میری خوب صورتی بار بار لگاتار میرا پیچھا کرتی ہے اور مجھے اس آخر کی سزا دیتی ہے کہ میں اُس کا نااہل دوست ہوں۔ اپنی خوب صورتی پر مجھے جیسا ناز تھا، غریب کو امیر کی دوستی پر ہوتا ہے جیسا میاں پر میں مردود تھا! میری روحانی سر بلندی، میری خوب صورتی سے تھی۔ اُس سے میرا وہ رشتہ تھا جو پتہ بندے کا شاہ پرودے سے ہے۔ اُس کے بل بوتے پر میں اُڑتا تھا اور آسمان کی بلندیوں میں بھاں لکتا تھا۔ میری رفیق، میری مصیبت کا باعث بنی تو میری رگوں میں میٹھی شراب کی جگہ کرڈا تیزاب بھر جاتا جو دھڑکنوں سے لے کر سانسوں تک میں سمیرت کر جاتا۔ میری روح کی وہ طاقت غارت ہو جاتی جو مجھے میری لاچارگی میں سنبھالتی تھی۔ میں اپنی ذلت کی پستی میں سوچتا کہ بد صورتی کتنی ہی بھیاں تک سہی، خوب صورتی سے دل پزیر اور آرام رساں ہے۔ میری یہ نفسیات شاید شدید تھی، اگر رہتی! میں نے اپنی صورت بگاڑ لی ہوتی۔

اُس پنچ نے ہر بھیج سنگھ اور گرداس سنگھ سے اٹ سٹ کر کے مجھے زیر کرنے کی گہری جال چلی۔ وہ دونوں چھٹے ہوئے طالب علم تھے اور مرنے مارنے پر تیار رہتے تھے۔ میری خوش قسمتی! میں اُس کے پیچ میں آتے آتے گرم چنڈ

کی وقتی مدد سے بال بال بچ گیا۔

میرا بزدل، جسے میں لاشے کی طرح اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا تھا، میری زندگی پر گھناؤنا بوجھ تھا۔ اپنے سارے عذابوں سے چھٹکارا پانے کے لئے مجھ پر لازم تھا کہ میں اس بد ذات سے چھٹکارا پاتا۔ میں کبھی اپنے بزدل کا توصلہ بندھاتا اور ناموافق حالات کا سامنا کرتا لیکن منہ کی کھاتا۔ مجھ ملٹوں پر یہ کہاوت پوری اُترتی تھی۔ بے سحر طے کا یار، سدا خوار۔

## باب ۲۶

زندگی کی بساط پر شاطر

چال اپنی نہ کوئی کام آئی (شاطر)

وہ زمانہ میری زندگی کا نازک ترین زمانہ تھا۔ میں اپنے آپ کو بدلنا چاہتا تھا، اپنی بزدلی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا، اپنے غلطی سے کیا کیا نہ چاہتا تھا! میں جسمانی طور پر اتنا کمزور نہ تھا اس کے باوجود میں کسی کی زیادتی کا مقابلہ کرنے کے ناقابل تھا۔ بھائی جی کی دست درازیوں نے میری اس جبلت کو کیل دیا تھا جو لکار کا جواب لکار سے دیتی ہے۔ جہاں کہیں مقابلہ درمیش ہوتا، وہاں میری حالت اس کتے کی سی ہوتی جو حریف کو دیکھ کر دم دیا لیتا ہے اور اس کے حملے سے پہلے ہی زمین پر لوٹنے لگتا ہے۔

نایابی کے عالمانہ رویے سے میری ذہنی تربیت جیسی ہوتی تھی اس کی نوعیت دوسری تھی۔ میں ان سے دلیل سے زیادہ عمل سے جیتنے کا فن سیکھ رہا تھا۔ معرکہ آرائی میں، میں حریف کے سنگھ ہوتے ہی یوں جھجھ جاتا جیسے ہوا میں کمزور چراغ۔ ماں کی مکمل تابعداری نے مجھے دعاؤں، التجاؤں اور مناجاتوں کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا، جہاں مجھے نہ کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھائی۔ میں گھور اعتقاد کی گھور خندق میں پڑا روشنی کا تمنائی تھا۔ میں ماں کی طرح اپنی ولت کو اس کی رضا سمجھتا تھا لیکن راضی بہ رضا جینے کے لئے، میں جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر جڑنا اور جڑ جڑ کر ٹوٹنا تھا وہ عذاب کی کیفیت ناقابلِ بیان ہے۔ کاش مجھ میں ایسی قابلیت ہو کہ میں نئے الفاظ ایجاد کر سکوں جو میری تڑپتی رگوں جلتی سانسوں اور کانپتی آہوں کی سچی نمائندگی کر سکیں۔ میری تجوری میری روح کی زیاں کاری ہے اور میری نامائی کی ہمیشگی۔ میری پستی میں سے ایک ہی آرزو ابھرتی تھی کہ میں اپنے اذیت دینے والے سے بدلہ لوں لیکن میں بے مقدر ہوتا تھا۔

میں اپنی لاچارگی میں اپنے دل و دماغ میں جنگ لڑا کرتا تھا، جنگ! بیہانک جنگ! وہ جنگ

واقعی لڑی جائے تو جنگِ عظیم سے غظیم تر ہو۔ میرا یقین ہے کہ آدمی ظاہری طور پر جتنے ظلموں، ہستموں، فسادوں، قہروں، غفیبوں.... کا مرتکب ہے وہ اس کی خیالی دَردِ زندگی کا دھندلا سا عکس ہے۔

میری بدلہ لینے کی آرزو دو ہی طریقے سے پوری ہو سکتی تھی۔ اول! میرا خدا میرے دشمنوں سے لڑتا اور انہیں ملیا میٹ کرتا۔ دوم! وہ میری ناحروری کو مزید انگلی میں بدل دیتا اور میں وہ سب کچھ کر دکھاتا جس کی مجھے، اُس سے توقع تھی۔ مجھے دعاؤں کی کارگزاری پر شک گزرتا اور میں اُن دھار مک کتھاؤں کو من گھڑت خیال کرتا جن میں بھگوان، اوتار دھارن کر کے اپنے بھگت کو سنگٹ سے بچاتا ہے۔ میں خدا کے معنی پھر سے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ تو بس رحیم تھا اور کریم تھا۔ میں سوچتا کہ ایسا خدا میرے کس کام کا! میرے خدا پر لازم ہے کہ وہ خوش خوار، بے درد، بے رحم اور سفاک ہو۔

قارئین، فہم و فراست کی نفسیات ہے! اور یہ نفسیات، پانی کی طرح ہے جسے جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

## باب ۲۷

چراغِ مندرلِ تو میں وہ شاطر

دُہی جو نقشِ پا میں خوں پیکلاں سے (شاطر)

پنجاب کے ساتھ زبان بھی تقسیم ہوئی۔ وہ لوگ جو اردو پڑھنا، اردو لکھنا اور اردو بولنا ہندوئی علامات سمجھتے تھے، اردو دشمن ہو گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، اسے بھی ملک بدر کر دو۔ نئی ہندیب کے علم بردار اردو کی مخالفت اردو میں کرتے۔ کوئی بھلا مانس انہیں یاد دلاتا تو وہ ڈھٹائی سے کہتے، ”اردو مسلمانوں کے ساتھ پاکستان چلی گئی ہے، ہم ہندی بول رہے ہیں۔“

ہریانہ کے آتش صاحب اکیلے آدمی تھے جو اردو کے بارے میں مستند نظریہ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اردو عین ہندوستانی زبان ہے جو اسلامی اور ہندوستانی کچھ کے وصال سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بالکل اتفاقی بات ہے کہ وقت کے حکمرانوں نے اس کے لئے فارسی طرزِ تحریر اپنایا۔ ایسا نہ ہوتا تو آج کوئی ایسی بات نہ کرتا۔ رسم الخط بدلنے سے زبان نہیں بدل جاتی۔ جب تک گرو مکی پتی ایجاد نہ ہوئی تھی، پنجابی، فارسی پتی میں لکھی جاتی تھی۔ سندھی، پوٹھواری پنجابی، اردو.... سب پر اُکرت بھاشا کی شاخیں ہیں۔

کہتے ہیں کہ زبان ہی حلال ہے اور زبان ہی حرام ہے، دُوبی بات تھی۔ اپنی تائید اور دُوسرے کی تردید میں لوگ جیسی باتیں بناتے، انہیں سُن کر حیرت ہوتی۔ کوئی اُن کی بات پر دھیان نہ دیتا تو وہ خود کو ایسے دیکھتے جیسے اپنی بات کو آپ سراہ رہے ہوں۔ کندن بادا یہی باور کروانے کی فکر میں رہتا کہ دنیا کی ہر زبان کی ماں، سنسکرت ہے۔ اسے ہر ملک کی زبان بنادینا چاہیے، اس طرح زبانوں کے جھگڑے ختم ہو جائیں گے، دُنیا ایک ہو جائے گی اور سنسکرت کو اُس کا کھویا ہوا مقام بھی مل جائے گا۔ وہ بیساکھی کے میلے میں سیسل لگایا کرتا تھا، اس بار اُس نے سیسل کا نام پیادو رکھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا، اپنے بال انگریزی وضع کے بنواتا تھا اور اُسی طرز کا لباس۔ وہ دیسی کپڑے پہننے والوں کو گُوارا سمجھتا تھا اور اُن پر طعن کرتا تھا۔ اُس نے گائے کے گھر جتنی بڑی چوٹی رکھ لی اور دیسی، وہ بھی غیر رسمی پہراوار رکھنے لگا۔ وہ سووہ مُنڈل سے تلک لگاتا، دھوتی باندھتا اور ایک ہاتھ میں لائنگ پکرتا۔ حالاں کہ جنسی زندگی جینے کے لئے ختم نہ ضروری ہے، وہ اس میں عیب نہ لگاتا، ”بھگوان سب کو ہندو پیدا کرتا ہے جو آدمی ختم نہ کرتا ہے وہ بھگوان کے کاروبار میں خلل ڈالتا ہے اس لئے ناقابلِ معافی گناہ گار ہے۔“

آداب و سلام کی جگہ ست سری اکال نے لی اور پھر ست سری اکال اور نمستے میں ٹھن گئی۔ کوئی کچھ ہندو کو ست سری اکال بلاتا، وہ نمستے میں جواب دیتا، ہندو، کچھ کو نمستے کرتا تو وہ ست سری اکال کہتا۔ پنجابی، گرو جی پتی سے رُوشناس ہوئی۔ یہ اس طرح کہ گرو جی، گرو انگند دیو جی کی ایجاد تھی، اس رشتے سے مقدس مانی جاتی تھی اور صرف دھرم کے کاروبار میں استعمال ہوتی تھی۔ اب گرو جی میں وہ آدب نقل ہونے لگا جو فارسی رسم الخط میں رقم تھا۔

نیا باجی گرو جی کے بارے میں جو کہتے تھے وہ بالکل غیر رسمی ہے، ”برہمن، سنسکرت کے محافظ بنے بیٹھے تھے نہ کسی دُوسرے کو پڑھنے دیتے تھے اور نہ پڑھاتے تھے۔ وہ گیان کو صرف اپنی جات تک محدود رکھ ہوئے تھے اور گیان ہانسنے کے خلاف اتنی سختی سے کاربند تھے کہ کوئی غیر برہمن، نام سُن لیتا تھا تو اُس کے کانوں میں سیسا ڈال دیتے تھے اور سنسکرت پڑھنے والے کی جیب کٹا دیتے تھے۔ علم و فن کی ترقی، جو انسانی زندگی کی طاقت ہے، مغلوب تھی اور باہمی نفرت عروج پر۔ اُس فرسوہ نظام کی تجدید نو کے لئے گرو جی نے بھاشا کے ادھار پر گرو جی کی ایجاد کی اور اسے ذریعہ مرست بنایا۔ اسے ہمہ صفت اور ہر درجہ عزیز بنانے کے لئے انہوں نے ہر ذات کے بزرگوں کی بانی اکٹھی کی اور اپنی بانی کے ساتھ گرتھ میں لکھی تاکہ گرو جی، سنسکرت کی طرح ایک ذات کی اجارہ داری سے باہر رہے۔ لیکن ہوا دُوبی جو دُنیا چاہتے تھے! گرو جی، جو جاسٹری بن گئی اور پجاریوں کا طرزِ معاش۔“ وہ کہتے تھے کہ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب ہنگوں کے ٹولے آوارہ گھومتے تھے، ہندوؤں اور سکھوں سے دسوندھ (کمائی کا دسواں حصہ) وصول کرتے تھے، جو نہیں دیتا تھا، اُسے لوٹ لیتے تھے۔ اُس دھاندلی سے اُن کا ہنسل زیادہ تکلیف دہ تھا! وہ ہلوں سے پھال نکال کر لے جاتے تھے اور

ہالیوں کو مارتے تھے۔ اُن کا عند تھا کہ میری صاحب (پھال، برچھی کی طرح ہوتا ہے اور برچھی، گڑگو بند سنگھی جی کا ہتھیار تھا جسے احترام سے میری صاحب کہتے ہیں) سے دھڑکی کھودنا، اُس کی بے حرمتی کرنا ہے۔  
پنجاریوں نے سوچا کہ گڑگو سنگھی کا علم عام ہوا تو اُن کے نان و نفقہ کا کیا ہوگا؟ انہوں نے گڑگو سنگھی میں لکھی کتابوں کو ممنوع قرار دیا اور انہیں جلانا شروع کر دیا۔ جب ماسٹر تارا سنگھ نے پنجابی صوبے کی مہم چلائی تو پنجاریوں کا رویہ بدلا جس کا ردِ عمل پنجاب اور ہریانہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

میری موجد بوجھ جس لحاظ سے بدلنا چاہتی تھی اُس سے میل کھاتا ادب ملتا نہ تھا۔ اقبال میری پسند کا شاعر تھا لیکن میرے جذبہ تلاش نے اُسے مسترد کر دیا تھا۔ اُس کا 'شکوہ'، 'بجوابِ شکوہ' اور 'ترانہ ملی'، پڑھ کر تو میں اُس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

"نایا جی روایتوں اور اداروں سے اپنی وجہ سے منحرف تھے۔" انسان اور حیوان آزاد پیدا ہوتے ہیں لیکن انسان اپنی اختراعی صلاحیت کی وجہ سے اپنے پید کردہ حالات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ میرے اسلاف پتھر سے اوزار بناتے تھے، جب کہ میں فولاد سے، وہ پتے اوڑھتے تھے، میں کپڑے پہنتا ہوں۔ میں نے ہر اُس چیز کو ترک کیا کہ جس پر اُن کا انحصار تھا۔ میں اُن کی ہر چیز ساتھ لے پھرتا تو غیر ضروری بوجھ کے نیچے دبا رہتا۔ انسان کے لئے ردِ قبول اور تغیر و تبدل لازم و ملزوم ہیں۔ روایتیں اور ادارے انسانی ضرورت کی پیداوار ہیں، انسانی ضرورت کے ساتھ ان کا بدلنا ضروری ہے جو نہ بدلیں وہ جمود پرستی کا شکار ہیں اور اُسی طرح وہ ذہن، جو ان سے منضبط ہیں۔ دونوں اپنے اپنے انداز میں بیمار ہیں لیکن پُر لطف بات یہ ہے کہ اپنی فرسودگی سے بے خبر ہیں۔"

وہ کہتے تھے، "پہلا پانی جیو ہے جت ہر یا سب کوئے۔ سب سے پہلے پانی میں پرانی پیدا ہوئے اور اُسی سے ساری زندگی کی ابتج ہوئی۔ پھر جمود کا سامنک پر اکریا (ارتقائی طریق عمل) سے بڑھتے، بدلتے دوسری انواع حیات میں بدلے اور بنتے بنتے آدمی بنے۔ گونگے رہنے سے بولنے اور ننگے رہنے سے کپڑے پہننے اور جنگلی سے شہری بننے تک آدمی جس طرح کے الٹ پلٹ حالات سے گزرا ہے اُن کی تفصیل ماہر انسانیات ہی بتا سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آدمی کی ابدیت کا راز تغیر پریری میں ہے نہ سخت گیری میں۔ جن جانداروں میں یہ حیات پرورد صلاحیت نہیں تھی وہ نالود ہو گئے۔ چوں کہ آدمی کو فہم و فراست سے نسبت ہے اس لئے جمود پرستی، فہم و فراست کی نفی ہے۔ خود رو زندگی کے برعکس آدمی اپنی زندگی کا پاسدار آپ ہے۔ آدمی کی اختراع و ایجاد کی لیاقت ہی اس کے دوام کی دلیل ہے۔ اس کے ارتقا میں کسی بیرونی طاقت کو دخل تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا۔"

پنجاب کی سرحد کیا بدلی ہر چیز بدل گئی۔ ہمارے گاؤں کی ادھی سے زیادہ مسلمانوں کی زمین جو دھال کوالات

ہوئی آدہ باقی دوسرے شرنا تھیوں کو، جو کسی کو الاٹ نہ ہوئی وہ خالص لگ گئی۔ شرنا تھیوں میں سے جگدیو سنگھ آدہ بار سنگھ قابل ذکر ہیں۔ جگدیو سنگھ اس لئے کہ وہ کچہری کا بیٹھی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اپنے بارے میں یہ بات کس شان سے بتاتا تھا، ”میں سچ کے سامنے سچ بولنے کا حلف اٹھاتا ہوں لیکن سراسر جھوٹ بولتا ہوں!“

بارا سنگھ اور بہادر سنگھ جھنگ سیال سے آئے تھے۔ وہ کسی سے کوئی بات کرتے تو اسے گالی دے کر بلاتے۔ شروع شروع میں ان کا رویہ بھگروں کا باعث ہوا، آخر بدلتے بدلتے کچھ وہ بدلے آدہ کچھ کاؤں کے لوگ مزے کی بات یہ ہے کہ جو انہیں گالی دے کر نہ بلاتا، وہ اسے جانگلو کہتے۔ وہ جو کچھ تھے، اپنی تہذیب رکھتے تھے، جس کا حنسی پہلو بے شری کی حد تک مضحکہ خیز ہے۔ کسی رات بارا سنگھ گھر سے باہر نکلے پر یاروں کے ساتھ بیٹھا ہوتا اور در تک گھر نہ جاتا تو اس کی بیوی دروازے میں کھڑی ہو کر چلاتی، ”باریا! مارنی ہے تو آجا، ورنہ میں سو جاؤں گی۔“ اس کی بات پر بارا سنگھ کا رد عمل نہایت فحش ہوتا۔ کئی بار وہ اٹھ کر چلا جاتا لیکن جس دن وہ اسے نیند سے جگا دیتا، وہ ایسا ہنگامہ مکر کی کہ اپنی نیند کے ساتھ پڑوسیوں کی نیند خراب کر دیتی۔ ان کی ہر ریت الٹی تھی۔ وہ تہمد باندھتے اور کرتے پہنتے۔ ٹوالا استعمال کرتے اور روٹی، ماندے (روٹی کا پتلا پاسا) کی طرف چھیڑتے۔ ان کے پاس بلیوں کے بدلے چکے تھے جو لٹے رہے ہوئے تھے اس لئے انہیں جھوتے ہوئے دائیں سے بائیں پھراتے تھے۔

ہماری ٹال کے پیچھے ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی تھی، اس میں حکمہ زراعت کا دفتر کھل گیا۔ جہاں سدیروں کے جھڑٹ اٹھکیلیاں کرتے گھومتے تھے وہاں اکھڑ ہقانوں کے جھنڈ ہنہناتے پھرتے۔ زراعت انسپکٹر مران سنگھ خوش خلق اور سادہ طبیعت آدمی تھا، وہ شام کو کاچھے، بین اور کھڑاؤں پہنے دکان پر آ نکلتا، اس کا بیٹا بخشیش سنگھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے وہاں بیٹھا ہوتا جب کہیں کام کرنا ہوتا۔ مران سنگھ اپنے بیٹے کو رائے دیتا، ”جگھے یہاں بیٹھنا ہے تو گیان سنگھ سے سائیکل مرمت کرنے کا ہنر سیکھ لے۔ کتنا اچھا لڑکا ہے! پڑھتا ہے۔ لکھتا ہے اور گاؤں سے پیدل آتا جاتا ہے۔“

”بابو جی! میں ٹریڈر سیپیر کرنا سیکھوں گا۔“ وہ اٹھ کر کہتا جیسے سائیکل مرمت کرنا اس کے شایان شان نہ تھا۔

”یو سی، مانی سن از اسے فول! آرٹ از آرٹ! تم دیکھو، میرا لڑکا بے وقوف ہے! ہنر کوئی بھی ہو ہنر ہے۔“ اپنے بیٹے کے جواب سے ناخوش ہو کر مران سنگھ جگھے سے کہتا۔ اس کی عادت تھی کہ جو انگریزی کا فقرہ بولتا تھا اس کا اردو میں ترجمہ ضرور کرتا تھا۔

گرو اس سنگھ اور ٹھینورام حکمہ زراعت میں عارضی میلدار تھے۔ گرو اس سنگھ کٹوار تھا اور ٹھینورام شادی شدہ لیکن وہ گونا مانہ لایا تھا۔ مزاج ٹھنڈا رکھنے کے لئے وہ دونوں دھنیا گھوٹ کر پیتے۔ اجیت سنگھ ان کا ٹھنڈا اڑاتا،



”تم دھنیا نہ پیا کرو! ایسا نہ ہو کہ وقت پڑے اور تم ٹھنڈے کے ٹھنڈے رہو۔“  
مستقل ملازمت کے لئے گرداس سنگھ اور ٹھینورام کی انٹرویو ہوئی، گرداس سنگھ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے رہ گیا۔ وہ جہاں جائے کہ رہے، قسم کا خدمت گار تھا اور سرائی سنگھ کا چھیتا۔ انٹرویو کے وقت سرائی سنگھ چھٹی پر تھا۔ اسے بتا چلا تو اس نے انٹرویو رد کر دیا۔ انٹرویو دوبارہ ہوا، گرداس سنگھ نہ کہ صرف یہ کہ مستقل ہوا بلکہ اس کا تقدم برقرار رکھا گیا۔

دفترِ زراعت کے نوکر خانے کا ایک کمرہ راجو اور مارو کے پاس تھا، جو باپ اور بیٹا تھے۔ ایک دن راجو کسی بردہ فروش سے اپنے بیٹے کی عمر کی مسلمانی خرید لایا۔ راجو اپنے بیٹے مارو کو مجبور کرتا کہ وہ اس لڑکی کو ماں کہہ کر ملائے لیکن مارو کو یہ بات ناپسند تھی۔ پہلے دونوں باپ بیٹے جیسے رہتے تھے، خوش رہتے تھے، اب آپس میں لڑنے لگے۔ راجو اپنے بیٹے سے زیادہ محنت کرنے لگا اور برت سلائی کے دو گھان لگانے لگا۔ ایک رات وہ دوسرا گھان بیچ کر آیا تو ماں اور بیٹے کو غائب پایا۔

چاچا کریم کی جگہ گرام امردو بیچنے لگا تھا۔ اس کی آواز اس کی صورت ہی کی طرح بھدی تھی۔ اسے دیکھ کر گھن ہوتی تھی لیکن اس کے امردو چاچا کریم سے زیادہ بکتے تھے، لگتا تھا کہ آزادی کے بعد لوگوں کے پاس دھن زیادہ گیا ہے اور ساتھ ہی خرچے کی صلاحیت۔

مولے کی مال پر سورج بھان اُبسا تھا۔ مولا شام کو چہرہ بنانا، نہانا اور پھیل لگاتا تھا۔ میں کئی بار گھر جاتے ہوئے جان بوجھ کر اس کے پاس سے گزرتا اور اسے سلام کرتا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلاتا، پھیل کی شیشی کا ڈاٹ نکال کر میرے ہاتھ کی پیٹھ پر رگڑتا اور مجھے ہکا دیتا۔ سورج بھان گورا چٹا تھا لیکن تھا سُر کی طرح غلیظ۔ اس کا بدن سیل سے چنکبار رہتا تھا جسے دیکھ کر متلی ہوتی تھی جس دن وہ نہاتا، لگتا کہ اس نے کینچی اُٹاری ہے۔ وہ اپنی گندی عادت کو قوی بنانا قرار دیتا اور اس کی تائید میں یشلوک سنانا،

پنج آشنانم مہاں گیانم، نت ناؤن دلہری

چھیں مہنیں اسی سال پچھوں آدمی

دُکھ کرنا عالموں فاضلوں کا جتن ہے۔ ہر روز نہانے والے خبیث ہیں۔ چھ ماہ میں

ایک بار نہانے والے اسی ہیں اور سال کے بعد نہانے والے چست چالاک،

شام کا وقت تھا۔ میں مال پر کبیری دھوئے باریک کونسلے، میں سے کونسلے رول کر الگ ڈھیر لگا رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی تیز تیز اور اونچی اونچی پاؤں میں پوش پوش، بچاؤ بچاؤ کی دہائی سُنی۔ میں کام چھوڑ کر سڑک کی جانب بھاگا۔ میں ادھر ہی تھا کہ ایک تانگہ میرے سامنے سے چھپاک سے گزر گیا۔ رکھا اور دیر ماتا تانگے کی پھیپھٹ

کو چپکے ہوئے تھے اور مدد کے لئے پکار رہے تھے۔ میں تانگے کے پیچھے بھاگا۔ تانگہ لپٹا کے چوہ میں پہنچا اور ناہوار سڑک پر اُچھلنے لگا، اس پہلے پر اور کبھی اس پہلے پر۔ سڑک کی نشاندہی کے لئے کوتاہی کے خالی درم کاڑے ہوئے تھے، تانگہ ایک درم سے ٹکرایا اور الٹ گیا۔ رکھا اور دیر یا اچھل کر دوڑ کرے، دیر یا ماکو خراش تک نہ لائی لیکن رکھے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔

راجہ احمد سید کے اُصل میں بڑے سچیلے اور بانگے گھوڑے تھے۔ رنجی باری میں اس کا گھوڑوں کا فام تھا جہاں سے وہ قلوں کو لاتا اور انہیں کھڑی کھیتی اور کھڑی نہاری پر پالتا۔ وہ انہیں بدیسی نام دیتا جو دور ایدش کی طرح حسین لگتے۔ راجہ گھڑا رکھا اور غضب کا شہسوار تھا۔ اس کے گھوڑوں کی کاٹھیوں میں قبور بنے ہوئے تھے جن میں وہ بھرے پستول رکھتا تھا۔ اس کی نازک مزاجی اور مرکز آرائی کے قصے مشہور تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر باگھ کا پیچھا کرتا اور اسے اکیلا مارتا۔ اس کے انگ رکشک (بادی گارڈ) ہم رکاب رہتے تھے لیکن کسی کو شکار پر وار کرنے کا حکم نہ تھا۔ وہ سویرے سویرے گھوڑے کو بگ ٹٹ دوڑا ہا تھا کہ اس کی باگ ٹوٹ گئی اور گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ وہ لپک کر گھوڑے کی گردن کو لپٹا، پلٹی مار کر نیچے لٹکا اور اپنی ٹانگوں کو فٹانے کی طرح اس کی اگلی ٹانگوں میں جڑ دیا۔ گھوڑا یوں رکھا جیسے سامنے دیوار اُٹ گئی ہو۔ اس کے سائیں، گھوڑوں کو کئی طرح سے سدھاتے تھے۔ وہ انہیں کبھی کھڑکھڑایاں میں جوتے اور کبھی کاوے دیتے۔ دونوں حالتوں میں سدھانے والوں کی ترنگ دیدنی ہوتی۔ کھڑکھڑایاں پر توازن برقرار رکھنے کے لئے وہ ایسے ہلتے جیسے لہروں پر رکھتے دریا۔ وہ انہیں چوگان پھراتے ہوئے ان کی ایال پکر کر بھاگتے بھاگتے اُچھلے، سوار ہوتے، اترتے اور اترتے ہی ان کے ساتھ بھاگنے لگتے۔ راجہ کی یہ بات کہات تھی، ”راگ کا اُصلی مزہ وہ لیتا ہے جو راگ کا تہ ہے اور باگ کا وہ جو باگ اُٹھاتا ہے۔“

اُن گھوڑوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ناپ کے پورے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نہیں جانتا ہوں، ہاں اُن گھوڑوں کے جڑے چھوٹے، نتھنے پیارے، چہرے پتے، گلے لمبے، بیسے چوڑے، نالیاں کم گہری، پیٹ گول اور ٹانگیں مضبوط مگر لچکدار تھیں جیسے پنکھ ہوں۔ اُن کی نازک طبیعت اور گرم رفتاری قابلِ ستائش تھی وہ اُڑتے تو پچھلی ٹانگوں پر العت ہو جاتے اور بھاگتے تو زمین سے کچھ اوپر اُڑتے دکھائی دیتے۔ اُن کی ٹاپوں کی تیزی حد سے زیادہ کسے ہوئے ڈھولوں کی تھا پوں جیسی تھی۔ وہ سواری کی حالت میں ایسے ٹھہرتے جیسے انگاروں پر کھڑے ہوں۔ جب انہیں لگام سے پکڑ کر چلایا جاتا، اُن کی چال میں بانگے جو ان کی شوخی اور سرکشی ہوتی جسے خوش سیرتی اور خوش خرابی میں بدلنے کے لئے احمد سید، گھوڑوں کو دوسرے دہانے کی لگام اور زیر بند پہناتا، تنگ اور زیر کمری ایسے کستا جیسے کوئی حسینہ اپنی کمر کو چینگ (کس کرنا ڈا باندھنے سے بڑا چوہا نشان) سے بچانے کے لئے ازار بند باندھنے میں احتیاط کرتی ہے۔ گھوڑے میٹھا بویا چلتے ہوتے تو سواروں کے اُٹھنے بیٹھنے کا منظر دیدنی ہوتا۔

علاقے میں کئی اور لوگوں کے پاس گھوڑے تھے جو اُن گھوڑوں کے مقابلے میں مار لگتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب راجہ کے گھوڑے اپنی ٹھسک گنوانے لگتے ہیں، وہ انہیں مردادیتا ہے۔ بھائیاجی انہیں دیکھ کر کہتے، ”باز ہیں، شیر باز!“ اُن سے اچھے گھوڑے میں نے ایک بار نہنگوں کے پاس دیکھے تھے، جو ہمارے گاؤں کے مشرق کے باغوں میں اترے تھے۔ اُن گھوڑوں کا سلسلہ ”سب نیلا“ (گرو گوبند سنگھ کا گھوڑا، جس کی وفاداری، بہادری اور خوب صورتی کے منظوم قصے پنجابی لوک گیتوں کی ابرو ہیں) سے ملاتے تھے۔ وہ انہیں پرتشو ناموں سے جلاتے تھے جیسے رن جیت سنگھ صاحب، سوا لاکھ سنگھ صاحب..... وہ انہیں شاہ زادوں کی طرح پالتے تھے اور آزاد احترام اُن پر سوار نہ ہوتے تھے۔

پرنندوں کے شکار کے لئے راجہ، باز پالتا تھا۔ جب وہ شکار کے لئے نکلتا، باز آموز چمڑے کا دستانہ چڑھائے باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہوتا۔ باز نوں خوار آنکھوں سے اپنے اطراف دیکھتا، جس سے اُس کی اندرونی بے قراری کا پتا چلتا۔ باز آموز کسی کو زیادہ پاس آنے سے روکتا اور شکاریوں کی بھیڑ سے تھوڑا الگ رہتا۔ وہ جس آواز سے ہاتھ کو حرکت دے کر باز، شکار پر چھوڑتا، وہ دل گرمانے اور اُکسانے والا منظر تھا لیکن باز اُس کی حرکت سے بے نیاز لگتا۔ اُس کا اپنا انداز اُس کا کمال تھا جسے کسی کی حمایت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہاتھ پر بینجوں کی گرفت ڈھیلی کرتا، شانے اُچکاتا، اُچھٹا، پر پھیلاتا اور بے تکلف ٹنک ردی سے گڑھ ہوا میں جارہتا جو اُس کے ورثے سے اُس کی کشور مُسلمہ ہے۔ اگر شکار بچ کر کسی کہیں گاہ میں چھپ جاتا، وہ اُس پر منڈلاتا، اپنی بے جینی میں چیخ مٹا اور نکالتا، کبھی اونچا کبھی نیچا اُرتا جیسے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی میں سرگرم ہو۔ باز آموز اُسے چمڑے کی پیریا سے لچاتا اور لُٹھاتا، اُس کی ناکامی میں اُس کی اُس بندھاتا۔ آخر کھوجی گئے چھوڑے جاتے، وہ شکار کو کہیں گاہ سے دھونڈ نکالتے۔ اس کے اڑان بھرتے ہی باز اُس پر انتقام جو یا نہ تیزی سے جھپٹتا، پنچوں میں دبوچتا، زمین پکڑتا، فاتحانہ انداز میں اپنے اطراف دیکھتا اور متمکن لگتا۔ راجہ کے ہر باز کی ٹانگ پر سونے کی شناختی تختی باندھی ہوتی تھی۔ بازوں کی پرورش گھوڑوں ہی کی طرح خیال آفریں ہے۔ وہ کُریز میں آتے تھے تو باز آموز انہیں گھاس کے ٹھنڈے جھوپڑوں میں رکھتے تھے اور زندہ بھیگی چڑیاں کھانے کو دیتے تھے۔

جب راجہ احمد سعید پاکستان گیا، اُس نے اپنا سارا اصل بل ہندوستان میں بانٹ دیا۔ چند گھوڑیاں اور گھوڑے سیٹھ پیارے لال اور منشی رام کے پتلے پڑے۔ اُن کی بھاری بھر کم تو نندوں اور لوٹوں لٹکے چہروں سے اُن بڑی رفتاروں کو کیا نسبت ہو سکتی تھی! وہ بددق انہیں تانگوں میں جو سننے لگے۔ ویرام، منشی رام کا کوچہ ان تھا جس کے تانگے میں غریب جتا ہوا تھا۔ وہ حادثیوں ہوا کہ غریب کا دہانہ ٹوٹ گیا اور جدر اُس کا منہ تھا، وہ ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔

سیٹھوں کے خاندان میں صرف رویش ہی چست اور چھریسے بدن کا تھا، باقی سب، جیسا کہ ان کے بارے میں مشہور تھا، گندے بروزے کے ڈرم تھے۔ رویش نے اپنی سواری کے لئے عرشی مخصوص کر رکھی تھی۔ وہ اُس کی دیکھ بھال خود کرتا تھا اور اس سے ردائی لگاؤ رکھتا تھا۔ اُس کی مارش کرتے کرتے اور جسم سہلاتے سہلاتے، وہ اُسے ایسے چوم لیتا جیسے وہ اُس کی عجوبہ ہو۔ اُس کی حرکتوں اور باتوں پر وہ اپنے طریقے سے متاثر ہوتی، اُس وقت رویش بالکل جذباتی ہو جاتا، ”ٹھیک ہے پیاری! میں جانتا ہوں! تم ابھی لڑکی ہو!“ جب عرشی سواری کے لئے نکلتی، وہ گھڑی دیدنی ہوتی۔ ادھر وہ رکاب پر بوجھ محسوس کرتی اور ادھر چوڑی بھرتی اور اگلے لمحے تان کی طرح سنائی تو پڑتی لیکن دکھائی نہ دیتی۔ رویش اُس کی تعریف یوں کرتا، ”عرشی بھاگتی ہے تو ہوا پر سے قدم اٹھاتی ہے۔“

رویش کو عرشی پر سوار ہونا ہوتا تو اُس کا نوکر لال، عرشی کی لگام پکڑتا۔ عرشی کی بے قراری رویش کو نقص دیتی اور وہ جس چوکسی سے رکاب پر پاؤں رکھتا، کاٹھی کا سہارا لیتا، اُپھلتا، کاٹھی پر بیٹھتا وہ دھند کرب کا جلا منظر تھا۔ وہ اکیلا ہوتا تو اُس کے سوار ہونے کا طریقہ ایک جھٹک میں سمٹ آتا۔ وہ ہرنے کو پکڑ کر کوندے کی طرح لپکتا اور تقریباً بھاگتی ہوئی عرشی پر سوار ہوتا۔ وہ اُسے میلوں پوٹیا دوڑاتا اور عرشی تھی کہ تازہ دم لگتی۔ اُسے عرشی پر چڑھے چڑھے بات کرنی ہوتی، وہ کبھی اُس کی لگام کھینچتا کبھی ڈھیلی چھوڑتا اور اُسے رام کرنے کے لئے اُس کی گزوں تھپکتا اور اُسے پچکاڑتا۔ لال، عرشی پر کاٹھی ڈال کر لایا۔ رویش کو گھر میں کوئی کام نہ کھل آیا اور اُس نے اُسے واپس کر دیا۔ اُس کے دل میں کیا آئی کہ وہ پہاڑیے کی مدد سے عرشی پر سوار ہو گیا۔ پہاڑیے کے لگام چھوڑتے ہی عرشی، اُسے لے اُڑی۔ وہ لگام کھینچنے سے عرشی پچھڑ دی چلے، لگام ڈھیلی چھوڑے تو وہ تارے بھرے۔ پیچھے سے بس آ رہی تھی، وہ اچانک مڑی، اور بس سے ٹکرائی۔ اُس عین وقت میں لال بس کے نیچے اُتر گیا اور عرشی کی انگوٹھوں کی دونوں ٹھیکان ٹوٹ گئیں۔

اور جیسا کہ کہاوت ہے، سنگڑا گھوڑا اور ڈھیللا.... کس کام کا! عرشی کو گولی مار دی گئی۔

رکھا، وریام کا بڑا بھائی تھا۔ وریام نے اُسے اٹھا کر گھر لے جانا چاہا لیکن اُس نے روک دیا۔ وریام نے اصرار کیا تو اُس نے اُسے گالیوں پر دھریا۔ جس کسی نے وریام کی طرف داری میں کچھ کہا، وہ اُس کے بھی گلے پڑ گیا اور اپنی انگوٹھوں سے سب کو حیران کر دیا۔ جب یس گھر روانہ ہوا، وہ وہیں پڑا کراہ رہا تھا۔

رکھا مجرد تھا اور اُدھے میں ایک جامن کے نیچے رہتا تھا۔ وہ دھیروں میں سے ردی کاغذ اور جیتھڑے اکٹھے کرتا اور انہیں بیچ کر توچھ مکتا اُسی سے اپنا پیٹ پالتا۔ یس اُسے پہلے سے جانتا تھا اُس نے اُس کی دیانتداری روایت تھی۔ اگر عمل کے معنی ضبط لئے جائیں تو اُس پر تابیاجی کی بات صادق آتی ہے، ”ادھی کا عمل اُس کا بچی حوصلہ ہوتا ہے۔“

اُسے ڈھیروں میں سے گھربو سامان جیسے برتن، چمچ، کھریا.... وغیرہ مل جاتا تو وہ اُس کے مالک کو ڈھونڈنے کا پورا عہق کرتا۔ اُسے سگریٹ کی ڈبیا میں سے سوکانوٹ ملا جسے اُس نے پٹنگل بارے (جہل کوڑھ کے مریض) رکھے جاتے ہیں، اُسے فڈ میں دے دیا۔ کوئی اُسے بھکاری جان کر خیرات دے بیٹھا تو وہ اُس کی ایسی خبر لینا کہ بس!

دوسرے دن میں سکول گیا تو اُسے دفترِ زراعت کے باہر برآمدے میں پڑا ہوا دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہاں رینگ کر پہنچا تھا۔ بھورام کا اڈے میں ڈھابا تھا جو رکھے کے خاندان ہی سے تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کشمیری لال کے ہاتھ رکھے کو کھانا بھیجا، جسے اُس نے اس شرط پر کھایا کہ وہ اُدھار کھا رہا ہے۔ اُس نے اپنی ٹانگ آپ ہی سیدھی کر کے اُس کے گرد بانس کی پچڑیں باندھ لیں جو میں نے اُسے بنا کر دیں۔ اُس نے میرا ہاتھ جوم کر احسان مندی سے کہا، ”تس یاد رکھوں گا! کبھی نہیں بھلاؤں گا!“

اُس کے ساتھ میں نے ایسا کچھ نہ کیا تھا، جسے اُس کے یاد رکھنے یا بھلانے سے مجھے فرق پڑتا تھا! لیکن میں اُس کے جذبے کی نفاست پر حیران ہوا کیوں کہ وہاں ایسی بات کرنے کی ریت نہ تھی۔ اُسے وہاں اٹھانے بٹھانے والا کون تھا! اُس نے وہیں کچے فرش پر گرٹھا کھودا اور اُسے ضروری لوازمات کے لئے برتنے لگا۔ اُس کا لباس چار انگلی چوڑا تنیا تھا جسے وہ کمر کے گرد بندھی رسی سے ستروں کے اوپر باندھ رکھتا تھا۔ تینے میں سے خسیصے جھانکتے رہتے جیسے وہ اُس کے نگہبان ہوں اور نکتہ چیں بھی۔ گوٹوں (ایلوں) کی آگ کے سامنے وہ ٹاٹوں اور جیتھڑوں میں پیٹا ہوا ناہموار گھڑی کی طرح پڑا اپنی کھال میں مست رہتا۔ وہ کبھی نہیں نہاتا تھا۔ گندی دھرتی پر پڑی گندگی، گندگی نہیں لگتی، دونوں ایک دوسرے کا حصہ لگتی ہیں ایسے ہی رکھے کے اطراف گندگی تھی، جس میں وہ مکھی کی طرح جی رہا تھا، صاف ستھرا، صحت مند، مسرور اور مطمئن۔ کیا کوئی یقین کرے گا! اُس کی اندھیری اور گھٹاؤنی زندگی میں ایک ناقابلِ فہم کشش تھی۔ ماہ بھر میں وہ لنگراتا ہوا چلنے لگا اور کبھی بھار دکان پر آکر بیٹھنے لگا۔ اُسے بیٹھنے کے لئے کچھ دیا جاتا پھر بھی وہ زمین پر ہی بیٹھتا اور کہتا، ”میں دھرتی کی دُوری برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ شاید ہی ایسی بات کرتا جس میں کسی کی گراوٹ ہو۔ کوئی اُس کے سامنے غیبت کرتا، وہ اُسے پھسکارتا، ”تم کیسے آدمی ہو! اپنے دشمن کا گُوہ کھاتے ہو!“ اُس کے خلاف روایتِ نویہ پر تیں اتنا حیران نہ تھا جتنا اس بات پر کہ اُس سے سوج بھان کی طرح بدبو نہیں آتی تھی۔ مال پر کوئی دوسرا نہ ہوتا اور اجیت سنگھ کو کہیں جانا ہوتا، وہ مال اُس کے پیرو کر کے چلا جاتا، کبھی سوئی بھر کا نقصان نہ ہوا۔ مال کے برابر ہوشیار پُور اور جاندھر جانے والی بیل گاڑیوں کا پڑاؤ تھا۔ گاڑی بان دُور دراز سے گڈے لادے آتے، وہاں رکتے ہنڈا بھانڈا تلاش کرنے کے لئے شہر میں جاتے۔ مہترانیاں گوبر اکتھا کرتی ہویں مال کاٹ لیتیں اس پر بیلوں کو آرام سے نہ بیٹھنے دیتیں۔ اُن بلاؤں کو دُور رکھنے کے لئے گاڑی بان باری باری بازار جاتے اور اس احتیاط میں سفر کا آغاز دیر سے کرتے۔ رکھے نے گاڑی بانوں کا اعتماد جیت لیا۔ وہ اُس کی بنگرانی میں گاڑیاں رکھ کر بازار چلے جاتے اور یوں وقت

بچا لیتے۔ اُسے بیساکھی لگ گئی تھی۔ اُس نے پُرانا کام ترک کر دیا اور گوبر اکٹھا کرنے لگا۔ چوں کہ وہ وہیں رہتا تھا اُس کا کوئی خریعت نہ تھا۔ سادھو رام کے باغیچے کی شمالی حد کو چھوٹا ہوا قد آدم گہرا اور کی قد آدم لمبا گرٹھا تھا، رکھا اُسے گوبر سے بھرنے لگا۔ چند ہینوں میں گڑھے کا تلا، خابہ کے پیٹ کی طرح ابھرا اور باہر دکھائی دینے لگا۔

اُس سال ہماری کھیتی اچھی نہ ہوئی جس کا سبب کھاد کی کمی سمجھی گئی۔ رکھے کا ڈھیر خالص گوبر تھا جسے بھایا جی نے پندرہ روپیہ فی گاڑی کے لحاظ سے خرید لیا۔ درشن رام، بھایا جی کا پُرانا بھارے دار تھا، اُس نے چار روپے فی گاڑی بھارا مانگا جسے انہوں نے ترنت مان لیا۔ درشن رام حیران ہوا اور اپنی خوشی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا، ”چاچا جی، آج تو بڑے ہریان ہیں آپ!“

”ہم نامہریان کب تھے؟“ بھایا جی نے اُسی لمحے میں کہا۔

اُس مہربانی کا مطلب درشن رام کی سمجھ میں تب صاف طور پر آیا جب پہلا گڈا بھرا گیا۔ گڈا برینڈیا جوڑنے پر ہلا۔ اُس نے داویلا کیا لیکن رکھا چپ چاپ دیکھتا رہا بلکہ مشورہ دیا، ”سردار جی، سانگھی خالی ہے کچھ گوبر سے بھر کر وہاں رکھ دیجئے!“

اُس طرح حد سے زیادہ لادنے کے باوجود تیس گڈے بھرے گئے۔ بھایا جی رکھے کا حساب کرنے لگے تو اُس نے لیسو رام کو بلا لیا۔ بھایا جی نے انگلیوں کو ٹھوک لگا لگا کر جیسے روپیہ گنا، لیسو رام کو دیا اور پھر ہم بھائیوں کو دیکھا وہ اُن کی خطرناک تنگ دلی، گھناؤنی تنگ خیالی اور سخت تنگ نظری کا مظاہرہ تھا۔ ”بی جی اُس کا کھٹھ کھٹا تھا! حکم جاری ہو گیا، گوبر اکٹھا کیا کرو!“ وہ حقیر حکم سب کے لئے ایک سا تھا، سب کو برا لگا لیکن حکم عدولی کا بدلہ ہر کسی کو معلوم تھا۔ کسی کو چوں و چرا کا توصل نہ ہوا اور نہ کوئی گڈن ڈالے کھڑا رہا۔ بھایا جی کے وہاں سے جاتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی ہانگے لگا۔ اُس سے کیا ہوتا؟ اُن کا کہا پھر پیر لکیر تھا۔ گوبر جمع ہونا شروع ہوا لیکن اُس کی مقدار بھایا جی کی امید سے کم تھی۔ اُن کے حکم کی اُمرور کھنے کے لئے میرے بھائی مجھے ہی کام میں لاتے اور خود اُس ذیل کام سے دور رہتے۔ وہ میری ہی طرح غم گرفتہ ہوگا، جس نے یہ کہا تھا، ”سگ باش، برادرِ خوردِ مباحش، کسی کا چھوٹا بھائی بننے سے کتا بننا بہتر ہے!“

میرے گوبر اکٹھا کرنے کی بات میرے سکول تک پہنچ گئی اور پھر بات میں سے بات نکلتے لگی۔ کوئی مجھے گوبر گنیش کہتا اور کوئی مہتر کی اولاد۔ میں کہاں تک جھیلتا؟ کب تک روندنا جاتا؟ جیونٹی بھی پلٹ کر کاٹ لیتی ہے۔ میں نے سوہن لال کو اُس کی زبان درازی کا مزہ چکھنا ناچا ہا لیکن اُس نے اُنسا مجھے چکھا دیا۔ میں تازہ زخم کی طرح بہتا ہوا مثال کے اندر داخل ہو رہا تھا کہ بھایا جی نے مجھے دُور سے دیکھا اور بلایا۔ وہ سادھو رام کے باغیچے کے پچھوڑے میں تیروں کی پھڑی لگاتے لگاتے رُک گئے تھے اور ایک پس کی طرف اشارہ کر رہے تھے، جو دم اٹھائے، چوتھیں پھینچ کر

گوہر کے آخری ذرے خارج کر رہا تھا۔ اُن کا مطلب جان کر بھی میں انجان ہو گیا۔ وہ میری دیدہ دلیری پر پھر گئے اور نکالیاں بکتے ہوئے میری جانب دوڑے، دوڑتے دوڑتے پیچھے مڑے، بالوں میں سے ڈنڈا کھینچ لائے اور ہاتھ اٹھائے مجھ پر آئے۔ میرا انجام قریب آ رہا تھا لیکن میرے مجروح جذبات کا ہٹیلپن میرے قریب تر تھا۔ کیڑے پر پاؤں پڑنے سے وہ دوبارہ روندے جانے کے ڈر سے ٹسکڑ جاتا ہے یا گنڈلی مار لیتا ہے، میں پہلے ہی دیسا ہو گیا۔ میری ہوشیاری کسی کام نہ آئی کیوں کہ میں کیڑا نہ تھا اور میرے آذیت زدہ کارویدہ ناگاہ نہ تھا، سوچا سمجھا تھا۔ جہاں ڈنڈا پڑتا وہاں مجھ کو جبرے کی طرح نوچ لیتا۔ مارکی تیزی اور غضب ناکی نے مجھے سر نہ اٹھانے دیا۔

بھائیاجی اپنے غصے میں اُس راکشش کی طرح لگتے ہوں گے جس کے بارے میں راوی کہتا ہے کہ وہ دانت نکالے اور زبان لٹکائے پتوں کا خون سُرتا ہے۔ میں اُن کی جنون گرفتہ حرکات کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہوں، کیوں کہ آذیت کی شدت نے مجھے سُن کر دیا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں کی بارش میں ڈوب کر اندھی ہو رہی تھیں اور کانوں میں چیخ مٹا گالیوں کا سیسہ بگھل گیا تھا۔ میں نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ سُن سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی جانب سے مجھے مار کر چھوڑ دیا۔ میری سخت جانی! میں مرتے مرتے زندہ ہو گیا۔ میں نے اپنے کچلے ہوئے وجود کو دیکھا نیلوں پر اڑے رتر چھ نیل پڑے ہوئے تھے جیسے خوں خوار سانپ! پس میں پلٹے ہوئے ہوں۔ میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ ظاہری چوٹ سے گنجھی چوٹ زیادہ تکلیف دہ تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ہر شے چکر کی طرح گھوم رہی ہے۔ میں، ڈی، اے۔ وی ہائی سکول کے پاس ڈر کر چیخا اور بھاگنے کی کوشش میں گر پڑا۔ میری دھندلائی ہوئی نظر نے دیکھا تھا کہ ایک درخت سیدھا مجھ پر گر رہا ہے۔

میرے بھائیاجی اُس بوجھ کی طرح تھے جسے میں نہ اتار کر پھینک سکتا تھا، اور نہ وہ مجھے چل کر میرے تختاب سے مجھے نجات دلاتا تھا۔

بُزدلی کو آزار پرستی اور بہادری کو خود رانی سے نسبت ہے اس لئے بُزدل اپنی کُلفت اور بہادری اپنی جُرأت میں خوش ہوتا ہے۔ میں بہادری ہوتا تو میری آرزو دگی میرے دشمنوں کی زندگی ہوتی اور میری ہلاکت اُن کی قسمت۔

پھر بھی بہادری جتنا سوچتا ہے حقیقتاً اتنا کر نہیں پاتا ہے، میں تو پیدائشی بُزدل تھا! میرے ہمدرد مجھ سے کیا امید کر سکتے ہیں؟ میں گوہر اٹھا تا رہا، اپنے ہم عصروں کی ملامت کا نشانہ بنتا رہا، اپنی حالت پر روتا رہا اور خود سے نفرت کرتا رہا اور خود نفرتی، زندگی کی وہ بری فطرت ہے جو اعتبار نشوونما کو جڑ سے مار سکتی ہے۔

میرے بھائیاجی بے مثال گھاگ اور چالاک تھے۔ جس دن وہ ٹال پر نہ ہوتے اُس کے دوسرے دن ڈھیر کی پڑتال کرتے، میری دیانت داری پر شک گزرتا تو کچھ کہے سے بغیر ڈنڈا اٹھا لاتے۔ وہ مار دھاڑا اور گالی گلوچ

میں ایسے بے لگام اور سنگ دل تھے کہ انسان و حیوان میں تمیز نہ کرتے تھے۔

پیشے کے لحاظ سے رکھا پنج سہی، بظاہر پنج سہی، اُس کا چلن اونچا اور اُجلا تھا۔ میں اُس کا پیشہ در قریب تھا لیکن وہ مجھ سے بیزار نہ رکھتا تھا۔ اُس کی دیانت داری میں جیسی سادگی تھی اُس کا بناؤ سنگار کیا جائے تو وہ بد صورت لگے۔ مجھے رنجیدہ پا کر وہ مجھ سے کہتا، ”گو بر اکٹھا کرنا برا کام نہیں ہے! دھوکا برا ہے! فریب برا ہے! چوری بُری ہے! بدخواہی بُری ہے! محنت کسی بھی قسم کی ہو! اونچی اور سادگی ہوتی ہے اور بالآخر دھن ہوتی ہے۔ آدمی کی اونچ پنچ اس کے پیشے کے برعکس کُرم، لکُرم سے ہے۔“

تایاجی بھی یہی کہتے تھے لیکن الگ طریقے سے، ”تہذیب و تمدن کے بانی بڑھی، موچی، جولاہے، معمار اور لوہار میں اور حقیقت میں یہی پانچ کارکن انسانی ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ آداب بات ہے کہ تاریخ نگار ان کا ذکر نہیں کرتے اور دھاری ان کے ساکھ نہیں گاتے۔“

میں ان کی بات سن کر مسرور ہو جاتا لیکن جوں ہی ایسے لوگوں کی ممابجی اور معاشی حالت دیکھتا، دل پکڑ پکڑا۔ رکھے اور تایاجی کی فراست میں وہ اعلیٰ سہی، روایت کے لحاظ سے وہ گردوں پڑوں کے نطفے تھے۔ میں اُصول کی حقیقت پر غور کرتا، مجھے لگتا اُصول ان لوگوں نے بنائے تھے، جو اپنی ذلت کو ریاکارانہ انداز سے عزت ثابت کرنا چاہتے تھے اور اپنی ہٹ دھرمی سے ایسا کر بھی گئے۔ اُن سب کے سردار برہم چاریوں اور برہم گماریوں کی ریت چلانے والے ہیں۔ اُن کی تائید کردہ ریت ساری دنیا اپنائیتی تو انسان کا بیج ہی گنوا دیتی۔

اس بار میں نے پھر اُصول بنائے لیکن میرا جذبہ اُصول دانوں سے الگ تھا۔ میں اپنے عمل کا کمال دیکھنا چاہتا تھا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ انسان بنیادی طور پر تن آسان ہے، دشوار پسند ہوتا تو ہر کوئی حاسبِ کمال ہوتا۔ یہ انسان کی سہل پسندی ہی کی لعنت ہے کہ انسان اپنی بدبو سے بدبو اس ہے اس لئے دوسرے کی خوشبو سے بے بہرہ ہے۔ میرے اُصول میری تقویت نہ بن سکے۔ میں اُصولوں اور اُصول دانوں سے نفرت کرنے لگا، کرتا ہوں آدہ کرتا ہوں گایں ایسا نہیں کرتا ہوں تو مجھے اپنی سچائی پر شک گزرتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو میری زندگی کی تاریکی میں میری روشنی رہی ہے، میرے اس چلن نے میرے گرد وہ کھرنڈ نہ بننے دیا جو پیپ میں گلے سرٹے پٹھوں کا انجام ہوتا ہے۔

اس باب کی آخری سطور لکھتے ہوئے میں، رکھا رام کو نرم و نازک جذبات سے یاد کر رہا ہوں۔ یہ جذبات اُس کے خیالوں کی تردید کی مغفرت کے طور پر نہیں اُس کے اُس قرض کی وجہ سے ہیں جسے میں اُس کی زندگی میں چکا کر سکا۔ آپ حضرات میرے انوکھے اعتراف پر حیران ہوں گے۔ بے شک! آپ کو حیران ہونا چاہیے! میری کہانی وہ انوکھی کہانی ہے جس کی بیش قیاسی ناممکن ہے۔ میں اپنے جانے پہچانے لوگوں کی نظر پر کرا کر گوبر اٹھاتا، جس دن ایسا نہ کر سکتا، رکھا گوبر کے ایک دو ٹوکے میرے ڈھیر پر ضرور پھینکتا۔ اُس کے عمل کے پیچھے جو جذبہ کار فرما تھا اُس کی سچائی وہی جانتا ہو گا!



میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، کیا وہ میرے انجام سے ڈر کر میرے ساتھ ہمدردی جتنا تھا؟ یا اپنے وعدے کا احترام کرتا تھا جو اُس نے مجھ سے پچھیں لے کر کیا تھا۔

## باب ۲۸

کانٹوں کے ساتھ ساتھ ہیں چھالے بھی ہم سفر  
دشتِ جنوں شوق میں تنہا نہیں ہوں میں (شاہ)

میری زندگی کہیں فکر و کردار ہے اور کہیں سماجی پھلاؤں کی یلغار ہے، کبھی آزادی کون و مکان ہے اور کبھی قید ناموس جہاں ہے، گاہے صبر و خاشی کا پیام ہے اور گاہے پکت ہوا شعلہ تمام ہے۔ مں حیران و پریشان دو متضاد طاقتوں میں گھرا ہوا گو، مگو کے جذبے میں اسیر ہوں۔

میری ماں کہتی تھی، ”ایک چپ سوا توں سے بھلی ہے۔“

تو کیا میں خاموش ہو جاؤں؟ وہ قلم جسے یرنگی حالات نے سچ لکھنے کی جرأت دی ہے اُسے سماجی دقتار کی بھی میں جلاؤں؟ اُن کا غدوں کو تلف کر دوں جنہیں میں نے خونِ جگر سے لکھا ہے؟ ہائے! میں کیا کروں؟

میں کسمپرسی کے عالم میں قلم پھینکتا ہوں، روتا ہوں، چیختا ہوں، سینہ کو مٹاتا ہوں اور سسکیاں لیتا ہوں انا کارہ سا بستر پر ڈھے پڑتا ہوں۔ جمود کی مرگ آسانی میں میرا دم گھٹتا ہے اور میں ایمان میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔

یہ جاں کاہ عذاب جھیل کر میں جیسے جیسے سنہلدا ہوں، جذبِ تخلیق سے تملتا اور تڑپتا ہوں، لیکن اپنی طمع رواں کو روکتا ہوں، میرے درون ضمیر سے آواز آتی ہے کہ زندگی کی اہل، حقیقت ہے! تو اپنی حقیقت لکھ اور بے دریغ لکھ! چھوٹی سے چھوٹی حقیقت، بڑے سے بڑے جھوٹ سے بری ہوتی ہے کیوں کہ اس کی اہمیت تاریکی میں روشنی کی سی ہوتی ہے۔

میں اس انکشاف پر غور کرتا ہوں۔ میری رگیں خود آفریزی کی حقیقت سے ٹھہرتی ہیں اور مجھ تک یہ پیغام پہنچاتی ہیں جسے میں دروغ کی وحشت انگیزی میں سُن نہ سکا تھا، ”تو اُجالے کا ایسا آفتاب ہے جو صدیوں میں طلوع ہوتا ہے“ ہاں قادیان! میں اُجالے کا نرالا آفتاب ہوں۔ میرا دوسرا نام، قلم ہے اور روشنائی، میرا نور۔ میں اپنے نور میں انسان کی ریاکاری کا اندھیرا غرق کر کے ہی رہوں گا تاکہ آپ اس کی حقیقت دیکھ سکیں۔

مجھ میں جدت طرازی کا ختم تھا، وہ اس لئے نہ پنبہ سکا کر کیا اپنے اور کیا پرانے، میری آزاد روی میں اپنی شکست دیکھتے۔ میں کہیں اپنی تخلیقی قابلیت کا مظاہرہ کرتا، میرے وجدان و رُحان اس بے رحمی سے کُجھ دیے جاتے کہ میرے دکھ دینے والے مجھ میں تڑپنے اور سسکنے کی سکت تک نہ چھوڑتے۔ مجھ میں تصویر کشی کی صلاحیت تھی جسے اُٹھانے

کے لئے میں نے ایک نوٹ بک الگ رکھ لی۔ میں خوشی پر اُٹھتا، فطرت کا مطالعہ کرتا، کوئی نظر آفریں منظر قیامت  
آدراس کی تصویر آتا۔ میری بدقسمتی! ذلیل میری پشت پر ہی سوار ہوتی تھی۔ میرا کام درشن سنگھ کی نظر پڑ گیا۔ پھر کیا  
تھا! جو حال میرے کام کا ہوا، وہی میرا لیکن میں اپنے چکندار اعضا کی وجہ سے بچ رہا۔ وہاں پڑھنے کا ماحول تھا اور نہ  
ہی فرصت، سکول میں جو پڑھ لیا سو پڑھ لیا۔ بھائیاجی میرے ہاتھ میں کتاب دیکھتے ہی بھونکتے اور میرے کتاب نہ  
چھوڑنے پر مجھے کاٹ کھاتے۔ میں ڈیک کے نیچے چارپائی پر بیٹھا پڑھ رہا تھا، بھینس گوبر کر کے روندنے لگی۔  
بھائیاجی وہیں کھڑے تھے، بولے، ”اٹھو، گوبر اٹھاؤ!“

اُن کی غیر ضروری مداخلت مجھے بری لگی کیوں کہ وہ کام خود کر سکتے تھے۔ میں نے جو محسوس کیا، کہہ دیا۔  
”اُمہوں نے گوبر ہٹانے کے لئے پھاؤڑا اٹھایا، میں اپنے انکار کی کارگری پر خوش ہوا لیکن میری خوشی کا وقفہ عارضی نکلا۔  
اُن کا دل تاریک گرٹھا تھا جس کی تہ میں جھانکنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ پھاؤڑا اٹھائے مجھ پر آئے، اپنا سر نشانہ ہوتے دیکھ  
کر میں نے پٹی ماری لیکن پنڈلی نہ دیں اُگئی۔ میری چیخ کے ساتھ میری زبان بھی باہر نکلی جیسے وہ اُسے اڑالے جا رہی ہو۔  
میں تڑپ کر نیچے گرا اور سر زمین پر پشکنے لگا۔ دوسرا وار منڈلاتے دیکھ کر میں ہانپتے اور کانپتے ہوئے اُن کے سبروں پر  
گرا اور چوری مغنویت سے پکارا، ”اٹھتا ہوں! ابھی اٹھتا ہوں! ہائے ماں مر گیا، ابھی اٹھتا ہوں!“  
”تو کیوں اٹھے گا؟ آرام سے بیٹھ! یہ کنجر، نوکر ہے ناں! یہ کما کر لائے گا اور تجھے آندو ویل کی طرح ناند پر  
باندھ کر کھلائے گا۔“

وہ پھاؤڑا پھینک کر ٹوچھیں سنوارنے لگے جیسے اپنے کئے کی داد اپنے آپ سے لئے رہے ہوں۔  
میں پھاؤڑا اٹھانے کے لئے اٹھا۔ میری منٹوں مانگ نے میرا بوجھ نہ لیا اور میں ڈھسے پڑا۔ بریکنگ  
کر پھاؤڑے تک پہنچا۔ مجھے بالکل پامال دیکھ کر اُن کی خوں آشام آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔ اپنی لازوال حقارت  
میں پلٹے ہوئے وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی خطرناک کیڑے کو پھیل کر اُس کے وجود کا مقصد تلاش کرے۔ میری  
ماں بھائی بھائی دالان تک اُئی اور چوکھٹ کے ادھر رُک گئی جیسے وہاں پہنچ کر اُس کی ساری طاقت سنب ہو گئی ہو۔  
وہ حد، اُس کے لئے سید سکندری تھی۔ اُس کے بارے وہ خوں خرواہوں کو ایسے دیکھتی تھی جیسے اپنی بے چارگی پر تہمت  
طراز ہو۔ مظلوم معصومیت کی بے بسی دیدنی ہوتی ہے کیوں کہ یہ اپنی سلامتی کے جتن سے عاری ہوتی ہے اور بالکل ظالم  
کے رحم و کرم پر جیتی ہے۔ میں نے پھاؤڑا اٹھایا، اُس کی ٹیک لے کر اٹھا، چلا، اہستہ اہستہ گوبر بٹایا اور اپنے ہی بوجھ  
سے ڈھیر ہو گیا۔ پنڈلی سے نکلتا ہوا خون ٹخنے تک پہنچ گیا تھا اور دزد دلہرا لہرا کر اٹھتا تھا، جیسے پھاؤڑے کا پھال ہڈی  
کے اندر ٹوٹ گیا ہو اور اچھل اچھل کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے پنڈلی سوج کر ران کے برابر ہو گئی اور  
نزہ، خون کی گاڑھی پر ت کے نیچے چھپ گیا۔

”ممکتی، نروان!“

”کس چیز سے ممکتی؟“

”جنم مرن سے!“

”نہیں، سنت جی مہاراج! گوتم نے اس شنکا (گھمان) سے ممکتی پائی کہ کرتا ہی کرتا رہے۔ اپنے گیان کا وگیا تک ثبوت ملتے ہی وہ خوشی سے چلا آیا، بدھم سرنم گچھا می! آرتھ ہے کہ میں بڈھ کی، یعنی اپنی پناہ لیسا ہوں۔ انسانی زندگی کا مقصود اپنے کرم سے ہے نہ کہ طاعت و عبادت سے! اُس نے دنیا کو بھٹکے سے بچانے کے لئے کیسی کھری بات کہی ہے، اپنے گرو کی بات پر بھی بھروسہ نہ کرو جب تک اُس کی سچائی نہ پرکھ لو۔“

”آپ ناستک ہیں۔ آپ سے بات کرنا پاپ ہے۔“ سنت نے حقارت سے کہا اور وہاں سے

اٹھ کر چلا گیا۔

تایاجی نے اُسے تحقیق آمیز نظر سے دیکھا اور پھر خود کو جیسے آسرا اور سر میں فریق کر رہے ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ سب سنت مہاتما اپنے اپنے انداز میں مجرم ہیں لیکن جس جرم میں یہ سب شریک ہیں، وہ ہے بیکاری، جسے جائز بنانے کے لئے یہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں اور جو انہیں جھٹلاتا ہے اُس پر ناستک کی تہمت لگا کر اُسے اپنے زمرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ ان کا شیوہ چچر ٹیول کا سا ہے جن کا نشانہ گرم خون ہوتا ہے۔

تایاجی کے خیال کے کسی نے کس خوبی سے مضمون لٹایا ہے،

چیلالائے مانگ کر بیٹھ کے کھلے مہنت

لام بجھن کا نام ہے، پیٹ بھرن کا بیٹھ

حالانکہ وہ دھارمک کتابوں میں سے اُدھارن (مثال) دیتے تھے لیکن اُن کا جا پ کرنے کو قہر

سمجھتے تھے۔ ”جو آدمی الفاظ پڑھتا ہے اور اُن پر عمل کرتا ہے وہی اُن کے معنی سمجھتا ہے۔ جو کوئی الفاظ جیتا ہے اُسے اُن کے معنی کا احساس نہیں ہوتا۔ الفاظ، آواز ہیں۔ جیسے کوئی تخلیق کار اپنی تخلیق کے نقوش سنوارنے کے لئے آواز بار بار تیز کرتا ہے، نئے آواز رائج کرتا ہے اُسی طرح عامل اپنے لفظوں کے معنی بار بار پرکھتا ہے اور حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا ہے، وہ خرافات کا بیج باری ہے۔ ذہن ایک گھر کی طرح ہے۔ جیسے گھر کو شستہ و رفته رکھنے کے لئے اُسے گندی مٹی چیزوں سے پاک رکھنا پڑتا ہے اُسی طرح مخلص زندگی گزارنے کے لئے ذہن کا احیاء لازم ہے جو مطمح نظر کی تازگی سے ملتا ہے

شکاری کی خوبی ہے کہ وہ شکار کو فترک میں رکھ کر اُس کے بارے میں بھول جاتا ہے اور نئے شکار کی فکر کرتا ہے۔ دُہی ہنسا میرے بھائیاجی کی تھی اور وہ اُسی بچے سے سوچتے تھے۔ وہ مقام حادثہ پر اتنی ہی دیر رکتے تھے جتنی دیر حادثے کو اُن کی ضرورت ہوتی تھی۔

میری ماں، کااندھے کا سہارا دے کر مجھے رسوئی میں لائی، پانی گرم کر کے اُس میں نمک ملائی، بجا ہوا نون، روٹی کے پنبوں میں گھلائی۔ زخم نے ننگا ہو کر پھر منہ کھول لیا اور تازہ کٹے بکڑے کی گردن کی طرح پہنے لگا۔ ایسے کتنے زخم میں جو میرے جسم پر بھولی بسری قتل گاہوں کی طرح موجود ہیں۔ میں انہیں دیکھتا ہوں تو اُن سے منسوب خوں ریزیوں کو یاد کرتا ہوں اور پھر اُسی جان لیوا تکلیف سے گزرتا ہوں جو اُن کی سرشت ہے۔ میرا دل، اُس نے کی طرح ہے، جس کی تقدیر، نوحے ہوں۔ ماں زخم کو لوگرے (گودر) سے سینکتی، اُس پر نیم اور بھلی کی پٹری باندھتی اور مجھے نیم کا بھرتا کھلاتی۔ میں کتنے دن تک لالچی ٹیک کر چلتا رہا۔

قارئین، زخم کی تقدیر، زخم ہے۔ اس کی فصیلت درد ہے اور زندگی، تازگی، یہی وجہ ہے کہ کوئی اسے لاکھ بچائے یہ چوٹ کھاتا ہے اور تازہ رہنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

کھیتی باڑی کے کام میں زخم بھرتے بھرتے کرید جاتا۔ اول تو انگوڑ بندھتا، بندھتا تو اُس کے نیچے زخم کھوتا جیسے اپنی شفا کے غم میں کڑھتا ہو۔ اُس کا رویہ بے حیائی کی کیفیت پیدا کرتا ہے جسے مارنے کے لئے میں اُسے کھجلاانا کھجلاہٹ کی لذت، کھجلائے کھجلائے انگوڑ پھٹ جاتا۔ میری نفسیاتی کمزوری، زخم کی نفسیاتی توانائی بن گئی اور اُس کی زندگی بڑھا گئی۔ حالات کی ہم آہنگی اور ہڈی کا زخم ٹھیک ہوتے ہوئے کئی ہسینے لگ گئے۔ میری وہ مظلوم ماں، میرے دل اور پنڈلی پر بیک وقت موجود ہے۔ میں نے اُسے ابھی ابھی چھوا ہے اور اُس میں وہی درد محسوس کیا ہے جو اُس کے عین آغاز میں تھا۔

ایسے صبر شکن اور عنان شکن حادثوں کا شکار ہو کر میں جذبات کی عمیق ترین پستی میں ڈوب جاتا۔ میری یاس پسندی! میں اندھیروں سے محبت کرتا اور اُجالوں سے نفرت اور اپنی فرسودگی میں ہر شے کو اپنی ہی طرح ذلیل دیکھنا چاہتا۔ میری نامزدی! میں کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ میں اپنی بے بسی پر بہم ہوتا اور انتقام جونی کی کیفیت میں سینہ کوئی کرتا اور کئی بار خود کو بخروچ کر لیتا۔

میں سکول کی فیس مانگنے پر معذوب ہوا۔ میں گھر سے سکول کے لئے نکلا لیکن راستہ بدل کر کچھاریں چھپ گیا۔ میں اس جھاڑی کے نیچے بیٹھا، اُس کے پاس کھڑا ہوتا اور شاخوں سے پتے توچ کر دوڑ پھینکتا۔ وہ دُور گرنے کے بجائے میرے ہی اطراف بکھر جاتے جیسے مجھے میری کم مائیگی کی یاد دلاتے۔ اُن کا چچہ پتن مجھے اچھا نہ لگتا اور میں گھبرا کر کسی لطیف جذبے میں پناہ لینے کی کوشش کرتا لیکن ناکام رہتا۔ میرا دل اسب زدہ گھر تھا جہاں میں پلیدہ پنوں

میں گھرا اور سٹکا ایٹھا تھا۔ کب سورج سر پر آیا، کب سایہ ڈھلا، کب جھٹ پٹا ہوا، میں نے دیکھ کر نہ دیکھا۔ نہ مجھے بھوک لگی اور نہ ہی پیاس۔ میرے زندہ ہونے کی کوئی دلیل تھی تو وہ میری سانس تھی جو حلق میں سے کھردرے ڈھیلے طرح گزرتی ہوئی اسے کھینچ رہی تھی۔ میرا دماغ بجھا ہوا گولہ تھا جس کے اندر اور باہر یکساں اندھیرا ہوتا ہے۔ میزبان آنکھوں میں دھندلی ہی روشنی تھی، اس نے میری رہنمائی کی اور مجھے کراڑے پر لے گئی۔ کراڑے کی پاتال سی گہرائی نے مجھے پکارا جیسے اسے میرا غم معلوم ہو، دیکھتے کیا ہو؟ او اور اپنی مظلومیت ختم کرو!

دو بلاؤں میری آنکھوں نے سنا اور سن کر مجھے سنا یا جیسے مجھ بڑ دل کا حوصلہ بندھایا، چلو، تم تمہارے ساتھ ہی! ہم نے تم سے کم عذاب نہیں جھیلے ہیں!

میں نے آنکھوں کے ساتھ مل کر پاتال میں دیکھا۔ اس میں پُر انسرا کرشش تھی جیسے اسے میری بند کرنا منظور ہو۔ اس کی ناموس خاموشی اس کی سنجیدگی کی ضمانت تھی۔ مجھے ضعیف الاراجہ پا کر وہ اُپر اُٹھ آیا، میری طرف آگے بڑھا جیسے آفتِ ناگہانی میں ایک دوست دوسرے کو سنبھالتا ہے۔ میں اس کے ساتھ جائے اماں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ رگمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے جھکا لگا، میرا سارا بل جاتا رہا اور میں کانپتا ہوا پاؤں پر دھنسل گیا۔ دلیلیوں دھڑکا گویا رنگ کر چلا ہو۔ میں پسینے میں نہا گیا۔ میرا احساس حیات لوٹ آیا۔ مجھے پاتال سے ڈر لگا۔ میں رنگ کر پیچھے ہٹا، مڑا اور اپنے سامنے نایا سندر سنگھ کو کھڑے دیکھا۔ میں انہیں خیرہ سا نکلے لگا اور وہ مجھے خیران سے جیسے کہ میں ان کا جانا پہچانا گیان سنگھ نہیں کوئی دوسرا تھا۔

ہاں قارئین، ماس اور ہڈیوں کا ڈھانچہ، انسان نہیں ہوتا! وہ تعبیر نفس کا عزم ہے، جو اس کے لئے کوئی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔

حالات کریں صبح سے بیکار تھا، میرا سارا جسم تکان سے شل تھا۔ میں ہلے ہلے جلتا ہوا، بھاگ دی ابھی کے پاس سے پہنچوں پر پاؤں جھاتا ہوا اب جو میں اُترا۔ اُچل جل میں پاؤں بھگتے ہی رگوں میں تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں ذرا آگے بڑھا، وہی مٹھی کے آلاپ سا بہتا ہوا پانی، چھوٹے چھوٹے بجزوں ہی تیری مرنیاں، سنگ مرمر کی مورتیں، بگلے، پیرتوتی، پریسکیرتی، گرتی، دودھتی، اُٹھرتی، اُرتی رام چڑیا، چوکس ٹیڈریاں، رس یتھی، تتلیاں، تیری کھیتی کھیلیاں جھپٹہ چھپاک بھاگتے مینڈک، ایک دوسرے کے تعاقب میں سخت ڈرین فلائیر، سبزہ فوخیز کے سامنے اپنی بڑنگی پر اترتے ڈاب کے سے اور ان سب کو حساب کی رو سے جھٹلانا اور زندگی کی تکنیکی مابیت جھٹلانا ڈیلا ڈاب اور ڈیلا گھاس ہیں جو پانی میں یا پانی کے کنارے اُگتے ہیں۔ .... تاحد نظر حسن و جمال حیات اپنی تقدیس از لوی پر نازاں تھا میری طرح ہر شے اپنے طور پر کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی لیکن طائفہ فطرت میں اس کا وجود نہایت مرقن اور مومن تھا۔

میں سوئی پر بیٹھا نرل ریت سے دانت مانج رہا تھا کہ میں نے لیکر کے پھول، پانی میں بہتے آتے دیکھے۔

وہاں سے کچھ دور آدھر کیلکریا پر جھکا ہوا تھا جسے میں جاتے آتے کی بار دیکھ چکا تھا لیکن اُس وقت وہ مجھے نہتی قیدافت کی طرح لگا۔ میں نے گہری گھٹائیں کیں، ہاتھ منہ دھویا اور آدھر چل پڑا۔ کیلکریا، یوں کے گھونسلوں سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے ایک گھونسلہ حاصل کرنا چاہا۔ میں نے بن سوئی کا لمبا سونٹا توڑا اور اُس سے ایک گھونسلے پر وار کرنا چاہا۔ گھونسلہ ٹوٹا اور بچا تھا، میرا وار خالی گیا۔ میں نے دوسرا وار اچھل کر کیا میرا نشانہ ٹھیک لگا لیکن گھونسلہ جھول کر ثابت رہ گیا۔ پیڑ پر چڑھ کر مشرق ہوتی اور شور میں بدل گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس زاویے سے وار کرنا کارگر ہوگا؟ اتنے میں بے شور بچا تے گھونسلے کے گد اور میرے سر پر منڈلانے لگے۔ مجھے لگا کہ بے گھر سے لڑنا چاہتے ہیں لیکن کمزور ہونے کی وجہ سے بے بس ہیں۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے پھڑکی بھینک دی اور وہاں سے کچھ پرے ایک جزیرہ نما اونچے استھان پر جا کر بیٹھ گیا اور بیٹوں کو دیکھنے لگا۔ جوں ہی خطرہ ملا، وہ بھرتے بھرتے پھر گئے اور اپنے اپنے کام میں جُٹ گئے۔ ان کی محویت میری رغبت بن گئی۔ ان کی چونچوں میں پیشہ ور ہاتھوں کی سی ہمارت تھی اور نفاست بھی۔ بیاہیتوں میں سے گھاس کا لمبا اور پتلا چیر لانا اور اُسے گھونسلے میں بٹتا۔ بئی اُس کے اُس پاس چبھتی، پھدکتی اور شاخ پر جھجھولاجھوٹی غیے وہ بے گھر کے کام کا مٹا نہ ہنسی کھیلی کرتی ہو۔ بیا جتنا خاموش، مخلص اور محنتی تھا، بئی اتنی ہی باتوئی اور بکٹی تھی۔ بیا نیا چیر لانے کے لئے پرتوتا، بئی کے چہچہا نے کا اندازنی ترنگ اختیار کر لیتا۔ وہ بے کو یہ تاکید کرتی لگتی۔

چیسر سو ہنا چہا لیا میں

گھر پریت ناں بنائیں

(کوئی خوبصورت سا چیر توڑ کر لانا اور اُسے پریت سے گھونسلے میں بٹنا)

ٹھنڈی گرم ہریالی اپنی اسودگی میں رُس برسا رہی تھی اور میری تنگ دلی کو کشادگی عطا فرما رہی تھی اور میرے تصور کو بہکا رہی تھی۔ وہ افق پر بدلتے ہوئے رنگ ہیں یا عروسِ فطرت جو خود اکرائی ہے! میں نے سوچا، ”یہ اچھی بات ہے کہ میں حیات جوں۔“ میں لطافت کی رویں بہہ کر اپنا غم بھول گیا اور اُن دو بے زباؤں کے انوکھے رشتے کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اُسے خاموشی سے سراہنے لگا۔ میں نے بئی کی قسمت پر رشک کیا، جس کی خاطر بیا اپنی ذاتی ضرورتیں تباہ کر تن دی سے کام کرتا تھا۔ مجھے اپنی ماں کا خیال آیا۔ وہ غریب، بھائی جی کی اطاعتوں اور خدمت گزاروں کا صلہ، سلامتوں میں باقی تھی۔ قابلِ رحم تھی میری ماں! میں اُسے دیکھنے کے لئے بے قرار ہو گیا اور گھر جانے کے لئے اٹھا۔ چند قدم جا کر میں نے پیچھے مڑ کر بے کو ست بھاؤ سے دیکھا اور جو دیکھا وہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ بیا اپنی جیرج میں کوئی ٹٹمٹاتی ہوئی چیز پکڑے ہوئے تھا۔ میرے سارے احساس مرکزِ تجربہ بن گئے۔ میں نے اُسے پہچانا، وہ جگنو تھا جسے وہ گھونسلے میں محفوظ کر رہا تھا۔ میں اُس بے زبان کی جدت طراز فطرت پر حیران ہوا۔ اپنی شریکِ حیات کا دل بٹھانے کے لئے بیا جیسی فضا تراش رہا تھا، وہ انسانی رشتوں میں ناپید ہے۔ اس نرالے انکشاف کی جدت اور سادہ منظر کی نفاست، مستی بن کر رگ و پے میں دوڑ گئی

میری تازہ کیفیت اُس جھونکے کی سی تھی جو پتے ریگستان سے یکایک نخلستان میں پہنچ جائے۔ میں نے ماں سے بسے کی بات کہی لیکن میری دریافت میری خوشی کا باعث نہ ہوئی۔ اُسے وہ راز پہلے ہی معلوم تھا۔ مزید برآں اُس نے مجھے بیٹوں کے بارے میں ایسی حیرت انگیز حقیقت بتائی جس کی تصدیق پر زندوں کا ماہر ہی کر سکتا ہے۔ ”بہی کو گھوٹسلہ پسند نہ آئے تو وہ اُسے توڑ پھوڑ کر گرا دیتی ہے اور بسے کو نیا گھوٹسلہ بنانے پر مجبور کرتی ہے۔“

اُس رات میں فطرت کے پُر آشرا راجھاؤں پر غور کرتا ہوا بستر پر لیٹا اور آسمان کے جلوہ بے حجاب کا نظارہ کرنے لگا۔ بستارے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے قوتِ نامید سے تڑپ رہے ہوں۔ چاند کے حسنِ سفر میں دعوتِ سفر تھی۔ اُس کے راستے میں باذل کا کوئی ٹکڑا حائل ہوتا تو اُس کا شوقِ سفر، جوشِ سفر میں بدل جاتا۔ وہ اُس کا ریسینہ چیر کر اُگے نکل جاتا اور پھر وہی صُبحِ خیرانی اختیار کر لیتا جس کا وہ متوالا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں سوچتا، ”زندگی کے بارے میں مجھے ایسا زاویہ نظر نہانا چاہیے جو چاند کے عملی رُحمان کی نمائندگی کرتا ہو۔“

## باب ۲۹

درد، گرہ، فُغاں، غُلبش، افسوس

شاخِ احساس کیسے پھلتی ہے! (شاطر)

میں ایسے لوگوں کا اُلٹ حصہ تھا، جہاں مصروفیت کی دلاؤ دینی تھی یا بیکاری کی فتنہ پردازی۔ آدمی کی ڈھنکی چھپی درندگی کی طرح سے نمایاں تھی۔

”مالکِ سیماں! اس سال فصل دھوکا دے گئی ورنہ سنتو کھے کا کام تمام کر دیا ہوتا!“

اور کسان کو جس کمائی پر بھروسا ہے اُس کی عدم یقینی کہاوت ہے،

لگی کھیتی دیکھ کے گربھ کرے کر سان

جھکو جھولا سامنے گھر آئے تاں جان

(کسان بھرے پُرے کھیتوں کو دیکھ کر ناز کرتا ہے اور گھمنڈی ہوا جاتا ہے۔ لیکن جب تک

کھیتی گھرنے آئے کون جانے کیا گزر جائے؟)

میں جگد یو سنگھ کو بلانے کے لئے اُس کے گھر گیا، وہاں سے پتا چلا کہ وہ حویلی میں رستاباٹ رہا ہے۔

رستاباٹ رکھ کر وہ تالا ڈھونڈنے لگا، تالا نہ ملا، دروازے کا کنڈا دیسے ہی چڑھا کر میرے ساتھ ہولیا اور خود برطخن کیا،

”ہم کسان کیسے مورکھ ہیں! گھروں کو تالے لگاتے ہیں جب کہ ہماری ساری پونجی کھیتوں میں کھلی پڑی رہتی ہے۔“

کسان فطرت پروردہ میں اور فطرت پرچ کی علم بردار ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی بر محل بات، لفظ بہ لفظ دشت آویز ہوتی ہے۔ یہ دشت آویز انوکھی دشت آویز ہے! اُن کے پُرکھوں سے اُن تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہے اس کہادت کی صداقت پر کون اُنکلی اٹھا سکتا ہے!

گٹک، کمادی سنگھی، ڈانگو ڈانگ کیا

گھدا پھر داکھی دے وچوں دی لنگ جا

دگندم اور ایکھ گھنا بونا چاہیے اور کپاس لاٹھی کی دُوری پر۔ مکھی بو تے وقت یہ

خیال رہے کہ اُس کے کمیت میں آسانی سے گھوما پھر جا سکے

قارئین! کام تنقیح فسادِ رُوح ہے۔ آدمی کی زندگی کا رستہ اور کار نامہ نہ ہوتی تو یہ اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکتا۔ اس کی ہر تلخی اور ہر محرومی کا ازالہ کام ہے اور ہر فرار کی پناہ بھی کام۔ جو آدمی زندگی کے اس فلسفے کو نہیں سمجھتا، وہ شہرِ حیات کا ناکارہ، منکروہ اور آفت زدہ بارشندہ ہے۔ بھائیاجی کی روندی ہوئی، میری ماں اٹھتی اور دُنی ہوئی کسی کام میں لگ جاتی۔ اُس کے توڑے مروڑے اعضا رفتہ رفتہ زندگی سے بھرکنے لگتے جیسے کھلائے ہوئے پودے پانی پلنے سے لہلہلانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے دکھ میں جکڑی پستی ہوئی گاتی تو اُس کے لفظوں کا درد بہت نازک اور معصوم ہوتا۔ جن دنوں اُسے میرے ماما اور میری بھائی کا سوگ تھا، اُس کے گیتوں کا سوز و گداز الگ ہی تھا۔ لگتا تھا کہ وہ دنوں کی جگہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پیس رہی ہے۔

دُنیا تیرا باگ بگچہ تُوں باگاں دامالی

کچے پکے دی سار نہ جائیں توڑ گنوائیں ڈالی

(اے خدا! دُنیا تیرا باغ ہے اور تُو ہی اس باغ کا مالی ہے۔ لیکن تُو کیسا مالی ہے! تجھے

کچے اور پکے پھل میں تمیز ہی نہیں ہے اور جسے جب چاہے شلخ سے توڑ کر ضائع کر دیتا ہے)

بھائیاں باج نہ سوہنڈیاں بھینناں پندھ اڈیکال کھڑیاں

پُتر اں باج نہ سوہنڈیاں ماواں بھاویں لکھاں دولت بھریاں

(بھائیوں کے بغیر ہمیں سوہنی نہیں لگتی ہیں، وہ اُن کے انتظار میں اُن کی راہ دیکھتی ہیں۔

پُتروں کے بغیر مائیں سوہنی نہیں لگتی ہیں، بے شک اُن کے لاکھوں خزانے کیوں نہ ہوں)

تایاجی کے پیٹ میں رسولی تھی جس کے درد کا اُناڑ پڑھا اُن کی زندگی کا سانچہ سویرا تھا۔ درد کے

سخت مراحل میں وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے، کوئی قریب ہوتا، اُس سے پیٹ دباو اتے ورنہ پیٹ باندھ کر کسی کام میں لگ جاتے۔ اول اول وہ غم کا شو کو لگتے پھر کھلے کھلے پھول کی طرح کھل اُٹھتے۔ قارئین! جیسے نشیب سے فراز شروع



ہوتا ہے اسی طرح دُکھ سے سکھ۔ فرق یہ ہے کہ نشیب کو فراز سے راستہ ملتا ہے اور دُکھ سے سکھ کو کام۔

ورنہ کو کر فاسل کا امتحان سر پر تھا اور کورس ختم نہ ہوا تھا اس لئے جمعیت سنگھ اور چانوی سنگھ راتوں کو بڑھانے لگے۔ مجھے سکول میں رہنے کی اجازت تب ملی جب جمعیت سنگھ شخصی طور پر بھائی جی سے ملے اور ان پر اُس مخصوص پڑھائی کی اہمیت بتائی۔ موقع کا لحاظ کرتے ہوئے ماں نے مجھے نیا بستر دیا۔ میں اتنا خوش ہوا کہ میری خوشی ہزار داستان کی تھی۔ یہ اس لئے کہ ماں جو نیا بستر بنا تی تھی اسے مہمانوں کے لئے اٹھا رکھتی تھی، تھوڑے پرانے بستر بڑوں کو ملتے تھے اور بڑوں کے مسئلے ہوئے بستر چھوٹوں کو۔ یہ ذلت آمیز تقسیم میرے حق میں عذاب تھی۔ کسی کو نیا بستر ملتا میرے پرانے بستر میں کانٹے لگ آتے جو کروٹ کروٹ جسم میں اترتے اور رگوں سے ہوتے ہوئے خلق میں پہنچ کر پھانس بن جاتے۔ میں اپنے غم میں سانس لیتا گویا آہ بھرتا۔ میرا احساس مجھے بستی روح کے اس اندھیرے غار میں لے جا کر اتنا حس کا باب داخلہ تھا، باب رخصت نہ تھا۔ میں ان مہمانوں پر رشک کرتا جن کے نئے ماں دھوپ جیسے اُبلے بستر بچھاتی تھی۔ کتنے مہمان غلیظ اور گنوار ہوتے تھے! لیکن مہمان تو مہمان ہیں۔ وہ اپنے بوائیوں بھرے اور گھوڑوں سے پاؤں بستر پر رکھتے اور ایک ہی کروٹ ہم اس کی حالت ایسی کر دیتے جیسے تھینس دلدل سے نکل کر تہرے بھرے کھیت میں لوٹ جائے۔ میرا نیا بستر، میرے دل میں عمدہ جذبات جگا رہا تھا جو میری محرومی کی حالت میں نہ جانے کہاں سوئے رہتے تھے۔ میرا جذباتی اور نفیس ضمیر میری زندگی میں مصیبت اور طبیعت کی وحشت رہا ہے۔ اس نے مجھے جس طرح لرزاں و خیزاں رکھا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کبڑے ام کے ادھر ہی تھا کہ ایک دھماکہ ہوا اور میرے خیال کی رنگینی حقیقت کی سنگینی سے ٹکرائی۔ میں اپنے بھائی جی کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنے سوال کا جواب سنتے ہی ان کا منہ ملامت لگے جو تڑوں کی طرح پھٹ پڑا اور میں اُس گھناؤنی گند میں گھر گیا جس کی کھٹن پھندے سے عبادت ہو۔ میں اُلٹے پاؤں گھر لوٹا۔ میرے پاؤں بوکھل پہاڑ تھے اور اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ حسین خیالوں کی طرح ہلکا پھلکا بستر سر پر بھاری پتھر لگتا تھا۔ میں جیسے تیسے گھر پہنچا۔ چون کہ بھائی جی سائیکل پر تھے، وہ مجھ سے پہلے پہنچ گئے تھے اور ماں پر نعمتِ ملامت بن کر برس رہے تھے۔ ان کے نفسِ غلیظ کی تسلی کے لئے ماں نے مجھے وہی بستر دیا جو میری کم نصیبی کا ساتھی تھا۔ سکول میں ہوسٹل اور چارپائیوں کا انتظام نہ تھا۔ رات کو کلاس روم ہی میں ٹالوں پر بستر بچھائے جاتے تھے اور سوئے تہ کر کے برآمدے میں جمادیئے جاتے تھے۔ میرے سوائے سب کے پاس نئے بستر تھے۔ میرے بستر پر کوئی بستر نہ رکھتا، وہ ایک طرف پڑا رہتا جیسے رسوئی میں جھوٹا برتن۔

جمعیت سنگھ کا گاؤں بھیکھوال پاس ہی کچی مڑک پر تھا، وہ بڑھا کر گھر چلے جاتے۔ چانوی سنگھ کا گاؤں ڈٹے وال کچی مڑک پر تھا اور دُور بھی، وہ بڑھا کر وہیں سو رہتے۔ سکول میں رہتے ہوئے چند دن زکڑے تھے کہ میرے بڑے نصیب آدھکے۔ ایک رات جمعیت سنگھ کی باری تھی۔ ان کے جلتے ہی فالوںں جھجا اور میں سو گیا۔ میں ابھی کچی پینڈ

میں تھا کہ کوئی میری آزائی میں گھس آیا۔ میں نے اسے روکا، وہ رواداری سے کام لینے کی ترغیب دینے لگا۔ میں نے اسے پہچان لیا، وہ پنج سوہن سنگھ تھا۔ اُس سے ہاتھ پائی کرتے ہوئے میں نے شور مچایا لیکن کمرے میں ایسا سکوت رہا جیسے ہر سونے والے کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے منگت رام کو آواز دی۔ اُس نے اگر دروازہ پیٹا لیکن کسی نے نہ کھولا۔ دروازہ مجھے ہی کھولنا پڑا۔ اُسی اثنا سوہن سنگھ مجھے دھکا دے کر بھاگ گیا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا اُس کے بارے میں چھپک اور سندیر کی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے منگت رام سے ساری بات کہہ دی۔ اُس نے دیا جلایا اور نہر کسی کو ٹھوک مار کر جگایا۔ ہر کوئی ایسے اٹھا جیسے مخو خواب خرگوش ہو۔ اُس نے اُن سب کو گالیوں پر دھریا، اُس لمپٹ کو گھسیٹ کر باہر لے گیا اور اُسے مار پیٹ کر رسوئی میں بند کر دیا۔ اُس شرمناک اور آفواہ طراز حادثے کے بعد نیند کیسے آتی، میری بدحواسیوں اور دوسروں کی کانپھوسیوں میں صبح ہوئی۔ میں جمعیت سنگھ کا منظور نظر طالب علم تھا۔ انہوں نے میرے دشمن کی جو درگت بنائی، سو بنائی! مجھ غریب پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ باتوں باتوں میں بات بھیل گئی، وہ مشہور آدمی بدنام ہو گیا۔ جو مجھے نہیں جانتا تھا، وہ پہچاننے لگا۔ میں جدھر جاتا اپنی طرف انگلیاں اٹھتی ہوئی پاتا۔ میری نیک نامی حرفِ فہم کی طرح مٹ گئی۔ میری صفائی اور غزرداری کچھ کام نہ لئی۔ میں ہر کسی کی دل لگی کا سامان بن گیا۔ میرے عزیز معتمد پر میرے ستم کے کہتے، ”یہ بات جھوٹی ہے تو اس میں تیری ہٹی کیسے ہوتی ہے؟“

کرنیل سنگھ نے مجھ سے یہی کہا۔ میں نے حوصلہ کر کے اُس سے کہہ دیا، شنگارار سنگھ کہتا ہے کہ وہ تیری بہن کی مارتا ہے۔

وہ مجھ سے الجھ پڑا لیکن میں نے مقابلہ کیا۔ وہ اپنے دوست گرمکھ سنگھ کے ساتھ مل کر مجھ پر آیا، میں نے ڈر کر کہا، ”میں نے جھوٹ بولا ہے۔“ اس کے باوجود انہوں نے مجھے پیٹا اور رُلا کر جھوڑا۔

بات سچی ہو کر جھوٹی جس سے دل آزادی ہوتی ہو، لائقِ تکریر ہے۔

مجھ پر بے دردی سے جُملے کسے جاتے، ”میں کیا برا ہوں؟ میرا بھی ذرا خیال رکھو!“

”یہاں اپنی سنبھال میرا ہلیا۔“

کئی دھاکر اوت پٹانگ بکتے ہوئے میرا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے راستہ بدلنے پر مجبور کر دیتے۔ زنجیر اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے جتنی اُس کی کمزور کڑی، میری جوان مردی میری بزدلی کے مساوی تھی۔ میں کسی مقابلہ نہ کر سکتا۔ میں نے جمعیت سنگھ سے ریشم سنگھ اور ترلوک سنگھ کی شکایت کی۔ انہوں نے اُن کی خبر لی اور پھر مجھی کو سمجھایا، ”مجھے تمہارا بہت خیال ہے! لیکن میں تمہاری کہاں تک مدد کر سکتا ہوں؟ اپنی حفاظت آپ کرنا سیکھو۔“

میں نے اُن کی بات کی نزاکت کو سمجھا اور اُس پر عمل کیا۔ لیکن میرا عمل اُس بھجڑے کا ساتھ جو کسی

مزد کو دیکھ کر اُس کی نقل کرے اور عین وقت پر جانے کہ وہ پیچڑا ہی ہے۔ بے حوصلگی اور حوصلہ مندی دو طاقت در متضاد نفسیاتی کیفیتیں ہیں۔ میری بے حوصلگی میری حوصلہ مندی سے زیادہ قوی تھی اور اپنی تحریف پر بُری طرح حاوی تھی۔

میں کرتار سنگھ کو اپنا ہوا خواہ سمجھتا تھا۔ وہ بلوان تھا اور لڑا کوبھی، میں نے اُس سے مدد چاہی۔ میری تجویزی سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُس نے مدد کا 'صلہ' پیشگی مانگا۔ میری سنجیدہ درخواست پر اُس کا لاابالیانہ ردِ عمل مجھے پریشان کر گیا۔ اُسے مجھ سے وہ ساری اعانت ملتی تھی جو نالائق طالب علم کی زندگی ہوتی ہے لیکن اُس نے اُسے یکسر بھلادیا۔ اُس کی بے ہودگی سے زیادہ، میں اُس کی فطری بے شرمی پر حیران ہوا جس میں پیشہ ور شاہد باز کی سی جرأت تھی۔

میرے غمگسار قارئین! اپنے جسم پر ہلکا سا زخمِ قتلِ عام کی خبر سے کسی گنا اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جن زخموں کی تقدیر میں رسوا یوں اور بدنامیوں کے ممکنہان ہوں، آپ ان کی کسک اور ٹیس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں روحانی آنا چڑھاؤ سے گزرتا ہوا سوچتا۔ "حیات و مماتِ احساسِ نور و ظلمت ہی کے دوسرے نام ہیں۔" میں ایسے بیدار ہوتا جیسے کوئی مردہ قبر سے اٹھ کر زندوں میں شامل ہو جائے۔ غم ہر پل، ہر جگہ، ہر سانس میرا پیچھا کرتا، رگوں میں لاوے کی طرح دوڑتا، روگٹوں سے چنگاریاں بن کر پھوٹتا۔ آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکتا ناک سے رطوبت بن کر بہتا اور بیٹ میں مروڑ سا کھلبلتا۔ اُس غم کے ہزاروں پہلو ناقابلِ بیان ہیں۔ میرا غم کوئی ٹھوس چیز ہوتی اور میں بورا، تو سیونوں پر پھٹ جاتا اور تار تار مسک جاتا۔ میں غم سے گھبرا کر کوئی تنہا گوشہ تلاش کرتا لیکن میری آفسردگی اُسے کال کو ٹھٹھری میں بدل دیتی۔ میری مردہ دلی سے سناٹے کی فضا گہری ہو جاتی۔ اُس بے اعتبار تاریکی میں میرا دم گھٹتا اور میں سانس کے لئے تڑپتا ہوا دیوار پر سر پٹکتا، فرش سے پیٹ کر روتا جیسے ایک دُہی میرا مونہس و غم خوار ہو۔ دل کچھ ہلکا ہوتا، میں جا کر بھول بن میں بیٹھ جاتا۔ مزاج کچھ اور ہلستا۔ میں کتا کی طرف دھیان دیتا۔ کوئی کینہ بھیتی باز ادھر سے گزرتا اور مجھ پر گانڈو کی تہمت لگا کر اپنی راہ لیتا۔ اُس اختر پردازی سے میری رگ جال میں درم ابھر اُٹتا، حرّوف آنکھوں کے سامنے ناچتے اور صفحے، سیاہی پونے کا غد نظر آتے۔ میرے کانوں میں ذلت کے گولے پھٹتے، فضا شورِ فنا کی طرح گونجتی اور میرے غم کو نفرت کے بیجان میں بدل دیتی۔ جذبہ نفرت کی خصوصیت ہے کہ یہ مدعی کو اپنی نظریں گرا دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ایسا سانچہ گورتا ہے وہ اپنی برتری جتانے کے لئے کوئی بھی بے جا طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے دوسرے کی نیک نامی متاثر ہوتی ہو۔

مجھے لگا کہ پھول میری ہنسی اُڑاتے ہیں اور پتے مجھ پر طعن کرتے ہیں۔ میں دیوانوں کی طرح پھر جاتا اور ان بے بسوں پر اپنا عقد نکالتا۔ اُس سے میری تسلی نہ ہوتی اور میری نفرت، علامتِ نفس کی صورت نمایاں ہوتی۔

میں اپنے بال نوچتا، منہ پیٹتا اور روتا۔ اُسٹو، پانی ہیں لیکن مجھے اُگ کی طرح جلاتے تھے۔  
 کہتے ہیں کہ ہر غم عارضی ہوتا ہے اور وقت ہر درد کی دوا ! یہ دُرست ہے تو غم رفتہ کی اُگ میرے  
 دامنِ دل کو کیوں جلا رہی ہے ؟ یہ عبارت لکھتے ہوئے میں پستی رُوح میں کیوں ڈوبا ہوا ہوں ؟ میں اُسی طرح کیوں  
 تڑپ رہا ہوں جیسے اُن جاں کاہ لمحوں میں تڑپا کرتا تھا ؟  
 میرے پیارے قارئین ! آپ میں سے کتنوں کو میرے جیسے جاں گسل غم سے واسطہ پڑا ہوگا۔  
 کوئی مجھے بتائے کہ غم واقعی دیر پا ہوتا ہے یا نہیں ہی کم نصیب ضرورت سے زیادہ حساس ہوں۔

میں اس باب کو بند کر چکا تھا کہ یہی سوال میں نے خود سے کیا اور یہ جواب پایا۔ ”خوشی کے لمحے  
 جھومتے، لہراتے خوشبو کے جھونکے کی طرح گزر جاتے ہیں لیکن غم کے لمحے، خوں خوار سانپ کی طرح رگِ جاں  
 سے پلٹے ڈستے رہتے ہیں۔“

## باب ۳۰

سفر ہے شرط فراغِ حیات اے شاہِ طر  
 جہاں رکا ہوں لگا ہے وہیں حصار مجھے (شاہِ طر)

اُس روحانی حادثے سے میں درنیکوگر فائینل میں فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اُس کے بعد ڈی۔ اے  
 دی، ہائی سکول میں داخل ہوا۔ اس سکول کے بارے میں اُس سے پہلے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ میں اس سکول  
 کی ڈریل دیکھ رہا تھا، اتفاقاً میرے ساتھ کچھ ڈریل چور بھی کھڑے تھے۔ برکتِ رام ہیڈ ماسٹر گٹ پٹ، گٹ پٹ  
 کرتا آیا، بغل میں سے ڈنڈا نکالا اور ڈریل چوروں پر برس پڑا۔ کسی نے کچھ جیل کیا اور کسی نے کچھ لیکن اُس نے کسی  
 کا عذر نہ سنا اور اپنی دھڑا دھڑ میں مجھے بھی پیٹ دیا۔ دوسرے پٹ کر پرٹیدگر اڈنڈ کی جانب چل پڑے اور میں  
 گھر کی طرف۔ وہ ڈنڈا اٹھاتا ہوا مجھ پر لپکا۔ میں نے رو نہا رہو کہ کہا، ”میں ڈسٹرک بورڈ سکول کا طالب علم ہوں۔“  
 وہ اپنی غلطی پر چھینپ گیا اور مجھے بچکاڑتا ہوا اپنے دفتر میں لے گیا۔ ماسٹر مہنگا رام سامنے کھڑا تھا، اُس نے اُسے  
 حکم دیا، ”فوراً ایک گلاس دودھ منگواد۔“

”یس سر“ مہنگا رام نے پیلے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اُسے دیکھا اور گھن سے منہ پھیر لیا  
 لیکن جیسا کہ استعجاب کا تقاضا ہے، میں اُسے دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اُس وقت تک وہ دفتر سے باہر جانچکا تھا

اور چیراسی کو آواز دے رہا تھا۔

برکت رام نے مجھے کُرسی پر بٹھایا اور ایک تھیلی میں سے بادام اور کشمش نکال کر میرا کھینا بھر دیا۔ اُس نے میرے بارے میں جتنے سوال کئے، میں نے اُن کے جواب بے جھجک دیئے۔ میں اپنی بڑولی کا ردنا بٹے شمار بار روچکا ہوں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں استادوں کے سامنے ڈر رہتا تھا جب کہ بہادر طالب علم اُن کے سامنے کانپتے تھے۔ برکت رام میرے بھائیاجی کو جانتا تھا۔ جن ترکھانوں نے اُس سکول کا فریچر بنایا تھا، وہ اُن میں سے ایک تھے۔ بھائیاجی کے پیشے کا ذکر آیا ہے اس لئے میں اُن کی کارگیری کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

انہوں نے ایشور سنگھ سے مل کر فیروز شاہ سے تختے چیرنے کا ٹھیکہ لیا۔ انہوں نے تنہا کھٹ کر (کھٹاڑے سے پھیل کر گول لکڑی کا مربع یا مستطیل بنانا) سوت لگایا اور چیرنے لگے۔ کم سے کم پچاس تختوں کا مال تھا، ایک طرف کی لکیریں لگانے میں ماہ بھر لگ گیا۔ دوسری طرف کی لکیریں لگا کر وہ ڈنگے (بڑی لکڑی کو دونوں طرف سے چیرتے ہیں اور جہاں دونوں طرف کی کاٹ ملتی ہے اُسے ڈنگا کہتے ہیں) چھڑوانے لگے تو پتا چلا کہ سوت ٹیڑھا لگا ہے۔ انہوں نے تنہا لٹا کر اُس پر ٹاٹ باندھ دیا اور فیروز سے کہا، اسے چار پانچ دن تک ترک کر دو تاکہ ڈنگے کھل جائیں۔ اُس نے اُن کی بات پر یقین کر لیا اور اُن کا حساب کر دیا۔ اپنی جان بچانے کے لئے وہ دونوں کو سٹھ چلے گئے اور دو سال کی مسافری کے بعد لوٹے۔

برکت رام کے کہنے پر میں نے اسے اپنی مرضی سے ایک طویل نشر سنائی۔ میں اُس نشر کے تخلیق کار کا نام بھولی گیا ہوں لیکن وہ خوبصورت نشر مجھے اس وقت بھی یاد ہے۔ اُس کا آغاز یوں ہوتا ہے، اے میری زبان اے میری طوطی مشیوہ بیاں، اے میری قاصد، اے میری ترجمان تُو سچ بتا کر تُو کس درخت کی ٹہنی اور کس چین کا پودا ہے؟ تیرے ہر پھول کا رنگ نیا اور ہر پھل کا مزہ نالا ہے۔ کبھی تو ہر پھل فسون ساز ہے جس۔۔۔

”تو میرے سکول میں داخل ہو جا، میں تیری فیس معاف کر دوں گا“ اُس نے خوش ہو کر مجھے لالچ دیا۔ میں نظمیں اور غزلیں سننے کی بات کئی بار کر چکا ہوں۔ اُن دنوں بڑے بوڑھے، بچوں کو یوں ہی پرکھتے تھے اور ایسی پہیلیاں بھی بچھواتے تھے۔

اک رتی سرمد توجنیاں، فون سرمد کے جنیاں؟ (ایک رتی سرمد فون عورتوں کے لئے کافی ہے، فون سرمد کتنی عورتوں کے لئے کافی ہوگا)

سو من والکڑ، اُپر بیٹھا اک بھجھکڑ، رتی روز کھاوے ذرا نہ گنواوے، دسواوہ لکڑوں کینیاں دناں  
وچ کھاوے گا؟ (ایک لکڑی سو من بھاری ہے، جس پر گھن کا کیڑا بیٹھ رہا ہے۔ وہ ہر روز ایک رتی کھاتا ہے،

بتاؤ وہ لکڑی کو کتنے دنوں میں کھائے گا ؟

بچوں کی حاضردماغی جانچنے کے لئے یہ سوال عام پوچھا جاتا تھا۔ ایک سیر لوہا بھاری ہے کہ ایک سیر رونی !

میں برکت رام سے داد پا کر گھر جانے لگا، اُس نے مجھ سے ہاتھ تلایا اور اپنی پیشکش کو پھر دوہرایا۔ اُس کی سخت گیری کی علت میں دھوم تھی اور میرا پہلا تجربہ بھی ہی تھا لیکن اُس کے نرم رویے سے میں بہت متاثر ہوا۔ وہ واقعہ میں نے کس کس کو سنایا ! جب میں اُس سکول میں داخل ہوا، برکت رام ریٹائرڈ ہو چکا تھا اور اُس کا داماد بھیم سین ہیڈ ماسٹر تھا۔ میری فیس معاف نہ ہوئی لیکن میں فیس دینے والوں کے اُس گروہ میں شامل ہو گیا جو اپنی فیس دفتر میں جمع کرواتا تھا۔ فیس ہڑپ کرنے کا یہ طریقہ بھیم سین نے ایجاد کیا تھا۔ جو کوئی دفتر میں فیس جمع کرواتا تھا اُس کی فیس ریکارڈ میں معاف ہوتی تھی۔ میرے پہلے استاد کا نام گیان سنگھ تھا۔ وہ اُسی سکول کی پڑیا تھا اور میٹرک میں پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ اُس سے نام کی نسبت میرے خیال کو اڑاتی اور مجھے بہکاتی کہ میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آؤں گا۔ اُس نے مجھے ایک بار بتایا کہ میں فلاں جگہ بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ میرے خیال کی اڑان اِس اُسی جگہ بیٹھ کر پڑھتا اور سمجھتا کہ اُس جگہ میں کوئی پُر اسرار خوبی ہے جو میری فطری قابلیت کی کامیابی پلٹ دے گی۔

رشتہ داری ہو کہ طرفداری، تنگ نظری کو فروغ دیتی ہے اور آخر کار سوچنے کی صلاحیت اور سمجھنے کی نفاست پر اثر انداز ہوتی ہے۔ میں نے کئی ایسے نزاع دیکھے ہیں جہاں لوگوں کو اپنے رفیق کی کلامت درکار تھی لیکن وہ اُس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ اِس کی وجہ یہی عصیت ہے جس کی شدت والستگی میں عصبہ آندھے ہیں اِس عصبہ ناک جذبے نے ایک قوم کو دوسری قوم اور ایک ملک کو دوسرے ملک کے خلاف نبرد آزما رکھا ہے اور انسان کو تاریخ کے بدترین جرائم کا مرتکب بنایا ہے۔ اِسی ملعون جذبے کے ایک بھیانک مظنر نے میری مذہبی تمیر کو جڑ سے اُٹھا رکھا۔

تقریب دہائی کے وقت ہریانہ کے ایک مُسلمان محلے میں قتل عام ہوا۔ تمام بڑے مارے گئے اور بچے، بچے۔ بچے جنہیں تاجیا جی انسانی برادری کی سانجھی پونجھی کہتے تھے، قاتلوں کا مسند بن گئے۔ ہر کوئی یہ سوال اٹھانے لگا کہ ان سپاہیوں کا کیا کریں !

مخصوصیت کا اپنا جلال ہے اور ایسا انوکھا جلال ہے کہ اِس کے سامنے انسان، رعبِ شاہی کے برعکس محبت سے جھکتا ہے۔ اِس کی کارفرمائی حیوان تک میں انسانی جذبہ جگا دیتی ہے۔ میں نے حیوانوں کو حیوانوں بلکہ انسانوں کے بچوں کی مذکر تے اور انہیں مصیبت سے بچاتے دیکھا ہے۔ لیکن آدمی ! یہ اپنے جوشِ جنوں میں ہرجائی بیچانی

اور دیکھی سنی انتہائے ظلم کی ابتدا ثابت ہو سکتا ہے۔

قاتلوں کے انبوه میں سے بھاگ سینی آگے بڑھا۔ اُس آدمی مُادرِ ندے کے قدیموں میں وہ گھات تھی جو شکار پر جھپٹنے سے پہلے شکاری کی چال میں ہوتی ہے۔ پھر وہ جیسے پاگل ہو گیا۔ اُس نے 'ماتاؤں' بھوانیوں، 'گرووں' کی جے جے کا رُلاتے ہوئے اُن مضموموں کو اٹھا اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیا۔ اور آدمیت کی گلاؤں وہ ذلیل قاتل ہریانہ کا سب سے بہادر آدمی گردانا جانے لگا۔

گیان سنگھ مرزا پور کا رہنے والا تھا۔ وہاں اٹما پیسنے کی مشین تھی جو دین ڈھلے چلتی تھی۔ اُس کے گھگھو کی آواز ہمارے گاؤں تک سنائی دیتی تھی۔ میں اپنے بچپن میں گھگھو کی آواز سن کر کس مُرت میں گاتا تھا!

ایک دو تین

بابے بڈھے دی مشین

اُدپر گھگھو بولدا

بابا بے ایمان اٹما گھٹ تولدا

میرے جی میں اتنی تھی کہ میں وہاں سے اٹما پسوا کر لاؤں اور مشین کو بھی دیکھوں لیکن ماں یہ کہہ کر ٹال دیتی، "بچی! اور خراس کے مقابلے میں مشین کا اٹما بھکسا ہوتا ہے اور کھانے میں بد مزہ! مشین کا اٹما دہی لوگ کھا میں جن کے پاس نہ بچتی ہے اور نہ خراس جو تنے کا سادھن۔" لیکن کوئی تقریب اپڑتی تو بھایا جی، اٹما مشین پر پسوا کر لاتے اور اکثر مشین والے سے لڑتے کیوں کہ وہ پسائی زیادہ لینے کے لئے مول سے زیادہ تولتے تھے۔

میں اُس سکول میں انگریزی کے ساتھ پنجابی پڑھنے لگا۔ انگریزی پڑھنے اور بولنے میں مجھے دُہی دُشواری ہوتی جو اُدو بولتے وقت ہوتی تھی۔ میں زبان میں روانی اور سلاست پیدا کرنے کے لئے انگریزی بول بول کر پڑھتا اور جہاں موقع ملتا ریاض کرتا۔ ہریانہ سے گھر لوٹتے ہوئے، میں اپنی دُھن میں انگریزی کی کتاب بول بول کر پڑھ رہا تھا۔ میرے پیچھے سے دولتی رام آیا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، "کا کا! میرا گتا تیری ہی طرح انگریزی بولتا تھا! اُسے انگریزی کی گُرمی ہو گئی اور وہ پاگل ہو کر مر گیا۔ تو اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے اُسے حیرت سے دیکھا لیکن خاموش رہا۔ اُس کا اپنا لڑکا ترسیم سنگھ انگریزی میں ٹیوشن لیتا تھا جب کہیں پاس موتا تھا اور بخر اٹھیں کلاس سے آگے نہ پڑھ سکا تھا۔

ہمارے اڑوس پڑوس میں پڑھے لکھے تھے لیکن میں بڑھوں اور بڑھیوں کا چہیتا تھا اور اُن کے خط لکھا کرتا تھا۔ شیر سنگھ کی عادت تھی کہ وہ ایک بات لکھواتا اور پہلی ساری باتیں پڑھوا کر سُنتا اور خط لکھنے کے بعد سارا خط پھر پڑھواتا۔ ایک بار میں اڑ گیا کہ میں خط لکھوں گا لیکن پڑھ کر نہیں سُنداں گا۔

”جو جانتا ہے کہ خط لکھو کر اُسے پڑھو کر سُننے کی روایت کیوں پڑی؟“ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر پاس بٹھالیا اور سوال کیا۔ مجھے معلوم نہ تھا، میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”بس، بڑا ہوشیار بننا ہے! میں بتاتا ہوں تجھے۔ یہ صرف مجھی کو معلوم ہے۔“ اُس نے فخر سے مسکرا کر کہا۔ ”ایک آدمی اپنی خوشدامن، جانتے ہو خوشدامن کیا ہوتی ہے؟ ساس، کو خط لکھو رہا تھا۔ اور سوڑے کے نیچے بیٹھا تھا۔ اوپر سے چڑیا نے بیٹ کر دی جو اتفاق سے خط لکھوانے والے پر گری۔ وہ جھلکا کر بولا، تو مجھ سے دور بیٹھی ہے ورنہ میں تیرے چوتروں میں اُلگی لکھا دیتا۔ لکھنے والے نے اسے مضمون سمجھ لیا اور ہُو ہُو لکھ دیا۔“

”میں ویسا نہیں ہوں!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میں کب کہتا ہوں کہ تو ویسا ہے! میں ویسا ہوں اور اوپر شاخ پر چڑیا بیٹھی ہے۔“

تیلورام واقعہ استاد تھے جو ڈنڈا نہ رکھتے تھے لیکن اُن کے پلٹر مشہور تھے۔ بگھیر تھ لال کی ناک ہمیشہ ہتی رہتی تھی اس لئے وہ ’نلی چو چو‘ کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کی نلی بہتے بہتے ہونٹوں تک بہہ آتی، وہ غلیظا اُسے سینکے کی بجائے اوپر چڑھا لیتا۔ کئی استاد اُسے یوڈی فیلو، غلیظا آدمی، کہتے لیکن اُس پر اثر نہ ہوتا۔ تیلورام ریاضی پڑھاتے تھے۔ انہوں نے بگھیر تھ کو لیک بورڈ پر حل کرنے کے لئے سوال دیا جیسے وہ حل نہ کر سکا۔ تیلورام اُسے ڈانٹتے اور اپنے غصے میں بڑبڑاتے ہوئے اُس کی جانب بڑھے۔ اُس کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ کانپتا ہوا موتے لگا۔ اُسے اپنی نلی پر قابو نہ رہا، جو لوٹ کر نیچے گر گئی۔ تیلورام نے اُسے معاف کر دیا لیکن بلدیورام نے اُسے نہ بخشا، اُسے چوچو جھل چو، کانیا نام دے دیا۔

اُس دہقانی ماحول میں بھی پہناد بدلتا تھا۔ ٹانگیں موندے کا رواج چلا، جن کی ٹانگوں پر روگٹے تھے، وہ بھی استرا پھیرنے لگے۔ میں اپنے گاؤں میں اکیلا تھا جو اُن کی ریس نہ کرتا تھا۔ میرے ہم عصر مجھ پر طعن کرتے، ارے، یہ مزدوں کا کام ہے! اسے لونڈے نہیں کر سکتے!“

اُن دنوں تنگ پوشی کا رواج تھا۔ بے میانی بالشت بھر کچھے، کچھوں کے پائینچوں سے ذرا اوپچے کرتے، کاندھوں تک موڑے ہوئے آستین، کرتے کے سارے ٹن کھلے، کالر کے نیچے سموسا کیا ہوا رنگین رومال، موڈی تیل چھتری ٹانگیں، ننگے پیروں میں آدھے جراب اور کلانی میں پٹی۔ پاؤں کے اوپر ہر بوٹی ایسے پھرکتی جیسے شبشبہ باز کے سر پر شیشہ۔ نوکدار گپڑی اور اُس پر پنوں سے لکھا ہوا نام، گویا چلتا پھرتا تعارف نامہ۔ جس غریب کی گپڑی میں گنجی نہ ہوتی وہ آخری لڑکوتہ کر کے اُس میں کاغذ رکھ لیتا اور اُسی میں تسکین پاتا۔ جو گندہ گھگھ امر تر گیا اور وہاں سے رنگین سروں والے آپسین لایا۔ اُن کا مظر، اُن صفروں سے کچھ ہی چھوٹا تھا جو اُسے استیلا میں ملتے تھے۔



دھرم چند امتحانوں کے پرچے دیکھ کر لاتے، طالب علموں میں تقسیم کرتے اور ان کی زبانی ان سے نمبر پوچھتے جو کہ ہندسوں میں ہوتے۔ جوگندر سنگھ کی باری آئی، وہ پوری ڈھٹائی اور بے حیائی سے بولا، جناب سر! آپ نے انڈا دیا ہے۔ ایک بے لگام اور بے ساختہ تہقہہ اٹھا اور پیرید ختم ہونے تک سارے سکول میں پھیل گیا۔ اس حادثے سے جوگندر سنگھ بے اثر رہا لیکن دھرم چند نے اثر لیا۔ انہوں نے انڈے دینے بند کر دیئے اور کم سے کم ایک نمبر دینے لگے۔ جوگندر سنگھ بلا کاظرفت تھا، کچھ مجھارتیں اُسی سے منسوب تھیں۔

آدمی کے پاس وہ کیا چیز ہے جو سردی میں چھوٹی ہو جاتی ہے اور گرمی میں بڑی؟  
وہ کیا شے ہے جسے غریب پھینک دیتا ہے اور امیر رومال میں لپیٹ کر رکھ لیتا ہے؟  
جوگندر سنگھ کی جگہ کافی ظرافت، ہر کسی کو اُس کی ہنریمت دکھاتی تھی۔ جب اُسے وٹنوں کی سزا ملتی وہ اپنے استاد کو نشانہ بناتا، ”مرگیا ماسٹر جی! ماسٹر جی مرگیا! اور ماسٹر جی اُسے تباہ نکال دیتے جب تک اُس کے منڈے سے یہ نہ کھلوا لیتے، ماسٹر جی! میں مرگیا۔“

وہ سائیکل سواروں کو طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ کسی کو پکار کر کہتا، ”ذرا نیچے دیکھ! تیرے سائیکل کے پہیے گھوم رہے ہیں۔“

سائیکل چلاتے ہوئے تیرے چوتڑے ایسے ہل رہے ہیں جیسے اونٹ جھگالی کر رہا ہو!  
اُس نے جگدو سنگھ سے کہا، نمبر دار جی! آپ کے پچھلے پہیے کی ہوائ نکل رہی ہے۔ وہ جھٹ سے سائیکل پر سے اُترا اور جھک کر پہیے کو دیکھنے لگا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ جوگندر نے اُسے لوٹو بنایا ہے، اُس نے اُس پر چوٹ کرتے ہوئے کہا، کا! میری ہوا نہیں نکلی لیکن تیرے باپ کی ضرور نکلے گی جب تیری ماں اُسے بتائے گی کہ تو میرا لطف ہے۔“

جوگندر سنگھ وقتی طور پر جھینپ گیا لیکن جگدو سنگھ کے دہاں سے جاتے ہی اُس نے اُسے منہ بھر کر بیٹی کی گالی دی۔ میں نے اُسے آفریں آمیز انداز سے دیکھا۔ جگدو سنگھ اس قدر غصہ تھا کہ کئی اُس کے پیچھے بھی اُسے گالی دینے سے ڈرتے تھے۔ گالی دیکھنے میں الفاظ کا پشتارہ نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں! یہ ایک طرح کا امتحان ہے، جو ہمارا ہوا انسان اپنے حریف کے خلاف برتنا ہے، اُسے نقصان پہنچاتا ہے اور کسی حد تک اپنے کھوئے وقار کو بحال کرتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شکست خوردہ اپنی ذلت کی دلدل سے نکلی نہ پاتا اور اسی میں غرق ہو جاتا۔

کرم چند اب جومیں مانگیں منڈ رہا تھا، میں موشی چرانا ہوا ادھر جا نکلا۔ اُس سانپ نے مجھے بہکایا اور میں بہک گیا۔ مانگیں منڈ کر میں نے اپنی نئی حالت کا جائزہ لیا۔ مجھے عجیب سا لگا۔ اُسی آشنائیں نے

کرم چند کو قاہ قاہ ہنستے سنا۔ میں نے حیرت سے اُدھر دیکھا، اُس نے ہنستے ہوئے رگ رگ کر کہا، ”تو ایسے، بابا، لگ رہا ہے، بابا بابا، جیسے چھیلا ہوا کیلا۔“

اُس ذیل نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اُس کی طنز اور میری خود آگاہی نے میرے احساس کو گہرا کر دیا اور مجھے لگا کہ میری ٹانگیں کنواری کی رانیں لگتی ہیں۔ میرا خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی ہوا باندھتا میری ہوا نکل گئی۔ میں اپنی حماقت پر کچھتا تا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی، ہمیشہ کی طرح دیر ہو چکی تھی۔ اپنی ندامت چھپانے کے لئے میں نے اندھیرے کا انتظار کیا اور پھر رات ہونے ہی مجھے صبح کا کھٹکا لگ گیا۔ میں رستہ میں دیر تک دبکا پڑا رہا اور جمید ظاہر کرنے والے اُجالے پر گرھٹا رہا۔ وہ دُھبیٹ میری حالت سے بے نیاز بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا۔ سکول جانے کا وقت قریب آگیا۔ میں ناشتے کے لئے چوکے میں نہ پہنچا، ماں نے بلایا۔ پاجامہ میرے پاس نہ تھا ورنہ میں اپنی شرم چھپا لیتا۔ مجھے ایک طریقہ سوچھا، میں جس سے ملتا اُس سے آنکھیں پڑاتا ہوا اُڑ جاتا۔ میری کڑوت دیکھ کر ماں نے کچھ راز جوئی اور کچھ تیرانی سے پوچھا، ”بارے تو بھی جوان ہو گیا ہے؟“ میرے پاگل پن کی کہانی کرم چند نے رات ہی میرے ہم عصروں کو جاسنانی۔ دوسرے دن سرک کے پہلے موڑ پر اُن بد ذاتوں کی ٹولی میری راہ دیکھ رہی تھی۔ اُن میں کئی ایسے تھے جو روز سکول دیر سے پہنچتے تھے اور سزا پاتے تھے، وہ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ قہقہے، وہ زہر میں بجھے فقرے، وہ بے باک کچوکے، میں ذلت کے گولے میں مدار کی بڑھیا کی طرح تھا جو اپنے بیج کے ساتھ اڑتی اڑتی کہاں گرتی ہے؟ کسے معلوم۔ کاش! میں اتنا احساس نہ ہوتا، اتنا بزدلی نہ ہوتا!! اپنی ذاتوں کا خیال کرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ اُن کی عمر ہزاروں سال ہے۔

سردیوں کے دن تھے۔ میں کئی دوسرے طالب علموں کے ساتھ کلاس روم سے باہر بیٹھا دھوپ سیک رہا تھا۔ کھرنی پر سے مادہ چیل کی پچوں اوں، چوں اوں کی دزد بھری آواز آئی۔ وہ یہ خاص آواز اپنے نر ساتھی کو مائل کرنے کے لئے پیدا کرتی ہے۔ اُس آواز کی حسرتناکی! افسا اُس نراس کے جذبات سے جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ عملِ وصل کی کم مائیگی! چیل چند چھنوں کے لئے چپ ہوتی ہے اور پھر اُسی حسرت بھرے انداز میں گر لاتی ہے جو بحر میں اُس کی طبیعت کا سوز و گداز ہوتا ہے۔ جس طرح فطرت حسنِ تخلیق سے معمور ہے اُسی طرح انسان جو شِ مسرت میں مجبور ہے۔ میں اپنی لہر دبانے لگا، ”چیل مرواتی کم اور شور زیادہ مچاتی ہے۔“ میری بات زبان سے ہونٹوں تک ہی پہنچی ہوگی کہ بھیم سین نے سُنا لی جیسے وہ میرے ہونٹوں سے کان لگائے بیٹھا ہو۔ اُسے دیکھ کر میں جلدی سے اٹھا لیکن اس سے پہلے اُس نے مجھے کلائی سے پکڑ لیا اور جھٹکا دیا۔ میں گستاخاں کی شکل سے سنبھلا۔ اُس کے ساتھ اُس کی لڑکی ششی کلا بھی کھڑی تھی۔ میں نے جو کہا، بلا ارادہ کہا تھا۔ میری سچائی کی سند، میری بزدلی ہے۔ ”سوری سر، ویری سوری سر!“ میں نے سچے دل سے معافی مانگی لیکن اُس نے قبول نہ کی۔ مجھ پر بید

برسنے لگا اور ساتھ ہی میری آنکھیں۔ اُن میں ادنیٰ سا فرق یہ تھا کہ میری آنکھیں خاموش برس رہی تھیں۔ شیشی کا کے چہرے کی بناوٹ ایسی تھی کہ وہ زیر لب مسکراتی لگتی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی جیسے اُسے اپنے باپ کی سختی بُری لگی ہو۔ اُس نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر لپک کر اپنے ظالم باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا، "بس! ڈیڈی بس!!"

بھیم سین نے اسے غصے سے دیکھا لیکن چپ رہا، آخر میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ شرمندہ تھا کہ پر اگندہ، دُہی جانے! شیشی نے جاتے ہوئے جس نیم نگاہی سے مجھے دیکھا، اُس میں ہمدردی سے زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ کیسا عادتہ تھا! بھیم سین کی زیادتی مجھے بُری نہ لگی۔ اُس دن سے شیشی کے رویے میں میرے بارے میں خوش گوار تبدیلی آئی۔ وہ جہاں کہیں مجھ سے ملتی، مسکراتی اور آنکھیں ملا کر چراتی ہوئی گزر جاتی۔ اُس کا یہ انداز اس قدر نازک، دل گداز اور خیال آرا تھا کہ کپل بھر کے لئے میں اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتا اور اُس قیافے، استخارے سے لطف اُٹھاتا جسے وہ راہ دکھا گئی ہوتی تھی۔ میں وہیں کھڑا اس یقین سے اُسے دیکھتا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی اور مسکرائے گی۔ میری آنکھوں نے دُہی دیکھا جو میرے دل نے اُن سے کہا تھا۔ ہم کئی بار اکیلے بھی ملتے لیکن کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کرتا جو جذبات کے لالباہی پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ وہ شلوار قمیض پہن کر سکول آتی تھی، اچانک وہ مسکرت پہننے لگی۔ اُس کے بارے میں پہلے بھی باتیں ہوتی تھیں لیکن الگ نوعیت کی۔ ایک دن وہ میرے پاس سے گزری، میں نے سوچی سمجھی لاپرواہی سے اپنی کتاب گرا دی اور کتاب اُٹھانے کے لئے جھکا، لحظہ بھر کے لئے اُسے دیکھا، آواز کے برعکس وہ اندر دیر پہننے ہوئے تھی۔

بھیم سین ہر سال اُنٹھویں اور نویں اور دسویں کلاس کے لئے پیپر کا میڈ، منتخب کرتا تھا۔ ہر طائر علم کا میڈ کی پوری قیمت چمکاتا تھا لیکن حصّے داری سات طالب علموں کے ساتھ نبھتا تھا۔ اُس کے پیچھے ہر کوئی شور مچاتا لیکن اُنے سامنے چپ سادہ لیتا۔ اُس کا سب سے پیارا محاورہ تھا، دلتھ لوسٹ نو تھنگ لوسٹ، ہلتھ لوسٹ سم تھنگ لوسٹ اینڈ کیریئر لوسٹ ایوری تھنگ لوسٹ۔ دولت گئی کچھ نہیں گیا، صحت گئی کچھ کچھ گیا، چال چلن گیا، سبھی کچھ گیا۔ "ساری کلاس کے لڑکوں نے مل کر یہ طے کیا کہ ہم بھیم سین کے ساتھ بات کریں گے اور الگ الگ کا میڈ دینے کی مانگ رکھیں گے۔ ترسیم سنگھ اور ترمون سنگھ کو لیڈر بنایا گیا اور باقیوں نے اُن کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ جب وقت آیا، کسی نے اُن کا ساتھ نہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچارے دھر لئے گئے۔

ایک نے اُستاد پیارا سنگھ کا تقرر ہوا، جو صرف بی۔ اے۔ پاس تھا۔ مزے کی بات یہ تھی

کہ اُس نے اپنی ڈگری، سائیکل کی مڈکارڈ پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی بی۔ اے کے نام سے اور پھر نوٹڈے باز کے نام سے مشہور ہوا۔ اُسے صرف ایک ہی شعر آتا تھا اور وہ بھی پنجابی کا،

گورے رنگ نے سدا نہیں رہنا

بھر بھر بک و نڈ دے

(یہ گورا رنگ ہمیشہ رہنے کی شے نہیں ہے، اسے بک بھر بھر کر بانٹ دے)

وہ جیسے اوجھی باتوں میں بدنام تھا ویسے ہی فٹ بال اور کبڈی میں اُس کا نام تھا۔ وہ اپنے دائیں پاؤں میں کالے رنگ کا بانا باندھتا، ٹانگیں موٹتا اور بدکار عورت کی طرح پائپے اٹھا کر گھلی پنڈلیاں دکھاتا۔ وہ آوارہ لڑکوں کو پُرچک دیتا اور ان میں پُرچ بھاد رکھلاتا۔ اُس نے مَن پسند لڑکوں کو پھانسنے کا نوٹ طریقہ نکالا، وہ ان پر سوال نامے فاش کرتا۔ اُس کے پاس نوٹڈوں کی بھرمار تھی لیکن اُس کی عادت کُتے کی سی تھی جو تنگ ہانڈی میں مَمنہ ڈال سکے تو اُسے اوپر ہی سے مونگھ اور چاٹ کر مٹپین ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کا فریب مجھ پر نہ چلا تو اُس نے میرے پیچھے بھڑوے لگا دیئے۔ وہ پھر بھی کامیاب نہ ہوا تو انجان ہو گیا۔ ہمارے درمیان وہی رشتہ قائم ہو گیا جو استاد کا طالب علم سے ہونا چاہیے۔

ایک شام دیر گئے میں کھیتوں سے لوٹ رہا تھا کہ پیارا سنگھ مجھے سڑک پر بلا۔ وہ سائیکل دھکیلتا ہوا بجل رہا تھا۔ ست سری اکال کے بعد اُس نے بتایا کہ سائیکل پتھر ہو گئی ہے۔ اُس کا گاؤں شاد کھڈیاں تھا اور میرے گاؤں سے کافی دور، میں اوپر سے دل سے اُسے رات رہنے کے لئے کہہ بیٹھا اور وہ رُنت مان گیا۔ کاش مجھے آنے والے سانچے کا ذرا سا بھی خیال ہوتا! میرے قارئین! یہ میری کمزوری ہے کہ میں زود اعتماد ہوں۔ میں غیند سے عالم بدحواسی میں بیدار ہوا، پیارا سنگھ الف ننکا مجھے نونو خوار سانپ کی طرح لپٹا ہوا جہاں تہاں ڈس رہا تھا۔ وہ آہنی گرفت، وہ ہوس بھرے تھلے، وہ دانتوں جیسے کڑے اعضا، میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنے آپ کو بچایا۔ اس تنگ دپو میں مَنجا لوٹ گیا اور وہ بھبھوکھا سا ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُس نے مجھے میرے حال پر چھوڑا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں گیا گورا سا لگا گزرا تھا! اُسے پکڑنے اور مارنے کے لئے، میں نے نہ کسی کو مدد کے لئے بلایا اور نہ ہی شور مچایا۔ میری اس معذوری اور نامزدی کی وجہ ہیبت سے زیادہ ذلت تھی جسے میں نے چھپانا چاہا تھا۔ جب کبھی میں ایسے جاں کاہ مراءِ حل سے گزرتا، اپنے غم کا بوجھ رو کر ہلکا کرتا۔ اُس منحوس رات، میں نہ رویا، نہ ٹولوں ہوا، ایک مردہ بنے حسی سے اپنے مسلوب وجود کو دیکھتا رہا جیسے کوئی بے بس مجروح اپنے بہتے ہوئے خون کو دیکھے اور سمجھے کہ وہ اُس کی ذات کا حصہ نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ کتا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے لیکن اپنی ذات میں، میں گتے سے بدتر تھا۔ اپنی نابکاری کی وجہ سے میں نے جتنے بار ذلت اٹھائے ہیں وہ ہمال پہاڑ پر پڑتے تو وہ زیر زمین دھنس جاتا۔ میں نے جتنے آنسو روئے ہیں انہیں کسی طرح اکٹھا کر سکتا تو ان کی گہرائی میں نمندردوب جاتا۔ میں صبر شکن جو روں اور عنابر فلک بیدادوں کا وہ قبرستان ہوں، جس کے ذرے ذرے سے ذلتوں، تہمتوں اور بدنامیوں کا لہو ٹپکتا ہے۔ ان دارالاول کو دھڑانا پرانے زخموں کو تازہ کرنا ہے۔ میری تقدیر کسی تقدیر ہے! پہلے میری زندگی ایک سانحہ تھی، اب میری کہانی ایک المیہ ہے۔ مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے تو میں عجزِ اظہار میں نڈپتا ہوں۔ میری ہر بات ماورائے سخن ہے! آپ میرے سامنے ہوتے اور میری کوشش کی بے کسی دیکھتے! میں جتنا لکھتا ہوں اس سے زیادہ حذف کرتا ہوں۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے۔ میں اپنی دلی کیفیت میں وعن بیان کرنا چاہتا ہوں اور یہ ممکن نہیں ہوتا ہے۔ میں خبر ان ہوں کہ میں اپنی اس حالت میں زندہ کیوں کر رہا؟ میرے ہم جہات ہر کرشن نے میرے جیسے دکھ سے گھبرا کر خود کشی کر لی تھی۔ کوئی جو سمجھے، سمجھے! میں نے اس کی بھادری پر شک کیا تھا۔ میں بیار سنگھ سے انتقام لینا چاہتا تھا لیکن بڑول کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ بھید کی لات، ٹخنوں تک زیادہ بڑھی تو گھٹنوں تک۔ ایک بار مجھ آزل ہستی کو جرات ہوئی اور اپنے دشمن کی سائیکل پیچ کر دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میری رشکستِ دل نے مجھے کچھ سنبھلنے دیا تھا۔

اس حادثے کا پس اثر! میں اپنی مظلومیت میں کچلے ہوئے کیرے کی طرح ریگلتا اور اپنے غم سے نجات پانے کا چارہ کار ڈھونڈتا۔ میری زندگی کسی زندگی تھی؟ میں اپنی گلی سڑی لاش اٹھائے گھومتا، اس کی سڑاند میں جاں بلب رہتا، لیکن زمانے کی بے تعلقی! کسی کو میری میت نظر آتی تھی اور نہ ہی عفوئت۔ وہ حادثہ وہیں ختم نہ ہوا۔ اس نے سکول کے غنڈہ عنابر کو اپنے ساتھ لایا جو مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ ان کی زیادتی مجھے بالکل ناپسند تھی لیکن دل کے کسی کونے میں پسند تھی، الگ طریقے سے میں ان کے سامنے جانے سے گریز کرتا کہ گتے دیکھیں گے، نہ بھولیں گے۔ وہ میرے بارے میں من چاہی آوازیں پھیلاتے اور مجھے بدنام کرتے۔ آوازوں کی بدجلن نہ شرابی شراب سے افزوں تر ہے۔ اول تو آرتی ہی نہیں، آرتی ہے تو بس چڑھنے کے لئے۔ بد معاش لڑکے، میرا نام لے کر چٹخارے بھرتے جیسے وہ کوئی کھانے کی مزیدار چیز ہو۔ زرخین سنگھ جہاں کہیں ملتا کسی نہ کسی طرح مجھے دق کرتا۔ میں ملائی اور مردود منہ ہی منہ میں اسے گالیاں دیتا تصور میں اسے زود و کوب کرتا، اس پر دانت پیستا لیکن اس نے منہ پر ایک خرف نہ بول سکتا۔ وہ بدنامی، انوکھی جوالا نکھی تھی! میں اس میں سانس سانس جلتا تھا لیکن حل کر رکھ نہ جاتا تھا۔

اپنے دشمنوں کا رویہ بدلنے کے لئے میرے لئے لازم تھا کہ میں کوئی معرکہ آرا کام کرتا۔ میں کیا کر سکتا تھا؟

میں نے سوچا، سوچا، سوچا اور اپنی بہادری کا سکہ جمانے کے لئے ایک جھوٹ اڑایا کہ میں نے دین دار کے ڈبرے کی تھانگ میں رہنے والے یوبے کو دکھا ہے اور اُسے مار بھگا یا ہے۔

جیسے ننگا گڑھ مکھیوں کا کھا جا ہے، وہی حشر میرے جھوٹ کا ہوا۔ میرے بارے میں مشہور ہو گیا، بیسجڑے کے گھر بیٹا ہوا! کس نے دیکھا؟ بیسجڑے نے۔

نویں جماعت کا سالانہ جلسہ تھا اور مجھے اول انعام ملنا تھا۔ میں انعام کے لئے اٹھا، پیارا سنگھ نے اپنی منڈلی میں سے آواز دے کر کہا، ”میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ نرنجن سنگھ آنکھ چمکا کر بولا۔

”کانڈو کو تمہارا مل رہا ہے۔“ پیارا سنگھ نے پنے تلے انداز میں کہا جیسے وہ مجھے میرے لقب اور عزت سے بلارہا تھا۔

”یہ تو شرم کی بات ہے! کانڈو کو تو نڈے باز ملنا چاہیے۔“ نرنجن سنگھ غرور آمیز افسوس کے ساتھ ہنسا دیتے ہوئے بولا۔

”سچ کہے سوٹھا ہوا ملے گا، ضرور ملے گا! ہم اسی اس برجی رہے ہیں! پیارا سنگھ نے ایسے کہا جیسے کوئی کسی کا شجرہ نسب دیکھ کر اُس کی اصل کا فیصلہ کرتا ہے۔

میں نے اُسے علامت بھری نظروں سے دیکھا اور نامزدگی سے جواب دینے کے لئے رکا پھر اُگے بڑھ گیا۔ وہ حقیر، کتے کی طرح ہونٹ چاٹ کر بولا، چلو، ایک نظر ہی سہی! سچے عاشق کے لئے یہی کافی ہے۔“ میں انعام لے کر واپس ہوا، اُس ذلیل انسان نے ایسے سانس ھینچا جیسے ہوا میں سے میرا س چُرا رہا ہو اور بولا، ”بھور بھکھے واسنادے، ہور لوڑناں، بھوڑے صرف خوشبو کے بھوکے ہوتے ہیں! وہ زیادہ کی تمنا نہیں کرتے۔“

قربین! الفاظ کے معنی نہیں ہوتے، انہیں معنی دینے پڑتے ہیں۔ میں الفاظ اپنے احساس میں تولتا ہوں پھر لکھتا ہوں۔ خدا نے میرے باپ کو جس ناپاک مٹی سے بنایا وہ اپنے حقیر کردار میں اُس کے حقیر معیار پر پوری نہ آئی۔ اپنے حقیر مقاصد کی بے تکلف پیروی کرتے ہوئے اور اُن کے قطعی حصول کے لئے اُس نے اُس مٹی میں بے ضمیری، بے انصافی، بے ہمتی، بے تمیزی، بے دادگری، بے وفائی، بے حسی، بے ادبی، بے ایمانی، بے حیائی، بے ذردی، بے رنجی، بے لچاٹلی... کے عناصر زیادہ مقدار میں ملائے اور اُس سے ذلیل انسان پیدا کیا۔

میں انسانوں سے بھر کر کتابوں میں پناہ ڈھونڈتا اور ایسی کتابیں پسند کرتا جن کے کردار مظلوم ہوتے۔

وہی کہتا ہے اُردو میں ناپید تھیں۔ میں نے پنجابی میں چٹا ہو اور پوتر پانی پڑھے اور بار بار پڑھے میں امرتا پرستم کی نظم اگھال وارث شاہ نوں، پڑھتا اور بار بار پڑھتا اور روتا، بھڑاس نکلنے تک روتا اور اطمینان قلب حاصل کرتا۔

اپنی داستان رنج و غم کے اس نازک مرحلے میں، میں زندگی کا ایک نازک راز بیان کرتا ہوں جسے راز ارتقا کہنا چاہیے۔ میں ٹوٹ ٹوٹ کر جڑا اور جڑ جڑ کر ٹوٹا اور پھر جڑا لیکن بالکل نئے انداز سے! جیسے کوئی مضمون اپنی تصویر کو شاہکار بنانے کے لئے اس کے نقوش بار بار مٹاتا ہے اور بناتا ہے۔

پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد پنجاب دیاں دیہاں، پنجاب کی بیٹیاں بھیک مانگنے کے لئے آنے لگیں۔ وہ، وہ لڑکیاں تھیں، جو ملک کے ہٹارے کے دوران کسی طرح پاکستان میں رہ گئی تھیں اور پھر ہندوستان لائی گئی تھیں لیکن ان کے ماں باپ نے انہیں قبول نہ کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے جو دستم کی کہانیاں سناتیں، اپنی مصیبت کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے لباس اٹھاتیں اور اپنے کاٹے ہوئے، داغے ہوئے اعضاء دکھاتیں۔ عورتیں انہیں دھتکار تیں، تم کچھ کھا کر کیوں نہ مر گئیں؟ تم ڈوب کیوں نہ مر گئیں؟ راہ میں پارخ دریا آتے تھے! ”بہنوں! تم ہماری جگہ ہوتیں تو شاید ہم بھی تم سے یہی سوال کرتیں! ہم مر سکتیں تو کب کی مر گئی ہوتیں!“ وہ شرمندہ ہوئے بغیر کہتیں۔

لیکن مژدہ، ان سے ہمدردی سے پیش آتے، ان پر ترس کھاتے اور مسلمانوں کی ہوس کے نشاںوں کو ایسے جھوٹے جیسے ان میں چھپے زخموں کے اندرونی درد کو سہلا رہے ہوں۔ کئی خدا ترس ان اعضاء کو پاک بناتے، جو مسلمانوں نے ناپاک کر دیئے تھے۔

میں عہد گزشتہ کے جس لمحے کو یاد کرتا ہوں وہی سوزِ دروں کی بھولی بھولی کہانی ہے لیکن میری تقدیر! میں اپنی کہانی لکھنے سے باز بھی نہیں رہ سکتا! میرے قارئین کے ذہن میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیوں؟ میں تاریخ ساز ہوں اور مورخِ وقت کو میری سچائی محفوظ کرنی ہے۔

## باب ۳۱

جو ہوا منحرف روایت سے

(شاہ)

اُس نے راہِ حیات نو پائی

میرے احساس کی تفصیل کسی کے لئے بے فائدہ تَطْوِیل ہو سکتی ہے۔ اپنی حقیقت لکھتے ہوئے، میں خود اُفت زدہ ہوں، اس کے باوجود، میں بھرپور یقین سے کہتا ہوں کہ وہ زمانہ اپنے اندر میرے حال سے زیادہ تاب و تاب رکھتا تھا۔ میرا مقصد بیان پر ٹھہر کر مبادا کوئی تذبذب میں پڑ جائے، میں شکست و ریخت کی نفسیات بیان کرتا ہوں۔ خود شکنی عبرت انگیز ہو تو وہ خود گری سے ہم آہنگ ہوتی ہے ورنہ اپنی تردید سے۔ میں بے چارگی دے کسی کا ایسا منظر تھا جو بننے کے لئے بگڑنا تھا۔ اس نے میرے حرفِ حیات میں سیلِ معنی کے وہ سمندر ہیں جن کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میرا ماضی لامتناہی منظر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ نوعیت کے منظر کو یوں دیکھتا ہوں جیسے میں خود ہی عین منظر ہوں۔ میری بڑائی! میں اُس منظر کا مصوّر ہوں۔ میری کمزوری! میں اپنے خاکوں میں وہ رنگ نہیں بکھر سکتا جن سے وہ حقیقی حسن کے حریف ہو سکیں۔ جیسے ماں، بچے کو جِسم تو دے سکتی ہے، ورنہ کی لذت بیان نہیں کر سکتی، وہی صورت میرے احساسِ عمل کی ہے۔

کسبِ اخلاق پیکرِ آدم کی طرح ہے جو کہیں یکساں نہیں، میں اپنے اخلاق کو اپنے گز سے ماپ رہا ہوں۔ میں انسانی جبلتوں کا روادار ہوں۔ مروجہ قدریں کیا بلاء ہیں، میں نہیں جانتا، تہذیب و تمدن کیا شے ہیں؟ میں نہیں پہچانتا۔ میری ذہنی بلوغت، میری اپنی آزاد روی ہے اور میرا شعور میری طبیعت کی سیما بوشی۔ میں آغاز و انجام سے بے پروا ہوں اور شوق و تجسس کے رخس تیز کام پر سوار سفر و سفر آرا جا رہا ہوں۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا لیکن میرا خبطِ ماضی ششماہی، میں دیکھتا ہوں۔

میں اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا اس کی ریلی مسکراہٹ سے رس لے رہا ہوں۔ وہ مجھے گد گداری ہے اور میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا کھڑکھڑا رہا ہوں۔ وہ میری پھٹو سے کھیلتی ہوئی مجھ سے پوچھ رہی ہے، ”یہ کیا ہے؟“ مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا ہے! یہ جاننے کے لئے مجھے بڑا ہونا ہے۔ میں بڑا ہو رہا ہوں اور ماں کے دائرہ اثر سے باہر زیادہ بڑا ہو رہا ہوں۔ میں نے الفاظ اور نئے لہجے سیکھ رہا ہوں، میری ماں انہیں سُنتی ہے تو حیران ہوتی ہے۔ کوئی میری پھٹو کو ہاتھ لگا کر پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ تو میں پورے اعتماد سے اُسے بتاتا ہوں، ”یہ میری پھٹو ہے۔“ میرا ٹھیک جواب سُن کر کوئی حیرت زدہ ہے، کوئی خوش ہے اور کوئی طعنے زن، ”بڑا ہوشیار ہے!“ مجھے اس کی پروا ہے اور نہ اس کی، میں بے شرم و بے لحاظ تنکا دھڑنگا گھوم رہا ہوں۔ فتو مجھے دیکھتی ہے تو پُر کر میرے پیڑوں میں تھوک دیتی ہے۔ مجھے اُس کی حرکت بُری لگتی ہے، میں رو پڑتا ہوں۔ وہ جھلاتی ہے اور منہ بنا کر کہتی ہے، ”جا، گھر جا اور کچھی پہن کر!“ مجھ میں ننگ پن کا احساس جاگتا جا رہا ہے اور میں اپنی ماں سے کہنے لگا ہوں، ”ماں! مجھے کچھی پہنایا کرو۔“ وہ مجھے پچکار کر بہلاتی ہے اور کچھی پہننے کا خیال میرے دل سے نکالتی ہے۔ میں وقتی طور پر



ہل جاتا ہوں لیکن کسی ہم عمر کو کچھی پہنے دیکھتا ہوں تو محل پڑتا ہوں۔ بھائیاجی مجھے دیکھتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں اور بازو سے پکڑ کر باہر بڑھا دیتے ہیں، ”میں سکول گیا تھا تو کچھا پہنتا تھا! گھر سے نکل اور باہر کھیل۔“  
میں اُن کے کٹھور روئے سے دل برداشتہ ہوں لیکن باہر جا کر کھیلنے لگا ہوں اور کچھی کا غم بھول گیا ہوں۔ ہر کسی کی اپنی پسند اور ناپسند ہے، جس کے حصار توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں پسند اور ناپسند کے جذبے سے روشناس ہو گیا ہوں اور فتوٰہ ناپسند کرتا ہوں۔ وہ ملتی ہے، مجھے پکڑتی ہے اور میرے چوڑوں میں تھوک دیتی ہے یا اُن پر گوبر مل دیتی ہے۔ اُس کے بارے میں میری شکایتیں بڑھ گئی ہیں، جن سے تنگ آکر ماں نے مجھے کچھی سی دی ہے۔ میں کچھی میں عجیب سا محسوس کرتا ہوں لیکن خوش ہوں۔

”تُو نے کچھی کیوں پہنی ہے؟“ تایاجی مسکرا کر پوچھتے ہیں۔  
”میں بڑا ہو گیا ہوں! میں خود اعتمادی سے کہتا ہوں۔“  
اُن کی مسکراہٹ نمایاں ہو گئی ہے، انہوں نے میری پیٹھ تھپکی ہے اور مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے میرے سراپے کا جائزہ لیتے ہیں گویا میرے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

میں اپنے باپ سے ہر طریقے سے دُور ہوں لیکن ایک طریقے سے قریب۔ جہاں کہیں وہ مجھے ہم عمر لڑکیوں میں کھیلتا ہوا دیکھتے ہیں، جھک کر میرے کان میں کہتے ہیں، ”انہیں اپنی پھلی نکال کر دکھا! میں جوں ہی اُن کے کہے پر عمل کرتا ہوں، اُن کے جہرے پر روشنی سی دیکھتا ہوں۔ میرے اندر ایک لہر اٹھتی ہے جو مجھے تھرتھراتا ہوا چھوڑ جاتی ہے۔“

میری سوجھ بوجھ بڑھ رہی ہے۔ میں نے ماں کے اس جھوٹ کی سچائی جان لی ہے کہ اُس کی دُعاؤں کے صلے میں بھگوان نے مجھے، آسمان سے اُس کی جھولی میں نہیں پھینکا تھا بلکہ میں اُس کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا جیسے کائے کا بچہ۔ میں اپنے آپ کو لڑکیوں سے برتر سمجھتا ہوں، یہ اس لئے کہ اُن کے چوڑے میرے چوڑوں کے مقابلے میں ادھورے نظر آتے ہیں۔ کچھ کام میں محض اس لئے نہیں کرتا ہوں کہ وہ لڑکیوں سے مخصوص ہیں جیسے بیٹھ کر مونتنا۔ میرا ہر فعل میری خودی کی تحسین ہے۔ میں اپنی شرم دھیا، جو تہذیب و تمدن کا سرمایہ ہے اسے دست بردار ہوں۔ میں موتنا ہوا دائرہ بناتا ہوں اور کسی سے موت کی دھار دُور سے دُور مارنے کی بازی لگاتا ہوں۔ میں کسی جیتتا ہوں اور کسی سے ہارتا ہوں، جس سے ہارتا ہوں اُس کے ساتھ پھر بازی لگاتا ہوں۔ زندگی بڑھتی ہوئی توانائی ہے اور پیچیدگی بھی۔ ریاکاری میری فطرت ثانوی بن گئی ہے۔ میں لفظوں سے لفظوں میں تمیز کرنے لگا ہوں۔ دُبی الفاظ جو میں دوستوں یا روں کے سامنے بے تکلف برتتا ہوں، بلکہ برتنے میں فخر محسوس کرتا ہوں، ماں باپ اور بھائی بہنوں کے سامنے اُن سے گریز کرتا ہوں۔ میری بھنوکھڑی ہونے لگی ہے۔ اپنی جذباتی کیفیت کی پردہ داری

کے لئے، میں چھپ کر چھتو سے پھٹوڑاتا ہوں۔ یہ لڑائی اٹوکی لڑائی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں یہی لڑائی لڑنے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ نیکی و بدی میں جانتا نہیں، پند و غلط سے مجھے کوئی واسطہ نہیں، میرے عمل میں میری خود نمائی کا جزو ہے۔ میں ہر کام کرنا چاہتا ہوں اور اپنے ہر عمل کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہوں لیکن بُنڈی بھڑکا یا سائل ہے جس کا ردِ عمل نہیں ہے۔ دیسے یہ فعل مقبول ترین عمل ہے۔ جہاں دو بچے چھپے ہیں، سمجھو وہ اسی طرح لوٹنے پٹنے کی حرکت کر رہے ہیں۔

میں ہوا کے جھونکے کی طرح ہوں، جو گرم سفر ہے لیکن اپنی منزل سے بے خبر ہے اور ہر گھڑی نئے ماحول سے سینہ سپر ہے۔ میں وہ سب کچھ کیسے بیان کروں! جو میں دیکھتا ہوں، کرتا ہوں اور کرنا چاہتا ہوں میں پہلے لکھ چکا ہوں اور اب مکرر مکرر ذرا تصرف سے لکھتا ہوں۔ زندگی، رفتار ہے اور قلم، رفتار کا حریف نہیں ہوتا۔ میں اپنی نشوونما کو کسی حد تک قلم بند کر کے پھر دیں لوٹتا ہوں جہاں سے میں نے یہ نفسِ مضمون شروع کیا ہے۔

میں اپنی ماں کی گود سے نکل کر رہینگتا ہوں، کسی چیز کا سہارا لے کر کھڑا ہوتا ہوں اور سہارے سہارے چلتا ہوں۔ میری ماں مجھے دیکھتی ہے اور خوشی سے مسکاتی ہے۔ میں سہارے سے پرہیز کرتا ہوں، لڑکھڑاتا ہوں، گرتا ہوں اور نئے دلوں سے اٹھتا ہوں۔ میری ماں، میری بے کسی پر ترس کھاتی ہے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چلنا سکھاتی ہے۔ میری دست نگرانی میں سہارے ہی میں محفوظ محسوس کرتا ہوں لیکن میری خود اعتمادی مجھے سہارے کے بغیر چلنے پر اُکساتی ہے۔ میری ماں، میری کوشش کو سراہتی ہے اور میری ہمت بڑھاتی ہے۔ میں اُس کے ہمراہ ہوں مگر اپنے ننھے قدموں سے اُس کا ساتھ نہیں دے پاتا ہوں۔ وہ مجھے قدم بڑھانے کی ترغیب دیتی ہے۔ میری تیز فہمی! میں اُس کے برابر برابر چلتا ہوں۔ حسنِ تغیر کا کمال! میں استکانت کی حدود کو پار کر کے استقامت کی سرحدوں میں داخل ہوتا ہوں۔ میں اپنی ماں کے آگے آگے چلتا ہوں اور غرور سے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ میں اُس کی جگہ کا ہٹ سے شہ پاتا ہوں اور دوڑ پڑتا ہوں۔ میرے اور اُس کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہے وہ مجھے پکارتی ہے اور اہستہ چلنے کی نصیحت کرتی ہے۔ اُس کے منع کرنے سے میرے قدموں میں تیزی آتی ہے جو میری سرشاری بڑھا گئی ہے۔ میں پھر ماں کو دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے پریشان لگتی ہے جیسے اُسے کسی خطرے کی بیش آگاہی ہو۔ وہ مجھے رکنے کی تاکید کرتی ہے لیکن میری آزادی میری تندی بن گئی ہے۔ وہ ڈرتی ہے۔ مجھے واپس بلاتی ہے اور مجھے بے خوف دیکھ کر نادیدہ اُفتوں کا خوف دلاتی ہے لیکن میں اُس کے بلاؤں کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اُس کا تعلق خاطر! وہ مجھے پکڑنے کے لئے میرے پیچھے بھاگتی ہے لیکن میں اُس سے اس قدر دور نکل جاتا ہوں کہ نہ اُسے دیکھ پاتا ہوں اور نہ سن سکتا ہوں۔

میری خودروی میری تحریک بن گئی ہے۔ اخلاقی قدروں سے ڈر کر میں کوئی کام نہیں کرتا ہوں تو مجھے ماں کا بیٹا، یا یہ ابھی پچھتے کہہ کر چڑھایا جاتا ہے۔ خود کو خود بردار ثابت کرنے کے لئے میں کسی بھی کھیل میں کود پڑتا ہوں اور اپنی صلاحیت کا ڈٹ کر مظاہر کرتا ہوں۔ میں حقیقت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔ اس کے کہے پر یقین کرتا ہوں، کبھی اُس کے کہے پر۔ حقیقت کی ہمہ رنگی! جو یہاں درست ہے وہاں غلط ہے۔ میں نے خدا کی حقیقت کو پایا ہے۔ وہ میرے قریب ہو کر بھی مجھ سے دُور ہے اور ناکارہ قسم کا ساتھی ہے۔ کسی کام کو اُس پر چھوڑنا، اپنا بیڑا اُس غرق کرنا ہے۔ میں متوتش ہو کر بھی خوش ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اسرار حقیقت کو پانا ہی زندگی کا واحد انعام ہے۔ میرے خبط کی پیچ، پچے کی ہٹ کی سی ہے جو کچھ نہ جانتے ہوئے سب کچھ جاننے کا ادعا کرتا ہے۔ چوں کہ میری ناکامیاں میری استاذِ ثابت ہوئی ہیں اس لئے میرے بننے اور بگڑنے کا سلسلہ جاری ہے اور یہی تغیر کا تسلسل ہے۔

سالانہ کھیل ہو رہے تھے۔ نرنجنی سنگھ کبڈی کے میدان میں اُترا۔ اُس کے لیموں جتنے بڑے مجھے سب کی نظروں کا مرکز بن گئے۔ کہیں سے بات چلی اور چل نکلی۔ بات مزید اٹھی، میں نے بھی لطف اٹھایا۔ چوں کہ مجھے ذلیل کرنے کا اُسے منہ پڑا ہوا تھا، وہ سب کو چھوڑ کر میرے سر ہو گیا۔

”مارنے، مردانے کی شرط، تو کسی کھیل میں اُتر آج فیصلہ ہوگا اور ضرور ہوگا! اُس نے مجھے لکھارا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے سب کے سامنے اعتراف کیا۔ وہ اور پھر گیا اور خم ٹھونکنے لگا، ہر دو طرح تیری ماتوں کا! میدان میں اُتر آ تو ہر اکو، در نہ زبردستی ڈھاک! وہ جھپٹنے کے سے انداز میں میری طرف بڑھا اور مجھے منکسر یا کر آپے سے باہر ہو گیا اور بند زبانی کرنے لگا۔

میری بُزدلی نے میری نفسیات کو عجیب طریقے سے متاثر کر رکھا تھا۔ لڑائی میں پہل کرنا بڑی بات ہے، میں لڑائی کے نام ہی سے ڈرتا تھا اس لئے رُفح کے جذبے کی سرشاری سے ناواقف تھا۔ جنگ جو بانہ حالات میں، میں جیتنے کی اتنی خواہش نہ کرتا تھا جتنی اُس صورت حال سے بچ نکلنے کی۔ اُس کے بار بار کھلم کھلا ذلیل کرنے پر میری نامردی ایسے اُڑن چھو ہو گئی جیسے جادو چھوٹنے سے ہوتا ہے۔ میرے دل میں کپکپا ہٹ سی اٹھی، خون میں کوندے کی طرح پلکی اُردرگوں کی سنسنہ ہٹ بن گئی۔ سانسوں کی گرمی ایسے بڑھی جیسے میرے اندر آگ بھڑک اٹھی ہو۔ میری ساری سلب شدہ اور بکھری ہوئی قوتیں یکجا ہو گئیں۔ وہ اپنی قلبِ ماہیت کر کے اپنی پوری توانائی سے ابھری اور رُفح کا جذبہ بن گئیں۔ میں نے سنا، میدانِ کارزار، مجھے معرکہ آرائی کے لئے پکار رہا ہے، ایسے بلاوے پر لیتیک نہ کہنا، فراری ہے۔ میں مقابلے میں اُتر پڑا اور اپنی مرضی سے اُسے دو میل کی دوڑ کا چیلنج دیا جو اُس نے ایک دم مان لیا۔ اس انوکھے مقابلے کو دیکھنے کے لئے دوسرے بھی کھیل بند ہو گئے۔ اُس کی جیت اور میری ہار کی

پیس قیاسیاں ہونے لگیں۔ ہر کوئی دوڑ کے نتیجے سے زیادہ نتیجے کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے بے قرار تھا۔ میرے اندر جرات کا سیلاب اُٹ آیا اور میں جو ہو، سو ہو کی ترنگ سے سرشار ہو گیا۔ میرے بھی طرفدار پیدا ہو گئے۔ بلدورام اور ترلوچن سنگھ کی نرنجن سنگھ سے لاگ تھی۔ انہوں نے میرے کان میں کہا، ”شروع میں تیز نہ دوڑنا باقی سب ٹھیک ہو گا!“ سوہن سنگھ کے فیصلے کے مطابق فٹ بال گراؤنڈ کے دس چکر لگانا قرار پایا اور ایک جگہ خط کھینچ دیا گیا۔ میں اپنے حریف کے برابر کھڑا ہوا، اُس نے حقارت سے تھوک کر کہا، ”تیری آخرت نہ بگاڑ دی تو نرنجن نام نہیں!“

”تیری بھی آخرت نہ بگاڑ دی تو گیان نام نہیں۔“

میں نے خود کو مینو (برائی) کا ناش کرنے والا دیکھنا کی طرح دیکھا اور اُسے دسیو (نیکی) کا ناش کرنے والا راکشس کی طرح۔

”ابھی پتا چلے گا، ٹھہر ذرا!“

اُس کی ہٹ دھرمی سے لگا کر وہ، مجھے دسیو اور خود کو مینو سمجھ رہا ہے۔

”ابھی پتا چلے گا، تو ٹھہر ذرا!“

میرے غم نے میرے مینو ہونے کی تصدیق کی۔

”تیرے ایک چکر میں دو چکر لگاؤں گا اور تجھے پانچویں میں داب لوں گا۔ ارمان نکل گیا آج!“ اُس نے تمسخر آمیز تبسم سے کہا اور خوشی سے اوپر اُچھلا جیسے اڑنا چاہتا ہو۔

سوہن سنگھ نے چار لڑکے دوڑائے جو جا کر گراؤنڈ کے چاروں کونوں پر کھڑے ہو گئے۔ اُس نے مجھ کو پرے دھکیلتے ہوئے ہدایت دی، ”دور ریڈی، سٹیڈی، گو سے شروع ہوگی۔“ اُس نے ریڈی، کہا، نرنجن نے شیر جھٹکا، سٹیڈی پر سر دھڑے آگے بڑھایا اور گو پر یہ جا، وہ جا ہو گیا جیسے وہ سوگن کی دوڑ، دوڑ رہا ہو۔ میرے ایک چکر میں اُس نے ڈیڑھ چکر لگالیا۔ اُس کی واہ واہ ہونے لگی اور میری حیثیت گئے گزرنے کی سی ہو گئی۔ میں گھبرایا نہ تھا۔ مجھے تجربہ تھا کہ دس چکر بہت ہوتے ہیں۔ میرا دم پک گیا اور میں نے قدم کچھ تیز کر دیا۔ حالانکہ میں اُس سے پونا چکر پیچھے تھا، اُس نے مجھ سے آگے نکلنے کے لئے زور لگایا اور وہ میرے برابر آگیا۔ اُس کوشش میں اُس کا اُنس نکل گیا جب کہ میں تروتازہ تھا۔ میں اُس کے قدم سے قدم ملانے لگا، اُس نے پورا زور لگا دیا جیسے وہ آخری چکر ہو۔ وہ ہانپنے لگا اور اُس کا قدم اُٹھنے لگا۔ اُس کا پچھرا میرے حق میں اکیس ثابت ہوا۔ اُس کی ہے ہے، ہو ہو اور میری آتش آتش واہ واہ ہونے لگی۔ اُس کا دھونسا بجنے لگا اور قدم لڑھکنے لگا آخر وہ گر پڑا۔ تماش بین اُس پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے گھرے میں آئے شکار پر شکاری کتے۔ میں دوڑ جاری رکھے ہوئے وہاں سے گزرا، میں نے دیکھا کہ میرا حریف تنکا اور بے بس پڑا ہے۔

بلدیو رام اور ترلوچن سنگھ اُس کی ٹانگیں اٹھائے ہوئے ہیں۔ دوسرے لڑکے مجھے بکڑ کر وہاں لائے اور دعوت عیش دینے لگے۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ وہ جیت جاتا تو مجھے ہرگز معاف نہ کرتا لیکن میں اُسے ذلیل کرنے پر راضی نہ ہوا۔ میرے طرفدار مجھے کوسنے لگے کیوں کہ وہ نہ چاہتے تھے کہ میں اُسے معاف کر دوں۔ اُن کے بار بار اصرار پر میں نے بھڑک کر کہا، ”حرامی کی پیٹ نکلی پڑی ہے۔ اسے ابھی چھوڑ دو، پھر کبھی ماروں گا اس کی“ میں نے اپنی فتح کا نعرہ مارا اور ہر کوئی میرے خروش میں شریک ہو گیا۔

آب میرے اندر بالکل نیا آدمی تھا جس سے میری پہچان اچانک ہوئی تھی۔ وہ اُس رنگے ہوئے مظلوم سے الگ تھا، جو مجھے ذلیل رکھتا تھا۔ میرا نیا آدمی خود روا، خود آرا، خود سمر، خود شناس۔۔۔۔۔ تھا۔ اُس کی شان و شوکت اُن نظاروں پر کند ڈال رہی تھی جن کی تنہا میری خسرت بنی رہتی تھی جیسے جذبِ عیش و نشاط نقطہ کمال کو پہنچ کر روبرو ال ہو جاتا ہے، اُسی طرح وہ ہنگامہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میرے حمایتی مجھے بُدول کہہ رہے تھے لیکن اُن کی ملامت، لذت سے معمور تھی۔ میرا دشمن میرے سامنے بے بس پڑا تھا۔ میری فتح کا جذبہ دو اُنتہ تھا۔ کیوں نہ ہوتا! اُسے میرے دشمن کی اہانت کی ضمانت حاصل تھی۔

نرنجن سینکھ تکان سے ٹدھال پڑا تھا۔ میری زبان سے اپنی توہین سُن کر وہ چونچال ہو گیا۔ گایاں بکتا ہوا اٹھا اور تجھ پر لپکا۔ میں اپنی جیت کی مٹی سے بدست اپنے دشمن کی بے کسی پر نازاں تھا۔ میری خود پسندی میری رگ جاں کے لئے سامانِ راحت تھی۔ اپنی خود آرائی کی ہمیشگی کے لئے میں اپنے دشمن کو مجبور و معذور دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی سرکشی بارِ خاطر گزری، میں نے پکچی باندھ کر پیستہ بدلا اور لات کھینچ کر اُس کے چنڈے میں ماری۔ وہ نلوں کو پکڑ کر چیخا، مسکڑ کر گراسری ٹیک مار کر ترپتا ترپتا تو تھ پو تھ ہو گیا۔ میری نئی دلیری نیا ماحول پیدا کر گئی۔ میری خوشی، جو چند ثانیوں کے لئے میرے غصے میں گم ہو گئی تھی، پھر لوٹ آئی لیکن وہ قلیل سا وقفہ، وہ عہدِ تغیر کس قدر گراں گزرا تھا! وہ اُسی گرائی کا اعجاز تھا کہ میری نئی مسرت کا مرتبہ پہلے سے زیادہ برتر تھا۔ میں پہلی بار اپنا کمال آپ تھا۔ مرنے اور مارنے کی جبلت میں حیاتِ افروزِ فرق تھا۔ پہلی دِل آزار پستی تھی اور دوسری دِل فریبِ بلندی۔ میں نے بکرا بلایا، کلکاری ماری اور اُس کے سامنے سینہ سپر ہو گیا۔ کہاں میں ایسے حالات میں آنکھیں نیچی کئے اپنی ذلت چھپاتا تھا اور پرخ نکلنے کا جتن کرتا تھا کہاں میں آنکھیں پھاڑے اپنے حریف کو تک رہا تھا اور اُس کے سامنے اٹل کھڑا تھا۔

انسان نما تھیوان کے خلاف میری یہ فتح، مجھ سے زیادہ دوسروں کے لئے باعثِ فخر تھی۔ وہ سب عیشِ عیش کر رہے تھے جیسے وہ فتح ان کی فتح ہو۔ میری ظفریابی میری بڑائی تھی جس کی پائیزگی مسلم تھی۔ میری زندگی، رنج و محن سے یوں صاف ہو گئی تھی جیسے پھری ہوئی موج، کنارے پر سے کوڑا کرکٹ بھالے جائے

اور اُس پر چاندنی بکھیر جائے۔ میرے نام کے پُرانے معنی مٹ گئے اور وہ مجھ پر اپنے نئے عنوان کے ساتھ منکشف ہوا۔ اُس کے آہنگ میں ارتعاش تو تھا اب اُس کی بساط میں وسعت بھی ہو گئی۔

میں اُن اخلاقی قدروں سے روشناس ہوا جو آپس کے اُصولوں کے برعکس ہیں لیکن میری دانست میں سچی اور قابل اعتبار۔ محبت، نفرت کو فتح نہ کر سکے تو اُسے فتح کرنے کے لئے اُس سے بڑی نفرت دکھلا رہے۔ خدا نام کی کوئی چیز نہیں ہے! یہ نام بڑوں، ناداروں، مصیبت زدوں، جاہلوں.... کی ایجاد ہے، جس کی مدد سے وہ اپنے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ عاجزی، مسکینی..... جیسے خدا پرست حمد و ثنا کہتے ہیں، شکست زدوں کی اپنی تذلیل و تکذیب کی آہ و بکا ہے۔ نوح آدم کا سب سے بڑا فریب آدمی نے خود پیدا کیا ہے، پروردگار مددگار!

میں نے اپنا خدا کھو دیا لیکن خود کو پالیا۔ اپنا مردہ، جسے میں زندہ سمجھ کر اپنے ساتھ لے پھرتا تھا، اُسے میں نے وہاں پھینک دیا، جہاں اُس کی جگہ تھی۔

## باب ۳۲

اُڑے سے جاتے ہیں شاعر وصال کے لمحے

کچھ ان پر روک لگاؤ بہار کے دن ہیں (شاہر)

میری زندگی میں وہ وقت آچکا تھا جب ہر کوئی شاعر بننے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ وہ وقت، نازک وقت ہے! آدمی دماغ کے بدلے دل سے سوچتا ہے، اپنے آپ کو ہر لڑکی کا معبود سمجھتا ہے اور لگنٹا پھرتا ہے،

جہناں نوں لوڑ میراں دی

لک دہیں پیناں تے کھڑیاں

(جیسے مجھ سے محبت ہے، وہ کمر باندھے گھاٹ پر کھڑی ہے اور میری راہ تک رہی ہے)

بواہوس، شاخوں میں انگڑائیاں لیتی کنواریاں دیکھتا ہے اور اپنے تصور میں اُن کا بیچھا کرتا ہوا دور تک نکلی جاتا ہے۔ اُس نازک وقت کی خوشبو، میں نے اپنے مضمون 'مائی دلچ دیل' میرے گاؤں کانوال میں سونگھی تھی۔ اُس کا اثر کتنا متضاد تھا! جہاں میری طبیعت سرشار ہوتی تھی، بھیم سین کی بگڑ گئی تھی۔ میری

گستاخی کی پاداش میں مجھے آتے نفی نمبر ملے تھے جتنے مضمون کے نمبر تھے، اس کے باوجود میں نے سر بلند محسوس کیا تھا جیسے میرا رویہ صحیح ہو۔

”تیر تھ کور کنویں سے ڈول کھینچتی ہوئی جھولتی ہے جسے دیکھ کر میرے لہو میں دھنک سی لڑتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ویسے ہی جھولتی رہے اور میں کتاب کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھتا رہوں۔“

اُنٹالیس لفٹوں کی یہ نثر، نثر نہ تھی، میری بساطِ ہوس کی ڈھکی چھپی حقیقت تھی۔ ایسے کنوارے جذبات کی ہلکی سی عکاسی ان بولیوں میں ملتی ہے۔

کدال دساں امبری نوں

میرا باجرے چے لونگ کو اچا

(میں اپنی ماں سے کیسے کہوں کہ میرا لونگ باجرے کے کھیت میں گم ہوا ہے)

پہلاں کہندا لے دوں آرسی

پچھوں گل نیں سیدھے منہ کر دا

(پہلے آرسی کا وعدہ کرتا ہے لیکن بعد میں سیدھے منہ بات نہیں کرتا ہے)

کئی لڑکیوں کے دل میں میرے لئے لطیف جذبہ تھا جس کا اظہار وہ اپنے انداز میں کرتی تھیں۔ وہ کہیں راستے میں ملتیں، مسکرا کر پاس سے گزرتیں اور پھر تاحدِ نظر پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتیں۔ وہ کھیتوں میں کام کر رہی ہوتیں اور مجھے دُور سے آنا دیکھ لیتیں تو اپنوں کی نظر بچا کر دہقانی تحفے ڈانڈے پر رکھ جاتیں۔ وہ معصوم لگاؤ اُن ڈھکے چھپے جذبوں کے نمائندے تھے جو اپنی وجہ سے ظاہر ہونے سے جھپکتے تھے۔ دُبی جانے وہ کون تھا؟ جس نے اپنے اُن کہے جذبوں کو یوں بیان کیا ہے۔

ساڈے دل دیال دل وچ و سیاں

نہ او نے پچھیاں نہ اسیں و سیاں

(میرے دل کی باتیں دل ہی میں رہیں، نہ اُس نے پوچھیں اور نہ میں نے بتائیں)

میں کئی بار سوچتا ہوں کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر دوں۔ میں دوبارہ سوچتا ہوں تو مجھے

لگتا ہے کہ یہ باتیں میری زندگی کی بنیاد ہیں جن پر میری حقیقت کی تعمیر کھڑی ہے۔ تایاجی اسی بات کو الگ طریقے سے کہتے تھے، ”بڑی بڑی باتیں پیغمبر کرتے ہیں کیوں کہ وہ ذمہ داری سے بری ہوتے ہیں۔ ذمہ داری سے آدمی انسان بنتا ہے اور چھوٹی بات ذمہ داری کا تقاضا ہے۔“

یہ دقت درشن سنگھ پر بھی آیا تھا۔ اُس نے اُسے لاکھ چھپایا تھا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ کسی نے

گھاٹ پر اُس کی راہ دیکھی کہ نہیں! یہ راز، اُسی کا ہے۔ ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اپنی دھات کا علاج اُس گائے کے دودھ سے کرتا تھا جو ہریانہ کی بھٹیاری نے پال رکھی تھی۔ بھٹیاری کی گائے سے زیادہ اُس کی گنوا ریوں کی دھوم تھی، جن کے بارے میں رویشی مزید بات بتایا کرتا تھا، اُن کے ٹھن، گائے کے تھنوں سے اچھے ہیں کیوں کہ دو ہننے کے لئے پہنانے اور سہلانے نہیں پڑتے ہیں!“

میں اُن منزلوں کو سر کرنا چاہتا جن کا خیال غیر واضح ہو کر بھی واضح تھا۔ میں اپنے دائرہ اختیار کو ہر طریقہ سے بڑھانا پسند کرتا۔ اپنے فضل کے جواز کے تحفظ کے لئے مجھ میں متضاد ضمیر جاگ پڑا تھا۔ قارئین! میری یہ یاد مجھے دھوکا دے رہی ہے! یہ نزاعی ضمیر میرے بچپن ہی سے مجھ میں موجود ہے میں چوڑے سے کھیلتا تھا اور دل ہی دل میں اُن کی خوبصورتی سے محفوظ ہوتا تھا کہ میری ماں وہاں آگئی۔ میں اُس سے اُن خوبصورت کھلونوں کی تعریف کرنے ہی والا تھا کہ اُس نے کہا، ”دیکھا بیٹا، چوڑے کتنے اچھے ہیں!“

مجھے لگا کہ ماں نے میرا خیال چر لیا ہے۔ میں نے حقارت سے منہ بنا کر کہا، ”کہاں اچھے ہیں؟“ اُونھ، بالکل کندے ہیں!“ میں نے اُن سے کھیلتا چھوڑ دیا اور وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ میری ماں نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کا ندھے اُچکا کر رہ گئی۔ میرے ماہ و سال نے جہاں میرے ایسے رویے کو چرکایا وہاں مجھے اپنے اچھے اور بُرے خیال کی حفاظت کرنے کا فن بھی سکھایا۔ میں بلونت سنگھ رنجی سے متعارف ہوا تو میری یہ بالکل کیفیت اپنی انتہا پر تھی۔ وہ میرے تخیل، بوداں کا رہنے والا تھا اس لئے میں اُسے ماما جی کے لقب سے بلاتا تھا۔ ہوتے ہوتے اُس کی رسائی دکان سے گھر تک ہو گئی۔ ویسے وہ تھا عجیب آزاد مرد! وہ کوئی کام دھام نہ کرتا اور گھومتا پھرتا رہتا اور جہاں رات پڑتی وہیں کہیں ٹھور ٹھکانا ڈھونڈ لیتا، خواہ انجانے لوگوں کے بچ کیوں نہ ہو۔ اُس کی کھٹی ہانہ شانے کے قریب سے غائب تھی اور سبھے ہاتھ کی دو انگلیاں نابود۔ وہ اپنے ادھورے ہاتھ کو نفیس، رنگین اور ہلکے ہوئے رومال سے اس ہوشیاری سے دھانکتا کہ پورا لگتا۔ اُس کے پگڑی باندھنے پر کوئی پہننے اور ڈاڑھی موچھ سنوارنے کے سلیقے سے اُس پر نچا ہونے کا گمان نہ ہوتا۔ وہ کس قدر پابند و محتاط تھا!

سائچھ سویرے ٹھنڈے پانی سے آستان کرنا، گھنٹا آدھ گھنٹا پوجا پاٹھ میں گزارنا، بیٹھ کر موتنا، موت کر ہاتھ پاؤں دھونا، کھانستے کھنکارتے وقت منہ پر رومال رکھنا، بالوں کو ننگے ہاتھوں نہ چھونا اور چھوٹے بڑے سے نرنا سے ملنا اُس کی عادت کی نفاست تھی۔ اُس کے طور طریقے طہارت پروردہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے، جو مادہ پرستی تیاگ کر روحانی زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کا اندازِ تحاطب کس قدر دل ربا تھا۔ ماتاجی، جی ماتاجی، پتاجی، جی پتاجی، دیرجی، جی دیرجی، بہن جی، جی بہن جی، ہاں جی، جی ہاں اور جی جی کی موسیقی، نمک پر میٹھے اور میٹھے پر نمک کا سامرہ دیتی تھی۔ اپنے حسنِ بیاں سے ملتا وہ یہ شعر سنایا کرتا تھا۔



## گیان سنگ شاہ

نہیں سلونے ادھر مدھ کہہ رحیم بڑ کون؟  
میٹھا بھاوے لون پر اور میٹھے پر لون

بد مزہ سے بد مزہ مضمون اُس کی زبان سے کیف کے ساغر کی طرح چھلکتا۔ اُس کی زبان اُس کا  
پیشہ تھا۔ وہ حسبِ موقع اشعار سُنا تا اور اپنے انداز کو پُر اثر بناتا۔ دھار مک گرتھوں میں ایسے اشعار کی بھر مار  
ہے جو دو محبت کرنے والوں کی دوری و حضوری کی کہانی بڑے غم انگیز اور حسرت آمیز الفاظ میں کہتے ہیں۔  
بھگتوں اور سنتوں نے خود کو معشوق اور خدا کو اپنا روحانی عاشق تصور کیا ہے۔ اپنے اخلاقی رشتے کو یوں نبھایا،  
کہ بالکل آرضی لگتا ہے۔

آج نہ سنی کنت سیوں میرا انگ مڑے مڑ جائے  
جاؤ پیچھو ڈھاگنی ادھ کیوں کر رہیں بتائے

(میں آج اپنے کنت کے ساتھ نہ سو سکی، میرا ہر انگ دوسرے تڑپ رہا ہے۔ اُس  
ابھانگن کی کیا حالت ہوگی؟ جسے اپنے پتی کی سیج ہی میسر نہیں ہوتی۔)

وہ ان اشعار کے معنی بیان کرتا تو ان کے خالق کی جگہ اپنے قصود پر زور دیتا، جو بنتے بنتے سنتے  
والوں کی نفسیات بن جاتا اور لگتا وہ، انہیں کے دل کی بات کرتا ہے۔ جس کسی پر اُس کا جادو نہ چلتا اور وہ دہاں  
سے اٹھ کر جانا چاہتا، وہ اُس کی بے قراری بھانپ لیتا، بار بار اُسی سے مخاطب ہوتا اور اُسے روکے رکھتا۔  
باتوں باتوں میں بات کسی نازک مرحلے پر پہنچتی، وہ ادھ کھلی آنکھوں سے جھومتا اور اپنی بات سے رس لیتا جان  
پڑتا۔ اُس کا ماضی اُس کی خود ستائی کی کہانی تھی۔ وہ غدر پارٹی کا باہر اُسلو گن تھا۔ وہ ٹرین اڑانے کے لئے بم بنا رہا  
تھا کہ بم پھٹ گیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ وہ ایک پٹھان کی فوری اور وقتی مدد سے جانبر ہوا اور اُسی کے گھر میں مہینوں  
رُو پوش رہا۔ اُس کے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر سرکاری انعام تھا اس لئے وہ آزادی وطن کے بعد ہی گوشہ گناہی  
سے باہر آیا تھا۔ چوں کہ آزادی حاصل کرنا اُس کی زندگی کا اول دائرہ مقصد تھا اس لئے اُس نے سیاست سے کنارہ کشی  
اختیار کر لی تھی۔

وہ نوجوانوں کو جو کہانیاں سُنا تا تھا ان میں ایک 'پری زاد' ہوتی تھی جو اُس سے والہانہ عشق کرتی  
تھی لیکن وہ اُس کی محبت سے بے پروا نلک و قوم کی خدمت کرتا رہا تھا۔ اُس کے پاس ایک معصوم دوشیزہ  
کی تصویر تھی جو مہروں کے کھیت میں کھڑی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، تھی، لیکن اُس کی سادگی میں ایسی پُرکھلی تھی  
کہ اُسے بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ اُس تصویر کو ریشمی رومال میں یوں چھپاتا کہ وہ پردے  
میں ہو کر بے پردہ ہوتی، اس لئے خواہش مند کی کمزوری۔ جہاں تک اُس کے اپنے نقش و نگار تھے، عمر کے

لحاظ سے دیکھو تو تیز تلوار تھے۔ ماتھا، قدرتی طور پر کشادہ تھا۔ ہونٹ، چھدری مونچھوں میں سے صاف دکھائی دیتے اور کالی مونچھوں کے پس منظر میں لال لگتے۔ رخسار کی ہڈی اُوچی نہ تھی چوں کہ وہ رخسار پر سے بال اُکھاڑتا رہتا تھا اس لئے کال ابھرے ہوئے اور چکنے تھے۔ ناک کو چہرے سے الگ کر کے دیکھو تو خوبصورت نہ تھی لیکن اپنے نامہ وارس میں بیٹھی جیتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اپنی کہانی جھلسیاں ہڈیاں کے عنوان سے لکھ رہا تھا؛ وہ کیا لکھ رہا تھا اس نے کبھی سنایا نہ تھا لیکن اس کی کہانی کا عنوان نہایت دردناک اور خیال افزوں تھا۔ وہ ہمارے گھر آتا، یس جی جان سے اس کی خدمت سے کرتا اور وہ میرے معمولی سے معمولی کام کو کھل کر سراہتا۔ ویسا حسنِ نیک ہمارے گھر کا رواج نہ تھا اس لئے وہ مجھے اور بھی اچھا لگتا۔

پوس جوان تھا۔ سورج کی گرمی پر اسرار طریقے سے غائب ہوگئی تھی۔ وہ جھلٹے ہوئے الاؤ کے برعکس ٹھنڈا گولا سا نمودار ہوتا تھا۔ ہمالیہ آسمان کو چھو رہا تھا اور آسمان سردی کھائے اعضا کی طرح نیلا نیلا تھا۔ ہمالیہ کے پادوں میں شوالک کے پہاڑ، ٹیلے لگتے تھے۔ دور دور تک باڈلوں کا نشان نہ تھا۔ کہیں کوئی ٹکڑا تھا تو وہ رُوئی کا اڑتا ہوا کالا لگتا تھا۔ شبنم کے موتی دھندلے آئینوں کے سے غیر دلچسپ اور بے رغبت تھے۔ اپنی خرازت بحال رکھنے کے لئے رگیں، سائس کی پوری گرمی نچوڑ لیتیں اور وہ بیچاری منہ میں جمتی جمتی جانے کیسے نہ جمی؛ اور بالکل کپڑے کی طرح خارج ہوتی، کھلی ہوا، متردفا سے ڈرتی بندکروں کی تلاش میں رہتی اور جہاں کہیں راہ پاتی، اندر گھسیتی اور گرم گوشوں میں چھپ جاتی۔ اُجالے پر جھٹ پٹے اور اندھیرے پر گہرے اندھیرے کا گمان ہوتا۔ ہر چیز مائل بر زوال تھی لیکن ہاں! چاند ستاروں کا وجود آئینہ دار آفرینش تھا۔ ذی روح تو ذی روح تھے، غیر جاندار ڈرے ڈرے سے رہتے۔ تالاب کا پانی ہرے بورے کے پیچھے سرچھپائے سویا رہتا۔ مویشی ادھر منہ نہ کرتے جیسے دونوں کسی خاموش معاہدے کا لحاظ کرتے ہوں۔ شام و سحر اپنے انداز میں دیران تھے۔ پرندے بڑن چڑھے چھپاتے اور دِن ڈھلے چپ سادہ لیتے۔ دھرتی، سبزے کو سردی سے بچانے لگی تھی لیکن شاخوں کی ممتا دیدنی تھی! قہ نازک کوپلوں کو اپنے ریشوں میں ایسے چھپائے تھیں جیسے بیج، انکُور کو۔

گرمیوں میں میرا ننھا، ٹٹوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اب وہ جاڑے کا مارا اُن کی انغوش ہی سے نہ نکلتا۔ بھٹی کے اطراف بخوم کی گرم باتیں، ہڈیوں کی خرازت قائم رکھنے کے لئے ناکافی تھیں۔ ہم کیلیوں میں سے گھاس پھوس اکٹھا کرتے، الاؤ جلاتے اور داؤ لگتا تو اپنی ضرورت کے لئے یلینوں سے بچتی (کھوئی) چڑا لاتے۔ ہم آگ تاپتے ہوئے کاپیتے اور رُوئی رُوئی کی کہادت دہراتے، چڑھیا پوہ، بچن کے اوہ، جیہڑے سون کے دود پوس شُرُوع ہو گیا ہے، اس کی سردی کی سختی سے دُہی بچ سکیں گے جو جوڑا، جوڑا سوئیں گے،

میں الاؤ تاپ رہا تھا، آسمان کی دائمی ممانت گیتی پر اثر انداز تھی اور چاند ستاروں کی دل آرام بخشی

انسانی رفاقت کی غماز تھی۔ سکوتِ شب میں حُسنِ نشوونما کی تحریک تھی اور اُس کی تاریکی، زندگی میں مُضمر حقیقت کا مظہر۔ درو دیوار لبِ راز آشنا بنے ہوئے تھے۔ دل میں آغازِ سفر کی سی بے قراری تھی اور نظر، شوقِ منزلِ بنی ہوئی تھی۔ پیپل کا درخت ایسے کھڑا تھا جیسے کوئی مجُوب، مجُوبہ کے انتظار میں ہو۔ راستہ چند قدم تک دکھائی دیتا تھا گویا کسی کے قدم لینے کے لئے حدِ نظر سے آگے دُور نکل گیا تھا۔ میں وہی حیاتِ آفریں ضربِ المثل دہراتا اور اپنی دُنیا سے مُراد کا نظارہ کرتا ہوا، آگ پر ہاتھ تاپ تاپ کر ستروں کو سہلاتا۔ وہ ایسے تھے ہوئے تھے جیسے پھٹا پھوٹنے سے ذرا پہلے بیج۔ اچانک پیپل کا پیڑ ہلا جیسے کسی کو جگ دینے کے لئے پیچھے ہٹا ہو۔ راستہ پلٹ آیا اور اپنے ساتھ زخمی کو لایا۔ میں بے ساختہ اٹھا اور ماجی کہہ کر اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے مجھے گلے لگایا اور میری آنکھوں میں جھانک کر کہا، ”آپ بڑے ہو گئے ہیں، مجھے میرے نام سے بلایا کرو!“

اُس کا بے تکلف انداز مجھے پسند آیا، خاص کر میرے لئے کُل اور اپنے لئے واحد کی تعبیر بھائیاجی بتوال میں ٹال پر رہتے تھے اور درشن سنگھ ہریانہ میں۔ درشن سنگھ کی بیکاری کا عمل نکالنے کے لئے اجیت سنگھ یوت مال، مہاراشٹرہ میں چلا گیا تھا اور درشن سنگھ نے سائیکلوں کی دُکان کے ساتھ ٹائپنگ انسٹی ٹیوٹ کھول لیا تھا۔ گھر میں میری حیثیت بڑے کی سی تھی۔ میں نے زخمی کا بستر اپنے کمرے میں لگایا۔ اُس نے آشنان کیا، کھانا کھایا اور جیسا کہ اُس کا معمول تھا، آنکھیں نیم در کر کے مُنہ ہی مُنہ میں پاٹھ کرنے لگا۔ اتنے میں ماں دروازے پر آئی اور کہنے لگی، ”مجھے لالٹین چلانیے، پشتو اندر باندھنے ہیں۔ میں نے کچھ کہے بغیر کھوٹی پر سے لالٹین اتاری اور لے جا کر اُس کے حوالے کر دی اور اُس سے چراغ لے کر میز پر رکھ دیا۔ میں رزائی میں گھسنے لگا۔ میں نے کمرے کے ماحول میں واضح فرق محسوس کیا، زخمی بول بول کر پاٹھ کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے باہری ماحول سے بے خبر تھا جیسے روحانی استرازیں ہو۔ میں نے بستر پر لیٹ کر رزائی کو اپنے گرد لپیٹ لیا اور ٹھنڈی ہوا کو بھینچ کر باہر نکال دیا جو میرے اُٹھنے سے اندر گھس آئی تھی۔ میں نے سر ڈھانک کر بڑی احتیاط سے چہرہ ٹھوڑی تک ننگا کیا اور زخمی کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر وہی سنجیدگی تھی جو ہمیشہ رہتی تھی لیکن تھوڑی دیر پہلے کسی وجہ سے اُلپ ہو گئی تھی۔ میں بے سرو پا سوچتا ہوا وقت کا ٹپٹ لگا اور بے ارادہ اُس کے معمول سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اُس حالت میں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اندھیرا بڑھنے لگا۔ میں نے چراغ کو دیکھا، بتی کا گُل بڑھا ہوا تھا اور شعلہ پیلا ہو رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر چراغ اٹھا کر دیکھا، قبتیلہ چھوٹا تھا۔ اُس کا آخری سرا بڑی مشکل سے تیل کو چھوٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں جاؤں، ماں کے کمرے سے تیل کی بوتل لاؤں اور چراغ کو مُنہ تک بھر دوں۔

میں دو دلی سے لڑتا ہوا اٹھا، باہر گیا اور ماں کے کمرے میں جھانکا، وہ لالٹین بڑی کر کے سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا، لوٹ آیا اور دروازہ جھینر کر اسے اندر سے بند کر دیا۔ اتنے میں مجھے میری مشکل کا دوسرا حل مل گیا۔ میں نے چراغ کو کاپی کی مدد سے تلوٹس دیا اور گل جھاڑ دیا جس سے وہ پہلے کی سی اب قباب سے جھلنے لگا۔ میں نے زرائی میں گھس کر زخمی کو دیکھا، وہ پاٹھ ختم کر کے مسکار رہا تھا۔ مسکارنے کا کوئی موقع محل نہ تھا لیکن میں اخلاقاً جواباً مسکرایا۔ اس نے وارفتہ سا ہو کر دروازے کی جانب دیکھا اور اپنے بستر پر سے اٹھ کر میرے بستر پر بیٹھ گیا۔ میری خود رفتگی! میں کچھ ادھر سرک گیا اور اسے زرائی میں لے لیا۔ میرا حال چال پوچھتے ہوئے، اس نے مجھے کپچھے کے اوپر سے چھو آجیسے اس کا ہاتھ جھٹک گیا ہو۔ مقامی گرمی کی لہر اٹھی اور سنسناتی ہوئی رگوں میں دوڑ گئی۔ اس نے اسی انداز سے مجھے دوبارہ چھو آ اور یوں پکڑا کہ جلنے نہ دیا۔ پھر تو میں خود اس کے ساتھ ہویا۔ کچھ نئے راستے کی تلاش، کچھ تلاش کی بے قراری، کچھ بے قراری کی تندی اور کچھ تندی کی سرستی، ہوا کا جھونکا آیا، چراغ کی کاپی ہوئی روشنی بجھنے لگی اور بجھتے بجھتے بجھ ہی گئی۔ لیکن اس سے فرق نہ پڑا! میری رگوں میں ایک کونڈا لپکا، اس نے مجھے وہ چمکارا دکھایا جس کا نور عارضی ہو کر بھی دائمی تھا۔

وہ سحر میری زندگی کی زرائی سحر تھی اور نور آفتاب کے بجائے جمال روح میں نہائی ہوئی تھی۔ اس سحر کا آفتاب پردہ افق کے برعکس میرے لہو سے طلوع ہوا تھا جو میری رگوں میں صدیوں اور صدیوں سے موجزن تھا۔ مجبوری کی بے سروپائی سے مختاری کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسے کتنی طویل اور کیسی کڑی مسافت طے کرنی پڑی تھی۔ اپنی گردشِ آفراس کی تکمیل کے لئے وہ کیسے کیسے حادثوں سے جانبر ہوا تھا! ان فیروں سے گزرا تھا! بیک وقت پوشیدہ و ہیدار ہا تھا۔ اس کا منکشف ہونا اس آغاز حیات کی تجدید تھی جو آدم کی تخم ریزی سے شروع ہوئی تھی، میرے بھائیاجی کی وساطت سے مجھ تک پہنچی تھی اور نئی تحریک کی مڑکب بنی تھی۔

قاریب! میں ایک نئے طریقے سے اپنے بھائیاجی کا مقروض ہوں۔

میرا انتہا، میرے ساتھ میرے ہاتھوں میں جوان ہوا تھا۔ میں نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی اپنے خواب کو پورا ہوتے ہوئے دیکھے۔ میری محویت میں لگتا کہ وہ دنیا کی سب سے دل فریب شے ہے۔ وہ مجروح ہوا، جھٹھے لگا کہ اس کا زخم، زخمِ درخون ہے، خون کی لذت ہے جسے میں نے رگوں کی زباناں سے چکھا ہے۔ میرے جسم میں لہو کی لذت منڈلانے لگی، جس کی پزیرائی سردی کے الاؤ کے تاپ کی سی تھی۔

اُس تاپ کا تپاک مسلسل تھا، جس سے میرے اعضاء روشن ہو گئے۔ میں، اُن کے اندر دیکھتا اور وجد کرتا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ وہ وہند میرے لہو کا انہی راز تھا لیکن میں نے اُسے اتفاقاً پایا تھا۔ لہو دیکھنے میں کچھ اور تھا لیکن اصل میں کچھ اور۔ چوں کہ اُس کی تقدیر ناقابلِ تفسیر ہے، میں اُسے ماورائے ادرک سے تعبیر کرتا ہوں۔ وہ گھڑی وقتی تھی لیکن اُس کی رفاقت دائمی۔ اُس کی پہچان سے میں اُس جذبے سے روشناس ہوا تھا جو تحریکِ خود نمائی و خود سازی ہے۔ مجھ پر انوکھی جبلت آشکار ہوئی تھی! اتلاوب ذات میں اقرار ذات کی شان ادا۔

جنگد یو سنگھ لڑائی کے میدان میں یکے تاز تھا اور ویسا ہی اُس کا تجزیہ۔ وہ اپنے زخموں کو فخر سے دیکھتا ہوا کہتا، لڑائی جیتنے کے لئے میرا لڑائی میں زخمی ہونا لازمی ہے!

لیکن میرے زخم کی داستانِ رنگ و بو میرے زخم ہی کی طرح زالی تھی۔ میں موشی چرانے جاتا، یکیک کی پھل اُتار کر ٹھیکے میں اُباتا اور زخم کو نیم گرم رس سے دھوتا۔ اُس کی جلن، سستی تھی جس کی عشرتِ آفریزی کا نشہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ میں زخم کو کھجلاتا اور اُس کے درد میں لذت محسوس کرتا۔ کھجلانا اور سہلانا ترغیب انگیز اعمال ہیں اس لئے دونوں اپنا تسلسل چاہتے ہیں۔ زخم بھرا تو مجھے سہلانے کا لپکا پڑ گیا۔ یہ بری عادت، ہوس پرستوں کی دل آویزی ہے جسے وہ خاموش بندگی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اپنے ننھے گوشکِ زیر پر ہوتے دیکھ کر میں مسرور ہو جاتا۔ اس مصدرِ سستی کا خیال، حالیا قی مسرت کی حقیقت اور لمس، حمدِ ظاہر کی لذت تھی۔ میں اسے خود سے جدا کر کے دور سے دیکھنا چاہتا۔ اُس فن کار کی طرح جو اپنے فن پارے کو تراشتا ہے تو کبھی اُسے قریب سے، کبھی دور سے، کبھی اس پہلو سے، کبھی اُس پہلو سے دیکھتا ہے، اُس کے نقش و نگار سنوارتا ہے جو اُسے ہر بار پہلے سے زیادہ رواں اور نمایاں لگتے ہیں۔ اُس کا ہر جتن اور ہر تعین ایک پرتخیل شاہکار کو عملی صورت میں دیکھتا ہے اور اُسے زندہ جاوید بناتا ہے۔ میرا ننھا کتنا بچل تھا! کتنا مکمل تھا! چاہت کی زبان تھا، لذت کی جان تھا، رعنائی خیال تھا، حُسن کی مثال تھا، فطری طور پر تہذیبِ نفس کا مبصر تھا لیکن خود ستائی کے لمحوں میں عیشِ دوست تھا۔ اُس سے میرے رشتے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ وہ میرے لئے آندھے کے سہارے کی طرح تھا جس کے بغیر وہ اپنا ج محسوس کرتا ہے۔

میں اپنی زندگی پر سرسری نظر دوڑاتا اور کبھی سنجیدگی سے غور کرتا۔ مجھے کوئی لمحہ ایسا یاد نہ آتا جب کسی نے مجھے میری اس جاں سناں ضرورت اور جاں افزا جبلت کے بارے میں کچھ بتایا ہو۔ میں تیاگ اور ہنسپنیا کے متعلق جتنی باتیں سُن چکا تھا اُن کا ازدواجی اور عملی زندگی سے کوئی سمبندھ نہ تھا۔ وہی

فُضول باتیں کھلے عام بحث کا موضوع رہتی تھیں۔ اور عین حیات بتائی جاتی تھیں۔ نفسانی جبلت جسمانی و روحانی وصال کا وسیلہ ہے لیکن اُسے سنگِ حیات سمجھا جاتا تھا۔ میں اخلاقی قدروں پر وچار کرتا ہوا یہ نہ سمجھ سکتا کہ قواعد و ضوابط کے موجدوں نے انسانی طبیعت کی جس خوبی کو خرابی قرار دیا وہ ان کی بھی صفت رہی تھی پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ آدمی کی سچائی الٹی سیدھی سچائی ہے! یہ جس فصل میں خوش رہتا ہے، دوسرے کو اُسی سے روکتا ہے تاکہ اس کی انفرادیت برقرار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے سرور پر بڑوں کی بڑائی کے خنجر لہراتے ہیں نہ کہ تربیت کے سائے۔ بچوں کو بچوں کی فطرت، بڑوں سے تحقیق طلب ہوتی ہے اور اپنی سرگرمی میں انہیں کسی کی اعانت نہیں ملتی ہے، وہ اپنے اضطراب میں بھٹک جاتے ہیں اور مطلوب مقام پر پہنچتے ہیں لیکن ٹیڑھے میڑھے راستوں سے، آندھیرے اُجالے تجربوں سے۔

نفس پرتی اتنی ہی پُرانی جبلت ہے جتنی کہ حیات آدم۔ میں اپنے قارئین سے ایک غیر متوقع سوال پوچھتا ہوں۔ آپ کے ماں باپ نے آپ کو اس جبلت کے بارے میں کبھی کچھ بتایا ہے؟ میرا یقین ہے کہ آپ میری ہی طرح اپنے والدین کی بے توجہی کا شکار رہے ہیں! یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم، ان کے اس قدر قریب ہو کر کس قدر دُور تھے! جنسی ضرورت کے لحاظ سے وہ ہیں بیچ سمجھتے تھے جب کہ ہم ہمہ تن سرگرم تھے۔ ہم ان کی ریاکاری کا یرغمال تھے جس کی تلاشی ریاکاری تھی۔

قارئین! نفس پرستی، حسنِ قوت و ادراک ہے۔ یہ شائستہ ماحول میں پروان چڑھے تو انسان کی نرم و نازک اور غیر معمولی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے اور انہیں وصف و ثنا کے مرتبے تک پہنچاتی ہے ورنہ اپنی ہی لغت بن کر رہ جاتی ہے۔

میں کلاس میں بیٹھا اپنے ننھے سے کھیل رہا تھا کہ رکھیر چند نے مجھ سے سوال پوچھا۔ میں اپنی دُھن میں سُن نہ سکا اور اُس نے مجھے کھڑا ہونے کا حکم دے دیا۔ ترلوچن سنگھ میرا ہم نشین تھا، اُس نے میرے کہنی ماری لیکن مجھے سنبھلنے اور اُٹھنے میں دیر ہو گئی۔ رکھیر چند نے غصے سے پوچھا، "تو کیا کر رہا ہے؟"

ترلوچن بڑبڑاتا تھا، اُس نے سر کھجھلاتے ہوئے کہا، "جناب، منکا پھیر رہا ہے۔"

وہاں کون تھا جو منکا پھیرنے کے معنی نہیں سمجھتا تھا! کلاس رُوم، تہقہہ زار میں بدل گیا۔ رکھیر چند نوجوان استاد تھا اور خوش مزاج بھی، وہ خود ہنسنے لگا اور پھر لوگوں کو مہسوعی غصے سے ڈانٹ کر چپ کر دیا۔

بچہ دانتوں پر اُٹے تو اُسے دستوں کا روگ لگ جاتا ہے اور سن بلوغ کو پہنچے تو تاک جھانک کا روگ لگوا لیتا ہے۔ پہلا روگ طبعی ہے اور دوسرا اکتسابی، پہلی صورت میں اُس کی حالت ترقم آمیز ہے اور

دوسری صورت میں قابلِ مذمت، جس کا میں کئی بار مُرتکب ہوا ہوں۔

کیسر سنگھ آدریں، رویش کے رہٹ پر بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ کوئی آدھیر عمر کی گھسیارن پانی پینے آئی۔ کیسر نے مجھے اُکسایا آدریں نے اُسے اُنکھ مار کر کہا، کیا حال ہے؟  
وہ خلافِ اُمید تن کر کھڑی ہو گئی اور مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولی، تیرے منہ سے دودھ ٹپکتا ہے اور میرا حال پوچھ رہا ہے تو؟

”اور کس کا پوچھوں؟ میں اپنی ندامت اور دہشت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”اپنی ماں کا! اپنی بہن کا! دیسے کوئی نہ کوئی اُن کا حال پوچھ ہی رہا ہوگا، اسی طرح!“  
اُس نے میری ماں اور بہن کا ذکر کیا تو میں غصے سے پھر گیا لیکن اُس کی پوری بات سن کر کانپ گیا اور شرمندہ ہو کر بے زبان سا اُس کا منہ سکے لگا۔ بات وہیں ختم نہ ہوئی، اُس نے مجھ پر ٹھوک کر کہا، کل تو جسے بیاہ کر لائے گا، وہ کسی کی چوسی اور چوڑی ہوئی ہوگی۔ لیکن تجھے کیا فرق پڑے گا؟ تو خود گندگی کا کیرا ہے“  
اُس نے مجھ سے جو کہا وہ تو بہن امیز سے زیادہ شرم خیز تھا۔ میرا وہی جذبہ جسے میں مسرت کا دھارا سمجھا تھا، ندامت کی بدروبن گیا۔ اس وقت میں اُس اجنبی گھسیارن کے پاکیزہ جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ میری نفسیات واقعی گندگی کے کیرے کی سی تھی لیکن مجھے احساس نہ تھا۔

میرے اطراف ایسے لوگوں کا انبوہ تھا جو اپنے نفسانی رویوں کے مظاہرے جن شرمناک طریقوں سے کرتے تھے وہ سب منافیِ اخلاق ہیں۔ میں اُن سب کی تفصیل میں نہ جاؤں گا اور اپنے بیان کو اپنے دو ایک دوستوں تک محدود رکھوں گا۔ کیسر سنگھ اس معاملے میں بے شرمی کی حد تک بدکار تھا۔ عورتوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اُس نے اپنے جوتے میں جیبھ ڈلوا رکھی تھی کسی کا حال پوچھنا اُس کے لئے کھیل تھا تھا۔ اُس نے ایک راہ گیر عورت کو ٹولا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور اُسے گالی دے کر بولی، ”دودھے، تیری ماں نے تجھے بتایا نہیں کہ باجرے کے ٹکڑے کے ساتھ سالن پتلا ہو تو کھانے میں بد مزہ ہوتا ہے؟“ وہ کسی ایسی لڑکی کو دیکھ کر عجیب اٹھتا اور اُس کے پیچھے ہی پڑ جاتا۔ وہ کئی بار پست پست بچا تھا۔ کچھ مہترانیاں جنگلی میں بالن اور آنے اوپلے چگ رہی تھیں۔ اُس نے انہیں رائے دی۔ ”زمانہ خراب ہے، گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنے مردوں کو ساتھ لایا کرو۔“

وہ سب کی سب اُس پر برس پڑیں۔ اُن میں سے ایک پٹاخ سی نے بھریاں چھوڑ رکھی تھیں۔ وہ چوندا ہلاتے ہوئے، ٹھٹھک سے آگے بڑھی اور منٹک کر بولی، ”بھیا! تو کیوں گھبراتا ہے؟ ہمارے مرد جانتے ہیں کہ ناگ پھنیوں کو باڑ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود دوسروں کی بار ہوتی ہیں۔“

رومیش کا گیان کور سے یارا نہ تھا جو ایک شادی شدہ عورت تھی۔ رومیش کی نفسیات نرالی تھی وہ بیباہی عورتوں ہی کا پیچھا کرتا تھا اور کہتا تھا، ”کنواری کی دوستی کوئی دوستی ہے! کبھی اس کا ڈر، کبھی اُس کا ڈر! بیباہی کا مزہ ہی آور ہے۔ یہ رقیب کی طرح کھلاڑی ہوتی ہے اور جذباتی بھی۔ کنواری، اناڑی ہوتی ہے، اس لئے ٹھنڈی ہوتی ہے۔“

پنجابی کا یہ شعر وہ کس مزے سے گایا کرتا تھا۔

یو بارہ، چھڑے دے پیت اٹھا رہ !

باپو اک نہ کہے

دکنواری کی پانچوں گھی میں ہیں۔ اس کے اٹھا رہ بیٹے میں لیکن

کوئی بھی اسے باپ نہیں کہتا۔

گیان کور اپنے خاندان کی موجودگی میں رومیش سے جیسے ملتی تھی وہ اُسی کا دل گرہ تھا۔ وہ رومیش پر جان چھڑکتی تھی لیکن اُس کا دل اُس سے بھر جیسا تھا۔ وہ اُس سے پیچھا چھڑوانا چاہتا تھا۔ رومیش نے اُسے مجھ سے ملوانا چاہا، اُس نے اُس کا منہ نوچ لیا اور جتایا، تو نے پھر ایسی بات کی تو مجھے زہر دے دوں گی اور خود زہر کھاؤں گی۔“ میں نے اُس کی دغا داری کو سراہا، رومیش نے اُنکے جوئے لہجے میں کہا، ”مرد کا مزاج بھونرے جیسا ہے! یہ ایک دو پھول پر کیسے گزر بسر کر سکتا ہے، بھونرے کو بھری بہار چاہیے! بھونرے کو بھری بہار کیوں چاہیے؟ یہ تو بھونر ہی بنا سکتا ہے۔ ہاں وہاں لڑکے، لڑکیوں کا پیچھا ایسے کرتے تھے جیسے مدھو مالکیاں، مدھو بھرے پھولوں کا۔“

اُس کی بات سن کر میں حسد سے ستر کھلاتا لیکن وہاں کون تھا جو ایسا نہ کرتا تھا۔ جو لوگ شادی شدہ اور بال بچوں والے تھے، وہ بھی دوسری عورتوں کے بارے میں مزے مزے کی باتیں کرتے تھے اور آزاد نفسانی عمل چاہتے تھے جیسے ازدواجی رشتے ناگوار بندھن ہوں۔ کئی تو شادی کو خوشی کا مدفن کہتے تھے۔ لیکن انسانی فطرت کی رسم ظریفی! لوگ جیسی باتیں دوسری عورتوں کے بارے میں جازر سمجھتے تھے اپنی عورتوں کے بارے میں ناجاز۔ جہاں تک میرا سوال ہے، میں کیسر سنگھ جتنا بے باک تھا اور نہ رومیش کا سا خوش نصیب، دل پھینک ضرور تھا اور خود کو ہاتھ میں لئے گھومتا تھا۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ میں خود کو ٹھکانے نہ لگا سکتا تھا۔ میرا جنسی تجربہ لذت بے تسکین کی طرح میرے حواس پر چھا گیا۔ جسم کا وہ حصہ جس کا نام ننگا اور گندا مانا جاتا ہے مجھے دیر نہ لگتا۔ کیوں لگتا؟ روایتیں اور کہائیں اُسے مقدس بتاتی ہیں اور اُسے، نوع انساں کو بھگوان کا ہدیہ جتاتی ہیں۔ اس کا ثبوت سٹوالے میں جہاں شوٹنگ کی پوجا ہوتی ہے۔ میں اُن گیتوں کے معنی راست جہت میں



تعبیر کرتا، جنہیں بدکاری، بد چلنی اور بد فعلی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک دونوں نے پیش کردہ لیکن میری ریاکاری اجازت نہیں دیتی ہے۔ میرا محتاط رویہ اس حقیقت کی ضمانت ہے کہ عفری آدمی کتنا ہی پر خلوص ہو، ابتدائی دور کے بشر کا ہم سر نہ ہو گا۔ ہو بھی نہیں سکتا قارئین! ہر تہذیب و تمدن اپنے شہریوں سے الگ قسم کا تقاضا رکھتے ہیں! میں نے ناگاؤں کو لباسیوں پر ہنستے دیکھا ہے۔

میرے نقش و نگار پہلے سے زیادہ فروزاں اور عریاں لگتے۔ میں نے دیکھا کہ میری میں بھیگ ہی ہیں اور کالوں پر زویم پھوٹ اُٹے ہیں۔ اُن میں وہ دل کشی تھی جو کچے پھل پر اُگے ٹائم بالوں میں ہوتی ہے۔ میں چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہوا محسوس کرتا کہ میرے اندر ایک اور آدمی ہے جو میری فریب کاری کی پردہ دری چاہتا ہے۔ میری خوشبو سے متنا، ہوا سے متنا میں بدل گئی۔ میرا جذبہ، شوقِ نظر سے بڑھ کر حُسنِ لذت سے جاما۔ میں نے بے مضبوطی کے گداز اور نفس پرستی کے انداز سیکھ لئے۔ میں ایک ہو کر دو حصوں میں بٹ گیا۔ میرا دوسرا حصہ مختصر رہی، اُس کی روحانی پرواز آسمان گیر تھی۔ وہ مجھ پر میرے شہریوں کی طرح مشکف ہوا تھا جس کی بدولت میں نے آسمانوں میں اُڑ رہا تھا۔ میں نے جس کائنات کو پایا تھا اُس کی مزید تلاش کے لئے میں پریشانی کی حد تک بے قرار تھا۔ میرا تخیل! مجھے ہر طرف اٹھلائی اور مسکراتی ننگی گنوا ریاں نظر آئیں۔ میرے سوتے ہی اُن میں سے کوئی ہنسی کھیلتی مجھ سے لپٹ جاتی اور میں، اُس کے بدن کی گرمی میں گھل کر بہ نکلتا۔ میں بیدار ہو جاتا اور خود کو اکیلا پا کر تیراں ہوتا لیکن لذتِ آشنا دل اس حقیقت کو جھٹلاتا کیوں کہ وہ اُنس خوشبو میں رسا ہوتا جو اُڑتی ہوئی مستی تھی۔ میں بڑے گھونٹ کی طرح گہری سانس لیتا اور اُس خوشبو کو رگوں میں اُتاتا، جن سے وہ فرار ہوتی تھی۔ میں چاہتا کہ روحانی خلوت کی وہ فضا قائم رہے اور وہ ظلم نہ ٹوٹے جو میرے اندر اور باہر مؤثر ہوتا۔ میرا ہر خیال، وصل کا خیال ہوتا اور ہر احساس عورت کا احساس۔ اور یہ عین تقاضا ضرورتِ فطرت تھا۔ میں پھر سونے کی کوشش کرتا لیکن گیلے کاچھے پینڈ نہ آتی۔ کوئی میرے کمرے میں ہوتا تو کاچھا بڈلا مشکل ہو جاتا۔ میں آہستہ، نرم روی سے سائے کی طرح آہٹ کے بغیر کمرے سے باہر نکلتا اور غسل خانے میں جا کر کاچھا بڈلا۔ میرا احساس گناہ! مجھے لگتا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ کھولتے اور بند کرتے وقت دروازہ آواز کرتا تھا، میں نے اسے تیل دے کر خاموش کر دیا لیکن وہ احساسِ جوں کا توں رہا۔ میں خواب گاہ میں اکیلا سونا پسند کرتا جو کبھی ممکن ہوتا اور کبھی نہ ہوتا۔ کئی بار بدلا ہوا کاچھا بھی گیلہ ہو جاتا۔ میرے پاس صرف دو ہی کاچھے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مجھے سکول جاتے ہوئے غلیظ کاچھا ہی پہننا پڑتا۔ میں خواہش کرتا کہ میرے پاس کئی کاچھے ہوں۔ ایک بار میں ایسے ہی کاچھا بدلنے کے لئے غسل خانے میں گیا اور وہاں درشن سنگھ کو کاچھا بدلتے پایا۔ ہم دونوں ایسے جینیب گئے جیسے ایک چور دوسرے چور کو چوری کرتے دیکھ لے۔ میری ہر سانس، ہزار داستان تھی اور ہزار حقیقت بھی۔

میں اپنی حقیقت کے آئینے میں جس کسی کی حقیقت دیکھتا، وہی مجھے شہوت کا شعلہ نظر آتا جیسے وہ، زندگی کا مرکزہ ہو اور اپنے طور پر خود پرور و خود مختار۔ میری طبیعتِ حرارت بڑھ گئی اور رگوں کی نفسیات بدل گئی۔ میں اپنے جذبے کو اُس کی گہرائی تک سمجھنے کی سعی کرتا جو میری ہی دھن کا حاصل ہوتا۔ درختوں کے جھومنے کی آوازیں مجھے کنواریوں کی چہلیں لگتیں اور گندم کے خوشے، حسیں کی لہرائی، بن لکھائی چوٹیاں۔ میں چھوٹوں کو دیکھتا، مجھے لگتا کہ کوئی آن میں چھپا ہوا میرا منظر ہے۔ میں سوچتا اور یہی سوچتا کہ مباحثت میرا پیدائشی حق ہے۔ میرے لوگ گیت نبی گہرائی و گہرائی سے متعارف ہوئے۔ میری نظریں دروں میں ہو گئیں اور لڑکیاں مجھے ننھی دکھائی دینے لگیں۔ میں کسی لڑکی کے پاس سے گزرتا، دل دھک دھک دھڑکتا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ میری نبض سرپیٹ بھاگتی اور خون کی بڑھتی ہوئی گرمی کی خبر دیتی۔ میں کسی لڑکی سے بات کرتا تو اپنی ہجانی مسرت میں مسکراہٹ کو روک نہ سکتا اور مدعا بھولنے لگتا۔ میرے آدھے ادھورے جملے بظاہر کچھ آدھے کہتے لیکن اندرونی طور پر کچھ اور۔ میں نے ایسی زبان سیکھ لی جس کے اسلوبِ بیاں کے لئے کنایوں اور اشاروں کی ضرورت ہے۔ میں ایسے الفاظ یاد کرتا جو میرے لئے مفید مطلب ہوتے۔ میں اپنے خیالوں میں لڑکیوں کو چومتا، چانتا اور اندر ہی اندر رُس میں ڈوبتا۔ میں کیا بدلا، ہر چیز بدل گئی! میں وہاں جا بسا جہاں زمین و آسمان عجیبوس و کنار ہیں اور ستارے اور مہینوں کی زینت بن کر چاند سے چہروں کا روپ نکھارتے ہیں۔ میرے کمرے میں سوہنی مہینوال کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ سوہنی کا آفاقی حسن، نفسانی پاکیزگی کا آئینہ دار ہے اس لئے باعثِ پرستش ہے لیکن اُسے دیکھ کر مجھ میں وہ جذبہ نہ ابھرتا جو روایت و حکایت ہے۔

میں یہاں ایک اعتراف کرتا ہوں اور اپنی صحیح اصلیت پر سے پوری طرح نقاب اٹھاتا ہوں تاکہ میرے دوست قارئین، میرے ماس اور ہڈیوں میں چھپے اُس ریاکار کو دیکھ سکیں جس کی نابکاری، میری مسئل پریشانی رہی ہے۔ زندگی کی وہ بد صورتی، جس کی حقیقت مجھے نامعلوم تھی اور میں اُس سے نفرت کرتا تھا، اپنے اسی گھناؤنے پن کے ساتھ مجھ پر اپنی اصلیت میں آشکار ہوئی لیکن میری پسند بن گئی۔

## باب ۳۳

دیکھتے چہرے جہاں پر دھنک ہو سینوں کی  
وہیں پہ ڈالو پڑاؤ بہار کے دن میں

(شاہ)

میں خوش ہوں! اس لئے خوش ہوں کہ میرا خیال فلک ہیما عنابر کی قید سے آزاد ہے میرا من تصورِ خاکِ حیات میں وہ رنگ بھر رہا ہے جو اپنی نظیر آپ ہیں۔ میں فطرت کی انجنِ آفرین کا قائل ہوں لیکن جو چیز مجھ پر گراں گزرتی ہے وہ ہے میرا جمودِ حیات۔ میں خوش رہنے کے لئے خیالِ ایجاد کرتا ہوں۔ زندگی کیکر کا پیڑ ہے لیکن اس پر جھکوں جیسے سنہری پھول لگتے ہیں جنہیں گاؤں کی گوریاں کان اور ناک میں بجا کر اتراتی ہیں۔

انسانی زندگی کے بارے میں تایاجی کا ایک انتہائی معقول اور عمدہ خیال ہے ”انسانی زندگی وہ انوکھا پیڑ ہے جس کے پھول پھل، کام کاج ہیں۔“  
میں ان پھولوں پھلوں کو کیسے کیسے چٹتا ہوں! میں ڈانگر پرتا ہوں اور ہری نرم گھاس توڑ کر کھچھڑ کو کھلاتا ہوں بچوں کو اُس کا دودھ نہیں بڑھایا ہے، وہ گھاس کھانے سے پرہیز کرتا ہے اور گھاس اُگل دیتا ہے۔ میں اُس کی باچھیں پکڑ کر منہ کھولتا ہوں اور گھاس اُس کے منہ کے اندر تک گھساتا ہوں۔ وہ گردن جھٹک جھٹک کر منہ ہلاتا ہے جیسے اُس کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو۔ میری ایسی حالت اُس وقت ہوتی ہے جب میں بے دلی سے کام کرتا ہوں۔ میں دل سے کام کرتا ہوں تو میری ترنگ دیدنی ہوتی ہے! میں کام کے ساتھ بولیوں سے لطف اٹھاتا ہوں۔ بولیاں، پنجاب کی آدھ بڑی کوتیا کلا ہیں۔ ان کے بغیر پنجابی ماحول کا تصور ایسے ہے جیسے سر کے بن سنگیت۔ میری مادری زبان مجھ پر کسی قدر مسلط ہے! میں پنجابی میں سوچتا ہوں اور اردو میں لکھتا ہوں۔ آپ جو پڑھ رہے ہیں وہ میرے اصلی خیال کا عکس ثانی ہے۔ میں ڈھیلے اکٹھے کرتا ہوں، ڈاچھے پر چڑھتا ہوں اور توتے اُڑانے کے لئے گوپیا بھرتا ہوں۔ یہ میرا نیا گوپیا ہے اور میرے پہلے گوپے سے زیادہ حسین اور کارآمد۔ تایاجی نے اسے سن کی ایک ہی باریک رستی سے بنایا ہے اور میرے کہنے پر پدا بڑا رکھا ہے۔ میں گوپیا چڑھاتا ہوں اور شور بھی مچاتا ہوں۔ پڑندوں میں سے تو تا سب سے بد ذات اور کسان دشمن پڑندہ ہے۔ حیرت ہے کہ اسے پلنے کے لئے پکڑتے ہیں اور کسان دوست پڑندے جیسے تلیر، مور، بیٹر، کبوتر، فاخہ... کھانے کے لئے۔ آپ تو تے کو مہروف کار دیکھے اور میری بات پر کھئے! وہ ایک ٹھونگ کے لئے پورا رستا، پورا پھل لے اُڑتا ہے اور دوسری ٹھونگ کے لئے دوسرا، کھانا کم اور گنوا زیادہ ہے اسی لئے ہری جھگ کے نام سے بدنام ہے۔ تو تا، رتی اور کام دیوتا کا بائیں ہے، جس کی موجودگی نفس پرستی کی ترنگ کی ترجمانی کرتی ہے۔ پنجابی کے لوگ گیت تو تے کی حمد و ثنا سے بھرے پڑے ہیں اور دنیائے ادب میں بے مثال ہیں۔

نامو کھندی تو تیا یارا (نامو اپنے توتے یار سے کہتی ہے)  
جینج نال اپنی کتر میرا ناٹا (میرا ناٹا اپنی چوچ سے کتر کر کھول)

شو دیئے بھگیتے اے شوشنکر کی بچارن

تیرے گل - دی مالا تیرے گلے میں - کی مالا ڈالتا ہوں

بھوک لگتی ہے تو میں موسم کے لحاظ سے کچی بسریوں اور کپڑوں سے پیٹ بھرتا ہوں۔ ویسے تو ہر شے سوا ہے لیکن ہر کچنوں کی کوئیلوں کا کھٹا میٹھا ذائقہ خوب ہے۔ اُسے خوب تر بنانے کے لئے میں نمک میں پیسا ہرا دھنیا اور نمک میں پیسا ہرا یودینہ دو الگ الگ پیٹریوں میں رکھتا ہوں۔ چنے پھلتے ہیں تو میں ڈوڑوں سے مزہ لیتا ہوں۔ یہ مزہ دو چند ہے، زبان کے ساتھ دانت بھی رس میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہر کام کی الگ اہمیت ہے۔ میں بھینسوں کو جو ہڑ سے نکالنے کے لئے ان پر ڈھیلے پھینکتا ہوں۔ کئی بار وہ مس سے مس نہیں ہوتی ہیں اور مجھے جو ہڑ میں اُترنا پڑتا ہے۔ میں گھاس کھودتا ہوں، ہرا نکالتا ہوں، ہل چلاتا ہوں اور رہٹ کی گاہدی پر بیٹھ کر بیل ہانکتا ہوں اور فطرت کے اُس سنگیت کو سُنتا ہوں جو موہن سنگھ نے اپنے لفظوں میں سمویا ہوا ہے۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی! او بہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی! او بہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

آہ دی گاہدی بنی نواری اس کی گاہدی نئی زردی ہے۔

اگے وگدا بلد ہزاری آگے سیکوں کی ہزاری چوڑی جڑی ہے۔

کر اس اتے اسواری اس پر سواری کرنا،

بھل جان دے دونوں جگنی دونوں جہاں کو بھلانا ہے۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی! او بہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

ایتھ گھم گھم وگن ہواواں یہاں ہواواں کا تاننا لگا رہتا ہے اس لئے کہ

ایتھ گھم بیاں گھم بیاں چھاواں ٹھنڈے سائے انہیں مستل للچاتے رہتے ہیں

نی میں اگ سُرگاں نوں لاواں میں آسمانی جنت کو بھاڑ میں جھونکی ہوں۔

جد پئے ایتھ ہی بھہ نی کیوں کہ میری جنت دھرتی پر موجود ہے۔

ساڈے کھوہ تے وسدا رب نی! او بہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

میں تھال تھال بٹی لائی میں نے سب تیر تھ نہائے ہیں

نہ میں کسے بھی لاہی لیکن کہیں نہ میرے تن کا میل اُترا اور نہ من کا

شبابا! آلو تے آئی یہ باعثِ فخر ہے کہ میں جوں ہی رہٹ کے حوض میں نہائی

جس میل و بجائی سب نی  
میرے تن آد من پاک ہو گئے  
سادے کھوہ تے وسدا رب نی!  
اوہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!  
سُن ٹھک ٹھک ریں ریں، وال  
رہٹ کے سنگیت کا جاؤ ناکابلِ بنیاں ہے،  
میں اڑ اڑ اوٹھے جاواں  
وہ بچھے اڑا کر دہاں لے جاتا ہے  
جھٹھ پھنچے ٹاواں ٹاواں  
جو لاکھوں میں کسی ایک کی منزل ہے  
اتے ورتی جادے لگ نی  
آپھر میں ایسے کھو جاتی ہوں کہ خود کو پا لیتی ہوں۔  
سادے کھوہ تے وسدا رب نی  
اوہن! ہمارے رہٹ پر رب رہتا ہے!

میری شوخی اپنے شباب پر ہے۔ کوئی لڑکی رہٹ پر پانی پیتی ہے تو میں لنگ سے اس کے  
مٹوں پر جھانکتا ہوں جو پچھر پر جھکنے سے آدرنمایاں ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ خود پسند انگ ہیں جو کپڑوں کے اندر  
کم اور باہر زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی خوب صورتی میں بر ماتی ہوئی دل کشی ہے۔ سوکھی الفت سی لڑکی میرے اندر  
وہ پھل نہیں مچاتی ہے جو بھر پور چھاتی والی۔ اوپر آسمان کی دائمی متانت اور نیچے گہمی کی متواتر بدلتی فراست ہے،  
جس کا ہر حسن و شیرازی سحر کی طرح افسلی ہے۔ وہ چہرہ و چہرہ میرے سامنے ہے، میں اس کی تصویر آٹاروں تو  
کیسے! فطرت کا خمیر اس قدر پر اسرار اور نیر کا رہے کہ اس کی حقیقت میں جھانکنا سرود و رعنائی کی بنیاد و کشاد  
پاٹل ہے۔ ذرہ ذرہ نغمہ سرا ہے، ہر ذرے کی اپنی لے ہے اور اپنی بھر کاری۔ کوئی مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے!  
فطرت کی ہم آہنگی میں گزرا ہوا ایک لمحہ، صدیوں کی فہم و فراست پر افضل ہے کیوں کہ یہ ایسا مقام ہے جہاں  
شاہد و مشہود ایک ہو جاتے ہیں۔

سُرمی اچلا ہے، چڑیاں چہچہا رہی ہیں، میں نیند کا نشہ توڑنے کے لئے انگڑائی لیتا ہوں۔ غمار اور  
سونے پر اگسا ہے لیکن سکول جانے سے پہلے چارالانا ضروری ہے۔ میں لٹ پٹی پگڑی باندھتا ہوں اور درختی  
اٹھا کر کھیتوں کو چل پڑتا ہوں۔ نسیم صبح کا ہی نے اعضا کو گدگد کر کھلا اور ہکا دیا ہے، میں تقاضائے طبیعت  
سے بیتاب ہوں، پوٹیا چلتا ہوں اور اسی تیزی سے اُتار پر اُترتا ہوں۔ میں گرتے گرتے، لڑھکے لڑھکے سنبھلتا  
ہوں اور اپنی چابک قدی پر ناز کرتا ہوں۔ اپنی ادا کو نئی ترنگ دینے کے لئے میں درختی کو اکٹھا کر بنا تا ہوں،  
اور اُسے کلانی میں ڈال کر کھاتا ہوں، تیز سے تیز اور ہولے سے ہولے، وہ گرنے لگتی ہے تو گھمانے کی رفتار بڑھا کر  
اُسے سنبھال لیتا ہوں۔ میری بھر بھاری میری ہوشیاری ہے اور میری محتاط جیتوں کی بیداری۔ گنداپا کر کے میں نے  
کھیتوں کا سرخ کیا ہے۔ میں اپنے سامنے شاہدِ فطرت کو دیکھتا ہوں جو زندگی و در زندگی کی صورتِ جلوہ گر ہو رہا ہے۔  
روئے سحر، بچے کی مسکان کی طرح فسوں نیاز ہے اور نباتاتِ محو غل حسیں کی طرح جلوہ ناز۔ فضا اُس عیش پسند

دو تیزو کی سی ہے جسے اپنے حُسن و جمال کو بانٹنے میں لُطف آتا ہے۔ جَزْد و پَرِ نَد کی حرکات پر جَزْدِ شادمانی ٹھپٹے۔ دیکھنے میں لگتا ہے کہ لڑ رہے ہیں لیکن کھیل رہے ہیں۔ میری آنکھیں لُطف و نشاط کی سرور سامانی ہیں اور مانس، رُوحِ مستی کی روانی۔ میری چال، موجِ شمیم جیسی سبک ہے۔ میں پودوں سے اٹھکیلیاں کرتا ہوں۔ میں پودا ہلا کر اُس کے نیچے سے بھاگتا ہوں لیکن شبنم کی زد میں آجاتا ہوں۔ میری ناکامی ہی میری کامیابی ہے اور میری شوقی میری مستی۔ میں اپنی چہلیں دھراتا ہوں اور اپنی حماقتوں پر ناز کرتا ہوں۔ پودے، مستانوں سے جھومتے ہیں۔ اُن کی خود نمائی مجھے اُکاتی ہے اور میرے وجود کو مہماتی ہے۔ میرے خیال لطیف جذبات سے چلتے ہیں اور اعضا چھیرے ہوئے تاروں کی طرح تھرکتے ہیں۔ میں نعمتہ سہرا ہوں،

بلے بلے! بھئی بھئی بھانے گم کھٹ پئے  
پچھا ہے بہن دی ٹکوراں کر دی

(بنتو کی معصومیت دیدنی ہے! وہ اپنے سینے پر پچھا ہے باندھتی ہے اور نکور کرتی ہے)

نادان سمجھتی ہے کہ ذلیل نکل آئے ہیں)

کچھار شمعِ دُعا ہو گیا ہے۔ تلوں سے چمٹی اور انگلیوں سے لپیٹی چیچپی ذلزل کی ٹھنڈک میں حرار

آمینز راحت ہے۔ میں چھپر چھپاک چل رہا ہوں۔ میری بے ڈھبی میری کھری خوشی ہے اور اُسی طرح اُونچے نیچے سروں کی جھل بندی۔ میں جبروں (کچھار کے کھیت)، میں پہنچ گیا ہوں۔ ہوا دلدلی بوسے بھاری ہے اور رنگ آمیز بھی ہے۔ راہ کے دونوں طرف ایکھ کے کھیت ہیں۔ اس راہ پر میں آج پہلا راہ گیر ہوں۔ میرے دُشوک کی دیل یہ ہے کہ راہ پر جھکے ہوئے گئے اوس سے لدے ہوئے ہیں۔ میں اُس پار پہنچتے پہنچتے ماسموں تک بھیگ جاؤں گا۔ اپنے بچاؤ کے لئے میں نے گنا کاٹا ہے، بدھیا کٹا! اور درانی کو پیچھے بیٹھ کر کارسے لٹا لیا ہے۔ میں گئے کو جھنڈے کی طرح آگے ہلاتا ہوں، اُس کے پیچھے چلتا ہوں اور اپنی پسند اور ایجاد پر خوش ہوتا ہوں۔ پنجابی میں ایکھ کو کما د کہتے ہیں، کما د کے کھیت ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے گئے کی کھوری (گئے کے ٹوکھے پتے)، آگ (گئے کا اگلا ہرا بھرا حصہ)، اور پاندھ (گئے کا اگلا پھیلا حصہ) اُتار کر ایک ہاتھ میں پکڑ لیا ہے اور دوسرے ہاتھ سے منڈھ (گئے کا نیچے کا میٹھا حصہ) چھلتا ہوں۔ گنا کتنا کولا ہے! تین تین، چار چار پور لمبا چھلکا اُترتا ہے۔ گنا کتنا رسیلا ہے! چکلت مار کر زور سے چوسنے سے غوط کھانے کا گمان گزرتا ہے۔ کچھار کے گئے تھوڑے سلونے ہوتے ہیں اور دس کا مزہ دوہرا منہ اور رگیں ایک ساتھ سرشار ہواٹھی ہیں۔ مندر سنگھ کا کھیت سبب آخر میں آتا ہے میں اس کا ذکر بطور خام کر تا ہوں۔ کیوں؟ اسے دیکھتے ہی میرا خیال بندھ جاتا ہے۔ اس کے گرد سنکڑے کی باڑ ہے جس کے پھول پُشپاکی آنکھوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ میرا ذوق لطیف! میں اُن آنکھوں کو نرگس شہلا سمجھتا ہوں۔

بنجائی کے مقابلے میں فارسی کی دُور رس تشبیہ بھلی لگتی ہے۔ پُشپا جوان ہو گئی ہے اور چالاک بھی۔ وہ اپنی اداؤں سے مجھ میں چاہتیں ابھارتی ہے لیکن انہیں پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ اب رواں میں پاؤں پڑتے ہی میں چونک پڑا ہوں۔ پاؤں سے لپٹی ہوئی مٹی پانی میں گھل کر بہتی ہے۔ میں شپاشپ پاؤں مارتا اور چھینٹے اڑاتا چلتا ہوں۔ کنارے کے قریب تیرتی ہوئی پھیلیوں کی روڈر کر تیر پتر ہو گئی ہے۔ سینہ آب، روئے شبنم کی طرح صاف ہے۔ تن میں سفید ریت پر بھورے گھونگے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ نرم ملائم لہریں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہیں۔ فطرت کی پُرکاری! سادہ سے سادہ چیز، نقشِ جمال ہے۔ میرے چلنے سے لہروں میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔ میں خود پر ناراض ہوں کہ میں اُن کا روپ بگاڑتا ہوں۔ میں بھر جاتا ہوں اور انجانے میں ایک سہانے نظارے کو جنم دیتا ہوں۔ میری ٹانگوں کے گرد پانی، بخسور بناتا ہے۔ میری نظر کی دل فریبی مجھ سے کہتی ہے کہ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہو لیکن میری ذمہ داری مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ پانی گہرا ہوتا جاتا ہے اور ٹخنوں سے پینڈلیوں، پینڈلیوں سے گھٹنوں اور گھٹنوں سے رانوں تک چڑھ اُٹتا ہے۔ میں اپنے دامن اور کاچھے کو اوپر اٹھا کر بھینکنے سے بچاتا ہوں۔ پانی اُترنے لگا ہے جیسے مجھے چوکس پا کر مایوس ہو گیا ہو۔ میں نے ٹانگیں جھٹک کر دامن اور کاچھے کو چھوڑ دیا ہے۔ سامنے اوپچا کر اڑا ہے۔ ایک کے اوپر ایک اور پھر اُس پر دو آدنی کھڑے ہو جائیں تو بھی اوپر کا آدنی اُس پار نہ دیکھ سکے کسی بھلے مانس نے کراٹے میں پہنڈے بنائے ہوئے ہیں اور راستہ ٹیڑھا میڑھا اوپر چڑھتا ہے۔ میں جب جب یہ راستہ طے کرتا ہوں، رحیم خان خانان کا یہ دہابے اختیار کنگ آتا ہوں۔

جو رحیم اوچھو بڑھے تو ات ہی اترائے

پیادے سے فرزین بھو، ٹیڑھا ٹیڑھا ہو جائے

میری ترنگ! میں ہر پلک میں ایک، کبھی دو اور کبھی تین پہنڈے سر کرتا ہوں اور اپنی توانائی سے نفلت اٹھاتا ہوں جیسے کوئی سہلانے لمن سے رس لیتا ہے۔ میں اوپر چڑھ کر سیدھا کھڑا ہوتا ہوں۔ میرے سامنے مناظر کھلے ہوئے ہیں اور ہر منظر میری سرشاری کی تائید کرتا ہے۔ آفت پر کُنڈن ہی کُنڈن بکھرا ہوا ہے لیکن یہ مال اُسی کا ہے جو اسے بڑھ کر سمیٹ لے۔ اس مال کی ستم ظریفی! اسے پانے کے لئے ہاتھوں کے برعکس حُسنِ طلب درکار ہے۔ میں انوکھا غمی ہوں! ابراہاؤ انگر ہوں! میں دامن دل کو متاعِ مسرت سے بھرتا ہوں۔ میری طرفگی! فرشِ سبزہ میرے قدموں میں بچھا جاتا ہے! شبنمی نورنگ مجھ پر پچھا رہو تے ہیں! ملکہ سحر سونے کے تھال سے ٹور چھلکاتی ہوئی میری آرتی آتا رہی ہے! کرنیں میرا منہ چومتی ہیں اور مجھے خوش آمدید کہتی ہیں! آسمانِ مسجدے میں گرتا ہے اور اپنی بندگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ان سب سے بالاتر لہلہاتے کھیت ہیں جو

میری روزی روٹی کی ضمانت دیتے ہیں۔

چشم بد دور! میں اس لامحدود سلطنت کا بے تاج بادشاہ ہوں۔

لیکن اُف! میں اپنے فرض کا غلام ہوں۔ میں ان کبوتروں کی آزادی پر رشک کرتا ہوں جو تارا سٹھ کے سانویں کھیت (وہ کھیت جس میں صرف آسار بھی بونی جائے) میں چمکتے کم اور غٹر غوں زیادہ کرتے ہیں۔ پرنندوں میں سے مجھے کبوتر ہی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ ان کو دیکھنا پرانی یادوں کو تازہ کرنا ہے۔ جینا کا سینہ غٹر غوں کرتے کبوتر ہی کی طرح خوبصورت تھا۔ میری نازک خیالی میری تیز خرابی بن گئی ہے۔ میں سپاٹے بھرتا ہوا کھیت میں پہنچا ہوں۔ میرے ساتھ عجیب بات ہوتی ہے! میں تروتازہ ہو گیا ہوں جیسے جام حیات پی لیا ہو۔ میں آگ اور کھوری کھیت میں رکھتا ہوں، اداس لدے باجرے کو دیکھتا ہوں اور پاندھ سے اُسے ہلا کر کاٹنے بیٹھتا ہوں۔ میرے آغاز ہی میں انجام کی جھلک ہے۔ ایک جگہ درانتی روڑے سے ٹکرا کر ہاتھ کو آئی ہے اور چھوٹی انگلی پر خراش لگا گئی ہے۔ میں دم بھر کے لئے رکتا ہوں اور پھر اُسی رفتار سے درانتی چلاتا ہوں۔ میں حسب ضرورت پٹھے کاٹتا ہوں، جو نا بٹا ہوں، جو نا پچھا کر پٹھے اکٹھے کرتا ہوں اور گٹھا باندھتا ہوں۔ میں بازیب کی جھنکار سُنتا ہوں اور حیران ہو کر اپنے پیچھے پگڈنڈی کی طرف دیکھتا ہوں۔ لال اور پیلے رنگ کے کپڑے پہنے لاجوتی آتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ گوری گاؤں کی دھوئیں ہے اور میلے کپڑوں کے ساتھ ضرورت مندوں کے تن بھی دھوتی ہے۔ وہ آنکھیں ملاتی ہے تو نازک جذبات کو ابھارتی ہے اور یہ راز ظاہر کرتی ہے کہ جسموں کے من سے پہلے رُوحوں کا ملن ضروری ہے ورنہ رنگیں اُس عرق کو پیدا نہیں کرتی ہیں جو پٹھوں میں خوشبو اور منہ میں پانی کھلاتا ہے۔ وہ عرق رُوحوں کی رغبت کا بے ساختہ غلطیہ ہے جو جسموں کے ہزاروں سالوں کے ملاپ کا مقدور نہیں ہے۔ کئی نا سمجھ اُسے شاطلات کہتے ہیں اور نا شکرے کا تک کی کُتیا! میں اُس کا احسان مند ہوں۔ وہ میری بیجان خیر جبلت کی جائے پناہ ہے۔ اُسے دیکھ کر میرے من میں شگوفے بیھوٹ پڑے ہیں اور اندر کھلتی میج گئی ہے۔ میں اُسے گٹھا اٹھوانے کے لئے بلاتا ہوں اور درانتی کو گٹھے میں جوڑنے کے پاس کھڑا ہوں۔ لاجوتی مسکراہٹ کو روکتی ہے اور میری بیباک نگاہی سے شرما کر اور دھنی سنوارتی ہے۔ میں اُس کے بدن کی گہرائیوں اور اٹھانوں کو، اپنے بدن کی گہرائیوں اور اٹھانوں سے ناپ چمکا ہوں۔ لیکن اُس کی سادگی! وہ خود کو نا محرم کی طرح چھپاتی ہے۔ اُس کی یہ عادت زبالی ہے کہ کھولنے سے پہلے شرماتی ہے، پھر تو بس!

گھٹ گھٹ پاجیمیاں

تیرے نیکے ہڈاں دی گرمی

(مجھے باہوں میں لے کر زور زور سے بھینچ تاکہ ہڈیوں کی گرمی اُن کے مخزن تک پھیل جائے)



## گیان سنگھ شاہ

میں شاعر نہیں ہوں لیکن میرے اَعْضَاءُ اَلْفَاظ کو گنگنا رہے ہیں جو لذتِ حیات کے نمائندے ہیں۔ نظامِ فطرت، جسے اہلِ دانش اور اہلِ خدا اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتے ہیں، مجھ پر میری رگوں کے ذریعے مُکشف ہو رہا ہے۔ میں زندگی کے مرکزہ کا مرکزہ ہوں۔ لاجوتی کے ریسے مئے! دیکھتے ہی متنبی پانی بھر آیا ہے، ذائقہ ہی بدل گیا ہے جیسے لذیذ میوہ کھالیا ہو۔ میں اُس کے جو بن کی تعریف میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے جذبات میری خواہشِ اظہار پر غالب آگئے ہیں اور مجھے لفظوں میں الجھا گئے ہیں۔ میں اُسے چپ چاپ دیکھتا ہوں۔ وہ گٹھا اٹھوانے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے، میں اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہوں۔

کسی نے دیکھ لیا تو؟ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے اور پھر سہی! پر بات ٹالتی ہے۔ میں ڈر گیا ہوں، دور تک نظر دوڑا کر واپس آیا ہوں اور مطمئن ہوں۔ اُس تنہائی میں ہم دونوں کے پاس کوئی اور ہے تو وہ میرا کام دبو اور اُس کی کام دیوی۔ میں اُسے باجرے کے اندر کھینچتا ہوں۔ اُس کا پاؤں گٹھے سے الجھ کر اٹھ گیا ہے لیکن میں نے اُسے باہوں میں سنبھال لیا ہے۔ وہ میرے ماس میں ہڈیوں تک دھنس گئی ہے۔ اس قبل آذ وقت لذت سے بھرپور میں آگے بڑھتا ہوں اور اُسے اپنے پیچھے سے اپنے آگے کھینچتا ہوں۔ وہ رکتی ہوئی چلتی ہے اور میرے ساتھ باجرے میں گم ہو جاتی ہے۔

لاجوتی سے ملن ایک ناقابلِ تسکین فعل ہے۔ میں مبتلا مئے تازہ ایسے خالی ہو جاتا ہوں جیسے لبریز گلاس ٹھوکے سے اُلٹ جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ آضلی خوشی، بھوکِ بلاس سے بڑھ کر، انتظار میں ہے یا دوسری باری میں۔ لیکن دوسری باری کے لئے وہ کبھی کبھار ہی رکتی ہے اور جب رکتی ہے تو مزہ دہچند ہوتا ہے۔ دراصل دوسری باری کئی پہلی باریوں سے لذتِ آمیز اور تسکین پرور ہے۔ میرے اندر جاتے ہی باہر آجانے سے وہ میرا ٹھٹھا اڑاتی ہے۔ میں اپنی کمزوری کا راز تلاش کرتا ہوں۔ ڈولانا بنانے میں پکڑے جانے کا اندیشہ میری رگوں کو کمزور بنا دیتا ہے اور اُن پر میرا اختیار گھٹا دیتا ہے۔ میرا ناقابلِ تسخیر رویہ اپنی پست ترین حالت میں ہوتا ہے جب میں طے شدہ وعدے پر لاجوتی کا انتظار کرتا ہوں۔ میں اُس گھرے کی طرح پجرتا، رستا ہوں جس کے مسام زیادہ ریت کی ملاوٹ کی وجہ سے تم رہتے ہیں۔ شوتمند میں شولنگ کو کیوں گیلار کھتے ہیں؟ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ علامتی اور آضلی زندگی میں کتنا تضاد ہے! میں اس روایت کو حقیقت ماننے لگا ہوں۔ "ہر آدمی شوکا سروپ ہے۔"

## باب ۳۴

کھٹکتے لہجے، اُبلتی ہوئی اداؤں کے

کوئی نہ روکے بہاؤ، بہار کے دن میں

(شاہِ طائر)

قارئین! میں نہ الا اعتراف کرتا ہوں! میں الفاظ کی بامعنی اور بے معنی حیثیت پر الجھن میں ہوں اور ان کی لطافت و کثافت پر حیران۔ یہ میرے سانس کی مانند میرے پُرانے ساتھی ہیں لیکن میری بے ہوشی میں نے ان کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نازک گھڑی میں ان کی حقیقت پر غور کر رہا ہوں۔

الفاظ دیکھنے کو بے جان ہیں لیکن ہیں جان دار۔ ان کا پُر اسرار وجود اپنی جان سے وصال پانے کے لئے انہیں انسان کے احساس کا لباس پہننا پڑتا ہے۔ یہ ایسا نہ کریں تو ان کا ارضی ضمیر، سماوی ضمیر میں منتقل نہیں ہوتا۔ ان کی فطری کمزوری! ان کو ملو تو دل سے ملو۔ اور دلِ نفرت و محبت کا ایسا رقیق سا پچا ہے جس کی حقیقت بے اعتباری سے عبارت ہے۔ چوں کہ الفاظ کی اپنی حقیقت، انسان کی حقیقت پر منحصر ہے، اس لئے میرے الفاظ کی معنی افزائی، عبارت و اشارت سے زیادہ پڑھنے والے کی دلی کیفیت پر موقوف ہے۔ دوسری ہر تخلیق کی طرح الفاظ بھی کسی کی تخلیق ہیں۔ اس تخلیق کی بدبختی! کوئی نہیں جانتا کہ اس کا خالق کون ہے۔ اس تخلیق کی دلکشی!! نہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ یہ میری ہی تخلیق ہے اور تخلیق کا خالق سے دُہمی رشتہ ہوتا ہے جو جسم کا جان سے۔ تخلیق کی آفاقی خوبی ہے کہ یہ اپنے خالق سے زیادہ ابدی ہوتی ہے۔ یہ اُسی ابدیت کی فسوں کاری ہے جسے روحانیت پسند روح سمجھ لیتے ہیں۔

وہ لے تو ہر طرح کی جبلت اُبروئے حیات ہے لیکن میں تحفظ ذات کے بعد جنسی جبلت کو بالاتر مانتا ہوں۔ انسان کی ہر جبلت عرصہ نشوونما سے گزرتی ہے اس کے باوجود اپنے کمال کو نہیں پہنچی ہے۔ اسی طرح انسان کے اعضا ہیں۔ ماں باپ اپنے بچوں کو ہر ہنر سکھاتے ہیں لیکن عضو تناسل کی تہذیب سے بے بہرہ رکھتے ہیں۔ وہ اس کے بارے میں آرزو دیکھتے ہیں اور کمال حاصل کرتے ہیں چوں کہ عضو تناسل کی تہذیب، تہذیبِ آفرائش ہے یہ عبارت و اشارت کی گرفت سے باہر ہے۔ اس کی وسعت و رفعت کا اندازہ پروازِ خیال کو ہو تو ہو۔ اس کی عظمت سے دھرتی کی زرخیزی، پانی کی تری، آگ کی گرمی، ہوا کی بے کلی اور فضا کی بزرگی نے اُن مانگی بنے ورنہ یہ پانچوں عناصر (جو زندگی کے کرنا دھرتا مانے جاتے ہیں) اپنی جگہ بے معنی ہوتے۔ یہ تہذیب اپنے آپ میں مکمل ہے اس لئے بڑی شوخی سے کاشفِ ذات میں سرگرم ہے۔ یوں نہ ہوتا تو انسان اس تہذیب سے چشم پوشی کرتا اور انجانے میں فطرت کے تخلیقی کام میں رکاوٹ ڈالتا۔

میں عضو تناسل کی نعمت غیر مترقبہ سے محفوظ ہوا اور محسوس کیا کہ میں پہلا آدمی ہوں جس نے اس کا پُر اسرار کردار دریافت کیا ہے۔ میں ایسا نہ کرتا تو یہ اپنی خوبی سے بے خبر گوشت کے ذیل کو تھپڑے کی طرح گوشہ تحارت میں پڑا نابود ہو جاتا۔ اپنی حقیقت میں یہ جن پُر انک کتھاؤں کا حامل تھا، اُن میں اس کا مرتبہ خلیفہ خدا کا تھا۔ اپنی بے خبری کی وجہ سے میں، اُن پر یقین نہ کرتا تھا۔ مجھے یقین آیا تو میں نے اپنی مدد سے اسے اُس مقام پر پہنچا دیا جس کی مجھے اُمید نہ تھی۔ اس کی مجھ سے پہچان، زبان سے پھل کی سی تھی جسے چکھ کر ہی لذت و لذت کا تعین ہوتا ہے۔ سیرج رواں ہوتا، میں اپنی مد میں تمنا کرتا کہ میرا وجود بھلے پگھل کر اُس رو کی تیزی میں مل جائے لیکن وہ نہ نہ تھکے۔ میں ضبطِ انزال کی کوشش کرتا لیکن ایسا ممکن نہ ہوتا۔ میری کمزوری میری برہمی کا باعث ہوتی جس میں شرمندگی کا ثبابہ ہوتا۔ میری ہوس کی بے تسکینی! انزال کے آغاز و انجام کا درمیانی وقفہ، مجھے بالکل چھوٹا لگتا۔ اُس کی عارضی لذت اُس نوالے کی سی ہوتی جو ہاتھ سے سیدھا حلق میں جا پڑے اور ہونٹوں کے ساتھ زبان تک کو ترستا چھوڑ دے۔ اس کے باوجود اعضاء و حواس کا وہ اتصال حقیقی ایسا خالص اور خاص لمحہ تھا جو ایک بے کیف اور بے فیض عمر سے کہیں بہتر تھا۔

دوسرا ہر عمل اپنے کمال کا ادھورا حاصل ہے لیکن نفسانی عمل لا انتہا کی انتہا ہے۔ میں اپنی جس انتہا کو کتابوں، اوزاروں اور دستاروں میں ڈھونڈتا تھا، اُسے میں نے اپنے اندر پایا تھا۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ یہ ممکن ہے! اپنے یقین کی خاطر داری کے لئے میں چاہتا کہ اُمی فضل میں مصروف عمل رہوں۔ اُسے میری فطری تائید تھی۔ میں اُس عمل میں آزاد، بے تکلف، آسودہ خاطر اور یکتائے عصر محسوس کرتا تھا جیسے اپنی خلوت میں خدا۔ میرے برہمن کا مقدس ارتفاع! مجھے وحی سی آتی! ”تم وہ برگزیدہ فرد ہو جسے ہم نے اپنے کارِ افرائش کی ترمیم کے لئے مخصوص کیا ہے۔ تم پر فرض عین ہے کہ تم ہر قابلِ عورت کو حاملہ بنا دو اور پُرانی نسلوں کو مٹا کر نئی نسل کا آغاز کرو۔ ہم انسان کی شکل کو عقل کا ہم سر دیکھنا چاہتے ہیں۔“

میرے پیارے قارئین! میں اپنے بیان کے تسلسل کو توڑ رہا ہوں۔ یہ اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ مجھے انسان کے اس فضل کے بارے میں تایا جی کے خیالات محفوظ کرنے ہیں اور یہ میرے لئے انتہائی اہم ہے جتنا اپنی حقیقت رقم کرنا۔ ”دنیا نے فطرت میں ہر ذہنِ عاقل کی سرگرمی سے سرشار رہے اور یہ عمل دورِ ماضی ہے، کمال سے جمال کی طرف اور زوال سے جمال کی طرف۔ چوں کہ انسان کا عقل صرف زوال سے کمال کی طرف ہے یہ اپنے عمل میں بے دل ہے اور سرگرمی کے فیض سے نا آشنا، جو عقل کا حقیقی مدد ہے۔ اور بھوگ بلاں ایسا طبعی فعل ہے، جس کی حقیقت مکمل عمل کی ہی ہے۔“

احساسِ شباب، حرکت اور اضطراب کا طالب ہے۔ یہ سچائی میرے آندھے وجود سے نور بن کر

ظہور پزیر ہوئی تو میرے تصور کی ہر تصویر مضدلی پڑ گئی۔ یہ تغیر باطنی ہو کر بھی ظاہری تھا۔ ایسا طوفان تھا جس کا انجام، آغاز سے خوبصورت تھا۔ دراصل میرا عمل اکسیر تھا، کیمیا تھا جو میرے ہونے کو چند گرم قطروں میں ڈھال کر ان میں جاں گداز لذت اور حیرت انگیز تڑپ بھردیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ سونو الہ غذا سے ایک قطرہ خون اور سو قطرہ خون سے ایک قطرہ مٹی بنتی ہے۔ لیکن اس تفصیل کی تحقیق کی فکر کسے تھی! مٹی اپنی ضرورت آپ پوری کرتی تھی۔ لاجوتی کی صحبت اتفاقیہ تھی کیوں کہ اُس کی دریا دلی روایت تھی،

راتاں چھوٹیاں یار بھیرے

کید ا کیدا دل رکھیے

(رات چھوٹی ہے اور میرے چاہنے والوں کی تعداد، لاتعداد، میں کس کس کا لحاظ رکھوں! میری کایا ہی پلٹ گئی۔ میں کہیں جھاڑیوں اور کہیں فصلوں میں چھپ کر لاجوتی کا انتظار کرتا۔ مجھے سانپ کا ڈر تھا اور نہ کچھو کا خطرہ۔ ہمہ رنگ زندگی یک رنگ ہو گئی۔ انتظار! اور عشرت! انتظار اس کے سوا اور کیا ہے کہ آدمی عورت کے بارے میں سوچتا رہے اور خیال وصل سے نطف اٹھاتا رہے۔ نفسیاتی اور عضویاتی فعل میں حدِ فاصل نہیں ہے۔ میں اپنے ارمانوں میں جو رس بھرنا وہی انگوں سے ٹپکتا۔ لاجوتی کی آمد سے ناامید ہونے پر میرے ننھے اُس سہانی خوشبو کی آرزو کرتے جو میرے ہونے کا راز تھا۔ میں اُس خوشبو کے ماحذ کا خیال کرتا جو پھول نہ تھا لیکن پھول کی طرح میرا حصہ تھا اور کائناتِ ممکنات کی حدِ کمال تھا۔ اُس سے موجودات کی ہر خوب صورتی اور لذت پیدا ہوتی تھی اور اُسی میں انجام پاتی تھی۔ میں اس پُرانک روایت کا قائل ہو گیا، ”پانی، آگ سے پیدا ہوا تھا اس لئے پانی ہر چیز کا مقدر ہے۔“ میں بے اختیار ہو کر اپنے پھول سے ساتھی کو دیکھتا اور دیکھتے دیکھتے سہلانے لگتا۔ وہ ایک متمرّم لہجے کی طرح اپنے گوشہ خاموشی سے بھرتا اور اُس تہذیب کا معتبر مشہر بن جاتا جو میری رگوں میں مضمر تھی۔ اُس کی خوشنودی کی خاطر میں نے بھی کئی باروں سے منہ موڑ لیا۔ مجھے میرا وہ ساتھی ملا تھا جس کی اکیلی ذات میں انجمن تھی۔ ”لنگ سوگو تر ہوتا ہے اس لئے شوکار ج کرتا ہے۔“ میں نے پہلی بار اس کہاوت کے معنی کلی حیثیت سے سمجھے۔ میں اُن دھار ملک باتوں کا منہ چڑاتا جو بندے کو موہ مایا کا کیرا بتاتی ہیں، اسے ذلیل کرتی ہیں اور جو بن روپ کو مانس جیون کی ذلت بتاتی ہیں۔

رَس پیچھے آنکھ سے، مُکھ سے بھیجے رام

تُلّسی دُہ نہ کر کوٹھ ہیں جو گھسیں چام سے چام

میں مرد وزن کے اس رشتے پر غور کرتا جس سے افزائشِ آدم جاری و ساری ہے اور جسے ناپاک بتایا گیا ہے۔ میں خود سے سوال کرتا، ”کیا میں اپنے ماں باپ کے ناپاک جذبات و احساسات کی پیداوار ہوں؟“

میرا ضمیر اس جھوٹ کی تردید کرتا، تو اپنے ماں باپ کے پاک عمل ہی کی پیداوار ہے۔ ناپاک عمل، حسنِ انزائش کی نفی ہے اور اُس ناقص بیج کی طرح ہے جس کی زندگی، بوسیدگی کی پرگندگی ہے نہ کہ غلِ انزائش کی رنگارنگی!

میرے قارئین! میں اعتراف در اعتراف کرتا ہوں، میرا یہ اعتراف میرے سارے اعترافوں سے نازک تر ہے کیوں کہ یہ اُس حیوانی جذبے کا ترجمان ہے جسے انسانی تہذیب نے مار کر اپنی بنیاد میں دفن کر دیا تھا اور کسی بنیاد کو کھودنا، اُس پر کھڑی تعمیر کو گرانا ہے۔

زندگی کی ہر جہت ایک جذبہ ہوس میں ڈھل گئی۔ اور شدتِ ہوس! میں اپنی ہوسوں کے پاس بیٹھا تو اُن کے اندر کی عورت، مجھے رجھانے اور بھانے لگی۔ وہ گاتی باندھے ہوئی یا آڑ بند پہنے ہوئی تو اد بھی جن موہنی گلتیں۔ اُس گمراہ کن فُشون کو ٹوڑنے کے لئے میں، انہیں مجبور کرتا کہ وہ پورے کپڑے پہنیں۔ وہ اپنے جذبات کی خود نمائی پر مہر مرتیں، میں اُن سے لڑ پڑتا اور اپنے جذبات کو دبانے کے لئے اُن سے دور بھاگ جاتا۔ میں کھیتوں میں جاتے ہوئے انہیں ساتھ لے جاتا جس کے نتیجے میں مجھے زیادہ کام کرنا پڑتا۔ میری ہٹ دھرمی میری ماں نہ سمجھ سکتی اور نہ میں اُسے سمجھا سکتا۔

تا باجی آدمی کی جو حقیقت بیان کرتے تھے وہ نہایت فلسفیانہ ہے اور بوالہوس کے لئے ناقابلِ قبول، ہرجیو، آدھ جیو ہے اور اپنی آتما کی پورنتا کے لئے اپنے دوسرے حصے کا خواہش مند۔ اسی طرح مائش آدھ مائش ہے اور استری، آدھ انگلی۔ ان دونوں کا اتصال، تائیدِ تولید کی ضمانت ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا مفہوم اس سے بڑھ کر ہے کیوں کہ انسان، حیوان نہیں ہے! انسان پر لازم ہے کہ یہ اپنی نفسانی طاقت کو کسی تخلیقی کام میں بھی لگائے اور زندگی کو نئی سمت دے، ورنہ بھوکِ بلاس کا کھڑا بن کر رہ جائے گا۔

لیکن میرا نفسانی رویہ، لوک کہانیوں کے آدمِ خور دیو کا سا تھا۔ وہ کہیں سامانِ شکم دیکھتا ہے تو خوشی سے آدمِ بو، آدمِ بو، پکارتا ہے۔ جیسے اُس کی حیاتیاتی حاجت اُس کی حیات تھی اسی طرح میری نفسانی ضرورت میری زندگی۔

حالات کی ناموافق اور میری اختراعی صلاحیت نے مجھے خود پرور بنا دیا۔ میں اُس انوکھے پھول کی طرح تھا جو بھونروں سے بچے لیکن اپنا اُس آپ پینے لگے۔ ایک بدخواہیاں، دوسرے خود فریبیاں، تیسرے شاہ خرچیاں، وہ کون سی حسین لڑکی تھی جسے میں نے تصور میں زیر کیا ہو۔ میرا انزال: میرے اندرونی وجود کا باہری وجود سے وصال تھا۔ اُس ہم آہنگی کے دوران، میں مستی سے چلتا تھا۔ وہ مستی جس روحانی بے خودی کا فیض تھا، اُسے ہمارا سر جمایا تھی بحرِ بے نسبت ہے۔ تجربہ کوئی بھی ہو۔ فرمونِ نیاں نہیں ہوتا۔ اُس سعادت کو پانے

کے لئے اُمی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے، جو اُس کا مانڈ رہی ہو۔ یس قطرے قطرے سے دھار دھار ٹپڑنے لگا اور جریبان کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ ناخن اُدگال، رگوں کے آئینے میں اور خون کے عکاس۔ وہ پیلے، ہلکی سے نظر آنے لگے تو میری ماں کو تشویش ہوئی کہ میرا لادلا پڑھائی کے بوجھ سے مر جاتا ہے۔ وہ رات کو دیر تک نہ جانے کی ہدایت کرتی اور میرا دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لئے مجھے توڑاؤ دے بلوئے ہوئے دہی میں تازہ دودھ کی دھاریں مارنے سے جو چیز بنتی ہے، توڑاؤ، کھلاتی ہے، پلائی اور باسی روٹی کے ساتھ مکھن کھلاتی لیکن میری حالت دہی رہی جو اُس حال میں ہونی چاہیے تھی۔ میری ماں، میری بھولی نادان ماں کو خبر نہ تھی کہ میں جسمانی بیماری کے برعکس ذہنی عیاشی میں مبتلا ہوں جس کا واحد علاج، عورت ہے۔

## باب ۳۵

دلِ تباہ میں یوں حسرت وصال پلے  
کسی مزار پہ جیسے کوئی چراغ جلے  
(شاہ)

میں ہوس پرستی کی ایسی حالت میں تھا جب بھائیاجی نے لامبرے میں ٹمک (درختوں کا ٹمنا) لگایا اور وہیں رہنے لگے۔ ایک اتوار دہر کے قریب وہ بے اعلان کھیتوں میں چہنچہے۔ کارن یہ تھا کہ انھیں اُس کام کا معائنہ کرنا تھا جسے وہ بطور خاص مجھے سونپ گئے تھے، سن کا مکلا مارنا۔ مکلا مار دوا کی عدم موجودگی میں اُسے مارنے کا ایک ہی مؤثر طریقہ تھا، پودوں کو ہلا کر مکلا نیچے گراؤ اور اُسے پیروں سے کچلو یا رعبے سے مارو۔ یہ کام جھک کر کرنا پڑتا تھا اور میں صبح سے مسلسل کر رہا تھا۔ میری کمر دکھنے لگی اور میں ڈانڈے پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ کسان کی زندگی میں کام کے دوران آرام کا خیال میرے ہی سے غائب ہے۔ وہ کھیتوں میں ہوتا ہے تو صرف نُقل پانی کے لئے بیٹھتا ہے ورنہ کام میں جُٹا رہتا ہے۔ کوئی ملاقاتی آجائے تو اُسے صورتِ حال کے لحاظ سے نباہنا پڑتا ہے۔ کسان بیٹھے بیٹھے کام کرتا ہو تو ملاقاتی اُس کے پاس بیٹھ جاتا ہے، کھڑے کھڑے کام کرتا ہو تو اُس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے، چلتے چلتے کام کرتا ہو تو اُس کے برابر چلتا ہے۔ کسان کہیں کام کرتے کرتے مڑتا ہے تو بس آفتِ ناگہانی میں وہ گھنٹوں کسی، گھوڑی، درانتی، رَمبا، ہل..... چلاتا ہے، پر ات ختم کر کے اٹھتا ہے بقایا کام پر نظر دوڑاتا ہے اور نئی پر ات دھرنے کے لئے تازہ دم لگتا ہے۔ چوں کہ متواتر کام، کسان کا غرورِ روزگار ہے اس لئے طاقت پریری بھی ہے۔

نیا جی کام کے بارے میں کہتے تھے، وہ جاہل ہیں جو کہتے ہیں کہ کام جینے کا وسیلہ ہے! کام،

دانش کا اختیارِ قطعی ہے اور انسان کی عالی ظرفی۔  
میری ماں کہتی تھی، ”کام جتنا زیادہ ہو، میں اتنی ہی تئی ٹوٹی محسوس کرتی ہوں!“  
بھائیاجی کہتے تھے، ”کام، انسان کی جان ہے!“

رکسان کے کام میں تمام کا تصور ہی نہیں ہے۔ اُس کام دسواں میں پھیلا ہوا ہے۔ بتایا جی،  
میری ماں اور میرے بھائیاجی کی طرح کسی گمنام شاعر نے کام کے تکلیف دہ سلسلے کو کسی نئی بیابان کی نظر سے  
دیکھا ہے۔

ماہی تیرے کم کاج نے،  
ساڈامیل بنایا سپنا  
جھٹھے تیرا ہل و گدا  
اوتھے ڈاواں پیرِ خم اپنا

(میرے ساجن! تیرا کام کاج ہمارے میل جول میں رکاوٹ بن گیا ہے اور ہوتے  
ہوتے ہمارا ملاپ، خواب ہو گیا ہے۔ مجھے ایک جگت سوجھی ہے! جس کھیت  
میں تو ہل چلا تا ہے، میں وہاں پیرِ خم کا ناکروں)

میری بے ہودگی! میں کام بیچ میں تاج کر آرام کر رہا تھا۔ بھائیاجی کو سر پر کھڑے دیکھ کر میں جلدی سے  
اٹھا لیکن انہوں نے مجھے اٹھنے سے پہلے ہی دبوچ لیا اور مجھ پر کام چور کا ہتھان لگا دیا۔ میری بدبختی! میرے منہ سے  
نیکل گیا کہ میری کمر دکھتی ہے۔ ان کی تندہی ابتدا ہی میں انتہا کو پہنچ گئی، ”نئی عمر آدھوٹی کمر! بول ترائی بول، مجھے  
کون چونگھ رہا ہے!“

میرے رازدار قاریں! مجھے حوصلہ نہ ہوا کہ میں انہیں اپنے راز میں شریک کر سکوں۔ میں جانتا تھا کہ  
میں خدا تعالیٰ سے گزر رہا ہوں۔ میں خود کو چوٹنگھے سے گریز کرتا لیکن اُس وقفے کی مدت بہت کم ہوتی۔ مانا کہ کوئی  
گتا تلاشِ معاش میں اپنے زخم کو چاٹنا بھول جائے۔

کملا مارنے کی حد سے بڑھ چکا تھا اور ادھی سے زیادہ سن کھا گیا تھا۔ مجھے آدھ موکر کے بھائیاجی نے  
کھیت کا جائزہ لیا اور جو کچھ سن پچی تھی اُسے اُدھے ہل (وہ ہل جو اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی مٹی اوپر کرتا ہے) سے  
کھیت میں باہ دیا اور اُسے ہری کھاد کے طور پر برت لیا۔

بتایا جی کہ میری بیماری کا علم ہوا۔ انہوں نے میرے لئے پکے ہوئے سوڑے تجویز کئے۔ سوڑوں  
کا موسم نہ تھا، انہوں نے وقتی طور پر کمر کس کھانے کو کہا اور ساتھ ہی بتایا۔ ”تیری بیماری منو گیا نک (نقیاتی) ہے“

وہ مجھے زیادہ کام کرنے اور کم سونے کی ہدایت کرتے۔ اُن کی پوچھ تاچھ کے دوران میں نے انہیں بتایا کہ سپن دوش تَب ہوتا ہے جب سپن میں موہنی (موہ مایا کی دیوی) آتی ہے۔ وہ مسکرا کر بولے۔ ”مَن میں بسے سو سپن دیکھے!“

بھائی جی ٹک پر رہتے تھے، اپنی روٹی آپ پکاتے تھے اور وہاں روٹی کی پوری سامگری رکھتے تھے۔ اُن کے پاس جتنا سامان ہوتا تھا، چھپتر کی بڑی کابجن (وہ لکڑی جس پر چھپتر کی اونچائی کا انحصار ہوتا ہے) سے بندھا ہوتا تھا۔ کبھی مجھے ٹک پر رہنا پڑتا تو میں اپنی روٹی آپ پکاتا۔ شروع شروع میں میری روٹی، ہندوستان کے نقشے سے ملتی تھی لیکن آخر میں تو بے جیسی گول روٹی بنانے لگا تھا۔

میری بڑی بوا کا چھوٹا لڑکا بنتا سنگھ میرے گاؤں آیا۔ اُس سے میری کار بھی چھنتی تھی۔ وہ آغوز بجانے میں ماہر تھا اور میں مرزا صاحبان گانے میں، مجھے گھر میں نہ پا کر وہ سیدھا ٹک پر چلا آیا۔ میں نے اُسے اپنے راز میں شریک کیا، اُس نے بتایا کہ وہ خود اس مرض میں مبتلا تھا۔ اُس نے جھٹ آزموہ دوا تجویز کی، افیون، میں افیون کہاں سے لاتا ہوں

رومیش کہتا تھا، ”نطع جماع سے رگوں کو پوری تسکین ملتی ہے اور ڈھیلی رگیں کس جاتی ہیں، جن کی وجہ سے دھات گرتی ہے۔“

تایا جی اپنی رائے دیتے تھے، ”مَاس شریوہ ترویہی ہے جو شریک، مانک، اتمک (جسمانی، نفسانی، روحانی) دھاروں سے نفعی ہے۔ یہ دھارا نزل ہو بھی مَاس نروگ رہتا ہے۔“

ان دونوں شخصوں میں سے مجھے پہلا آسان اور قابل اعتبار لگتا تھا۔ خیر، میں کسی سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ ایک کے اجزا میسر نہ تھے اور دوسرے کو آزمانے کے لئے میرے پاس راسخ ارادہ نہ تھا۔

گل لالہ کی بہار تھی جو ہمارے ٹک کے مشرق سے شروع ہو کر لڈراں کی حد سے اگے نکل گئی تھی۔ ڈوڈے لگ رہے تھے، جن کا رنگ پتوں کی طرح سبز تھا۔ اُن پر نظر ڈراتے ہوئے بنتا سنگھ نے کہا، ”تیرے علاج کا بندوبست ہو گیا ہے۔“

”کیسے! کہاں سے؟“ میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

”مجھے دھن و نتری کا بتایا ہوا فن آتا ہے۔“ اُس نے چار پانی سے اٹھتے ہوئے اور پوست کے کھیت کا رخ کرتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا، ”دھن و نتری نے سپن دوش کے لئے یہ اکسیر بتائی تھی اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا تھا۔ وہ کھیت میں بیٹھ گیا اور ڈوڈوں کو دیکھنے لگا۔“

تایا جی دھن و نتری کو حکیم زمانہ مانتے تھے اور اُس کا حوالہ دیتے تھے۔ ہر بڑی بوٹی کی افادیت مُسلم ہے،



کسی کو معلوم نہیں ہے تو وہ اُس کی اپنی جہالت ہے۔ "وہ بذاتِ خود بوٹیوں، بیجوں، نمکوں کے گُن ایسے جانتے تھے جیسے کسی تاریخ وال کو شاہی خاندان کے حسب و نسب معلوم ہوں۔ حکومتِ خدا کے برعکس وہ سلطنتِ زمیں کی اس تکونی مابیت کے متناخواں تھے۔

### عالمِ حیوانات

#### عالمِ معدنیات

#### عالمِ نباتات

جو برتاؤ دھرتی، بیج سے کرتی ہے وہی برتاؤ گیان، انسان سے کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ تایاجی کی باتیں حقیقتِ افروز اور اعتبارِ افزا تھیں۔ پرکاش کو گرگھ دتی تھی۔ گرگھ کے دن پورے ہو چکے تھے لیکن دردِ کہے اُتار نہ تھے۔ اُس کا پیٹ بھت بڑا تھا اس لئے ہر کوئی فکر مند تھا۔ سنتی دانی کہتی تھی کہ پہلو سٹھی کا بچہ ہے اور جو گھڑی اوپر ہو رہی ہے، حاملہ کے حق میں خطرناک ہے۔ اُس نے اُسے ملانی میں کسٹوری رکھ کر کھلائی جو بیکارِ ستا ہوئی۔ تایاجی سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے دلاصا دیا اور جنگل سے چرچٹا کی چھڑیں لائے اور سنتی کو دے کر بولے ایک بچھڑ کو گرگھ دتی کی ناف پر کمر کے گرد باندھ دے اور اپنا دوسرا سامان تیار کر لے۔

سنتی نے تالی ماں سے پانی گرم کرنے کو کہا اور خود کترنی کو سینک کر ٹھنڈا کرنے لگی۔ اُس کے بعد اُس نے موت کا دھاگا بٹا اور اُن دونوں چیزوں کو تھالی میں رکھ دیا۔ وہ تالی ماں سے کچھ پُرانے کپڑے اور کچھ زوئی کا انتظام کرنے کے لئے کہہ رہی تھی کہ پرکاش کو درد سے کراہنے لگی۔ سنتی نے ایک کے بعد ایک، سارے بچوں کو وہاں سے بھگایا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ دیر بعد خبر ملی کہ پرکاش کو رنے ایک صحت مند بچی کو جنم دیا ہے۔

اجیت سنگھ کا بیاہ قرار پایا تھا تو تایاجی کی تجویز پر ماں نے ریش برگد گھوٹ کر پی لیا تھا۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ ساس اور بہو ایک ساتھ بچے پیدا کریں۔ یہی بات کسی شاعر کو بھی ناپسند ہوگی ورنہ وہ یہ طنز کیوں کرتا ہے

نوہ سس دونوں گھمنائ

کون کس نوں دوسے پنجیری؟

(بہو اور ساس دونوں پیٹ سے ہیں۔ دونوں میں سے کون، کس کو پنجیری دے؟)

میں آفیون کھانے سے ڈرتا تھا۔ اُس کی ایک بُرائی، جسے میں بچپن سے جانتا تھا، قبض تھی۔ تایاجی

کی ہس رس کہانیاں آفیونیوں اور پوستیوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ میں آفیون اُس لئے کھانا چاہتا تھا کہ اس کا چمتکار دیکھنا چاہتا تھا۔ بنتا سنگھ کے لفظوں میں آفیون بہتے دھارے کو باندھ سکتی ہے، ہر باند کے رام بیلا کے میلے میں سنیا سی ایسی کار آمد جڑی بوٹیوں کا مرکب بیچتے تھے اور اُس کے بارے میں ایسے چٹکے سناتے تھے جو نفس کی خوابیدہ رگوں کو جگا کر گمادیتے تھے۔ بنتا سنگھ کہتا تھا کہ اُن ساری جڑی بوٹیوں کے گُن ایک آفیون میں

موجودہ ہیں۔ وہ جیسے آئیون پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک نہایت دلچسپ معاملہ ہے اور وہ اُس میں باہر تھا۔ وہ ایک بار گھر سے بھاگ گیا تھا اور ماہ میں آئیون لکھی کر کے روزی کما رہا تھا۔ ہمارے علاقے میں کسانوں کے پاس پوست بونے کا لائنس تھا، آئیون نکالنے کا نہ تھا اور لائنس کے بغیر آئیون نکالنا جرم تھا۔ ”کسی نے ہمیں آئیون نکالتے دیکھ لیا تو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ اُس علاقے کے پورے کسان بھائیابی کو جانتے تھے۔ میں نہ چاہتا تھا کہ کوئی پر خطرات اُن تک پہنچے جو میری شامت کا سبب بنے۔ ”ہم نے کون سی مَن بھر نکالی ہے۔ اشام کو کسان گھروں کو چلے جائیں گے اور ہم تھوڑے سے ڈوڈے چھیڑ دیں گے۔“ اُس نے بے دمہر کہا۔

وہ ڈوڈے چھیڑنے کی تیاری کرنے لگا۔ اُس نے جھنڈ میں سے ایک کانٹے دار جھاڑی تلاش کی جس کے کانٹوں کی لمبائی باریک درانتی کے دانتوں سے آدھی ہوگی۔ چاقو سے ٹہنی کاٹ کر اُس نے بالشت بھر لبا قلم بنایا، اُسے دیکھا، پرکھا اور مجھ سے پوچھا، ”اس میں کیا خاص بات ہے۔“ میں نے اُس کے ہاتھ سے قلم لے کر دیکھا لیکن وہ نکتہ نہ پاسکا جس کا اُسے علم تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا، ”یہ کانٹا مڑی ہوئی پچھری طرح ہے۔ اس سے کتنے ہی ڈوڈے چھیڑو، یہ ثابت رہے گا۔“ اُس نے کانٹے پر انگوٹھا پھیرا جیسے کاریگر، تیغ کی دھار دیکھتا ہے۔ مجھ پر دھاک جمانے کے لئے یا اپنے ہنر کا مظاہرہ کرنے کے لئے، اُس نے اپنی بانہر پر خراش لگائی۔ ماس پر لال لکیر پڑ گئی، لہو نہ نکلا۔ میں حیران تھا کہ اُس نے دیا کیوں کیا؟ میں پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ کانٹے کی تعریف کرنے لگا۔ کانٹے کی لمبائی بالکل ٹھیک ہے، انکھیں بند کر کے بھی خراش لگاؤ تو خراش، ڈوڈے کے کال کے اندر، باہر نہیں نکلیں گی۔ اس کام میں یہی احتیاط لازم ہے ورنہ آئیون، ڈوڈے کے اندر پس جاتی ہے اور آدھی بھی ہاتھ نہیں آتی ہے۔“

وہ چوتھی جماعت سے آگے نہ پڑھا تھا۔ اُس کی تجربہ کاری نے اُس پر جیسی فنی باریکیاں ظاہر کی تھیں وہ بصورت دیگر نامکن تھیں۔ وہ چاقو جس سے اُس نے قلم تراشتا تھا، اُسی کا بنایا ہوا تھا۔ اُس کا پھل، باز کی چوچ جیسا تھا اور اسی شکل کا اُس کا شیشم کی گری کا دستہ، جس میں تانبے کی سیخیں ٹھونکی ہوئی تھیں۔ وہ کس خسرے کہتا تھا، ”میں جس کسان کے پاس کام کرتا تھا وہ تار سے ڈوڈے تراشتا تھا۔ میں نے اُس کے لئے جو قلم بنایا تھا اُس سے آئیون کا حایل بڑھ گیا تھا۔“

بنتا سنگھ اُن پڑھ سہی، ہنرور تھا اور میں پڑھا لکھا جاہل۔ علی اور عملی رسائی میں اندھیرے جاہل کافر ہے۔ یہ کہا دین یوں ہی وجود میں نہیں آئیں۔  
۱۔ کرتا انسان، نہ کرتا شیطان۔

## گیان سنگ شاہ

۲۔ کرتا کرتا ، نہ کرتا اوتار۔

۳۔ کرتے کی بدیا۔

۴۔ نیم حکیم خطہ جاں۔

حافظ اتنے بڑے عالم تھے لیکن علم پر عمل کی برتری گردانتے تھے۔

نوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں

تا سید روی شود ہر کہ درد غش باشد

دُنیا میں اگر تجربہ کی کسوٹی ہوتی تو جھوٹے، رُوسیاہ ہوتے)

میں گھر سے بھاگنے کا ارادہ کرتا لیکن مجھ پر یہی خوف طاری رہتا کہ میں اپنی روزی کیسے کروں گا؟ بنتا سنگھ کو خود پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ جب چاہتا گھر سے بھاگ جاتا۔ بھوپھا کی غیر میں وہ پودی سپی (کسانوں کا کام جس کی اُمرت اساطھی اور ساوئی پر جنس میں ملتی ہے) اکیلا سنبھالتا اُس کی ماں اُسے دودھ اور مکھن کم دیتی، وہ اڑ جاتا، ”برابر کما تا ہوں، کم کیوں کھاؤں؟“

اُس نے ایک ڈوڈے پر دو خراش لگائیں، ایک ادھر دوسری ادھر۔

جلد گھائل ہوتے ہی اُس میں سے دودھ یا رس نکلا اور سطح پر ایسے ٹھہر گیا جیسے لبریز ساغز پر پانی۔ اُس نے خوش ہو کر کہا، ”کل شام تک یہ دودھ جم جائے گا جسے کھر دیا کرو گویا بنالیں گے۔“ اُس نے بسے بھی ایک قلم بنایا تھا۔ میں بھی ڈوڈے چھیڑنے لگا اور جب کام سے فارغ ہوا، میری انگلیاں سُرخ بجا رہی تھیں۔ میں نے اُسے انگلیاں دکھائیں، اُس نے کہا، ”یہی آئیون ہے، اسے چاٹ لے۔“

میں نے اُس مواد کو چکھا اور اُسے کھانوائی حد تک کڑوا کھیلایا۔ اُس سے میرا خروش ٹھنڈا کیوں کر میں اُس انوکھی اکسیر کی تاثیر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو ایسے چاٹا جیسے کٹا اپنے بہتے لگا تا رہا تھا ہے، اور پھر وقفہ وقفہ سے۔

تایاجی آئیون کو نزلہ، زکام اور جلاب وغیرہ کے لئے دوا مانتے تھے۔ وہ یہ تو ہرگز نہ بتاتے تھے چیز، دھات کے لئے بھی مفید ہے۔ اُن کے پیٹ کا درد ناقابلِ برداشت ہونے پر وہ آندے کی سفید تھوڑی سی آئیون ملا کر اُس کا لیپ لگا لیتے اور دیکھتے ہی دیکھتے آرام سے سو جاتے۔ کئی بار وہ لیپ سے کرتے اور کام میں جُٹ جاتے۔ اُن کے چہرے کا تناؤ جلتے جاتے جاتا رہتا اور وہ کام سے لُطف اٹھا لگتے۔ اُن کا عمل اس فراست کا ثبوت تھا کہ کام، درد کا بھی علاج ہے۔

سورج چھپ گیا اور مجھے رات کی روٹی کا فکڑ ہوا۔ بنتا سنگھ نے کہا، روٹی کا پکڑ چھوڑ

چوتے ہیں اور رات کاٹ لیتے ہیں۔“

نک سے کچھ دُور کماد کا کھیت تھا ہم دونوں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گئے اور دس بارہ گئے چُرا لائے۔ سَردی چُبھنے لگی تھی۔ ہم نے دھونی جلائی اور آگ تاپتے ہوئے گئے چُوسنے اور باتیں کرنے لگے۔ بنتا سنگھ نے کہا، ”میں تجھے ایک راز کی بات بتاتا ہوں، کسی سے نہ کہنا!“

”ٹھیک ہے۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے استیاق سے پوچھا۔

”بالکل خاص! گھر کی بات ہے۔“ اُس نے میرے شوق کو بڑھا دیتے ہوئے کہا،

”ایسی کیا بات ہے؟“ میرا لہجہ پہلے سے زیادہ بے قرار تھا۔ بنتا سنگھ سے میری کار دھی چھنتی تھی۔

وہ اپنا ہر راز مجھے ملتے ہی بلاتا مل بتا دیتا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ ایسی کون سی بات ہے جو اُس نے اتنی دیر سے چھپا رکھی ہے۔ اُس کی، بچکچا ہٹ پر غور کرتے ہوئے میں نے پھر پوچھا، اُس نے کہا، ”کسی سے نہیں کہنا! میں اپنی بھابی سُر جیت کو ر سے چھینس گیا ہوں۔ کل دوپہر ہم لگے ہوئے تھے کہ اوپر سے ماں آگئی۔ اُس نے اُسے کچھ نہ کہا لیکن مجھے گھر سے نکال دیا۔ یہ بات ابھی تک ہم تینوں کے بیچ تھی۔“ اُس کی ابتدائی جھجک نکلتے ہی وہ کھل گیا اور کہنے لگا، ”بھگت سنگھ نافزد ہے اور سُر جیت کو رکھڑا سوار چاہتی ہے۔“

ٹھنڈی رات میں گئے چُوسنے کا مزہ وہی جانتا ہے، جو کبھی اس عمل سے گُزر رہے، لیکن اُس رات گئے چُوسنا، عمل برائے عمل تھا۔ ہم کبھی باتیں کرتے آدھ کبھی گئے چُوستے اور اپنے اپنے انداز میں اپنے اپنے تجربے بیان کرتے۔ عملی طور پر بنتا سنگھ مجھ سے کہیں آگے تھا۔ ایک موقع پر اُس نے گنڈیری لُڈ کر کہا، ”گنوار کی کے اعضا گنڈیری کی طرح ہوتے ہیں، جسے دانتوں سے چُوسا جاتا ہے۔“

میری نفسانی کیفیت! میں جب تک گئے کہا سنا رہا، اُن گنوار یوں کے انگ چُوستا رہا جن تک میری خیالی رسائی تھی۔ باتوں باتوں میں دن چڑھ آیا اور وہ یہ کہہ کر لامبرٹے چلا گیا کہ وہ شام کو آئے گا۔ لامبرٹے میں اُس کی بہن پریم کو کا سُسرال تھا جس کا پتی لاہر سنگھ انڈین اکسیجن دلی میں سُپر وائزر تھا۔ بنتا سنگھ اُس دن شام کو نہ آیا۔ میرا سارا دن چھوٹے موٹے کاموں میں گُزر گیا۔ میں نے کئی بار ڈوڈوں پر ایفون جی ہوئی دیکھی لیکن میں نے اکٹھی نہ کی۔ وہ دوسرے دن دوپہر کو آیا۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے حیرت سے پوچھا، ”میں نے سمجھا تھا کہ تو چلا گیا ہے۔“

”کہاں؟“ دلی جانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ بی بی نے کہا ہے کہ وہ کچھ مدد کر دے گی۔ میں گاؤں نہیں جاؤں گا۔“ اُس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”یہ تو اچھا ہوا! تو بڑھی کا ہنر جانتا ہے، کہیں نہ کہیں کام مل ہی جائے گا۔“ امر سنگھ کہتا ہے، دلی

ہر دشا میں پھیل رہی ہے، غبارے کی طرح! میں نے امر سنگھ کے حوالے سے اُسے تسلی دی، ”اب اُن کا کیا کرنا ہے؟“ میں نے کھیت کی طرف اشارہ کیا۔

”اُس کا کیا کرنا ہے؟ اُسے اکٹھی کرتے ہیں۔“ اُس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کی نظر گنوں کے پھلکوں پر جا کر رُکی اور وہ اُن کی طرف چل پڑا۔ اُس نے دو پھلکوں سے دو کھوپے بنائے اور ایک کھوپا مجھے دے کر کہا، ”کھوپے کے باہر کے پاس پر آئیوں کھڑ چنا، اندر کا پاس کھڑ اور کبڑا ہے، اُس پر سے آئیوں اتارنی مشکل ہوگی۔“

مجھے لگا کہ وہ جو کام جانتا ہے اُس کے بارے میں پوری جانکاری رکھتا ہے۔ میں اسے پوچھے بغیر نہ رہ سکا، ”تو اتنا ہوشیار ہے، سکول سے کیوں بھاگ گیا؟“

”میں نے بہت زور مارا، چھوٹے بھائی! کالے اکثر میری سمجھ سے باہر میں۔“ وہ اپنی بے بسی پر مسکرا کر بولا۔

ہم آئیوں کھروچنے لگے اور کٹوریوں میں اکٹھی کرنے لگے۔ وہ کام ختم ہوا۔ اُس نے ہاتھوں کو سرسوں کا تیل مل کر آئیوں کو ہاتھوں میں لیا اور ایک آٹا بنا لیا۔ میں نے دیکھنے کے لئے مانگا، اُس نے میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ہدایت آمیز لہجے میں کہا، ”سنبھال کر رکھنا، نیچے نہ گرا دینا، ابھی آتا ہوں میں!“

میں نے اندازہ لگایا کہ اُس آٹے کا وزن اُس حجم کے گڑ کے گولے سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ آٹے کے دو پتے توڑ کر لایا، انہیں کپڑے سے صاف کر کے تیل سے چھڑا، مجھ سے آٹے لے کر اُس کے ایک جیسے دو آٹے بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا، ”اسے تو رکھے گا کہاں؟“

میں نے اُسے چھپانے کے لئے پہلے ہی نہایت موڑوں جگہ سوچ رکھی تھی، جھٹ کہا، ”نواڑی پلنگ کے بیچ میں!“ اُس نے میری تائید میں کہا، ”اچھی جگہ ہے! میں اپنی چیزوں کو اپنے کس میں رکھتا ہوں۔“ اُس نے اپنا آٹا پکڑی کے لٹریں باندھ کر پکڑی میں اُس لیا۔ میں نے اپنا آٹا دبا کر چپٹا کیا اور جیو مٹری کس میں رکھ کر بستے میں باندھ دیا۔ بنت سنگھ نے اپنے کھیسے میں سے دو گولیاں نکالیں جو قطر میں جنوں کے دانوں سے چھوٹی تھیں۔ اُس نے ایک گولی اپنے منہ میں رکھی، اُحاب دہن سے گلے میں اُناری اور دوسری مجھے دے کر کہا، ”لے کھالے خوراک کا بھی یہی حساب رکھنا۔“

گولی کھانے کے لئے میں نے اُسی کا انداز اپنایا۔ وہ چیز، دھات اور سین دوش کے حق میں واقعی اکیسیر تھی لیکن اُس سے میں ایک ناگوار الجھن کا شکار ہو گیا۔ میں جب کبھی خود فریبی پر مائل ہوتا، میرے آتماز کو انجام بڑی مشکل سے ملتا۔

## باب ۳۶

اک مرے چاہنے سے منتی نہیں بات کوئی  
تم بھی کچھ بات بناؤ تو کوئی بات بنے (شاطر)

میں اپنی ماؤسی شوکور کے ہاں کندھالے جا رہا تھا۔ راستے میں سین پور پڑتا تھا جہاں میری ماں کی بہیلی بستی رہتی تھی۔ ماں نے اُس کے لئے شکر قند باندھ دی اور کہا، اُس سے کہنا کہ گھر کی ہیں، بادی نہ ہوں تو اور منگو اے۔“

میں شکر قند کی کانٹھ، بستی کو دے کر کھڑے کھڑے لوٹ رہا تھا کہ اُس نے میل پائے کے سہارے کھڑی ایک لڑکی کو بٹھا دیا، نرمل، گیان تیرے گاؤں جا رہا ہے۔ تو جانا چاہتی ہے تو اس کے ساتھ چلی جا، آخر کا ساتھ ہے۔“

نرمل کو میں پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اُس کے بارے میں کتنا کچھ جانتا تھا! اُس کے ساتھ سماجی حادثہ ہوا تھا جو اُس کا جذباتی مسئلہ بن گیا تھا۔ اُس کی بڑی بہن کیسری مرگئی اور اُس کے باپ نے اُسے اپنے زندہ دے داماد گریت سنگھ کے گھر بٹھا دیا۔ جب نرمل کم سن تھی اس لئے گونا ملتوی رکھا گیا۔ نرمل بربر اپت (سیانی) ہوئی، اُس کا گونا دینا طے پایا تو وہ اڑ گئی اور اُس نا انصافی سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئی جو اُس کے ساتھ بچپن میں ہوئی تھی۔ گریت سنگھ نے پنج اکٹھے کئے، انہوں نے اُس کے ہت میں فیصلہ دیا اور نرمل کو سمجھایا وہ نہ مانی تو اُسے ڈرایا اور دھمکایا۔ اس پر وہ دھڑلے سے بولی، ”جیسے ہمدردی ہے، وہ اپنی لاڈلی اس ہڈھے کے گلے باندھ دے، جہاں تک میرا سوال ہے، میری جانے جوتی!“

اُس نے جوتی اُٹاری تھی اور بڈھے کے دے ماری تھی!

اُسے سبق سکھانے کے لئے تیجوں نے فیصلہ سنایا، ”گریت سیال! یہ تیری چیز ہے! تو اسے

اٹھا کر لے جا!“

اُن کی شہ پاکر گریت سنگھ آگے بڑھا لیکن گاؤں کے کچھ من چلے نرمل کے نکش میں کھڑے ہو گئے اور گریت سنگھ کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ جب پنچاست اُس کا حق دلانے میں ناکام رہی تو اُس نے کچھری کا راستہ اپنایا اور مقدمہ چلنے لگا۔ نرمل کی ساکھ پھلنی میں ڈالا چھاج میں اڑایا کی سی تھی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ وہ لڑکی کیل ہے! جس سے ملتی ہے، دھنس کر نکلتی ہے اور پھر اُسے ترپنے، مرنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ اُس کے بارے

میں کیسی کیسی باتیں گردش میں تھیں۔ اُن میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ! میں کیا جانوں۔ ہاں میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ دُؤنوں سے کہہ سکتا ہوں کہ غیبت وہ دائمی ندی ہے جو کسی سرچشمے کے برعکس آدمی کی زبان سے چھوٹی ہے اور زبان، زبان سے ہوتی ہوئی کہیں بھی جا نکلتی ہے۔

نرمل کا نام سن کر میں نے اُس لڑکی کو دوبارہ دیکھا جو پہلے پائے کے سہارے برآمدے کی لگی روشنی میں کھڑی تھی۔ اُس ماس آور ہڈیوں کے ڈھانچے کو اُس کے نام نے جو مہنی دیئے وہ روایتی اور کتابی نہ تھے۔ اُن کی رُزملتا کٹانے کی سی تھی جو زیادہ قریب آئے تو ہونہار کر جاتا ہے۔ اپنی سچائی وہ آپ جانتی ہوگی، لیکن جو میں نے دیکھا وہ الگ تھا۔ اپنے ارادے اور دل گردے کے مقابلے میں وہ معمولی ڈیل ڈول کی لڑکی تھی۔ مجھے اعتبار نہ آیا کہ وہ لڑکی جو پہلے پائے کے سہارے کھڑی ہے، پنچوں سے ٹکڑے کی طرح آویں گے اور سچ کے سامنے بیان دے سکتی ہے۔ اُس کا قد مجھ سے کچھ کم تھا اور بدن اکہرا۔ کوئی مسند رنگ تھا تو وہ اُس کے ذرا سے ابھرے ہوئے ہونٹ تھے۔ مجھے سامنے سے دکھائی نہ دیتے تھے لیکن پہلو سے دیکھو تو کاسر زانو کی طرح نظر آتے تھے۔ بستی کی تجویز نمائبات سن کر نرمل اندر بھاگی، جھٹ پٹ تیار ہوئی، باہر آئی اور اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اُس کی جلد بازی پر تبصرہ کرتے ہوئے بستی نے کہا، ”یہ کیا؟ میں نے تو یوں ہی کہا تھا، تو سچ چچ تیار ہو گئی!“

میں مسکرا پڑا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے گڑبڑ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اتنے میں بستی نے مجھ سے اور اپنی بیٹی سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر کہا، ”مٹیاریے (دوشیزہ)! مہمان کو لسی، چائے پلا، کیا پینا ہے پتھر؟“ کچھ نہیں، میں گھر سے کھاپی کر چلا تھا۔ میں نے نرمل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس دوران نرمل

شرمندہ سی مسکرائی۔ شرمانے سے پہلے اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور جذبات سے عاری، بے رنگ خاک کے سی طرح۔ اُس کے شرماتے ہی وہ نسوانیت کی دلکشی سے نکھر گیا۔ وہ جس انداز سے ایک انجانے کے ہمراہ سفر کرنے پر آمادہ ہوئی تھی، اُس سے اُس کی خود اعتمادی، جھلکتی تھی۔ میرے تصور کی پرواز مجھے لے اُڑی اور میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ وہ مجھ پر مہربانی ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی میری خاطر داری پر دوبارہ دھیان دیتا، میں بے سفر کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری جلدی میں تشویش کو دخل تھا۔ مجھے خدشہ لگ گیا تھا کہ بستی نرمل کو روک نہ لے۔

ہم بیدل چلتے چلتے گاؤں کے باہر پہنچے، میں آگے تھا اور وہ پیچھے۔ اس عرصے میں میرے دل میں کئی خیال گزرے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں ہر ایک کی حقیقت پر کھنا چاہتا تھا۔ اُن میں سے کوئی خیال ایسا نہ تھا جس کی اٹھان میں نفس کا خمیر نہ ہو۔ فرق اتنا تھا کہ کوئی خیال سہا سہا، ٹیڑھا ٹیڑھا منزل مقصود تک پہنچتا تھا اور کوئی دلیرانہ سیدھا۔ وہ چھوٹا سا فاصلہ جو ہمارے درمیان تھا، میں اُسے کیسے کیسے مٹا چکا تھا۔ میں نے رُک کر پیچھے نہ مڑ کر دیکھا، اُس کی اونچی ایٹری کی جوتی اُس کی ٹمکل نی ہوئی تھی۔ اُس کی دشواری سے لطف اٹھاتے ہوئے میں نے

کچھ ہچکچا کر کہا، ”یہ کسی نے تیرے ہی جیسی کے لئے کہا ہے، نرمل!“  
”کیا؟“ اُس نے جھینپ کر لیکن فوراً پوچھا۔

”جتنی کسوری پیریں نہ پوری، ہائے ربا دے مینوں ترنا پیا۔ میری جوتی کسور کی بنی ہوئی ہے لیکن تنگ اور تکلیف دہ ہے۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ مجھے چلنا پڑ رہا ہے“ اُسے رضا مندا پا کر میری تشویش، زندہ دلی میں بدل گئی اور میں نے برجستہ کہا۔

”یہ جانتے ہوئے بھی تم مجھے پیدل چلا رہے ہو! سائیکل پر کیوں نہیں بٹھالیتے؟“  
وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اگے بڑھی اور سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے پیازی ساٹن کی قمیض شلوار کھنی تھی اور اُسی رنگ کی اورھنی جو سینے پر بے مطلب پڑی تھی۔ اُس کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے اورھنی اتار سر سے باندھ لی اور اُسے اس دھنگ سے ڈیڑھ گرهہ دی کہ اُس کے دونوں سرے اوپر نیچے لہرانے لگے۔ وہ جس زادے پر کھڑ تھی وہاں سورج کی روشنی، چہرے پر سیدھی پڑتی تھی جس کی چمک کو وہ ہاتھوں سے روک رہی تھی۔ اُس کی دوشیزگی، بود و دیوار کے سائے میں بچھی بچھی سی تھی، برا بھلا بھی دسی ہی تھی۔ اُس میں کوئی دلکشی نہ تھی، کوئی کچھ تھی تو وہ میری ہوس پرستی کی لپک سے تھی۔

”تم جانتے ہو کہ میں تمہیں پہلے ہی سے جانتی ہوں؟“ اُس نے جس بے اختیاری سے کہا اُس سے شوقِ ملاقات ظاہر ہوتا تھا۔

”وہ کیسے؟“ میں نے سوال کا جواب سوال میں دیا اور بڑی مشکل سے اُس فاصلے کو برقرار رکھا جسے میرے لحاظ سے اُس نے مٹا دیا تھا۔

”ست پال کو نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ تم گاتے بھی ہو۔ جتنی کسوری گاکر سناؤ ناں!“ اُس نے اپنی خواہش کا اظہار مسکرا کر کیا۔

وہ بار بار مسکرا رہی تھی جیسے وہ جانتی ہو کہ اُس کی مسکراہٹ اُس کی سادگی میں رنگ بھرتی ہے۔ اُس ناگہاں ملاقات کا زرا پہلو یہ ہے کہ اُس وقت تک میں اُس سے ہزاروں باتیں کر چکا تھا۔ اُن باتوں کے الفاظ دل نواز اور معنی جاں گداز تھے۔ وہ اس قدر لطیف تھے کہ میں انہیں زیر لب بھی ادا کرتا تو اُن کا حال، پامال ہو جاتا۔ لپکتی ہکتی ہریالی، مناظر کی خوش ادائی، جاں آفریں تنہائی اور اُن سب سے زیادہ دل آرا تصور سازی! میں وہ البیلا تھا جس کی دل داری کے لئے نرمل کے بھیس میں ’موہنی‘ اُتری تھی۔

کسی اور موقع پر میری بے اختیاری میری ترنگ ہوتی تھی۔ میں گاؤں میں کسی لڑکی سے دور ہوتا، اُسے رجوع کرنے کے لئے اونچی تان میں گاتا اور تمنا کرتا کہ اُسے پاس بٹھا کر گیت سناؤں۔ نرمل مجھ پر وارد ہوئی



تھی اور وہ خواہش کرتی تھی کہ میں اُسے گیت سناؤں لیکن اُس کی خواہش سے میں خوش نہ تھا۔ میں نے اپنی حالت اپنے دل کے آئینے میں دیکھی۔ میری رگیں آپس میں الجھ رہی تھیں اور میری آمد میں کشمکش کی بد نظمی تھی۔ میرے متلون نظموں اور نرمل کی اداؤں میں کوئی ربط نہ تھا۔ میں نے اپنے خیال میں گیت کے سرگنگنائے جو بالکل پھیکے تھے میں اپنی تجقیر کے ڈر سے خاموش رہا اور اپنی کھوئی ہوئی سنجیدگی کو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ فاصلے پر رہتے چل رہا تھا جس کا پانی پگھلندی کاٹ کر گزرتا تھا۔ نرمل نے اڑ میں سے چلو بھر کر کچھ پر پھینکا اور ادا سے چل کر کہا، ”سناؤ ناں! ست پال کہتی تھی کہ تم بہت اچھا گاتے ہو۔“

وہ اڑ پر بیٹھ کر پانی سے کھیلنے لگی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے ضیافتِ نفاذ دے رہی ہو۔ میں اُسے دیکھتے دیکھتے لپک گیا اور میں نے اظہارِ مدعا کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اپنی راہ ہموار کرنے اور اُسے بھرمانے کے لئے، میں گانے لگا۔ وہی الفاظ جو میری لے کی روانی ہوتے تھے، جسے سے تھے۔ میں نے انہیں رگوں کی پوری گئی دے کر پھیلایا، وہ قدرے رواں ہوئے لیکن اُس گئی سرود سے بیگانہ رہے جو میری تنہائی کا ناز و نمو ہوتی تھی۔ میرا گیت بے جان الفاظ کا سلسلہ تھا جو میرے حلق سے شروع ہو کر ہونٹوں پر ختم ہوتا تھا۔ میرے اندر کا کلاوٹ گھٹے گھٹے سانس لے رہا تھا جیسے بیمار ہو۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی، میں خاموش ہو گیا۔ میں کیا کروں؟ میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ پایا۔ جیسے تالاب میں لنگر پھینکنے سے دائرہ و درائرہ کی دائرے ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے جیسے لگتے ہیں لیکن بے معنی ہوتے ہیں، میری حالت کچھ دسی ہی تھی۔ ایک خواہش پوری طرح واضح نہ ہوتی تھی کہ دوسری سزا اٹھالیتی، اُسی طرح تیسری ہوتی اور... اچانک وہ مسکراتی ہوئی اٹھی، میرے پاس آئی، گنگنائی ہوئی مٹری اور جا کر اُسی جگہ بٹھ گئی اور پھر پانی سے کھیلنے لگی۔ اُس کی یہ ادا سلی کی طرح تھی جو کسی کے سامنے پھول پر سے اڑے، لہرائے، رہ جائے اور وہیں جا بیٹھے جہاں سے وہ اڑی تھی۔ وہ دل ربا اندازِ جذبات کی خوشبو سے لبریز تھا۔ خوشبو کی خوبی ہے کہ یہ جیسے چھو لے اُسے ہکا دیتی ہے۔

”تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ ہو رہا ہے!“

”کیا ہو رہا ہے؟“

میں عاشقانہ جذبات سے محو تھا۔ میری رگ جہاں، میری زبان کی طرح کانپ رہی تھی جیسے وہ کسی ناگہان خطرے سے دوچار ہو۔ میں اُسے چھونا چاہتا تھا، پیار کرنا چاہتا تھا لیکن حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ہم خیالی سے شہ پاک میں ازارے باہر نکل پڑا۔ ”او، وہاں جھاڑیوں میں چل کر بتانا ہوں!“

”میں ایسی دلیبی نہیں ہوں! میں...“ اُس نے اپنے غصے پر کسی قدر قابو پا کر کہا اور مجھے تیز نگاہی سے

دیکھا۔ اُس کے الفاظ، اُس کے مجروح جذبات کا عکس تھے۔

میں دھک سے رہ گیا۔ میں اُس ردِ عمل کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ میں نے اُس کے سامنے جو تجویز رکھی تھی وہ میری بواہوسی کی ننگی تصویر تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ میری تجویز پر لبیک کہے گی اور خود کو خوشی سے میرے حوالے کر دے گی۔ اُس کے منفی رویے پر میں خوف سے کانپ گیا۔ گاؤں میں ایسا ہوتا، میں بھاگ کر کھیتوں میں چھپ جاتا، رات گئے باہر نکلتا وہ بھی ادھر ادھر دیکھتا ہوا، لڑائی کی بواہاس پاتا ہوا۔ اب کیا ہوگا؟ اپنی بد ذاتی پر ٹھہرنا ہو کر میں نے نظر جھکا لی اور میں افسردہ افسردہ چل پڑا۔ میں وقتی طور پر بھول گیا کہ نرمل میرے ساتھ ہے۔ میری خوش فہمی کہ ہر لڑکی مجھ پر مروتی ہے اور جان چھڑکتی ہے، غارت ہو گئی۔ پہلی بار مجھے اپنے ناک نقشے کی خوبصورتی پر شک ہوا۔ میرے ذہن سے آواز بھی خیال نہ گزرا تھا کہ کوئی لڑکی مجھے انکار کر سکتی ہے۔ میرے اسی خیال نے میری بُردلی کا حوصلہ بڑھایا تھا اور مجھے پیش دستی پر اُکسایا تھا۔ میں نے سائیکل کے آئینے میں دیکھا، چہرے کی جاذبیت وہی تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ آنکھوں میں سنجیدگی تھی جو شوخی سے بھلی لگتی تھی، چڑی کے دونوں کڑا آنکھوں کے بیرونی گوشوں کو چھو رہے تھے اور برابر کھینچی دو کمانوں کی صورت مستعد دکھائی دے رہے تھے۔ میں چلتا چلتا رک گیا۔ اُردو، ہتھیلیوں سے سنوارے، بلیکس، پوروں سے سہلا میں، اور ہونٹ، زبان سے تر کئے، اپنے رنگ دھنگ سے مرعوب ہو کر میں نے نرمل کو اُس کی نظر بجا کر دیکھا۔ وہ میرے مقابلے میں مہولی سی لڑکی تھی۔ میری خودی نے مجھے باور کرایا، تو نے اُس کے سامنے اسی تجویز رکھ کر اُس کی عزت بڑھائی ہے۔ اس وقت میں نے انجانے میں خود سے سوال کیا ہے خودی ہے کیا بلا؟

میرے ضمیر نے مجھ سے جو کہا ہے وہ میرے بیان کے بالکل اُلٹا ہے۔ میں پریشان ہوں اور اُس کی بات کو نظر انداز کرنا چاہتا ہوں۔ میں مزید واقعہ بیان کرتا ہوں تو میرا ضمیر شور مچاتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ میں اُس کی بات کو رقم کروں اور میں لکھنے پر مجبور ہوں۔ خودی، مَن مانی، گستاخی، زبردستی، چھینا جھپٹی... ہرگز نہیں! رضامندی، پاسداری، رواداری... دلیل ہے۔ جو اول صورتِ حال کو خودی سمجھتا ہے، وہ مزاج کا حالی ہے اور غارت گر ہے۔

نرمل نہ آہستہ نہ تیز اپنی رفتار سے آہی تھی اور جوتی اُنار کہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ وہ برہمن لگتی تھی۔ اُس نے سر سے چُنری کھول کر سینے پر اوڑھ لی تھی اور سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی دلچسپی نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ سوچ کی رعنائی میں عجب رسائی ہے! یہ اس سے ملتی اُس سے بچھڑتی اپنی رعونت میں کہاں سے کہاں جاگتی ہے۔ ویسے حالات میں میں نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا اور دوسروں کو اپنی مدد کے لئے بلایا تھا۔ نرمل نے اپنی حفاظت کرتے ہوئے مجھے صرف ڈانٹا تھا اور دراز دستی سے روکا تھا۔ اُس کی اخلاقی جرأت نے اُس کے بارے

میں میرے سارے گمانوں کو بڑے اکھاڑ دیا۔ میں نے اُس کے ساتھ جو بدستی کی تھی، اُس پر مجھے افسوس ہوا۔ میں رُک گیا اور نادام سا اُس کا راستہ دیکھنے لگا۔ وہ میرے قریب آئی اور غلافِ امید رُک گئی۔ وہ پریشانیِ خاطر سے عاری تھی اور مطمئن سی تھی جیسے اُس نے میری بدتمیزی کو معاف کر دیا ہو۔ اُس نے مجھ سے نظر ملا کر جس حیا سے آنکھ چرائی، اُس میں دوشیزگی کی پاکیزگی تھی۔ وہ اچھوتی ہے! یہ لطیفِ احساس مجھے پہلی بار ہوا۔ میری رُک جانا سازِ نوحِ آفر کی طرح بچ اُٹھی۔ وہ ایک طرح سے میری کھری مثال تھی۔ میں کیسے کیسے روند اُگیا تھا! بدنام ہوا تھا! حالانکہ میری بدنامی میں سچائی برائے نام نہیں تھی۔ میں مہک گیا جیسے میں نے پُرانے کپڑے اتار کر نئے پہن لئے ہوں۔ میں نے شرماتے اور جھجکتے ہوئے کہا، ”زُریل جی! میں اپنے کپڑے پر چل رہی ہوں، مجھے معاف کر دیجئے!“ اُس نے جوتی، کیر پر رکھ کر میرا ڈوٹھام لیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے کہا، ”یہ کیا ہے! میں تمہیں، خونِ معاف کر سکتی ہوں! تم جیسے ہو، اچھے ہو اور میرے ہو! میں ایسا نہ سمجھتی تو تمہارے ساتھ نہ آتی۔“

زُریل جوتھی تھی! دلیر لڑکی تھی۔ اُس میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ اُس کی مصلحت نے میری ہوس کو پھر بھڑادی اور مجھے بہکا گئی۔ زُریل کٹواری ہے اور تم پر مرقی ہے! تم کٹواریے ماس کی لذت سے نا آشنا ہو، وہ چیز ہی اور ہے! یہ نادر موقعہ چلا گیا تو چلا گیا! میری رگیں لطفِ تازہ سے ناچنے لگیں۔ میں نے اُس نازک جذبے اور بلند اخلاق کو بے حسی اور بدکاری کی آگ میں جھونک دیا جس کی میں نے اپنے آہانتِ کمیز حالات میں دوسروں سے آرزو کی تھی۔ میرے قارئین میری ریاکاری پر غور کریں! اپنے خرموجِ نفس کے لئے میں ہر بدردو میں ڈوبتا پھرتا تھا لیکن میرا ناپاک دل پو تر خیل کا پیا سا تھا۔

تیا جی کہتے تھے، ”عدیل، دوسرے کی غلطی سے سیکھتا ہے اور اپنی غلطی سے عبرت حاصل کرتا ہے۔ ذلیل، دوسرے کی غلطی اُچھالتا ہے اور اپنی غلطی چھپاتا ہے اور اپنی سہل پسندی کی وجہ سے اپنا مقابلہ اپنے سے کم تر سے کرتا ہے اور یوں پستی سے پستی میں گرتا ہے اور آخر کار حدِ ضمیر سے گزر جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ طریقے سے انجام کو پہنچتے ہیں۔ پہلا اپنے کمال سے اور دوسرا اپنے زوال سے۔“

میں ابھی تک دوسروں کے اعمال کا نکتہ چیں رہا ہوں۔ میں زندگی کے اُس موڑ پر اُگیا ہوں جہاں مجاہدِ نفس ضروری ہے ورنہ میری کہانی کی یکتائی برقرار نہ رہے گی۔ نجات اور عسرتِ فطری اور ابدی جذبے ہیں۔ ان میں بہت نازک فرق ہے جسے سمجھنے کے لئے کڑی دیانت داری درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکتہ چیں کسی کے بارے میں کچھ بھی کہتا ہے لیکن جب اپنی بات کرتا ہے تو اپنے عیب میں ہنر دیکھتا ہے اور جانبِ داری قائم رکھتا ہے۔ اس زوے سکول کے زمانے کی ایک یاد تازہ ہو گئی ہے۔ کئی بار استاد، خود سزا نہ دیتے تھے اور قصور دار سے

کہتے تھے کہ وہ اپنے منہ پر آپ ٹھپڑ مار لے۔ وہ جس طرح اپنے منہ پر ٹھپڑ مارتا تھا اُس کی وضاحت ضروری نہیں ہے۔ آپ میں سے ہر کسی نے وہ منظر دیکھا ہوگا! ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت سچ یہ بھی ہوا ہو۔ اس کے علاوہ اپنی کمزوری اپنے منہ کی بدبو کی طرح ہے، جو محسوس نہیں ہوتی ہے اور اگر کبھی ہوتی ہے تو بُری نہیں لگتی ہے۔

”گیان جی! مجھے رنج سے بڑھ کر افسوس ہے کہ آپ نے بھی مجھے دوسروں سے الگ نہیں جانا!“  
 نرمل نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر جذبات سے چھلک کر کہا۔ اُس کے لہجے میں تنبیہ، مٹا کر کایت تھی۔ اُس کی بے گناہی کہہ رہی تھی کہ وہ میرے دل سے مخاطب ہے۔ اُنکھوں ہی اُنکھوں میں اُس نے کچھ اور بھی کہا جس کی تغیر اس شعر میں ملتی ہے۔

تیری میری اک جندڑی

رَب دو کلیوت بنائے

اُس نے خود کلامی کے سے انداز میں مجھ سے کہا، ”تم میرے تصور کے شہزادے ہو۔ میں سین پور آئی ہی اس لئے تھی کہ تم سے رسم درہ پیدا کر سکوں۔ میں بدنام ہوں، میں جانتی ہوں۔ میں تمہارے گاؤں اس لئے نہ آئی کہ تمہاری ماں مجھے پہچانتی ہے لیکن میری تمنا ہے کہ تمہیں میرے پاس کھینچ لائی جائے۔ میں مانجھ سویرے تمہارے گاؤں کی طرف سیر کو جاتی تھی اور لوہاراں دے باغ میں بیٹھ کر تمہاری راہ دیکھتی تھی۔ میں کاکوں اور ہواؤں کے ذریعے تمہیں سندیش بھیجتی تھی، سو تو وقت تمہارا نام لے کر سوتی تھی، عین اپنے دیوتا کی طرح! مجھے تمہیں بھوک لگانا ہے جس کے لئے میرے پاس انمول پدارتھ ہے۔ اس کاکوی بدل نہیں! کیوں کہ وہ صرف کٹواری کا دھن ہے“  
 تخیل پر جذبات مسط ہوں تو یہ سُر اب کی مانند ہے اور خطرناک حد تک ناقابل حصول اور گمراہ کن۔  
 اُس کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں پہلی بار عجیب کشش میں گرفتار تھا۔ میرے ذاتی نفس کو باہر کھینچ کر میرے اندر بند کر گھس بیٹھا تھا جو رواداری کے معنی دجانتا تھا۔ اُس کی رنگوں میں لہروں کی نرم روی کے برعکس طوفانِ موزن تھا جو رنگ اس کی راہ ڈھونڈتا تھا۔ ہم چلتے چلتے بلوال کے قریب پہنچ گئے۔ اب جو کے ادھر آہوں کا گھنا باغ تھا۔ نرمل کے مشورے پر میں نے ادھر کا رخ کیا اور میں باغ کے وسط میں جا کر بٹکا۔

حیثیت کا روح پرور مہینا تھا۔ یہی وہ وقت ہے جسے بسنت رانی نے سیر و تماشا کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اُس کی آمد کی نوید پاک درخت پُر اسنے لباس اُٹارتے ہیں اور نئے پہنتے ہیں۔ فہلیں لہلہاتی ہوئی لگناتی ہیں، گویا دوشیزاؤں کے رقص و سرود کی نقل اُتارتی ہیں۔ پھول بھونروں کو رس دیتے ہیں اور بدلے میں اُن سے رنج لیتے ہیں۔ ہوا سے بہار، جو ہر جہات لگاتی ہے اور پرندوں کو خوشبوئے نفس سے سرشار بناتی ہے۔ اُن کی پرواز میں نچنے کی لے اور آواز میں مستی ہے ہوتی ہے۔ اُن کی ایک سی خوبی، انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور

اُن میں باہمی چاہت کی ترنگ اُبھارتی ہے۔ وہ پَر پھلاتے، پَر پھیلاتے، پَر بھٹ پھٹاتے مَن موہنی حرکتیں کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دل جیتے ہیں۔ یہ اُسی فضا کی کرامت ہے جو کُل کو تَرَم دے کر کوئے سے جُدا کرتی ہے اور اُس کے کالے رنگ میں ایسی چمک بھرتی ہے کہ وہ سیاہ پتوں میں چھپی صاف دکھائی دیتی ہے، حاسد کوئے، اُس کا بیچھا کرتے ہیں، اُسے ستاتے ہیں لیکن وہ دِل رُبا آواز میں چیخاتی ہے گویا اُن کا ٹھٹھا اُڑاتی ہے۔ اُس بیارے نظارے کا حصہ بننے کے لئے نیلا آسمان، دھرتی پر اُتر آتا ہے لیکن اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے اُسی کے پھولوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

میرے قارئین! میں اپنی طبیعت کی ایک انوکھی کیفیت بیان کرتا ہوں، جس کے برتے پر میں اپنی کہانی لکھنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ میں اس قدر نازک مزاج ہوں کہ حساس لمحوں میں اپنی بیتابی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہوں۔ لمحے عیش کے ہوں یا غم کے دونوں اپنے اپنے طریقے سے مجھے اُکساتے ہیں اور اپنے اضطراب میں ایسا اودھم مچاتے ہیں کہ میرا دماغ بد نظمی کا زرم گاہ بن کر رہ جاتا ہے۔ میرے احساسات کی حالت اُن بے گسوں کی سی ہوتی ہے جو بھگدڑ میں ڈھے پڑے ہوں۔ اُن میں سے اکثر پس کرنا بد ہو جاتے ہیں، جو کمال تقدیر سے بچ نکلتے ہیں وہ شدتِ غم سے گونگے رہتے ہیں۔ میرے چاہنے پر بھی وہ میرے بارے میں کچھ نہیں بتاتے جس کے وہ چشم دید گواہ ہوتے ہیں۔ میرا بیٹلا پن، میں مطلوب حادثے کو اُس کی خاک سے کریدتا ہوں، اُن ذروں کو اکٹھا کرتا ہوں جو میری بے کسی کے شاہد ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں اور سچے دوستوں کی طرح مجھ سے ہمدردی جتاتے ہیں اور اُس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس کی تفصیل میں بھول چکا ہوں۔ دھیرے دھیرے لیکن پورے اعتماد سے میں اُس واقعے کا مکمل حصہ بن جاتا ہوں جو کبھی ہو کر بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں میرے جذبات، میرے مشاہدات میں شریک ہوتے ہیں اور صحیح الفاظ چننے سے پہلے مجھے اُسی حقیقی زندگی سے متعارف کر دیتے ہیں۔ اُن کے اس ردیے سے میرے عیش و غم کی عمر اُس کی اصلی عمر سے جہاں لمبی ہوئی ہے وہاں ول گداز اور فکر انگیز بھی۔ اپنی بنیادی حقیقت میں میرے حادثے کسی معنوی خوبی سے محروم تھے اور اُسی طرح میری دھڑکنوں کی کیفیت کوئی حقیقت نہ تھی۔

میں زبل کو متنوع پھل کی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ جس بیباکی سے گھرے بھاگ جانے کی تجویز رکھتی تھی وہ انتباہ کی حد تک ٹھیک لگتی تھی۔ اُس کا کردار اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے آگ میں سے گزر سکتی ہے۔ اُس کی باری تو ڈنھانے، مرتے دم تک وفاداری والی بات تھی وہ اپنے بچوں کے بارے میں سوچتی ہوئی اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اُس کے بچے، میری طرح خوبصورت ہوں گے۔ اُس نے اپنے پہلے بچے کا نام تک چن رکھا تھا، نرمل گیان! جو لڑکی اور لڑکے دونوں ہی کے لئے مناسب ہے۔ وہ میرے زانو پر سر رکھے

پسنے بساتی اور میرے پاس ہو کر کئی بار دُور نکل جاتی۔

میری رگوں میں جو طرب ہوس موجزن تھی وہ نفس کے محدود حلقے سے نکل کر خیالوں کی بسیط فضا میں پھیل گئی تھی۔ ہر جذبے کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ مرکزِ جمال سے بھٹک جائے تو اپنی بے راہ روی میں معدوم ہو جاتا ہے۔ میں خود کو سمجھتے ہوئے اور اپنے مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے تھیں کہ چپکا تھا کہ میں بیاہ نہیں کروں گا۔ نرمل کی باتوں میں بیاہ کی بات (اور وہ بھی گھر سے بھاگ کر) یوں آتی کہ ہر بات اُسی بات سے شروع ہوتی اور اُسی بات پر ختم۔ میں اپنے جنوں میں بھی ویسا نہ سوچتا تھا۔ میں باتوں ہی باتوں میں اور حرکتوں ہی حرکتوں میں اُس پر واضح کرتا کہ مجھے اُس کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اُسے، میری لیکن اُس طرح نہیں جس طرح وہ چاہتی ہے، جس طرح میں چاہتا ہوں۔ وہ میری بات کو خاطر میں نہ لاتی۔ جوں ہی میں ممنوع حدود سے اگے تجاوز کرتا، وہ مجھے پرے دھکیل دیتی، دوستانہ ملامت بھری نظر سے دیکھتی اور دُور جا کر بیٹھ جاتی۔ ایک ایسے ہی موقع پر وہ میرے پاس نہ آنے کی سوگند کھائے بیٹھی تھی کہ اُس پر بھونڑا مند لایا۔ اُس نے دوپٹے کی اڑ سے خود کو بچایا اور اُسے مار بھگایا۔ اُن کی اُن میں بھونڑے نے دوبارہ حملہ کیا اور پھر تو جیسے اُن دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اُس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بھونڑا ہٹلا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ اپنے منہ پر دوپٹہ تان کر اُٹھی، اُسے چمکے دے کر بھاگی اور جھپاک سے مجھ پر آگری۔ اُس نے اُس کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ ڈر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے سرسری ہاتھ اٹھایا جو اُس کا لے کھوٹے پر پڑا۔ وہ ایسا گر کر پھر نہ اٹھا۔ نرمل نے اس سے استخارہ لیا، مجھے تحینِ آفریں مسرت سے دیکھا اور اپنے ہاتھ کا بوسہ دیا۔ اُس میں سے گلاب کی بھینی بھینی خوشبو آئی۔ کچھ دیر پہلے اُس نے کھیت کی باڑ میں سے تازہ گلاب توڑا تھا اور توڑتے ہی مسل ڈالا تھا جیسے اُس کا کھلنا اُسے ناگوار گزرا ہو۔ اُس نے احساسِ حمایت سے میری آنکھوں میں دیکھا اور پھر جھٹ سے مجھ سے چپک گئی جیسے وقتا طیسی کشش کی زد میں آگئی ہو۔ کچھ دیر ویسے ہی چپکی رہی اور پھر میری آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

میری ریا کاری! میں نے جب دیکھا کہ میری جلد بازی بے سود ہے، میں نے پہل نہ کرنے کا فیصلہ کیا، اس لئے وہ جس حالت میں پڑی تھی، اُسے پڑی رہنے دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ شبکیاں لے رہی ہے۔ میں نے اُس کا چہرہ اٹھا کر دیکھا، پلکیں گاؤں تک بھیگ رہی تھیں۔ میری ہوس کاری نے ہمدردی کا روپ دھار لیا۔ میں نے اُس کی مسرت بھری آنکھوں میں تاکا جو ایک خاص انداز سے حسین تھیں۔ وہ انہیں بند کرتی تو نیم ہنسنے، پنکھڑیاں لگتیں اور پلکیں، رگ گُل۔ میرا خیال ہے کہ ایسی ہی آنکھ دیکھ کر کسی کو نرسِ شہلا کا خیال آیا ہو گا۔

”گیان جی! یقین کیجئے! میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!“

اُس نے آہ بھر کر نظر چرائی اور اپنا چہرہ میرے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

میں نہایت جذباتی ہو کر جذباتی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نرمل جب سے بیاہ کا تذکرہ کر رہی تھی، میں اُس سے ڈرنے لگا تھا۔ ایک جہتی کے لئے دو دلوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ورنہ کچھ کہنا سنانا کہنے سننے کے مترادف ہے۔ وہ میری طرح جذباتی تھی لیکن الگ طریقے سے اور دل پر قابو کئے ہوئے تھی۔ میں کئی بار رکتے رکتے آگے بڑھا، اُس کے اقرار و گریز کو سمت دیا اور اُسے سپردِ گردی پر آمادہ کیا۔ اُس کی مصالحت، آغاز میں عجوری کی تھی جو رفتہ رفتہ پسندیدگی کی صورت اختیار کر گئی۔ مخالف جذبات کی اسلحہ، خواہش و صل کی ہمت بنی اور اُسے شوق و وصل پر آمادہ کی۔ اُس وقت ہمارے اعضاء اُن آشنائوں کے سے تھے جو ایک دوسرے کی امنگ کا پوری دیانت داری سے احترام کرتے ہوں۔ باہمی اعتماد نفس کا فٹوں اُس وقت ٹوٹا جس وقت میرے اعضاء دیانت میں خیانت کے قصور وار ہونے کے نزدیک تھے۔ زہل کا محنت طرہ، مجھے احساس دلایا تھا کہ اُس کی مجھے سے محبت شعوری ہے اور میری ایمانی۔

میں جن حالات میں رکھا ہوا تھا اُن نے مجھے ازدواج بے زار بنا دیا تھا۔ میں شادی کو زندگی کی خوشیوں کا مدفن سمجھتا تھا اور بچے غیر ضروری ذمہ داری جہاں تک خروجِ سیل نفس کا سوال ہے، میں مستقل عورت پالنے سے خود غریبی کو کھسا اطمینان بخش جاتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے قارئین مجھے بدخو اور گمراہ سمجھ کر کوئی الزام عائد کریں، میں بچوں کے بارے میں مزید وضاحت کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں بچوں کو آدمی کی اخلاقی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ زندگی ایک حادثہ ہے! میں پیدا نہ ہوتا تو یہ کوئی افسوسناک معاملہ نہ تھا، لیکن یہ ضرور شرمناک بات ہے کہ میں بچے پیدا کر کے اُن کی پرورشِ شیعے سے نہ کرتا۔ میں اسے فردا کی فطرت کہوں کہ اسرافِ فطرت! گمانِ حمل سے یقینِ حمل تک کھربوں زندگیاں تلف ہو جاتی ہیں۔ اُمید اُن کا ضائع ہونا نہیں، اُمید یہ ہے کہ جو پیدا ہو، اُس کا پائے پوسن ناقص طریقے سے ہو۔ جس کسی کے ساتھ ایسی نا انصافی ہوئی ہے، اُس کا وجود اسقاطِ حمل سے بدتر ہے۔

میرا یقینِ صادق ہے کہ محبت کرنا تو بڑی بات ہے، دو آدمی ایک جھٹ کے تلے نہیں رہ سکتے اگر وہ ہم خیال نہ ہوں۔ راوی کا بیان ہے، جوڑیاں جگ تھوڑیاں، تڑپ تھیرے۔ دو دلوں کا ملن شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ ایسے ہے جیسے مرکبے تیل کے گٹھے سے بانہی ہوئی اُریل گائے۔

میں نے کوئی گھر ایسا نہ دیکھا تھا جہاں میاں اور بیوی میں جو بچیں نہ لڑتی ہوں۔ تایا جی فہم و فراست کی مثال تھے لیکن وہ تائی سے جیسے نباہتے تھے، وہی نباہ سکتے تھے۔ اُن کے جلن سے سرعوب ہو کر میں ذہنی شتوں کا ایسا قائل ہوا کہ یہ تاثر بُری انفرادیت کے ساتھ مجھ پر ابھی تک تسلط ہے۔

نرمل نے یہ تجویز بار بار رکھی کہ ہم نندیڑ بھاگ چلیں اور وہاں جا کر شادی کر لیں۔ میں ایسی لالباہی کی رسوائی جانتا تھا۔ میرے گاوں کی آفرور، سرائیں، کھگے کے ساتھ اُدھل گئی تھی۔ کئی سال بعد اُن کی خبر ملی تھی کہ وہ نندیڑ کے گرد دارے میں لنگر کے جھوٹے رتن صاف کرتے ہیں اور وہیں کھانا کھا کر جیتے ہیں۔ میں اُس کے منصوبے کو صاف لفظوں میں رد کر چکا تھا اور وہ ایسے ہی کئی اور امکان تجویز کر چکی تھی۔ جذبہ کوئی بھی ہو، اُس کی نفسیاتی خوبی دیوار میں اُگے پودے کی تکرشی سے ملتی ہے۔ اُسے توڑو، مروڑو، اگھاڑو۔۔۔۔۔ وہ ہر بار نئی توانائی سے سر اٹھاتا ہے اور اپنے جھوٹے سے دُجود کے برعکس نمایاں لگتا ہے۔

سورج ڈوبنے لگا۔ درختوں کے ننھے پتے نرمل شیشوں سے چمکنے لگے۔ شام کی ٹنکی، دن کی گرمی پر اثر انداز ہونے لگی۔ ہر بانی ٹھنڈی ہو کر سُکڑنے لگی گویا اوس کا بوجھ اٹھانے کے لئے خود کو تیار کرنے لگی۔ اُدھ کھلی کو پٹلیں، شانوں کی جانب اُٹھک پڑیں جیسے سردی میں شیر خوار بچے، ماؤں سے گد مڈھ جاتے ہیں۔ آسمان صاف تھا۔ دُور مغرب میں بادلوں کے مہین مہین ٹھکڑے ہلکے ہلکے رنگوں سے چمک رہے تھے۔ اُن میں وہ بھرک نہیں تھی جو عام طہرِ افق کی رنگینی میں ہوتی ہے۔ بدی کے پہلے دن کا پاکہ تھا، چاند بے نور نکلا۔ تاجدِ نظر دھوئیں کا نشان نہیں تھا۔ ہم آبادی سے کافی دُور تھے۔ پرنڈے واپس لوٹ رہے تھے جن میں کونوں کی تعداد زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے بارے میں تایا جی پیش گوئی کرتے تھے، ”ایک دن ایسا آئے گا کہ ہر طرف کوئے ہی کوئے دکھائی دیں گے! وہ اپنی بات کو اس طرح حق بجانب بتاتے تھے کہ کوئل کون کوئی کھانے کے لئے پکڑتا ہے اور نہ رکھنے کے لئے۔ یہ ہر کسی کے اندے پی جاتے ہیں لیکن اپنے اندوں کے پاس کسی کو پھٹکتے نہیں دیتے۔ اس طرح ان کی آبادی بے روک ٹوک بڑھ رہی ہے۔ پرنڈے گھونسلوں میں مٹھیں ہو رہے تھے اور باغ کا برہم شدہ سُکوت دھیرے دھیرے اپنی اصلیت کی طرف لوٹ رہا تھا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن حسبِ معمول ڈراؤنی نہ لگتی تھیں۔ اُن میں دُور برپا ہنگامے کی سی لے تھی۔ سپتِ ریشیوں نے دن سے آنکھ مچولی کھیلنا بند کیا اور رات کے انگن میں ڈیرا جمالیا۔ نرہرہ کے چہرے کی لالی پھسکی پڑی، چاندنی دودھیا ہو گئی اور سایے، سیاہ۔ پتوں کے سایوں میں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی، میدانی چاندنی سے زیادہ سفید تھی۔ درخت پُر اُمر طریقے سے آسمان کو چھونے لگے اور اُن میں چمکنے ہوئے جھگوٹے منٹھے بتارے سے دکھائی دینے لگے۔ شبنم آثرِ برگ و بار، تنخیزِ زندہ آئینوں سے دُھندلا گئے لیکن فضا کو بھیسی بھیسی خوشبو سے مہکا گئے۔ میرے خواب و خیال شوق و ہیجان اور رگ و ریشہ خود زادہ گرمی سے پکنے لگے، جو شدتِ ارتدّد و فصل کا حاصل ہوتی ہے۔

ہم دہیں رات گزارنے کا ارادہ کر چکے تھے اور یہ فیصلہ نرمل ہی نے کیا تھا۔ وہ مجھ سے بڑر تھی



اُدھ بیک بھی۔ جہاں تک جھوک پیاس کا مسئلہ تھا، دونوں میں سے کسی نے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جیسے رواداری نفس ہی جسمانی ضرورت کا مُداوا ہو۔ ہم جس کرب سے گزر رہے تھے اُس کی انتہا نشاۃ تھی۔ اُس کیفیت کو پانے کے لئے نرمل میری ہی طرح بے چین تھی لیکن اپنے غمبند پیماں پر۔ جوں کہ وہ میری طرح بدعین نہ تھی اس لئے میرے عکس شامت اور متاثر تھی۔ رات گہری ہوئی، رگوں کی گرمی فضا کی ہفت کوروک نہ سکی اور وہ ہڈیوں میں اترنے لگی۔ بھاری کپڑوں کے بغیر کھلے میں رات کا طئی مشکل تھی۔ مجھے اس کا اندازہ تھا اور میں نے اپنی ساکن کو خبردار کیا تھا لیکن وہ 'جو ہو سو ہو' کی رنگ میں تھی۔ ہم بیٹھے بیٹھے جھنے لگے اور اُٹھ کر گھومنے لگے۔ رات کا جاؤ بکل نکلا تھا۔ ہر چیز وہی تھی لیکن رات کے اندھیرے اُجلے میں انوکھے طریقے سے دل فریب ہو گئی تھی۔ ہر وجود نے اپنی کا یا ہی پلٹ لی تھی۔ آبِ جو میں درختوں کے سایے ایسے نظر آتے تھے جیسے سیاہ مسّت، آئینہ دیکھ رہے ہوں۔ ریتلے کنارے مرمریں راستوں سے چمک رہے تھے۔ ہریالی، کالے ہرے لباس میں زیادہ راحت آمیز تھی اور خوش گوار جذبے کی طرح خوش نما بھی۔ دھرتی کی ممت پر خلوص ماں کے محاسن تھے جو بوقتِ آرام اپنے لاڈلوں کو لوری دے کر سلاتی رہتے اور درازی عمر کی دعا بھی دیتی رہتے۔ چاند ایسا سا فرخ تھا جسے منزل پر پہنچنے کی جلدی نہ ہو۔ ستارے اُن مشتاق طالبِ علموں کی طرح تھے جو اپنے دانش ور معلم سے رازِ آفرینش سننے کے لئے سر پا گوش ہوں۔

ادھر ادھر خرام کرتے ہوئے ہم نے باغ کے آخر میں ٹوڑی کا کپّ دیکھا، جو لگا ہوا تھا۔ ہماری نثر بے تکلف اور مکمل تھی۔ ہم نے کپ کے منبر سے بھا پے اٹھائے اور آند گھس گئے۔ ٹوڑی کی گرمی اور نرمی میں پلش کے بستر کا آرام تھا، اُس کے باوجود ہم نے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزاری۔ مجھے نیند آتی تو نرمل مجھے کھلا کر جگا دیتی اور وہ سوتی تو ہیں، اُسے اپنے طریقے سے۔ اپنا مطلب زکا لینے کے لئے میں نے اُس سے وعدے کئے، محبت کے فریب دیئے لیکن اُس کے پاس محبت کے الگ معنی تھے۔ اُس نے اپنی محبت کے پردے میں مجھے مخصوصیت سے بُھایا، آنسوؤں سے بہکایا، آواؤں سے بھرمایا اور وعدہ فردا سے گرایا لیکن کسی حالت میں اُس جلد سے آگے نہ بڑھنے دیا، جہاں اُس کے خالق نے خود لیکر کھینچ رکھی تھی۔ اُس کے جذبہ نفسانی کی نفسیات! آدمی کی عورت میں دل چسپی، اُس کی پاک دامنی تک ہے۔ آدمی، عورت کو رندی بنا سکتا ہے لیکن رندی کو گھر میں نہیں بسا سکتا۔ میرے جذبہ نفسانی کی نفسیات میں کا تک کے متاثرے کتنے کی طرح تھا۔ وہ اپنی مستی میں ہر کتب کو سونگھت پھرتا ہے اور جہاں داؤ لگتا ہے، چل پڑتا ہے۔

سویا ہوا تو میں نے آگے ماسی کے ہاں جانے کا ارادہ بدل دیا اور نرمل کو کھڈیالہ کے موٹر سٹیڈیہ

پہنچ کر گھروٹ آیا۔

## باب ۳۷

بنایا آئینہ جس نے یہ اُس کا مقصد تھا  
ہنر میں اپنے کوئی عیب ہو تو دیکھ سکے (شاہ)

جہاں تک اخلاقی قدروں کا سوال ہے، سو میں سے ننانویں کسر سونائیں مگر بدکار ہیں لیکن اعتراف نہیں کرتے ہیں۔ کسر صفر ایک، جو شریف ہیں، اُن کی شرافت محنتِ تحقیق ہے۔ ہنر ہی ایسی سچائی ہے جس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ہنر، اخلاق نہیں، صحیح عمل ہے اور ایسی تحریک ہے جس کی حرکت لازوال ہے اور وقت کی مُعاصر بھی۔

تقسیمِ وطن کے بعد پنجاب میں قحط کی سی حالت ہو گئی تھی۔ گیہوں کا بھاد پانچ روپے سے بڑھ کر تین روپے فی من ہو گیا تھا۔ گیہوں خرید کر کھانے والے اپنے غم و غصے کا اظہار یوں کرتے تھے، ”میسے کھا کر بیٹ بھڑنا، کنک کھانے سے سستا ہے۔“

گھر میں باجرے، مکئی اور بیٹلڑے کی روٹی پختی جو سب اور مکھن کے ساتھ کھانے کے باوجود گلے میں اٹکتی لگتی۔ جس دن خالص گیہوں کی روٹی پختی، گھر میں تقریب کا سماں ہوتا۔ ہر کوئی اپنی بے قراری کا اظہار کرتا، پہلی روٹی میری ہے! پھر وقت آیا کہ ماں صرف مہانوں کے لئے گندم کی روٹی پکاتی۔ مہانوں کو لذیذ روٹی کھاتے دیکھ کر تین خون کے گھونٹ بیتا اور دل ہی دل میں انھیں کوستا۔ ایک واقعہ سُنئے جو میری کم ظرفی کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے گیہوں کی روٹی کا اہتمام کیا۔ میں اس قدر للچایا گیا کہ روٹی کا سواد میرے منہ سے رال بن کر ٹپک پڑا۔ کھانا، مہان خانے میں پروسا گیا جو سوئی سے کچھ دُور ہے۔ میں وہاں گرم گرم کھانا پہنچاتا اور ہر بار ایک دو روٹیاں راستے ہی میں ہڑپ کر جاتا۔ ماں نے تقریباً ایک آدمی کے لئے آٹا گوندھا تھا، اُس سے دو کا پیٹ کیوں کر بھرتا؟ اُس نے جھٹ پٹ اور آٹا گوندھا، وقفہ پاٹے ہوئے حیرت سے کہا ”گیان! تیرے چھوٹے بھائی نے زیادہ ہی کھانے لگے ہیں۔“

بیکاری پہلے بھی تھی لیکن اتنی نہ تھی۔ اب ہر کوئی بیکار تھا اور تلاشِ معاش میں نکل رہا تھا۔ تیرنگ

کہتا تھا کہ یہ بڑھتی ہوئی آبادی کی لعنت ہے، جس گھر میں ایک تھا وہاں کم سے کم پانچ ہیں۔ جو گھر آدمیوں سے بھرے رہتے تھے وہاں قسم کھانے کے لئے آدمی نہ تھا۔ دلی پر پنجابیوں نے دھاوا بول دیا تھا۔ جو کوئی نیچے پیروں، پھٹوں پر انوں سے دلی جاتا، جٹلمین بن کر لوٹت اور ڈینگ مارتا، دلی جاو، کماؤ دھاوا سُست سے سُست پنجابی، چُست سے چُست چار پور بیوں کے برابر ہے! اس زبردست کوچ کو حکمتِ علی سے نہ روکا جاتا تو شاید پورا پنجاب، ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جاستا۔ میں نے پہلی بار اُن شہروں کے نام سنے جنہیں میں تاریخ و جغرافیہ کے وسیلے سے جانتا تھا۔ جاگر بھیور کو روکشیتر اور پانی پت جاگرایا۔ میں نے اُزیرہ بھگتس اُس سے پوچھا، کہتے ہیں کہ وہاں کی دھرتی لہو جیسی لال ہے! تو نے تو دیکھی ہے، کیا یہ سچ ہے؟

”بالکل لال ہے، شکرگ کی طرح!“ اُس نے کچھ اس طرح کہا کہ میرا شوق بڑھا دیا۔

دھرم چند کہتے تھے کہ انگریزوں اور امریکہ کی خوش حالی کا راز، صنعت اور زراعت ہے۔ کچھ حکومت کے ایما پر اور کچھ عوام کی کوشش سے وہی ہونے لگا۔ کسان گادوں میں اور نہروں شہروں میں اپنے کمال دکھانے لگے۔ اُن مٹی سٹائی دیسے لگی اور اُن ہونی ہونے لگی، دیسی مال چلے گئے کہ ولایتی؛ کئی دکان دار دیسی مال کی بفارش کرتے، میرے بھروسے لے جاو! دس داری کے برابر نہ چلے تو بدل مفت! ہماری دکان پر سترہ سین آنے لگے۔ وہ اپنے مال کے بارے میں سینہ ٹھونک کر کہتے، یہ ایکسل، یہ کپ، یہ یرم، یہ گراری، یہ فری و میل یہ چین۔۔۔ دس داری کے مال سے بڑھیا ہے پہلے استعمال کرو، پھر مول دو!“

ہریانہ میں چنگی کھل گئی۔ درشن سنگھ ہوشیار پور سے سائیکلوں کے پُرزے چھپا کر لاتا اور چنگی بچاتا چنگی حُر تاک میں رہتا۔ جب چنگی بھرنی پڑتی، درشن چنگی کے نظم و نسق کو رد کرتے ہوئے کہتا، ”ہم جتنا محنت سے کھاتے ہیں اُس سے زیادہ یہ حرام زادے بیٹھے بٹھائے لے جاتے ہیں!“ اُس کے رویے سے لگتا جیسے حُر محصول وصول کر کے گھر لے جاتے ہوں۔ سائیکلوں کا سامان تھیلے میں چھپایا جاسکتا تھا اس لئے درشن، چنگی بچانے میں کامیاب ہو جاتا تھا لیکن لکڑی، گڈے میں بھر کر آتی تھی، بھائیاجی اُسے کیسے چھپاتے! وہ چنگی حُر سے مل جاتے۔ وہ ایک دو گڈوں پر محصول دیتے اور کئی کئی گڈے بچا لیتے۔

کستوری لال بجاج، درشن سنگھ کا دوست تھا۔ وہ اکثر دکان پر آتا اور کپڑے لئے کی باتیں کرتا۔ اُس کی ایک بات اُس تہذیب پر روشنی ڈالتی جس کے بانی ہندوستانی تاجر تھے۔ ”انگریزوں کے زمانے میں تھانہ کے سچے ہوتے تھے بلکہ ناپ سے ایک ادھ گز زیادہ نکلتے تھے۔ آج کل کے تھان کس کس کرنا اپنے سے بھی پورے نہیں اُترتے، آدھا پاؤ گز کم ہی پڑتے ہیں۔ پہلے جس تھان میں کپڑا ذرا خراب ہوتا تھا، اُس پر سیکنڈ کو ایڈجسٹ لکھا ہوتا تھا، اب یہ اصول ہی ختم ہو گیا ہے۔“

مغربی پنجاب کا زرخیز اور نہری علاقہ پاکستان کے حصے میں پڑا تھا۔ مشرقی پنجاب میں زیادہ تر مارا زمین تھی اور کھیتی کا انحصار جِرس، رَہٹ اور ڈھینکلی پر تھا۔ کسانوں کے کھیت بکھرے ہوئے تھے اور ڈانڈے سینڈے جھگڑے کا جھونپڑا بنے رہتے تھے۔ بڑکوں کا نام و نشان نہ تھا۔ کسان محنتی تھا لیکن منظم نہ تھا اس لئے غریب تھا۔ شرمار تھیں کوزمین الاٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اشتمال اراضی شروع ہوئی اُس صورت حال پر کسی شاعر نے شعر موزوں کیا جو کھاوت کی طرح مشہور ہو گیا۔

بسدھی بڑک سر بیاں نوں جاندی

اَنھال ہویاں راہ پُچھداں

(کوئی لڑکا کسی لڑکی سے بات کرنے کے بہانے پوچھتا ہے کہ کھیتوں کو کون سی

راہ جاتی ہے؟ لڑکی غصے سے کہتی ہے۔ لگتے تو آندھا ہے! سامنے دیکھ،

کھیتوں کو بڑک جاتی ہے۔)

پنجاب میں آتم زواہ (خود نمونی) کی جنگ چھڑ گئی۔ محکمہ زراعت و ترقیات کی سرگرمیاں سورج کی کرنوں کی طرح پھیلیں اور کھیت کھیت محسوس ہوئیں۔ پلئے اور ڈالکے کے ساتھ گاؤں کی لغت میں زراعت کا اضافہ ہوا۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتے اور کسانوں کو مشورے دیتے۔ پہلے ایکھ اور جوار کی کھیتی کو کسوا (سلائی) پڑتا تھا جس کا علاج، راکھ سمجھا جاتا تھا۔ اب زراعت کے دفتر میں شکایت کرنے سے وہاں سے زراعتی کتے اور سپرے پمپ سے ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ یا دوسری کیڑا مار دوا چھڑکا جاتے۔ مٹی کے معاینے ہونے لگے اور کیمیا کی کھاد کے نمونے مانے جانے لگے۔ تقادی کے طریقے جاری ہوئے اور اُس کے ساتھ ہی اعلیٰ رقم کے بیجوں کی تقسیم اور اُن کے بیجنے کے نئے طریقے۔ لیکن دھان کے بیجنے کا طریقہ دہی رہا، جو تھا اور کھاوت کی شکل میں دہرایا جاتا تھا۔ بیٹی اور دھان کا پودا اسی جگہ نہیں پھلتا، اسے اُگھاڑ کر لگایا جاتا تھا، باہمی مقابلے کا رواج پڑا۔ جو کسان فی ایکڑ زیادہ اگانا، انعام پاتا۔ کُلا اور بنجر تو ٹوٹے جانے لگے اور کمزور زمین کو طاقت کے ٹیکے دیئے جانے لگے۔

میرے بھی قارئین میرے اس عجیب بیان پر حیران ہوں گے کہ کمزور زمین کو طاقت کا ٹیکہ کیسے دیا جاسکتا ہے؟ کمزور خطے کی مٹی میں زرخیز خطے کی مٹی ملانا پیوند لگانا ہے۔

اس ترقی کا اثر براہ راست کسان کی جیب اور اُس کی سمجھ بوجھ پر ہوا۔ رہٹوں پر رنجن لگائے جانے لگے اور 'بورویل' کے چرچے ہونے لگے۔ گاؤں میں پہلا بورویل، سرون سنگھ نے لگایا جو رہٹ کی ایک بٹا دس قیمت میں لگا۔ جو کوئی بورویل کی دھار کو دیکھتا وہ بے ساختہ کہتا، "چار رہٹوں کے برابر ہے! پہلا

## گیان سنگ شاہر

ٹریکٹر کیلاش ہتے نے خریدا۔ اُس کا باہنا دیکھ کر شاید ہی کوئی ہوگا جس نے یہ نہ کہا، ”اس نے جتنی دیر میں ایسکڑ بھڑ زمین باہی ہے، کل اتنی دیر میں ایک شیا ڈلگاتا ہے۔“

چھوٹی صنعتوں کا کمال! کرو سکر کے مقابلے میں مقامی ڈیزل اینجن ایک تہائی پر پکے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے کسان بڑے کسانوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ ایک ساہی زمین دو ساہی ہو گئی اور پھر تو زمین کئی کئی فصلیں دینے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھادیاں، تِلن، دَلن (کھانے والی اَشیا، تیل نکالنے والی اَشیا، دَلنے والی اَشیا) کا حاصل بڑھ گیا۔

اس ترقی کو سراہتے ہوئے تایا جی کہتے، ”جو کام دُعاؤں، پوجا پاٹھوں اور دیوی دیوتاؤں سے نہ ہوا وہ آخر انسان نے کر دکھایا۔ امتحان، ترقی کا گرجہ استھان ہے۔“ اُس پر گنتی سے ڈگ ملاتے ہوئے انھوں نے اپنے خیال کو یوں سنوارا،

لکھاں چندے اگون، سُدج چہڑھن ہزار

گیان جوت پن مانسا، جیون گھور اندھیار

(اگر لاکھوں چاند آگ آئیں اور اُسی طرح ہزاروں سُدج! وہ سب بیکار ہیں کیوں)

کہ انسان کے جیون کا اُجلا، گیان کی روشنی سے ہے۔)

پہلے گندم بس گندم تھا، اب گندم، ناموں خاص کر غبروں سے مشہور ہونے لگا۔ نئی قسموں کی ٹوبی

یہ ہے کہ ان کے خمشتے پرانی قسم سے لمبے اور تنے چھوٹے ہیں۔ ہر طرف ایک نئے انقلاب کے چرچے ہونے لگے، تیز انقلاب!

بھاکڑہ ڈیم مشہور ہو رہا تھا اور ساتھ ہی یہ افواہ کہ گورنمنٹ پانی میں سے بجلی نکال لے گی اور

کسان کو کھیتی کے لئے پھوکا پانی دے گی جس سے فصل کا حاصل گھٹ جائے گا۔

اس ترقی کے پس پردہ ایک زوال بھی آیا۔ میرے پڑھنے والے کہیں گے کہ کيسا زوال؟ کیمیائی

کھادوں اور نئے بیجوں سے فصلوں اور بہتر یوں کے حاصل بڑھے لیکن اُن میں سے وہ لطیف ذائقے جاتے رہے

جو گوہر اور سبز کھاد کی پیادوار تھے۔ یہ زوال ایسا نازک زوال ہے جس کے ہونے کی تصدیق صرف

ذہنی ذوقِ سلیم کر سکتا ہے جو وقت کی پرانی اور نئی قدروں سے الجھ کر جیابے۔

## باب ۳۸

زندگی کے ہزار پہلو ہیں  
اور کوئی نہیں کسی سے کم (شاہ)

میری کتاب کے اگلے صفحات میری زندگی کے تاریک ترین باب ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اُن اندھیروں کا ذکر کروں، میں اپنے قارئین کے ساتھ کچھ ایسے لمبے بانٹنا چاہتا ہوں جو میری فطرت پسند طبیعت کی دریافت ہیں اس لئے میرا اذکارِ درتہ ہیں۔

بھائیاجی نے ڈھولباہے سے پرے جنگل خریدنا جو کہ شوالک کے عین دامن میں ہے۔ میں بچپن ہی سے پہاڑوں سے رومانی لگاؤ رکھتا ہوں۔ پوس ماگھ کی برسات سردی میں، میں سویرے چھت پر ڈھوپ سینکتا اور ہمالہ کا نظارہ کرتا۔ برف سے لدی چوٹیاں، خوش لباس دوشیزاؤں کی طرح پہنا دے بدلتی اور اٹھکیلیاں کرتی لنگتیں۔ اُس دوران میں کبھی چھت پر آتی، سب سے اونچی چوٹی کی طرف اشارہ کر کے کہتی، ”وہیے کیلاش پر بیت، شوجی، پاروتی کا سنک! گنگا مینا وہیں سے نکلتی ہے۔“

میں پوری یکسوئی کے ساتھ لہرائی اور بل کھاتی گنگا مینا کے کنارے شوجی، پاروتی کو دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن مھنڈلی بکروں اور بدلتے رنگوں کے علاوہ کچھ نہ دیکھ سکتا۔ بڑھتی ہوئی روشنی کی چمکا چوند میں کیلاش پر بیت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا اور میں سوچتا، جو پہاڑ اس دوری سے اتنے سرسبز خیز اور حسین ہیں، وہ قریب سے کیسے دل، آمیز اور رنگین ہوں گے!

میں نے سراپا شوق بن کر بھائیاجی سے گزارش کی کہ میں جنگل میں اُن کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ وہ چنگی منودشا (اچھے موڈ) میں تھے، جھٹ مان گئے۔ زاوراہ کے لئے ماں نے اٹلے میں پیٹ دے کر پراٹھے بنائے اور اُن کے ساتھ آم کا اچار اور پیاز لوازم کے طور پر دیئے۔ بھائیاجی اشیائے ضرورت کے لئے گاؤں آتے جاتے رہتے تھے۔ انھیں جو کچھ لے جانا ہوتا وہ رات کو پٹلیوں میں بھر کر بوری میں رکھ دیا جاتا۔ میں نے بوری سائیکل کے کیریئر پر باندھی، چارسل کی ایور ریڈی، بیٹری جھولے میں رکھ کر ہینڈل سے لٹکائی، کھڑے کھڑے کسی پی اور سائیکل آندر سے باہر نکالی۔ بھائیاجی پہلے ہی پرتلا باندھے اور کرنج لٹکائے صحن میں ٹہل رہے تھے،

کے نام جو ہوں سو ہوں! ان کی دیدِ راحت فراتھی۔ بھائیاجی منزل کی دھن میں اور میں حسنِ فطرت سے حفظ اٹھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں اُداس ہوا اور نہ ہی تھکا، کیا تضاد تھا! میں آٹاپسانے کے لئے ہریاڑ جاتا، وہ دو میل لمبا راستہ بڑی مشکل سے ختم ہوتا۔ میں گاؤں کو میلوں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اور میں کُل ترکی طرح تازہ۔ جہاں کہیں انوکھا منظر نظر آتا، میں نظارہ کرنے کے لئے رُک جاتا۔ میرے اور میرے بھائیاجی کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا، جسے میں مستِ پچھیرے کی طرح بھاگ کر طے کرتا اور پسینے کے ٹون سے ہلک کر فوہ نو ہو جاتا۔ میرا رویہ دوپٹہ تھا۔ میں بگولے کی طرح تیز کام اور کہیں نسیم کی طرح نرم خرام تھا۔ میں کوئی نیا منظر دریافت کرتا اور اُس کے ساتھ چپک کر رہ جاتا۔ کھجور اور برگہ کے درختوں کو آپس میں پیٹے دیکھ کر مجھے زل کی یاد آئی۔ وہ اسی طرح کھب کر گئے ملتی تھی۔ اُس مزیدار یاد میں رہ کر میں منزل ہی بھول گیا۔

بھائیاجی نے مجھے پکارا تبھی وہ جاؤ ٹوٹا اور میں دوڑ کر اُن کے پاس پہنچا۔ وہ مولسری کے نیچے سائیکل کھڑی کر کے اب جو میں ہاتھ منہ دھو رہے تھے

حسنِ فطرت ہر جگہ اپنی خوبصورتی کے کمال کو پہنچتا ہے لیکن یہاں اُس کے کمال کو جمال حاصل تھا۔ خوب تر، خوب کامنٹا قیض ہے! میرے گاؤں کی اب جو یہاں کے مقابلے میں بیچ نظر آئی۔ گھنے جنگل میں وہ کھلا فطرت کا گوشہ نمائش تھا۔ دودھیاریت، بے داغ سفید چادر تھی۔ اب جو کے کنارے، دوتارے کے تار تھے، جن پر وہ اپنا راگ الاپتی تھی۔ ابرق کے دَرے، نیلے تھے، گھونگے، ناترا شبیدہ میرے اور سیب، جڈ کی نتھی طشتریوں، آفتاب، مینار نور تھا اور درخت اُس دولت بے بہا کے بے اجرت پہرے دار۔

میں بے قابو ہو کر پانی میں کود پڑا۔ میں یہاں غوطہ لگاتا اور وہاں اُبھرتا۔ ادھر تیرتا ادھر لہریں پکڑتا۔ وہ سراپا نزاکت محبوب کی طرح چلک کر آغوش سے نکل جاتیں اور ذرا دور ہوتے ہی اداسے ناز سے بھاتیں۔ وہ دوشیزہ کی طرح پاکیزہ تھیں اور چھوٹی موٹی کی طرح باخیا۔ میری نظر سُبک سے بحرے کی طرح لہروں کے زیر و بم پر تیرتی کبھی شاید نظارہ بن کر دور دراز کا احاطہ کرتی اور فطرت کی کاریگری سراپا مئی۔ فطرت کی بے احتیاطی بھی قابلِ داد ہے! پہاڑ اُونچے نیچے نہ ہوتے تو بد صورت لگتے۔

عملِ فطرت، عملِ انسان کے برعکس حد کثرت سے گزر کر حسنِ فطرت بنتا ہے، اس لئے عملِ فطرت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی زیادتی میں پاکیزگی ہے۔ اس پاکیزگی کی فیصلیت، اس کی نفسیات محو بالذات ہے۔ اس سے رسم و رواج پیدا کرنے کے لئے حسنِ نظر کے ساتھ افرادِ اشتیاق ضروری ہے ورنہ یہ اپنی رفاقت کی لطافت سے بے فیض رکھتی ہے اور اپنی حقیقت بانٹنے سے احتراز کرتی ہے۔ وہاں ہر منظر اس قدر حسین اور رنگین تھا کہ اُس کے سامنے اقبال کی اُرزو بھیک لگی۔

میں اُس حُسنِ لامتناہی سے سکول کرتا ہوا بھائیابی کے پاس جا کر بیٹھا۔ وہ گھٹنے پر پیاز رکھ کر  
 مچکے سے توڑ رہے تھے۔ انہوں نے پیاز اٹھیلیوں میں دبا کر پُور اریج میں انگوٹھا گھسا کر پھاڑا اور میرا جھٹکے  
 دیا۔ ہم نے پراٹھے کھا کر اب جو سے پانی پیا اور ذرا استنا نے کے لے لیٹ گئے۔ نرم ہوا کے جھونکے، جھولے کی  
 طرح جھلا گئے جیسے لہریں دے کر سلا گئے۔ چھکی کھلی، میں نے دیکھا، مجھ پر پھول ہی پھول پڑے ہیں۔ پھولوں کے مانند  
 مولسری کی دریا بت میرے لئے حیرت و مسترت کی موج تھی۔ وہ لوگ کوتاہ بین ہیں جو کہتے ہیں کہ درخت بے زبان  
 ہیں۔ میری روحانی پستی میں درختوں کی قربت، میری بالیدگی کی تحریک رہی ہے۔ میں نے اپنے وہند میں محسوس کیا کہ  
 میرا آخری قدم کرنے کے لئے ارنیانی (جنگل کی رانی) نے مولسری کا بھیس بدل لیا ہو۔

وہ ماحول باطِ رنگ و نور تھا اور قنطریٹ کا انوکھا میوزیم اور نرالا رُو۔ اپنی لگائی اور اپنی آرائش کی ذمہ دار  
 اُس کی اپنی بڑائی تھی۔ کوئی شے نہ بے عمل لگتی تھی اور نہ ہی نظر میں کھٹکتی تھی۔ جن جھاڑیوں پر پھول نہیں تھے ان کی کونڈیں  
 پھولوں جیسی تھیں۔ حُسنِ فطرت کا جمال بے مثال ہے۔ زوالِ حُسن بھی کمالِ حُسن ہوتا ہے۔ ہرے پتوں میں مرمجھائے  
 پہلے پتے، آسبابِ زینت تھے۔ مکڑی کے جالے، کتاں کے دامن اور ان میں پھنسی ہوئی تتلیاں، رنگ برنگے پیل  
 بوٹے تھے۔

آدمی کی طرح درختوں کو بھی بڑا بننے کا خبط ہے اور جو کامیاب ہوتے ہیں وہ اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ  
 آدمی سے زیادہ بے رحمی سے کرتے ہیں۔ بڑے درختوں کے نیچے جھیل میدان نظر آتے ہیں۔ ایسا نظارہ اکاؤ کا ہوتا  
 ہے ورنہ شہرِ فطرت کی گہا گہا، ہمہ بودی کے اُصولوں پر مبنی ہے۔ آسمان کے پاس سنگترہ، سنگترے کے پاس انگوٹھا، انگوٹھا  
 کے پاس شہتوت، شہتوت کے پاس زرد آؤ، اِس پر طرہ یہ کہ ہر کوئی اپنی ذاتی خوبی سے مالا مال اور طرزِ حیات پر نازاں۔  
 یہاں کے باشندوں میں مسابقت جذبہ بدرجہ اتم ہے۔ ان کے حیرت انگیز طور طریقہ بیان کرنے کے لئے مزید  
 مشاہدے اور الفاظ کی ضرورت ہے۔ یہ تبدیلی وطن کے جو اندازِ اختیار کرتے ہیں وہ نرالے ہیں۔ کچھ اپنے بچوں کے  
 ذریعہ فضا میں اُڑتے ہیں، کچھ ندیوں میں تیرتے ہیں اور کچھ پرندوں کو اپنا حامل بناتے ہیں۔ میرے کھانوں کے غمگینا  
 میں شہتوتوں کے چند درخت تھے، جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ویسے توئے چین، بلوچستان میں ہوتے ہیں۔  
 ایک بزرگ کی بڑائی اور دائمی کو دیکھ کر گمان گزرا کہ وہ اُس شہرِ تمدن کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ بولکپش کے درختوں کے جھولنے  
 سے جو سنگیت پیدا ہوتا تھا اُس کی ترنگ خوشگوار خیال کی کمی تھی۔ درختوں کی طرح پرندے بڑے اور خوبصورت  
 تھے۔ کوسے بہت بڑے تھے اور تیل پوتے تو سے سے چمکتے تھے۔ ہمہ قسم پرندوں کے جھنڈ جھنڈا چمکتے تھے۔ اُن کے  
 رکھ رکھاؤ میں پریشانی اُس خطرے کی نشانی تھی جو دورِ جھاڑیوں میں یا آسمان پر غنڈا لاتا تھا۔ کوئی جھنڈا اُٹتا، جس کے  
 بھڑاٹے سے اپنی ہی قسم کا غنم پیدا ہوتا جو قضا کو جھولا جھلا جاتا۔ سبزی اِس قدر کثیر اور اعلیٰ قسم کی تھی کہ مرید سا



یہ سودا ہاں ہفتہ بھر چلے تو موٹا تازہ ہو جائے۔

ہم منٹرل پر پہنچے۔ پر چھائیں، قد سے لمبی ہو رہی تھی۔ وہاں رہنے کے لئے بھائیاجی نے درخت پر مچان بنائی ہوئی تھی اور زمین پر سر کی لٹکانی ہوئی تھی۔ میں نے کیر سے سامان کھول کر کچھ مگری سے لٹکایا اور کچھ اداہی سے۔ سورج ڈوبا نہیں تھا لیکن درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ سر کی سے کچھ دور الاؤ کی جگہ تھی بھائیاجی وہاں اگ جلانے لگے۔ آگ کے چمٹے تک آندھیرا چھا گیا اور دھرتی کا دوسرا روپ ابھرنے لگا۔ چاند ستاروں میں آبادی کی سی رعنائی نہ تھی۔ جھینگروں کی آواز پر خطر ماحول کی غماز تھی۔ پتوں کی سرسراہٹ سے آواز ہوتا تھا کہ وہ ایکانت کا جھوٹو رنے اور رات گزارنے کے لئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ تنہائی کی اداہی سے متاثر ہو کر میں گنگنانے لگا اور گنگناتے گنگناتے کانے لگا۔ میرے گیت بھائیاجی کو ایک تان نہ بھاتے تھے لیکن اُس اداہی رات وہ میرے گیت سننے لگے، کچھ دیر ایک تنے پر بیٹھے رہے اور پھر کمر کے پیچھے ہاتھ پکڑ کر الاؤ کے گرد گھومنے لگے۔

اُن کی عادت ہے کہ وہ مخالف حالات میں ہوتے ہیں تو اپنی حفاظت کی سوچتے ہیں اور اگ جلا لیتے ہیں۔ درندوں اور بھوتوں کے ڈر سے جہاں لوگ دن کے وقت گھبراتے تھے وہاں وہ اکیلے راتیں بسر کرتے تھے۔ وہ ایسے بے پلک کردار کے آدمی تھے جنہیں نظم و ضبط میں رکھنے کے لئے آئیں بیاباں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نامساعد حالات میں اُن کی دیرنگی، در ماندگی میں بدل جاتی۔ وہی نازک لمحہ اُن کی ذہنی آفرائش کی قرارداد ہوتا اور انسانی قدروں کے بارے میں ظہور ثانی۔ میں نے 'کانگڑی' اور 'مقام' کے جنگل میں کچھ راتیں اُن کے ساتھ گزاریں تھیں اور اُن کا رویہ در و درمندانہ پایا تھا۔ اپنے نازک جذبات سے رس لیتے ہوئے، وہ حسنِ ضمیر کا مجسم بنے جھوٹے تھے۔ اُن کے چہرے سے وہ احساسِ خاطر ظاہر تھا جو رفیع حالات میں شہقتِ پدری کا جلال ہوتا ہے۔ میرے تحمل اور بے تحشی کے ساتھی قارئین، کچھ جانے! وہ ویسے ہی تھے۔ اُن کی زود پریشانی اور بند زبانی وہ فتنہ پرور طاقت تھی، جو اُن کے دل کش نقش و نگار کو بگاڑ کر قابلِ حقارت بنا دیتی تھی۔

کیفِ دُور کا سماں چھایا ہی تھا کہ بھائیاجی کے دو آوارہ پالتو گتے بھونکتے ہوئے سر کی کی جانب پلکے پر لطف ماحولِ فساد کے شور سے گونج اٹھا اور میں چپ ہو گیا۔ بھائیاجی تیزی سے پلٹے، الاٹھی پر چھٹے اور گتوں کے پیچھے بھاگے۔ کتے جہاں رُکے، وہاں آگے بڑھے اور زمین بیٹھنے لگے۔ میں اُن کے پیچھے نہیں آیا اور دیکھا میرے بازو جتنا موٹا سانپ بس گھول رہا ہے۔ اُس کے سر کا بالشت بھر حصہ لال تھا اور شب کے اندھیرے میں دیکھنے کو تلے کی طرح چمک رہا تھا۔ اُسے وہیں گول کر کے وہ کہنے لگے، 'یر سانپ آجگر ہے، زندہ آدمی کو ناپایت نکل جاتا ہے'۔

میں نے اجگر پہلی بار دیکھا اور اُس کی غیر معمولی خوبی پر حیران ہوا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ اجگر، جس کا منہ چپا بھر ہے، آدمی کیسے نکل سکتا ہے! میں نے بھائیاجی سے پوچھا، انہوں نے کہا، اُس کا منہ بچکدار ہوتا ہے اور جتنا دکھائی دیتا ہے اُس سے دس گنا زیادہ بڑا ہو جاتا ہے، ربڑ کی طرح۔“

میری حیرت، استعجاب میں بدل گئی۔ میں دل ہی دل میں اندازہ کرنے لگا کہ وہ اجگر کتنا موٹا آدمی ہٹپ کر سکتا ہو گا؟ درست اندازے کے لئے میں اپنا سینہ ناپ رہا تھا کہ بھائیاجی نے ایک انکشاف کیا جو روایت شکن ہے اور قدرتی طور پر پہلے سے زیادہ حیرت انگیز۔ یہی سانپ ہے جسے لوگ منی راج کہتے ہیں! ایسا ہی سانپ میں نے 'مقام' میں بھی مارا تھا۔“

”منی راج کے بارے میں جو کہانیاں مشہور ہیں؟ میں نے پوچھا  
”سب سن گھڑت ہیں! انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔“

میں نے غور کیا تھا کہ اُن کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ادھام پرستی گھٹ رہی تھی۔ سانپ کو ٹوکے سے ڈھانک کر وہ اُس پر لکڑیاں رکھنے لگے۔ میں نے پوچھا، اسے ڈھانک کیوں رہے ہیں آپ؟ دبا کیوں نہیں دیتے؟“

”سویرے کامگاروں کو دکھائیں گے۔“ انہوں نے آخری لکڑی رکھتے ہوئے فخر سے کہا، ٹوکے کے گرد چکر لگایا، اکٹوں کو دھنکارا، جو ٹوکے کے اُس پاس گھوم رہے تھے۔ کتا، سانپ کھالے تو باؤلا ہو جاتا ہے! وہ الاؤ کی طرف لوٹتے ہوئے بولے۔

مجان پر گھاس چھونس کی موٹی تہ بستر کا کام دیتی تھی۔ میں سانپ کی موت پر غور کرتا ہوا رنجیدہ ہو گیا۔ اپنی مودی خصلت کے باوجود، وہ خوبصورت چیز تھی۔ اُس کی موت درد بھری تھی۔ وہ کیسے لوٹا پوٹا اور تڑپتا پھوٹتا مرا تھا۔ کہاوت ہے کہ آدمی کی روح سر میں اور سانپ کی ہڈیوں میں ہوتی ہے۔ میں رُوح کے وجود کا قائل نہ تھا لیکن وقتی طور پر مجھے لگا کہ سانپ کی رُوح، ہڈیوں اور جوڑوں سے رنگی ہوئی نکلی ہے۔ رات کے جانوروں کی آوازیں بڑھتے بڑھتے باز گشت بن گئیں۔ اُٹو کی ترر رُو، سب سے خوف پرور تھی۔ یہ بھی کہاوت ہے کہ اُو اپنی آواز کی حد تک بیاباں کی اُرزو کرتا ہے اور آدمی کی موت کی دعا مانگتا ہے۔ یہ کہاوتیں بھی عجیب ہیں! میرا خیال ہے کہ ہر نفس مضمون پر کہاوت موجود ہے۔ میں افسردہ ہو گیا جیسے سانپ کی موت میری موت کی پیش رو ہو۔ میں ڈر کر مسکڑ گیا اور بھائیاجی کے قریب ہوتے ہوئے بھی محفوظ محسوس کرنے لگا۔ یکایک گیدڑوں کی پدم سلطان بود، بالکل پاس سے سنائی دی۔ بھائیاجی نے ادھر پہلو بدلا اور پیچھے پڑے بھر کر انہیں ماں کی گالی دی۔ اپنی نسل کی برتری کا اعلان ان کی زبان پر ادھر وہاں رہ گیا جیسے انہوں نے گالی کا مطلب سمجھ لیا ہو اور اپنی نسل کی سچائی

پر شک ہوا ہو۔ بھائیاجی اٹھ کر اکڑوں بیٹھ گئے، کھنکھورے مارنے لگے اور آندھیروں کو کھور نے لگے جیسے اُن میں منڈلاتے ہوئے خطروں کو ڈراتے ہوں۔ اُن کے سایہ عاطفت کا اثرِ باخوف بھرے ماحول میں نیند کی سرشاری صبح تک بنی رہی۔

اُس پر لطفِ سحر کے نقیب، سُریلے پرندے تھے۔ وہ جس بیتابی سے مَسنِ سحر کو خوش آمدید کہہ رہے تھے، اُس سے لگتا تھا کہ انہوں نے ڈراؤنی رات سے بڑی مشکل سے نجات پائی ہے۔ میری انگلیں نیند کے خار سے بے نیاز تھیں اور میرے اعصاب سستی سے۔ یہ اثر سورج کی اُن کرنوں کا تھا جو درختوں میں سے چھلکے ہوئے جو اُربھاٹے کی طرح مجھ تک پہنچتی تھیں اور مجھے اپنے حُسن کا نظارہ کرنے پر اُکاتی تھیں۔ میں بستر پر ہی تروتازہ تھا۔ میں خوشبوئے سحر کی لطافت میں سانس لیتا ہوا چُمان سے نیچے اُترا اور باغ سے باہر نکلا۔ منظرِ فطرت کھلا ہوا تھا۔ نباتات کی لہک، چمک رہی تھی، فضا کی چہک اُچک رہی تھی اور ہوا کی ہلک، پلک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہر شے سنگار کے اپنے کسی چاہِ واں کی راہ دکھتی ہے۔ اُن سب میں سے شفق کی بے قراری دیدنی تھی جو اُس کے چہرے پر لالی بنی کر دوڑتی تھی۔ پیرندے چہچہاتے تھے کہ خوش آمدید کا نغمہ الاپتے تھے۔ میں جدھر جاتا تھا صبر سے پر راہ بناتا تھا۔ میرا تصور! مجھے لگا کہ میں جو نئی راہ پیدا کرتا ہوں، دوسروں کے لئے باعثِ تقلید ہوگی۔ تروتازگی میں نے کی سی خوشگوار تھی۔ میری رگوں میں خروشِ نفوذ تھا جیسے کوئی ہا نہیں پھیلائے سکے ملا ہو۔ جھاڑوں پر شبنم اُبدار موتیوں سی چمکتی تھی۔ میری نظر سے وہ چہرے گزر گئے جو اپنے آپ کو عروسِ فطرت کی طرح سجاتے تھے۔ اُمی بچیلے ماحول سے متاثر ہو کر میں نے نیم کی دانتوں توڑی اور اُس کے آخر میں پتوں کی لڑی رہنے دی۔ میں دانتوں کو تاتو ہلتے ہوئے پتے، چنور لگتے۔ مجھے لگا کہ میں نے انجانے ہی اُس فضا کی سندر تائیں اضافہ کر دیا ہے۔ میں اپنے خیال پر مسکرا دیا اور ادھر ادھر دوڑنے لگا جیسے بچہ اُکھیل کرنا ہے۔

تاریں! مناظر کی خوبصورتی، دھرتی جتنی ہی پرانی ہے لیکن لطافتِ احساسِ وقتی ہے۔ کتنے اہل دل ہیں جنہوں نے ایسی کیفیت سے حظ اٹھایا ہے اور عارضی طور پر اپنے آپ کو اُس ناقابلِ بنیاں اور ناقابلِ گرفت حُسن و خوبی کا حصہ محسوس کیا ہے۔ ایک میں ہوں، جس نے اُن اڑتے ہوئے لمحات و جذبات کو اسیر کر لیا ہے یہی وہ صلاحیت ہے جو شاعر اور ادیب کو دیگانک اور ہمنور سے برتر بناتی ہے۔

بھائیاجی نے جہاں سے درخت کاٹے تھے وہ مقام، نئے لباس میں پیوند لگتے تھے۔ میں انہیں شاداب زمین کے سینے پر ویران و بریاں داغ کہوں تو زیادہ درست ہوگا۔ وہ پامالی دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ درختوں کے کاروبار نے بھائیاجی کو اُن کے بارے میں تحقیق بنا دیا تھا۔ وہ پیسٹر کا بیٹا دیکھ کر قریب قریب آرتھرو دیکھ کر ٹھیک ٹھیک اُس کی عمر بتا دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ”تنہ، درخت کی رُوح ہے۔ کوئی جاننا

چاہے تو یہ اپنے بارے میں سب کچھ بتاتا ہے۔ اُس کی پتریں گن کر وہ بتاتے تھے کہ اُس نے کتنی بہاریں دیکھی ہیں اُن کے پاس اُردو میں ایک کتاب تھی، جس کے درتے بھورے پڑ گئے تھے لیکن تڑے مڑے نہ تھے۔ اُس میں سینکڑوں ناپ کی لکھی کے حجم درج تھے۔ وہ اُس کتاب کے درتوں کو جس نزاکت سے اُٹتے تھے، اُن کی سخت مزاجی پر حجت ہے۔ اُن کی تہرات، اُن کا پیشہ تھا۔ وہ جس نیلامی میں دلچسپی رکھتے اُسے ہرگز نہ چھوڑتے۔ کوئی بیوپاری اُن کے منصوبے کو ناکام بنانا چاہتا تو اُس سے ساز باز کر لیتے۔ اُنہوں نے جب تک بیوپار کیا، ہر بار نہ شام چورامی سڑک کی بولی کسی آدمی کے نام ٹوٹنے نہ دی۔ اپنے مال کی شناخت کے لئے وہ پوروں کے دونوں سروں پر اپنا ٹھہر مارتے کیا گانے بے زبانوں کو زبان دیتے تاکہ بوقت ضرورت بنا سکیں کہ وہ کون ہیں اور کس کا دھن ہیں۔ اُن کے ٹھہرے کا تھیمو اکانے کے برعکس اس بات کا بنا ہوا تھا۔ ٹھہرے کو عمل میں لا کر وہ اُسے صاف کرتے، تیل لگاتے جیسے بند بچی بند بچو چلا کر اُس کی نالی کو۔

کامیاب مرنہ سانپ دیکھ کر بھی خوف کھانے لگے اور پھر ساپوں کے بارے میں اپنے علم کا مظاہرہ کرنے لگے جیسے اُس موضوع میں ماہر ہوں۔

”یہ سیٹھا (یوہا، ہے۔“ ایک نے کہا۔

”نہیں، یہ ناگ مٹی ہے۔“ دوسرے نے پہلے کی بات کاٹی۔

”یہ آجگر ہے۔“ تیسرے نے بھائیاجی کی بات کی تائید کی۔

سانپ کے مرنے کو چھوٹیاں لگ رہی تھیں۔ کامیابوں نے سطحی ساگرٹھا کھودا اور اُسے کاڑنے لگے۔ بھائیاجی نے دیکھا تو تنبیہ کرتے ہوئے کہا، گہرا گرٹھا کھود کر کاڑو۔ ورنہ کتے کھود کر کھالیں گے اور باؤلے ہو کر لوگوں کو کاٹتے پھریں گے۔“

انہوں نے کھودے ہوئے گرٹھے کو آور گہرا کیا، سانپ کو گھسیٹ کر اندر ڈالا اور بھائیاجی کے کہنے کے مطابق اُسے پتھروں کے نیچے داب کر مٹی سے پٹا۔ اُس کام سے فارغ ہو کر کامیابوں نے ہتھیار اٹھائے، درختوں کی طرف ایسے بڑھے جیسے وحشی لوگ، امن پسند شہریوں پر ہلہ بول دیں۔

باغوں کے درمیان کھلے میں تالاب تھا۔ اُسے دیکھ کر گمان گزرا کہ کرب تخلیق کی تاب نہ لا کر مخلوقِ فطرت نے سمندر رویا اور پھر سکون پایا لیکن اُس کی چشم گریہ میں ایک افسوس بچ رہا جو کمال واقعہ سے وہاں گرا۔ بھائیاجی اُس پانی کو مال کر پیئے اور نہانے دھونے کے لئے دیسے ہی برستے۔ وہ پانی ٹھہے بدمزہ لگا۔ میری شریکیت پر انہوں نے بھجھا دیا۔ ”یہاں سے کچھ دور بھجھنا ہے۔ جاؤ، وہاں سے پانی بھراؤ۔“

اُبلے ہوئے پانی کی بے سادی نے بھرنے کی بات کو اور شیریں بنا دیا۔ میں نے باٹی اٹھائی اور

جھرنے کی راہ لی۔ باغ کے پاس سے گڈے لیک سیدھی وہیں جاتی تھی۔ میں جھرنے سے کچھ دُوری پر تھا کہ میں نے پانی گرنے کا شور سنا جو میری گرمی رفتار ثابت ہوا۔ باقی سارا راستہ میں نے بھاگتے ہوئے طے کیا۔ ایک گھاٹی کے اوپر سے پانی کی دھار گرتی تھی جو نیچے آکر چاندی کی چادری پھیل جاتی تھی۔ دُور دُور تک پھوٹیاں پھوٹیاں مینہ برساتا تھا۔ گھاٹی کے پتروں میں دُودھ سا بہتا تھا جو ایک خاص مقام پر پہنچ کر پانی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اُس بہاؤ میں ایک لکیر دکھائی دیتی تھی جو دُودھ کو پانی سے جدا کرتی تھی۔ میں جا کر وہیں بیٹھا اور اُس منظر کو منظر در منظر... کا حصہ بن گیا۔ میں پانی سے کھیلنے لگا۔ پھوٹیوں میں بھیگنے لگا اور اپنا مستقبل سنوارنے لگا۔ آپ قارئین حیران ہوں گے کہ وہ کیسے! میں نیت باندھتا کہ میں فلاں پتھر کو نشانہ بناؤں گا۔ نشانہ ٹھیک لگاؤں گا تو میں کلاس میں اول آؤں گا ورنہ! اور نہ! نشانہ ٹھیک لگنے کی صورت میں میری خوشی بے اختیار ہوتی اور بے مثال بھی۔

آپ میں سے کتنے ایسے تجربے میں سے گزرے ہوں گے اور مسرور ہوئے ہوں گے۔ کتنے اور ایسے واقعے ہیں جو میں نے لکھ لکھ کر مٹائے ہیں۔ آپ اپنی زندگی پر نظر دوڑائیں اور ان لمحوں کو یاد کریں جن کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کی باز گردی میں، میں آپ کے ساتھ شریک ہوں۔

میں پانی لے کر واپس جا رہا تھا کہ ایک خیال آفریں نظارہ دیکھا جو قبل ازیں جھرنے کی شوکت نہ تھا۔ اُس پر قوس قزح دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی حسینہ کے گلے میں ست لڑا، ست رنگا بار۔ میں روز پانی لینے جاتا اور کوئی نہ کوئی نیا منظر دریافت کرتا۔ درختوں پر سبزے کی بھرمار تھی جس میں سے طرح طرح کے پودے اُگ رہے تھے۔ وہ پودے زمین پروردہ پودوں سے زیادہ سیاہ مست تھے۔ کچھ ایسا ہی منظر میں نے اپنے گاؤں میں الگ طریقے سے دیکھا تھا۔ چچروں پر لگی چچریاں دوسری چچریوں سے زیادہ صحت مند ہوتی تھیں۔

گھاٹی سے بچھ اِدھر ایک بھاری پتھر تھا۔ اُسے بے سلسلہ دیکھ کر میں سوچتا، یہ یہاں کیوں کر آیا؟ میں کوئی فیصلہ نہ کر پاتا۔ ایک رات اپنی بے خیالی کے عالم میں مجھے خیال آیا کہ خالق کل کسی متصور غایت کے تحت اُسے وہاں لایا لیکن اپنی خود اِدام مصروفیت میں اُس کی تشکیل کرنا بھول گیا۔ دوسرے دن میں اُس پتھر کے اوپر چڑھ گیا تاکہ اُسے نزدیک سے غور سے دیکھ سکوں۔ اوپر کی سطح کا کاستری رنگ تلے کے مقابلے میں بھورا خاکستری تھا۔ اُس میں خوب یہ تھی کہ وہ اوپر سے نیچے کی طرف یکساں روی سے گہرا ہوتا گیا تھا۔ اُس ٹھنڈے رنگ کے اوپر بھر پور قمری، نارنجی، بنستی، آسمانی، دھانی ایک دوسرے کے تقابل میں خوش نما بھی تھا اور خوش گوار بھی۔ وہ کینواس کسی انسان فنکار کے بس کی بات نہ تھی۔ صرف فنکارِ فطرت ہی کا کرم تھا۔ ہر نقش اس قدر نازک تھا کہ اُسے دیکھ کر محسوس کرنا پڑتا تھا۔ میں وہاں سے گزرتا، اُس پتھر کو دیکھتا اور خوش ہوتا۔ دیکھنے میں وہ کس قدر بھونڈا اور

ہیبت ناک تھا لیکن میرے احساس جمال نے اُسے حسین اور لطیف بنا دیا۔ راستے میں کوئی تنکا یا پتتا میری نظر کو بھاتا، میں اُسے اٹھالیتا، صاف کرتا اور ایسے دیکھتا جیسے وہ میرے کسی ناقابلِ بیاں جذبے کا مفتر ہو۔ میں یوں ہی کوئی دھن گنگنا نے لگتا اور محسوس کرتا کہ میں اُس کے گونگے حُسن کو زبان دے رہا ہوں۔ جھرنے سے کچھ دُور گھاٹی کے وسط میں سے پانی کی اِچ بھر موٹی دھار گرتی تھی۔ میں نے اُس کے نیچے نہانا چاہا لیکن پانی کی چوٹ اتنی شدید تھی کہ میں اُسے جھیل نہ سکا۔ میں کھڈ کے اوپر نیچے گھومتا اور خوبصورت بٹیاں اکٹھی کرتا۔ میں نے ایک بیضہ نما لال پتھر دیکھا جو تین انگلی چوڑا اور بالشت بھر لمبا تھا۔ وہ ماں کے کام کی چیز تھی۔ اُسے تھوڑا سا مسالا گونٹنا ہوتا تو وہ شہکایت کرتی کہ اتنے مسالے کی آدمی مقدار پتھر وٹی کی تہ میں رہ جاتی ہے۔ اس کے لئے بٹا ہو تو کتنا اچھا ہو! تباہی نے ماں کو نیم کا گھونٹا خراہ کر دیا تھا لیکن وہ اُس سے خوش نہ تھی۔ وہ بٹا، پتھر وٹی کے عین ماپ کا تھا۔ میں نے جتنی بٹیاں اور بے جمع کئے تھے، اُن میں سے وہ میری انعامی تلاش تھی۔

ایک تو میری پڑھائی میں ہرج ہو رہا تھا اور دوسرے میرا دہاں رہنا غیر ضروری تھا۔ اُسی ہفتے لکڑی کے گڈے، ہریانہ کے لئے لادے گئے اور میں جن سینگے کے گڈے پر بیٹھ کر گاؤں لوٹ آیا۔

## باب ۳۹

جس نے لڑ لڑ کے اندھیرے سے اُجالا چھینا

اُس پہ یہ راز کھلا کون خدا ہوتا ہے ؟

میں اپنی فطرت کا صحیح تجزیہ کرتا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں بڑوں سے زیادہ نازک خیال ہوں۔ میرے جذبات مجروح ہو جائیں تو میں اپنے آپ سے اُلجھ جاتا ہوں، مطلوب سمت کھو بیٹھتا ہوں اور میرے حریف اُس صورتِ حال سے فائدہ اٹھالیتے ہیں۔

میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا اور نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں ٹال پر رہتا، دکان پر کام کرتا اور فالتو وقت میں بلوندر کو ٹیوشن پڑھاتا۔ میرے دلچاہے کے باوجود وہ میری منہ بولی بہن بن گئی اور مجھے بھائی صاحب کہہ کر بلانے لگی۔ میں اُس کے اندازِ گفتگو کو پسند نہ کرتا اور اُس کی موجودگی میں بے چین سا رہتا۔ میں ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وقت کی کمی کا بہانہ کر کے ٹیوشن ترک کر دوں لیکن بلوندر نے اس کا موقع نہ دیا۔ اُس نے اداؤں اداؤں اور باتوں باتوں میں واضح کر دیا کہ وہ علم الکتاب کے ساتھ ساتھ علمِ انسان سیکھنے کی بھی خواہش مند ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی اور اُس کی خواہش کا احترام کرتا، میرے ضمیر نے مجھے روکا۔ اوپر سے دل

ہی سے سہی، میں اُس رشتے کا لحاظ کرنے پر آمادہ ہو گیا جو بلو ندر نے مجھ پر لاشوری طور پر لا دیا تھا۔ مجھے راہ پر لانے کے لئے اُس نے بے جھجک کہا، ”یہ رشتہ میں نے اِس لئے گانٹھا تھا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ کہنے سے کوئی بھائی تھوڑا ہی ہو جاتا ہے۔“

کسی کی اُصل دیکھنی ہو تو اُسے کھلی چھٹی دے دو اور پھر اُس کا رنگ دھنگ دیکھو! ہم کہاں کہاں ملتے! کیسے کیسے پلستے! اپنی اُگ ٹھنڈی کرتے لیکن ہر بار محسوس کرتے کہ وہ جو ٹھنڈی ہوئی ہے، اُگ نہیں، اُس کی لپٹ ہے۔

میں کلاس میں فٹ نہ آیا، ہاں فٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ جس دن میرا نتیجہ نکلا اُسی رات میرے مستقبل کی بات چلی اور بھائی جی نے کھری کھری سنائی، ”درشن سنگھ نے اُگے پڑھ کر کیا اُکھاڑا ہے جو تو اُکھاڑنا چاہتا ہے؟ دکان پر جایا کر اور کام کیا کر!“

ہریانہ کے دونوں سکولوں میں سے جتنے شیڈول کا سٹ پاس ہوئے تھے، وہ سب ہریانہ کے کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ اُن میں سے کتنے کالج کو ’کل جگ‘ بولتے تھے لیکن اِس میں کیا قباحت تھی، وہ سب ’کالاجی ایٹ‘ تھے اور وظیفہ پاتے تھے۔ اُن میں سے کئی نئی سائیکلوں پر شان بگھارتے اور دن میں ایک آدھ بار دکان کا چکر ضرور لگاتے اور کسی نہ کسی طرح موقع نہ نکال کر یہ شعر سناتے،

عیش کر لو دوستو کالج کی دیواروں میں

کل سے لکھے جاؤ گے سب کے سب بیکاروں میں

انہیں اُونچے مقام پر دیکھ کر میں بظاہر خوشی کا اظہار کرتا لیکن اندر ہی اندر ایر کھائی اُگ سے جلتا۔ میری فٹ ڈویژن میری رسوائی کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کیسے؟ ہمارے گاؤں اور کوئلہ نوہر سنگھ کے درمیان کبڈی کا میچ ہو رہا تھا جہاں میں بھی تماشا مانی تھا۔ ملکیت سنگھ ہر دم میں نمبر لا رہا تھا اور وہ ادب پارہا تھا۔ وہ حریف کے میدان میں ہوتا، وہاں کے کھلاڑی ایسے بھاگتے پھرتے جیسے بکریوں کے باڑے میں شیر گھس پڑے۔ وہ اپنے میدان میں لوٹتا ہوا، پالوں کے پاس سے ناچتا ہوا پچھاری چلتا اور اگر حریف کھلاڑی اُسے مارنے کی کوشش کرتا وہ اُس پر تھپٹتا اور اُسے دہیں داب لیتا۔ ہمارے گاؤں کی ٹیم جیت گئی اور اُسی کے بل بوتے پر جیتی۔ میں نگینہ سنگھ کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ ”دیکھا میرے ملکیت کو! تو بھی کھیلا کر۔“

شیر سنگھ وہیں کھڑا تھا، وہ میری طرف داری میں بولا، ”نگینہ سیان! کبڈی نہیں کھیلتا تو کیا ہوا؟“

میٹرک میں فٹ ڈویژن میں پاس ہوا ہے۔“

”فٹ ڈویزن! کانڈ میں لے لے خٹ ڈویزن!! میرے بیٹے کے ایک تھپڑ کی مار ہے۔ اُس نے میرا منہ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں خاموش خاموش کھڑا رہا اور حیران حیران دیکھتا رہا۔ وہ حدِ سماعت سے دُور نہ گیا تھا کہ شیر سنگھ، اُس سے مخاطب ہو کر بولا، ”نکینہ سیباں! لگتا ہے، اس کی فٹ ڈویزن تیری کانڈ میں گھسی ہوئی ہے، جیسی تو دوزخ سے بلبار رہا ہے۔“ اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ یاد آیا ہے۔ ہندو مسلم ہائی سکول ہریانہ اور خالصہ ہائی سکول بجواہ میں فٹ بال کا مقابلہ تھا۔ ہریانہ کی ٹیم کا منیجر راول سنگھ تھا۔ جب ٹیم میدان میں اترنے کے لئے تیار ہوئی راول نے اپنی ٹیم کو جیسی ہدایت دی وہ سپورٹس مین شپ کی زلی مثال ہے۔ ایک گول کیسے بھی کر لینا! پھر فٹ بال باہر پھینکتے جانا۔

کھلاڑی اپنی ٹیم کا کمر پہنے گھوم رہے تھے۔ وہ جوں ہی بوٹ پہن کر میدان میں اترے، پھدکنے اور بھاگنے لگے جیسے اُن کی ساری شرات اور طاقت بوٹوں میں ہو۔ ہریانہ کی ٹیم کا گول کیپر بلیو سنگھ تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ گول میں دیوار ہے۔ میچ شروع ہوتے ہی کھلاڑی اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ہاف ٹائم تک دونوں پاسے برابر رہے۔ دوسرے ہاف میں میرے دوست شنکارا سنگھ نے میدان کے اپنے حصے میں سے فٹ بال چھو کر پیروں سے چپکا لیا۔ اُس کی حرکت کا اثر سارے کھلاڑیوں پر پڑا اور لگا کہ وہ بھاگتے ہوئے کسی خیالی فٹ بال کا تعاقب کر رہے ہیں۔ تہارت اور طاقت، ہمتی اور ہوشیاری کا وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ کسی کو فریب دیتا، کسی کو پچھاڑتا کسی کو لٹکاتا، کسی سے الجھتا آگے بڑھا، ایک ناقابلِ تسخیر رو کی طرح۔ اُس کی چپ و راست کی نقل و حرکت میں آفاقی تال میل تھا۔ اُس کے فاتحانہ انداز سے مجھے پھر بری اُکی اور میں نے محسوس کیا کہ اُس کی جگہ میں میدان میں ہوں۔ میں فٹ بال نشانے پر لایا لیکن گول کیپر کو گول کے درمیان چوکس پایا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا جھکاؤ داہنے ہے۔ میں نے دوسری طرف نشانہ لگایا۔ وہ پھرتی سے اُدھر پلٹا اور فٹ بال پر چھپٹا مگر فٹ بال، اُس کے اوپر گول پوٹ کے بیچ میں سے سکڑ کر نکل گیا جیسے اُسے میری غفلت کی حرمت منظور تھی۔ لیکن حریت بھیرا سے برداشت نہ کر سکی اور بیک زبان چلائی، کون بے یہ خرا می؟ اس کی ٹانگ توڑ دو!“

دُنیا ایک رن بھومی ہے جہاں ہر کوئی جیتنا چاہتا ہے۔ کون بے جسے ہار پسند ہے؟ یہ جیتلے بچے سے لے کر بوڑھے تک میں پوری تندی سے موجود ہے۔ میں نے اس جیتلے کے اتنے رنگ دیکھے ہیں، جنہیں میں الگ الگ بیان کروں تو کئی کتابوں کا مواد ہے۔ چوں کہ یہ میری کہانی ہے، میں اپنی بات کرتا ہوں۔ میرے بھائی باجی اپنے رویے پر فخر کرتے ہیں، ”میں نے سچے گھر سے نکالا، تبھی تو ڈیلینو۔ ایچ۔ او۔ میں انجینئر کے



مرتبے تک پہنچا، ورنہ گاؤں میں دو ٹکے کا مزدور ہوتا۔“

کالج سے ناامید ہو کر میں گھر کے کاموں میں اُوبی اُوبی دلچسپی لیتا تھا۔ درشن سنگھ مجھے رائے دیتا کہ میں فالٹو وقت میں ٹائپنگ آڈیٹ شارٹ ہینڈ سیکھ لوں لیکن میرے پاس فالٹو وقت تھا کہاں، گھر پر جھگڑے بڑھنے لگے آڈیٹ کے ساتھ میری تہمیزی اور زبان درازی۔ تپا جی سمجھاتے، بیٹا، کوئی ہنر سیکھ لے، پھر میں ترقی ہے! ہنر سیکھنے کے لئے تین چار سال کی شاگردی درکار تھی اور بھائی جی امید کرتے تھے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی دھڑنے لگے بلکہ کما کر لانے لگے۔ زندگی روز افزوں اجیرن ہو رہی تھی۔ کوئی خوشی تھی تو وہ بلوند سرے ملن کی تھی۔

قارئین! ویسے زندگی ہے کیا؟ بے انتہا جذباتوں کا ایک مجموعہ ہے اس لئے اس کی سفاکی متاثر ہے۔ جذبہ نفس کے سوائے ہر جذبے کا کمال انتہائی کوشش سے بھی نہیں ملتا، اس لئے یہ جذبہ آدمی کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ طاقت اس لئے کہ اس کا کمال، مکمل اور یقینی ہے، کمزوری اس لئے کہ اس کی تکمیل میں تسکین غنا ہر آسانی سے ہو جاتی ہے۔ کسی اور جذبے کا انجام کسی دوسرے جذبے کا آغاز ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا انجام اسی کا آغاز ہے۔ یہ ایسی حیاتیاتی و نفسیاتی حقیقت ہے جو جسمانی و نفسانی خوبیوں کی سخاوت ہے۔ اس کی سرپرستی میں آدمی کی جس لطیف، حسنِ بصیرت سے تعبیر ہوتی ہے۔ میں اس کے اس مخصوص وصف سے کئی بار فیضیاب ہوا ہوں، خاص طور پر تب، جب الجبر کے مشکل سوال حل نہ ہوتے تھے۔

میں درشن سنگھ کی روٹی، ٹال پر پہنچا کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اُجالا چمپی اندھیرے میں بدل رہا تھا۔ اپریل کی گرمی دوبرا اثر رکھتی ہے۔ دن کو گرم پانی کی طرح زمین میں جذب ہوتی ہے اور رات کو بھاپ کی طرح اٹھتی ہے۔ گرد اُٹو ہوا عطسہ آور ہوتی ہے اور ریگ مال کا کام کرتی ہے۔ ماس، ہڈیوں سے اکھڑتا جان پڑتا ہے۔ نہ تن پر کپڑا برداشت ہوتا ہے اور نہ تن میں تھلا ٹپ۔ آس سے مسموموں میں سے موبل آئیل نکلتا ہے، جہاں ہاتھ لگاؤ چیپک ہی جاتا ہے اور کھینچ کر جڈا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں جی چاہتا ہے کہ کام کاج کو بھاڑ میں جھو کو اور پانی میں ڈبکیاں لگاؤ۔ گاؤں کی آب و ہوا میں پہنچ کر میں نے جو دھال دی امبی کا رخ کیا۔ مسلمانوں کے ترکِ وطن کرنے سے مقاموں کے نام بھی بدل گئے تھے، پہلے ہی جگہ بھاگ دی امبی کہلاتی تھی۔ اُس کا سیدھا راستہ اب جو میں سے تھا، میں نے وہی اپنایا۔ پانی سے اُلجھ کر چلنے میں مجھے وہ لطف آ رہا تھا جو کسی سرکش کو بار بار زیر کرنے میں آتا ہے۔ دھم کی سطح پر دھول جی ہوتی تھی گویا آلودگی سے بچنے کے لئے اُس نے نقاب اوڑھ رکھی ہو۔ میں نے ایک بڑا دھوا اٹھایا، دھم کے وسط میں پھینکا اور اُس کے مطلوب ردِ عمل پر خوش ہوا۔ میرے کپڑے اتارنے اور پانی میں اترنے تک پوری دھول کناروں پر جمع ہو چکی تھی۔ میں دیر تک نہاتا رہا اور ناخوشگوار ماحول کو خوشگوار بناتا رہا۔ نہاتے ہوئے میرے دل میں ایک مبہم سی

تہنا ہوئی، کیا خوب ہو اگر دھم کے کنارے میرا گھر ہو۔ چاند کا زرد چہرہ نکھرنے لگا تھا۔ اُفتی پر پھیلے ہوئے سُرمی بادل پہاڑوں کا سلسلہ لگتے تھے۔ ٹھور ٹھکانوں کو لوٹتے ہوئے کسان، مویشی، پرندے اُس نظارے کی خوبصورتی بڑھا رہے تھے۔ کسی چرواہے کے نفعے کی سحر طرازی نے اُس خواب پرور وادی کو نغمہ بیدار میں بدل دیا تھا۔ میری ترنگ دہری تھی اور یہ کیفیت پہلی بار میری ہم آہنگ ہوئی تھی۔

جیسے شہر کی شوکت اُس کی بڑی جسامت اور ترقی میں ہے، گاؤں کی بڑائی اُس کی سادگی اور بے تکلفی میں ہے۔ میرے حواس پر گاؤں کا سایہ نہ ہوتا تو میرا وجود اُس صحرا کی طرح ہوتا جس پر آفتاب غروب نہ ہوتا ہو۔ اندھیرے بڑھنے لگے۔ اپنے گلوں اور جھنڈوں سے بکھرے ہوئے چرندے اور پرندے دکھائی دینے لگے۔ وہ اپنی ڈکراہٹ اور آواز سے گھبرائے ہوئے لگتے۔ وہ کسی گتے اور جھنڈ کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھتے، کچھ دور تک ساتھ چلتے، اپنی غلطی محسوس کرتے اور اپنے صحیح مقام کی تلاش جاری رکھنے کے لئے اکیلے پڑ جاتے۔

جب میں گھر پہنچا، مجھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ بھائیابی کسی بات پر بکھر کے ہوئے میری ماں کو گالیاں دے رہے تھے۔ میری نانی اُکی ہوئی تھی۔ وہ بے چاری گوشہ کے اپنی اغوش میں سر چھپائے رو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی قطعی آمریش آنے والا ہے۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے پھاوڑا اٹھایا اور بھائیابی کو لالہ لا توچپ نہ ہوا تو تیرا سر بھاڑ دوں گا! مجھے گھرائے وہاں کی بھی شرم نہیں ہے۔

”تو گھر سے نکل جا! ابھی، اسی وقت!“ وہ کالی دے کر بولے اور مجھ پر پکے۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر پیچھے مڑ گئے۔ انہوں نے پھر کالی دی۔ اُن کا دبا دبا ہوا لہجہ ایسا تھا جیسے گلے میں پھانس پڑ گئی ہو۔ ”جب چاہوں گا۔ چلا جاؤں گا۔ تو کون ہوتا ہے مجھے گھر سے نکلنے والا؟ میں نے چلا کر چھاتی بجا کر کہا۔

اُس گھر میں پہلی بار ایک دوسری آواز بلند ہوئی تھی۔ وہاں کی ریت تھی کہ کوئی دوسری آواز پیدا ہوتے ہی دبا دی جاتی تھی۔ اُس گھر کے مالک کا نظریہ تھا کہ اُس کی موجودگی میں نہ کوئی راست سوجھ سکتا ہے اور نہ کسی کو سوچنے کا حق پہنچتا ہے۔ کاش وہ جانتا کہ وہاں کے میکین سوچتے تھے! سمجھتے تھے! کٹھنی گھٹی ہی سہی، اپنی جُزیلا لگ، اپنے ڈھنگ سے بسانا چاہتے تھے، جہاں اُس کی طرح وہ بھی سُن مانی کر سکتے۔ یوں نہ ہوتا تو بیڑا باپ سے اور بھائی، بھائی سے جدا نہ ہوتا۔ آدمی کی خود پسندی کا بانگین! یہ اپنے بنائے ہوئے دوزخ کو دوسرے کے دیئے ہوئے بہشت سے بہتر جانتا ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو آدمی سے خدا کی ارضِ موعودہ کے لئے مسجدے کرواتا ہے اور خود کو حقیر ماننے پر مجبور کرتا ہے۔

وہ ناموس راؤ لائسن کر پڑوسی حیران تھے اور تماشا دیکھنے کے لئے اپنی اپنی چھت پر چڑھ گئے تھے۔

ایسے ہتک آمیز حالات میں ہمارے گھر کے در و دیوار میں رخنے ابھرتے تھے۔ تایاجی نے دروازے کے اندر جھانکا، رُسے اور پھر اُگے بڑھ گئے، انہیں دیکھ کر میرا غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہوا اور مجھے لگا کہ میں نے گھر کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ لیکن بھائیاجی کو دیکھ کر میرا تنفر اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور میں نے خود کوئی کسے سے انداز میں کہا، ”اِس گھر کی عزت تھی ہی کہاں؟“ اتنے میں بھائیاجی کچھلے دروازے کی جانب بڑھے جو باہر کھلتا تھا۔ اُس کی کُنڈی کھول کر انہوں نے اُسے زور سے لات ماری، پٹ کھلے، چوکھٹ سے ٹکرا کر پلٹے، بند ہوئے اور پھر اُدھے کھل کر رہ گئے۔ وہ باہر نکلے، مُڑ کر اندر دیکھا اور چلائے، ”دیکھ لوں گا تجھے! دیکھ لوں گا!“

میں پھاؤڑا پھینک کر نانی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اُسے باہوں میں بھر کر پیار کیا۔ اُس نے مجھے آنکھوں میں لیا، میرا منہ چوما کر گویا میرے کئے کو سراہا۔ میری ماں حیران و پریشان چوہے میں کھڑی تھی اور ناخوش لگتی تھی۔ اِس پر دھیان نہ دیتے ہوئے، میں اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا، سر بلند اور طاقتور۔ اُس نے مجھ سے منہ پھیر لیا اور تمرزش کرنے کے لیے میں کہا، ”جا کر دیکھ! تیرے بھائیاجی کہاں گئے ہیں؟ اور اُن سے مُحافی مانگ!“

مجھ پر بھائیاجی کے ظلم و ستم کے وقت اُس کی آنکھوں میں جو نرم و نازک جذبہ ہوتا تھا وہ غائب تھا۔ وہاں ایک سنگینی تھی۔ یہ مُستفاد صورتِ حال مجھ پر پہلی بار ظاہر ہوئی تھی۔ اپنے جذبے کے نشے میں مجھے ماں کا جوابی عمل بُرا لگا اور میں نے غصے سے کہا، ”نہیں، ہرگز نہیں!“

”وہ تیرے باپ ہیں! وہ دانت میس کر پڑی۔“

”ہونے دو!“ میں نے تیزی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں چھت پر چڑھ گیا، اور ایک کونے میں پڑی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ میں ہر چند خوش تھا لیکن ماں کے برتاؤ نے مجھے افسردہ بنا دیا۔ میں سو جا کر تاتھا کہ میں بڑا ہوں گا اور ماں کی جمائیت کروں گا اور اُس سے جڑا پاؤں گا۔ لیکن جب وہ وقت آیا، اُس نے مجھے ہی قصور وار ٹھہرایا۔ مجھے اُس سے جو ہمدردی تھی، جاتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اُس ہدایت پر پوری سنجیدگی سے چل رہی ہے جو بیاہ کے وقت ہر شہاگن کو دی جاتی ہے۔ تیرا پتی، تیرا پریشور ہے! وہ، تجھے جیسے رکھے گا تو ہے گی، فریاد نہ کرے گی اُس کا ہر لفظ تیرے لئے قانون ہے! تو اُس کی لمبی زندگی کی کامنا (آرزو) کرے گی اور اُسے چھوٹے پھلتے دیکھنے کے لئے برت رکھے گی۔ پتی سیوا، تیرا دھرم ہے، اِکرم ہے اور اُس کے بغیر جینا کُکرم (بُر اِکرم) شہاگن کا استھان، بھگوان سے برتر ہے اور بیوہ کا بیسوا سے بدتر۔ ہاں بیوہ کی اُبروستی ہونے میں ہے سستیوں کے مندر اِس بات کا جینا جاگتا ثبوت ہیں۔

اِس خیال کی تائید کے لئے سستیوان سا وتری اور سستیوں کی کہانیاں ہیں جو ابھاگن سستی نہ ہو سکتی تھی اُس کے پچھتاوے کے لئے دوسرا طریقہ تھا۔ وہ تیرے استھانوں پر جا کر رہے اور اپنی مُکھتی کے لئے بھگتی کرے۔

ممکنی کے لیے ضابطے کو چھوٹا کرنے کا ایک مارگ اور تھا۔ مُکتیشور میں ایک ممکنی دھام تھا جہاں بیوائیں الگ دان کر کے بیگنٹھ سیدھا رکھتی تھیں جو کوئی سہاگن مرتی تھی اُس کی ممکنی سمپورن تھی۔ شام سنگھ کا باپ مر گیا، اُس کی ماں اپنے پتی کے چھوٹی کاشی چڑھانے گئی اور اُن کے ساتھ جل سنسکار کر لی۔ وہ کتنا دیانت دار ہے جس نے کاشی کی پوترتا کا سانچا روپ گرتھوں اور روایتوں سے الگ انداز میں دیکھا ہے۔

رائنڈ، سائڈ، سیرٹھی، سنیا سی

ان سے بچے تو سیوے کا سی

یہیں، ماں کے لئے پرایا تھا اور بھائی جی اُس کے اپنے۔ مجھ سے زیادہ اُسے، اُن پر بھروسا تھا اور میری دی ہوئی عزت سے اُن کی تھو نپی ہوئی ذلت پر فخر تھا۔ مجھے اپنے گھر سے جو نفرت تھی وہ اور زیادہ ہو گئی۔ میرا ماضی منظور منظر میری آنکھوں سے گزرنے لگا۔ کتنے سر، دیواروں سے ٹکرا کر لہو لہان ہو رہے تھے! کتنے دلی، پیروں تلے روندے اور مسلے پڑے تھے! کتنے نالے، مکروں میں کھلبلاتے تھے کیوں کہ وہ درو دیوار کی قید توڑ کر فرار نہ ہو سکے تھے! کتنے اعضا، کپڑوں کوڑوں کی طرح رینگتے، ٹھٹھرے پڑے تھے! کتنے شوق وادیلے بن کر ہونٹوں پر دبے بیٹھے تھے۔ کتنے دیدے، رحم و کرم کی التجا کرتے کرتے پتھرائے ہوئے تھے! کتنے ڈولے، حسرتوں کے نیزوں سے رگ جہاں میں ٹوٹ رہے تھے۔

قارئین! وہ گھر، اذیت کدہ تھا! اُسے سہمے، سکڑے، گونگے، بہرے، روندے، کچلے، تڑپتے ہوئے بے کس پسند تھے۔ اُس کی رسم و راہ زمانے سے جدا تھیں جو زخم کھائے وہ زخم لگانے والے کا احسان بھی اٹھائے۔ اگر وہاں کے درو دیوار بولنے لگیں اور اُن حادوثوں کا ذکر اپنی زبانی کریں، جن کے وہ سچے شاہد ہیں تو اُس کی رقت بالکل الگ ہوگی۔

## باب ۴۰

یہ میرے دل کی آبادی کہ بربادی کے ساماں ہیں

مرا شوقِ نمُو آواز دیتا ہے ہزاروں کو (شاہو)

بھائی جی گھر واپس آئے تو تایا جی، اُن کے ساتھ تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر تایا جی کے قدم لئے، سر نوایا، وہ کرسی پر بیٹھے اور میں پاس ہی کھڑا رہا۔ بھائی جی دُور دروازے کے سہارے جاکھڑے

ہوئے آد کہنے لگے، ”بھائیاجی! آپ اسے کہہ دیجئے کہ یہ گھر سے چلا جائے۔ جہاں چاہے چلا جائے اور بے شک لوٹ کر نہ آئے۔ لیکن یہاں سے چلا جائے ورنہ.....“

میرے بھائیاجی، تایاجی کو بھائیاجی کے نام سے بلاتے تھے۔ اُن کا بڑا لڑکا کرنا سنگھ میرے بھائیاجی کا ہم عمر تھا۔ بھائیاجی نے غصہ روک کر کمال برداشت سے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا جیسے موزوں الفاظ نہ ملے ہوں۔

”رتن سیاں! ماں باپ کے گھر اُن سے زیادہ بچوں کے ہوتے ہیں۔ تم جس طرح کہتے ہو، اُس طرح نہیں کہتے۔“ تایاجی نے مصلحت آمیز دُور اندیشی سے کہا۔

جیسے کہنا چاہیے، آپ کہہ دیجئے لیکن یہ گھر سے چلا جائے! اُن کا لب دلہو پہلے سے سخت اور بے قرار تھا۔

”لیکن ایک بات ہے“ تایاجی کی نرمی برقرار تھی۔ ”ٹھیک ہے! میں اسے جانے کے لئے کہہ دیتا ہوں۔ اسے کون سا ہنر آتا ہے جس کے بل بوتے پر یہ جتنے گا، اپنی روزی پیدا کرے گا؟“ انہوں نے نئے طریقے سے میری طرف داری کرنی چاہی۔

”بیکھ لے گا! وہ لا پرواہی سے بولے۔

”تمہیں یاد ہے؟ تم نے کتنے برس بڑھی کا کام سیکھا تھا اور پھر مسافری پر گئے تھے، وہ بھی گھر کے بندے گزرخش سنگھ کے ساتھ! بھائیاجی کو رام کرنے کے لئے اور انہیں کی زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے، تایاجی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”بچوں کو یوں گھر بند نہیں کیا کرتے! انہوں نے میری طرف دیکھا جیسے وہ کسی سمجھوتے کے خواہشمند ہوں۔

”وہ آد بات تھی! انہوں نے بات کو سمجھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا بات تھی؟“ تایاجی نے انہیں کُریدا۔

”میں بچہ تھا! وہ اپنی حمایت میں بولے۔

”یہ بھی بچہ ہی ہے!“ تایاجی نے میری تائید میں کہا۔

بھائیاجی نے مجھے برجھیوں دیکھتے ہوئے شیطنیت سے کہا، ”اس بچے کو آج ایک عورت لادو، وہ

نومہ میں بچہ نہ جن دے تو میں اپنی داڑھی مچھ، موت سے مُنڈواؤں گا!“

تایاجی اپنی بات کہہ کر نیچے دیکھ رہے تھے۔ وہ مطمئن سے تھے جیسے انہوں نے ساری الجھنوں کا حل نکال لیا ہو۔ وہ اُن کے زرا لے بیجان پر مسکرا دیئے اور میں بے تکلف ہنس پڑا۔ بھائیاجی کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے

کچھ کر دو ٹوک کہا، ”میں نے جو کہتا تھا کہہ دیا“ انہوں نے باہر کا رخ کیا اور اپنے پیچھے بیٹھک کا کواڑ زور سے مارا جو قبضوں سے اکھڑ کر ٹیڑھا ہو گیا۔ جو کھٹ کے اوپر کا سیر وہلا اور ڈاٹ پر سے پستر ٹوٹ کر گرا جو پہلے ہی کچھ اکھڑا ہوا تھا۔

تایا جی نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ خاموش تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ بات کیسے شروع کریں! بھائی جی اندر گھسے اور قدم مارتے ہوئے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ان کی بے قراری اس وحشی کی سی تھی جسے پہلی بار بنجرے میں ڈالا گیا ہو۔

”سائیکل کہاں ہے میلو؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے میری ماں پر چلائے۔

”وہیں، جہاں ہوتی ہے! برآمدے میں۔“ اس سے پہلے کہ ماں بولتی، میں بول پڑا۔

بھائی جی! انہوں نے جی پر زور دے کر دانت کچکپکپائے، ”میں اپنے نطفے کو پیدا ہوتے ہی تالاب

میں پھینک دوں تو وہ تیسرے کنارے جا لگے۔“ وہ بولے تو سمجھو کہ حرام کا ہے!

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ میری ماں نے کچھ سہم کر اور کچھ لجا کر کہا، ”اپنے بچوں کے بارے میں کوئی ایسا

کہتا ہے؟“

”کوئی کہہ نہ کہے، میں کہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے جیب میں سے کچھ روپے نکالے اور ماں

کی طرف پھینکے، اسے دینا! تاکہ زندگی میں یہ نہ کہہ سکے کہ گھر سے خالی ہاتھ نکلا تھا۔“

یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے مجھے بن مانگے کچھ دیا تھا لیکن دینے کے انداز میں وہی حقارت آمیز

ترجم تھا۔ وارث شاہ کے اس شعر میں کتنی سچائی ہے!

وارث شاہ نہ عاداتاں جانندیاں اے

بھاویں وہڈیے پوریاں پوریاں ای

(اے وارث شاہ، آدمی عادتوں کے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ یہ پور پور کٹوا کر بھی وہی

کریں گے جو کرتے آئے ہیں)

”میں جا رہا ہوں! وہ باہر سے چلائے۔“

”کہاں؟“ ”میری ماں ان کے پیچھے بھاگی اور سانسے سے چلائی۔“

”آندھے کنویں میں! وہ پورے ارادے سے لیکن بیجانی لمبے میں بولے۔“

ان کا جوتا برآمدے کے کونے کے پاس رکھا تھا، جس پر کپڑے کی جھٹی پڑی تھی۔ اسے جھاڑے جھٹکے

بغیر انہوں نے جوتا چڑھایا اور دھجی گھسیٹتے ہوئے چل پڑے۔ ماں نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑا لیکن انہوں نے جھٹک

کر چھڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ ماں کوئی اور جتن کرتی، بھائی جی سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل گئے۔ ماں کچھ دور ان کے

پیچھے ”اجیت کے بھائی سنو تو! اجیت کے بھائی! سنو تو! پکارتی گئی آخر لوٹ آئی۔ اُس نے بھرے ہوئے روپے اکٹھے کئے اور شرماسی اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

بھائیاجی کو اپنے نطفے پر ایسے بھروسا تھا جیسے کسان کو صحت مند بیج پر ہوتا ہے۔ بیج کے بارے میں کسان کا رویہ صدیوں پرانا ہے۔ کسان کھیتی کا وہ حصہ بیج کے لئے الگ رکھتا ہے جس کی اٹھان پورے کھیت سے اچھی ہو۔

یہ پہلا موقع تھا کہ گھر میں جھگڑا ہوا تھا اور کوئی رو نہیں رہا تھا۔ ماں کسی حد تک برہم تھی لیکن مجموعی طور پر صورت حال مانوس اور سکون پر دو تھی۔ میری نانی اور ماں اٹھ کر تایا جی کے پاس بیٹھ گئیں۔ ماں نے تایا جی سے ہلکے سے گھونگٹ کی آڑ سے پوچھا ”بھائیاجی، اب کیا ہو گا؟“

انہوں نے میری پیٹھ تھپک کر وثوق سے کہا، ”تو بڑا ہو گیا ہے۔ تجھے اپنا گھر بسانا ہی ہے اور اپنے طریقے سے چینا ہے۔ اس سے پہلے ضروری ہے کہ تو دنیا کو اپنے طور پر دیکھے اور اچھے، بُرے میں تمیز کرنا سیکھے۔ آدمی اپنے تجربے سے زیادہ سیکھتا ہے نسبتاً دوسرے کے بتانے سے، کیوں کہ اُسے ہر سبق کے لئے کچھ نہ کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ آدمی اُس جگہ کی صاف طور پر نشان دہی کر سکتا ہے جہاں اُسے ٹھوکر لگی ہو۔ اپنے سے سیکھنے اور کسی سے سیکھنے میں اسی حقیقت کا فرق ہے۔ تجھے کون سا بُرا اس آئے! تیری مچھی پر ہے لیکن ہنر کوئی بھی ہو، دیانت داری سے جینے کا وسیلہ ہے!“

میں گھر سے نکل جانے کا تہہ نہ کر چکا تھا اور کسی بھی مصیبت کے لئے تیار تھا۔ ہوتے ہوئے میں جھگڑوں کا عادی ہو گیا تھا اور سوال جواب کرنے لگا تھا۔ میں نے ”جی ہاں“، ”ہاں جی“ کہتے ہوئے اُن کی باتیں سنیں۔ میں اُن کی ہر بات اسی لگن سے سنتا تھا جیسے کہانیاں۔

”بھائیاجی، یہ دلی میں رہے گا کیسے؟“ ماں نے تشویش ظاہر کی۔

عقل مند آدمی کہیں رہے، اکیلے نہیں ہوتا! اُس کی فہم و فراست اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ”انہوں نے جہاں ماں کی ڈھارس بندھائی وہاں میری تعریف بھی کی۔ میری ناقابل اعتبار صورت حال پر وہ رنجیدہ تھے لیکن رنجیدہ تھے جیسے اپنے دکھ، سکھ میں ہوتے تھے۔ وہ اٹھ کر جانے لگے، ماں نے کہا ”بھائیاجی، آپ بیٹھے! میں چائے بناتی ہوں۔“

ٹھیک ہے، میں باہر صحن میں بیٹھتا ہوں۔ ”انہوں نے ماں کی بات مانتے ہوئے کہا۔ وہ چائے شوق سے پیتے تھے۔

”بیٹی! میں نہ تیرے پاس آتی اور نہ یہ لڑائی ہوتی!“ میری نانی میری ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اُس کا لہجہ احساسِ تصور سے چمک رہا تھا۔

”نانی ماں! یہ لڑائی آپ کے آنے سے نہیں ہوئی۔ بھائی کے منہ کے لئے چھینکا چاہیے جو کوئی دیتا ہوا داتا ہے۔ اجیت سنگھ کے بیاہ پر کیا ہوا تھا، اس نے پورے رشتے داروں کو بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا۔“ اس سے پہلے کہ ماں کچھ کہتی، میں نے آواز نیچی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تو چپ رہ! بیٹوں کی بات میں چھوٹوں کا بولنا بد تمیزی ہے۔ باہر جا کر بھائی جی کو سر ہانہ دے، ان کے پاس بیٹھ اور کوئی عقل کی بات سیکھ! سارے خاندان میں ایک ایسا نہیں جو ان پر گیا ہو!“ اس نے مجھے دھتکار کر وہاں سے بڑھادیا اور میں سوچنے لگا، کاش! میں تایا کا بیٹا ہوتا! میں نے اندر سے سر ہانہ اٹھایا، لے جا کر تایا جی کے سر کے نیچے رکھا اور ان سے پنکھالے کر انہیں جھلنے لگا۔ میں تایا جی کی بات پر غور کرنے لگا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے، مجھے اپنا راستہ آپ تعین کرنا تھا اور زندگی کی سچائی کو اپنے طریقے سے پرکھنا تھا۔ میرے سامنے زندگی تضاد ہی تضاد تھی۔

راتنے میں ماں چائے لے کر آئی اور چائے کی گڑی سٹول پر رکھ کر چلی گئی۔ تایا جی انھیں بند کئے بیٹے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی اور گڑی میں سے گلاس میں چائے ڈالی۔ وہ ایسے اٹھے جیسے تھکے ہوئے ہوں۔ میرے ہاتھ سے گلاس لے کر وہ چائے پینے لگے اور چند گھونٹ پی کر کہنے لگے، ”بیٹا! آدمی کی زندگی خود کو سمجھ کر آگے بڑھنے میں ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ کہیں نہیں پہنچتا! ادھورا رہتا ہے۔ ادھوری شے ذاتی تسکین ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے کی۔ زندگی کے ایک ہی معنی ہیں، حسن عمل۔ ادھر دیکھ!“ انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھایا جہاں کچھ دن پہلے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہاں سے درانتی سے ماس اڑ گیا تھا۔ یہ گرٹھا بھر کر ماس کے برابر آگیا ہے اور انگوٹھا پہلے کی طرح خوبصورت لگتا ہے۔ آدمی کی عملی زندگی، اسلوب فطرت کے مطابق ہے جس آدمی میں حسن پرستی کا عنصر نہ ہو وہ فیض خود زائیدگی سے محروم رہتا ہے اور فرحت آفریں لمحوں کی نازکی سے بے بہرہ۔“

میں اپنے تایا جی کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں اور کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہوں۔ اس وقت یہ چند سطور ہدیہ رخصت کے طور پر لکھ رہا ہوں۔

تایا جی کے کردار میں جو قوت حیات تھی اس کا سرچشمہ خالص ان کی اپنی ذات تھی ورنہ دھرتی ماں کسی اور کو بھی ویسی خوبی سے نوازتی جو صرف انہیں کی پونجی تھی۔ ان کی طبیعت میں نرمی اور ہمدردی، بھول کی خوشبو کی طرح تھی جو دور دور تک محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کال کوٹھڑی میں چھوٹا سا سوراج، آفتاب کی ہی حیثیت رکھتا ہے ویسے ہی مصیبت میں ان کی قربت تھی۔ ان کی بول بانی لفظوں کے معنی ہی بدل دیتی تھی۔ اپنے دکھوں سے گھبرا کر میری ماں اپنی موت کی چاہ کرتی، وہ اُس غریب بے کس کی دھارس یوں بندھاتے، میرے بیٹے! میں تجھے مرنے سے ہرگز نہ روکتا لیکن مرنے کا ایک ہی دھنگ ہے اور جینے کے انیک۔ موت کو پچھاٹنے کی ہمت کا نام ہی



زندگی ہے۔“

اُس مبدلہ فیاضی و سخاوت اور گنج فہم و بصیرت کا نام سادھو سنگھ ہے۔ نام کی ریاکاری کہادت ہے، نام بڑا اور درشن چھوٹے! لیکن وہ اپنے نام کے معنی سے بہت بڑے تھے۔ وہ الفاظ کو غلی جامہ پہناتے تھے تو اُن کے رسمی معنی ابے ربط لگتے تھے جیسے خوشبودار پھولوں کے سامنے بے خوش بو پھول۔

دوسرے دن سویرے ہی میں دلی کے لئے تیار ہو گیا۔ ماں نے مجھے پندرہ روپے نقد دیئے جو پچھلی رات بھائی جی میرے لئے دے گئے تھے۔ وہ ناقابل اعتبار گھڑی آہنیچی اور میری ماں لگی مجھے ہدایت کرنے۔ وہ جان کر نہیں جانتی تھی کہ مجھے انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑے ہوئے سترہ سال ہو گئے ہیں۔ میری رخصت کا سماں دیدنی تھا! ماں نے دہلیز پر تیل چوایا، میری ہن ترسیم کرنے کنبھ کی، میں نے سیدھا پاؤں دہلیز کے باہر پہلے رکھا اور میرے پیچھے ہر کوئی باہر نکلا۔ میری حیثیت میرا روال کی سی تھی۔ میرے ہی خواہوں میں کوئی نہیں تھا تو میرا بھائی میرا باپ۔ راستے میں کٹواں پڑتا تھا۔ تیرتھ کو رپانی کا گھڑا لے آئی ملی۔ اُسے دیکھ کر ماں کی آنکھیں اُمید و مسرت سے چمک اُٹھیں۔ اُس نے اُس کا منہ چوما، جگ جگ جیو، سہاگن بسو کی دُعا دی۔ اُس شبہ شگون کو ہر کوئی سراہ رہا تھا اور ماں کو بدھائی دے رہا تھا۔ میرے گھر بدر ہونے کی خبر ہمدردی بن کر پھیلی تھی۔ بڑی بوڑھیاں فکر مند تھیں کہ اُن کے خط کون لکھے گا؟ کئی میرے ساتھ تھیں جن میں سے تانی پر بھی اور بھابی سُمرن کو قابل ذکر ہے۔ تانی پر بھی لاڈ سے کہا کرتی تھی، ”تو میرا کوا ہے!“ اُس نے جذباتی ہو کر کہا۔

کون رانجھڑے خبر کرو کا داں

میرد ہمار بیٹی

(میرے کوئے! اب کون میرے رانجھے یا کو خبر دے گا کہ تیری بہن بیمار ہے)

بھابی سُمرن کو شرم سے کچھ نہ بولی حالانکہ میں اُس کا راز دار تھا۔ بھائی صاحب اُس سنگھ کو وہ جیسے خط لکھواتی تھی، اُن کے مضمون راز میں رکھنے کے لئے مجھے چوری چھپے مکھن کھلاتی تھی۔ اُن کا مطلب کم و بیش ایک سا ہوتا تھا۔ آپ نوکری چھوڑ کر گھر آجاؤ، تاکید ہے۔ میرا اکیلا پن، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا! یہاں کھانے پینے کے لئے سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نوکری چھوڑ دو، تاکید ہے۔ پھر تاکید ہے۔ اس خط کو تار سمجھنا۔

اُس دیہات کی باتیں، کھرے جذبے سے سرشار ہوتی تھیں اور دیہاتی مشاہدے سے بھرپور۔ آپ کے باہر گئے کتنا عرصہ گزرا ہے! میں اُن پرٹھ کیسے جانوں؟ آپ کے ہوتے ہوئے گائے نے جو بچھڑا دیا تھا، وہ نوا، مجھ سے شبہا لے نہیں سنبھلتا! پورا میل ہو گیا ہے!

میری ماں ہر طرح سے مطمئن تھی۔ اُسے ایک ہی بات کھٹکتی تھی کہ اُس کے کہنے پر میں گروہ دار نہ گیا تھا اور اس طرح گروہ کی آشیر باد سے محروم رہ گیا تھا۔ گاؤں کے باہر پھرتے ہوئے میں نے بڑوں کے پاؤں ہاتھ لگایا اور جھوٹوں سے گلے ملا۔ کوئی سوگوار تھا اور کوئی اشکبار کوئی آواز غم سے زندہ تھی ہوئی تھی اور کوئی بسکیوں سے ڈھائی ہوئی۔ میں جس سے مل کر جدا ہونا فہ کوئی نہ کوئی دعا دیتا۔ ماں نے بار بار کہا۔ ”رَبّ رکھا! تیرا اہل گرو رکھا!“ میں نے تایا جی کے پاؤں جھوئے تو انہوں نے مجھے گلے سے لگایا، پیار کیا اور قدرے توقف سے کہا، ”تُو اپنا رکھا آپ ہے! اپنا خیال رکھنا! میں تجھے، تجھی کو سوچتا ہوں۔“

انہوں نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ میری جیب میں ڈالا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور گاؤں کی طرف مڑ گئے۔

میں اپنی حالت کیا بیان کروں! میں اُن سے ایسے جدا ہوا جیسے اُنسو، آنکھ سے ٹوٹتا ہے۔ میرے اُنسو میری عمر گزشتہ کا ایسا جوہر ہیں، جس کی کمی گری ہمہ صفت ہے۔ کہیں معصومیت کا احساس ہے اور کہیں چال بازی کی بویاں، کہیں مردہ دلی کی بے کسی ہے اور کہیں زندہ دلی کی سرگرمی، کہیں بچپن کا الجھاؤ ہے اور کہیں جوانی کا سلجھاؤ، کہیں خیال کے خاکے ہیں اور کہیں عمل کے نقشے، کہیں شکست کی قنوطیت ہے اور کہیں فتح کی رجائیت۔ میں کہیں ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا تو میرے اُنسو ہی مجھے سنبھالتے اور سہارا دیتے۔ انہوں نے میری پرورش اُس لاچار پودے کی طرح کی ہے جسے ٹھیک سمے پر برکھا کا امرت نہ ملے تو وہ اپنی ہی آگ میں جل جائے۔

مشائستوں کے لحاظ سے آدمی، اَشَوَکھم ہے (وہ سدا بہار درخت جس کی جڑیں آسمان میں اور شاخیں دھرتی پر ہیں، تایا جی کہتے تھے کہ آدمی، درخت کی طرح دھرتی کی پیداوار ہے لیکن اس کی جڑیں، دماغ میں ہیں۔ دماغ، انسان کے وجود میں چھٹا عنصر ہے اور اُن پانچوں عناصر سے زیادہ اہم ہے جن کی مذہب دین دلتا ہے۔ دماغ سے انسان کا عرفان ہے اور عرفان ہی انسان کی قوت ہے۔ یہ اسی عرفان کا احسان ہے کہ میں ماں کی محفوظ گود سے نکل کر ناقابل اعتبار دنیا میں اکیلا کھڑا ہوں۔ میں اُس سفر پر آمادہ ہوں جس کی بے اعتباری کا ادراک صرف سفر کے راستوں کو ہے جس طرح جسم کی تشکیل میں پٹھوں کو بڑا دخل ہے اُسی طرح آدمی کی زندگی میں راستوں کو۔ خون کے لئے رگیں اور آدمی کے لئے راستے لازم و ملزوم ہیں۔ سمجھو تو راستے، کتاب حیات کے درخت ہیں جن پر ہر آدمی اپنے اپنے نقش بنا رہا ہے۔ ان آوارق کی خوبی، ان پر کوڑا ہنقوش باہم دگر ثبت ہیں لیکن ہر کوئی اپنے طور پر صاف اور واضح ہے۔ آدمی کے سوائے ہر چیز کی انفرادیت اُس کے خیر میں ہے لیکن آدمی کو اپنی انفرادیت تلاش کرنی پڑتی ہے۔ میں خود سے سوال کرتا ہوں۔ کیا میں اپنی انفرادیت تلاش کر سکوں گا؟

گیان سنگ شاطر

۲۲۹

دوسری کتاب

باب نمبر	صفحہ نمبر
۴۱	۳۵۳
۴۲	۳۶۳
۴۳	۳۷۱
۴۴	۳۷۵
۴۵	۳۸۲

یاس و اُمید کے دو راہے پر  
دَم میں جیتا ہوں دَم میں مرتا ہوں

پہلے کاندھوں پہ صلیبوں کو اٹھا لو یارو  
پھر جہاں چاہو پھر و اہل تمنا بن کر

دُنیا سے زرا لے ہیں قرینے اپنے  
صدیوں میں گزرتے ہیں مہینے اپنے  
ناکام تمناؤں کے مدفن جیسے  
دیکھتے تو کوئی کھود کے سینے اپنے

روتے ہیں لہو چھلے کہ جلتے ہیں چراغ  
یا گردشِ دوراں میں ہیں قسمت کے ایاغ  
کہتے ہیں جنہیں چاند ستارے شاطر  
لوحِ غمِ امروز پہ فاقوں کے ہیں داغ

نقصان میں جب تجزیہ ذات کرو  
کچھ عقل کو بھی شامل جذبات کرو  
رونے سے ٹھہر جائے گی ہر ساعتِ غم  
اس طرح نہ تُم ماتیم حالات کرو

- ۳۸۷ ۴۶ اخلاص کی افراط کسے ملتی ہے  
یہ عُمَدِ گِی ذات کسے ملتی ہے  
تقدیر سے مل جائے جسے مل جائے  
یہ لذتِ سوغات کسے ملتی ہے
- ۳۹۱ ۴۷ دانے میں نہاں دام نظر آتا ہے  
آزاد بھی ناکام نظر آتا ہے  
دل جہد کے جذبے سے اگر عاری ہو  
آغاز بھی انجام نظر آتا ہے
- ۴۰۳ ۴۸ طوفان کو ڈراتا ہے سفینہ جن کا  
دریاؤں کا رخ موڑ دے سینہ جن کا  
وہ زہرِ غم روز میں ہیں ڈوبے ہوئے  
امرت سے بھی بڑھ کر ہے پسینہ جن کا
- ۴۰۸ ۴۹ جذبات سے دیوانہ ہوا جاتا ہوں  
حالات سے بیگانہ ہوا جاتا ہوں  
جب سے میں ہوا اپنی حقیقت کا نقیض  
بے جوڑ سا افسانہ ہوا جاتا ہوں
- ۴۱۵ ۵۰ وہ جو رکھتے ہیں اپنے کام سے کام  
وہ حقیقت کو ہی سیانے ہیں
- ۴۲۳ ۵۱ شاطر زمانہ دے گا ضمانتِ دوام کی  
نود میں مگر کمال تو پیدا کرے کوئی

- ۴۳۲ ۵۲ ہم اُسے آدمی نہیں کہتے  
جس نے ٹھوکر کبھی نہیں کھائی
- ۴۴۰ ۵۳ ہر کام میں ہے دیر جدھر بھی دیکھو  
تقدیر کا ہے پھیر جدھر بھی دیکھو  
ہر سمت نئے پاپ جنم لیتے ہیں  
اندھیر ہے اندھیر جدھر بھی دیکھو
- ۴۵۰ ۵۴ ہوں خشک دہن دشت کے خاروں کی طرح  
ویران ہوں بوسیدہ مزاروں کی طرح  
سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں طوفاں  
خاموش ہوں دریا کے کناروں کی طرح
- ۴۶۰ ۵۵ چہرہ ہے غم دہری جلتی سی کتاب  
آنکھیں ہیں امیدوں کے فردہ سے گلاب  
جینے کی تمنا پہ گماں ہے ایسا  
گھر لوٹتا ہے جیسے کوئی خانہ خراب
- ۴۷۱ ۵۶ نفرت کے خداؤں کی عبادت چھوڑو  
تفریق کے سنگین بُتوں کو توڑو  
تم چاند ستاروں کی طلب سے پہلے  
انسان سے انسان کے رشتے جوڑو
- ۴۷۸ ۵۷ اخلاص اُسے راس نہیں ہوتا ہے  
قدروں کا اُسے پاس نہیں ہوتا ہے

کس بات میں کیا حُسن ہے؟ کیا معنی ہے؟  
کم ظرف کو احساس نہیں ہوتا ہے

## باب ۴۱

یاس و اُمید کے دورا ہے پر  
دَم میں جیتا ہوں دَم میں مرتا ہوں  
(شاطر)

بَسوں کے آدے پر جانے سے پہلے میں ٹال پر آیا۔ رکھا جامن کے نیچے اینٹ پر سر رکھے پڑا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں دلی جا رہا ہوں۔ وہ ویسے ہی آرام سے پڑا رہا جیسے پڑا ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اُس نے میری بات نہیں سنی، میں نے بات دُہرائی۔ اُس نے میری جانب پہلو بدلا اور سر کا بوجھ ہاتھ پر لے کر کہا، ”تم جو کرنا، کرنا، ادھار نہ کھانا۔ یہ پودا جتنی آسانی سے لگتا ہے اُس سے ہزار مشکل سے اکھڑتا ہے۔ جاؤ، کام کرو، بڑھو پھولو، خوش رہو۔“

میں مشکل سے دو قدم پیچھے مڑا تھا کہ رکھے کو بولتے سنا۔ وہ پہلے ہی کی طرح چپٹ پڑا تھا اور خود سے کہہ رہا تھا ”پرانی چکنی چٹری سے اپنی سُکھی بھلی“ وہ خود سے اخلاقی باتیں کیا کرتا تھا۔ جسے اپنی مُراد و مقصد کو پانا ہوا اُسے اپنے عہد و عزم کی تجدید بار بار کرنی چاہیے! دیانت داری اپنا گھر شیشے سے بناتی ہے جسے لو بھکا ہلکا کا پتھر چور چور کر سکتا ہے۔ رکھا اور تایا جی کے سوائے میں کسی کو نہیں جانتا، نہیں پہچانتا، جس کے کہنے اور کرنے میں مماثلت ہو۔ تایا جی کہتے تھے، ”کسی سے کبھی کچھ مت لو! اگر لو تو وعدے سے پہلے اُس کے گھر دے کر آؤ، یہ عزتِ نفس کی علامت ہے۔“

دلی دُور کی بات ہے، میں نے جائزہ نہیں دیکھا تھا جہاں سے دلی کو ریل گاڑی جاتی تھی۔ میں نے ہوشیار پور بھی چار بار دیکھا تھا اور وہ کبھی کسی خاص مقصد کے تحت، جب کوئی نہ کوئی میرے ساتھ تھا۔ ان سفروں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ پہلی بار میں شیش محل، گندہ بروڑہ کا کارخانہ اور باولی دیکھنے

کے لئے گیا تھا، دوسری بار پنڈت جواہر لال نہرو کو دیکھنے کے لئے، تیسری بار سنسایکچر دیکھنے کے لئے اور چوتھی بار سائیکلوں کے لئے کل پُرزے خریدنے کے لئے۔ ہریانہ سے جالندھر مشکل سے تین گھنٹے کا سفر ہوگا لیکن میں گھر سے سویرے ہی رولڈ ہو پڑا تھا۔ گاؤں کا رواج ہے کہ سفر آخر اتفری میں نہیں کرتے ہیں۔ دیسراج شہری ٹھگلوں اور اُچکوں کے قصے سنا تھا۔ گاؤں والوں میں عام چرچا تھا کہ شہری، دیہاتی سے زیادہ لالچی اور فربہ ہوتا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ کسان منڈیوں میں صاف سُتھری پیداوار بیچتے ہیں لیکن جب وہی چیزیں دکانوں سے خریدتے ہیں تو ان میں بلاوٹ ہوتی ہے۔ مجھے ہر کوئی مشکوک نظر آ رہا تھا۔ جالندھر تک شاید ہی کوئی مقام گزرا تھا جہاں کسی نے پھت پر سے سامان اُتارا ہو اور میں نے دیکھا نہ ہو۔ اس کی ایک وجہ اور تھی، بس پر لکھا ہوا تھا، سواری اپنے سامان کی ذمہ دار آپ ہے۔ جالندھر میں بسوں کے اُٹے سے ریلوے اسٹیشن زیادہ دُور نہ تھا اور میرے پاس وقت بھی تھا۔ میں اپنا سامان آسانی سے اٹھا سکتا تھا اور چل کر وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔

میں آپ سے اپنی ایک اور کمزوری بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں گاؤں میں جس کام کو ہنسی خوشی کرتا تھا، وہی کام شہر میں کرتا ہوا اُٹھتا تھا۔ گاؤں سے ہریانہ آتے ہوئے بوڈورام میرے ساتھ تھا جس نے میرا ٹرنک اٹھایا ہوا تھا۔

میں نے اپنا سامان قلی سے اٹھوایا اور سائیکل رکشا پر بیٹھ کر سٹیشن پہنچا۔ ویسے تو کئی گاڑیاں دلی جاتی تھیں، میں نے شام کو جنتا میل سے جانے کا پروگرام بنایا۔ آسمر سنگھ کہتا تھا کہ جنتا میل میں بھیڑ کم ہوتی ہے۔ ٹرین کا کٹ، ٹرین آنے سے گھنٹا بھر پہلے ملت تھا، میں مسافر خانہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

پلیٹ فارم کی گہا گہی مسافر خانہ سے الگ تھی۔ خوائجہ والوں کے بلاوے، چلے فروشوں کے بہکاوے، دھواں اُڑاتے انجن، کانٹے بدلتے پھیپوں کی ٹھن ٹھن، بوجھل ہوا، شور فضا۔ شہری زندگی سرا سبکی اور پریشانی سے پُر تھی اور چوکسی طلب تھی۔ مستقبل سے زیادہ میں نے ماحول کے خوف کا اسیر تھا۔ میں جس بیچ پر بیٹھا تھا وہ کئی بار بھر کر خالی ہوا تھا۔ میں نے خواب میں نہ سوچا تھا کہ اُس ایک لائن پر سے اتنی ٹرینیں گزر سکتی ہیں اور وہ بھی الگ الگ سمتوں میں۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ بڑھتی اور ٹرین آتے ہی ساری کی ساری بھیڑ اُس میں سمٹ جاتی۔ میری بڑی پریشانی میرا قلی تھا۔ وہ مجھے وہاں بٹھا کر اور بھروسہ دلا کر چلا گیا تھا کہ وہ ٹرین آنے سے پہلے آئے گا اور اچھی سی سیٹ پر بٹھا جائے گا۔ اُس نے سامان اُتھا کر لانے کی مزدوری نہیں لی تھی، اس کے باوجود مجھے لگ رہا تھا کہ وہ وقت پر نہیں آئے گا اور



مجھے ٹرین پر اکیلے ہی چڑھنا پڑے گا۔ میری بے قراری میری بے اعتباری تھی۔ میں ایک نظر آگے اور ایک نظر پیچھے سامان کو دیکھتا، آگے پلیٹ فارم کے کنارے کی طرف بڑھتا اور پیٹری کو حیرت سے دیکھتا جو نامعلوم مقام سے آتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور اُسی طرح نامعلوم مقام میں گم ہوتی ہوئی۔ میرا سامان میرا مسئلہ تھا۔ میں سوچتا کہ میں تنہا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! جتنا آہی ہے! کہیں سے اُڑتی ہوئی آواز آئی اور خطر کے سارن کی طرح گونج گئی۔ نہ کوئی نئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے بے چین نظر آیا اور پھر جہاں تھا وہیں دم بستہ ہو گیا جیسے خود نہاد ضابطے کے قانون پر ایمان لے آیا ہو۔ ٹرین آئی اور ایک منظم ریلے کی طرح گزرنے لگی۔ اس کا آغاز تھا اور انجام نامعلوم ہیں۔ سکتے میں اگیا اور بھول گیا کہ وہ ٹرین ہے اور مجھے اس پر سوار ہونا ہے۔ اتنے میں میرا قلمی سر پر مڈاسا باندھتا ہوا میرے سامنے اکھڑا ہوا۔ اس نے جلدی جلدی مڈاسا باندھا، ٹرنک اٹھا کر دھڑنے کی سی رفتار سے چلنے لگا اور اس کے پیچھے میں۔ وہ بھیڑ میں جیسے چل رہا وہ اُسی کا کرتب تھا۔ میں نے اُسے بار بار کھوکھو کر پایا۔ ٹرین پوری طرح رکی نہ تھی کہ اُس نے لپک کر ڈبے کا ہینڈل پکڑا، اچک کر فٹ ریسٹ پر چڑھا اور دروازہ دھکیل کر اندر گھس گیا۔ اُس نے میرا ٹرنک اوپر ریک پر رکھا اور کہا، ”اس پر قبضہ جالو، آرام سے سو کر دلی پہنچ جاؤ گے۔ وہ اپنی مزدوری لے کر ایسے غائب ہوا جیسے حاضر ہوا تھا۔“

ٹرین جاندر کینٹ کے سٹیشن پر رکی اور روانہ ہوئی۔ ایک سردار چملمیں، ٹرین کی راہ داری میں اُکر کھڑا ہو گیا اور اونچی تیکھی آواز میں مسافروں کو مخاطب کرنے لگا۔ ”بھائیو آدھ بنو، آدھ دیکھو یہ بیوپاری آپ کے لئے کیا کیا لیا ہے؟ مہربان، قدردان آدھ دھیان دیجئے، خریدیئے نہ خریدیئے، مال ضرور دیکھئے ایسا سود مند بیوپار نہ آپ نے سنا ہے، نہ دیکھا ہے، نہ کیا ہے!“

وہ اپنے پیروں میں پڑے پڑے سے بیگ پر جھکا اور اُسے ٹٹولنے لگا۔ وہ ٹٹولنے کے ساتھ بول بھی رہا تھا، آواز دھیمی پڑ گئی تھی لیکن سنائی دے رہی تھی۔ وہ سیدھا اکھڑا ہوا، اُس کے ایک ہاتھ میں گڑوی اور دوسرے میں کنگھی تھی۔ ہاں تو بھائیو آدھ بنو، یہ گڑوی بکا دے۔ جس کی بولی اُس کی گڑوی۔ میرے لحاظ سے بولی ٹھیک ہوگی تو میں گڑوی دوں گا ورنہ یہ کمیشن دے کر گڑوی لکھ لوں گا۔ اُس نے گڑوی پر کنگھی مار کر کنگھی گھما پھرا کر دکھائی۔ گڑوی کاٹنے کی ہے اور نکل کی ہوئی ہے۔ جو سچ بولنے سے ڈرے، کوڑھی ہو کر مرے! مجھے کھرا سودا بیچنا ہے اور آپ کو کھرا سودا خریدنا ہے اور اس ٹرین میں جاتے آتے ہزار بار ملنا ہے۔ میں دھوکا کروں گا تو دوبارہ آپ کو منہ کیسے دکھاؤں گا؟

وہ بولی دے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن ہر کوئی چپ رہا۔

”بھائی صاحب کچھ تو بولیں ! وہ سامنے بیٹھے ایک سردار جی سے مخاطب ہوا جو اپنی پگڑی اُٹا کر گود میں رکھے ہوئے تھا اور اُسے خود کو ہوا جھل رہا تھا۔ اُسے بے اثر دیکھ کر اُس نے اُسے بہکانے کے سے انداز میں کہا، ”شرملے کی کوئی بات نہیں ہے، جو جی میں آئے بولیں۔ مجھے گڑوی بیجی ہے اور آپ کو خریدنی ہے۔“

”پھر روپے“ کسی دوسرے آدمی نے کچھ شرما تے ہوئے اور کچھ مسکراتے ہوئے بولی لگائی۔ اُس کے چلن سے ظاہر تھا کہ اُسے گڑوی کی ضرورت نہ تھی، وہ محض دل لگی کر رہا ہے۔

”پھر روپے ! دوسرے کی کانسی کی گڑوی چھ روپے میں۔ چھ روپے ایک، چھ روپے دو، بولی لگائیے بھائی صاحب ! جس نے کی شرم اُس کے پھوٹے کرم۔ چھ روپے ایک، چھ روپے دو، چھ روپے تین۔ لائے جناب چھ روپے۔“

بیوپاری نے ہاتھ بڑھا کر کاہگ سے روپے دھول کئے، سب کے سامنے گئے اور سب کو دکھاتے ہوئے کنگھی کے ساتھ واپس کر دیئے۔

وہ انوکھا بیوپاری اپنے بیگ میں سے نیا مال تلاش کرنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میری طرح اور کئی پچھتا رہے ہوں گے۔ خریدار کے پڑوسی اُس سے کنگھی لے کر دیکھتے اور بیوپاری کی حقیقت پر سندی کی تہنیت کرتے۔ اُس بار بیوپاری کے ہاتھ میں کٹری کا رٹ تھا۔ ہلکے پیلے رنگ کی لکڑی کے ڈبے کے اندر نیلی مٹلی میں سجائے ہوئے کلنٹے، چھریاں اور چچھے، نیلم کے ٹکڑے لگتے تھے۔

”بھائیو اور ہنوں، میرا یہ مال۔۔۔۔۔“

”دکھاؤ تو؟ ایک مسافر نے ہاتھ بڑھا کر اُسے بیچ میں ٹوکا۔

وہ خوبصورت سیٹ جس نے دیکھا، اُسی نے سراہا۔ جو کوئی بیوپاری کو بے یقینی سے دیکھتا تھا اُسے بھی اُس کی دیانت داری پر یقین ہو گیا تھا۔ تماشا بینوں کے چہروں پر سے تناؤ جاتے رہے تھے اور اُن کے خیالات یکسر بدل گئے لگتے تھے۔ کانٹے بدلتی، بچکولے کھاتی ٹرین یا رڈ پارک کے سیدھی لائن پر آگئی تھی اور چلتی ہوئی ساکن نظر آتی تھی۔ اُس کی رفتار میں لطیف سنگیت سمو گیا تھا اور بھلا لگتا تھا۔ کھڑکی سے آگے کے درخت اور کھجے، ٹرین کے منظر دکھائی دے رہے تھے اور کھڑکی سے پیچھے وہ سب اُس چور کی طرح بھاگ رہے تھے جس کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔

”مال سولا آنے کھرا ہے بھائی صاحب ! باہر کا مال ہے۔ ہندوستان کا ہوتا تو شک کی گنجائش تھی۔“

بڑھیا مال، بڑھیا کمیشن! اُس نے نہ کیا ہوا نوال جھٹک کر کھولا۔ سفید رومال میں کناروں سے دو انچ اندر اُدھا انچ چوڑا نیلا حاشیہ تھا۔ میرے جی میں آئی کہ بولی لگاؤں اور کمیشن حاصل کروں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اُس نے کمیشن دینے سے پہلے روپے دیکھے تھے اور میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ تایا جی کے پانچ روپے ملا کر میرے پاس کل بیس روپے ہوئے تھے، جن میں سے میں تقریباً بارہ روپے خرچ کر چکا تھا۔ بیوپاری نے رومال کا ندھے پر رکھا، صاف سنوارا، فکر سے چکی ہوئی داڑھی پر احتیاط سے ہاتھ پھیرا، جیب میں سے رنگین رومال نکالا اور اُس سے گردن کو ایسے پونچھا جیسے کوئی تازہ تحریر کو سیاہی چوس سے نکھاتا ہے۔ جب تک وہ اپنی وضع قطع سے مطمئن ہوا، کٹلری سیٹ ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا واپس اُس تک پہنچ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اعتماد سے بولا، ”بھائیو اور بہنو! میری بولی پندرہ روپے۔ اس قیمت میں مجھے کوئی سو سوٹ دلوا دے، میں خریدار ہوں۔“

”سولہ روپے“

جس گاہک نے بولی دی، اُس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

سولہ روپیہ! میڈان انگلینڈ مال کا مول سولہ روپیہ۔ بھائی صاحب، انگریز لوگ خراب ہیں، ان کا مال اچھا ہوتا ہے۔ اتنے اچھے مال کے سولہ روپے۔ سولہ روپیہ ایک،

”سترہ روپیہ“

جس نے بولی بڑھائی اُس کی آواز تسکین آمیز تھی۔

”سترہ روپے۔ انگلش کٹلری سیٹ سترہ روپے میں۔ شین بس سٹیل انگریزوں کی نئی ایجاد ہے، اُس کا کٹلری سیٹ سترہ روپے میں۔ سترہ ایک، سترہ دو، سترہ“

”اٹھارہ روپیہ“

جواہری پہلے بولی دے چکے تھے وہ بابتھے۔ اس بار جس نے بولی دی وہ سردار تھا۔ وہ بولی دے کر اڑ کر بیٹھ گیا جیسے بولی بڑھانے والے سے لڑنے پر آمادہ ہو۔

”اٹھارہ روپیہ ایک، اٹھارہ روپیہ“

”بیس روپیہ“

جس آدمی نے پہلے سولہ روپیہ بولی دی تھی اُس نے بولی بڑھائی اور کپڑوں کو سنوارا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیوپاری نے اُسے غور سے دیکھا اور کہا، ”بیس روپیہ۔ اسی لئے ماں باپ کہتے ہیں کہ بیٹا پڑھو لکھو اور آتم و شواش بڑھاؤ۔ بیس روپیہ ایک، بیس روپیہ دو، بیس روپیہ تین۔“

اُس نے ہر بولی دینے والے سے بولی کے روپے لئے اور جس نے دو بولیاں دی تھیں اُس سے دو بولیوں کے۔ اُس نے کٹری سٹ بند کر کے جھولے میں رکھ لیا اور ایک بولی دینے والے سے مخاطب ہوا آپ نے ایک بولی دی ہے، یہ لیجئے اپنے روپیے اور ایک رُومال کمیشن۔ اس طرح اُس نے ہر بولی دینے والے کو ایک رُومال کمیشن دیا اور دو بولیاں دینے والے کو دو رُومال۔ بولیاں دینے والے کمیشن پا کر اترا ہے تھے اور بیوپاری جھولے میں سے نیا مال نکالنے میں مصروف تھا۔ اس بار اُس کے ہاتھ میں کالا نیا بُوٹ اور چمکتا دمکتا بگھونا تھا۔ اُس نے دونوں چیزوں کو نمایاں طور پر اُوپر اُٹھایا اور گویا ہوا، ”بھائیو! آہ بھنو بُوٹ ہاٹ کے ہیں آہ بگھونا سٹین لس سٹیل کا۔ ہاٹا اور ٹاٹا کا تام کون نہیں جانتا! اس سودے کا کمیشن، پائلٹ بین ہے۔ میری بولی بیس روپیہ۔“

”بائیس روپے“

”تیس روپے“

”چوبیس روپے“ ”بائیس روپے بولی دینے والے نے بولی بڑھائی۔“

”پچیس روپے“

”چھبیس روپے“ ”تیس روپے بولی دینے والے نے بولی بڑھائی۔“

بولی جتنی تیزی سے بڑھی تھی اتنی ہی تیزی سے رُک گئی اور ایک، دو، تین ہو گئی۔ بیوپاری نے جوتا اور بگھونا جھولے میں رکھ دیا اور اپنے ہاتھ میں پائلٹ بین لئے کھڑا رہا۔ اُس کی ادا سے ظاہر تھا کہ اُس کے مال کی مطلوب قیمت نہیں ملی ہے۔ ٹرین پگھلاؤ پر لوے سٹیشن کے یارڈ میں داخل ہو چکی تھی آہ بھلی جلدی کا ٹاٹا بدل رہی تھی۔ خریدار مطلوب روپیہ بیوپاری کے ہاتھ میں پکڑا چکے تھے اور کمیشن کے انتظار میں تھے۔ جس آدمی نے چھبیس روپے بولی دی تھی اُس کے پاس رقم کم پڑی، اُس نے اپنے ساتھی سے اُدھار لے کر دو بولیوں کی رقم پوری کی آہ بیوپاری کو دی۔ ٹرین پلیٹ فارم کی حدود میں پہنچ گئی اور لگانا رفتار کھونے لگی۔ بیوپاری نے روپیہ جیب میں رکھا اور مال دینا شروع کر دیا۔ پہیلیں پر بریکوں کے رگڑنے کی آواز آئی اور ٹرین رُکنے کے آخری مراحل میں داخل ہو گئی۔ ٹرین کے رُکنے تک اُس نے سب گاہکوں کو بھگتا دیا اور نیچے اترنے کے لئے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ جب تک خریداروں کو اپنی نادانی سمجھ میں آئی، پگھلاؤ سے چڑھنے والی جتنا ایک ریلے کی صورت ڈبے میں گھس رہی تھی۔ ہر گاہک نے ایک ہی مال کی الگ الگ قیمت چکائی تھی۔ جو اُس کا دیار میں تماشائی تھے وہ بھی اپنی رائے دینے لگے تھے۔ میری طرح ہر کوئی بیوپاری کی دیدہ دلیری پر حیران تھا اور تہمت طراز بھی۔ ایک بوڑھے دیہاتی نے اُس کی فطرت کا جیسے تجزیہ کیا وہ قابل

ذکر ہے، ”شہری لوگ، سُتار ہوتے ہیں جو اپنی ماں کے زیور تک میں کھوٹ ملا دیتے ہیں۔“  
 شہریوں کے بارے میں میرے دل میں ایک خیال آ رہا تھا اور ایک جارہا تھا۔ میری ماں  
 نے مجھے دلی میں لایا۔ سنگھ کے پاس رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ میری دو بھینسوں کا ایک داماد تھا اور ماں کا  
 لاڈلا۔ وہ اپنے رہن سہن پر ناز کرتا تھا اور آجمل خان روڈ کے پاس ریگڑھ پورہ میں رہتا تھا۔ وہ جب  
 چھٹی آتا، ماں سے ضرور ملتا اور اصرار کرتا، ”مامی جی! آپ میرے پاس دلی چلیے، آرام کیجئے اور  
 کام کاج کو خیر باد کہیے!“

ماں اُس کے آدر سے خوش ہوتی، اُسے سیر، دو سیر گھر کا گھی دیتی اور نادم سی کہتی، ”بیٹا  
 یہ میری تقدیر کہاں! تم جب آتے ہو، مل جاتے ہو۔ میرا جی خوش ہو جاتا ہے۔ میرا ممبر بڑا ہے۔  
 دودھ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ یہ تھوڑا بچایا ہوا ہے، لے جا، شہر میں یہ سوغات ہے۔“

میرا دل قدرے ٹھہر گیا اور میں نے خود سے کہا، میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ دلی میرے  
 خوابوں کا شہر تھا۔ کورو پانڈو کے ہستنا پور نے کتنے انقلابوں سے گزر کر یہ چھوٹا سا دل بنا نام اپنا دیا تھا۔  
 استاد گرجن سنگھ دلی کو توڑ کر ’دلی‘ بولتے تھے اور حضرت ذوق کے حسن انتخاب کی داد دیوں دیتے تھے۔  
 استاد نے تگدستی سہی، بے قدری جھیلی، دلی نہ چھوڑی۔ اُسے دلی سے جذباتی لگاؤ تھا۔  
 ذوق کا یہ شعر گرجن سنگھ کے بیان کی سند ہے۔

میں نے یہ مانا، دکن میں ہے بہت قدرِ سخن  
 کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر!  
 کون جائے ذوق!!! یہ تین الفاظ اُس کے ماضی، حال، مستقبل کے نمائندے ہیں جن کے  
 معنی شش جہت کا احاطہ کرتے ہیں۔

دلی کا چپچپا چپا، تاریخی یادگاروں سے بھرا پڑا تھا۔ میرے خیال میں قطب مینار، اشوک کی  
 لاطھ، فیروز شاہ کا کوئلہ، لال قلعہ، دیوانِ خاص، دیوانِ عام، چاندنی چوک، سیس گنج۔۔۔ کے خاکے  
 ابھرتے۔ ان سے بڑھ کر جمنائے پیارے کنارے، جو رادھا کرشن کی پریم کتھاؤں کے چشم دید گواہ تھے۔ دلی  
 وقت کا ایسا ورق تھا جہاں تاریخ بولتی سُنانی دیتی تھی۔ عدالت یار اس محلے کو کیسے توڑ توڑ کر گاتا تھا اور  
 کہتا تھا کہ اسے کئی راگوں میں گایا جاسکتا ہے۔

سکھی ری سکھی چل جمنائے تیر

میں نے غالب مغلوب کو یاد کیا۔ وہ خود سر نہ کر ہوا، جاہل پتی ماروں میں جیا، مجھ کو کامرا لیکن دلی سے رام پور نہ گیا اور اپنے اس نظریے پر مرنا۔

کیا پوچھئے وجود و عدم اہل شوق کا  
خود اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

میں نے اس خیال میں تسکین پائی کہ اُس زمین میں آسمانی کشش ہے جسے دلی کہتے ہیں۔ میں اُن لوگوں پر رشک کرتا جو دلی میں رہتے تھے۔ دلی گھٹی، دلی بڑھی، دلی اُجڑی، دلی بسی اور اُجڑتی بستی رہی اور اپنی ہر صورت میں نئی جاذبیت کے ساتھ ابھرتی رہی۔ اُس کا اُجڑنا اس کے لئے فال نیک تھا۔ تایا جی یہی بات ہنر کے بارے میں کہتے تھے، پرانا ہنر، نئے ہنر کے لئے ایسے ہے جیسے کوئہ میں ریشم کا کپڑا۔ میں محمد تفلک کی بے شعوری پر حیران ہوا جو دلی جیسی جنت کو ٹھکرا کر دکن کی طرف چل پڑا تھا اور بالآخر پہچھتا یا تھا۔ چانن سنگھ کہتے تھے، تخت طاؤس پر یہ شعر کندہ ہے۔“

اگر فردوس بر روے زمین است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

تاریخ کا یہ باب پڑھاتے ہوئے وہ تاریخ داں کی زبان درست کرتے تھے، یہ شعر لکھا ہوا نہیں، کندہ ہے۔ جو کوئی عبارت کو جوں کی توں پڑھ دیتا، وہ اُس کی گوشمالی کرتے اور سمجھاتے، کوئی بھی ایراعیہ نہ تھو خیر الھکھ سکتا ہے لیکن کندہ کرنے کے لئے ہنرور چاہئے۔ تخت طاؤس ہنروری کا نقشِ کامل ہے اس لئے اُس پر لکھنے کا تصور، خیال باطل ہے۔“

جب مجھے احساس ہوا کہ میں دلی میں ہنر سمجھنے اور تقدیر بنانے جا رہا ہوں، چانن سنگھ کی وضاحت نئی سمت اختیار کر گئی۔ شیخ ابراہیم ذوق غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اپنے ہنر سے استادِ شہ کے مرتبہ تک پہنچا تھا۔ میرا گادول مجھے حقیر اور بے معنی لگا۔ اُس کی نہ کوئی تاریخی اہمیت تھی اور نہ تہذیبی۔ کیا فضول سا نام تھا! ڈیڈیانہ کلاں۔ اس کے لغوی معانی ہیں، مینڈک کی سی اونچی آواز میں ٹرانے والا۔ ہریانہ کے باسی اس نام کا ٹھٹھا اڑاتے تھے۔ ڈیڈیانہ، ڈڈو کھانا، ڈڈو کھا کے مگر جانا۔ ڈیڈیانہ کے لوگ مینڈک کھا کر گزر بسر کرتے ہیں لیکن مگر تے ہیں۔

دلی تو دلی تھی، اُس کے گرد و نواح تک تاریخ ساز اور داستان خیز تھے۔ پانی پت کا میدان اپنی پیاس ہی خون سے بجھاتا آیا تھا۔ اُن لڑائیوں کا چرچا کرتے ہوئے دھرم چند کہتے تھے، پانی پت کے میدان کی مٹی، لہو کی طرح لال ہے۔“ میں اُس خوں خوار میدان کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو گیا جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

میں اُس وقت اُنبال میں تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ مجھے نہالا تجربہ ہوا۔ میری ٹرین کھڑی تھی لیکن مجھے چلتی لگی۔ یہ طلسم اُس دقت ٹوٹا جب ساتھ والے پلیٹ فارم پر سے ٹرین گزر گئی۔ نیوٹن کے لائف ریلیٹیو مشن ایفکٹ کا عملی ثبوت کس قدر حیران کن تھا۔ ایک آدمی، جس نے نیلی وردی پہن رکھی تھی، کے ہاتھ میں لمبے دستے والی ہتھوڑی تھی۔ وہ اُسے ٹرین کے ہر پہیے پر مارتا، آواز سُنا اور اگلے پہیے کی جانب بڑھ جاتا۔

”آپ یہ کیا کرتے ہیں؟“ میں نے ٹرین سے نیچے اتر کر اُس سے پوچھا۔  
 ”پہیے چک کر رہا ہوں“ اُس نے پہیے پر ہتھوڑی مار کر کہا۔ ”پہیے کی آواز کسی قدر باریک آواز دیر پا تھی۔“  
 ”پہیے میں کیا چک کر رہے ہیں؟“

وہ پہیے چک کر تاجا جا رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا جیسے جلدی میں ہو۔ میں نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے وضاحت چاہی۔

”میں چک کر رہا ہوں مبادا کسی پہیے میں بال اُگیا ہو۔“

اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجائی۔ میں اپنے ڈبے کی طرف بھاگا، اپنی جگہ بیٹھا ہی تھا کہ ٹرین ریگنٹ لگی۔ میں اُس کاریگر کے بیان پر غور کرنے لگا، وہ بال آئے پہیے کو دوسرے سے کیسے جدا کرتا ہوگا؟ اچانک ہریانہ کے گنگو کمہار کے آوے کا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ آدے سے بھانڈا نکال کر اُسے ٹٹکارتا تھا آدھ کس یقین سے بُرے کو اچھے سے الگ رکھ دیتا تھا۔ میرے کتنے تجربے دھرم چند کے بیان سے زیادہ عجیب اور سچے تھے۔ جیسے جیسے ٹرین دلی کی طرف بڑھتی گئی، میرے ذہن میں پانی پت اُبھرنے لگا اور ہولے ہولے میرا خروش بننے لگا۔ میری نیند اڑ گئی تھی۔ میں سفر کی تکان کے باوجود رُودتا زہ محسوس کر رہا تھا۔ جس سیشن پر ٹرین رکتی، میں اُس کی تختی پڑھنے کی کوشش کرتا، نہ پڑھ سکتا تو پلیٹ فارم پر گھومتے پھرتے کسی فرد سے اُس کا نام پوچھتا۔ کرنال کے بعد کوروشیترا آتا تھا اور پھر پانی پت۔ جیسا اُس کے بارے میں کہتے تھے اُسی طرح کوروشیترا کے بارے میں۔ شرون کمار کی کہانی سنا تے ہوئے، ماں زور دے کر کہتی تھی، ”کوروشیترا کی دھرتی اتنی نرم و میو ہے کہ اُس کے زیر اثر شرون جیسا سبوت اپنا فرض بھول گیا تھا اور اپنے اندھے ماں باپ کو جنگل میں بھوکا پیاسا مرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔“

شرون کمار اور مہا بھارت کی کہانی سُن کر میں سوچتا تھا، کوروشیترا کی دھرتی کیسی دھرتی ہے جو انسانوں میں درندوں جیسا جذبہ اُبھارتی ہے اور انھیں لڑنے مرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لیکن ایک بار مجھے ذاتی تجربہ ہوا، جس کی سچائی کُلی ہے۔ میری ماں کو بھائیاجی نے بُری طرح مارا پیٹا۔ اُس کا دکھ باٹنے کے لئے میں نے

جھلکتے ہوئے جذبات سے اُس سے کہا، ”ماں، تو کو روکشیتر کی دھرتی کو زرموہی اور دُربھاگی کہتی ہے لیکن اُس سے کہیں زیادہ زرموہی اور دُربھاگی ہمارے گھر کی دھرتی ہے!“

”تو ٹھیک کہتا ہے، بیٹا! اُس نے بے ساختہ کہا جیسے میرے خیال سے اُس میں نیا احساس جاگ پڑا ہو۔“

بھائی جی کی بربریت سے متاثر ہو کر تایا جی کہتے، ”عدم رواداری ایسی آگ ہے جس کا ایندھن انسان ہیں۔ اس آگ کا پُراسرار اختلاط! مبتدی لاس میں خود جلتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے کو جلاتا ہے۔“

پانی پت آیا اور میں نے رات کے دُھندلکے میں کھڑکی کے باہر غور سے دیکھا۔ دھرتی کا لال چہرہ کہیں نظر نہ آیا لیکن زخمی اور کُھلاتی رُخوں کے سایے سے دکھائی دیے۔ اُن کے ہجوم کے ہجوم مجھ پر پکنتے لیکن ٹرین کی تیزی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے۔ اُس بھیاںک منظر سے گھر اگر میں نے کھڑکی بند کر لی۔ میں ڈرنے لگا، اپنے آپ سے، مستقبل سے۔ میں زندگی کے موافق و ناموافق پہلوؤں پر غور کرتا ہوا محو سفر تھا۔ ڈبے میں کھسپا ہونے لگی اور ہوتے ہوتے دلی آئی، دلی آئی کے شور میں بدل گئی۔ جو جاگ رہے تھے وہ اپنے سوتے ہوئے ساتھیوں کو جگانے لگے اور جین کا کوئی ساتھی نہ تھا وہ شور سُن کر اپنے آپ اٹھنے لگے۔ ہر کوئی سامان سنبھالنے لگا اور باہر جھانکنے لگا۔ میں بھی ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ اُف! میں نے کھڑکی کھولتا نہ باہر دیکھتا اور نہ میرے خیالوں کا جاؤ ڈٹوٹا! دُھواں اُگلتی ٹیکڑیاں، مکاؤں پر چڑھے مکان، انسان اُگلتی گلیاں، ریلوے لائن کے ساتھ بیٹھے ٹپتی کرتے عوام، سنگے ستروں کو دیکھتی للچائی نظریں، گھٹی گھٹی فضا، میدانوں اور سبزہ زاروں کا نشان تک نہیں تھا۔ ٹھنڈے سبیلے رنگ، اوس لد کھیت، چمچہاتے پرندے ٹھیلیں کرتے مویشی، جو میری سحر کی سحر خوشی اور سترستی ہوتے تھے۔ میلوں پیچھے رہ گئے تھے۔ میں نے پہلی بار خود کو اکیلا محسوس کیا اور گھبرا کر اندر مڑنے موڑا لیکن دلی کی بد صورتی اور گھناؤنی تصویر میری آنکھوں سے چپک گئی۔ میں آنکھیں موند کر اپنے بچھرے خوابوں کو سمیٹنے اور سنوارنے لگا۔ اتنے میں دلی آگئی اور ہر کوئی ٹرین میں سے بھاگنے کے سے انداز میں اُترنے لگا جیسے وہاں مزید بیٹھنے والے کو جان کا خطرہ لاحق تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اُترا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ریل کے ڈبے سے زیادہ بھیڑ تھی۔



## باب ۴۲

پہلے کانڈھوں پہ صلیبوں کو اٹھا لویارو  
پھر جہاں چاہو پھرو اہل تمنا بن کر (شاطر)

ریگڑھ پورہ کے لئے سالم تانگا مہنگا پڑتا تھا۔ میں نے دوسری تین سواریوں کے ساتھ تانگا سانچے کرایے پر لیا۔ تانگے والے نے مجھے بڑی سُرک پر آنا دیا۔ میں سامان سر پر اٹھائے لاجھ سنگھ کے گھر پہنچا۔ وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے لگا کہ میری ساری مشکلوں کا حل نکل آیا ہے۔ میں سامان سر سے اُتار کر اُس کے پاؤں پڑا۔ میں مہک رہا تھا۔ میں اُس کے قریب تر کھڑا ہو گیا کیوں کہ میرا تجربہ تھا کہ جب میں اُس کے پاؤں پڑتا تھا، وہ مجھے باہوں میں لے کر بیاہ کرتا تھا۔ وہ انجان آدم بے حرکت کھڑا رہا۔ مجھے بُرا لگا اور میرا ایک طرف تپاک ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں اُسے شرمندہ سا دیکھنے لگا۔

”اوہ تو!“ اُس نے آہ بھرنے کے سے انداز میں پوچھا۔

”جی ہاں، میں گیان!“ حالان کہ میں رنجیدہ تھا، میں یک بیک کھل اٹھا اور بات میں ہنسنے ہنسانے کا انداز پیدا کیا۔

وہ نہ ہنسا، نہ مسکرایا، نہ ہی بولا، نہ ہی ایسا اشارہ کیا جس سے اُس کی اندونی حالت کا اندازہ ہوتا۔ میں نے اپنی ضرورت کے لحاظ سے اُس کے جو معنی سمجھے وہ خلاف ضرورت تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر دل میں بھی خوش نہ ہوا تھا۔ وہ آنکھیں، دل کی جھلی ضرور کھاتیں۔ اُس کی آنکھیں گھنی جھاڑی میں سے جھانکتی پلّی کی سی تھیں۔ سر کے بال چہرے کو آبروؤں تک ڈھانکنے ہوئے تھے اور پلکوں کے نیچے داڑھی۔ اُس کی آواز کے سوا اُس سے بات کرنے کا دوسرا ذریعہ آنکھیں تھیں۔ میں نے ان آنکھوں کو مسکراتے دیکھا تھا، باتیں کرتے سنا تھا۔ انھیں بالکل خاموش دیکھ کر میری گرم جوشی ٹھنڈی پڑ گئی۔ مجھے گھر کی چابی تھا کہ وہ ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اُس کی آنکھیں پلکوں کے بیچ سٹی رہیں جیسے جمی ہوئی ہوں۔

گاؤں کی کھلی دھوا سے نکل کر مجھے جالندھر ہی میں گھٹن لگ رہی تھی، ریگڑھ پورہ میں پوری گھٹن تھی اور اُس میں سے جتنس لپک رہا تھا۔ میرا منہ بھنگا اور دم اُلٹنے لگا۔ میری حس لطیف دم توڑنے لگی۔ میں نے ناک داب لی اور میں منہ سے دم لینے لگا گویا سانس گینے لگا۔

لاہر سنگھ کا گھر کیا تھا، چھوٹا سا بے روشندان، سرے کچھ اونچا دکھانا تھا۔ کولتار کے خالی ڈرم چادروں میں پیٹ کر چھت پر ڈالے ہوئے تھے جن کو سنبھالنے کے لئے اُن پر بھاری پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ٹیڑھے میٹر بھرے برگے کڑیوں اور بالوں کا کام دے رہے تھے۔ چادروں میں چھید تھے۔ وہاں سے کولتار پگھل کر گرتی تھی اور فرش پر کھڑنڈوں کی طرح جم جاتی تھی۔ کولتار کے جو تار لٹکتے تھے وہ چیلے کالے ناگوں کی طرح چمکتے تھے۔ دیوار سے ٹوٹی جھڑی ہوئی تھی جو اُس کے پیروں میں تہ در تہ جمی ہوئی تھی۔ دھوئیں میں لٹھڑے ہوئے مکڑی کے جالے، جٹاؤں کے سے تھے۔ ایک کونے میں کڑی اور پھٹی کا ڈھیر تھا، دوسرے میں آواروں کی پیٹی، تیسرے میں چولہا، ٹوکرا، چند برتن اور جو تھے میں دروازہ تھا جو اندر کو کھلتا تھا۔ کواڑ کی زنجیر نیچے تھی جسے کھول کر لٹکانے کے لئے تختے میں کانٹا لگایا ہوا تھا۔ دروازہ کھولتے اور بند کرتے ہوئے چوکھٹ ہلتی اور دیوار سے مٹی گرتی۔ چوکھٹ کو مضبوط رکھنے کے لئے باہیوں اور دیوار کے بیچ فائل مارے ہوئے تھے۔ چوکھٹ کا جھکاؤ باہر کی طرف تھا۔ کواڑ باہر سے اندر دھکیلنے سے کھلتے تھے اور انہیں کھلا رکھنے کے لئے روک لگانے پڑتے تھے۔ دروازوں کا رنگ اندر سے کالا اور باہر سے خارش زدہ کئے کا سا تھا۔ گھر کا سارا فرنیچر لے دے کر مونج کے بان کا ایک بھلنگا تھا جو پردیوں پر رکھا تھا تاکہ اُس کے نیچے ٹنک ساسکے۔ بھلنگے کے پائینی کی طرف بے ترتیب گول کیا ہوا بستر رکھا تھا۔ کالے ہرے رنگ کی توشک کے بگڑے ٹوٹے ہوئے تھے اور روتی سرکنے سے گھٹھل صاف دکھائی دیتے تھے۔ ٹوٹے ہوئے بان کے کچھ ہرے نیچے لٹکتے تھے۔ وہیں ڈالڈے کا چپا چنگبرا، رنگ لگا ڈبہ پڑا تھا اور اُس کے قریب دروازے کی جانب بھاڑو جو دراصل سفیدی کی پُرانی کوچی تھی۔ سامنے کی دیوار میں سورخ تھا جس میں سے سورج کی روشنی اُبل لاٹھ سی اندر گھس رہی تھی۔ اُس میں کروڑوں درے ایسے اڑتے تھے جیسے گھٹن گھیری میں پھنسے ہوں۔ سامنے اور پیچھے کی دیوار کے ساتھ اُلگنی بندھی تھی جس پر تازہ دھلا کاچھا، بنیان اور صاف ٹلکتا تھا۔ اُن کپڑوں کا رنگ دیواروں سے ملت تھا جن کی سفیدی، سیاہی کے نیچے سے جھانکتی تھی۔ اُلگنی کی اونچائی اتنی نیچی تھی کہ دائیں سے بائیں جاتے ہوئے سر جھکا کر نظر پڑتا تھا۔ سامنے کی دیوار کے دائیں کونے میں اُن گھڑت شلف تھی جس پر چند آدھی بھری اور خالی شیشیاں رکھی تھیں۔ اُن کی حالت چھت سے زیادہ خراب تھی۔ چھت کی غلاطت دھوئیں کی سیاہی سے ڈھکی ہوئی تھی اور شیشیوں کی غلاطت شیشے کے پس منظر سے چمکتی تھی۔ اُن پر اُنگلیوں کے نشان، آٹو لگتے تھے۔ کمرے کے درمیان آٹے کا نستر تھا، جس کی کٹڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ لوہے کے چولہے کے پیچھے توا پڑا تھا اور سامنے میلی کچیلی لون دانی، اُسی طرح کی پرلٹ اور اُس سے بُری جنگیری۔ چھت کی درمیان کڑی سے بجلی کا بلب باندھا ہوا تھا اور سچے سے تار اور تار سے بلب تک میلا ٹپکتا تھا۔ سینٹ کے فرش

پر راتے بنے ہوئے تھے۔ کچھ جھوٹا موٹا سامان اور بھی تھا۔ چپلیں تھیں، جن کی گھسی ہوئی ایڑیوں پر چوکنے بچھوں کا گمان ہوتا تھا۔ موزے، ایڑیوں اور پنجوں پر پھٹے ہوئے تھے اور بھبھکتے تھے۔

قارئین! تہذیب و تمدن کی بنیاد و سلمہ اصولوں پر رکھی گئی ہے اور انسان نے ہر عمل، ہر شے ہر فعل۔۔۔ کا معیار مقرر کیا ہے۔ اُس لحاظ سے اُس گھر میں کوئی شے اپنے معنی میں پوری اُترتی تھی تو وہ گندگی تھی۔ مجھے اپنی ماں کی یاد آئی جو کوڑے کی بالٹی کو برتن کی طرح صاف کرتی تھی۔

میں کھڑکھڑا تھکتا تو چار پائی پر بیٹھ جاتا، بیٹھا بیٹھا اُکتاتا تو دروازے میں جا کھڑا ہوتا۔ اُٹھتے بیٹھتے اور بیٹھتے اُٹھتے چولیس بولتیں گویا احتجاج کرتیں۔ اُس گندی فضا اور گھنڈائی ہوا سے مجھے متلی ہوتی تھی۔ میں اپنی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں جس شے کو دیکھتا، میرے ماضی کی بدنامی اور کڑواہٹ کی پرچھائیں لگتی۔ میں سوچنے لگا کہ میری تقدیر یہی ہے تو مجھے خود کشی کر لینی چاہیے۔ اُس گھر کا محل وقوع کیا بیان کروں؟ گھر سے باہر سڑک اور سڑک سے باہر گھر تھا۔

گاؤں کی لہکتی اور مہکتی فضا سے نکل کر میں دلی میں اُس چار دیواری میں منتقل ہو گیا جس سے ہمارا طویل اَصاف ستھرا اور صحت افزا تھا۔ ٹینوں کی گرمی، کھالوں کی سڑاند، جذبات کی پستی۔۔۔۔۔ اُن سب سے بالاتر غیر واضح مستقبل! میری حالت اُس طائرِ نوپر کی سی تھی جو گھونسلے سے اُڑتے ہی طوفانِ بادِ باراں میں گھر جائے اور پر تڑوا بیٹھے۔ میرا میزبان کام سے تب لوٹا جب میری بھوک کی آگ پیٹ سے بڑھ کر نسوں اور سانسوں تک پھیل گئی۔ زاو راہ سے بچے کچھ پراٹھے میں نے دوپہر سے پہلے ہی کھالے تھے۔ بھوک وہ بدکار ذات ہے جو بیکاری اور غربی میں زیادہ مز زور ہوتی ہے۔ میں اور برداشت نہ کر سکا، میں نے بچی سی لے کر کہا، ”جی جاجی! مجھے بھوک لگی ہے۔“

میرا یہ ایک جملہ اُن ہزاروں جملوں کا خلاصہ تھا جنہیں میں خود سے کئی بار دہراچکا تھا۔ وہ خاموش اور بے حرکت رہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔ میں اُلجھن میں تھا کہ اپنی بات دہراؤں کہ چپ رہوں، اُس کی مونچھوں نے آنکھوں کی زبانی کہا، ”وہاں ایک ہوٹل ہے۔“ اُس کے ساتھ ہی اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اپنی بات کو پوری طرح واضح کر دیا۔ میں نے ادھر دیکھ کر جلدی سے اُس کی طرف دیکھا۔ میری جلد بازی کا مقصد یہ تھا کہ اُس کی بات پورے طور پر سمجھنے کے لئے اُس کی طرف دیکھنا لازم تھا۔ مونچھوں کے ساتھ ڈاڑھی بھی ہل رہی تھی، آواز پہلے سے صاف تھی جیسے اُس کی رُوح نے جسم کی تمام ذلیل قوتوں سے ساز باز کر کے الفاظ کی صورت نمایاں ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ میرا قیاس دُورست تھا۔

”وہاں دوئی کی روٹی اور دال مُفت ملتی ہے آ۔۔۔۔“ وہ بولتے بولتے رُک گیا جیسے اِن چند لفظوں

نے اُس کی ساری طاقت چھین لی تھی۔ وہ بڑھال سا اٹھا اور کمزور سا بولا، ”چل، تجھے دکھا آتا ہوں“ پھر وہ ایسے چُپ ہو گیا جیسے اُتم زدہ لمحات میں ہوتا ہے۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا اور اُن یادوں میں کھو گیا جو براہِ راست اُس سے منسوب تھیں۔ وہ ہمارے گھر میں مہمان ہوا ہے۔ میں بھاگ کر اُس کے قدم لیتا ہوں، پاؤں جھوتا ہوں اور راہ نمائی کے سے انداز میں ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ بیٹھک میں قدم رکھے، میں دودڑکراں کو خبر کرتا ہوں۔ وہ ہنستی پیشانی سے اُس کی بلاتیں لیتی ہے اور صندوق میں سے اُن لگ بستر نکالتی ہے۔ نئے کپڑوں کی غاصر خوشبو دل و دماغ کو مسح کرتی ہے۔ میں ماں کے سلیقے کی داد دیتا ہوں۔ پلنگ پر بستر بچاتا ہوں اور چادر چادروں کو نوں سے باری باری پکڑ کر کھینچتا ہوں اور پھر ہاتھ پھیر کر سلوٹیں نکالتا ہوں۔ ماں خوشی سے دکتی ہے جیسے لالچہ گھگھکا کا اُمبارک فال ہو۔ اُس کے آدرشمان میں ایک میلان ہے جس کا احساس اُسے دیکھنے سے ہوتا ہے۔ تاکہ وہ حسبِ خواہش آرام سے بیٹھ سکے، لیٹ سکے، ماں اُسے گاڈ ٹیکے کے ساتھ سرانا بھی دیتی ہے۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ کر سب کی تحریریت و عافیت پوچھتی ہے اور کہتی ہے، بیٹا، کبھی کبھار اپنی خیریت کا خط لکھتے رہا کرو، دل تیری طرف لگا رہتا ہے۔ رشتوں کی فسوں کاری! اُس کی بھاری بھدی اور چرچری آواز مجھے سرری لگتی ہے۔ ناک سے جوہے نکالنا، بال اکھاڑنا اور ٹٹے چھلکانا اُس کی بے ہودہ اور بے شرم عادت ہے جسے میں غلیظ نہیں سمجھتا ہوں۔ وہ جھگ جاتے کے لئے تیار ہے، میں پانی کا گڑو لئے کھڑا ہوں۔ عین ذاتی نوکر کی طرح کہیں مناسب جگہ دیکھ کر میں گڑا رکھتا ہوں اور دود جاکھڑا ہوتا ہوں، اُس کے اٹھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ وہ ہاتھ دھو کر گڑا دہیں رہنے دیتا ہے۔ میں گندگی سے آنکھیں بچاتا، کراہت سے لڑتا گڑوا اٹھاتا ہوں، مانجتا ہوں اور گھر لوٹ کر اُس کے نہانے کا انتظام کرتا ہوں۔ وہ ناک میں پانی چڑھا چڑھا کر ناک نہکتا ہے، غُزغُز کے غُزارے کرتا ہے، جسے دیکھنے سے تے آتی ہے۔ وہ نہاتا ہے اور گیلا کا جھادہیں رہنے دیتا ہے۔ کچھ میں تندیل (وہ نیل جو صھاگے کے اندرونی حصے تک پہنچ چکی ہو) پڑی ہوئی ہے۔ میں اُسے صابن لگا کر تھاپلی سے کوٹتا ہوں، نیل لگاتا ہوں۔ تاکہ نیل اکسار لگے، اُسے دبا کر نچوڑتا ہوں، جھٹکتا ہوں، دھوپ میں بھیلاتا ہوں لیکن کوئی خاص فرق نہیں دیکھتا ہوں۔ ماں کھانا پڑوتی ہے۔ وہ دال اور سبزی کی کٹوریوں کے ساتھ نرے گھی کی کٹوری بھی رکھتی ہے۔ لالچہ سنگھ کھانا کھاتا ہے اور میں اُسے بچھا بھلتا ہوں۔ وہ بگھاری ہوئی دال اور سبزی میں زرا گھی ڈالتا ہے اور چھڑی ہوئی روٹی کو دوبارہ چھڑتا ہے۔ اس کے باوجود گھی بچ رہتا ہے جسے وہ پنڈلیوں اور داڑھی پر مل لیتا ہے۔ وہ تھالی میں ہاتھ دھونے لگتا ہے، میں اُسے چلیجی کی جانب راغب کرتا ہوں۔ وہ میری بات پر دھیان نہیں دیتا، تھالی ہی میں ہاتھ دھو تا ہے اور کٹی بھی کرتا ہے۔ اُس کی مونچھیں، داڑھی میں ٹپک رہی ہیں۔ وہ آنکھیں ہاتھ مار مار کر صاف کرتا ہے اور چھینٹے اڑاتا ہے۔ میں اُس کے سامنے کھڑا ہوں، ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔ وہ بستر پر لیٹتا ہے اور میں اُس

کی مانگیں بباتا ہوں۔ وہ غنودگی کے عالم میں کہتا ہے، ”تو میٹرک پاس کر کے دلی آجانا۔ میرا بڑا صاحب، انگریز ہے اور میرا دوست ہے۔ میں تجھے انڈین انجینئر رکھوا دوں گا۔“

وہ تقریباً سو رہا ہے۔ ماں دودھ کا گلاس رومال میں لپیٹ کر لائی ہے اور اُسے اپنی میٹھی آواز میں پکارتی ہے، ”لا بھریاں! سو گئے کیا؟“

”نہیں ماما جی!“

وہ ہڑا کر اٹھتا ہے، اُس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیتا ہے اور گرم دودھ، سڑپے مارتا ہوا پیتا ہے۔ بھاری بھدی اور اٹپ سڑپ آواز سن کر ٹائیگر اپنے اگلے پیروں پر سے سر اٹھاتا ہے اور اُسے بھونکتا ہے۔ یس اُسے ڈانٹتا ہوں اور چپ کرواتا ہوں۔ لا بھ سنگھ دودھ پی کر گلاس مجھے تھماتا ہے، ہونچیں ہونٹوں میں دبا دبا کر اُن میں پھنسی ہوئی ملائی چوست ہے، مونچھوں پر چھونکیں مارتا ہے اور اُنھیں ہلا ہلا کر پھوک اٹھاتا ہے۔ ماں گلاس لینے کے لئے آتی ہے، وہ اُس سے کہتا ہے، ”ماما جی، رومال بہت اچھا ہے! لگتا ہے، آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے!“

ہاں بیٹا! تجھے پسند ہے تو رکھ لے۔ ماں اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے اور گلاس لے کر چلی جاتی ہے۔

اُس دلدری کے گھناؤنے طور طریقے اور بھنکتی صورت مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اُس کی باتیں میرے مستقبل کی ضمانت ہیں۔

”وہ سامنے ہوٹل ہے۔ تو کھانا کھالے، میں آتا ہوں۔“ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا۔

میں چونک پڑا۔

لکڑی کے پرانے تختوں کی ہڈ جھڑاؤٹ کا نام ہوٹل تاج محل تھا۔ رسولی سامنے اور کھانا پروسنے کا انتظام پیچھے تھا۔ باہر پھوان کی خوشبُود اور اندر میل کی بدبو تھی۔ کچا گیلافرش، ڈھیلا ڈھیلا ذہینچر، چب کھڑتے بھانڈے، ادھ ننگے میرے، ایک کراہت در کراہت تھی جو کھانا سامنے آنے پر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے نغمہ توڑ کر منہ میں ڈالا ہی تھا کہ ایک منڈے نے پانی کے گلاس تھپ سے میز پر پٹخا۔ اُن میں سے پانی کے قطرے اڑے، کچھ میز پر گرے اور کچھ میری تھالی میں۔ وہ پانچ انگلیوں میں چار گلاس اٹھا کر لایا تھا۔ اُس نے گلاسوں میں سے انگلیاں نکالیں، ناخنوں سے غلاظت ٹپک رہی تھی۔

میری جگہ کو آہوتا تو اُس گندگی کو دیکھ کر خوشی سے پھدکتا۔ لیکن میں اُس گندگی سے گھبرا گیا، قسے خیز کیفیت پر قابو پا کر اُسے کھایا اور باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ میرا میزبان میرے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کی گھناؤنی

ہمیت، مجھ پر اس قدر مسلط تھی کہ میں جس چیز کو دیکھتا تھا اُسی کا غلیظ سایہ نظر آتا تھا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب اُس نے مجھ سے میرے دلی آنے کا سبب پوچھا۔ میرے پاس گزیدہ دل میں اُمید کی کرن پھوٹ پڑی جو ابھی تک نہ جانے کہاں گھٹی پڑی تھی اور مجھے بوکھلائے ہوئے تھی۔ میں نے خوشی سے جھگڑا کر اُسے اپنے میٹرک پاس کرنے کی خبر سنائی اور ساتھ ہی اُسے اُس کا وعدہ یاد دلایا۔

اے پاگل لڑکے! آنے سے پہلے خط لکھ کر پوچھ لیتے۔ جس انگریز صاحب سے میری دوستی تھی، وہ ریٹائر ہو گیا ہے اور جو نیا آیا ہے، ہندوستانی ہے۔ بڑا اکڑفوں ہے، حرامی! میرا صاحب ہوتا، میں تجھے سویرے کام پر لگا دیتا، اب مشکل ہے۔ وہ جلدی جلدی بولا کرتا تھا اور کئی بار اُس کی بات کا مطلب مجھ میں نہ آتا تھا۔ اُس نے جو کہا، ایسے نپے تلے لہجے میں کہا کہ وہ ہر لفظ کو دہراتا جان پڑا۔

”کسی دوسرے کام کا انتظام کر دیجئے؟ میں نے التماس کرنے کے سے انداز میں کہا۔“

”مشکل بات ہے! دیکھو لگا، وعدہ نہیں کرتا۔“ اُس نے انکار نما اقرار کیا۔

”ایسی بات ہے تو میرا گزارہ کیسے ہوگا؟“ میں نے درپردہ اپنی مالی حالت کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے ساتھ رہنا ہے تو آدھا کرایہ دینا ہوگا اور اپنا دوسرا خرچ اٹھانا ہوگا۔“

اُس نے میری بات کو نظر انداز کر دیا اور گھر واپس آتے ہوئے مجھے صابن اور تیل خریدنے کو کہا۔

اُس کے اُس بے درد رویے کی وجہ حیرت انگیز ہے! میں اُس کے ساتھ رہنے کا قصد نہ کرتا تو اس کا انکشاف ناممکن ہوتا۔ وہ اس قدر صفائی پسند تھا کہ کسی دوسرے کا استعمال کیا ہوا صابن اور تیل وغیرہ استعمال نہ کر سکتا تھا۔

وہ سامان خرید کر میری جیب میں جو بچاؤ بھان تھا۔ اُس کی کمینی بات سے مجھے گھن ہوئی، ایسی گھن جو آنکھوں کے سامنے پڑی گندگی سے ہوتی ہے۔ ہم جس راستے سے گھر لوٹے وہ پہلے سے لمبا اور اندھیرا تھا۔ اُس

نے کمرے کے باہر چارپائی پر اور میں نے نیچے سڑک پر بستر اچھایا۔ سونے سے پہلے اُس نے کپڑے اُتارے، میں نے پہلی بار ان میں چھپی ہوئی ڈراونی شکل دیکھی۔ تھیلیوں اور تلوں کو چھوڑ کر اُس کے بدن پر چنڈال بالوں جیسے

بال تھے۔ ایڑیاں ٹوکھے ہوئے جو ہر کی طرح شق تھیں۔ ناخنوں کے نیچے کا ماس ناخنوں سے بڑھا ہوا تھا، جس پر ناخن چیتھڑوں پر چیتھڑوں کے پیوند لگے تھے۔ وہ شخص، انسان نہیں! غم روزگار کا سدھایا ہوا بھمورا تھا۔

اجنبی فضا، بھٹکتا ذہن، سنگتی نفرت، میں لوہار کی بھٹی میں اُس لوہے کی طرح تھا جو تھوڑے

کی چوٹوں اور اپنی آخری شکل سے بے خبر ہو۔

وہ رات ماحول ہی کی طرح سنگین تھی۔ مریضانہ اندیشے مجھے رات بھر بھنجوڑتے رہے۔ میں سویرے

بیدار ہوا تو میرے بدن پر پتھروں کے گہرے نشان تھے۔ دلی نے میرا جیسا خیر مقدم کیا تھا، سنگ انداز، سنگ

کئے جانے والے کا کرتا ہے۔ میں نے چاہا کہ گھر کے کام کاج میں لایچہ سنگھ کا ہاتھ بٹاؤں لیکن میں اُس اثر کو توڑ نہ سکا جو اُس کی بے رخی سے مجھ پر جاری ہو گیا تھا۔ وہ کام پر چلا گیا، میں نے اُس پر نو گھر کا جائزہ لیا، ہر چیز میرا منہ چڑھاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اکثر جھگڑتا تھا، ”میرا گھر، اجمل خان روڈ سے پانچ منٹ کی مسافت پر ہے۔ ہمارے علاقے کے ترکھان ٹاپروں اور بارکوں میں رہتے ہیں۔ میں ڈیوٹی کرتا ہوں اور وہ دہاڑی۔“

اجمل خان روڈ کا ٹھاٹھ بٹ مشہور ہے، اُس کا ریگڑھ پورے سے کیا رشتہ بنتا ہے؟ وہی جو خوبصورت مکان کا بدروسے۔ میں نے اپنی بے چارگی میں اُس غریبی کی بے کسی کا اندازہ کیا جو دوسرے ترکھانوں کی زندگی تھی۔ میری مروح کا نپ گئی۔ اُس نفسیاتی صدمے کا اثر! میں نے اُس گھر کو دوبارہ دیکھا، وہ مجھے برانہ لگا۔ فطرت کا بلاوا آیا۔ میں ڈبے میں پانی لے کر بیت الخلا گیا۔ وہاں دوسری بدبو اور حاجت مندوں کی دھیری قطار تھی۔ انھوں نے اپنے سر کیڑوں میں ایسے پلیٹ رکھے تھے جیسے ریگستان کے سفر پر آمادہ ہوں۔ قطار میں بڈک کی طرح بھدک کر آگے بڑھتی اور رُک جاتی۔ ڈبے کے پیندے میں چھید تھا، اُس کے اندر پانی گھٹنے لگا اور میرے اندر دباؤ بڑھنے۔ میری باری تھی کہ آہی نہیں رہی تھی۔ میری بے قراری کا چشتکار! بدبو ناؤد ہو گئی مجھے اُن کاہلوں پر غصہ آجا جو اہل اندر آرام سے بیٹھے تھے۔ مجھ سے اگلا آدمی میری ہی طرح مضطرب تھا۔ وہ آنکھیں بھیجتا تھا گھٹی گھٹی آواز میں کہتا، ”حرام زادے! اندر توں بیٹھے ہیں جیسے آرام گاہ میں۔“ میری نظروں کے سامنے دھند چھانے لگی اور کانوں میں ساں ساں کی آواز آنے لگی۔ میرا جسم ناکارہ پڑنے لگا اور ڈبا ہاتھ سے پھسلنے لگا۔ میں بار بار گرفت مضبوط کرتا اور اُسے سنبھالتا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ سامنے والی پر بیٹھ جاؤں لیکن حوصلہ نہ پڑا۔ میری باری آنے تک میری سُدھ بُدھ جانے کے قریب تھی۔ بے چینی اتہار پر پہنچ کر کچکپی بن گئی تھی اور انگلیاں ناڑے سے الجھ رہی تھیں۔ میں پیروں پر ڈھکے پڑنے کے سے انداز میں بیٹھا۔ جوں ہی میرا بوجھ ہلکا ہوا، میرا مدہ احساس زندہ ہو گیا۔ وہ سکروہ جگہ واقعی آرام گاہ تھی۔ میں شہر میں نہ آتا تو اس دودھالے تجربے سے محروم رہتا۔ مجھے ڈبے کی ضرورت پڑی، اُس میں دو چلو سے زیادہ پانی نہ تھا۔ میں نے جیسے اپنی کندگی دھوئی اُس سے گتہ گھسنی اچھی تھی۔ کراہت سے میرے گلے میں پھانس پڑ گئی۔ مجھے اُن حالات سے پہلے ہی نفرت تھی، اب خود سے بھی نفرت ہو گئی۔ میں اس صورت حال سے کئی بار گزرتا تھا، اپنی بزدلی کے لمحوں میں بے کسی کے لمحوں میں، ناامیدی کے لمحوں میں، ناکامی کے لمحوں میں۔ میں اپنی نفرت کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھ پر ظاہر ہوا کہ میری نفرت میری بددستی ہے۔ جوں کہ میری بددستی مسلسل تھی اس لئے میری تعمیر میں اس کا حصہ خوبی سے زیادہ تھا۔

میری ہی تعمیر میں کیوں؟ یہ ہر کسی کی تعمیر میں سرگرم ہے۔ زندگی کا اہم اور بنیادی جزو ہے اس

لئے آدمی اسے فنا کرنے سے قاصر ہے۔ اسی کے بل بوتے پر آدمی نے اپنی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی اور اپنے یکے، یکتے آفاقی انداز دکھائے۔ ایک انداز، اندازِ محبت ہے جو اس نے اپنی ریا کاری سے ساریا کر کے روحانیت کے پردے میں دکھایا اور اُس کی آڑ میں تمام حقیقت شناس جبلتوں کا صفایا کر دیا۔

یہ تھی میرے خوابوں کے شہر، میری آنے والی ملاقات، گندگی میں کیڑوں کی طرح ریختے ہوئے انسان، بارودِ گار سے دبے ہوئے انسان، احتیاج کے توڑے مروڑے انسان، اپنی کم مائیگی سے وحشت زدہ انسان، جن کا مقصود حیات ایک ہی تھا، خود کو زندہ رکھنا۔ اُن کی زندگی کے دو مفہوم تھے، روٹی اور کام۔ گندگی میں رہتے رہتے اُن کا احساس اس قدر پس چکا تھا کہ وہ اپنی کم اصلی کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ وہ انسان اشیائے ضرورت کے گڑھے تھے جو اپنی تاریکی اور خسوگی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ رنگین خواب صاف ساہ کپڑوں میں بٹے جاسکتے ہیں، امید افزا جذبات تازہ کھلی فضا میں پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن موسے فاقوں، اکودہ دلوں اور بیمار رُوحوں کے ساتھ آزاری، کم ہمتی اور نفی پلتی ہے۔ آدمی نظمِ حیات کا حصہ ہو کر بھی اس سے الگ ہے۔ کیوں کہ یہی ایک ایسا جانِ واس ہے جو اپنی نسل کے علاوہ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی اُچ میں ہر شے اپنے خلقی کمال کو پہنچتی ہے اور وہی اُس کی زندگی کا جمال ہے۔ چوں کہ آدمی کی زندگی کی خوبی تحریکِ تخلیق سے عبارت ہے اس لئے جس کے تخلیقی رجحان کا نشوونما لاچار ہے اُس کی زندگی، نایک رہے۔ ایسے فرد کو انسان کہنا غلطی تو ہے، جرم بھی ہے۔

قانونِ فطرت ہے کہ گندگی کا کیڑا گندگی سے نکال کر پھول پر رکھ دیا جائے تو وہ اُس کی حیات آفریں لطافت میں مخراتا ہے، پھول کا رَس پینے والے بھونرے کامرگ آسا گندگی میں کیا حال ہوگا؟ اس طرح حقیقتِ آدم ہے! اچانک تغیر سے انسان مستفید نہیں ہو سکتا، یہ اُسے ہڑپ کر سکتا ہے۔ کر جاتا ہے، یس نہیں کہہ رہا ہوں! اس لئے کہ آدمی صورتِ گریح ہے اور تغیرِ نفس کی استعداد رکھتا ہے۔ کوئی کبھی نقطہ نظر کا حامی ہو، میرا یقین ہے کہ عملِ تغیر میں آدمی کے بننے سے بگڑنے کے امکان زیادہ ہیں۔

میں نل سے پانی بھر کر لیا اور لالچہ سنگھ کی طرح سڑک میں کھڑا ہو کر نہایا۔ میں پہلے ہی آٹوسیوں پڑوسیوں کے تحسُّس کا مرکز تھا، اُن کی نظروں کے تندوے (اوکلوئس) نیچے سینے لگے جیسے میری ظاہری عروانی اُن کی تسلی کے لئے کافی نہیں تھی اور وہ اُسے ہڈیوں تک دیکھنا چاہتے تھے۔

دلی اور دلی والے ابرق کے اُن ٹکڑوں کی طرح تھے جو ندی کی ریت میں بہہ کر آتے ہیں اور کمنوں کی زد میں آکر ہیروں سے چمکتے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر بے تاب ہو جاتا تھا، آنکھوں سے اُن کے مقام کا تعین کر کے اُن تک پہنچتا تھا اور ابرق دیکھ کر مایوس ہو جاتا تھا۔ راوی کا بیان ہے، ”ہیرے



لیے ہی ریت میں بہہ کر آتے ہیں لیکن قیمت والے کو ملتے ہیں۔“

میری جیب جالندھر ہی میں مجھے ڈرانے لگی تھی، دلی میں اُس سے میں ڈرنے لگا۔ اُسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ خوف ناک آؤ رہے کا بل ہو۔ میں کہے کو تالا لگانے کے لئے تالا ڈھونڈ رہا تھا کہ میری آنکھیں چٹنگیری میں رکھی۔ مسلی کچلی کا ٹھنڈ پر ٹھہر گئی اور اُسے سونگھنے کے سے انداز میں دیکھنے لگیں۔ اُس گندی چیز میں سے روٹی کی خوشبو اُٹھی اور میرے تھنوں سے پٹ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا ٹھنڈ کو کھولا۔

اُدھی روٹی کا گول کیا ہوا ٹکڑا پایا، جس میں چھبہ بھر سبزی بھی تھی۔ وہ وہاں کیوں اور کس کے لئے تھی؟ اس پر غور نہ کرتے ہوئے میں نے وہ روٹی کھالی۔ اُس نے میری جھوک ایسے بھر کا دی جیسے مڈم آگ پر تیل چھڑک دیا جائے۔ میں نے جلدی سے، نکلاس بھریانی اندا اُٹھلا اور اپنی اُدھوری تلی میں ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان دو دیوار سے میرا وہی رشتہ ہے جو کسی بد شکل انسان کا اپنے اعضا سے ہوتا ہے۔

میں نے رتن رانج کر ٹوکے میں رکھے، چولہا کھسکا کر دیوار سے لگایا، انگنی کھول کر سامنے کی دیوار سے متوازی باندھی، لٹکے ہوئے جالے جھاڑے، ٹوٹی اٹھا کر باہر پھینکی، کوتار کے کھڑنڈ کھرچے، چارپائی کی اودان کسی، بستر ٹھیک سے نہ کر کے رکھا، شلف اور شیشیاں صاف کر کے جھاڑودی۔ اُس تھوڑی سی رد و بدل سے وہ کمرہ زیادہ کشادہ اور قابل قبول دکھائی دیا۔ میں نے اپنے کام کو مکملتے چیں نگاہوں سے دیکھا۔

اُس گندگی میں کتنی صفائی اور بھیمی ہوئی تھی۔

## باب ۴۳

دنیا سے نزلے میں قرینے اپنے، صدیوں میں گزرتے ہیں جیسے اپنے

ناکام متناؤں کے مدفن جیسے، دیکھ تو کوئی کھو دکے سینے اپنے (شاطر)

میں نے دروازے پر تالا لگایا اور تلاش معاش میں نکل پڑا۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر میں رُک گیا اور سوچنے لگا کہ کدھر جاؤں؟ نہ کوئی جدھر جا رہا تھا مصروف لگتا تھا۔ کوئی میری طرف دیکھتا، میرا دل کہتا، یہی تیرا ہی خواہ ہے! مجھے حوصلہ ہوتا لیکن وہ میرے پاس سے بے تعلق گزرتا تو میرا دل مسوس جاتا۔ میری امید آرائی جھوکے کتے کی سی تھی۔ وہ غریب کسی کو دیکھ کر دم ہلاتا ہے اور اُسے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر گردن ڈال

کر آگے چل دیتا ہے۔ ایسے خوب صورت مکان، جن کے پیش دالان کی قیمت ہمارے گھر سے کئی درجہ زیادہ ہوگی! ایسی سبھی دکانیں، جن کے سائن بورڈ کی مالیت سے ہماری دکان جیسی کئی دکانیں بنائی جاسکیں! دلی میں کتنی دولت تھی! لیکن اُس افراط میں، میں پیٹ بھروٹی کا محتاج تھا۔ میں وہاں سے آیا تھا جہاں سے نہ کوئی آتا ہے لیکن وہاں جا رہا تھا جہاں مجھے اکیلے جانا تھا۔ چوں کہ مجھے معلوم نہ تھا، میں نالاں تھا، متزلزل تھا، محروم تھا۔۔۔ وہ سب کچھ تھا جس کا رشتہ غریبی، بیکاری، بیکسی۔۔۔۔۔ سے ہے۔ میں ست نگر سے ہوتا ہوا سلیوان سکول کے سامنے سے گزر کر پچھوئیاں روڈ پہنچا جسے چوڑا اور پتکا کیا جا رہا تھا۔ عورتیں اور مرد اکٹھے کام کر رہے تھے۔ کوئی کوئٹار کے ڈرم توڑتا، کوئی بھٹی جھونکتا، کوئی طرف میں بگری بھرتا، کوئی بکسر کے برتن میں گھلی ہوئی کوئٹار، کوئی پھوارے سے کوئٹار چھڑکتا، کوئی ملائی ہوئی بگری بچے سے بچھاتا، کوئی پُرانی سڑک کے کنارے بڑش سے رگڑ کر صاف کرتا اور کوئی صاف کی ہوئی مٹی اٹھاتا۔ روڈ رولر کی رفتار سے قدم ملائی ہوئی عورتیں چل رہی تھیں، جنھوں نے پہیوں پر بھیگی بوریوں کے پچھاہے پکڑے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کوئٹار کی پدبجو اور سیاہی میں نظر آتا تھا۔ سحر اپنے ابتدائی مراحل ہی میں تھی لیکن گرمی سے جھلا ہٹا اور بے جینی پیدا ہو رہی تھی۔ یہ سورج میرے گاؤں کے سورج سے زیادہ غضب ناک تھا جیسے دلی والوں کے تلخ مزاج سے راست متاثر ہو۔ مزدوروں میں کوئی نننگے پاؤں تھا اور کوئی پاؤں پر ٹاٹ باندھے ہوئے۔ جو کوئی ان دو زمروں میں نہ آتا تھا اُس نے پُرانا فوجی بوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہاں نہ کوئی روڈ رولر کی بھک بھک سے مرعوب تھا۔ وہ خوف ناک شے حکایات کے دیو کی سی تھی جس کا منہ بھرنے کے لئے شہر کا ہر شہری کچھ نہ کچھ بہم پہنچاتا ہے۔ ظاہر طور پر ہر کوئی اپنے عمل میں آزاد گتا تھا لیکن درپردہ روڈ رولر کی حرکت کا قیدی تھا۔

وہاں ایک آدمی تھا جو اُس ہنگامے سے الگ ہو کر بھی اُسی کا حصہ تھا بلکہ اُس ہنگامے کا وہی بانی تھا۔ وہ سر پر چھتری تانے ایک جگہ کھڑا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر کسی کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ جسے کاہل اور نااہل سمجھتا، اُس کی نہایت شدت سے سرزنش کرتا۔ پھاوڑوں کی رگڑ وگڑ، بگری کی چرچوں روڈ رولر کی بھک بھک، انسانی آوازوں کا شور۔۔۔۔۔ اُس آدمی کی ایک بھڑکی میں ڈوب جاتا۔ اُس بھڑکی کا رد عمل عجیب تھا! ہر حرکت سہم کر سُکھتی اور سُکھ کر اُبھرتی اور پھر اپنی تیزی کی انتہا کو پہنچ جاتی اور بہت دیر تک بدستور رہتی۔ اُس آدمی کا لقب جمدار تھا۔ وہ مزدوروں کو تیز چلتے اور بھاگتے دیکھ کر ایسے خوش ہوتا تھا جیسے اُسے ہر سست رفتار شے سے نفرت ہو۔ میں اُس سے تھوڑی دُور کھڑا ہوں چکاں عقدوں، دل نگار فوٹوں انسانی ہمتوں کا تجزیہ کرتا ہوا سوچنے لگا، کتنا اچھا ہر جو یہ کام مجھے مل جائے! میں اپنی اُمید سے نا اُمید ہو کر اُسے سمجھنے ہی والا تھا کہ اُس نے میرا حوصلہ بندھایا۔ میں نے پاس سے گزرتے ہوئے مزدور کو روک لیا اور

اُس سے کام کے بارے میں بات کرنے لگا۔ میری بات اُدھوری ہی تھی کہ جمدار نے دیکھ لیا اور اُسے آوارہ کتے کی طرح چھڑکا۔ وہ چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی جمدار نے مجھے ہاتھ اور سر کے اشارے سے آگے بلایا۔ میں اُس سے کون تعلق نہ تھا لیکن میں ڈر گیا اور ہچکچاتا، ہچکچاتا، رکتا رکتا آگے بڑھا اور قریب پہنچا۔ اُس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور غصے سے کہا، ”سکھا، سکھ پتلیوں کا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟ چل اپنی راہ پکڑ۔ تیرا منہ بند کر کے چوتروں کی طرح لال ہے۔“

اُس نے میرا ہاتھ جھٹک کر چھوڑا، بازو پھیلا کر مجھے پرے دھکیلا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مجھے اُس سے جو ڈر لگ رہا تھا، جاتا رہا۔ میں وہیں کھڑا رہا اور اُس کی طنز و مزاح پر غور کرتا رہا۔ وہاں جو ہوتا تھا وہ کٹھ پتلیوں ہی کا تماشا تھا۔ جو آدمی بے سوچے سمجھے کام کریں، کسی کے اشارے پر ناچیں، وہ کٹھ پتلیاں ہیں۔ میرا منہ سردی کی نرم دھوپ میں تھمتانے لگتا تھا اور وہ تو تھی گرمی کی چلچلاتی دھوپ۔ میرے بُردل نے میری پیٹھ تھپکی، چل کہیں گھنی چھاؤں میں بیٹھ! لیکن خالی جیب کے تسے نے میرے تلوے پکڑ لئے اور میرا پیٹ پیرتسمہ پا کی طرح مجھ پر سوار ہو گیا۔ اُس نے مجھے جھٹکا دے کر جتلیا، ”مجھے روٹی چاہیے! میں بھوکا ہوں۔“ اُس کی شکایت پر دھیان نہ دیتے ہوئے، میں وہاں سے چل پڑا۔ مجھے بے پروا پار اُس نے میرے گلے پر گرفت کڑی کر دی میں گرتے گرتے سنبھلا، رکتا تو اُس نے دباؤ گھٹایا میں نے اپنے جابر ساتھی کے رویے پر غور کیا اور اُسے دُست پایا۔ ادھی روٹی پر کوئی پورا دن کیسے گزار سکتا ہے! پوری روٹی حاصل کرنے کا ایک ہی وسیلہ تھا، کام۔ میرے ساتھی نے میرے خیال کی تائید کی اور مجھے سمجھایا، ”مجھے روٹی کی ضرورت ہے اور تجھے ادھے کرایے کی ادھی مسئلہ تیرے کام کرنے ہی سے حل ہوگا۔“ میں نے اُس کی خود غرضی میں ہمدردی دیکھی اور خاموشی سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے مجھے وقت پر یہ بھی یاد دلایا، ”تو کل ہی سے مکان کے کرایے میں ادھے کا حصہ دار ہے۔“ میں نے سوچا کہ میں نے کرایہ نہ دیا تو کیا ہوگا؟ مجھے وہیں جواب مل گیا اور میں دہل گیا۔ باغوں اور کھیتوں کی بات الگ تھی۔ میں وہاں آرام سے رہتا تھا۔ کیوں کہ وہاں بے گھری کا احساس ناپید تھا۔ کٹائی پر میں ضد کر کے کھیتوں میں سوتا تھا اور اُس تنہائی کو اپنے گیتوں سے بساتا تھا۔ میری لے، رات کے سنگیت سے ہم آہنگ ہو کر سوز و سازِ فطرت لگتی تھی۔ مکھیوں کے چھتے سے جھبھناتے شہر میں بے گھری اور بے کاری! میرے کلیجے میں دراڑ پڑ گئی اور کام کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ کام سے میری زندگی کی نغمگی تھی، رگوں کی گرمی تھی اور سانسوں کی روانی۔ ایک وہی عمل تھا جو میری حیات کے فرضی خاکے میں حُسنِ یقین کے رنگ ابھار سکتا تھا۔ میں نے اس عمل کے کئی چلن دیکھے تھے، ایک چلن تھا غلامانہ۔ میرے بھائیاجی مَر دوروں کو بے جسی سے گالیاں دیتے تھے، بے رحمی سے لائیں جاتے تھے اور وہ بے چارے اُف نہ کرتے تھے۔

وہ جس کو کام سے نکالنے کی دھمکی دیتے، وہ فریب کس عاجزی سے کہتا، ”سردار جی، پیٹھ کی مامہ مارنا، پیٹ کی مامہ مارنا!“

میں جمعدار کی جانب سرکا اور سہاجت سے کہا، ”جمعدار جی، مجھے کام پر رکھ لیجئے!“ میری گزارش کا ردِ عمل ناقابلِ مصلحت تھا۔ وہ میری ہنسی اڑاتا ہوا مردودوں سے بولا ہے! سناٹہ مٹانے کے لیے اسے کام چاہیئے۔“ وہ رک رک کر بولا، ماماہ لفظ چبا چبا کر اگلا۔

کتنی آنکھیں ایک ساتھ اٹھیں اور اُس کی آنکھوں سے ہوتی ہوئیں مجھ پر اکڑ ٹھہر گئیں، بے ہنگام آنکھیں، معصوم آنکھیں، کھٹور آنکھیں، حساس آنکھیں، شوق آنکھیں، حیران آنکھیں، متنجس آنکھیں، بے تعلقی آنکھیں، خردمند آنکھیں، گنوار آنکھیں، بولتی آنکھیں، خاموش آنکھیں۔۔۔ آنکھیں ہی آنکھیں میرے جسم کا ہر حصہ کئی کئی آنکھوں کی مار سے پھلنے لگا جیسے میں بے تحاشا بھیڑ کے خلاف چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کام ٹھہر گیا۔ لیکن جمعدار خوش تھا۔ اُس نے ساری آنکھوں میں بیک وقت تانکا، میری طرف دیکھا اور بے مشرعی سے کہا، ”لوٹو! تو کام کرنے کے لیے پیدا نہیں ہو! گاندھروا اور پیسے کما! اسی میں میری بے سبب کی بھلائی ہے۔“ اُس نے میری طرف، اپنی طرف، اُن کی طرف اشارہ کیا جیسے میرا پیشان کے خروجِ نفس کا سامان نہیں کرنا تھا۔ مجھے پوری طرح بے عزت دیکھ کر اُن آنکھوں پر کیا گزری؟ میں نہیں جانتا کیوں کہ اُس وقت میری آنکھیں بارِ نہایت سے جھکی ہوئی تھیں اور میری اپنی حالت نزعِ پذیر تھی۔ میری نا اُمیدی کا دھندلا اُجالا گھپ اندھیرا ہو گیا جیسے بند کمرے کا کمرو سا چراغ بجھ جائے۔ مجھ پر سکتہ چھا گیا جو بے بس کی ذلت و اہانت کی پیداوار ہوتا ہے۔

کام دامن! انسان کی فطری ضرورت ہے۔ اسے جذبہٴ محبت کہا غلطی ہے، حلالِ کربہ دو جسموں کے ملاپ سے تحریک پاتی ہے اور تسکینِ عناصر بنتی ہے۔ اس میں بے دردی، بدکاری، دیندوں کی مسمیٰ بے رحمی ہو تو یہ کس احساس کی تشفی ہو سکتی ہے؟ صرف فنا و ابطال!

تایا جی کہتے تھے، ”جذبہٴ شہوت، کمالِ لطافت کی پیش از وقت قرارداد ہے۔ اس کی نازکی اس کی خشکیا پاتی ہے اور یہ ایسی نفیس زندگی ہے جسے جینے سے پہلے اُس سے لطف اُٹھایا جاتا ہے۔“ اس کے باوجود وہ اسے حیوانی جذبہ کہتے تھے اور اپنے خیال کی وضاحت یوں کرتے تھے، ”جو عمل خود آموز اور ثمر آور ہے وہ حیوانی زندگی کی خصوصیت ہے۔“

آہ! اس بے رحم دنیا میں کمزوروں اور حاجت مندوں کی حیثیت کیا ہے؟ ان کی عزت کے کیا معنی ہیں؟ وہ زندہ رہنے کے لیے گناہوں کے راستوں پر چل نکلتے ہیں تو بے قصور ہیں۔ اپنی ناکامی سے گھبرا کر عذبی

کہنا کہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خودکشی، بند عمل ہے اس لئے بہادر، حاجت مند کے برعکس حاجت روا ہوتا ہے۔ میں ریزہ ریزہ ہو کر سالم رہا اور زخم زخم ہو کر خاموش۔ میرے ضبط کے باوجود میری روح نے تڑپ کر چیخ ماری جسے میں نے اپنی ہڈیوں اور دھڑکنے والے دھیرے میں جذب کر لیا۔ میرے بدخواہ کی ملائت، کام کے شور میں ڈوب گئی اور میں احساسِ ذلت کی آزدگی کو پالتا ہوا، بے جان بُت کی طرح کھڑا رہا۔ میری بے چارگی نے رنگ پر رنگ بدلا لیکن کوئی اُجاگر روپ دھارن نہ کیا۔ نہ جانے کیسے! میری بے مائیگی، گدازی مندے معمور ہوئی اور میرے پرانے لفظوں کو نیا آہنگ دے گئی، ”جمعدار جی“ مجھے کام پر رکھ لیجئے!“

اُس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا جیسے میری بات آنکھوں سے سُنی ہو۔ وہ جلدی سے میری جانب بٹھا اور میں ڈر کر پیچھے ہٹا۔ میں ڈرتا اور پیچھے ہٹتا دلی کی بے دلی کا شکار ہونے ہی والا تھا کہ اُس نے گرگٹ کی طرح سر ہلا کر مجھے اُگے بلایا اور جھڑی ایک طرف جھکا کر اُسے گھمانے لگا۔ اُس کی ادا، اُس کسان کے ماش تھی جو بوجھ سے تھنسی گاڑی کا پیہرہ مار کر اُسے قابلِ حرکت بنا تا ہے۔

”ٹھیک ہے، کل سے آجا“ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے نرمی اور مہربانی سے کہا۔ اُس کا یہ چھوٹا سا جملہ، خوشبو کے اُس جھونکے کی مانند تھا جس کی سمت چاروں سمت ہو۔ کولتار کا دھواں، دھواں نہ رہا، دھوپ کی تلخی، تلخی نہ رہی، روڈ نور کی بھک بھک، بھک بھک نہ رہی، شور و غل، شور و غل نہ رہا دوسری ہر شے کی طرح میری بے کسی، بے کسی نہ رہی، میری توانائی بن گئی۔ میں نے بلا خوف کہا، ”جمعدار جی!“ مجھے آج ہی کام دیجئے، میں کل سے بھوکا ہوں۔“

اُس کے بارے میں میرا جذبہ یکسر بدل گیا۔ ویسے جذبہ ہے کیا؟ کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ ہے! جھوٹ بول کر مجھے سچ بولنے کی سی تسلی ہوئی۔ وہ آدمی جو کچھ دیر پہلے غنڈے اور چھٹی باز کی علامت نظر آتا تھا میں نے اُسے ہمدرد اور مددگار کی شکل میں دیکھا۔ آدمی کی نفسیات اپنے ساتھ ہر شے کے معنی بدل دیتی ہے! میں اُسی گھڑی اُن مزدوروں کا جھنڈ بن گیا جو کچھ دیر پہلے مجھے اجنبی سے دیکھ رہے تھے اور نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے!

## باب ۴۴

روتے ہیں لہو چھالے کہ جلتے ہیں چراغ، یا گردشِ دوراں میں ہیں تمت کے یارِ غ  
کہتے ہیں جنہیں چاند ستارے شاہِ لوحِ غمِ امروزی پہ فاقوں کے ہیں دِلغ (شاہ)

ان مزدوروں کو دلی میں باگرٹیے کہتے تھے۔ ان کے دل کے دل روزی کمانے کے لئے راجھان سے دلی آتے اور وہیں کے ہوتے۔ ان کے چہرے مہرے راجپوتوں کے سے تھے۔ فرق بس اتنا تھا کہ یہ دوشالوں کے بدلے پھٹے پڑے پہنتے، غازوں کے بدلے دھول میں لتھرتے، قالینوں کے بدلے گندگی روندتے، گلاب جل کے بدلے پسینے میں نہاتے، سرود و نغمہ کے بدلے بدکلامی سنتے، رسوائیوں میں جیتے اور حسرتوں میں مرتے۔ یہ مہارانا سنگرام سنگھ، مہاراجا پرتاپ سنگھ کی طرح مفروف جنگ تھے لیکن ان کی اور ان کی جنگ میں بنیادی فرق تھا۔ وہ ملک و قوم کی آزادی کے لئے حملہ آوروں سے لڑے تھے اور یہ زندہ رہنے کے لئے بھوک سے لڑ رہے تھے۔ آزادی کی جنگ وقتی تھی لیکن بھوک کی جنگ ابدی۔ کہاوت ہے کہ یہ آدم و حوا سے شروع ہوئی تھی لیکن اس کی تندی کی توانائی! یہ جاری و ساری ہے۔ کوئی نظام، کوئی ازم، ایسے روک نہیں سکا کیوں کہ یہ عناصر حیات کی ضرورت موجودات ہے۔

جہاں کہیں کام ہوتا یہ مزدور وہیں کہیں میدان تلاش کرتے اور اُس میں جھونپڑے بنا لیتے۔ شان دار مکانوں کے درمیان وہ گندے جھونپڑے ایسے لگتے جیسے خوبصورت چہرے پر چیچک کے دھبے۔

دوپہر کی چھٹی ہوئی۔ مزدوروں کے بچے پاس کے درختوں اور دیواروں کے سایوں میں رینگ رہے تھے، وہ اپنی ماؤں کو دیکھ کر ان کی جانب پکے۔ مجھے مجھے چہرے ایسے روشن ہو گئے جیسے ان کے اندر چراغ جل اٹھے ہوں۔ وہ چھاتیوں سے آئینوں سے عکس کی طرح لپٹے۔ مزدور جس حالت میں کام سے ہٹے تھے اُسی حالت میں روٹیاں کھانے لگے، موٹی سوکھی باجرے کی روٹیاں! میں ہاتھ یادوں موکھ کرنے کے لئے لیٹ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نہ دیکھتا تو میری حیرت مجھے اُگاتی کہ میں معلوم کروں کہ کاسٹھ کی سی وہ روٹی، سوکھی کیسے کھا رہے ہیں؟ اُس میں وہ کون سی لذت ہے جو اُسے گلے سے نیچے اُترنے میں مدد کرتی ہے؟ وہ روٹی جیسی تھی، نام کی روٹی ہی تھی۔ اُسے دیکھ کر میری مری ہوئی بھوک جی اٹھی اور منہ میں پانی آگیا۔ میں وانت بھیج کر گائیں بچوڑا اور پانی نکلتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میرے دانت آپس میں جڑتے جاتے ہیں اور منہ میں رکھے گٹھ کی طرح کھلے جاتے ہیں۔ منہ کھولنے سے رال ٹپکتی اور منہ بند کرنے سے بے قراری بڑھتی۔ میں نے خیال بدلت چاہا لیکن بدل نہ سکا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اُنکلی سے زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔ میں حیران رہ گیا! میری ہر لکیر روٹی سے ملتی تھی۔ میں اپنی دھن میں لکیریں کھینچت رہا اور روٹیاں بناتا رہا۔ میری روٹی، چاند کی سی تھی۔ وہ جھوکے کو امید دلاتی ہے، اُس کا پیٹ نہیں بھرتی ہے۔ اتنے میں کام کا گھنٹا بجا اور میں اُس دل فریب خیال سے بھی محروم ہو گیا۔

مزدوروں نے اذان رتب رکھے جب ان کے سایہ رات کے اندھیرے سے جا ملے۔ وہ جھونپڑوں

کی جانب ایسے بھاگے جیسے اُس ذاتی کام کے لئے انھوں نے اپنی طاقت چوری چھپے بچا رکھی تھی اور اُس پر جمدار کی نظر نہیں پڑنے دی تھی جمدار پھرتی بند کر کے اپنی چھتری کی نوک سے دھری کر دیتا تھا اور اُن مردوں کو دیکھتا تھا جو سامان چوکیدار کے حوالے کرتے تھے۔ میں اکیلا اوٹ پٹانگ سوچتا کھڑا تھا کہ اُس نے مجھے بلایا دو روپے دیئے اور میری پیٹھ تھپک کر کہا، ”کل سویرے جلدی آنا۔“

حالات کا وہ موڑ کتنا خوش گوار تھا! روپوں کی موجودگی سے میری تنہائی کا خوف کم ہو گیا جیسے میری بے اعتباری میں مجھے قابل اعتبار ساختھی مل گئے ہوں۔ اُن خطرناک حالات میں، میں نے بے خطر محسوس کیا۔ میری مسرت میں حیرت کی تلاوٹ تھی۔ دو روپے میں نے کئی بار خرچ کئے تھے، کمائے نہ تھے۔ انھیں پانے کے لئے میں کیسے نشیب و فراز سے گزرتا تھا۔ ان کے سامنے گنج کاروں کی کیا حقیقت تھی! جو لوٹ کھسوٹ کا حاصل تھا۔ میں گھر کی طرف زیادہ دُور نہ گیا تھا کہ رک گیا۔ مجھے لگا۔ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ میرا قدرتی میرا وابہ تھا۔ میں نے روپے ہاتھ میں محفوظ نہ سمجھے، دُوسرے ہاتھ سے جیب کھول کر تھام میں رکھے اور اوپر سے داب لئے۔ میرے دل میں آیا، براہِ آتار ہا کہ میں جیب میں سے روپے نکال کر دیکھوں لیکن حوصلہ نہ پڑا۔ اندھروں نے راستوں کو رلا دیا تھا اور میں صبح سمت نہ پا رہا تھا۔ میں نے کتنے راہ گیروں سے ریگڑھ پُورہ کا راستہ پوچھا اور گھر پہنچا، دروازہ کھولا جو چرانا ہوا کھلا۔ میری روحانی ترنگ! میں نے اُسے مبارک ہو، سے تعبیر کیا۔ میں نے بلب جلایا، جیب میں سے نوٹ نکالے، الٹ پلٹ کر تہری دیکھے اور پھر غور سے۔ میں نے ایک روپے کے دو نوٹ پہلی بار نہیں دیکھے تھے لیکن انھوں میں اور دُوسروں میں بُنیادی فرق تھا، یہ میری محنت کی پیداوار تھے۔ میں نے جذباتی ہو کر سوچا، ان نوٹوں کا خالق میں ہوں! فقط میں! یہ نوٹ قابلِ پرستش ہیں اور میری آنے والی نسلوں کے لئے تبرک۔ یہ لاقیت ہیں! مجھے سنبھال کر رکھنے چاہئیں۔ میں نے اُن پر لکھی ہوئی اُن کی قیمت پڑھی، مجھے غصہ آیا، اُن کی قیمت کس قدر گھٹا کر رکھی گئی تھی۔ اُس گھڑی میری نفسیات ماں کی سی تھی۔ ماں کتنی ہی غریب ہو، خود پسند لمحوں میں اپنے بچے کو راج دلار کے نام سے مخاطب کرتی ہے۔

میرے کپڑے اُس کاغذ کے سے تھے جو بھیگ کر سُکھ جائے۔ وہ بدن کو ریگمال کی طرح جھیل رہے تھے۔ میں نے نہانے کے لئے کپڑے اتارے جو زخم پر سے کھڑک کی طرح اُترے۔ ماس ٹپ رہا تھا۔ اُس پر پانی ایسے لگا جیسے تپتے تپتے پر گرا ہو۔ میں نے کسی احساس کے زیرِ اثر پنڈانہ ملا اور ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔ گردن سے کان دھوں کے بچے تک پستی اُبھر رہی تھی۔ میں نے اُس موادِ فاسد کو غور سے دیکھا، وہ نشہاںش کے سے باریک چھالے تھے۔ میں نے نہا کر تولیے سے پنڈا اس احتیاط سے پونچھا جیسے زخم کا کچھلے سے

صاف کرتے ہیں۔ ہاتھوں میں سے پوروں کی حالت دیکھتھی۔ وہ اتنی گھسی گئی تھیں کہ ماس کی پتلی پرت کے نیچے خون صاف نظر آتا تھا۔ ان میں نمک چھڑکے زخموں کی سی جلن تھی۔ انھیں دبانے سے گلستا کہ ان میں سے خون کے ذارے چھوٹ پڑیں گے۔

ہوٹل کا فاصلہ اور روٹی پر دسے کا وقفہ دکھ کی گھڑی کی طرح طویل ہو گیا۔ سامنے روٹی دیکھ کر دل و جان کی ساری بے صبری ہاتھوں میں سمٹ آئی۔ میری بھوک پیٹ سے، آنتوں سے، حلق سے زبان سے ہوتی ہوئی دانتوں پر اکڑ رہی تھی۔ اس لمحے کے اتار چڑھاؤ مجھے ایسے یاد ہیں جیسے قطعی ستارے کو مسافروں کے راستے۔ میں سانسوں کی لطافت و قیامت کے ساتھ ان کی رفتار گم گشتہ کو محسوس کرتا ہوں اور ان کی حیات سازی کی طرف مگی پر حیران ہوتا ہوں۔

میرا ہاتھ جہاں تھا تھاں رک گیا اور انگلیاں لا حرکت ہو گئیں۔ کہنیوں پر میز کی چیمچ جاتی رہی۔ گاہکوں، بیروں، برتنوں کا شور بند ہو گیا۔ سٹو نے کی گرم خوشبو، سٹو نے میں ٹھنڈی ہو گئی۔ بھوک کی شدت دانتوں میں نابود ہو گئی۔ منہ میں بھرا ہوا پانی ٹوکھ گیا۔ روٹی، آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میری تمام غناہ پرورد قوتیں، قوتِ لامہ میں ڈھل گئیں۔ گرم روٹی نے گھسی پوروں پر پچا ہے کا اثر کیا اور میں انھیں سہلانے لگا۔ میرے لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالتے ہی پوروں کا سویا ہوا ذرہ تیزی سے جاگا، مجھے لگا کہ میں نے انھیں کاٹ کھایا ہے۔ میں نے تشویش سے دیکھا، پوریں تازہ زخم کی سی لال تھیں لیکن ثابت و سالم تھیں۔ میری حالت عجیب تھی! میں جتنی دیر لقمہ چباتا اس سے زیادہ دیر روٹی سے پوریں سہلاتا۔ پہلا لقمہ، دانتوں میں گھل کر حلق میں اتر جاتا بھی دوسرا اڑتا۔ یہ اسی تسکین کی تسلی تھی کہ ایڑیوں تک بھوکا ہونے کے باوجود میں معمول سے زیادہ کھانا دکھا سکا۔

میں گھر لوٹے ہوئے برف کا ڈلا خرید کر لایا اور اس کے گھلنے تک اس سے پھاووں کی گرمی، ٹھنڈی کرتا رہا۔ وہ تھلا ہٹ، وہ جھن جھن ہٹ، وہ سنسنابٹ، میں نے رات سوتے جاگتے لڑاری۔ ماس، ذہیل کی طرح دکھاتا رہا، ہڈیاں کچوں کی طرح چھبتی رہیں، پوڑ کروٹ کروٹ دزد اگلتے رہے، سانس سے تنھے جلتے رہے جیسے ان پر انگارے رکھے ہوں۔ میرے خواب حقیقت کی پڑتال سے ملکر اکچور چور تھے۔ اور خواب وہ عجیب و غریب مظہر ہیں جو حیوان کے الجھے ہوئے تانے بانے کو سلجھاتے ہیں اور سلجھے ہوئے کو نکھارتے۔ سنوارتے ہیں۔ یہ وہ کیمائے صحت ہے جو بیماروں کو تندرستی اور تندرستوں کو تازگی سے نوازتے ہیں۔

دلی شہر حین درنگین نہیں تھا، کلفت و نکبت کا اکھاڑ تھا اور اس قول کی تصدیق نہ کمزور



طاقت دلیکے غذا ہے۔

لاجھ سنگھ منہ اندھیرے بیدار ہوا اور اُسی کے ساتھ میں۔ اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ انکھی کھول کر دیسے ہی باندھی جیسے پہلے تھی۔

جو کوئی یہ توقع کرتا ہے کہ اُس کے جذباتی لگاؤ کا صلہ اُسی جذباتی لگاؤ سے ملے، وہ نادان ہے لیکن اتنی توقع عین فطری میلان ہے کہ اُس رشتے کا کچھ لحاظ رکھا جائے۔ اُس وقت وہ مجھے ناقابلِ برداشت حد تک محرومہ لگا۔ میرے دل میں نفرت کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میں نے جیسے کیسے اُس پر قابو پایا لیکن اتنا کہے بغیر نہ سکا۔ ”کیسے اچھی ہے! ایسے سر کو لگتی ہے“

”جو چیز جیسے ہے اُسے ویسے ہی رہنے دے۔ بڑا آیا، مجھے سکھانے والا، اپنے پر نہیں نکلے مجھے اڑنا سکھاتا ہے“ وہ غصے سے اتنا اونچا بولا کہ سیدھا حلق سے بولتا جان پڑا۔ اُس کی مونچھوں نے آواز کی تیزی اکہری کردی ورنہ دودھاری ہوتی۔ اُسے مونچھوں کی بے ہودگی کا علم تھا۔ اُن پر اپنی بیزاری ظاہر کرنے کے لئے اُس نے انھیں کھینچ کر اوپر اٹھایا اور گرایا۔ اُس کا انداز ہریانہ کی کھترانیوں کا سا تھا۔ وہ راہ گیروں کے سامنے شلوار سرکاتی تھیں اور جھٹ سے بیٹھ جاتی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ گورے سڑوں کے نظارے کے برعکس اُس کے دانت پیلے گھنداؤنے تھے۔

میں دل برداشتہ باہر گھومنے لگا اور وہ اندر اپنا کام کرنے لگا۔ جب وہ بیٹ اٹھلا گیا، اُس نے ڈبے میں مٹی ڈال کر پانی بھرا اور اُسے دھو کر رکھ دیا۔ اُس نے اسکا کیا لیکن مجھے ڈبے میں پانی بھرنے کا فن سکھایا۔ وہ کام پر چلا گیا۔ اُس کی مخالفت پر بھی، میں اُس مشکل کے مستقل حل کے بارے میں سوچنے لگا۔ آدمی کے سکھنے کی قابلیت میں اختراعی صلاحیت کا عنصر خود افزا ہے۔ اپنی غریبی اور بے قدری کے باوجود غالب و میر نے علم کی جو دولت چھوڑی ہے وہ استمراری ہے۔ ان سے قابلِ رحم ارشمیدس کی کہانی ہے۔ وہ علمِ ہیئت کا کوئی مسئلہ حل کر رہا تھا کہ کسی حملہ آور بادشاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن وہ ممتاز ہندسداں، ہندسوں میں زندہ ہے۔ ہنز دروں کی شان و شوکت ان کی بایں گئی ہے! ورنہ یہ سلطانیوں کی جھوٹی ٹیپ ٹاپ کی طرح نابود ہو گئے ہوتے۔

مہارت، عمل کی روانی اور تیزی ہے لیکن اختراعی، خیال کی تازگی اور بر جستگی ہے۔ میں نے بہتر سے ڈبے کا جوڑ رگڑ کر صاف کیا۔ چھت کے ایک کونے میں کوئٹا کا ڈھیلا تھا۔ میں نے اُسے اُتارا، ڈبے کے اندر جوڑ پر رکھ کر چمچے پر گرم کیا اور ڈبہ گھما کر پورے جوڑ پر پھیلا دیا۔ میں نے ڈبے میں پانی بھر کر اوپر اٹھایا، نفعیہ کیا اور اپنی کامیابی پر خوش ہوا۔ میں کام پر جانے کے لئے تیار ہوا اور کپڑے پہننے لگا۔ اُن میں

سے بغل گندے لٹی بدبو آ رہی تھی۔ لیکن میری خوشی کی خوشبو اس قدر تیز تھی کہ وہ بدبو دب کر رہ گئی۔ کمرے کی ہر شے ویسے ہی پڑی تھی جیسے کل تھی۔ اپنے ضمیر کی تنبیہ کے خلاف میں نے چنگیری میں پڑا پونا (روٹیاں رکھنے کا کپڑا) مٹولا اور اُسے خالی پایا۔ میں زندگی کی اُس راہ پر تھا جہاں سانس سانس نیا درد اور قدم قدم نیازِ قہم تھا۔ لیکن میری جرأتِ نبرد آزما! مجھے اپنی شکست پر فتح کا گمان ہوا اور میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ طاقتِ در کی وہ طغیانی تھی جو کمزور دشمن کو لڑائی پر آمادہ دیکھ کر سونٹوں کا لے ساخنہ لوج ہوتا ہے۔ میں نے برات، کوٹھوکر ماری، چوٹ کھائی، لیکن مسرت پائی۔ میں کام پر روانہ ہوا تو پیادوں میں درد ہو رہا تھا۔ عناصر کی خود اعتمادی میں عجز خود آرائی ہے، یہی وجہ ہے کہ فطرت میں ہر بیماری کا علاج اور ہر زہر کا تریاق موجود ہے۔ میں ست نگر سے ادھر ہی تھا کہ درد غائب ہو گیا۔ میری چال میں چستی، دل میں خوشی اور خیال میں نیرنگی تھی۔ سامنے آفتاب طلوع ہو رہا تھا جو مجھے کاروانِ رنگارنگ نظر آیا۔ بچکھوٹیاں روڈ پر لمباڑے کام پر جلتے ہوئے مل گئے۔ لمباڑوں کی جھانجھنوں کی جھنکار نے مجھے لہکا دیا اور میں گن گناتے لگا۔

دَدھ تاراں توں بھانجھراں تیریاں

تیسریاں بیچوں خبراں

(تیری جھانج، ڈاک گھر کے تار سے جھپی ہے، تیرے آنے کی خبر سیدھی پہنچاتی ہے)

میرا لونگ ہی گڈی دے وچ گمیا

اگ لا ماں ٹکٹاں نوں

(کوئی لڑکی شہر سے لونگ خرید کر ریل گاڑی میں آ رہی ہے اور اُسے ٹکٹ کے

ساتھ باندھ کر جیب میں رکھ دے۔ دورانِ سفر ٹکٹ چیکر آتا ہے اور

لڑکی سے ٹکٹ پوچھتا ہے۔ اُس وقت اُسے پتا چلتا ہے کہ ٹکٹ گم ہو گیا ہے اور

اُس کے ساتھ لونگ بھی۔ ٹکٹ چیکر ٹکٹ دیکھنے پر اصرار کرتا ہے، وہ جھلا کر

کہتی ہے، کنت پڑے نیرے ٹکٹ پر، خود تو مٹوا گیا، میرا لونگ بھی لے گیا)

کام شروع ہوا۔ وہی روڈ رولر کا شور، کوئٹا رکاوٹوں، پتھر کی دیوڑھاک پڑاک،

پھاڈوڑوں کی رگڑ رگڑ، پھوارے بدلتے ہاتھ، پھلتے بھاگتے پاؤں، دھول میں اٹے چہرے، میل میں لتھڑے

پنڈے، کوئی ٹھکے، کوئی کھڑے، کوئی ننگے، کوئی ڈھکے، کوئی چوکس، کوئی سُست، کہیں ہنسی خوشی

تہکار، کہیں جانی بوجھی تہکار۔۔۔۔۔ سخت دھوپ میں محنت کا ایسا گلزار ہے تفصیل سے بیان کرنا تو درکنار

اُس کا تصور بھی مشکل ہے۔ میں نے سات رنگوں، سات سوادوں، سات سروں اور سولہ سنگاروں کی بات

سُنی تھی اور یہی تمثیلِ انسانی زندگی کے عمل و اسلوب کی مکمل تفصیل سمجھی تھی، لیکن محنت کے اتنے رنگ بُپ ہیں کہ انہیں نام دینا تو ناممکن ہے گنتا بھی ناممکن ہے۔ دوپہر نہ ہوئی تھی کہ میری گھسی ہوئی پوروں نے منہ کھل دیئے۔ وہ ہنسنے لگیں اور درد سے چلانے لگیں۔ میں اُن سے ہمدردی جتلاتا تو میرا کام متاثر ہوتا اور وہاں کام سے زیادہ پیاری چیز کام تھا۔ کام پیارا نہ کہ چام، یہ محاورہ کسی نے ایسی ہی صورتِ حال میں گھڑا ہو گا۔ وہ کام ایسا منظم سلسلہ تھا کہ ہر کامگار زنجیر کی کڑی کی طرح تھا۔ ایک کا ٹوٹنا سلسلے کا درہم برہم ہوتا تھا۔ ایسا ہوا ہی چاہتا تھا کہ بستی نے میرے ٹوٹنے کے کرب کو بچان لیا۔ اُس نے تسلسلہ پھینکا، میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور دونوں طرف کے کامگاروں کو وقت نبھانے کو کہا۔ مجھے بُری طرح زخمی دیکھ کر وہ اُس ماں کی طرح چلائی جس کا ننھا اپنی نادانی سے خود کو مشکل میں ڈال لے۔ اُس نے میرے ہاتھ جوئے، دو پٹ پھاڑ کر زخموں پر بیٹیاں باندھیں اور تین پیرامی زنجیر کی کڑی بن گیا۔ اُس کے لگاؤ میں دُہی سرو کا رتھا جو شفیق ماں کو بیمار بچے سے ہوتا ہے۔ میں اُس کے حسن سلوک سے بہت مرعوب ہوا۔ میری زبان نے ایک بار اور دل نے سوار اُس 'زرس ماں' کا شکریہ ادا کیا۔ وہ پیتاں، ہمدردی کا ایسا پچھل تھیں، جسے میں نے پہلی بار چکھا تھا۔ فرط جذبات کہوں کہ تحسین جذبات میری آنکھیں بھر آئیں۔ جہاں ایک درد سویا وہاں دُوسرا جاگ پڑا جسے میں نے زخموں کے رفو میں پایا تھا۔

میں اپنے قارئین سے معافی چاہتا ہوں! میں نے جن لوگوں کو کٹھ پتلیاں کہا ہے وہ حقیقی معنوں میں انسان تھے اور جاہل ہو کر اُن تہذیبوں کے ترجمان تھے جو دردمند دل ہی میں جُٹ لے سکتے ہیں۔ اُن کے سخت ہاتھ، نازک لمس کے سرچشمے تھے۔ آنکھیں بظاہر طاقِ نسیاں تھیں لیکن حقیقت میں احساس کی پٹاریا۔

دوپہر ہوئی، کام بند ہوا اور وقت دُہی منظر دہرانے لگا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ صرف ایک بات فنی تھی، میں اپنے زخموں کو دیکھ رہا تھا۔ میں سویرے سے نہار مُونھ تھا اس لئے جھوک کے خنجر کی دھار تیز تر تھی۔ میں اپنی محرومی میں غربت کی دست درازی پر دل ہی دل میں تبصرہ کر رہا تھا کہ میری نظر کے سامنے رنگ ہی رنگ لہر گئے۔ میں حیران ہو کر اٹھا اور اپنے سامنے بستی کو کھڑا پایا۔ آگے وہ میرے زخموں کا مرہم بن کر آئی تھی اور اب میرے پیٹ کے درد کا درماں لاتی تھی۔ اُس کے سراپا ہمدرد رویے نے اُس کے نام کے معنی ہی بدل دیئے۔ وہ شکیل کے لغوی معنوں سے زیادہ شکیل تھی اور فیاض سے بڑھ کر فیاض۔ وہ میری بے کسی کو سہارا دے کر جلی گئی اور میرے گرد وہ فضا پیدا کر گئی جو روٹی کی خوشبو سے زیادہ دل پزیر تھی اور روحانی احساس سے بڑھ کر لطیف۔ اُس کی ایک نسوانی ادا، روپ، پیار اور ممتا کے کئی قریبے لُٹھائ گئی اور مجھے مسرور بنا گئی۔

میں اُس روٹی کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ چکا ہوں جو میرے اس نئے تجربے کی روشنی

میں بالکل غلط ہیں۔ وہ روٹی، لکڑی کی طرح سخت تھی اور نہ ہی بے مزہ مواد ! اُسے کھا کر مجھے اور روٹی کی تمنا ہوئی تھی۔ قارئین ! روٹی جیسی بھی ہو، اپنے مخصوص ذائقے سے بھرپور ہوتی ہے ! اُس کی نفاست کی لطافت بھوک کی شدت پر ہے نہ کہ اُس کی غذائیت پر۔

## باب ۴۵

نقصان میں جب تجزیہ ذات کرو، کچھ عقل کو بھی شامل جذبات کرو  
رونے سے ٹھہر جائے گی ہر ساعت غم، اس طرح نہ تم ماتم حالات کرو (شاہ)  
کچھ دنوں میں روڈ بلائنگ کا کام ختم ہو گیا اور میں شاخ سے ٹوٹے پتے کی طرح بھٹکنے لگا۔ ایک دن میں گھری میں تھا کہ لاجھ سنگھ کا دوست، ڈرائیور گربخش سنگھ آیا۔ اُس کے ساتھ صاحب سلامت ہو رہی تھی کہ ایک جوان لڑکی آئی اور دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

”ارے باہر کیوں کھڑی ہے؟ اندر آ۔ کوئی غیر تھوڑا سی ہے، تیرا دلیر ہے۔“ اُسے مدعو کرتے ہوئے اور مجھے اُس سے متعارف کرواتے ہوئے گربخش سنگھ نے بے تکلفی سے کہا۔  
میری بھابی نے پائل کی جھنک کے ساتھ دلیز پر پاؤں رکھا، مسکرا کر میری طرف دیکھا، ہاتھ لگے جھپٹایا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس کا انداز بے تکلف سے زیادہ بے باک تھا۔ میری رگ جال میں شعلہ سا کانپ گیا۔

بہت خوب ! اسے ست سری اکال بلا، یہ تیری بھابی ہے۔ گربخش سنگھ طنز آمیز سنجیدگی سے بولا جیسے وہ اپنی بیوی کے بیباک رویے پر نکتہ چیں ہو اور اُس رشتے میں تکلف کا آرزو مند۔  
میں نے اُس کے طرزِ مخاطب سے اثر نہ لیا۔ وہ جھٹکے باز آدمی تھا اور اُس کا بردباری سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ جیسی باتیں کرتا تھا انھیں برداشت کرنے کے لئے بے شرعی درکار تھی۔ وہ اپنے اندازِ بیان پر اتراتا تھا، ”کوئی حاملہ عورت میری اصل بات سُن لے تو محلِ گراوے۔“

وہ بیس سال سے شادی شدہ تھا لیکن بے اولاد تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ہاتھ پن کی وجہ بیان کرتا تھا، ”زمین کتنی ہی زرخیز ہو ! اُس میں کتنا ہی بڑھیا بیج بیجو ! اُس میں روز بھل چلانے سے بیج نہیں آگتا۔“

بچے، آدمی کی کمزوری ہیں۔ کوئی اُس سے ہمدردی جتلاتا تو وہ اُس کا منہ چڑا دیتا، ”بچے اچھے

ہیں ! لیکن وہ جو نو حینے پیٹ میں بہتے ہیں، اچھا نہیں کرتے ! اتنے دن گزرنے پر بخش سنگھ کہاں رہے گا ؟ حیرت کی بات یہ ہے کہ لاہور سنگھ جیسا کہ آمیز آدمی بھی اُس کا آدر بھاؤ کرتا تھا۔ وہ لاہور سنگھ کے لئے ایک کیلنڈر لایا اور کمرے میں لٹکادیا۔ کیلنڈر میں نیم عریاں انگریز حینے کی تصویر تھی جو ریلے لیڈی سائیکل کے سہارے کھڑی تھی۔ اُس نے اعتراض کیا، ”گزن بخش سنگھ نے دھڑلے سے کہا، ”برادر، تم اکیلے تنے بہتے ہو ! اسے دیکھو گے تو کچھ ڈھیلے رہو گے۔ لے انگریز قوم کچھ تیرے نصیب“

بھابی چھم سے اندر آئی، دونوں ہاتھوں سے قمیض کی پٹیٹھا اٹھائی اور دھم سے بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا بوجھ ہاتھوں پر لیا اور مجھے ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، کیا حال ہے ؟ اُس کا سارا چہرہ ہونٹوں میں سمٹا ہوا تھا جو اچھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ”دو پیڑ کا ندھوں سے سرک کر ہاتھوں پر گر پڑا لیکن اُس نے اسے وہیں رہنے دیا۔ مجھے لگا کہ ننگا سینہ مجھے لٹکار رہا ہے، میں یہاں کھڑا ہوں، تیرے سامنے ! تو میرا کیا بگاڑے گا ؟“

بھوٹے بھائی، زور کی پیاس لگی ہے۔ کیا گرمی ہے ! دلی، ہندوستان کا ملتان ہے ! گزن بخش سنگھ نے میرے کا ندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اُس کی بات سن کر بھابی مسکرائی۔ اُس کے ہونٹ کنپٹیوں تک پھیلے اور دانت کوندے کی طرح پک گئے جیسے وہ اپنی جھلک دکھانے کے لئے اُسی لمحے کے انتظار میں تھے۔ میں نے بالٹی میں سے پانی کا گلاس بھرا اور گزن بخش سنگھ کو دیا۔ اُس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے مجھ سے سوال کیا، تجھے معلوم ہے کہ میں ملتان کا رہنے والا ہوں ؟

ملتان میں کیا خوبی ہے ؟ میں نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جیسے سوال اُس نے کیا ہو۔ وہ اٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک ہاتھ سے نموں کو تھاما، دوسرے سے کرتے کے اوپر سے انگلی کی کٹھیاں پکڑ کر باری باری نیچے کھینچیں، پچھایا دُرست کیا اور پھر کرتے پر جھٹکا دیا۔ اُس کی دبی دبی سی چمھاتی ایسے ابھری جیسے برسات میں دھرتی میں سے کھمبی پھوٹتی ہے۔ مجھے متوجہ بنا کر وہ مسکرائی، ”مسکراہٹ پہلے سے زیادہ دل نواز تھی جب وہ اندر آئی، پچھلتے ہوئے گالوں سے پتا چلتا تھا کہ پسینہ پھوٹنے کو ہے، اب ماتھے، اوپر کے ہونٹ اور ٹھوڑی کے پاس باریک قطرے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ کمرے کی گھٹن سے بے آرام تھی لیکن اُس نے شکایت نہ کی تھی۔ اپنی مانگ بٹی کو بچانے کے لئے وہ پسینہ پونچھنے سے پرہیز کر رہی تھی اور دوپٹے کے سرے سے پتکھے کا کام لینے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ زردیدہ نگاہ سے کیلنڈر کو دیکھ رہی ہے اور کچھ خیال آرا سی ہے۔ میں بہک گیا اور سوچنے لگا کہ اگر بھابی چولی اور کاجھی پہن کر کھڑی ہو جائے تو انگریز حینے کے مقابلے میں کیسی لگے ؟ اتنے میں گزن بخش سنگھ نے مجھے کا ندھے سے ہلایا اور کہا، ”ملتان

میں آدمی نہیں تحفے رہتے ہیں !

چہار چیز آست تحفہ ملتان  
گردو گرما ، گدا و گورستان

آدھواں کا پانچواں تحفہ ہے ، گرجن سنگھ ! اُس کے ساتھ ہی اُس نے پانچ کانٹ میرے ہاتھ میں تھمایا اور محکم دینے کے سے آواز میں کہا - ”بھاگ کر تین بوتل کوکا کولا لے آؤ ، دلی میں ملتان اسے کہتے ہیں۔“

میں دکان کی طرف چلا ، وہ دروازے میں کھڑا ہو کر اُن پتوں پر چلایا جو اُس کی بلیک اوٹن کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہے تھے ، بھاگوں سے ! عورتیں ، سڑک کی جانب منہ کر کے نیچے جنتی ہیں جی جی تو گھروں کی بھیڑ ، سڑکوں میں نظر آتی ہے۔ اُس کی ڈانٹ سُن کر نیچے ادھر ادھر بھر گئے۔ میں اس خیال سے خوش تھا کہ میرے پاس کار دالے مہمان آئے ہیں۔ کار کے قریب سے گزرتے ہوئے ، میں نے اُس پر گرے نیم کے پتوں کو جھاڑا اور اُن پتوں پر خفا ہوا جو کار کی دوسری طرف دیکھے بیٹھتے تھے۔ میں اندر ہی اندر گرجن سنگھ کی رفت پر ناز کرنے لگا اور لاجھ سنگھ کو بُرا بھلا کہنے لگا جو آٹھ آنے کا ٹی گھڑا نہ خرید سکتا تھا۔ اُسی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لاجھ سنگھ سپروائزر تھا ، کار پشتر تھا۔

اُن دنوں دلی میں کوکا کولا کی دھوم تھی۔ میں نے کوکا کولا پیانا تھا لیکن اپنے خیال میں اُس کی بڑائی کا قائل تھا۔ کوکا کولا پینے کے پہلے امکان پر میں کئی یادوں سے گزر گیا۔ ہریانہ میں سوہنا سوڈا واٹر ورکس ، کی دھوم تھی۔ دُسرہ کے میلے میں وہ اپنی دکان ، ٹال کے برابر لگاتا تھا جس سے ٹال کو اوٹ ہوتی تھی۔ اُس خسارے کو وہ یوں پورا کرتا تھا کہ سنگترے ، مالٹے ، ججیر ، گلاب --- وغیرہ کی بوتلیں ، ہمیں مفت پلاتا تھا۔ وہ گولی دالی بوتلیں ، کوکا کولا کے برعکس نہایت پیاری سیٹی کے ساتھ کھلتی تھیں ، خوش ذائقہ بھی تھیں لیکن اُن کی شہرت ہریانہ کی حدود سے باہر نہ تھی۔ سوٹر سنگھ کے کہنے کے انوسار کوکا کولا ، امریکہ کی ٹاپ کلاس ڈرنک تھی اور دنیا گیر شہرت رکھتی تھی۔ وہ کوکا کولا کو لطیف لہجے میں کولا کہتا ، چٹنارا بھرتا گویا تہان میں چھپے ہوئے پرانے مزے کی تجدید کرتا۔ میں نے اُسے کوکا کولا پیتے دیکھا نہ تھا لیکن اُس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ اُس کی نفاست پسندی کوکا کولا پر ختم ہے۔

آدمی کا جذبہ خود آرائی ، عزت نفس کو اُبھارتا ہے اور اُسے اپنی ہانکے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر عہد کے پیچھے ہی نفسیات کا فرما ہے جو اُسے مکمل طور پر مرنے سے روکتی ہے اور بوقت ضرورت اُس کا احیا پوری تندہی سے کرتی ہے۔ میں بھی ہریانہ میں پئے ہوئے مشروبات کی تعریف کرتا۔ وہ مجھے جھڑکتا ، چل ہٹ ، کہاں امریکہ ! کہاں ہریانہ ! وہ کوئی پروڈکٹ ہے ؟ کوکا کولا میں امریکن میڈ ایسن ہے اور

فلٹرڈ واٹر۔ جس کا نام تو لیتا ہے اُس میں ہریانہ کے جوہڑوں کا پانی ہے۔ میں کس نفسی سے خاموش ہو جاتا اور وہ میری خاموشی سے فائدہ اٹھا کر کہتا، یہ ہندوستانی! انھیں اپنے نام کے ساتھ انگریزی نام جوڑنے کا پاگل پن ہے۔ انگریز چلے گئے اور اپنے دوغلے بچے پیچھے چھوڑ گئے۔ سوہنا سوڈا واٹر اور کس نام ہی سے ملاوٹ ظاہر ہے۔ جیسے انگریزی خالص زبان ہے ویسے ہی انگریزوں کی بنائی ہوئی چیزیں۔

میں اکیلے میں امریکن ایسنس پر غور کرتا۔ امریکن لڑکیوں کے سنہری بالوں اور شکر فی رنگ کی طرح وہ نام واقعی خالص اور دل فریب تھا۔

اُن دنوں دلی میں پیپسی کو لاکا بولٹنگ شروع ہوئی تھی۔ اُس کی مقبولیت بڑھانے کے لئے چمکتی چمکتی دو شیرائیں اُسے مفت بانٹا کرتی تھیں۔ وہ ایسا تنگ لباس پہنتی تھیں جو اُن کے اعضا کی دلکشی بڑھا کر شہوت خیزی کی حد تک پہنچا دیتا تھا۔ اُن کے سینے کی گھاٹیاں اور کمر کی وادیاں، وہ عشرت گاہیں تھیں جہاں پوری عمر ایک کروڑ میں بسر کی جاسکتی تھی۔ میں اپنے جذبات اُن کے ساتھ بانٹنے کے تیار رہتا تھا لیکن اُن کی دعوت انکار طلب کی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا تھا۔ جہاں کہیں اُن سے ملاقات ہوتی، میں اپنے شوق کو ہوا دینے کے لئے اُن سے وہ مشروب لے کر بیٹا۔ صاحبِ ذوق کہتے تھے کہ پیپسی کو لاکا کے مقابلے کی چیز نہیں ہے۔ نہیں ہوگی! میں کون سا پارکھی تھا! لیکن یہ میرا راسخ یقین تھا کہ کو لاکا کتنا ہی لذیذ و نفیس ہو اُن حسینوں سے بہتر چیز نہیں ہے۔ اُن سے بوتل لے کر میں اپنے تصور میں کھو جاتا اور زیر لب گنگنا تا،

ماں دیئے بند بوتل

تینوں دیکھیاں نشہ چڑھ جاوے

(اولر کی! تو کس ماں کی بند بوتل ہے!؟ تجھے دیکھتے ہی نشہ چڑھ جاتا ہے)

اُن کی دید میری خواہش تھی۔ میں جوں ہی بستر پر لیٹتا، اُن حسینوں کا خیال میرے اعضاء میں خوشگوار حرکت بھر جاتا۔ وہ حرکت، حرارت میں بدل جاتی اور پھر کسی نہ کسی حسینہ کا روپ دھار کر لیتی خاص کر اُس کا، جس کا جو بن گھبتا ہوتا۔ میں اُس کے جاں گداز ہاتھوں سے بوتل لیتا اور جان بوجھ کر انگلیاں انگلیوں سے چھوٹاتا اور مطمئن ہوتا۔ تصور، امید کو منتشر کر کے زندگی سے معذور کر دیتا ہے۔ میری امید میری نفسانی تسلی کو پہنچتی اور خواب کا مزہ دوچند کر دیتی۔

میں نے مکان پر سائی دی، کو لاکا اور چابی لی اور اپنے مہمان کی خوشنودی کے لئے بھاگتا ہوا واپس آیا۔ دُور ہی سے دروازہ بند دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا اور نیم کے سائے میں کار کے سہارے کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ میں کو لاکا کی دل فریبیاں بھول گیا اور کمرے میں منائی جانے والی رنگ رلیوں

کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جتنی دیر وہاں کھڑا رہا، میری آنکھیں دروازے کی دراڑ میں بنی رہیں۔ دروازہ کھلا اور میں بوتلیں لئے پہنچا۔ اندر داخل ہوا ہی تھا کہ گرج بخش سنگھ مسکرا کر بولا، بڑی دیر کر دی! اجمل خان روڈ سے لائے ہو کیا؟ لاؤ! بیاس، آگ کی طرح لگی ہے۔

میں شاید چپ رہتا لیکن اس کی دیدہ دلیری سے مجھے زبان مل گئی، میں کب سے باہر کھڑا ہوں! دروازہ بند تھا۔

بھابی، بچی ہوئی مرغی کی طرح بستر پر بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھوں سے جو کچھ سنوار سکتی تھی، سنوار رہی تھی۔ مجھے جلنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لڑکی اس کی بیوی نہ تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بوتلیں چادر پانی پر رکھ کر دروازہ بند کرنے لگا۔

ارے! یہ کیا؟ گرج بخش سنگھ نے مجھے روکا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے کار میں جا بیٹھے اور چلے گئے۔

میں دروازے میں کھڑا رہا جیسے کسی کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ سبھولی پور آتی دکھائی پڑی۔ میرے زنا کار خیال کی انتہا! مجھے لگا کہ وہ میرے پاس آ رہی ہے۔ اسے متاثر کرنے کے لئے میں نے کوکا کولا کی بوتل اٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اس نے سرسری طور پر میری طرف دیکھا اور میں عاشقانہ انداز میں مسکرایا۔ وہ میری مسکراہٹ لوٹائے بغیر آگے بڑھ گئی۔ میں نے اسے کوتاہ ہیں اور دقیا نوسی کہا اور پھر اس کا منہ کی یاد میں کھو گیا، جس کی ہبک کمرے میں رسی بسی تھی۔ میں نے جانچ کر اپنی نشست اسی جگہ جمائی جہاں وہ بیٹھ کر گئی تھی اور اڑتی ہوئی تسکین پائی۔ اس خیالی لمن سے مزہ لیتے ہوئے، میں نے بوتل کھولی، چابی پھسل گئی۔ میں نے دوبارہ چابی لگائی، چابی پھر پھسل گئی۔ مجھے بوتل کی سرکشی پسند آئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور احتیاط سے چابی ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ بوتل بھکے کھلی، مجھے یوں تسلی ہوئی جیسے میں نے کسی خود سر چیز کو زیر کیا ہو۔ بوتل کھلنے کی آواز، دل رہا تھی۔ میری اداکار فطرت نے اس کی طرح اڑانی چاہی۔ میں نے منہ میں اٹنگلی گھسائی اور گال پر دباؤ دیتے ہوئے باہر پھسلائی۔ اس سے جو لے پیدا ہوئی وہ بوتل کی آواز سے تصور آفریں تھی۔ کوکا کولا ویسے ہی گلا خراش تھا جیسے پسی کولا، مجھے زیادہ پسند نہ آیا۔ باقی کی دو بھری بوتلیں، میں دیسے ہی دکان پر لوٹا کر بقایا لے آیا۔ مجھے لگا جیسے وہ روپے میری معاونت کا انعام ہوں۔

لاجھ سنگھ آیا، میں نے اسے گرج بخش سنگھ کے بارے میں بتایا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میری صداقت پسندی میں سو فیصدی رقابت کا رفرما تھی۔ اگر اس لوٹ میں میرا حصہ ہوتا، میں اس واقعے کو راز ہی میں رکھتا۔ وہ تھیلی کی پشت پر سے چند ٹال بال اکھاڑ رہا تھا۔ میری بات سن کر اس کے



بال اکھاڑنے کی رفتار تیز ہو گئی جیسے وہ اپنا غصہ اُن پر نکالنے لگا ہو۔ وہ رُکا اور مجھ پر نیلا بیلا ہونے لگا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میری بزدلانہ خاموشی میرے کام آئی اور بات اتنی ہی بڑھی جتنی اُس نے بڑھائی۔

جو ہوا سو ہوا، آئندہ ایسا ہوا تو مجھ سے بُرائیں! اُس نے فہمائش کر کے چپ سادھ لی اور میں نے اُسی میں خوش قسمتی سمجھی۔ لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ کم ظرف کا اعتبار کرنا، نہ کرنا برابر ہے، وہی بات ہوئی۔ کچھ دیر آرام کر کے وہ نہانے کے لئے اُٹھا اور الگنی پر سے تولیہ اُتار کر اُسے اُس چوکسی سے سونگھنے لگا جو موتے سے پہلے کتے کی ہٹ ہوتی ہے۔ میرا خوف ابتدائی مراحل ہی میں تھا کہ اُس نے ناک منہ سکڑا، تھوکا اور تولیہ سڑک میں پھینک دیا اور پھر میرا سامان۔

## باب ۴۶

اخلاص کی افراطِ کسے ملتی ہے! یہ عُمدگی ذات کے ملتی ہے!  
تقدیر سے مل جائے جسے مل جائے، یہ لذتِ سوغات کے ملتی ہے! (شاہ)

وہ سڑک پھیل کر دلی بن گئی جو میری آشنا ہو کر بھی نا آشنا رہی۔ میرے لئے ہر چہرہ اجنبی تھا اور ہر قدم اجنبیت کا احساس۔ مجھے وہ راستے یاد آئے جو میرے بچپن کے ہم راہی تھے اور دُکھ سکھ کے ساتھی، میری خوشی میں میری بڑھوتری تھے اور میرے غم میں میری دل جمعی۔ میں اُن پیرے ساتھیوں کے لئے اُداس ہو گیا جن کے سامنے میں اپنا دکھ اُردا تھا اور دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ میں اُن درختوں کی آرزو کرنے لگا جن سے لیٹ کر میں اپنی ڈھارس باندھتا تھا۔ جن کی دید، قاطع یا س تھی اور اُمید کا سرگم۔ زبان دراز اور ظالم انسانوں سے بچ کر، میں اُن بے زبان غم خواروں سے ملتا تھا، انہیں بوجھل دل سے دیکھتا تھا اور اُن سے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہتا تھا۔ لابیو سنگھ نیچ سا نیچ تھا! اُس نے سڑک میں رات گزارنے تک کی اجازت نہ دی جیسے وہ اُس کی جاگیر تھی۔ زیادہ قریب سے دیکھنے سے خط و خال دھندلے لیکن رشتے نالتے صاف دکھائی دیتے ہیں اور عین متعین بھی ہوتے ہیں۔

اُس محلے میں کرتار سنگھ، سومتر سنگھ اور جگت سنگھ رہتے تھے۔ میں سامان اُٹھائے اُن کے پاس پہنچا۔ پہلے دولوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جتنے رقبے میں رہتے تھے، وہی جانتے تھے کہ کیسے؟ جگت سنگھ کی بیوی جا پے جتنے کے لئے پنجاب گئی ہوئی تھی

وہ کوئی ناخن نہ کٹے بغیر مجھے ٹھہرانے کے لئے راضی ہو گیا لیکن دو ٹوک سنا بھی دیا، میرے ساتھ رہنا ہے تو اٹھا کر ایہ بیعانہ دینا ہوگا۔

جگت سنگھ کا مکان کیا تھا؟ ایک جھوت تھی جس کے اوپر چھت ڈال کر دروازہ لگایا گیا تھا۔ اس مکان کی صورت حال جیسی بھی تھی پہلے سے ابھی تھی۔ اُس نے سارا سامان چھت، دروازے، دیواروں، شلفوں اور کھونٹیوں پر لٹکایا ہوا تھا جسے اُتارنے اور لٹکانے کے لئے آنکڑے والا ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ حسن ترتیب اور صفائی کی وجہ سے وہ چھوٹا سا رقبہ بڑا لگتا تھا۔ اُس کی ایک دیوار پاخانہ سے سا بھی تھی۔ بڑے تڑکے محلہ جاگ پڑتا اور وہاں سے کھانسنے، کھنکارنے، تھوکنے، سینکے اور چھپڑ چھپڑ کی آوازیں آنے لگتیں۔ ایک آواز بند ہوتے ہی دوسری آواز ایسے ابھرتی جیسے پہلی کو دوسری نے دبوچ لیا ہو۔ اُس پاخانہ کی ایک بات بڑی دلچسپ ہے۔ سومتر سنگھ قبض کا شکار تھا۔ وہ رفع حاجت کے لئے جاتا ہوا اپنے ساتھ اخبار لے جاتا۔ جو کوئی شدید حاجت میں مبتلا ہوتا، وہ دروازہ دھڑ دھڑ پیٹتا اور چلاتا۔ سومتر سنگھ چپ چاپ، باہر نکل آتا اور اخبار پڑھتا ہوا قطار کے آخر میں جا کھڑا ہوتا۔ لاجبہ سنگھ کے مکان میں بدبو بھی آتی تھی جب ہوا، کھال کنڈوں کی سمت سے چلتی تھی۔ یہاں بدبو لگتا تھا لیکن قدرے کم تھی۔ ہر وقت ناک دلبے رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے باوجود میں خوش تھا کیوں کہ وہاں آتے ہی میرا دل دڑ چلا گیا۔ جگت سنگھ نے مجھے اپنے دوست سچا سنگھ کے پاس ترکھان کے کام پر لگوا دیا۔ کام کا اڈہ بڑے نلے کے پارست نگر میں تھا۔ سارے کاریگر مجھے گھورنے لگے جیسے طویلے کے پُرانے مویشی نے اضافہ کو دیکھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں عداوت و مخالفت کی ملی جلی جھلک تھی جو کسی کے حلقہ اختیار میں مداخلت کا ردِ عمل ہوتی ہے۔ اس کام کا رواج ہے کہ کام پر چڑھنے سے پہلے کاریگر اوپرے کپڑے اتارتے ہیں۔ میں اس صورتِ حال سے پہلی بار دوچار ہوا تھا۔ میں جھپکتا ہوا کھڑا رہا، وہ مجھے تاڑنے لگے جیسے میں تنکا تھا اور وہ کپڑے پہنے ہوئے۔ اُن کی خاموش طنز کی بے باکی نے مجھے کمزور بنا دیا اور میں شرم سے سُکھ گیا۔ میری غیر ضروری تاخیر سچا سنگھ پر گراں گزری۔ اُس نے جھڑکا، ”تو یہاں تماشا دیکھنے آیا ہے کیا؟“ میں نے چاروں چار کپڑے اتارے۔ کاریگروں کی سفاک تہ میں نگاہیں! ہر نام سنگھ نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا، واہ، کیا مال ہے! میں خون پی کر رہ گیا۔ میری حالت اُس معنی کی سی تھی جو بھیتریوں میں گھر جائے۔

میں اڈے پر بھاڑو دے کر، برادے سے چھپٹی رول کر جدا ڈھیر لگا رہا تھا کہ سچا سنگھ تنگ مزاج برہمی سے بولا، ”جلدی کر! کیل، پیچ لے تو اُسے ڈبے میں رکھ اور جلدی کر۔ کام سے چپک

”نہیں جلتے۔“

جب تک میں خطیایا ہوا مال اٹھا کر اُڑے پر لایا ، وہ تیغ تیز کر کے رندے میں رکھ چکا تھا اور اُسے ادھر ادھر بیٹھا ہوا ، اُس کا دم دُورست کر رہا تھا۔ چوکھٹوں کے پاتام رندے کا منصوبہ تھا ، میں رندے کے آگے اور وہ پیچھے جٹ گیا۔ وہ کاندرھے اور اڑیاں اوپر اٹھا کر رندے پر دباؤ ڈالتا اور میں اُسے کھینچنے کے لئے لڑی چوٹی کا زور لگاتا۔ رندے کا گھسا پار نہ ہوتا تو وہ میری گردن مارنے کے سے انداز میں مجھے دیکھتا۔ میرے پٹھے جیسے جیسے کستے گئے ، رندہ رکنے کے وقفے بڑھتے گئے۔ ہوتے ہوتے وقفے لگاتار ہو گئے۔ سچے کی زبان ، منہ سے اٹھ کر دل میں بیٹھ گئی اور اُس کے جذبات کی نمائندگی کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں بات ، گالی تک پہنچ گئی۔ گالی سے دست درازی تک کا مرحلہ بڑا مال کا ر تھا۔ اُس نے ڈنڈا اٹھایا اور میری آنکھوں میں تاکا۔ وہ اُس کی تندی کی تاب نہ لاسکیں اور جھک گئیں۔ کاش ! وہ اپنی بزدلی کا انجام جانتیں ! میں اُڑے کی رونق اور کارگردوں کی دل لگی کا سامان بن گیا۔ سچا سنگھ کے پکتنے اور برسنے میں دیر ہو جاتی تو دوسرے مجھے بدگمانی سے دیکھتے۔ ملتے ملتے وہ سارے اُس سے مل گئے۔ کیوں نہ ملتے ! ہر زبیل دوسرے زبیل کے فضل میں ملوث ہوتا ہے ورنہ وہ اُس کے بھائی چارے کا دم کیسے بھر سکتا ہے ؟ وہ مجھ پر تحقیر آمیز طعنہ کستے جیسے سچا سنگھ کے سناکارے ہوئے ہوں۔

”بڑھئی کی اولاد پڑھنے چلی ، واہ بھئی واہ !“

”باپ کے کچھے میں بُرا دہ پھنسا ہوا ہے اور میٹا انجیر بننے کے خواب دیکھتا ہے !“

”کھاتی کے ہاتھ میں کاتی چلتی ہے ، کانی (قلم) کا کیا مطلب ؟“

کیا آدمی کی اپنی بے ہودگی بھی جائے تضحیک ہوتی ہے ؟ میں کام کے کسی معیار پر پورا نہ اُتر سکا۔ جب کام بند ہوا ، میں بظاہر بھلا چک گیا تھا لیکن اندر ٹوٹا ہوا۔ میری مظلومیت ننگی ناچتی رہی تھی اور میرے اپنوں کا سامانِ راحت بنتی رہی تھی۔ میرے جذبات ، بہر کرتے ہوئے خون کے مانند کالے ہو گئے۔ میری ہر سوجھ بوجھ نفرت میں بدل گئی۔ اس بار اُس نفرت کی نوعیت الگ تھی۔ اُس کا ماخذ وہ نسل تھی جس سے میں خود کو پہچانتا آیا تھا۔ جس کا میں اٹوٹ حصہ تھا۔ ایسا اٹوٹ حصہ جو نسل در نسل مجھ تک پہنچا تھا اور کرنے والی نسل کی مجھ پر امانت تھی۔

میری ماں کہتی تھی کہ میرا کام ، میری رُوح کی لذت اور جسم کی لطافت ہے۔ لیکن میرے کام نے میرا نقشہ ہی بگاڑ دیا اور میری طاقت کا آخری کس تک نہچوڑیا۔ سارے کاریگر سائیکلوں پر سوار ہو کر آگے نکل گئے۔ میں وہیں سے واپس اُڑے پر لوٹ آیا ، اپنی کم اُصلی پر نالال برادے کے ڈھیر

پر گر گیا اور اگلے ہوئے نوالے کی طرح وہیں پڑا رہا۔ پسینہ سوکھ کر بھٹک اٹھا اور برادے کی بدبو، میری سطراند میں دب گئی۔ میں گندگی کے انبار کی طرح تھا جو اپنی فرسودگی میں زیادہ گھناؤنا اور ڈراؤنا ہوتا ہے۔ اپنے گھر میں کام کرتے ہوئے میں بارہا اس پسینے سے زیادہ ترسز ہوا تھا لیکن اس ناگواری، بدنامی، بدحواسی انتشاری سے ناواقف تھا جو اس پسینے کی مخلوق تھی۔ بدن ٹھنڈا ہوا تو ہر انگ کیل ٹھونکا ہوا سا اور ہر جوڑ، توڑ کر جوڑا ہوا لگا۔ دھرن ٹل کر اوپر چڑھ گئی اور سینے میں دھڑکنے لگی۔ میں پہلو بدلتے ہوئے دزد کے شعلے کی طرح کاہتا۔ کھینچی کی مسلسل پکڑے انگلیاں، لکڑیاں بن گئی تھیں۔ میں نے انھیں پچھایا تو ان میں لمس کا احساس آیا۔ حلق، کانٹے کی طرح، زبان، ٹھنڈھ کی طرح، ہونٹ، سریش پوتے کاغذ کی طرح اور نتھنے، انگاردن کی طرح تلک رہے تھے۔ سانس میں ریت کے ذرے ملے ہوئے لگتے تھے۔ ناف کے پاس نیل پڑ گیا تھا۔ تھے آتی تھی لیکن اتنی زخمی۔ میں گھر روانہ ہوا تو لگا لگا بغلوں میں پھالے پک رہے ہیں۔ لڑکھڑاتے ہوئے چلنے میں توازن برقرار رکھنا محال تھا۔ میری آنکھیں، اشک غم سے دھندلائی ہوئی تھیں لیکن میرے دزد کی خود انکشافی! میں اپنے انگ انگ کو دیکھ رہا تھا کیوں کہ وہ الگ الگ دزد کی الگ الگ شدت سے ترخت تھا۔

تباہی، کام کو تحریک حیات سمجھتے تھے اور انسانی زندگی کا مقدس فریضہ۔ "کام، زندگی کی حفاظت کرتا ہے اور اسے ماکس بقا عظمت رکھتا ہے۔"

لیکن کام نے مجھے تباہ کر دیا تھا۔ اُس نے مجھے جو ہریت دکھائی تھی اُس کی انتہا ناگواری تھی اور ناگواری ایسی پستی ہے جس کی بلندی نہیں ہوتی۔

میری بھوک کی آگ ہمیشہ کی طرح تیز تھی۔ وہ ذلیل بھتی ہی کب تھی! وہ آگ، اگیلی لکڑی کی چتا سماں تھی۔ شروع شروع میں وہ بھئی بھئی لگتی ہے اور پھر خوفناک الاؤ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے۔ میری حالت دیکھ کر جگت سنگھ تھپتھپ مارنے لگا۔ اس کے کٹھوپن کی تاب نہ لا کر میں رو پڑا۔ میرے گریبے اختیار نے اس کے دل پر اثر کیا، وہ کمال ہمدردی سے بولا، "اٹھ، تیری مالش کردوں! تو سویرے تک پچھیرے جیسے کلیدیاں مارنے لگے گا۔" میں مالش کر دانے کے لئے اٹھا، اُس نے نرگوشی میں کہا۔ "دیکھا بیٹا، پیسہ یوں کماتے ہیں! ایک ہی دن میں پھٹ گئی تیری! بڑا آیا میٹرک لیٹ! روز روز کی چھبٹیاں سن کر مجھے لگے لگا تھا کہ میٹرک پاس کرنا برائی بھی ہے اور جرم بھی۔ وہ مالش سے میرے اکڑے ہوئے پٹھے نرم کرنے لگا۔ میں ناقابل برداشت درد سے کراہتا اور سماجت کرتا، "تھوڑا سہولے! تھوڑا سہولے! وہ میری تکلیف کو خاطر میں نہ لاتا اور اپنے مطلب سے مطلب رکھتا۔ میری پنڈلی کی مالش

کرتے کرتے وہ نکا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا، ”تُو نیچے پڑی کنواری طرح تڑپ رہا ہے۔“  
 مجھے کنواری کا تجربہ تھا اور نہ میں اُس حالت میں تھا کہ ٹھٹھے کا لطف اٹھاتا، میں دانت  
 بیس کر رہ گیا۔ مائش کے رگڑے آدم میرے کراہنے میں وہی تھپک تھی جو رگڑے سے رگڑے میں ہوتی  
 ہے۔ میری مائش کے اُس نے میرا بیٹ ملا، دھرن کو مٹکی دے کر دُست کیا، پاؤں کے انگوٹھوں  
 میں دھرن بندھی، میرے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر مجھے اٹھایا، بٹھایا اور میری پیٹھ کو مل کر گرگایا۔  
 اُس نے پانی گرم کر کے اُس میں نمک لایا، مجھے نہلایا، بستر پر لٹایا، لحاف اُڑھایا اور یہ کہہ کر چلا گیا  
 ”یوں ہی بیٹے رہنا، میں گیا آہ کیا!“

میں نے پہلو بدلا، مجھے نکا کہ میں پہلے سے قدرے آرام دہ ہوں۔ وہ ہوٹل سے میرا کھانا  
 لایا آہ بازار سے آؤ ڈکس کی شیشی۔ اُس نے مجھے لحاف ہی میں بیٹھے بیٹھے کھانا کھلایا، نیم گرم پانی  
 پینے کو دیا آدم میرے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر پوچھا، ”کیوں، کیا لگ رہا ہے؟“  
 پہلے سے ٹھیک ہوں!“ میں نے احسان مندی سے کہا۔  
 ”اے، تو سویرے دیکھنا! اب اس سے مائش کروالے ذرا۔“  
 اُس نے میرے گال پر پچلی بھر کر آؤ ڈکس کی شیشی کھولی۔

میں پسینہ پسینہ ہوتا تھا۔ اُس نے میرا پسینہ پونچھا اور آؤ ڈکس کی مائش کر کے میرا انگ  
 اُٹک گرایا آدم مجھے لحاف میں گھسایا۔ منی کا جنس اور اُس پر لحاف کا سرپوش، میں ساری رات  
 پسینے میں بھیگتا رہا، سویرے اٹھا تو کسی حد تک ٹھیک تھا۔ میں محنت زدہ نے دھاڑی نہ توڑی،  
 کیسے توڑتا! میری دھاڑی مجھے میرے فلقے سے ایسے جدا کرتی تھی جیسے صبح، رات کو دن سے۔

## باب ۴۷

دانے میں نہاں دام نظر آتا ہے، آزاد بھی ناکام نظر آتا ہے  
 (شاہ) دل جہم کے جذبے سے اگر عاری ہو آغاز ہی انجام نظر آتا ہے

شریر میں پہلے دن جتنا بیل نہ تھا۔ کام صبح ہی سے ڈھیلارہا اور سچا سنگھ ٹوکھا، اکھڑا  
 آدم گسا ہوا۔ اُس کی بد زبانی مستقل صورت اختیار کر گئی۔ کام کا دباؤ اس قدر زیادہ تھا کہ کسی عمل  
 کے دوران پسینہ پونچھنا، کام روکنا تھا۔ فضا پر گھس کا دور دورہ تھا اور اعضا، چشم گریاں کی طرح

برس رہے تھے۔ میں اُسی وقت ناک صاف کرتا جب لگ بھگ چھینکنے کے قریب ہوتا۔ میری صفائی پسندی میری لعنت تھی۔ میرے ساتھیوں کی ناک بہتی تھی اور وہ مضطرب ہوئے بغیر کام میں مصروف رہتے تھے، لیکن ویسی حالت میرے لئے عذاب سے کم نہ تھی۔ سر کا پسینہ، ماتھے کے پسینے سے مل کر سیڑھ کی طرح بہتا اور دیدوں میں نمک بھرتا۔ رُومال میرے پاس کہاں تھا! میں نے قیض سے کام چلایا جو شام تک ایسے ہو گئی جیسے گندی نالی میں لت پت کوئی شے۔ آڈے سے رگڑ کھا کھا کر میرا کا چھا پھٹ گیا۔ بغل گند، پسینے کی بدبو سے زیادہ گھناؤنی تھی۔ وہی حالت میرے چٹّوں کی تھی۔ میرا سر چیونٹیوں کا بھون تھا جسے میں کھلاتا نہ تھکتا تھا۔

”پڑھائی لکھائی میں کیا دھڑلے؟ کاریگر کے بیٹے ہو، ہنر سیکھو!“ بھائیاجی کا یہ جملہ جسے میں متعصب اور لمخون ذہن کی پیداوار سمجھتا تھا، مجھے بالکل ٹھیک لگتا۔ میری غلطی کی درستی ممکن نہیں تھی۔ میری نجات کی ایک ہی سبیل تھی، بھیلو، بھیلو، بھیلو اور یہ طریق عمل صبر کرنا تھا۔ نامساعد حالات سے لڑنے کے لئے آدمی میں اخلاقی جرأت ہونی چاہیے یا کسی ساتھی کی پشت پناہی۔ پہلی کا مجھ میں فقدان تھا اور دوسری کا عالم زوال تھا۔ سچا سچ مجھ سے وہ ہمدردی تھی جو قصائی کو بکرے سے ہوتی ہے۔ اپنے حالات کو قابل تسلیم بنانے کے لئے میں اس کام میں دلچسپی لیتا لیکن سچا سچ کی بدکلامی میری بے دلی اور بے زاری کو ابھارتی۔ میں اپنی رسوائی اور بدنامی میں اس ہنر میں لذت اور عظمت تلاش کرتا۔ مجھے لگتا کہ اس ہنر میں بصیرت ہنر کم اور وحشت ہنر زیادہ ہے۔ اس مشقت میں راحت ہوگی لیکن میری آزر دگی اُسے مجھ پر ظاہر نہ ہونے دیتی۔ میں اس ہنر سے نفرت کرتا اور میرا منفی رویہ میری ہمت کی شکست ہوتا۔ میری حالت گلیا بیل کی سی تھی جو کام اپنے ساتھ جتنا ہی کرتا ہے لیکن ڈنڈے اور گالیاں اُس سے کہیں زیادہ کھاتا ہے۔ جب تک دوسرا کام نہ ملے اُس وسیلہ روزگار سے کنارہ کشی حماقت تھی۔ میرے جسمانی آزار پوری طرح کم نہیں ہوئے تھے کہ مجھے سُدے پڑنے لگے۔ رفع حاجت کے وقت لگتا کہ آکسٹریاں، پیٹ سے ٹوٹ کر گر رہی ہیں۔ میری ماں نے لاجھ سچھ کے لئے دو سیر گھی بھیجا تھا جو میں نے اُسے دیا نہ تھا۔ وہ اُس آڈی (مصیبت) میں کام آیا۔ میری جسمانی حالت نے موڑ پر تھی۔ ہاتھوں کے چھالے بھر چھوٹ کر گئے بن گئے۔ ہاتھ پر ہاتھ رگڑنے سے ہاتھ کھڑکھڑکتے جیسے اپنی نئی کیفیت کا دعویٰ کرتے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہر بند اپنے انداز میں بگڑ کر سنور گیا۔ گالوں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئیں اور چہرے کی قوسیں بیضوی، تنھ پتلے ہو گئے اور ناک کا بانسا اونچا، بھرے بھرے نرم ہونٹ تیکھے اور سخت ہو گئے، چہرہ زیادہ فانا ہو گیا اور گورا چمکیلا رنگ، گندم کی ٹھس جڑا لایا۔ میری مکر

کے گرد گھری لیکر ابھر آئی جو صحت مند جسم کی نشانی ہوتی ہے۔ وزن کم ہوا، ڈھیلا ماس کھنچ گیا اور  
میں ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اُن کل جزویات کا مجموعی اثر قابل ستائش ہے۔ میرا کٹھن نکل آیا اور  
میری ناپختہ آوازیں پختگی آگئی۔ میری صورت میں نسوانیت کی کچھ جھلک تھی، وہ جاتی رہی۔ میری اہمیت  
اُس پورے کے مماثل تھی جو پھل پر آتا ہے تو بڑھن پھولنا بند کر دیتا ہے لیکن بھرا پُرا لگتا ہے۔  
اُس جسمانی کمال کے ساتھ مجھ میں روحانی زوال بھی آیا۔ مجھے نرم گرم اٹھانے کی عادت  
پڑ گئی اور اپنی ذلت آمیز نامردی میں عزت افزائی محسوس ہونے لگی۔ میں ماحول زدہ ہو گیا اور مجھ پر ترکان  
کا ٹھپا لگ گیا۔ میں ہو ہوا اس کہاوت کی تصدیق تھا 'بھیت' بھٹے سے ہو کر آئے تو اینٹ کھلاتی  
ہے۔ میں ریگڑھ پورہ کی بدبو سے مانوس ہو گیا۔ صابن کی کمی کے سبب میں کیس اور کپڑے پانی سے  
بیہنچ کر سکھاتا۔ میری جوئیس میرے ایسے خانہ زاد تھے جن کی صحت مندی میری ناپاکی پر موقوف تھی۔  
کھجولتے کھجولتے کہیں جوں ہاتھ لگ جاتی تو مسئلے سے نہ مرنے۔ اُسے ناخن پر رکھ کر ناخن سے مارنا  
پڑتا۔ میں اُس جیتے جاگتے اور لال سوہے خون کو آفسوس سے دیکھتا جو میری رگ حیات کا جاں فزا حصہ  
تھا لیکن کس ناگوار طریقے سے ضائع ہوا تھا! یہ باتیں اُس ماحول کی خوبیاں ہیں، جس پر میری زندگی کا  
دار و مدار تھا۔ میری دہاڑی کی اجرت ڈیڑھ روپیہ ملے ہوئی جو مزدور سے آدھی تھی۔ سچا سنگھ کچھ دینا ہی  
نہ چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا "میں جس ہنر سے تجھے مالامال کر رہا ہوں وہ تیری عمر بھر کے روزگار کا ضامن ہے  
اس کے باوجود میں، تجھے کچھ صلہ دے رہا ہوں، لے نہیں رہا ہوں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پُرانے زمانے میں گرو، چیلوں سے گرو دکھنا لے بغیر کوئی ہنر نہ  
سکھاتے تھے۔ تایا جی کہتے تھے کہ ہندوستانِ علم و فن میں ساری دنیا سے آگے تھا، اس کے زوال کا  
کارن ایسے ہی گرو تھے۔ وہ گرو ادب تجارتی میں فرق کرتے تھے، "گرو، اُن داتا ہوتا ہے اور بھاری،  
بھکشا رہتی (بھکاری)" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے، "جو محنت کش، محنت سے پیٹ نہیں بھر سکتا  
وہ حیوان سے بدتر ہے۔ کیوں کہ محنت کش اپنی ضرورت میں اکیلا نہیں ہوتا، اُس کا کوئی نہ کوئی دست نگر  
ہوتا ہے۔ اُس کی کم اجرت اُس کے لئے ایسے ہے جیسے بڑی مچھلی کے لئے اٹھلا پانی۔"

اور میں یہ بات حقارت آمیز دیانت داری سے تسلیم کرتا ہوں کہ میری مزدوری کم سہی،  
دل و جاں کو بیچا رکھنے کے لئے کافی تھی۔ نہ کسی کا پاس، نہ کسی سے آس، نہ اپنے آپ سے نہ آس،  
میرے دل میں ایک ایسے احساس نے جنم لیا جس کی اہمیت اندھے سکون کی سی تھی۔

میری کائنات ترکھانوں، آزاروں، لکڑیوں، آذیت خواہوں، پھبتی بازوں، حریفوں

۔۔۔۔۔ کی ہمہ جہت کائنات تھی۔ میں اُس سے دُور بھاگنے کی کوشش کرتا۔ میری کوشش، پتھر کی طرح واپس پلٹتی اور مجھے پہلے سے زیادہ مجروح کر جاتی۔ میری دماغی کیفیت آندھے پرندے کی سی تھی جو پرداز بھرتے ہی کسی ستر راہ سے ٹکرا جاتا ہے۔ وہاں دل بہلاوے کا ایک ہی سامان تھا، کام! گھر سے کام اور کام سے گھر، صبح سے شام تک ایک ہی کام، ایک ہی خیال، ایک ہی دھن، میری زندگی کا محدود راستہ سیدھا تباہی کے پاتال تک جاتا تھا۔ ان سارے عذابوں سے بڑھ کر میلانِ طبعی کا ابطال اور ابطال کوئی بھی ہو، تنزل کی نشانی ہے۔ جس آدمی کے تخلیقی وجدان اور نازک رجحانِ مہفوز ہو جائیں اُس کے ادبار کی رفت ارتیز ہو جاتی ہے۔

میں مُشقت کی کم مانگی میں شجرِ کُلفت کی طرح پل رہا تھا۔ بے صبوری، بے شعوری، بے طرحی، بے سروسامانی، بے آہنگی۔۔۔۔۔ میری خواری تھی، میری معدودی تھی، میں ایسا وحشی تھا جو انسانوں کی نستی میں جا بسا تھا اور اُن کے رہنے سہنے کے طور طریقے سیکھتا تھا۔ میں اپنے مطلب کا کوئی جملہ سنتا تو مجھے اپنی سماعت پر شک گزرتا۔ میں گاؤں سے زیادہ اکھڑا اور گنوار لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ اُن کا شمار زیادہ ذہنی، خیر! لیکن تقدیر! وہ ہر جگہ موجود تھے۔ اُن کی زد سے بچ نکلتا، آتش کدے میں پاؤں رکھ کر چکانہ کھانا تھا۔ اُن میں سے کچھ اتنے بے پروے اور ادھورے تھے کہ اُن سے چوٹی سی ملاقات سخت دِل کو سخت ترین بنا دیتی۔ میری بے دلی فزوں ہو جاتی اور ہمت سرنگوں۔ نفرت آنکھیز حالات آدمی کے لئے ایسے ہیں جیسے بارانی کھیتی کے لئے اوڑا (پانی کا قحط)! اور نفرت اُس ماحول کی آرزو تھی، نفرت اُس ماحول کی آبرو تھی، نفرت اُس ماحول کی جستجو تھی۔ اور نفرت وہ اونٹنی گندگی ہے جو نجاست خانوں، بدروؤں اور تاریک زادیوں کے برعکس عین انسان کے دل میں پلتی ہے۔ یہ جانی پہچانی گندگی سے زیادہ گھناؤنی اور سریع اثر ہے۔ اس کی ایک حرکت کا محدود اُجالوں کو عمیق اندھیروں میں غرق کر جاتی ہے۔ یہ انسان کی طبعی موت سے قبل، غیر طبعی موت ہے، جیتی جاگتی موت! مرنے والا اسے دیکھ سکتا ہے، چاہے تو اس کا ماتم کر سکتا ہے۔

میرے ساتھی لازوال عمومیت اور معمولیت کے بوجھ سے مرے جاتے تھے لیکن کوئی کمال اور نیا پن دکھانے کے لئے بھی بے قرار رہتے تھے۔ جہاں کہیں ایک سے دو ہوتے تھے وہاں انہٹوں کی چٹائی، دیواروں کی پٹائی، چوکھٹوں کی ٹھکانی، جاوں کی بچھائی، فرشوں کی ڈھلانی، حوضوں کی کھدائی، پاڑوں کی اونچائی، سڑکوں کی لمبائی، نالوں کی چوڑائی کی باتیں چل نکلتیں۔ ہر کوئی اپنے فن کی ڈینگ مارتا اور زورِ بازو کی شیخی بگھارتا۔ میری دنیا ترکھانوں، مہاروں، لوہاروں، بت دھانیوں،



بہشتیوں، مژدوروں کی دنیا تھی۔ کیا تقدیر تھی؟ وہ دوسروں کے لئے اُچلے اور کھلے مکان بناتے تھے لیکن خود گندے اور اندھیرے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ خوب صورت اور شیریں زندگی کے پاس رہ کر وہ اپنی زندگی کو اور پُرآزار بنا رہے تھے۔ وہ اپنی ناداری اور کم اصلی کی تسلی کے لئے جیسے طریقے اختیار کرتے تھے وہ حقارت کی بجائے ہمدردی کا مقام ہے۔ وہ اپنے حسبِ نسب کی کھوج ایسے انداز میں کرتے کہ اُسے کسی نہ کسی شاہی خاندان سے لے جا ملاتے یا کسی بزرگ سے۔ اس کے باوجود وہ اپنے نام کو قائم و دائم رکھنے کے جیسے طریقے ایجاد کرتے، وہ قابلِ ذکر ہیں۔ کوئی اپنا نام اینٹوں پر کھودتا اور کوئی پلستر پر، کوئی رینفورسمنٹ میں سرنامہ لکھتا اور کوئی محرابوں پر، کوئی پتھروں پر مردانگی کے نقش بناتا اور کوئی پائاموں پر۔ سناسنگھ نے بھر سے برا لکھا۔ وہ جہاں بیٹھ کر اٹھتا وہاں مڑ کر دیکھتا جیسے اپنی رُوح کو وہیں چھوڑ آیا ہو۔ اپنے ننھے سناسنگھ کو وہ کھٹکوں اور ٹونٹیوں سے جھوٹا، اُس وقت اُس کا چہرہ جس احساس سے جھلکتا اُس سے لگتا کہ اُس کے تجربے نے کسی نئی فکر جو جَم دیا ہے۔

”تو ایسا کیوں کرتا ہے؟“ میں ہکا بکا پوچھتا۔

”مجھے اچھا لگتا ہے!“ وہ اپنے سے رس لیتا ہوا کہتا۔

”تجھے کیوں اچھا لگتا ہے؟“

اُس کی حرکت میں مجھے کوئی مدعا واضح نظر نہ آتا اور میں اُسے جانا چاہتا۔

”کیوں بتاؤں تجھے؟ اچھا لگتا ہے، اچھا لگتا ہے!“

آخری دونوں جملوں کا مفہوم ایک ہے لیکن وہ جس اداسے انھیں بولتا، اُن کا مطلب جدا جدا ہوتا۔

”بڑے بھائی، تمہیں میری قسم! بتاؤ، کیا بات ہے۔ ایک بار میں نے اُس کا ہاتھ دبا کر التجا آمیز لہجے میں پوچھا۔“

ٹھیک ہے، بتاتا ہوں۔ اُس نے یوں صا د کیا جیسے مجھ پر احسان کر رہا تھا۔ وہ ایک لکڑی کے قریب کھڑا تھا، اُسی پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ میں ہمدن گوش ہو گیا جیسے میں زندگی کا اہم ترین راز جاننے والا تھا اور اُس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو نظر انداز کرنا اُس کے معنی کھونا تھا۔

یہ سب لوگ جب ان مکالموں میں رہیں گے، ان چیزوں کو استعمال کریں گے اور اس طرح میرے اُسے! وہ ایسے تڑپ کر اُٹھا جیسے اعصاب میں درد اُٹھا ہو اور پھر کاچھے کے اوپر سے ہاتھ میں

پکڑ کر چلایا، اسے! اسے! اسے! اسے!!!

اُس کا ہیجان اس حقیقت کا ترجمان تھا کہ وہ پُرانی تہذیب کو پامال کر کے نئی تہذیب بسانا چاہتا ہے جس کا اول قانون اُس کا بنگ آرچن ہو۔ اُس کا یہ جذبہ میرے بھائی جی کے اس جذبے سے زیادہ مہذب تھا جو اپنے کسی دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تو اُسے یوں ذلیل کرتا، ”وہ ہے کیا؟ میں چاہوں تو اُس کی ساری پشتیں اپنے موت کی دھار میں بہا دوں!“

وہ بیل کی طرح گردن ڈالے چھوٹے چھوٹے قدموں سے گھومنے لگا اور بیک وقت خود سے اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ ”میں پشت ہا پشت سے ترکھان ہوں، تو جانتا ہے، مجھے کیسے معلوم ہے؟ بزرگوں کے اوزار تبرکات کی طرح پُوبے جاتے ہیں۔ میرے بچے ترکھان ہی ہوں گے! کیوں؟ بچے مکے گھڑے کے سے ہوتے ہیں، جس پر جیسا نشان پڑ گیا، پڑ گیا!“

”ترکھان کا بچہ، ترکھان نہیں کہلائے گا تو کیا کہلائے گا؟ جیسے کسان کا بچہ کسان! میں نے منطق بگھاری۔

وہ نظر نیچی کئے خاموش رہا جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گھومتا رہا اور پھر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ”ہم جھوٹیڑوں میں اس لئے رہتے ہیں کہ ہم اپنی محنت بیچتے ہیں۔ اپنے لئے مکان وہ بنواتے ہیں جو دوسروں کی محنت خرید سکتے ہیں۔ ہم اپنے لئے مکان نہیں بنوا سکتے! کیوں کہ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ دوسروں کی محنت خرید سکیں۔“

”اُس کا کیا علاج ہے؟ میں نے اُسے کُریدا۔

”ایک ہی علاج ہے! اُس نے ہی پر زور دیا جیسے اُس کا خیال اس سماجی مسئلے کا ایسا حل تھا۔ اُس کے لب و لہجے کی بیباکی اُس شخص کی سی تھی جو کسی کے حلقہ اختیار میں مداخلت کا ارادہ رکھتا ہو۔ ہمیں ان لوگوں کو مار دینا چاہیے اور مکانات پر قبضہ کر لینا چاہیے۔“

”تم سوچتے ہو کہ تمہارے ایسا کرنے سے حکومت چپ دیکھتی رہے؟ میں نے اُس کی بات کو رد کر کے اپنی بات کہی۔ ”پاکستان کے ہنگامے میں ایسا ہوا تھا۔ لوگ مسلمانوں کی زمینوں اور گھروں پر قابض ہو گئے تھے لیکن پھر سب کو چھوڑنے پڑے تھے۔ میں نے تقسیم وطن کا حوالہ دیا جب ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ لگا ہے، اُسی کا ہے۔

”تو پھر حکومت کو چاہیے کہ وہ ہمیں مکان بنا کر دے!“

اُس نے اپنی بات کو نیا موڑ دیا جیسے اُسے اپنی بات میں کھوٹ نظر آیا ہو۔

”پہلے ٹھہری مانگ تھی کہ چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن اُجرتی چھٹی ہو۔“  
 ”یہ کامگاری کم سے کم مانگ ہے! مجھے آرام کرنے دے، یہ باتیں تیری سمجھ سے باہر ہیں۔“ اُس  
 نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے کہا اور چلا گیا۔

سننا سنگھ ساتھ دالی کوٹھی پر اپنے طور پر کام کرتا تھا اور کھانا اُسی ہوٹل پر کھاتا تھا جہاں میں  
 اُس کا ایک مخصوص جذبہ تھا، وہ سمجھتا تھا کہ سارے ہنزو وِشو اکرام کی سنتاں ہیں۔ چوں کہ سرٹھی کا پینا  
 کار وِشو اکرام ہے اس لئے ہر چیز پر پہلا ادھیکار ہنزو رکھتا ہے۔

میرا ہوٹل، گھر سے کافی دُور تھا۔ اس جیسے دُوسرے ہوٹل بھی قریب تھے لیکن میں اسے  
 چھوڑتا نہ تھا۔ میری پسند کی وجہ بالکل سیدھی اور عملی تھی۔ اس ہوٹل کی روٹیاں، دُوسروں سے بھاری  
 تھیں اور پیٹ بھرنے کے لئے دوکانی تھیں۔ اتنی تسکین کے لئے دُوسرے ہوٹلوں کی تین روٹیاں کھانی  
 پڑتی تھیں جس سے مجھے ہر روز چار آنے کا خسارہ ہوتا تھا۔ اس ہوٹل کا مالک نریندر سنگھ دال خوب  
 بگھارتا تھا اس لئے مزے سے کھانا کھانے کے لئے سپیشل سبزی کی ضرورت نہیں رہتی تھی، جس کا نرخ  
 دو فی کی روٹی کے ساتھ الگ دینا پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں وہاں کھانے کے ساتھ کبھی پیاز اور کبھی مولیٰ کے  
 پینڈ ٹکڑے ملتے تھے جو کھانے کا سوا دُہا دیتے تھے۔ سننا سنگھ دیونگریں رہتا تھا اور کام کے بعد اکثر  
 ہوٹل پر ملتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی ذات پر نالاں تھا لیکن اُنچی ذات والوں کو گالیاں دیتا تھا جیسے مذہبی  
 لوگ، شیطان پر لعنت بھیج کر مقدس فریضہ ادا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کی ساری رذیل حرکتوں  
 کا ذمہ دار وہی تو ہے۔

ایک رات میں گھر سے ہوٹل جا رہا تھا کہ وہ مجھے راستے میں مل گیا۔ وہ سائیکل پر سے اُترا،  
 میرے ساتھ پیدل چل پڑا اور رسمی بات چیت کے بعد گویا ہوا، ”چھوٹے بھائی، مَنو نے جات پات  
 بنا کر ماؤ کے ساتھ بڑی نالائقی کی ہے۔“

”کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اُس نے جو بدنامی ہماری قسمت میں لکھ دی ہے، اُمٹ ہے!“

اُس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے ایک ملعون دُوسرے کو دیکھتا ہے اور اس خیال سے تسکین  
 پاتا ہے کہ اپنی بدقسمتی میں وہ اکیلا نہیں ہے۔

اس میں منوکا کیا قصور ہے؟ جو جیسا کام کرتا ہے، ویسا ہی نام پاتا ہے۔ تم یہ کام چھوڑ دو  
 کوئی دُور کرنے لگو، وہی کہلاو گے۔“ میں نے اُسے زندگی کی حقیقت بتائی۔

”قہر دہ کہاوت سنی ہے؟ اُس نے میری بات کو بحسن نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی خصوصیت تھی کہ وہ جس کسی کے ساتھ ہوتا، اپنی ہی گاتا اور دوسرے کی بالکل نہ سنتا۔ وہ دوسرے کی بات پر اُسی قدر دھیان دیتا جس قدر اُسے ضرورت ہوتی۔

”کون سی کہاوت؟“ میں نے اپنی مجروح خودی کی ڈھارس بندھاتے ہوئے پوچھا۔

”بڑی کڑی ہے! میں نے پہلی بار سنی تھی تو میرے تَن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میرے جی میں آئی تھی کہ اُس کا خون کروں! لیکن میں سنہل گیا تھا کیوں کہ میں اُس کے گھر میں کام کرتا تھا۔ وہ مجھے دھکیلتا مچھا اسٹوک سے ایک طرف لے گیا، اپنے اطراف دیکھا جیسے کوئی کسی کا راز کہنے سے پہلے خاطر جمع کر لے کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے۔

ایسی کون سی کہاوت ہے؟ اُسے دیر کرتے دیکھ کر میں نے بیتاب ہو کر اپنا سوال دہرایا۔

”سنو!“ اُس نے مجھے جھنجھوڑنے کے سے انداز میں تاڑا جیسے میری سخت جانی کا اندازہ کیا۔

”جیسے کتے کا بچہ کتا، ترکھان کا بیٹا ترکھان!“

اُس کی بات مجھے تیر کی طرح لگی لیکن میں سہار گیا۔ میری ذلت میری ڈھال بنی رہتی تھی لیکن وہ یہ کہہ کر خند باقی ہو گیا، ”ہم ختم ختم سے وہی ہیں جو تھے! جیسے امیروں کے کتوں اور بیلوں کے نَسب نامے ہیں دیے ہی ہم کاریگروں کے صداقت نامے۔ جہاں کام کرنے جا پہلے پوچھتے ہیں، خاندانی کاریگر ہو کیا؟ کہاں کہاں کہاں کام کیا ہے؟“

”اُس میں کیا برائی ہے؟ ہنزہ قوت عمل ہے جو انسان کو تخلیق کرتی ہے اور اسے ادنیٰ سے اعلیٰ بناتی ہے۔ کوئی ہنزہ کے بارے میں ایسا پوچھتا ہے تو وہ اُس کی عزت بڑھاتا ہے۔ جسے اپنے بارے میں بات کرنے سے عار ہے، وہ فریب کار ہے۔“

تہذیب اخلاق، قدرِ عافیت کا مبداء ہے۔ جو کوئی اس میں غلطی شرکت کرتا ہے وہ صورتِ حال کے ساتھ خود کو بھی سنوارتا ہے، جب کہ دوسرا اپنے ماحول کی طرح خود بھی اُدھورا رہتا ہے۔ اُس کی نفسیات گندگی کی مٹھی کی طرح ہوتی ہے! وہ صاف ستھرے ماحول میں پورا جاتی ہے اور کہیں آرام سے بیٹھ نہیں پاتی ہے۔ وہی حالت میری تھی لیکن میں نے تایا جی کا قول دہرایا۔

”نہیں! ہرگز نہیں!! وہ غصے سے چلایا۔ ہنزہ اُونچے اور سانچے ہوتے تو ہم، کاریگر نہ کہلاتے۔ ہماری بیویاں، ترکھان، لوہار، ریگڑھ، جولاہے نہ جنتیں!“

اُس نے سائیکل کا اگلا پہیہ اٹھا کر زمین پر پٹخا جیسے وہ سب پیسے کا قصور تھا۔

میں نے اُسے کچھ خوف سے دیکھا اور چپ رہا۔ اُس کا چہرہ متمایا ہوا تھا اور آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ وہ دوسروں کو حقیر سمجھتا تھا لیکن کوئی اُسے حقیر سمجھے! وہ یہ نہ چاہتا تھا اُس کی نفرت ذاتی ہو کر مجموعی نوعیت کی تھی اور ناقابلِ مصالحت بھی۔ وہ اپنی انتہا میں اپنے سوائے ہر کسی کو ذلیل و خوار دیکھنا چاہتی تھی۔

تُو نے یہ کہاوت سُنی ہوگی؟ اُس نے بے جیسی سے کہا اور میرے کاندھے پر ہاتھ مارا جو میری پگڑی کو مس کرتا ہوا لگا۔ سَپِت ، سَپِت ، سَپِت ۔۔۔ میں نے پگڑی سنبھالتے ہوئے اُسے ذرا غصے سے دیکھا۔ وہ کہاوت بھول گیا تھا اور اپنا ماتھا ٹھونک رہا تھا۔ وہ کہاوت مجھے یاد تھی۔ میں نے اُس کی بات کی کڑی آٹھائی جو میرے غصے کو گر محوشی میں بدل گئی۔

سَپِت جَنن کھڑانیاں

ویشانیاں، باہمنیاں

(کشتریوں، ویشوں اور برہمنوں کی بیویاں سَپوت جنتی ہیں)

یہ سنتے ہی سنا سنگھ بھڑک اٹھا۔ اور بولا، ہاں ہاں، یہی ہیں! تجھے بھی یاد ہے۔ اِس کا مطلب کیا ہے؟ اُن کے سوا ہر عورت، کَپوت جنتی ہے۔ جب تک جاتوں پاتوں کے بھرم بھید ہیں ہماری تقدیر اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔

”یہ بدنامی مٹ سکتی ہے کیوں کہ اِس کی وجہ معاشی پستی ہے نہ کہ ذات پات! اُنم اپنے بچوں کو پڑھاؤ اور اُنھیں اِس قابل بناؤ کہ وہ اپنی تقدیر بدل سکیں۔“ میں نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

”تُو نے پڑھ کر کیا اُکھاڑیا ہے؟“

اُس نے میرا مذاق اڑایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے میری بات سُن کر اُس کا راست جواب

دیا تھا۔

”میری تعلیم اُدھوری ہے! میں نے اپنے خیال کی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

”پوری کر لے! پھر میں دیکھوں گا کہ کیا کر لیتا ہے تُو؟“ اُس نے اپنے سخت انداز کو برقرار رکھا۔

”پوری کیسے کر لوں! اُنم جانتے ہو کہ میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔“ میں نے اپنی

بے بسی کا رونا ریا۔ میرے پتے اظہار نے اُس کے تعصب کا پردہ پھاڑ دیا اور اُسے جذبات کے

اندھیرے سے اُٹھا کر سوچ وچار کے اُجالے میں لا بٹھایا۔ اُس کا تاؤ، احساس میں بدل گیا جیسے اُس

کا اور میرا مسئلہ ایک ہو۔ اُس نے ایک ہاتھ سے سائیکل پگڑی، دوسرے ہاتھ سے میری کلائی تھامی

اور ہوٹل کی طرف چل پڑا اور شکست خوردہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”ہم غریبوں کا یہی رونا ہے! جو پڑھ سکتا ہے، اس کا ماحول اس کے خلاف ہے اور جسے کوئی پڑھنا چاہتا ہے، وہ پڑھنے میں ٹھک رہا ہے۔ ٹولا کھول میں ایک ہے! اس نے میری کلانی چھوڑ کر میری پیٹھ تھپکی، پھر کلانی پکڑ لی اور بات جاری رکھی، ”ترکھانوں کے بچے پڑھتے کہاں ہیں؟ میرے بچے کتابوں کو آواروں کی طرح برستے ہیں۔ وہ اُن کے ورقے ایسے الگ کر دیتے ہیں جیسے وہ گل کے پُرزے ہوں اور دوبارہ جوڑے جاسکتے ہوں۔ کتاب کا ایک لفظ یاد نہیں لیکن بیٹی میں رکھے ہر آواز کا نام اور کام معلوم ہے۔“

”یہ ابھی ہی بات ہے! مجھے دیکھو، میں نہ ادھر کا ہوں نہ ادھر کا! بے ہنر کوئی جتن کھول کر جوڑتا ہے تو آخر میں کچھ پُرزے زیادہ پاتا ہے۔ ہم لوگ بہت اچھے انجینیر بن سکتے ہیں۔ ہنر کے پورا جاننے ہی میں ترقی کا راستہ ہے۔ کرنیل سنگھ اور سو بھائیوں کو دیکھو، آج کس مقام پر فائز ہیں۔ ہنر ہماری گھٹی میں پڑتا ہے لیکن پینپ نہیں پاتا ہے کیوں کہ ہم اپنے فن کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اس کی بیرونی بے دلی سے کرتے ہیں۔“ میں نے اپنی ذلت میں نئے طریقے سے عزت کا پہلو تلاش کیا۔

”تم بڑی عقل کی باتیں کرتے ہو!“ اس نے پہلی بار مجھے کچھ ادب سے مخاطب کیا۔ ”کس نے بتایا تمہیں یہ سب کچھ!“ اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

”تایاجی نے! وہ کہتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے تعصب سے چھٹکارا نہیں پاتا، حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا اور نہ صحیح سمت میں!“

میں نے تایاجی کا حوالہ دیا۔ وہ تعصب کو انسانی زندگی کے آئینے کا تیزاب جانتے تھے اور

محبت کو زنگار۔

”تم ٹھیک کہتے ہو! ہم اپنے پیشے کو ذلیل کہیں گے تو دوسرے اسے کیوں سراہیں گے؟ راشٹرپتی بھون اور پارلیمنٹ کے گنبدوں کی سنٹرنگ کرنے میں انگریز انجینیر نا کام رہے تھے جسے ایک ترکھان نے سمرانجام دیا تھا۔ ترکھان، وشواگرما کا آوارہ ہے۔“

ترکھان کے پیشے کو نئے معنی دے کر اس نے خود کو جس اعتمادِ نفس سے دیکھا، وہ فتح و نصرت کے لمحے کی شان و شوکت ہے۔

ہم ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھے، اس نے اپنی جانب سے میرے لئے آلو پیئر کی سپیشل بیری سنگوائی، میں نے انکار کیا تو اس نے فخر سے کہا، ”میری خوشی کے لئے! میں آج بہت خوش ہوں۔“ تم نے مجھے میری گم کردہ شخصیت کا چہرہ دکھایا ہے۔

وہ کبھی کبھی نرم و نازک باتیں کرتا تھا۔ اُس کے بدلے ہوئے ردیے کو دیکھ کر مجھے گھمان گزرتا کہ کوئی جہاں پینڈت وید سنانے کا جتن کر رہا ہے۔ عام طور پر وہ بے لوج اور بدظن رہتا تھا۔ مکمل ہوتے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر وہ کہتا، ”گیان، یہ امیر کتنے حقیر ہیں! تجھے کیا معلوم ہے؟ میں ان کے ار پار دیکھ سکتا ہوں۔ جس دن یہ، ان میں آجے حسن اتفاق سے ہم ادھر سے گزرے اور اپنی تخلیق کے ان شاہکاروں کو دیکھنے کے لئے رُک گئے، یہ، ہمیں آوارہ، بدچلن اور چور سمجھ کر دھتکار دیں گے۔“ میں اُس کی تنگ نظری پر یقین نہ کرتا، وہ میری نا تجربہ کاری پر تشف کہتا، ”تُو لوٹا ہے! تو کیا جانے؟ آزما لینا! میرا کہا غلط ہوا تو میرے مُنہ پر تھوک دینا۔“

اُس کے جذبات کی گرمی، گندمی رنگ پر پیازی لہر دوڑا جاتی اور دیر تک دکھائی دیتی جیسے اڑتے ہوئے لمحے ٹھہر جائیں۔

گھر بھر وائی سے پہلے گھروں کے مالک اپنے بال بچوں سمیت آتے۔ وہ اس دروازے کو کھولتے، اُس کھڑکی کو بند کرتے، ٹوٹیاں گھماتے پھرتے، سناٹا گھر کا رنگ دکھ اُٹھتا۔ اُس کی آندرونی حالت سے باخبر، میں سوچتا کہ اس تعمیر کی بنیاد اُس کے خون پسینے سے رکھی ہوئی ہے۔ اُس کا اس تخلیق سے رشتہ احترام کا ہے، وہ اس سے نفرت کیوں کرتا ہے؟ میں اُس کی نفسیات کو سمجھ نہ سکتا اور اُس کے ردیے پر تحیران ہوتا اور کبھی کبھی پریشان۔

میرے ساتھی اپنے وجود کی سفاکی سے فرار پانے کے لئے گزرو گرتھ میں سے حوالے دیتے،

جو تینوں مارن ٹکیاں، تیناں نہاریں گھم

آپ نیڑے گھر جائے کے پیر تیناں دے گھم

(جو کوئی تجھے مڑکا مارتا ہے تو اُسے پلٹ کر مڑکا مت مار۔ اُس کے پاس جا، پاؤں گھم

اور کہہ کہ آپ مجھے مارنے کے لئے اتنی دُور کیوں آئے! مجھے بلا لیتے، میں حاضر ہو جاتا)

لیکن عملی زندگی میں وہ دُور اسی مخالفت پر پھیر جاتے اور مرنے مارنے پر اُتر آتے۔ میں

اُن کے دل کی گہرائی میں جھانک کر دیکھتا، جہاں ناکامیوں کے اندھیروں کی حکومت تھی اور لعنت بھی۔

اُن اندھیروں کے دُورے نام محرومی، بے نوائی، تہی دستی، بے چارگی، کم اصلی۔۔۔ ہیں۔

میرے کپڑے گھستے گھستے گھٹنیوں، گھٹنوں اور مچھڑوں پر سے پھٹ گئے۔ میں

چاک پر پیوند لگاتا، پُرانا پیوند نئے بچوں کا ساتھ نہ دیتا، جہاں کہیں دباؤ پڑتا، وہ لچر دُوسری کی

طرح مُنہ کھول لیتا، میرا مُنہ چڑاتا اور میں آزدہ خاطر، اُس کا مُنہ تکتا۔ میں اپنے بچپن میں اس

طرح اپنے زخموں کو دیکھتا تھا۔ میرے کپڑوں کے پیوند ایک طرح سے میرے روحانی زخم تھے جو کسی نہ کسی شکل میں میرا ساتھ نباہ رہے تھے۔ نئے کپڑوں کی توفیق کسے تھی! میں اُترن خرید کر پہنے لگا۔ مجھے جانے پہچانے والے میری تعلیم کی نفی اڑاتے، میرے کام پر لکھن طعن کرتے اور میری غریبی کو نشانہ بناتے۔ اُن سے میل جول رکھنا، گندگی میں رہنا تھا۔ اپنے ماحول کو قابلِ برداشت بنانے کے لئے میں ادبی باتیں کرتا۔ وہ مجھے چڑاتے،

”اُردو کوئی زبان ہے! چدر دوسری زبانوں کا سر ہے، اس کے پیر ہیں، پائیل بچھکی طرح“  
”جب لگی پھٹنے، شمر لگا پھرنے۔“

اُن کی زبان دمازی کے کئی نمونے پیش کر سکتا ہوں لیکن گریز کر رہا ہوں۔ اُن نامعقولوں سے دُور رہنے کے لئے میں اکیلا گھومتا اور کسی کے اس خیال کی تائید کرتا۔

جہاں نہ اپنا گن چلے تہاں نہ اپنی تھاولں

دھوبی رہ کر کیا کسے دیگمبر کے گاؤں (دیگمبر، سنگا)

اکیلا پین ڈی شور جو زندہ کے لئے سود مند ہو سکتا ہے لیکن بے راہ رو کے لئے ایک غلام ہے، وحشت کدہ ہے۔ وہ میری رگوں کا ضعف تھا جس نے میرے خون کو اُس کے منتہائے کمال تک نہ پہنچنے دیا اور اُسے مجھوں کی سبز سامانی سے محروم رکھا جس سے اُس غریب کو شہرتِ دوام ملی تھی۔ دلی نے مجھے چند ہی مہینوں میں بدحواس کر دیا تھا۔ میں اُن لوگوں کے بارے میں سوچتا جو وہاں سا لہا سال سے بستے تھے، وہیں پیدا ہوئے تھے اور کہیں جانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ مجھے لگتا کہ وہ لوگ میری ہی طرح آدھے پاگل ہیں لیکن اپنے پاگل پن سے بے خبر ہیں۔

اینا دل بہلانے کے لئے میں نے انوکھا طریقہ دریافت کیا۔ میں خود کو آشعار سُنا تا اور محفوظ ہوتا۔ میں اس فن سے گاؤں میں دل بہلایا کرتا تھا لیکن شہر کی بھیڑ میں اسے بھول گیا تھا۔ اپنے شوق کی خوشنودی کے لئے میں نے اپنی شہائی کے اوقات بڑھالے۔ وہ یوں کہ میں منہ اندھیرے کام کے لئے نکل پڑتا اور رات گئے لوٹ کر آتا۔ میں جب کبھی اس ٹھہراؤ سے گھبرا جاتا، سوچتا کہ میں خود کو زمانے سے چھپا رہا ہوں یا اپنے آپ سے۔ میں اپنی بے نوائی میں اپنی ہمت طرح طرح سے باندھتا اور اپنے ملمون و مطمون حالات میں ندرت و نفاست پیدا کرتا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں شعر کہنے کی طرف مائل ہوا۔ میرے جذبات میرے الفاظ پر اس قدر حاوی تھے کہ میں اُن کی تشریح نہ کر پاتا۔ میری ناکامی میری شوریدہ نثری کا باعث ہوتی۔ مجھے لگتا کہ میرا جسم الگ اور میری



روح الگ جی رہی ہے۔ میرا احساس دُست تھا۔ میرے اعضاء کل پُڑوں کی طرح اپنا اپنا کام کرتے تھے آند میری روح، عذابِ وقت سے نبرد آزما تھی۔ میں اُس ہر شے سے دُور جی رہا تھا جس کی قربت جاں آفرِ خیالات کو جنم دیتی ہے۔ نرمی و ناز کی میری زندگی سے کوسوں دُور تھے۔ میری تحقیر میری زنجیر تھی آند میری فحرومی میری بدحواسی۔ میں ہر بری شے سے نفرت کرتا تھا۔ رگڑھ پورہ سے، ہوٹل سے، سچا بچھ سے، ساتھیوں سے۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ اپنی صورت سے! جو ہوتے ہوتے آم کی چوس ہوئی ٹٹھلی کی مانند ہو گئی تھی۔ کہاں میں آئینے کے بوسے لیٹا تھا، کہاں میں نے اُسے گرا کر توڑ دیا۔ میری وحشت یہ برداشت نہ کر سکی کہ کوئی مجھے میری ذلت اور ہزیمت دکھائے۔ لیکن جوں ہی میں نے آئینہ توڑا، میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا، تجھ میں ہمت ہے تو اپنی مجبوری کا محاصرہ توڑ! تو اتنی آسانی سے زندگی کی سچائی نہیں بھٹلا سکتا! تو کب تو دماغ ہے! جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔

میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوا اور آئینے کے ٹکڑے چھنے لگا۔ اُن میں مجھے اپنے مسخ شدہ عکس نظر آئے۔ مجھے لگا کہ وہ میری آندوئی اور بیرونی شخصیت کے پتے نمایندہ ہیں۔ میں انھیں خاکداں میں پھینک کر آیا، میرے دل میں رنخ پڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا، ”اپنی شکست کا ذمہ دار خود میں ہوں۔“

میں بے ساختہ رونے لگا، گویا اپنا ماتم کرنے لگا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی! میں اپنا ماتم کرنے کا عادی تھا اگرچہ ہر بار اُس کی وجہ الگ ہوتی تھی۔

## باب ۴۸

طوفان کو ڈراتا ہے سفینہ جن کا، دریاؤں کا رخ موڑ دے سینہ جن کا  
وہ زہرِ غمِ روز میں ڈوبے ہوئے، اُمرت سے بھی بڑھ کر ہے پسینہ جن کا (شاہر)

آسمان کے نیچے کوئی عجوبہ ہے تو وہ دھرتی ہے، دھرتی پر کوئی عجوبہ ہے تو وہ آدمی ہے آدمی سے بڑھ کر کوئی عجوبہ ہے تو وہ آدمی کا دل ہے۔ میں اپنے دل کی منظر کشی کرتے ہوئے کتنے ممکن و ناممکن مراحل سے گزرتا ہوں۔ جیسے سمندر کناروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کرب و بلا کی داستان کہتا ہے ویسے ہی میرے دل نے کاغذ و قلم کو ذریعہِ تواپیرائی بنایا ہے۔ سمندر کی بے کلمی کسی حد تک اُس

کی ظاہری کیفیت کی عکاسی کرتی ہے، نہ کہ اندرونی حقیقت کی، وہی حالت میرے دل کی ہے۔  
میں انتہائی کوشش کے باوجود وہ تفصیل دہرانے کے ناقابل ہوں جو میری اصلیت ہے۔ آدمی کے  
جذبات و احساسات، بھول بھلیوں کے راستے ہیں۔ یہ اسے ہر جگہ لے جاتے ہیں لیکن کہیں  
نہیں پہنچاتے ہیں۔ آدمی اپنی ناکامی کی پریشانی سے بدحواس رہتا ہے اور کامیابی کے ہزاروں  
طریقے سوچتا ہے اور جو کچھ کر سکتا ہے، کر گزرتا ہے۔

میری ناکامی و پریشانی میری اپنی کہانی ہے۔ میں دلی کی گلیوں کی طرح پھیل کر سٹکا  
ہوا تھا۔ گلیاں کیا مٹتی ہیں! روشنی سے روشن اور تاریک سے تاریک مقام تک پہنچتی ہیں، ہر کسی  
کا سراغ دیتی ہیں لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں کہتی ہیں۔

کام بند ہوتا اور ہر کوئی گھر کی راہ لیتا۔ میں کسی نہ کسی بہانے وہاں رُک جاتا، بڑا دے کے  
ڈھیر پر لیٹ جاتا، آسمان کے دل میں گھوڑنا اور بارِ بڑے ربط خیالوں میں کھو جاتا۔ دورِ نئی زندگی کی  
طرح وہ کبھی سن بھاونے ہوتے اور کبھی ڈلاؤنے۔ مجھ پر کیا کیا گزر جاتی! میں خوش ہوتا، میں غم زدہ ہوتا،  
میں متحیر ہوتا، میں متاثر ہوتا، میں خوابیدہ ہوتا۔ میرے جذبات کا اتار چڑھاؤ اس لہر کی طرح ہوتا  
جو ہر بار نئی توانائی سے اٹھتی ہے اور کنارے سے مکر کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ شام کے سائے  
کسی سوگوار کے غم کی طرح گہرے ہونے لگتے۔ اُس اندھیرے اُجالے میں، میں کسی ستارے کو  
جھلسلاتے دیکھتا جو میرے ہی دل کی طرح دھڑکتا معلوم ہوتا۔ میں زندگی کی بے مصرفی پر غور کرتا  
کرتا پتھر سا ہو جاتا۔ میرے پوٹے، ڈھیلوں پر کھلے جم جاتے۔ مجھے اُسی وقت خبر ہوتی جب  
وہ ٹیس سے ڈھکے لگتے، میں انھیں بھینکتا، وہ خزاں زدہ پتوں سے ہوتے، جو ہوا کے جھونکے سے  
ٹہنی سے ٹوٹ سکتے ہیں، لہر نہیں سکتے۔ میں پوٹے کھینچ کر بند کرتا اور آنکھیں ملت۔ وہ عمل اس  
قدر لذت انگیز ہوتا کہ میں وقتی طور پر ہر آزار بھول جاتا۔ وہ مرغوب لمحہ گزر جاتا۔ رات کی تاریکی اور  
میری تنہائی اور جذبات کی پستی، وحشت انگیز ہوتی۔ اُس تسلط کو توڑنے کے لئے میں پہلو بدلتا  
اور گہری سانس لیتا، جس میں ٹھنڈی آہ کا اثر ہوتا۔ میں کانپ جاتا اور محسوس کرتا کہ میرے جسم کی گرمی  
نمی میں بدل رہی ہے۔ میری حالت گیلی ہٹی کے اُس بُت کی سی ہوتی جس کی گھائی میں پانی کی مقدار  
زیادہ رہ گئی ہو۔

بڑھتے بڑھتے اندھیرے بڑھ جاتے ستارے سہمے سہمے اور کمزور کمزور ٹپکتے جیسے میرے  
حالات کی غمازی کرتے۔ میرا دماغ آؤف ہوتا، لیکن دل احساس سے دھڑکتا اور خود آگاہی پر

مجبور کرتا۔ میں اپنے کپڑوں کے پیندوں کو دیکھتا، ہاتھوں کے گٹوں کو سہلاتا، تھکے ماندے اعضا کو ملتا جیسے اُن کی دراندگی میں اُن کی ڈھارس بندھاتا اور دردِ بائنت۔ میں اُن کی غم خواری میں اس قدر کھوجاتا کہ مجھے دل کی دھڑکنوں میں سسکیوں کی سی کسک لگتی۔ میرے خیال سے وہ چہرے گزرتے جن کے درمیان میں بڑا ہوا تھا۔ کوئی چہرہ مجھے ایسا نظر نہ آتا جس پر محنت کی کڑی چھاپ نہ ہو، جو دشواری حیات کی واردات نہ ہو۔ اس کے باوجود اُس محنت اور اس محنت میں بے پناہی فرق تھا۔ وہ فرق کیا تھا؟ میں سمجھ نہ سکتا۔ وہاں ماں چچی بیسی ہوئی سہاگ گاتی۔ بھائیاجی گڈا چلاتے ہوئے مرزا گاتے اور سانگی پر بیٹھے جھومتے۔ تایاجی آب پاشی کرتے ہوئے بانی گنگنائے گویا پانی میں جیون امرت گھولتے۔ میرا اپنا رویہ دیدنی ہوتا! میں خوبزوں کی رکھوالی کرتا ہوا ٹوڑی بناتا اور اُس میں جگنو بھر کر سر پر سجالیتا۔ میرے جذبے کی رعنائی! میں یوں مسرور ہوتا جیسے کوئی شاہ زادہ اپنی تلج پوشی پر۔ وہاں جدوجہد کی شدت ضرور تھی، لیکن بے اطمینانی اور ناگواری کا جذبہ نا معلوم تھا۔ میں مقابلے کے کام میں اپنے سے دو گنے سے بھر جاتا تھا۔ لیکن یہاں میرا ہر احساس نا تمام ہر شوق بے روح اور ہر عمل مفلوج تھا۔

کہاوت ہے، اُتم کھیتی، مدھم بیوپار، نکھد چاکری، بھیک دوآر۔ میں اس کہاوت پر غور کرتا۔ ان تینوں میں سے مجھے نوکری ہی اچھی لگتی لیکن انجیر کی نوکری۔ میں انجیر نگ پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دل کی بات امر سنگھ سے کہہ دی۔ اُس کھینے نے میری بات مجھے تہمت بنا کر لٹائی اور میں میٹرکولیٹ کے بجائے انجیر صاحب مشہور ہو گیا۔ اُن نا مساعد حالات میں میرے لئے یہ لقب یوں تھا جیسے اندھے کے لئے نین سٹھ۔

میں کام سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں بچتر سنگھ مل گیا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں یوں ہی تھا اور پرائمری پاس کر کے راج گری سیکھنے لگا تھا اور پورا معمار بن گیا تھا۔ وہ اپنے بچپن میں کتوں سے ڈرتا تھا اور کھڑا کھڑا گھبتا تھا تاکہ کتا دیکھتے ہی بھاگنے میں آسانی رہے۔ جب میں اُس کا ٹھٹھا اڑاتا تھا، اب وہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھے ذلیل کرتا تھا۔ وہ ٹرنٹ بولا، کیوں بھئی؟ سناہے انجیر نگ پڑھ رہے ہو!

”بالکل پڑھ رہا ہوں! میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔“

”خوب کیسے چلاتے ہو؟ گانڈ مرواتے ہو کیا؟“ وہ یہ کہو اس کر کے مسکرایا جیسے مجھ سے

اپنے بر محل تبصرے کی داد چاہتا ہو۔

”تیری تو ماں کی۔۔۔۔“ میں گالی دیتے مجھے سڑک کے کنارے پرے پتھروں کے ڈھیر کی جانب لپکا لیکن جب تک اُسے پتھر اٹھا کر مارا، وہ پتھر اُوکی زدے دُور جا چکا تھا۔

میری زندگی میں کتنے لمحے اُسے جب میری تجرُّج ذات مجھ سے کوئی بھی سنگین جُرم کروا سکتی تھی اور دم بھر میں مجھے میری بدنصیبی کی انتہا کو پہنچا سکتی تھی۔ وہ خطرناک لمحے کسی طرح بچر گزر گئے لیکن میرے دل میں بدے کا جذبہ بھر گئے۔ میں یہاں ایک اعتراف کرتا ہوں جس کی نوعیت میری کہانی ہی کی طرح یکساں ہے۔ اگر کوئی ایسا قانون ہے جو مجھے میرے خیالی جرائم کی سزا دے سکتا ہے تو میں سو بار، شاید ہزار بار پچھانسی کا مستحق ہوں۔

دلی میں آدمیوں کے انبوه تھے، پریشاں پریشاں، حیراں حیراں، دُھواں دُھواں، دیرال دیرال۔۔۔۔۔ عیسے شیطانی طاقت نے انسان کے احساسِ تعمیر کو جذبہٴ تخریب میں بدل دیا ہو۔ پرندوں کے چچھہ، موروں کے تاج، لہلہاتے کھیت، بھرنوں کے نغے ناپید سہی، موج صبا تک اس لمس سے بیگانہ تھی جو اداس غنچوں کو گلد گدا کر کھلنے اور مہلکنے پر مجبور کرتی ہے۔ آسمان پر ستارے تھے لیکن اُن کا جھللا ناکی کو لُبھا تا نہ تھا۔ چندا لاما کی طرف کوئی دیکھتا نہ تھا جیسے اُس میں کوئی دل کشی نہ ہو۔ پیٹ پالنے اور پیٹ مسونے کے جذبے کے سوا ہر وجدان غیر واضح اور بے آہنگ تھا۔ کائنات انسان اتنی چھوٹی تھی کہ روٹی کی ٹکیا میں سکڑی ہوئی تھی۔

گاؤں میں چاند ستاروں کی اہمیت اُن کی قدروقیمت تھی۔ میری تالی ماں، چاندنی رات کو دودھ نہائی دِلہن، کہتی تھی: چاندنی کی خوشگواہی، حُسنِ کاری سے عبارت ہے۔ ترنم (لڑکوں کا مل بٹھ کر چرخہ کا تنا، خاص کر چاندنی راتوں میں) میں بیٹھی گُرمیت کو جسمی بد شکل لڑکی، خوش شکل لگتی تھی۔ کسان، چاند کے ساتھ کھیتوں کو جاتے، ہل چلاتے، فصل سنبھالتے، رہٹ ہانکتے کھاد پیڑتے، نکائی کرتے۔۔۔ اور سورج طلوع ہونے سے پہلے گھروں کو لوٹ آتے۔ لوگ گیتوں کی دھنیں، بیلوں کی جھانجول کی جھنکاریں، چرخوں کی غوغاؤں، پیروں کے افسانے تھے۔ اُن جگمگاتی جاگتی راتوں میں دھرتی اور دھرتی کی ہر شے سنبھالنے اور مستانے رُپ میں ڈھل جاتی تھی اور مدھر الاپ میں گن لگتی تھی۔

ماں کہتی تھی، ”سورج بنا سیتی اگاتا ہے اور چاند اس میں بیٹھے، سلونے رس بھرتا ہے۔“

میں گاؤں کے چاند اور سورج کا شہر کے چاند اور سورج سے مقابل کرتا۔ اُن کے مقابلے

میں یہ مدقوت تو تھے ہی، بے کار بھی تھے، شاید اسی لئے شہریوں کی بے توجہی کا شکار تھے۔ شہر کے نزاعوں، اختلافوں، فسادوں، کینوں۔۔۔ کو دیکھ کر لگتا کہ یہاں سورج، بنا سیتی کی جگہ اُدھوے انسان پیدا کرتا ہے اور چاند، اُن میں کڑوے، کیلے خیالات بھرتا ہے۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے نظاروں سے نطف اٹھانا دُور کی بات ہے، میں کئی کئی دِن تک آسمان نہ دیکھ پاتا۔ کبھی دیکھتا تو اُس کی بے رنگی سے اخذ کرتا کہ وہ زمانے کے جھیلوں سے چھٹکارا پانے کے لئے دُور، بہت دُور جا بسا ہے۔

میں جتنا اپنے باہر ویران تھا اُس سے زیادہ اپنے اندر سنسان۔ میں بُرادے کے ٹھیر پر مَر دوں کی طرح پڑا رہتا تھی کہ جھوک، کچھ کے لگاتی اور مجھے میرے زندہ ہونے کا احساس دلاتی۔ میں کراہتا ہوا اٹھتا اور پیٹ پانے کے لئے ہوٹل کی راہ لیتا۔ میں جھوک کے سوائے ہر جذبے سے عاری ہوتا۔ میری افسردگی! مجھے ہر چیز دھندلائی اور مَر جھائی نظر آتی۔ اپنی صبح سمت کا جائزہ لینے کے لئے، میں کسی جانی پہچانی چیز کو پہچاننے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھ سے دُور جھاگتی نظر آتی جیسے مجھ سے خوف زدہ ہو۔ آمدورفت نہ ہونے کے برابر ہوتی، سڑک، صبح کے مقابلے میں لمبی اور زیادہ چوڑی لگتی جیسے اُس کے دونوں کناروں پر کمین و مَکاں میری آمد کی باس پاکر سُکڑ گئے ہوں۔ میری اپنی سانس کا ردیہ مجھ سے بدلا بدلا ہوتا۔ وہ اُس چنگاری کی مانند ہوتی جو گاہے بگاہے الاؤ سے ٹوٹی ہے اور ذرا اونچی اُڑ کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں عاجز و لاچار ہوٹل پر پہنچتا۔ وہاں کوئی دُوسرا گاہک نہ ہوتا اور تیرے بچا کھچھا کھانا سمیٹنے میں مصروف ہوتے۔ وہ مجھے ایسے دیکھتے جیسے دل میں کہہ رہے ہوں، ”تو اس وقت کہاں سے آ رہا ہے؟“ میں اُن کی تیوری کی گھر کی سُنتا لیکن خاموش رہتا اور بے وقت پھکاری کی طرح اُن کا منہ نکتا۔ اُن میں سے کوئی ایک بڑبڑاتا ہوا، تھالی میں کھانا پھینکتا اور اُسے جھٹکے سے میری طرف بڑھا دیتا۔ میں تھالی میں پڑے کھانے کے ساتھ اُس نفرت انگیز کردار کو دیکھتا جو میری جھوک کا چارہ کرتا۔ میں تھڑے پر تھڑے کھانا کھاتا۔ جو تیروں کے جذبات کی طرح مکروہ ہوتا اور تھالی کی دھات کی طرح ٹھنڈا۔ میری تسکین اُس جھوک کے پتے کی سی ہوتی جسے رونے اور چلانے ہی سے ماں کا دودھ نصیب ہو۔ اُس بے چارے کی رگوں میں دودھ کی شیرینی کم اور آہوں کی تلخی زیادہ ہوتی ہے۔

ہوٹل کے ملازم، گندے فرنیچر کو اُس سے زیادہ گندے کپڑے سے صاف کرتے اور اسے ادھر ادھر کھسکا کر فرش پر پکھری ہوئی گندگی سمیٹتے۔ وہ ایک دُوسرے کو اُس کی کاہلی پر

کوستے آور گا ہکوں کی گنوار و عادات پر تلاوت کرتے، جن کی وجہ سے اُن کا کام، رات کے پچھلے پہر تک بکھج جاتا تھا۔ وہ جوں ہی اُس ناخوشگوار فریضے سے نجات پاتے، اندھیرے گوشوں میں سے میلی کچیلی گودڑیاں نکالتے، زمین پر بچھاتے اور اُن میں گھس کر ایسی رضا و رغبت کا اظہار کرتے جیسے بدرود سے بھٹکے ہوئے کیڑے، اُس میں واپس رینگ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

اُن بدنصیبوں سے ہمدردی جتاتا ہوا، میں اپنے گھر پہنچتا۔ میرے جذبات کا عارضی پن! میں جوں ہی بستر پر دراز ہوتا، اُن کا غم بھول جاتا۔ میری نکان، تلوں سے اٹھتی اور ایڑیوں شختوں، پنڈلیوں، گھٹنوں، جانگھوں سے ہوتی ہوئی، وسط میں آکر بیٹھ جاتی جیسے وہ جگہ آمد و رفت کا نقطہ ارتکاز ہو۔ وہ مجھے ترغیب دیتی کہ میں اُسے سہلاؤں۔ میں انکار کرتا تو اُس کا اصرار بڑھ جاتا اور میں مجبور ہو کر اُس کا کہا مان لیتا۔ لطف، حواس کا ناپائدار تار ہے لیکن حواس اور اعضا اپنے کمالِ اتصال سے اُس میں استمراری ناپائیداری کی کیفیت پیدا کر دیتے اور مجھے اُس مقام پر پہنچا دیتے جہاں روحانی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔

## باب ۴۹

جذبات سے دیوانہ ہوا جاتا ہوں، حالات سے بیگانہ ہوا جاتا ہوں  
جب سے میں ہوا اپنی حقیقت کا نقیض، بے جوڑ سا افسانہ ہوا جاتا ہوں (شاطر)

خیرانی کی بات یہ ہے کہ وہاں ہر کوئی اپنے پیشے سے بیزار تھا لیکن دوسرے کے پیشے کو بہتر سمجھتا تھا۔ اس تعلق سے کاریگروں میں نوک جھوک چلتی رہتی تھی۔ لیکن کئی بار نوک جھوک سے قولِ متناقض جھلکتا تھا۔

پیارا سنگھ نے جکت سنگھ پر چوٹ کی، ”تیرا کام اچھا ہے! دھوپ پانی سے آرام ہے اور بالکن مفت کا۔ میری ادھی دھاڑیاں میگھ ناتھ کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔“

”ناں بھئی ناں، کام تیرا اچھا ہے! ایک اینٹ ٹھیک سے نہ ٹوٹی تو دوسری توڑ لی، ساہل میں نہ بیٹھی تو اٹھا کر بٹھالی، چٹائی ٹیڑھی ہو گئی تو پاستر میں سیدھی کر لی، تیرے تو مزے ہی مزے ہیں۔ بڑھئی کی آری اور درزی کی قینچی کا چلن ایک ہے، نظر ثانی کو اس سے معاملہ

ہی نہیں! جگت سنگھ نے اُسے کھینچا۔

”دیکھو تو ہمارے پیشے سے جُلا ہے کا پیشہ اچھا ہے! زیادہ تانیاں آگئیں تو اٹھا کر اندر رکھ لیں اور دن رات کام کر کے چار پیسے زیادہ کمائے۔ ہماری جو دہاڑی لگ گئی، لگ گئی۔“ پیارا سنگھ نے اُس کی ٹانگ لی۔

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو! جگت نے اعتراف کیا۔ جُلا ہا کام کے لئے مارا مارا بھی نہیں پھرتا ہماری طرح! اُس کا کام اُسے ڈھونڈنا ہے۔ جتنا وقت ہم کام پر جانے آئے میں برباد کرتے ہیں اُسے میں وہ گز، دو گز کپڑا بن لیتا ہے۔“ اُس نے اپنی بات سے نیا نکتہ پیدا کیا۔

”پھر کیا ہوا! آخر وہ ہے تو جُلا ہا ہی۔“ پیارا سنگھ نے اُس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ اِس سے پہلے کہ جگت سنگھ کچھ کہتا، وہ ترار ابھر کر سائیکل پر سوار ہوا اور یہ جا، وہ جانظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے اور کسی سے ہمدردی ہو تو ہو، میں کلرکوں کا نکتہ چیں تھا۔ وہ دیر سے کام پر جاتے اور پہلے واپس آتے۔ ہفتہ وار چھٹی کے علاوہ اُن کی دوسری چھٹیوں کی بہتات تھی۔ اُن تمام لیوز (میں ڈمٹوں کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ ڈمٹ، بغیر درخواست کے چھٹی لینا) آرٹڈ لیوز، میڈیکل لیوز، کثیر ڈل لیوز، نیشنل ہولی ڈیز کو جلاؤ تو دور کنگ ڈیز کے بعد تیسرا دن چھٹی کا ہوتا ہے، لیکن وہ اُس پر بھی مطمئن نہ تھے۔ اُس وقت ایک دولت آمیز روایت تھی اور اب بھی ہے۔ ایڈمنسٹریشن اور انڈسٹری کے ورکنگ اورز جدا جدا ہیں اور پہلی کے دوسری کے مقابلے میں کم ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ پہلے دماغی اور دوسرے جسمانی کام کرتے ہیں جو زیادہ تکلیف دہ ہے۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ کون سا کام ہے جس میں دماغ خرچ نہیں ہوتا؟ میں شیر سنگھ کے حوالے سے ایک بات کہتا ہوں۔ میاں، آدمی کو پاخانہ پھرنے کے لئے بھی دماغ کی ضرورت ہے! اُس نازک گھڑی جو پانچ ’پ‘ کا خیال نہیں کرتا، وہ جانور ہے۔

پ، پانی ساتھ رکھو۔

پ، پنڈ سے دور جاؤ۔

پ، پاؤں کا خیال کرو۔

پ، پلو سنبھالو۔

پ، پون کا رخ دیکھ کر پھرو۔

جن لوگوں نے ان دونوں شجیوں میں فرق سمجھا ہے، وہ ذلیل تھے! اور جو اس فرق کو  
برقرار رکھے ہوئے ہیں، وہ ذلیل نہیں! اس ترقی یافتہ فضا میں اُن کا دماغ اُسی تنزل کا شکار ہے جو  
صرف جاگیر دارانہ ذہنیت کی لعنت ہے۔

میرے شناساؤں میں ایک نئے نام، رام سنگھ پیار کا اضافہ ہوا۔ وہ شاعر نہ تھا لیکن  
تخلّص کرتا تھا۔ اُس میں خوبی یہ تھی کہ وہ آدب دوست تھا۔ میری رسائی اردو کتابوں اور رسالوں تک ہو گئی۔  
میں ساجر لدھیانوی کے کلام سے متعارف ہوا جو میرے حالات و جذبات کی کاہل عکاسی تھی۔ میں  
خود سے استفسار کرتا، "میرے کرب و بلا اور رنج و غم کی باتیں ساجر کو کیسے معلوم ہیں؟ اس چھوٹی سی  
تبدیلی کے بغیر میرا معمول جوں کا توں رہا۔ میں ساجر کے اشعار گنگنا تا تو میرا احساس کل ترکی طرح مہک  
اُٹھا۔ میں اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو تازہ بھیرت سے دیکھتا، جو اتنا خراب نہ تھا لیکن میری تنگدلی  
اور کم نظری سے کچھ زیادہ ہی خراب لگتا تھا۔ ساجر کے جذباتی مطالعے سے میں کئی دوسری چیزتوں سے  
مُدشمناس ہوا، جو ہر بحران کی تائید و تردید ہوتی ہیں۔ جب میں حوصلہ ہار دیتا میں اُن حالات کو اپنا نصیب  
سمجھتا جو میرے شب و روز بنے ہوئے تھے۔ اگر میں روتا، میں گیلی سٹی کا ڈھیر ہوتا، جس کی تشکیل، کہار  
کی مرضی کی احسان مند ہے۔ میں حوصلہ باندھ لیتا تو آب دیے لوہے ساجے لچک ہو جاتا۔ وہ لوہا بظاہر  
لوہا ہی ہوتا ہے لیکن اُس کے اندرونی اوصاف بدل جاتے ہیں، وہ کسی دوسرے لوہے سے پھڑپھڑانے  
تو اُس کے سینے میں اتر جاتا ہے۔

ایک رات میں کام سے لوٹ رہا تھا کہ میں نے چھوٹا سا جگمگٹا دیکھا جہاں کوئی غزل گا رہا  
تھا۔

خدا نے زندگی میری غصَب کے درمیان رکھ دی  
ادھر نوکِ سناں رکھ دی ادھر برقی تپاں رکھ دی  
چمن کے رنگ و بو نے اس قدر دھوکے دیئے مجھ کو  
کہ میں نے ذوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر نہاں رکھ دی

ناگہاں میرے سامنے لیشن سنگھ آپاسک اکھڑا ہوا۔ وہ سری رام پیل کا ہم پیار اور ہم نوا  
تھا، اُس رشتے سے میں اُسے حدِ ناپسندیدگی تک پسند کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت میں اُس کمزوری کا شکار  
تھا جسے غریب الوطنی کہتے ہیں۔ انسان کی بے گسی، خدیتِ جذبات سے کسی سہارے کی مٹلاشی ہوتی ہے  
اور وطن کی جاذب سے بادِ سُموم بھی اُسے تو ٹھنڈی ٹھنڈی اور بھینی بھینی لگتی ہے۔ بڑے وقت میں انتہائی



اُد منفی جذبوں کی بے رحمی اپنے انجام پر ہوتی ہے۔ اُد می جھوٹے وحشی کی طرح سبزہ زار دیکھتا ہے یا اجڑے دیرانے۔ غزل کے سوز و گداز کا اثر ایسے زائل ہوا جیسے لذیذ لقمہ کھاتے ہوئے دانتوں میں لٹکے اجلاے۔ میری آنسو سناک حالت دیکھ کر وہ اُد اس ہو گیا۔ اُس نے میرے ہاتھ چومے، آنکھوں سے لگائے اور مجھے سنبھالتے ہوئے کہا، ”گیان جی، آپ اس کام کے لئے نہیں بنے! آپ کی منزل اُد ہے۔ آپ میرے پاس رہیں، آگے پڑھیں اور اپنا مستقبل بنائیں۔“ میری بے بال و پری کو پر پر واز دیتے ہوئے اُس نے کتنے نام گنوائے، جن کو میں جانتا تھا لیکن پہچانتا نہ تھا۔ میں اُس کے حلقہ احباب پر حیران تھا۔ وہ میری نظروں میں کیا سے کیا ہو گیا! فخر کی بات یہ تھی کہ وہ سب اُس کی کویتا کلا کی برکت تھی۔ فطرت جذبات سے اُس نے مجھے گھٹے سے لگا کر بھینچا گویا وہ مجھے ساڑھنستی سے بچا کر اپنے دل میں رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے مل کر مجھے لگا کر میں نے اپنے کسی کھوئے ہوئے قیمتی ارمان کو پایا ہے۔ میں اُس کے ساتھ ہویا، یہ جانے بغیر کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اُس کے پاس ہر کیولیس کی نئی سائیکل تھی جو میری دلی آرزو تھی۔ اُس نے مجھے سائیکل پر آگے بٹھایا اور اُبل خاں پارک میں لے آیا۔ ہم ہری بھری گھاس پر بیٹھ گئے۔ وہ میری کمر میں بائیں ڈالے ہوئے تھا اُد میں اُس کی کمر میں۔ ہم ایسی خوشگوار باتیں کر رہے تھے جن کا واسطہ سنبھانے حالات اور پیارے جذبات سے تھا۔ میں نے اُسے اُد می سے الگ پایا جیسے میں ہریانہ میں جانتا تھا۔ انتہائی خوشی کی بات یہ تھی کہ اُسے میری ناداری سے نفرت نہ تھی۔ اُسے میری قابلیت پر بھروسہ تھا جیسے میرا باپ اپنی کم ظرفی میں دیکھتا نہ تھا۔ میں ہر طرح سے بہل گیا اور دھڑکن دھڑکن اُسی کا ہویا۔ ضرورت اور غسرت ایسے دونوں جو کسی کے احساس خاطر سے گھٹتے ہیں اور ترک احساس سے بڑھتے ہیں قارئین، میری حالت عجیب تھی! میں ہر کسی کو اپنے خوش آئند زمانے کی خوش خبری سنانا چاہتا تھا۔ میں پارک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اکٹھا کر کے اپنا راز داں بنانا چاہتا تھا اُد کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر لپکنا چاہتا تھا۔ ”دنیا والو! میری عاجزی کے اندھیرے مٹ گئے ہیں! میں اُن اُجالوں میں گھرا ہوا ہوں جو میری سر بلندی کا مینارہ نور ہیں۔“

میری روح کے پیکھ نکل آئے۔ میں زمین سے اڑ کر آسمان پر جا بسا جہاں سے دلی کے عالیشان مکان، گھر وندے نظر آ رہے تھے اور بجلی کے قمعے بے حقیقت شرارے۔ اُونچے درخت، زمیں بوس سبزے لگ رہے تھے اُد کشادہ سڑکیں، ٹکڑی ہوئی پگڈنڈیاں۔ میرا شوق پر واز! عرش بریں میرے پیروں کے نیچے تھا۔ میں مطلق العنان تھا اُد سر کشی کی حد اکبر پر براجمان۔ میرے سامنے ہر شے حقیر تھی اُد میرے رحم و کرم پر تھی۔ اُد می، گندگی کے یہ رنگتے ہوئے کیڑے تھے اُد اُن کی زاری و نزاری میری

زود حانی ترقی۔ آپس فلاکت زدہ دیکھ کر میں سرور تھا۔ میری ذلت و رسوائی کی مسلسل تکلیف نے مجھے بھیاںک حد تک اذیت خواہ بنا دیا تھا۔ انتقام جوئی میں کسی مسرت تھی! اپنی شرمناک دنیا کو تاراج کر کے میں نے اس کے خرابے سے جو کائنات تخلیق کی تھی اس کی شان و شوکت فوق الادراک تھی۔ میری نفرت نے مجھے نیا احساس دیا تھا، محبت، محبت کو جہنم دے کر دے، نفرت، نفرت کو جہنم ضرور دیتی ہے!

میں خود آرا و خود مختار تھا۔ میری ایک خواہش کے ساتھ دوسری خواہش جاگ رہی تھی۔ خواہش موافق ہو رہی تھی۔ میں سانس سانس سرور تھا، انگ انگ نور تھا، نظر نظر ظہور تھا۔ مجبوری، کمتری، معذوری، رنجوری۔۔۔۔۔ میں ہر اس جبلت سے دور تھا جس کو زوال و انحطاط سے نصیب ہے۔ وہ ریگڑھ پودہ سے دور آند پر بت پر رہتا تھا۔ آند پر بت! کیسا جذبات خیز نام ہے! راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے مجھ سے کہا، ”آپ جائیں آد سامان لے آئیں، میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔“

اس کا مودب لب و لہجہ آد سائیکل پھولنے کا شائستہ انداز! میں مہک گیا۔ میں سائیکل پر سوار ہوا، اس کے نئے پن کالس میری تجدید کر گیا۔ میں ریگڑھ پودہ کے علاقے میں پہنچا، کھالوں کی آنت سڑاند بھی اتنی گھناؤنی نہ تھی۔ میں گھر میں داخل ہوتے ہی سامان اکٹھا کرنے لگا۔ جگت سنگھ نے چیتھے چوے لہجے میں پوچھا، ”کیا ارادہ ہے؟ پھوٹے بھائی!“

اس صورت حال سے پیٹنے کے لئے، میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ میں اس سے آنکھیں پھرتے ہوئے، سامان سمیٹا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ ممکن ہے، میرا چہرہ، دل کا راز کہہ دے یا باتوں باتوں میں بات کھل جائے۔ وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اس سے منہ پھیر لیتا۔

”اوہ، یہ بات ہے!“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھ! اپنی مرضی سے آیا تھا اور میری مرضی سے جائے گا!“ اس نے میرا ٹرنک بند کیا اور میرے ہاتھ سے سامان لے کر پھینک دیا۔

”لیکن کیوں؟“ میں نے نرم سی زبان میں احتجاج کیا۔ اس کا انداز مجھے زہر لگا لیکن میں آند ہی آند پر پی گیا۔

”کہہ تو دیا، میری مرضی!“ اس نے رعب سے کہا۔

اس کے سخت روئیے سے میں سوچ میں پڑ گیا اور کوئی راہ نہ پا کر میں نے بے دلی سے

کہا، ”میں جارہا ہوں!“

”جارہا ہوں۔ یہ کوئی جواب ہے؟ اُس نے جھڑکا۔

بظاہر یہ نہایت بامعنی الفاظ ہیں لیکن مجھے بے معنی لگے۔ میں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور چُپ رہا۔ میں کچھ دیر رکا اور پھر سامان سیٹھنے لگا۔ وہ راہ بستہ دیوار کی طرح میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور دو ٹوک بولا، ”تو جانے پر بضد ہے، ٹھیک ہے، جا! لیکن بتا کر جا! میں نے اس پر بھی دم نہ مارا تو اُس نے فلسفہ بگھارا، ”میرے پیارے، یاد رکھ! ٹوٹا بازو، گل چندڑا ہی سنبھا لے! میں کتنا ہی بُرا سہی، تیرا پچھیرا بھائی ہوں۔“ اُس نے جس جذباتی لہجے میں کہا، میں اُس سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اپنے ہی خواہ کی تلقین کے باوجود سب کچھ اگل دیا جو مجھے راز میں رکھنا چاہیے تھا۔

”اوہ، وہ! اُس کے اظہار میں حیرت سے بڑھ کر استعجاب تھا۔ وہ حرامی شاعر! تجھے کہاں بل گیا وہ؟“

اُس نے میرا مذاق اڑانے کے سے انداز میں منہ بنایا۔

یہ جان کر مجھے رنج ہوا کہ جگت سچھ اُسے جانتا ہے لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا، ”تم اسے جانتے ہو؟“

ہوشیار پور کے جتنے بڑھئی دلی میں رہتے ہیں، میرے ناخنوں میں پڑے ہیں۔ میں جگت گڑھوں! اور ترکھانوں کے پوترٹوں سے واقف ہوں کہ وہ انھیں کہاں سکھاتے ہیں۔ وہ تو شاعر ہے، سونے پر سہاگ! کیا وہ آئندہ پریت پر نہیں رہتا؟ ملٹری کی بارکوں کے ادھر۔ اُس نے جس یقین سے کہا اُس میں گمان کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ دھم سے میرے ٹرنک پر بیٹھ گیا۔ ٹرنک پورا بھرا نہ تھا، دھب کی آواز آئی اور ڈھلکن اندر دھنس گیا۔ میں نے اُسے تشویش سے دیکھا لیکن وہ بیٹھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اِزام دیتے ہوئے بولا، ”جیسٹو، ویسا ہی تھو تھاتا ترک! اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گیا۔ میں اُس کے کاٹھے چھانٹنے پر نالاں ہوا اور سچپن میں سخی ہوئی ایک کہادت پر غور کرنے لگا۔ ترکھان ایسے بدذات ہیں کہ ایک ساتھ ہو کر اپنے مردے تک نہیں چھونک سکتے۔ اس کہادت کی تفصیل ضروری ہے۔ جب ترکھان چتا چٹنے لگے ہیں، ایک ترکھان چتا کی لکڑی ایک طرح سے رکھتا ہے، دوسرا اُسے اٹھا کر دوسری طرح سے رکھ دیتا ہے، تیسرا اُسی لکڑی کو اپنے طریقے سے ترتیب دیتا ہے اور چوتھا اپنے طریقے سے، نتیجے کے طور پر وہ چتا چٹنے میں ناکام رہتے ہیں اور مردہ چھونکے سے بھی۔ اُن کی اس نفسیات کا راز یہ ہے کہ ہر ترکھان اپنے آپ کو وشوا کرنا (وہ دیوتا جو سریشی کا کرتا دھرتی ہے)

کا اوتار مانتا ہے اور اپنے کام کے علاوہ ہر کسی کے کام کو ناقص گردانتا ہے۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جنت سنگھ میری خوش بختی پر تہمت طراز ہے۔ اتنے میں وہ سٹول اٹھائے اندر آیا، میرے سامنے رکھا اور اُس پر ٹانگ پر ٹانگ جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے گھور کر دیکھا جیسے میں نادان بچہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں کوئی بات کروں لیکن مجھے بے اثر دیکھ کر وہ اعلان کرنے کے سے انداز میں بولا "تو کس دنیا میں رہتا ہے؟ یہ دلی ہے، دلی! یہ چھنل اُسی کی ہوتی ہے جو اسے ٹوٹ لے، جو اسے ٹوٹ نہ سکے یہ اسے ٹوٹ لیتی ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رک گیا اور میں ہکا بکا اُس کا منہ جکے لگا۔ میری تذبذب میری الجھن بنی ہوئی تھی۔ وہ سٹول پر سے ایسے اٹھا جیسے وہاں بیٹھنا اُس کی بے چینی کا باعث ہو۔ وہ میرے برابر کھڑا ہو گیا، میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھا اور مجھ پر جو ہید اکیادہ دلی والوں کی پوشیدہ حقیقت ہے۔ "گاؤں والوں کے پاس دو زبانیں ہیں، ایک میٹھی اور دوسری کڑوی۔ لیکن دلی والوں کے پاس پانچ زبانیں ہیں، سمجھے! وہ دوبارہ سٹول پر بیٹھ گیا اور میں اپنی جمہوریت پر نادم اُس کے سامنے دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ وہ بظاہر مجھ سے مخاطب تھا لیکن اندرونی طور پر اپنے آپ سے۔ "دلی والوں کے پاس پانچ زبانیں ہیں، دل ایک بھی نہیں! اُس نے اپنی پہلی بات پر نظر ثانی کر کے اپنی بات بڑھائی، پہلی زبان ان کے منہ میں ہے جو ان کے کاروبار چلاتی ہے۔ دوسری زبان ان کی آنکھوں میں ہے جو دیکھتی ہے کہ کہاں کون سی بات کہنی ہے۔ تیسری زبان ان کے کانوں میں ہے جو سنتی ہے لیکن چپ رہتی ہے۔ چوتھی زبان ان کے پیٹ میں ہے جو فقط اپنے مطلب کی بات کرتی ہے۔ اور پانچویں زبان ان کے دماغ میں ہے! اسے اپنوں سے مطلب ہے، نہ پرانیوں سے۔ یہ اُسی وقت سامنے آتی ہے جب اسے اورنگ زیب کا سا کردار ادا کرنا ہو۔ یہاں کوئی جو کہہ رہا ہے، اُس کی سچائی سننے والے کی سمجھ بوجھ پر منحصر نہیں کہنے والے کی اصلیت پر موقوف ہے۔ چوں کہ دلی والے بے دل ہیں اس لیے بے تحمل ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصود ہے، اپنے فائدے کے لئے کسی کا نقصان کرنا۔"

میری نیت اُس سٹالے کی طرح ٹوٹی جس میں کوئی بیج مار دے۔ لیکن میں جوں ہی موافق و مخالف حالات کا تجزیہ کرنے لگا، میرا شاندار مستقبل مجھے ہکا بکا کرنے لگا۔ عین اُس وقت گندوں کے احاطے کا دردازہ کھلا اور جھک سے بدبو کارایا۔ وہ متعفن شے کبھی اتنی متعفن نہ تھی۔ ایک اڑتی ہوئی نیش تھی جو رگ و پے میں اتر گئی۔ اُن حالات سے میری نفرت بھر پڑ گئی اور میں سامان باندھنے لگا۔ مجھے غیر متاثر دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور افسوس سے کہا، "یار میں تو ان پڑھ ہوں! تو پڑھا لکھا ہو کر نہیں سمجھا کہ کوئی کسی کی بے مطلب مدد نہیں کرتا۔" اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور باہر نکل گیا۔

وہ جاتے ہی لوٹ آیا اور پتھری لے کر پھر چلا گیا جیسے موسم مشکوک ہو۔

میں نے اُس کی ہر بات پر سنجیدگی سے غور کیا، وہ دُست لگا۔ میں ارادہ بدلنے ہی والا تھا کہ میرے دل نے مجھے بھڑکایا، گمیان، یہ تیری ٹانگ کھینچ رہا ہے۔ یہ وہی ہے جس نے اُدھا کر ایہ پیشگی لیا تھا۔ تو جلا گیا تو اسے پورا کر ایہ دینا پڑے گا۔ تیرے مستقبل سے زیادہ اسے اپنے حال کی فکر ہے۔ اُس کی وہ مہربانی جو اُس وقت رحمتِ ناگہانی لگی تھی، مجھے نشتر کی طرح کھٹک گئی۔

میرے قارئین! میری زندگی میں جو کوئی آیا، جس کسی نے میرے لئے کُچھ کیا، میں نے کسی نہ کسی طریقے سے اُسے موردِ الزام ٹھہرایا۔ یہ میری فطرت کی تنہا مزاجی ہے یا احسانِ مندی کی کینہ پروری، جس کا محضول اپنے محسن کی تذلیل ہے۔

”وہ تجھ پر اتنا مہربان کیوں ہے؟“

میں نے خود سے ایسے سوال کیا جیسے ادہام پرست کوئی بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے قرءِ فال نکالتا ہے۔ خود سے کوئی صاف جواب نہ پا کر میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک جتنا پُر اعتماد تھا دوسرا اتنا ہی بدگمان۔ اُس دو دلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اُس کے پاس گیا لیکن سامان گھر ہی میں رہنے دیا۔ اُس نے پوچھا تو میں نے جھوٹ بولا کہ جگت سنگھ گھر میں نہ تھا۔

## باب ۵

بات ظالم کی شن کے چپ رہنا  
ظلم کا ایک باب ہے وہ بھی (شاٹر)

اُپاسک کا مکان میرے خیال کی ترنگ سے الگ تھا۔ چوں کہ میں بہکا ہوا نہ تھا، میں زیادہ مایوس نہ ہوا۔ مجھے خوشی یہ ہوئی کہ وہاں ریگڑھ پورہ کی بدبو نہ تھی۔ اُس نے پیٹنے پلانے کا اہتمام کیا۔ اُن دنوں میں سونگھنے کے سے آواز میں پیتا تھا۔ شراب تھی بلیک نامٹ لیکن حنظل کی سی کڑوی تھی۔ اُس کی ترغیب کے باوجود میں جام نہ چڑھا سکا۔ اُس نے اپنا جام غٹا غٹ پیا، بیکوڑوں سے منہ سلوا کیا اور دوسرا بھر لیا۔ ہم تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر وہ میرے کہنے پر اپنی نظم ’پاشو جوان ہو گئی‘ سنانے لگا۔ اُس کے گہرے لطیف لہجے نے ہر شعر اُس جلدی پر بنیاد یا

جہاں شوق کی جادوگری، ناقابلِ حصول خواہوں کو حقیقت بناتی ہے اور وہ بزمِ عیش سجاتی ہے، جس کی دل نوازی قطعی ہے۔ وہ نظم سنا رہا تھا کہ حسنِ وضعی کا دریا بہا رہا تھا۔ وہ کیت سسکتی حشرات، تڑپتی تمّتاؤں، ابلتے جڈلوں، بے باک اظہاروں اور بے گناہ خاموشیوں کا بولتا منظر تھا۔ پاشو وہ جوان لڑکی تھی جو اپنے گاؤں، گلیوں، کھیتوں، کھلیانوں، میلوں، تیوہاروں، دلوں، دماغوں اور خیالوں کی رونق تھی۔ اُس کے بغیر وہ سب ویرانے تھے۔ ماحول میں جوانی کی طغیانی آئی ہوئی تھی۔ کم سن، جوان ہونے کے خواہش مند تھے، جوان زمین پر پاؤں نہ دھرتے تھے، بوڑھے، جوانوں کی سی حرکتیں کرتے تھے، اس لئے کہ پاشو جوان تھی۔ میں نے اُپاسک کو تحسین آفریں نگاہوں سے دیکھا اور اُس کی شاعرانہ لیاقت کو سراہا۔ وہ اگر میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھ سے لاڈ کرتے ہوئے، میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سستروں پر رکھ لیا۔

بے اُبروئی کی نفسیات، اُبرو ریزی سے الگ ہے! پہلی ابتداء شکست ہے اور دوسری انتہائے شکست۔ پہلی حالت میں مجروح کی بحالی کے امکان زیادہ ہیں، نسبتاً دوسری کے۔ میں جھجھوکا سا اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا جو اندر سے بند تھا۔ اُس نے مجھے روکا۔ میں اُس پر لپکا، پیٹ میں سرکار ملا دیا اور اُسے چارپائی پر لے جا کر لیا۔ تھوڑی ہاتھ پائی بھی ہوئی جس میں میسری پگڑی ڈھے گئی۔ میں نے کونے میں پڑا ڈنڈا اٹھا لیا، وہ وہیں جم گیا جہاں پڑا تھا۔ میں نے پگڑی اٹھائی، دروازہ کھولا، ڈنڈا پھینکا اور گھر کی راہ لی۔ میرے غم نے مجھے گونگا بنا دیا۔ میری ناکردگی! میں اُسے گالی تک نہ دے سکا۔ کسی کی بات ناپے تولے بغیر تسلیم کرنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ میری زود اعتباری نے مجھے کیسے کیسے ذلیل کیا ہے!

میں ریکڑھ پورہ سے دور ہی تھا کہ بوند باندی شروع ہو گئی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا اگھر پہنچا اور ہچکچاتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ سارا احاطہ سوراٹتا ہوا اگھر جگت سنگھ جاگ رہا تھا جیسے میرا منتظر ہو۔ اُس کی بڑائی! وہ مجھ سے ناراض بھی نہیں تھا۔ اُس کی خاموشی نے مجھے اُس شرمندگی سے بچا لیا جو شکست خوردگی کا پس اثر ہوتا ہے۔ اُس نے اپنا بستر کچھ اُدھر کھسکایا اور میں برابر بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ میرا دل بھر آیا۔ بازوؤں کی گرج کے ساتھ بارش تیز ہو گئی جیسے آسمان میرے ماتم میں شریک ہو۔ میں غریبی میری رسوائی تھی اور میری زندگی اُن دردِ دیوار کے نیچے گھری ہوئی دراڑ، جو میری بے ہمتی سے اور بھی سکڑ جاتی تھی جیسے فشارِ قبر کی سزا بن گئی ہو۔ میری رُوح کی گلی سڑی لاش جیسے میں نازک خیالوں میں چھپانے کی کوشش کرتا تھا، میرے اندر سے نکل کر میرے جسم سے لپٹ جاتی۔

اُس کی سزا اِس قدر مجبھی ہوئی ہوتی کہ سانس جیسی لطیف شے بوجھل لگتی۔

کانٹوں اور دکھوں کا چلن ایک سا ہے۔ یہ اپنے حریفوں کے ساتھ جَم لیتے ہیں لیکن اُن کے برعکس زندہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کی رگ جال کے پاس دکھوں کی بارگھنی ہوتی جاتی ہے اور پھر یہ پھندے کی طرح کستی کستی آدمی کو بند حواس و بد وضع کر دیتی ہے۔

کُلفَت، کُلفَت کا رُتچہ خانہ ہے اور مسرت، مسرت کا، میں اپنی ناداری میں منفی قدروں میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں بذاتِ خود خوشی کا متلاشی تھا لیکن کسی کو خوش دیکھ کر کینے سے جل مرتا میں سوچتا کہ وہ میری غریبی پر طعن کرتا ہے۔ میرا رویہ مجھے چڑچڑا اور سرکش رکھتا۔ میں اپنے پھٹے پرانے سے نفرت کرتا لیکن کسی کے نئے کپڑے برداشت نہ کر سکتا۔ مجھے لگتا کہ وہ میرے جلانے کے لئے نئے کپڑے پہنتا ہے۔ میرا دل، کینہ پرور دل مجھے درغلالتا، تو اُس کے کپڑوں پر کیچڑ پھینک دے، انھیں پھاڑ دے۔ میری دماغی جھنجھلاہٹ اور روحانی کوفت اُس غلیظ شور کی سی تھی جو اپنی تسلی کے لئے اپنی ہی گندگی کھاتا ہے اور مطمئن رہتا ہے۔ مجھے مظلوم اور نادار لوگ ہی بچلے لگتے۔ میرا حسد، میری زندگی کی آفتوں تھی۔ اور حارس کا کردار بچھو کی طرح ہوتا ہے، وہ کسی کو ڈنک مارنے میں ناکام رہے تو خود کو ڈنک مارنے لگتا ہے۔

میں اک نئی موت مر گیا۔ اُس چھوٹی سی ملاقات نے مجھے بے پناہ کمزور اور بے پناہ لاچار بنا دیا۔ میرا معمول جان لیوا حد تک گھناؤنا ہو گیا۔ حسرت، ندامت، ذلت، میرے نفس کی فطرت تھی۔ میرے ضمیر میں دیر اثر زہر بھر گیا جو مجھے گھلا گھلا کر مارنے لگا۔ میری نفسیاتی حالت بگڑ گئی، کبھی وقت کی رفتار ٹھہری ٹھہری جان پڑتی اور کبھی چھوٹی سی گھڑی ہزاروں برس طویل۔

سچا سچکھ کا دین پوجا پاٹھ سے شروع ہوتا اور ملا متوں پر ختم۔ وہ میری ذرا ذرا سی کوتاہی پر لے دے کرتا اور بات بے بات مجھے کاٹتا اور پھٹکا کرتا۔ میری مظلومی اُس کا سامانِ نشاط تھا۔ میں اعتماد سے کہتا ہوں اور اپنا الزام دہراتا ہوں۔ میری مظلومی اُس کا سامانِ نشاط تھا جس کی مخبری اُس کے چہرے کا رنگ کرتا تھا۔ سرکہ فساد و عناد کی تحریک سرفرازی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جو جذبہ اُس کے جلال کی اکسیر ہے، اُس میں گاہے بگا ہے روح چھونکے تر ہو ورنہ اُس کی حالت گھاس بھوس کی آگ جیسی ہوگی جس کے فروغ کی مدت لپک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سچا سچکھ کے نفرت بھرے فقرے، کاریگریوں کے زہر بچھے آوازے، میرے خوابوں تک میرا پیچھا کرتے اور انھیں خوفناک بناتے۔ میں اُن سے دور چلا جانا چاہتا لیکن حوصلہ نہ کرتا۔ میں قفس زاد کی سی زندگی گزارتا تھا۔ وہ

گرفتارِ حال، کھلی فضا سے ڈرتا ہے اور خود کو وہیں محفوظ سمجھتا ہے۔

میں بیاراسنگھ اور امرسنگھ سے اپنی بے بسی کا رونا روتا۔ میں چاہتا کہ وہ مجھے مہار کا کام سکھادیں لیکن وہ ٹال مٹول کرتے تھے۔ میری فریاد کا اُن کے پاس ایک ہی جواب تھا، ”ہاں ہاں، مزد ضرور!“ اِن چار لفظوں کی خرابی، اِن سے چار ہزار درجہ بڑھ کر تھی۔

فطرت اور انسان میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ جو ہے، وہی ہے اور یہ جو اِدعا کرتا ہے ویسا نہیں ہے۔

پیارا سنگھ کی ظرافت میرے لئے سب سے بڑا آزار تھا۔ میں جب کبھی اُس سے کام کے بارے میں بات کرتا، وہ کہتا، ”گیان سنگھ جی، تم پڑھ لکھ کر انجینیر ہی بنو۔ ہنر، لفظ کی طرح نہیں کہ کاغذ پر لکھ لیا، غلط ہو گیا تو بڑے پٹاکر دوبارہ لکھ لیا۔ ہنر، ہم غریبوں کے لئے رہنے دو۔ پڑھے لکھے ہنر سیکھنے لگے تو اُن پڑھ کیا کریں گے؟“

میں ہنر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سُنا آیا تھا اور اپنی رسائی کے لحاظ سے مہمار کے ہنر کو بڑھئی کے ہنر سے آسان سمجھتا تھا۔ اینٹ ٹیڑھی لگ جائے تو اکھاڑ کر سیدھی کی جاسکتی ہے۔ ایک اینٹ خراب ہو جائے تو دوسری کے ملنے میں آسانی ہے۔ دیلی (ادھی اینٹ جسے پوری اینٹ سے توڑ کر چٹائی کی درز آگے پیچھے کرنے کے لئے سیر کو کے ساتھ لگاتے ہیں)، گل سٹنڈے (دو اینٹوں کے بیچ مسالے کی تہ) سے گھٹائی بڑھائی جاسکتی ہے۔ ہم جسامت اور عمودی گل سٹنڈوں کے کام کے لئے قہارت درکار تھے لیکن گھڑک ایشیں لگانے اور ٹھوکوں ٹپک کا ٹھٹھا انگریزوں کے ساتھ اٹھ گیا تھا۔ پلستر کا دور دورہ تھا جس کے لئے جیسی چٹائی ہوتی تھی، میرا خیال تھا کہ میں ویسی چٹائی کر سکتا ہوں۔ مہار چھ سات روپے دھاڑی پاتا تھا۔ اُس کے تھوڑے سے آزار جیسے تیشی، کرنی، جھولا، گرالا، ٹھانس، ساہول اور ڈوری دو دن کی اجرت میں نئے خریدے جاسکتے تھے۔ اس کے برعکس بڑھئی کے آزار میں تیشے، کلہاڑے، کمانچے کی صنف ایک ہے، باقی آزار صنف قدر صنف ہیں۔ آریاں، چورسیاں، رکھانیاں، رندے، ہتوڑے، برے، گینے پیمچ کس۔۔۔ میں پوری تفصیل میں جادل تو ایک نعت کا مواد ہے۔ تایا جی کے پاس بڑھئی کے آزار کا صندوق تھا، اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ آزار کم ہیں۔ وہ کہتے تھے، ”جیسے جیسے ہنر بڑھتا ہے ویسے ویسے آزار! ہنر وجدانِ نامیہ کی تحریک ہے اور نشاءِ ثانیہ سے عبارت ہے۔“

کاٹھگری میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں کوتاہی چھپ ہی نہیں سکتی۔ جگت سنگھ اپنے



بہن کی تعریف یوں کرتا تھا، اگر دو آدمی کرنی اور ہتھوڑا رکھتے ہیں تو ان میں سے ایک ہمارے اور دوسرا ہمارا۔ ان کا بڑھنی سے کیا مقابلہ! بڑھی، آئینہ ساز ہے۔“

قاریں! وہ ماہر تیشہ فراد تھا جس نے شیریں کے لئے جوئے شیر بہم پہنچائی تھی۔ میں تلخی روزگار کو شیریں بنانے کے لئے تیشے کا فن سیکھ رہا تھا۔

پاتام گھڑنا، چولیس چیرنا، پھید ڈالنا، تھریاں مارنا، قبضے بٹھانا، پتلے چڑھانا۔۔۔ میں آنکھت کام کرنے لگا تھا لیکن انھیں خوبی سے کرنے کے لئے میری پروگرس کم تھی اور پروگرس سچا سنگھ کی جان تھی۔ بچل اور پھید کو لیجئے، دیکھنے میں معمولی سا کام ہے لیکن ٹھنگ سے نہ ہوا پنا رنگ دکھاتا ہے۔ بچل اور پھید کے خطوط کو خطوط تک اڑا دیجئے اور نتیجہ دیکھئے۔ چوکھٹ ڈھیلی ہوگی سو تو ہوگی اس میں کان پڑ جائے گی۔ ڈھیلی بچلوں کو پچروں سے کس لیا، کان کا کیا علاج؟ میں تایا جی کا بتایا ہوا اگر، ناکامیابی سے آزار رہا تھا۔ میں بچل کے خط کھڑے رکھتا اور پھید کے خط اڑا دیتا۔ لیکن خطوط کے کھڑے رکھنے اور اڑانے میں جو زکات ہے، وہ آنکھ کی بصیرت ہے جسے چورسی، رکھانی اور ہتھوڑی سے لکڑی میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ ضرورت ہے جو مجھ سے بناتے بناتے بگڑ جاتی تھی۔

جہاں تک میری نعاشی زندگی کا سوال ہے، میں ضرورت اور طمانیت کی سرحد پر کھڑا تھا۔ میں ہمت کر کے سچا سنگھ سے اجرت بڑھانے کی التجا کرتا۔ وہ مجھ پر جیسی نہمت لگاتا، میں اُسے کسی طرح جھٹلا نہ سکتا۔

”جتنا وقت میں تیرے لگاڑے ہوئے کام کو بنانے میں خرچ کرتا ہوں اس سے آدھے وقت میں اُسے نے سرے سے کر سکتا ہوں۔“

”ترکھانوں کے بچوں میں رکھانی اور آری پکڑنے کی لیاقت پیدا اُٹھی ہوتی ہے۔ جس میں یہ طبعی صلاحیت نہ ہو، سمجھو کہ وہ حرام کا ہے۔“

ان کاریگروں میں سے سب سے زیادہ زبان دراز ہر نام سنگھ تھا۔ ایک دن اجرت کی بات چلی، اس ریزل نے کہا، ”تو اپنی مردار ایک روپیہ نہیں کما سکتا، یہاں تجھے ڈیڑھ روپیہ ملتا ہے۔“ میں اپنے غم میں شکایت آمیز خاموشی اختیار کر لیتا لیکن وہاں میری پروا کسے تھی! مجھے ان سے میل جول رکھنا اور مون توڑنا پڑتا۔ میری حالت چھلے میں گلی لکڑی کی سی تھی۔ وہ جلتی کم ہے اور رسوں کی ملا متوں کے ساتھ چھونکنے اور چمٹے کے چر کے زیادہ کھاتی ہے۔ میں ہر زیادتی کو ضرورت سمجھ کر برداشت کرتا۔ جہاں جسمانی ضرورت، حیات کی شرط اول ہو وہاں یہ عادت بن جاتی ہے۔ ایسی

عاقبت جیلتی ارتقا کے لئے رکاوٹ بنے اور نامیاتی زندگی کی نفی۔ اُف! آدمی کی بے بسی اُسے کہاں تک مختصر، نافر اور دشتِ نگر بنا دیتی ہے۔

میں سچا سنگھ کی خدمت ایسے کرتا جیسے اُس نے مجھے موت کے مُنہ سے بچا یا ہو اور میری زندگی اُس کا مجھ پر قرض ہو۔ میں نے کام آداگی اور محنت پسندی سے اپنی محبت کی ضمانت دی۔ میں سب سے پہلے کام پر جاتا، اُٹے پر جھاڑو لگاتا، پھھر کاؤ کرتا، گھرے میں پانی بھرتا، گلاس بانجتا۔۔۔ آواز تیز کرتا۔ ایک رکھانی کا دستہ بے شام تھا جس کی کچوں سے ہاتھ زخمی ہوتے تھے۔ میری لگن! میں چار آنے کے دو شام خرید کر لایا اور اُن سے نیا دستہ بنایا۔ کھلنے کی بدھی خراب تھی۔ جگت سنگھ کے پاس نئی بدھی کا بندل تھا۔ اُس سے بدھی لے کر میں نے کمانچہ مرمت کیا۔ میری دل چسپی اور عالی ظرفی نے ہنتر کا نیا پہلو پایا۔ ہنتر، بھوگ بلاس نہیں ہے کہ جس میں سرسری شرکت کرنے والا بھی اپنا کمال دیکھتا ہے۔ ہنتر گریز طلب عمل ہے، جو اس پر دل سے توجہ دیتا ہے وہی لطف اٹھاتا ہے جب کہ دوسرا اسے بارِ خاطر سمجھتا ہے۔ ہر پُرخلوں کا روبرو میرے تجربے کی تائید کرے گا اور میری باریک بینی کو سراہے گا کیوں کہ وہ ضرور ان مراحل کا رسیار با ہوگا۔

میری فرماں برداری اس قدر پوری تھی کہ وہ ساری جگہ میرے عمل کی خوش ادائیگی سے چھلکتی تھی۔ سچا سنگھ نے میرے عمل کو سراہنے کے بجائے بد خوئی طرح کہا، ”اس کی کیا ضرورت تھی؟“ میرے ساتھی جانتے ہی نہ تھے کہ محبت کس بلا کا نام ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی باتیں کرتے تو اُن سے شہوت کی رذالت ٹپکتی کہ از دو اجی زندگی کی رفعت۔ اُن سے میری توقع، خلاف توقع تھی۔ جسے موقع ملتا، وہ مجھے تمسخر کا نشانہ بناتا اور اپنی سخت زندگی میں لطافت پیدا کرتا۔ میری حالتِ بلدیہ کے بیت الخلا کی سی تھی۔ رفع حاجت کے وقت وہ ہر کسی کی ضرورت ہوتا ہے لیکن ذمہ داری نہیں۔ میں دن بھر بے شمار جملے سناتا جن کا تعلق مجھ سے اور میرے کام سے ہے۔ لیکن میں کچھ ہی جملے بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

”تیخ کا ڈنگا دوہرا کر دیا ہے، تیری آنکھیں ہیں کہ ڈوڈے!“

”آری کیسے پسندی ہے! (ہر دو دانت کے بعد آری کا ایک دانت ادھر اور دوسرا ادھر موڑا جاتا ہے جس سے چیر، آری کے پترے کی موٹائی سے کھلا ہوتا ہے آہ آری، پیر میں صاف چلتی ہے ورنہ لکڑی، آری کو پکڑتی ہے) ایک دندانہ لاہور کو جاتا ہے اور دوسرا پشاور (پشاور کو)۔“

”یہ چھید تیرے چھید سے ٹیڑھا ہے!“

ان نفروں کے ساتھ وہ جیسے القاب جوڑتے تھے وہ آدمی کی وحشی زندگی کے گھناؤنے ثبوتوں میں جنہیں اس نے سرمایہ بزرگاں جان کر سینے سے لگا رکھا ہے۔ میں اس لب ولہجے سے گریز کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا تشو و مناوہ ناگہیب طرز حیات مسترد کر چکا ہے۔ میں مجرم کی طرح گردن ڈالے چپ کھڑا رہتا۔ سچا سنگھ مجھے یوں دیکھتا جیسے کتا اپنی اٹی کے مواد کو جسے وہ پہچان نہ سکا ہو۔ میرا اذیت خواہ آدمی کی نسل سے تھا تو کیا ہوا، اپنی عادتوں کے لحاظ سے آوارہ کتے کی طرح جس تھا۔ اسے کوئی پچکارے بھی تو وہ مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے اور ناک سے دم تک تیر سا کھچا رہتا ہے۔

وہ شیوہ روزگار اپنانے کے لئے، میں نے وہ ماحول ناقابل برداشت حد تک برداشت کیا۔ میری صبر آزمائی کا ایک واقعہ سنئے۔ میں اڈے پر کھانا کھا رہا تھا، نہال سنگھ سامنے بیٹھا تھا، جسے ناک ٹپکنے کی عادت تھی۔ اس نے وہیں ناک سبکی، کاچھے سے ہاتھ صاف کیا اور پھر کھانے لگا۔ میں نے حقارت سے کہا، ”جہاں کھاتے ہو وہیں سکتے ہو! اٹھ کر پرے جانے میں موت آتی ہے!“ تیری روٹی پر جا چاہئے کیا؟“ اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ سے روٹی گر گئی اور میں نے قے کر دی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس ماحول اور کام کو بڑے دل گردے سے جھیلنا لیکن اس نے مجھے مسترد کر دیا جیسے صحت مند زخم، کھرنڈ کو کرتا ہے۔

تجربہ کاری، خود محاسبی ہے! یہ غلطی پرکھتی ہے اور غلطی کرنے سے روکتی ہے۔ میری نا تجربہ کاری نے جو کھٹ چھوٹی خطیادی۔ جب پتلے چڑھانے لگے، میری کاریگری، سامنے آئی۔ سچا سنگھ مجھ پر پل پڑا، تھپتھپوں اور لاقوں سے مطمئن نہ ہوا تو ڈنڈا اٹھا لیا۔ میرے نالے پتھروں پر پڑنے سے پتھر ٹوٹ جلتے۔ تماش بینوں کا ہجوم لگ گیا لیکن کسی نے نہ اثر لیا، نہ بیچ بچاؤ کیا۔ ان کے پاس نہ کان تھے اور نہ زبان۔ ان کے دیدے تک چھوٹے ہوئے تھے! کیوں کہ وہ دیکھ سکتے تو بے حس ستونوں کے سے کھڑے نہ رہتے۔ میرے قارئین! میں نے بے حس کے اس سے بھی حیرت ناک منظر دیکھا ہے! وہاں لوگ آتش خاموش کی مانند جلتے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والے کو نہ سبک آتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے۔ میرے ہمدرد اعضا کے سوائے ہر کوئی مجھ سے بے غرض تھا۔ میری آنکھیں رو رہی تھیں، دل تڑپ رہا تھا، زبان سماجت کر رہی تھی، ہڈیاں تھلوں سے چور تھیں پھر بھی میری قوت برداشت کی کی ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ میرے نگہ سار اعضاء وہ سب کچھ کر رہے تھے جو عذاب و اذیت میں

پچھتے دوستوں کا کرب ہوتا ہے۔ یہ ان کی مجموعی امداد کا حاصل تھا کہ اپنی ناداری کے باوجود، میں نے ہر جان بھرنا منظور کر لیا۔

”اتنے روپے تولائے گا کہاں سے؟ اپنی ماں کی --- سے!“

اُس کی گالی، خوں خوار خجری طرح دل سے ہوتی ہوئی رگوں میں اتر گئی اور بیچانی کیفیت برپا کر گئی۔ زندگی کے سارے قوائے عمل یکبارگی غیر معمولی شدت سے بروے کار آئے جیسے انھوں نے اپنی ساری توانائی اُسی مخصوص لمحے پر خرچ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں نے جواباً گالی دی لیکن میرے منہ سے چیخ ہی نکلی۔ میں اُس پر بھپٹا، اُس سے ڈنڈا چھینا اور بھڑ گیا۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اُس نے مجھے اٹھا کر نیچے پٹنی اور میری پچھانی پر چڑھ کر میرا گلا دبانے لگا۔ میں نے اُسے کلائیوں سے پکڑا اور بڑھتا ہوا دباؤ دکا۔ ”اٹھ کر مجھ پر جھک گیا اور پورا زور لگانے لگا۔ میرا ٹینٹو اندر دھسنے لگا، دم نہ کئے لگا اور سر، دھڑ سے ٹوٹنے لگا۔ وہ دباؤ ایک چھن آہ رہتا تو میرا کام تمام ہو جاتا۔ میں کسی طرح اُس کے بیٹھ میں ٹانگیں گھسانے اور اُسے پرے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اُس نے پھر مجھے نیچے گرایا اور نئے انتقامی جذبے سے مجھے گلے سے پکڑ لیا۔ ہم دو غیر مساوی لیکن مخالف طاقتوں کی طرح تھے۔ میں اُس میں ضائع ہوا ہی چاہتا تھا کہ میری نظر اُس کے ٹانگوں پر پڑی جو اُس کے ڈھیلے کپڑے سے باہر لٹک رہے تھے۔ میں پورے زور سے جھٹکا مار کر اٹھا، اُن پر بھپٹا اور دبوچ لیا۔ سچا سچ چوٹ کھائے گئے کی طرح ہلایا اور ڈھکے پڑا جیسے مڑھ ہو۔ میں نے اُسے دھکا دے کر پرے ہٹایا، وہ لو تھڑا سا بے حس و بے حرکت رہا۔ دوسرے کاریگر، بنتا سنگھ، ہر نام سنگھ، تیرتھ سنگھ، نہال سنگھ اُس کی مدد کے لئے دوڑے، میں نے کھپٹا اٹھا لیا۔ میرے سر پر خون سوار دیکھ کر جو جہاں تھا، وہیں رگ گیا۔

نفرت کا جذبہ جتنی تیزی سے بڑھتا ہے اتنی ہی تیزی سے اپنے مفعول پر اثر انداز ہوتا ہے، جو اس کے تصادم کی تاب نہ لاسکے، اُسے اپنی تحریک کی طاقت بنالیتا ہے جیسے جلتی آگ شوکھی گھاس کو۔ اس کی نفسیات طبعی، جنون ہے، اس لئے اس کی ابتدا ہی انتہا ہے۔ چوں کہ یہ جذبہ منفی قدروں کا حامل ہے، اس کی شان و شوکت اسی میں ہے کہ اس کے سامنے ہر کوئی مملعون و مملعون رہے۔ اس کی تلذیب پسندی ایہ اپنے حریف کو صرف باطل کرنے کے لئے باطل کرتا ہے۔

میں علی الاعلان سب کو گالیاں دینے لگا اور مقابلے کے لئے للکارنے لگا۔ کوئی آگے نہ

بڑھائیں نے جیکا را بلایا، اپنا سامان اٹھایا اور وہاں سے چل پڑا۔ میرا خروش ٹھنڈا ہوا تو میں نے اپنے اندر غلا محسوس کیا۔ میری رگوں کا چلن ہی بدل گیا اور مستقبل کے خوف نے مجھے بے دست و پا بنادیا۔ میں تیز گام مسافروں سے ڈر کر سڑک سے دُور ہو کر رینگنے کے سے انداز میں چلنے لگا جیسے موسم سرما میں زنبور، اُس کا ڈنک گر جائے تو طاقت پر واز بھی جاتی رہتی ہے۔

## باب ۵۱

شاطر زمانہ دے گا ضمانت دوام کی  
خود میں ذرا کمال تو پیدا کرے کوئی (شاطر)

میں جدھر جاتا وہی راستہ گھوم پھر کر ریگڑھ پورہ میں جا پہنچتا جیسے سارے راستے اُسی میں مل گئے ہوں۔ میں چاہتے ہوئے بھی بھائیاجی کے اس دعویٰ کو نہ جھٹلا سکا کہ آدمی کی جڑیں گھر میں ہوتی ہیں۔ ریگڑھ پورہ میں میرا ٹھکانہ عارضی سہی وہاں میری جڑیں نکل آئی تھیں۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی جگت سنگھ کو جھگڑے کی اطلاع مل چکی تھی۔ سچا سنگھ آیا تھا اور میرا حساب کر گیا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان کیا معاملہ رہا؟ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ جگت سنگھ نے محبوبِ تبسم سے مجھے دیکھا، میری پیٹھ تھپکی اور کہا ”عزت سے جینے کا یہی طریقہ ہے کہ شیر سے بتر ہو کر ملو۔“ اُس نے عزت سے جینے کا طریقہ بتایا لیکن اگے وہ راستہ نہ دکھایا جو میرے دیارِ روزگار تک جاتا تھا۔

میں اپنے بچپن میں ”گرو گوہند“ بندہ سنگھ بہادر، بدھی چند، جیسے جیالوں کے منظوم کارنامے پڑھا کرتا تھا اور گایا کرتا تھا۔ اُن کی بے نظیر شجاعت میرے فیضانِ رُوح کا باعث تھی اور اُن کے کردار میرے وجدان کے لئے ہمیز۔ کیوں نہ ہوتے! حکومت کے سپاہی، اُن کا پیچھا کرتے تھے، مجبوروں کے ذریعے اُن کا سراغ لگاتے تھے، اُن تک پہنچتے تھے لیکن وہ، اُن کی آنکھوں کے سامنے زپو پوش ہو جاتے تھے، غائبِ غلہ کی طرح۔ رائج سماجی اصولوں کے لحاظ سے وہ غیر سماجی عناصر اور سزاؤں کے مستحق تھے لیکن اُن کے کارنامے نئی تہذیبوں کے پیش خیمے ثابت ہوئے تھے آہستہ آہستہ وہ نوجوان اور گائے جانے لگے اور اُن کے دیوانے، اُن کے نام پر مرمٹنے لگے۔ میرے اندر کا گیان سنگھ مجھے اکسا تا کہ تیرے گھر سے بھاگنے کی دیر ہے، دولت تیری رکھیل ہوگی اور شہرت،

داسی! تو بادشاہ ہوگا اور دنیا تیری رعایا! مجھے تصور کے وہ بھرپور اور سرور لمحے یاد آتے جب میں اُس غلامی رکھ پراڑٹا تھا جسے دھارمک تصویروں میں پیتا مبرکشن چلاتے ہیں۔ ساری کائنات میری اور صرف میری ہوتی تھی۔ میں اپنی سلطنت میں سے وفاداروں کو ریاستیں دیتا اور غلاموں پر نوازشیں کرتا۔ اُس وقت میں ممتوئل تھا اور اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے ناقابل۔ اب میں آزاد تھا۔ اپنا راہبر آپ تھا! جو چاہے کر سکتا تھا اور کچھ نہ کر پارہا تھا۔ کیسا حیرت انگیز تضاد تھا! تنہا، انسانی حقیقت کا ایسا فروغ ہونے جو فروغ ہوتے ہوئے بھی دروغ ہے۔

انسان کی پہچان اُس سے نہیں بنتی جو وہ کرنا چاہتا ہے، اُس سے بنتی ہے جو وہ کرتا ہے۔ میری پہچان میری بیکاری تھی، جو میری بدحواسی بن گئی۔ آدمی کے کم سے کم وسیلے کا کھوجانا، دودھ پیستے بچے کے منہ سے ماں کا دودھ کھینچ لینے کے برابر ہے۔ میں کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ دلی چہتا گھٹنا شہر ہے، میں اتنا ہی اکیلا تھا۔ پتلے پتلے پاؤں دکھنے لگتے۔ میں اپنے پاؤں کو دیکھتا اور کبھی زخم ہونے والی راہ کو۔ مجھے لگتا کہ میں یوں ہی چلتا چلتا نابود ہو جاؤں گا۔ میرا یہ احساس جنابِ میر کے احساس سے کس قدر ملتا ہے!

پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا

اب رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ

خودِ اعتباری، انسانی زندگی کی ایسی خوبی ہے، جو اسے گرنے سے روکتی ہے، اوپر اٹھاتی ہے اور مقصودِ حیات پانے میں مدد کرتی ہے۔ میری بے اعتباری میرے سانس کی نفسیات بدل دیتی۔ وہ تارِ رگِ جال کے برعکس پھندے کی طرح ہوتا اور ہر جزو بدن سے اُلجھتا، جو نتھنوں سے لے کر پیھیٹوں تک اُس کے سامنے پڑتا۔ میں اپنے اندر تنہا اور ریزہ ریزہ ٹوٹا محسوس کرتا۔ پیٹ، پیٹھ سے جا لگتا اور انٹریوں کی دیواریں، انٹریوں کی دیواروں سے۔ بھوکے دکاروں کا اثر اٹا ہوتا۔ کر بان، حلق میں اور ہونٹ، منہ میں سکرٹنے لگتے۔ راستے میں نل یا پیاؤ دیکھ کر میں دراندازہ سفر ادھر بڑھتا اور پانی پیتا۔ اُس کی اِمکانی قوت ٹھہرے ہوئے اعضا کو حرکت دیتی اور نادانستہ طور پر اُن کی رہی سہی ہمت چھین لیتی۔ زورِ فاقہ، ضعفِ فاقہ میں بدل جاتا۔ میرے سامنے تیر مرے ناچتے۔ وہ مرئی تیروں کی طرح آنکھوں میں گھستے اور تیرِ وح کرتے۔ میرا سر جھکاتا اور میں زمین پر گرنے لگتا۔ مشکل سے سنبھلتا اور سر، ہاتھوں میں تھام کر وہیں کہیں بیٹھ جاتا۔ میری ساری رگوں کا درد، دیدوں میں سمٹ آتا۔ اندرونی دباؤ سے ڈھیلے پھیل کر بھٹتے اور اعصابِ ٹیس سے تڑپتے۔ درد کی کانٹھ کھلتے کھلتے کھلتی، بصارت لوٹتے لوٹتے

لوٹتی اور طاقت ایسے بحال ہوتی جیسے روندا ہوا کیڑا پہلے کنڈلی مارتا ہے، پھر اپنے بل کھولتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ریگلتا ہے۔ میں کمزور کمزور چلتا اور پاؤں تلے کی دھرتی کو دیکھتا جو جگا جگا سے روندی جا رہی ہے۔ مجھے لگتا کہ یہ دھرتی ان چارہ سازوں اور غمگساروں کی طرح ہے جو ہر کسی کا دکھڑا سُننے ہوئے لیکن اپنا حال کسی سے نہیں کہتے ہوں۔ دھرتی کہاوت ہے، رکھے بھی پیٹ تو مارے بھی پیٹ، میں اس کہاوت کی مثال تھا۔ پانی پینے سے بھوک کا درد کم ہوتا لیکن پیٹ آدھ بھرے گھرے کی طرح کھنکتا۔ میں پیٹ کی تال سے قدم ملاتا ہوا اگر دوا رہ رکاب گنج پہنچتا۔ میرے قارئین جانئے ہیں کہ میں گرو دواروں کی تحکیم و تقدیس کا قائل نہ تھا، پھر میں وہاں کیوں جانے لگا؟ میں وہاں اپنی بھوک مٹانے جاتا تھا پیٹ کی ضرورت، طمانیت حیات کی وہ ناقابلِ اطمینان حالت ہے جو آدمی سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔ خود کو زندہ رکھنا آدمی کی قدیم ترین جبلت ہے، جس پر کسی اخلاقی شرط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میرا عمل پھر بھی ضلع کل تھا ورنہ جو آدمی کم سے کم اشیائے ضرورت کا محتاج ہے، وہ کسی وقت بھی شہری قدریں پھلانگ کر قانونِ بیاباں کی پیروی کر سکتا ہے۔

میں ضرورت کو ایک الگ نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ ضرورت، تسکین پسند بے تسکینی کی ایسی تحریک ہے، جس کی سمت، ہمہ سمت ہے اور ہر سمت کی انتہا، خودکشی ہے یا ارتکابِ جرم۔ پہلی حالت میں انسان اپنے فعل میں اکیلا ہوتا ہے اور دوسری حالت میں صورتِ حال کے مطابق انسان پورے کنبے، پورے محلے، پورے گاؤں، پورے ملک۔۔۔۔۔ پوری نوعِ انساں کو اپنی ضرورت پر قربان کر سکتا ہے۔

آدمی کی اسی ضرورت نے خدا ایجاد کیا۔ پہلا خدا غریبوں، لاجپاروں، بیماروں، مظلوموں۔۔۔۔۔ کا بار و مددگار تھا جسے پھر بادشاہوں اور غاصبوں نے اپنا لیا کیوں کہ وہ نہ کھائے رازوالے، کی حقیقت سے واقف ہوئے تو انھیں اپنے کمال کو برقرار رکھنے کی ضرورت پڑی۔ اُس ضرورت کی نوعیت دوہری تھی، اپنے کمال کی بڑھوتری اور دوسرے کے زوال کی برقراری۔ اس لئے ابھرتے کو دیانا ان کا اخلاقی فرض ہو گیا۔ اُس جائز، فعل کی ناجائز تائید کے لئے انھوں نے ظل اللہ خداوند جیسے خطاب اختیار کئے تاکہ بوقتِ ضرورت وہ خدا ہی کی طرح ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں کا صفایا کر سکیں۔ فرق اتنا تھا کہ خدا کا تہرہ یلگ، چیچک، سیڑھے، کال، بھونچال۔۔۔۔۔ کی شکل میں گناہ گاروں پر نازل ہوتا تھا اور بادشاہوں کا جبر، سزاؤں اور جنگوں کی صورت میں کمزوروں اور باغیوں

لنگر کا وقت ہوتا تو میں لنگر کھاتا، وہ وقت گزر چکا ہوتا تو میں گرتھی سے کڑا ہ پر سادہ لنگر  
وہ میری مصمت سے ضرورت کا انداز لگاتا لیکن دیتا اتنا ہی جتنا اُسے دینا ہوتا۔ میں کڑا ہ پر سادے  
کر اپنے گرد بھوکے کتے کی مانند دیکھتا جو روٹی کا ٹھوڑا پار گرد پیش پر مشتہ ہو جاتا ہے۔ اُس تھوڑی  
سی خوراک سے میری بھک مری کا احساس بڑھ جاتا اور میں آنٹوں کی اینٹھن سے ہڈھال ہو کر سامنے  
پارک میں لیٹ جاتا۔

نئی دہلی سبزہ زاروں اور درختوں کا شہر ہے۔ انڈیا گیٹ سے پار لینٹ ہاؤس تک سبزہ زار  
بھی سبزہ زار دیکھ کر میں سوچتا کہ یہ زمین کسانوں کے پاس ہو تو وہ اس میں سے لاکھوں من اناج پیدا کریں  
میں حاکمان وقت کی عقل پر سلامت کرتا، جو گھاس اگانے کے لئے لاکھوں روپے کی محنت اور قیمتی پانی  
برباد کرتے تھے۔ سلطنت منلیہ کی مست روی جمہوریت کی بھاگم بھاگم میں کم تھی۔ میر، موئن،  
ذوق، غالب۔۔۔۔۔ کا تصور حقیقت کی نگاہ میں پس رہا تھا۔ انگریزوں کا ڈسپلن ہندوستانیوں کی  
بے اصولی کا شکار تھا۔ ہر جگہ آزدہ، غیر مطمئن، اٹھڑ۔۔۔۔۔ پنچابیوں کی بے اعلان حکمرانی تھی۔ کنگز  
کیمپ پر سرکاری عملداری تھی لیکن سبزی منڈی، روشن آرا گارڈن، موتی نگر، پہاڑ گنج۔۔۔۔۔ کون سا  
مقام تھا جہاں کنگز دے کیمپ کے غیر سرکاری نمونے موجود نہ تھے۔

میر اکوئی قابل ذکر رفیق تھا تو وہ ساجر کا کلام تھا۔ میں کسی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر تلخیاں  
پڑھتا اور اُن فنکاروں، کاریگروں، محنت کشوں کی نامزد زندگی پر آنسو بہاتا جو نام رکھتے ہوئے بے  
نام ہی مرے تھے۔ اُن کے سامنے میری مصیبت کی حقیقت کیا تھی؟ لیکن اُن کی مصیبتوں کی کہانی پڑھ کر  
میرے دکھ درد ایسے کم ہوتے جیسے کریلے کو نمک کے ساتھ کھانے سے اُس کا سیلا پن گھٹ جاتا  
ہے۔ میں کیسے کیسے خیالوں میں گھرا، حالات سے گزرا، سراما، میں سوچتا ہوں کہ اُن عناصر فگن  
حالات میں، میں سالم کیسے رہا۔

جیسے فصل گل کی آفرائش کے لئے زرخیز زمین اور دھوپ کی ضرورت ہے ویسے ہی آدمی  
کے نشوونما کے لئے محنت اور محنت لازمی ہیں۔ محنت نقش اعتبار کو ستوراتی ہے اور محنت حسن طبیعت  
کو نکھارتی ہے۔ کامیابی و برتری کا احساس سرچشمہ مسرت ہے۔ ایک ہی لطف حیات ہے جو  
آدمی کے مزاج کو بہتے دھارے کی طرح صاف رکھتا ہے۔

قول باغ میں دہاڑی دار ترکھانوں، مہاروں، قلعی گردوں اور پتلے داروں کا اجتماع ہوتا  
تھا۔ میں قسمت آزمائی کے لئے اُن میں بیٹھنے لگا۔ وہاں ترکھان آریاں تیشے، مہمار کر نیاں گرمالے،



قلعی گر کوچیاں ڈبے اور پلے دار بھاری صانے، ٹوکرے، پھاؤڑے سامنے رکھ کر بیٹھتے تھے۔ اپنے پیشے کی تصدیق کے لئے ہر کسی کے پاس کچھ نہ کچھ تھا۔ سب سے بڑھ کر اُن کی گندی بول بانی دیہاتی حرکات، کھردرے جہرے، نامہوار جلدیں ایسی سندیں تھیں جنہیں وہ پیشہ دارانہ صلاحیتوں کی علامتوں طور پر جموں پر لٹکائے پھرتے تھے۔ میری ناگواری اور کشمکش نے مجھے اس حد تک نہ بدلاتھا کہ میں اُن جفاکشوں کا مسئلہ جھہکھلا سکتا۔ جیسے غول بیابانی میں گھریلو مویشی کا پہچانا آسان ہے، اُن میں میری وہی علامت تھی۔

میں ہارے ہوئے سپاہی کی طرح زخمی غیرت اور شکستہ حوصلہ تھا۔ نئے ملاح کی بدحواسی کے لئے پیندا چھدی کشتی ہی کافی ہے، اُس میں نا اُمیدی اور تنگ نظری کے پتھر بھی پڑے ہوں تو آپ اُس کی ذہنی پریشانی کا قیاس کریں۔

میں پینڈار روڈ سے گزر رہا تھا کہ میں نے نسوانی پھلیں سنیں۔ ایک بنگلے کے لان پر رنگ برنگے چھاتے گاڑے ہوئے تھے۔ میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں سجائی جا رہی تھیں۔ چند گر سیال تھیں جو میزوں سے دوڑ رہی تھیں۔ کئی دو شیرازیں گھاس پر ٹھل رہی تھیں اور ہنسی کھیلتی بھی تھیں، کچھ پر دلی سے گھاس پر بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے ایک ہاتھوں پر بوجھ لے کر پیچھے جھکی ہوئی تھی اور اُس جھرمٹ میں سب سے زیادہ بے حجاب تھی۔ ایک ہاتھوں میں ٹھوڈی لئے گھٹنوں پر جھکی، شکری ہوئی تھی۔ دو آسنے سامنے پہلوؤں پر لیٹیں سر ہاتھوں پر تھامے ہوئے تھیں۔ حسیں کا ویسا جھرمٹ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں باڑ کے پیچھے مسخوڑا تھا اور ایک بھر د کے میں سے اُس رنگین ماحول کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اُن میں سے ایک سب سے الگ تھلگ پتھری کے نیچے کرسی پر رونق افروز تھی۔ اُس نے دھوپ چھاؤں سلک کا گلابی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کے من نقش اُس کے سر پر ہے۔ جیسے نازک تھے اور جلد نرم اور زریں۔ وہ لڑکی لباس کے پرتو میں خوبصورتی کی مثال تھی۔ میں اُسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنی چھینی گئی دنیا کو دیکھے، جس کے واپس ملنے کا امکان نہ ہو۔ میرے سامنے ایک ساتھ دو نعمتیں موجود تھیں۔ میری حسرت کا کمال! نہ میری رال بٹکی اور نہ ہی میری رگوں میں ہل چل مچی۔ میرے لہو میں وہ نفیس گداز تھا جو معصوم حسن کی عزت و توقیر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ کھانا کھانے کا بلاوا دیا گیا۔ وہ سب ادھر یوں مٹوچہ ہوئیں جیسے کسی کو جلدی نہ ہو۔ کھانا، کھانا سیدھا سادہ عمل ہے۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اس عمل میں کوئی دلکشی پوشیدہ ہے۔ ہاتھوں اور چچوں کا لوچ، دانتوں، ہونٹوں، گالوں، آنکھوں، ابروؤں، ہاتھوں اور لباسوں پر ابھر رہا تھا۔ ویسے تو ہر کسی کے چچو پکڑنے کا انداز خوب تھا

لیکن میں لال پری کی ادائے نازیبان کرتا ہوں کیوں کہ وہ میری دلچسپی کا مرکز تھی۔ وہ دہنے ہاتھ کی چھنگلی اور اُس کے ساتھ والی انگلی کو باقی تینوں انگلیوں سے جیسے جدا کئے ہوئے تھی، وہ احتیاط پسندی کی نظیر تھی۔ اپنے ہونٹوں کو دائرے کی طرح کھول کر وہ چمچ، منہ کے اندر گہرا لے جاتی اور نوالہ دانتوں سے سنہال کر زبان پر رکھتی، کچھ دیر رکھتی، پچھلے منہ سے نکالتی، دھنک سی بناتی ہوئی پلیٹ تک لاتی اور نوالہ چوسنے کے سے انداز میں کھاتی۔ میں باڑ میں سے سیدھا اُس کے استاقریب تھا کہ پچھلے کے پلیٹ سے ٹکرانے کی آواز سُن رہا تھا۔ ریلے ہونٹ، لپ سٹک سے اور ریلے جو رہے تھے۔ اُس کی اوڑھنی کھسکتی کھسکتی بچنے لگتی، جسے وہ بار بار سنہالتی۔ وہ لڑکی جو گھٹنوں پر ٹھکی اور سسٹی بیٹھی تھی، ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اُس نے پلو کو کا ندھے پر بکسوا لگایا ہوا تھا۔ وہ ٹٹک ٹٹک کر چلاتی تھی پھر بھی اُس کی ساڑی اُس کے لئے تکلیف دہ نہیں تھی۔ میرے جی میں آئی کہ میں اپنی پیاری، کو مشورہ دوں کہ وہ اوڑھنی کو کا ندھے پر بکسوا لگا لے یا گلے کے گرد دبل دے لے۔ اتنے میں اُس نے پچھلے پلیٹ میں رکھا اور اوڑھنی اتار کر کرسی پر رکھ دی۔ اُس مصیبت سے آزاد ہوتے ہی اُس کا پچھلے سے برتاؤ اور بھی دل فریب ہو گیا۔ اُس کے تھے، مرغی کے آندھے جتنے بڑے تھے لیکن اُس کی نازک بدنی پر بھستے تھے۔ لمبی مخروطی انگلیاں، لمبے رنگیلے ناخنوں سے اور مخروطی ہو گئی تھیں۔ اُس نے کھانا کھا کر پانی پیا گویا گلاس کا بوسہ لیا۔ اُس لطیف کام سے فارغ ہو کر اُسے اپنے بناؤ سنگار کا خیال آیا۔ اُس نے ہونٹوں کو ایک دوسرے کے اوپر دبا کر اوپر نیچے گھمایا اور اُن کے حاشیوں کو سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت سے سنوارا پھر اُسے ایسے دیکھا جیسے وہ آئینہ ہو۔ میرا سویا ہوا لمپٹ جاگتے جاگتے جاگ پڑا تھا اور اپنے تصور میں اُسے کہاں کہاں چوم رہا تھا بالکل ایسے جیسے بھونرا ایک پھول کا رس چوس کر دوسرے پر جا بیٹھتا ہے، پھر تیسرے پر۔۔۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کے لئے مڑ رہی تھی کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نفس پرستی کے جذبے سے مہکا ہوا تھا، مسکرایا۔ میری مسکراہٹ میں عاشقی و فریفتگی کے برعکس عاجزی و یکسی ہوگی کہ اُس نے مجھے گیٹ کی طرف آنے کا اشارہ کیا اور ایک پلیٹ میں بھوٹن اکٹھی کرنے لگی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں گیٹ پر رکنے کے بجائے آگے بڑھ گیا۔ میرے خلاف ادب زدیت پر اُس نے ناک بھوں چڑھائی جیسے وہ اس بھکاری کے معیار پر حیران ہوئی ہو۔ میرا نفسیاتی رویہ اُن لوگوں کا ساتھ جو اپنی بے ابروئی اور مفلسی سے لطف اٹھاتے ہیں اور اُس پر فخر بھی کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں اُن سے آگے نکل جاتے ہیں۔ میں دلی کی چکمتی دکتی دنیا میں اپنی حسرتوں کا لاشہ اٹھائے گھوم رہا تھا۔ دوسرے جتنے

مجھ سے عاجز تھے اس سے زیادہ میں خود سے متنفذ تھا۔ وہ نظم حیات اس قدر سفاک تھا کہ کام پر مزدوروں میں بھگدڑ مچی رہتی تھی۔ پوری اجرت پانے کے لئے شدہ پروگرس لازمی تھی۔ اس کی تصریح بھیانک سی بھیانک ہے! وہاں راج سیاہہ بھی بنتی تھی تو کل مشرول تاکہ دہاڑی کا ایک بٹاؤ، ایک بتائن، ایک بناچار بنانے میں آسانی ہے۔ دوسرے دن مشرول پکی کرنے میں ایک اور مصلحت تھی۔ کوئی فرد حادثے کا شکار ہو جاتا تھا تو ٹھیکیدار محدودت کو کام سے غیر حاضر دکھا کر معاوضے کے بھنھٹ سے بچ رہتا تھا۔ تایاجی کا بھلا لڑکا ترلوچن سنگھ اسی مصلحت کا شکار ہو چکا تھا۔

میں اس دور کا مقابلہ اس دور سے کرتا ہوں تو میرے روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آدمی، آدمی کے استحصال کا کہاں تک شکار تھا! مزدوروں کی تنظیم نہ تھی۔ اپنی خود اعلیٰ اور اجتماعی بے نظمی کی وجہ سے انھیں محنت کا صلہ معلوم نہیں تھا اس لئے ان پر انصاف کے دروازے بند تھے۔ وہ ٹھیکیداروں اور جمہداروں کو اپنا آن داتا سمجھتے تھے اور اس رشتے کی نزاکت جان کر نہ جانتے تھے کہ ان کے روئے سال تک اپنے بچے کو دودھ نہیں دیتی ہے۔ وہ ان کی شان و شوکت سے خوفزدگی کی حد تک مرعوب تھے اور ان کے خلاف منظم ہونے سے ڈرتے تھے۔ ان کی کمزوری اور نامزدی نے ان کے آن داتوں کو سنگدل سے بے رحم بنادیا تھا۔ وہ جفاکش اس قدر بھولے تھے کہ جانتے نہ تھے کہ وہ اپنے دور کے ہنومان ہیں۔

وہاں ایک دن، طیرہ دن کے برابر تھا کیوں کہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ ہفتہ داری چھٹی اور آٹھ گھنٹے کام کے لئے جلوس نکالے جاتے تھے، ہڑتال کے نوٹس دیئے جاتے تھے لیکن ہڑتال کے دن لیڈروں کے علاوہ ہر کوئی کام پر جاتا تھا۔ کامریڈز دھرنا دیتے۔ وہ مزدوروں کو کو ادھر سے روکتے، وہ ادھر سے کھسک جاتے، ادھر سے روکتے تو ادھر سے کھسک جاتے۔ وہ ان کو ادھر ادھر دونوں طرف سے روکتے تو وہ کام پر ڈیرا ڈال لیتے۔

سبحان سنگھ پارک میں کرتا سنگھ وگل کا کام چل رہا تھا۔ راج کماری امرت کور ہلتھ منسٹر کوورلڈ ہلتھ آرگنائزیشن کے وفد کو ایک ورکنگ سائٹ دکھانی تھی، اس نے اسی سائٹ کا انتخاب کیا۔ مزدوروں کو دستلے، ڈسٹر، گم بوٹ اور صابن دیئے گئے۔ انھیں یہ جملہ رٹایا گیا کہ وہ سامان انھیں ہمیشہ سے ملتا آیا ہے۔ مزدور گم بوٹ پہن کر مضمحلہ خیز انداز سے چلتے اور اپنے آپ پر ہنستے۔ بٹوں کی حواچ ضروری کے لئے طہارت خانہ بنایا گیا اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے کچج۔ نرسوں کو دیکھ کر پریوں کا گمان ہوتا تھا۔ بچوں کو نہلا کر کچے دودھ کے سے نئے کپڑے پہنائے گئے اور ان پر بکسودوں

سے چٹے تو مال لگائے گئے۔ مائیں اپنے لادلوں کو صاف ستھرا دیکھ کر پھولے نہ سہا رہی تھیں۔ اُن کے چہروں کی تھکن اور پتھر زدگی، جو سالہا سال کی جمع شدہ غلاظت کی طرح گھناؤنی لگتی تھی، بالکل غائب ہو گئی تھی۔ یہ چمٹا کر کیسے ہوا؟ اس طرح کہ اُن کی کوکھ کے پودوں نے اپنا اصلی رُپ دکھایا تو اُس کی تازگی کا عکس اُن کے چہروں پر در آیا۔ بچوں کے کھیلنے کے لئے کھلونے اور پڑھنے کے لئے تصویروں والی کتابیں تھیں۔ گرج کے باہر سفید رنگ کا دُاش سٹینڈ تھا جس پر سفید رنگ کی دو سیلفیاں رکھی تھیں۔ اُن میں سے ایک میں صاف دوسری میں ڈیٹول ملا پانی تھا اور ساتھ ہی رکھا ہوا بے داغ تولیہ جو روش، گرج تک جاتی تھی، اُس پر لال درمی پچھائی تھی، جس کے دونوں طرف پھولوں کے گملے سجائے تھے۔ دریاں، ساٹبان، کھوٹے، طنائیں، گملوں کا رنگ۔۔۔۔۔ اس بات کی تصدیق تھی کہ وہ انتظام بالکل نیا ہے۔ اُس خوش نصیب دن کی خوش کن بات یہ ہے کہ مزدور اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے جیسے اُن کا متصور مستقبل انھیں گدہ دار ہوا۔ کام کی جگہ کو قابل قبول بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ حوض کے گرد کیچڑ بھرا رہتا تھا، اُسے ہٹا کر گز بھر چوڑا اینٹوں کا فرش باندھا گیا اور ادھر ادھر بکھرے روٹوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔ مٹی کے ڈھیر بچھا دیئے گئے اور ہر بلاک نیکو پہنچنے کے راستے بنا دیئے گئے۔ آفر کہتے تھے کہ راج کمار، رسوئی گھر پر توجہ دے گی۔ ایک گھر کی رسوئی خاص طور پر تیار کی گئی جس کا سارا کام سرجن سنگھ اور سروپ سنگھ نے کیا کیوں کہ وہ بہت ماہر مہار مانے جاتے تھے۔ وفد کے معائنے کا وقت یوں ترتیب دیا گیا کہ جب وفد پہنچے، پچھلے کو دودھ اور پھل دیا جا رہا ہو۔ میں وفد سے زیادہ راج کمار میں دلچسپی رکھتا تھا کیوں کہ میں نے راج کمار کی دیکھی نہ تھی۔ میں نے اُسے دیکھا، میرا تصور چور چور ہو گیا۔ وہ اپنے قد کی مرل سی بوڑھی تھی جس کا منہ چوڑے ہوئے ام کی طرح تھا۔ وہ ایسے چلتی تھی جیسے اُسے اپنے اطراف گڑھے نظر آ رہے ہوں۔

دوسرے دن وہاں نہ کُرج تھا اور نہ نرسیں۔ بچے دیواروں کے سارے میں کھیل رہے تھے جیسے وہ کھیل کرتے تھے۔ گم بوٹ، آرد ستانے مزدوروں سے واپس لے لئے گئے، طہارت خانہ کو تالا لگا دیا گیا، آرد حاجت مند اپنی حاجتوں کو ویسے ہی رفع کرنے لگے، جیسے وہ کرتے آئے تھے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی، ہفتہ وار چھٹی اور دوسرے حقوق حاصل کرنے کے لئے جو کامریڈز گولیوں اور لاطھیوں کا شکار ہوئے ہیں، میں اُن کی بارگاہِ شہادت میں سر جھکاتا ہوں۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر ایسا کام کر گئے جو بندوں کے خدا نہ کر سکے۔ اُن کی حکمتِ عملی کے پودے کا پھل پوری

کہ پچھڑے کو بدشگونی سمجھتے تھے۔ وہ رخصت کے وقت جیسے دل دہلا دینے والے آنسو روتے ، انھیں دیکھ کر میری رُوح میں زلزلے آتے۔ وہ لوگ بیک وقت اوہام پرستی اور زندہ دلی کے دریا تھے۔ میں اُس میں غوطے نہکا تا تو یقین نہ کرتا۔ وہ عادی طور پر غریب سہی ، دولتِ احساس سے مالا مال تھے۔ جس مٹی نے اُن کا پالن پوسن کیا ہوتا ، وہ اُسے خاکِ مقدس مانتے اور اُس سے ٹپکے لگاتے۔ وہ اپنی محنت کا حاصل ، در و دیوار کو چومتے۔ اُن کے سنگلاخ چہرے ایک لطیف سی جھلک سے جگمگا اُٹھتے جیسے گھور اندھیرے میں کرن پھوٹ پڑے۔ اُس نازک گھڑی وہ در و دیوار ، مٹی کے بے جان آثار ، اُن ہونٹوں کا لمس محسوس کرتے لگتے اور اُن کی گرمی جذبات سے پگھلتے دکھائی دیتے۔

باب ۵۲

ہم اُسے آدمی نہیں کہتے  
جس نے ٹھوکر کبھی نہیں کھائی  
(شاہر)

[illegible]

و غیر۔ وہ اُن بیکاروں کو کھلاتے پلاتے، کام ملتا تو کام پر لگاتے اور اُن سے اپنا قرض اور کمشن دونوں وصول کرتے۔ ہر جمعہ دار کے مزدور اُس کی ذاتی فوج کی طرح تھے اور مخصوص احاطوں میں رہتے تھے۔

اجل خاں روڈ کی چمک دمک مشہور تھی۔ میں جس دن اُدھر جاتا، ایک کونے میں کھڑا ہو کر انسانی چہروں کا نظارہ کرتا۔ اُس نظارے میں انوکھی خصوصیت یہ تھی کہ وہ پانی کے دھارے کی طرح جذبات کی رو بدلتا تھا۔ میں نے وہاں جہارام کو دیکھا۔ میں نے اُسے پکارا، اُس نے مجھے دیکھا جب تک ہم گلے ملے، ہمارے چہرے کتنے ہی اُسلوبِ اظہار سے گزر گئے۔ میری حالت نئے فقیر کی سی تھی اور اُس کی نئے امیر کی سی، پہلے کو لینے کی جلدی ہوتی ہے اور دوسرے کو ٹھٹھا دکھانے کی، میں پڑتے ہی اُسے اپنی مصیبت سنانے لگا، اُس نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا، ”پہلے رس ملانی کھاتے ہیں پھر تیری بات سنتے ہیں۔“

اُس نے میری بات پورے دھیان سے سنی۔ دوسرے دن حسبِ وعدہ وہ مجھے قریل باغ میں ہریانہ کے ایم۔ پی۔ جگت نارائن کے پاس لے گیا اور مجھے شیڈول کاسٹ کا سرٹیفکیٹ دلوا دیا۔ ہم وہاں سے واپس ہوئے تو اُس نے فخر سے کہا، ”لے گیاں! تیرا ٹھو پار ہو گیا۔ یہ سرٹیفکیٹ جادو کی چھڑی ہے۔ اب تو اسپلانمنٹ ایکسیجینج میں نام درج کروالے، گورنمنٹ سروس ملے گی!“ جہاں کہیں ملتا میرے ساتھ ہندوؤں سے پیش آتا اور کسی نہ کسی طرح میری خاطر کرتا۔ اُسے دیکھ کر میں خوش ہوتا اور پالتو کتے کی طرح بھاگ کر اُس کی آغواںی کرتا۔

میں اپنی خوشی دبانے لگا اور یہ راز رام سنگھ سے کہہ دیا۔ اُس نے مجھے ڈرایا، یہ سراسر جھل سازی ہے۔ نوکری ملنے ہی پولیس کی تفتیش ہوگی اور سچائی سامنے آجائے گی۔ سنا بھی ہو سکتی ہے!“

میں ڈر گیا اور اُسی وقت اُس جھلی دستاویز کو پھاڑ دیا۔ جہارام نے مجھے بزدل کہا اور سمجھایا کہ اپنی ترقی کے لئے جو کرو جائز ہے! لیکن میں اُس سے اتفاق نہ کر سکا۔ میری بزدلی نے مجھے کئی بار ناخوشگوار صورتِ حال سے بچایا ہے۔ پھر اُس نے مجھے خود ہی سمجھا دیا، ”تیرا نام دریا گنج کی اسپلانمنٹ ایکسیجینج میں درج کروا دیتا ہوں، پھر وہاں سے کوئی راہ نکالوں گا۔“

وہ ڈی۔ ٹی۔ یو۔ میں بس کند کڑ تھا۔ ہم دریا گنج کے لئے بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ حالانکہ کئی بار بیٹھنے کے لئے جگہ ملی، اُس نے ددازے ہی کے پاس کھڑا رہنا پسند کیا۔ وہ وہاں کھڑا بس

میں چڑھتی، اُترتی لڑکی کے گولہ پہ پڑ چکی بھرتا کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا تو اُس سے ایسے پھڑتا کہ اُلجھ سا جاتا اور پھر 'ویری سوری' کہہ کر اُسے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا۔ جب بس کنڈکٹر نے ٹکٹ کے لئے پوچھا، اُس نے اُسے "شافدیلینز" کہہ کر ٹال دیا اور مجھے بھی ٹکٹ لینے سے باز رکھا۔ ایپلائمنٹ ایکسچینج کی لمبی آمد پر بیچ قطار سے بیٹھنے کے لئے اُس کی عیاری ہی کام آئی۔ چوں کہ ہم وہاں سے جلدی فارغ ہو گئے، وہ مجھے لال قلعہ دکھانے کے لئے لے گیا۔ انقلابِ وقت ! وہاں بیگموں اور شہزادیوں کی جگہ سیاحوں کی بے لگام ٹولیاں تھیں۔ دیونِ خاص اور دیوانِ عام بے رغونت تھے۔ جہاں تختِ طاؤس ہوا کرتا تھا وہاں پتھر کا چبوترہ تھا۔ ٹھتھوں اور دیواروں پر گرٹھے پڑے ہوئے تھے۔ حجام نے بتایا کہ وہاں ہیرے، جواہرات جڑے ہوئے تھے جو نادر شاہ نکال کر لے گیا تھا۔ اُس کی آواز چائن سنگھ کی باتیں تاریخ کے اوراق میں نہ تھیں لیکن سچی لگتی تھیں۔ چائن سنگھ دلی کے قتل عام کا ذکر اپنی زبان میں کرتا تھا۔ نادر شاہ کے کچھ سپاہی لوٹتے کھسوٹتے فوج سے دور چلے گئے اور مقامی لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ نادر شاہ کو خبر ہوئی، اُس نے تاؤ کھا کر تلوار کھینچ لی، جس کا مطلب تھا، قتل عام ! تین دن تک یہ گھمن جاری رہا۔ اہل دلی، دلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آخر سپاہیوں نے آکر شکایت کی کہ قتل کرنے کے لئے آدمی نہیں مل رہے ہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کا سپاہ سالار آصف جاہ بے بس دیکھ رہا تھا اور پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور دست بستہ بولا،

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ نازکشی  
مگر کہ زندہ کنی خلقِ راو بازکشی

(تیغِ نازک کی مشقِ قتل کے لئے کوئی زندہ نہیں بچا ہے۔ ممکن ہے تو مردوں کو زندہ کر دو اور اُنھیں دوبارہ مارو)

یہ سن کر نادر شاہ فخر سے مسکرا دیا اور تلوارِ میان میں رکھ کر روشن الدولہ کی مسجد میں بیٹھ گیا، تب کہیں قتلِ عام بند ہوا۔ نادر شاہ کو رنگیلے کے خزانے سے حسبِ اُمید دولت نہ ملی، اُس نے قلعے کی بیگمات سے لے کر ملک کی بھٹیاریوں تک کے زیور اُتروائے۔ ہندوستان سونے کی چڑیا اسی لئے کہلاتا تھا کہ یہاں غریب سے غریب بھی سونا پہنتا تھا۔

چائن سنگھ کا بیان سن کر میں سوچتا، "بلو شاہوں اور لٹیروں میں کیا فرق ہے؟" میں ہوشِ اسی نتیجے پر پہنچتا کہ یہ ایک ہی جنس کے دو نام ہیں۔

مجھے مُلک کے بٹوارے کی بات یاد آ رہی ہے جسے میں بھول گیا تھا۔ ایک صبح میں نے دیکھا کہ ہمارے گھر میں ہرے رنگ کی ایک چوکتھ پڑی ہے اور اُس کے ساتھ دروازے۔ وہ سامان پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ میں نے تایاجی سے پوچھا، ”تایاجی! محمود سومنا تھ مندر کے دروازے اُکھاڑ کر لے گیا تھا اور بھائیاجی، احمد خان کے گھر کے دروازے چُرالائے ہیں، دونوں کے کردار میں کیا فرق ہے؟“

انھوں نے قدرے توقف سے کہا، ”بنیادی طور پر دونوں چور ہیں اور قانون کی نظروں میں مجرم! لیکن حالات کے لحاظ سے فرق ہے۔ محمود کا جرم تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور تن سنگھ کا جرم وقتی نوعیت کا ہے۔“

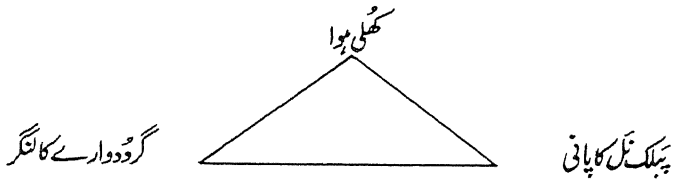
دوبہر ہو رہی تھی۔ جُمارام نے موتی محل میں کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ وہ شاہانہ رکھ رکھاؤ خواب پرور ماحول، پتھریاں کانٹے (جین کے استعمال سے وہ کسی حد تک اور میں پوری طرح ناواقف تھا) نفیس کھانے، صاف ستھرے بیرے۔۔۔ اور اُن سے بڑھ کر میرے میزبان کی باتیں، جلالِ قلم کی تاریخ سے زیادہ بے رحم اور سُرائیگر تھیں۔

میرے قاریبیں، تاریخ کتنی ہی سفاک ہو، آدمی کے اپنے زخموں سے زیادہ سفاک نہیں ہوتی! کیوں کہ ان کا دزدی حیات ہوتا ہے۔ اُس کی تنخواہ سو روپے سے کم تھی لیکن اُس کی بالائی آمدنی ہزار بارہ سو سے بڑھ کر۔ میں اُس سے نفرت کرنے لگا۔ اُس نفرت کی وجہ میری دیانت داری یا قومی جذبہ نہیں تھا، میرا اگر احساس تھا۔ میں شتم پشتم وقت کاٹ رہا تھا، جو بیس گھنٹے میں ایک بار گڑھا بھرتا تھا اور وہ سو روپے کو حقیر رقم سمجھتا تھا۔ وہ مجھ سے ملتا، مجھے لگتا کہ وہ میری غربتی کی ہنسی اڑاتا ہے۔ میری زبوں حالی سے متاثر ہو کر اُس نے مجھے اپنے کپڑے دیئے جو نئے جیسے تھے۔ اُس آرن سے ہزار درجہ بہتر تھے جسے میں بازار سے خرید کر پہنتا تھا۔ میں جب وہ کپڑے پہنتا، جُما میرے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا اور پلک چپکنے تک کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا جیسے وہ میری رُوح سے پٹا ہوا ہو۔ اُس کی رفاقت میری اذیت بڑھا گئی۔ اُس سے نجات پانے کے لئے میں نے وہ کپڑے کسی پھکار بنی کو دے دیئے۔ اُس سے میری نفسیاتی حالت میں کوئی فرق نہ پڑا کیوں کہ میری خودداری مجھ میں نیا احساس جگا گئی۔ میں اپنے آپ کو دیکھتا، مجھے جوتے کسی کے نظر آتے، مونے کسی کے اور اُسی طرح پینٹ، قمیض، بنیان۔ میری حالت گڈری کی سی تھی، جس کی لیریں مانگے تانگے کی ہوتی ہیں۔ میں اپنے ہی خواہ سے جو حسد کرتا تھا وہ قدرے کم ہوا لیکن میں اُس سے چٹھکا کر



نہ پاسکا۔ میں نے حسد کو نفرت سے سنگین پایا ہے۔ حسد، نفرت کی ابتدائی حالت ہے اور کچی بددو کی طرح ہے جو ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے۔ میں جہارام سے ملنے سے کتراتا۔ لیکن اپنے ایک نو آشنا ججیت سنگھ کی دوستی پر ناز کرتا۔ وہ ریلوے میں گڈز کلرک تھا اور جہارام سے زیادہ بدچلن اور زیادہ بد دیانت۔ میں اپنے متضاد رویے کو کیسے بیان کروں! جہارام میرے سکول کا دوست تھا اور میں اُسے اپنا حریف سمجھتا تھا۔ چونکہ اُس کا موقف مجھ سے اچھا تھا اس لئے مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ شہریوں اور دیہاتیوں کی بنیادی فطرت میں فرق نہ تھا۔ دونوں کی بدچلنی اور بددیانتی مسلم تھی، انداز جڈاگانہ تھا۔ دیہاتی پسر چرانے اور فصل چرانے میں ماہر تھے اور شہری روپے پیسے۔

سومٹر سنگھ مجھے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کی رائے دیتا۔ میں جو موقع کھو چکا تھا اُس پر پچھتا رہا تھا۔ میرے اختیار میں کچھ تھا تو میری لاچارگی تھی جس کی تنلیت یوں ہوتی تھی



میری پونجی چند سکولوں میں منگوا گئی اور میری بدحواسی بڑھ گئی۔ پیارا سنگھ سے ملنے کے لئے میں ویسٹ نیلنگ گیا، وہاں وہ ہزاری لال کی کوٹھی کا کام کرتا تھا۔ اُس کی مکمل ہمدردی جگانے کے لئے میں نے رونی صورت بنا کر کہا، ”بھائی صاحب! میں یوں ہی بیکار رہا تو مجھ کو مارجاؤں گا!“

”ارے گاؤں میں کوئی مجھ کو مارجائے تو مارجائے، دلی میں کوئی مجھ کو نہیں مرتا!“

وہ مسکرایا جیسے اپنی بات سے لطف اٹھا رہا ہو۔ اُس کی بات سن کر، میں خاموش رہا۔ میری خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، وہ بولا، ”گرو دوارے میں لنگر کھاؤ، نل پر پانی پیو اور مستی کرو!“

میں کبھی اُس کے سامنے نہ ہوتا تھا اور اُس کے ٹھٹھے منحل پر مرجھا کہتا تھا۔ اُس وقت اُس کی بات مجھے تیر کی طرح لگی اور میں چلایا، ”یوں مستی ہوتی ہے تو تو کیوں کام کرتا ہے؟“

ہزاری لال ہاتھ روم میں کھڑا ٹائیلوں کا معائنہ کر رہا تھا، اُس نے اچک کر میری جانب



”کون امر سنگھ؟“

مجھے نیچ میں ٹوک کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اُسے میری بات سے بدبو آئی ہو  
”ڈڈ۔۔ ڈڈیا نہ کلاں۔۔“

میں لڑ بڑاتا ہوا جھلے کے نیچ ہی میں تھا کہ اُس نے مجھے کاٹ کر کہا، ”اوہ اوہ ر  
کھان!“

اُس نے اپنی بات یوں کہی جیسے کوئی کھنکارا کہ بلغم تھو کے۔

”مردارجی سے کیا کام ہے تجھے؟“

اُس کے لہجے کی درشتی بدستور تھی۔ میرا منہ اتر گیا۔ میری گھبراہٹ، بوکھلاہٹ میں بدل  
گئی اور میں نے مشتعل ہو کر دیہات کی اکھڑ زبان میں کہا، ”اوہوؤں ٹکڑنا!“ (ان الفاظ کا لغوی  
معنی ہے کہ اُس سے لڑنا ہے)

میری بات بڑھئی کی ہتھوڑی کی وہ چوٹ تھی جو کیل کو لکڑی میں پورا مگر ٹیڑھا اُتارتی ہے۔  
وہ بھری کھڑی تھی، پھٹ پڑی، ”یو فول گٹ اوٹ اینڈ نیور شو یور فیس اگین تو یا جی یہاں سے  
بیکل جا اور پھر بھی اپنی گندی صورت لے کر ادھر مت آ!“ اُس نے چوکیدار کو آواز دی، ”چوکیدار  
تو کہاں مرا پڑا ہے؟ جیسے دیکھو تھو تھنی اٹھائے چلا آتا ہے!“

میں اپنا سامنے لے کر رہ گیا اور بھاگنے کی رفتار سے چلتا ہوا گیٹ کے باہر آ کر رکا۔ کچھ  
اگے جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا اور زمین پر ڈنڈا مار مار کر مجھے کوس رہا تھا۔  
مجھ سے نظر ملتے ہی اُس نے ڈنڈا ہوا میں لہرایا جیسے وہ مجھے ڈنڈا پھینک کر مارنا چاہتا ہو۔ میری  
بدکلامی اور ناشائستگی کی شکایت امر سنگھ تک گئی جو مجھے تہمت بن کر ملی۔

یہ تمام وحشتناک اور ہتک آمیز تفصیلات تایا جی کی اس بات کی سند ہیں کہ رہت ملوک  
بے زکرات۔ آدمی کی بود و باش ہی اُسے بادشاہوں کے سے طور و اطوار سکھاتی ہے۔ میرے سوچنے  
سمجھنے کی صلاحیت غارت ہو گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ابھی بات جیت مجھ پر تہمت بننے لگی تھی اور میں  
نے اُسے جان بوجھ کر بھلا دیا تھا۔ میں ویسا نہ کرتا تو اُس گندے ماحول میں سانس نہ لے سکتا۔ آپ  
اپنے آپ سے یہ سوال کریں اور آپ ہی جواب دیں۔ بہت حالات میں ارفع و اعلیٰ جذبات اور نفیس  
قربان کی کیا حقیقت ہے؟ میرا تجربہ ہے کہ دیسا روئے زیادہ ناگواری کا باعث ہے۔ بھٹکے خیالوں  
کو سنبھالنے کا ایک ہی موثر طریقہ ہے، جہاں ہوا جیسے ہو! مطمئن رہو۔ اختلاف طبائع، زندگی

کی گونا گونی کا مبداء ہے لیکن کسی واضح سمت کا تعین کے بغیر حالات سے نزاع تباہ کن ہے۔ جہاں  
ذراست کا فقدان ہے وہاں ناداری، جمود ہے۔ فرید میرے ہی جیسے تجربے سے گزرا ہوگا، ورنہ وہ  
یہ کیسے لکھتا،

فریدا موتوں بھٹک بُری (بھوک)  
راتیں سوتے کھائے کے صبح پھیر کھڑی (سوئے)

جیسے چراغِ مُردہ کے لئے تیل بیکار ہے، دلِ مُردہ کے لئے اُمید۔ اپنے دل کے احیا کے لئے  
میں کیسے کیسے جتن کرتا! میری کوئی سمت نہ تھی اور نہ ہی غمِ حیات سے بے نیازی۔ میری بد بختی! میں  
اُن لوگوں میں گھرا ہوا تھا جو کسی کی بات سُننے سے زیادہ اپنی کہنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس میں اُن کا  
کوئی قصور نہ تھا۔ اُن کی سوجھ بوجھ بنیادی ضرورتوں کا آئینہ تھا۔ وہ اپنی ذات سے پہلے کسی دوسری  
چیز کو دیکھتے تھے تو وہ اُن کی ضرورت تھی۔ وہ شہر میں رہ کر بھی سرابِ زدہ تھے۔ وہ اپنے جس جذبے  
کو سراہتے تھے، دوسرے کے اُسی جذبے کو جھٹلاتے تھے۔ غیبت اُن کی روشنی تھی، غیبت اُن کی  
تیرگی تھی، غیبت اُن کی برہمی تھی، غیبت اُن کی دل جی تھی۔۔۔۔ غیبت اُن کی زندگی تھی، پروازِ خیال  
تھی، اس لئے وہ جا لے میں پھنسی مکھی کی طرح بھینھناتے رہتے تھے۔ اُن میں رقابت و کدورت کا جذبہ  
اس قدر سرگم تھا جو کسی وقت بھی جوا لکھی کی طرح پھٹ سکتا تھا۔

میں خود فسادِ رُوح میں مبتلا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ زوالِ پزیر حیلت مجھے پوری  
طرح مغلوب نہ کر سکی تھی لیکن میرے اندر گندے گڑھے کی طرح سسپاتی اور اُلٹی رہتی تھی۔ میری رُوح  
کی سب سے بڑی آزر دگی وہ گندگی تھی جسے میں اپنے لباس کی شکل میں اپنے تن پر اٹھائے پھرتا  
تھا۔ میں اُس بھیا تک گندگی کو ناک کے علاوہ آنکھوں سے، ہاتھوں سے، روٹنگٹوں سے، ماسموں  
سے، خیالوں سے سونگھتا تھا۔ وہ رذیل لباس، سردی میں برت کی پرت، گرمی میں پسینے سے ریگمال  
اور برسات میں گیلے سیل کا بھبھوکتا ڈھیر تھا۔ وہ اُسی وقت ذریعہِ راحت بنتا تھا جب پہنانا ہوتا تھا  
اُسے اتار کر دوبارہ پہننا، قے کیا ہوا بوالہ اٹھا کر کھانے کے برابر تھا۔ میں جس دن اُسے دھو کر پہنتا  
وہ اتنا ہلکا ہوتا کہ کئی بار مجھے لگتا کہ میں ننگا ہوں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر انسانِ جدیدِ نقاست سے عاری ہوتا تو آج بھی وحشی ہوتا۔  
میرے احاطے میں پرہتم کو نام کی ایک عورت رہتی تھی۔ اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ  
کہ وہ دوسروں کے نئے کپڑوں میں بلیڈ پھیر دیتی ہے۔ اُس کے ڈر سے لوگ اپنے کپڑے اندر سکھاتے

تھیا اپنے سامنے۔ وہاں کوئی نہ کوئی کلیس اور جھمیل کھڑا ہی رہتا تھا۔ کوئی کسی کے دروازے کے آگے کوڑا کرکٹ پھینک دیتا اور کوئی دوسرے کی دیوار کے ساتھ بچے کو ہنگا دیتا۔ سبزبان اپنی تلوار کی سی تھی جو رات کے چند گھنٹے منہ کے نیام میں رہتی تھی۔ اُس تو تو، میں میں کی کچ کچ، کچی کھا لوں کی بدبو سے زیادہ گھناؤنی اور سرکش تھی۔

## باب ۵۳

ہر کام ہے دیر جدھر بھی دیکھو  
تقدیر کا ہے پھر جدھر بھی دیکھو  
ہر سمت نئے پاپ جنم لیتے ہیں  
اندھیر ہے اندھیر جدھر بھی دیکھو (شاطر)

میری آوارگی مجھے معاشی بد حالی سے چھٹکارا نہ ملا سکی لیکن میرے غم کی تسکین بن گئی۔ دلی کے راستے مختلف المزاج باہوں کی طرح مجھے کہیں گراتے، کہیں سہارا دیتے اور کہیں اٹھاتے ٹالکھتے۔ گارڈن تک لے گئے۔ وہ گارڈن، گارڈن نہ تھا، دامانِ درد مند دی و شادمانی تھا جو قلبِ زمیں سے لے کر قلبِ انساں تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نامرادی اور بے توجہی کا کچلا ہوا دہاں ایسے پہنچتا جیسے کسی غرقاب کشتی کے مسافر کو لہروں کے تھپیڑے کنارے پر لا پھینکیں۔ فضا کی مصالحت سازی میرے اُجڑے تصور کو آباد کرتی، ہوا کی نرمی تھکے ماندے اعضا کو سہلاتی، پرندوں کے نغے افسردہ کالوں میں رس گھولتے، گلِ تازہ دل کے زخموں پر پچھلے رکھتے، سبزے کا گداز میری غمی کو خوشی میں بدلتا اور شاخیں شفیق باہوں کی طرح ہلک کر مجھے اپنے بسے میں بلاتیں۔ میں بے اختیار ہو کر ادھر بڑھتا، اُنھیں چومتا گالوں سے مس کرتا جیسے وہ مجھے مصیبت زدہ کے درد مند ہوں۔

میں اُن حالات کا تجربہ کرتا جن سے میں گزر چکا تھا اور گزر رہا تھا۔ میرا ماضی پُر تشدد اور ذلت آمیز سہمی، میں اُس میں کم کم ہی سہمی، پیٹ کے آزار سے آزاد تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے خیا لوں کی وادیاں آباد کروں لیکن اُن کی مٹی خراب تھی۔ میں ساجر کے پوجے اور چاہے ہوئے گم ناموں سے

زیادہ گم نام، بے بسوں سے زیادہ بے بس اور بے سہاروں سے زیادہ بے سہارا تھا۔ اُن فن کاروں کی صلاحیتِ ایجاد وہ شگفتہ جذبہ تھا جس کے طفیل وہ اپنی فلاکتوں کو محسنِ کاریں ڈھالنے اور اُن سے نجات پانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ غم ذات کے غارت گردور سے وہ کس نادر طریقے سے گزرتے تھے۔ اُن کے تعمیری وجدان نے بے حس چھینی کو حس دی، اور اُس سے جو عالم تراشے وہ اُن کے گونگے غم کے بولتے شاہکار تھے۔ اُن کے کربِ تخلیق کی کہانی دیوارِ چین کی طرح طویل، اہرامِ مصر کی طرح عظیم، تاجِ محل کی سی مرمزین، مونا لیزا کی مسکراہٹ کی سی لطیف اور نامٹِ داچ کی سی پرتجسس تھی۔

قارئین! جسے ہم تہذیب و تمدن کہتے ہیں وہ ایسے ہی گم نام ہنروروں کی نام ور

کہانی ہے۔

میں اُن فن کاروں کے خیالی پیکر بناتا، اُن کی اذیتوں کا اندازہ کرتا اور اس نتیجے پر پہنچتا کہ کوئی جتنا بڑا فن کار ہے اتنا ہی اتم پروردہ ہے۔ انسان کا کھوکھلا پن عجب طریقے سے اپنے بھرے پُرے ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے! میں کچھ بھی نہیں تھا اور نہ ہی میری کوئی دشا، لیکن اُس نازک گھڑی میں میرے ضمیر سے آواز آتی، ”تو اُن فن کاروں سے بڑا فن کار ہے! تو اُس تصویر کی طرح ہے جو رنگوں کے ڈھیر میں مسکڑی مٹی پڑی ہے!“

اُن فن کاروں کے احساسِ تخیل کی بلندی اور کربِ تخلیق کی شگفتگی پر میں حیران ہوتا۔ اُن کے درد و کرب میں وہ خوبیاں نہ ہوتیں تو نوعِ انسان، احیا اور ارتقا کے راستے پر گامزن نہ رہ سکتی۔ وہ فن کار، فرطِ تخلیق کے ایسے سرچشمے تھے، جنہیں مزاحمتِ زمانہ مجھول نہ کر سکتی تھی۔ وہ ہر رکاوٹ کو روندتے ہوئے اُس نصب العین کی جانب بڑھے اور بڑھتے رہے، جسے وہ ریگ زارِ دہر پر نقشِ مستقل کی صورتِ ثبت کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی سرشاریِ تخلیق میں خدا کو یوں مُسک کر گئے۔

پَر مَرے تاں ہم مریں

نیں تاں ہم مریں بلا

(خدا مرے گا تبھی ہم مریں گے ورنہ ہماری بلا مرنی ہے)

اُن فن کاروں کی فطرتِ کامل! اُنہوں نے اُنکو ٹھٹھے کٹوائے، ہاتھ قلم کروائے، نہرِ پیا سولی پر چڑھے، سنگسار ہوئے اور جلا وطنی کے ساتھ وہ سارے ظلم سہے جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ انکشافِ آسرا کے اُن اُجالوں کو مصیبتوں کے اندھیرے دھندلانہ سکے۔ وہ انسان، حیرت انگیز

انسان! آسمان کے برعکس دھرتی کے چاند ستارے تھے، آفتاب تھے اور آج بھی ہیں۔

تایاجی علم و فن کی حقیقت جانتے تھے اور اسے ہنر و زندگی سے جیسے جوڑتے تھے وہ قوتِ ایجاد کی تحریک در تحریک ہے۔ علم و ہنر لافانی اور انجام ناکشنا ہیں اور اُسی طرح ان کے خالق۔ یہ آغاز و آغاز سے منسوب ہیں اور ابدیت و ابدیت سے منسلک۔“

جو ہنر و تہذیب ہنر کی رُوح رواں تھے، میں اُن کے کمالِ ذات میں کھو کر اپنی رُوح کا کمال دیکھتا۔ مجھے لگتا کہ ہنر و دلوں کے سوائے ہر بشر، مجذوب بھنور ہے۔ بھنور کا ہنوک مشہور ہے! وہ خود کو جتنا بھرتا ہے اُس سے زیادہ خالی کرتا ہے۔ مجھے سکندر، چنگیز، محمود، نادر، نیولین، موسولینی۔۔۔ جیسے لوگ بھنور کے انسانی نمونے لگتے۔ میں سوچتا کہ انھوں نے نوعِ انسان کو بجز خوں خریلے اور تاریکی تہذیب کے کیا دیا ہے؟ اُن تاریخی مجرموں اور لٹیروں میں اقبال کو کیا خوبی نظر آئی کہ وہ اُن کے ترانے گانے لگا۔ میں اقبال کے کھوکھلے پن پر حیران ہو کر سوچتا کہ ہمال، گل رنگیں، حقیقت جس، جگنو، سرگزشت آدم۔۔۔ کے اقبال کو کیا ہوا؟ وہ کیسے بدل گیا؟ میں سوچتا، سوچتا اور سوچتا اور اس نتیجے پر پہنچتا کہ اقبال انحطاطِ ضمیر کا شکار ہو کر موسمِ گرما کے تالاب کی طرح سوکھ گیا۔ ایسے تالاب کا مینہ پھٹ کر ہزاروں فریادی ہونٹوں کی تصویر نظر آتا ہے۔

میرے فارسیں، مجھے معاف کرنا! میں اقبال کا نکتہ چیں تو ہوں لیکن میں خود اُس چرچ کی طرح تنہا جس کی وضاحت و صراحت نہ ہو۔ میرے دل و دماغ، شبِ بایوں کے میرے نغے۔ اچھا سوچتا اور اچھا قدم اٹھانا، پانی پر نقش و نگار بنانا تھا۔ میرا سب سے زیادہ دردناک کرب میری جسمانی ضرورت تھی، جس نے میری روحانی اُترج کو دبا رکھا تھا۔ خود کو صاف ستھرا دیکھنا میری اولیں خواہش تھی۔ میں اپنے ذہنی تنزل کو روکنے کی کوشش یوں کرتا تھا جیسے دوسری گلی کا کتا مقامی کتوں کی یلغار کی تاب نہ لا کر اندھی گلی میں دبک جائے، بھونکے کم اور غرائے زیادہ۔ غریبی اور بیکاری کی وجہ سے میری آزرہ دہلی نمک چھڑکے زخموں کی سی تھی۔ میں پیٹ سے سوچتا، آنتوں سے چھیلتا اور دل سے محسوس کرتا کہ میری ہڈیوں کو کھن لگا ہوا ہے۔ ہر وقت دیکھتے رہنے سے کپڑوں کے پیوند زیادہ بڑے اور زیادہ ابھرے ہوئے لگتے۔ اُن کے ٹوٹنے اور اُدھرتے ٹانگے میرے لرزاں و خیزاں جذبات کے نمائندے تھے۔ اُن جیسے بیوندوں اور بے جوڑ ٹانگوں کو دیکھ کر گمان ہوتا کہ میرا جسم بے ترتیب اعضا کی بجائی سے بنایا ہے۔ میرا لباس اور جسم اُن نامعقول ہسیابوں کی طرح تھے، جو وقت بے وقت ایک دوسرے کی ہنسی اڑائیں اور اپنے رویے پر فخر کریں۔

میں لنگر کھانے کے لئے گردوارہ رکاب گنج پہنچا۔ وہ دن گردارجن دیوجی کا شہیدی پُرب تھا۔ تاحد نظر چمکتے چمکتے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ماتمی ماحول کے بجائے میلے کی سی جہل پہل تھی۔ کسی کے چہرے پر اُس نازک دزد کا تاثر نہ تھا، جو اُس مخصوص وقت سے ہم آہنگی رکھتا ہو۔ وہاں جو ہوتا تھا وہ اعتقاد و احترام کے خلاف اور توہین آمیز تھا۔ گردوجی نے ظلم پرست حکومت کی تنبیہ اور انسانیت کی غلم برداری کے لئے جہان دی تھی لیکن وہاں اُس پر ایثار اور پُر وقار مقصد کا فقدان تھا۔ گردوجی کے جذبے میں حُزن و ملال کا احتجاج تھا لیکن اُن کے جذبے میں عشرت و مسرت کا امتزاج تھا۔ ہر کوئی اپنے انداز میں خود کو ٹھیلتا ہے اور دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ لباس کے حلقہٴ عمل میں یہ دستور عام ہے کیوں کہ یہاں دوسرے کو کمتر ثابت کرنا آسان اور قطعاً ہے۔ اُن ترفاں میں میری حالت بھکاری کی سی تھی۔ میں اپنی زندگی کے کسی موڑ پر اس قدر پامال نہ تھا۔ میرا دل خود رچی اور خود آگاہی کے جذبے سے موس گیا۔ اُس کی دیانت داری! اُس نے بھائیاجی کی بدخواہی میں بھی خواہی دیکھی اور احسان مندی کے دزد سے دھڑکا۔ عین اُس وقت میری خود داری نے سر اٹھایا اور چلا کر کہا، ”تیری اس گت کا ذمہ دار وہی ایک تو ہے! تو جس آگ میں جل رہا ہے، وہ اُسی کی لگائی ہوئی ہے۔“

عام آدمی کی خودی کی نفسیات اقبال کی بتائی ہوئی تفسیر سے الگ ہے۔ میں نے اُس کے اُنوکھے رنگ دیکھے ہیں، صرف دو کی صورت بیان کرتا ہوں۔

سُریندر اور میں گاؤں میں تھے۔ ایک شام ہم گلی میں ٹہل رہے تھے کہ جوگندر کور (میرے دوست سوگ سنگھ کی بیوہ) اُپلے اُٹھائے ادھر سے گزری اور ہم سے باتیں کرنے لگی۔ اُس کے ہاتھ سے ایک اُپلا گر پڑا۔ میں نے اُپلا اُٹھایا اور اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے بھرے پُرے حقارت آمیز لہجے میں کہا، ”رہنے دیجئے! ایک اُپلے کی کیا حقیقت ہے!“

اُس کے خلاف توقع بلکہ ہتک آمیز ردیے سے میں نہایت شرمندہ ہوا۔ میں اُلجھن میں پڑ گیا کہ اُس اُپلے کا کیا کردار؟ میں نے اُٹھایا ہوا اُپلا گرا دیا۔ میں کس نفسیاتی حالت میں تھا؟ میرا جذبہ رفاقت، جذبہ ندامت میں بدل گیا اور میں نے اُس کے سامنے حقیر محسوس کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ اُس کے بُشرے پر ایسی روشنی تھی جو احساس برتری ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسرے دن سویرے میں سیر کو گیا، سُریندر میرے ساتھ تھی۔ ہم نے جو دیکھا وہ خلاف قیاس تھا۔ جوگندر کور سڑک میں سے گوبر اُٹھا کر ہی تھی۔



سنتو کھ سنگھ پیدائشی لنگڑا تھا۔ اُس کے ماں باپ کی مدافعت کے باوجود وہ قیدوں (دورث شاہ کی ہیر کا فساد کی کردار، جو لنگڑا تھا) کے نام سے موسوم ہو گیا۔ جب کوئی اُسے اُس نام سے پکارتا اُس کا رویہ عمل دردناک اور خوفناک ہوتا لیکن کئی اُس کی چڑ سے لطف اٹھاتے۔ وہ اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتا لیکن اُن کی تھوپی ہوئی ذلت کا بدلہ اپنی ماں سے لیتا۔ ”او ذلیل عورت! یہ سب تیرا قصور ہے! میں تیری وجہ سے خوار ہوں۔ کتنا اچھا ہوتا! اگر تو مجھے پیدا نہ کرتی۔ پیدا کر ہی دیا تھا تو یہ جان کر کہ میں لنگڑا ہوں، مجھے مار ڈالتی یا خود مر جاتی۔ میں تیری منحوس صورت برداشت نہیں کر سکتا!“ لیکن اُس کی ماں اُسے برداشت کرتی اور دل و جان سے چاہتی۔ ایک دن وہ سوئی پڑی تھی سنتو کھ نے اُس کے پیٹ پر اینٹ دے ماری جیسے وہ اُس ماخذ کو برباد کرنا چاہتا ہو جس نے اُسے ادھورا بنایا تھا۔ اُس کی ماں مرقی مرقی بجی۔ اُس نے پہلی بار اُسے مارا اور لتاڑا وہ اسی رات گھر سے بھاگ گیا اور کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ اُس کا کیا حشر ہوا؟ وہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نیچ سمجھ کر ہر کوئی مجھ سے کتراتا تھا جیسے میں غلاظت کا چلتا پھرتا ڈھیر تھا۔ مجھ سے جو چھو جاتا، مجھے وہ اُس کر است سے دیکھتا جو بد رویں پاؤں پڑ جانے سے چہرے پر ابھرتی ہے۔ اُن خوش لباس لوگوں کی رُو میں ہولناک حد تک گھناؤنی تھیں۔ جب وہ اپنی سرد مہری کا مظاہرہ کرتیں، جگمگا چہرے، اندھیرے گڑھے دکھائی دیتے۔ پنگت بیٹھنے لگی اور اُن بھلے مانسوں کی بے حسی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ میں پنگت سے سرکتا، دبتا، سُکڑتا، اٹھتا وہاں جا کھڑا ہوا جہاں مجھے جیلوں کا ہجوم تھا۔ وہ ہجوم سماجی اور انسانی قدروں کے ابطال کی پیداوار تھا۔ وہ اُس نفیس ماحول سے بے جوڑ تھا، اس لئے وہاں یوں لگتا تھا جیسے گھر کی حد دے کے ساتھ غلاظت کا ڈھیر۔ اُسے دُور دھکیل دیا گیا۔ اُس کی عاجزی، فروتنی، لاچاری، بدحواسی۔۔۔ جو اپنی تردید آپ تھی، اُس میں اضافہ ہو گیا۔ میں اُس کے گھناؤنے پن سے گھبرا کر دُور جا کھڑا ہوا۔ لنگری دلاسا دینے لگے، ”پنگت کے بعد تمہاری باری آئے گی جب تک تم یہیں ٹھہرو۔“ وہ لنگر بانٹنے لگے اور حاجت مندنا آمیدی سے سہمے دلوں کی طرح سُکڑنے لگے۔ حوصلہ افزا وعدوں کے باوجود بھوکے آگے بڑھنے لگے۔ اُن کی بے قراری سے ظاہر تھا کہ وہ وعدے اُن کے آزمائے ہوئے ہیں۔ کیسا حسرتناک منظر تھا! اُن بھوکوں میں مجھ سے زیادہ بھوکے تھے اور زیادہ بے ضبط۔ وہ منہ میں اُمڈتے پانی کو یوں نگلتے تھے جیسے آہیں بھرتے ہوں۔ وہ اپنی بے چینی میں آگے بھسکتے، بھسکتے پنگت تک کھسک جاتے۔ وہ اُنھیں ایسے دیکھتی جیسے اپنی بد صورتی سے گھبرا کر کوئی آئینے سے منہ پھیرے۔ اُس کی چھڑکی کھا کر وہ پیچھے ہٹتے لیکن آگے بڑھنے

کے لئے۔ پنکٹ اٹھنے لگی اور جھوٹی پتروں پر ایک کونے میں پھینکنے لگی۔ جھوکے اُدھر پکے اور کھینچنے کی سی بھینھنا ہٹ سے وہاں جا اکٹھے ہوئے۔ جو جھوٹوں، کتوں، بلیوں اور کیڑوں کو کھا جاتا تھا اُس کے لئے انسانوں میں لڑائی ہونے لگی۔

انواعِ حیات میں نوعِ انسان ناقابلِ تفسیر حیات ہے۔ میں نے انسانوں کو گوبری (گوبر میں سے نکالی ہوئی جنس) فضل کاٹنے کے موقع پر اناج عام پڑا ہوا بتایا۔ مویشی اُسے کھا لیتے ہیں لیکن بچے میں ناکام رہتے ہیں اور اُسے گوبر میں نکالتے ہیں۔ اُن دنوں غریب گوبر میں سے اناج پانے کے لئے گوبر اکٹھا کرتے ہیں (کھاتے دیکھا ہے)۔ جھوک کی آگ وقت پر بجھائی جائے تو حیات بدور ہے ورنہ غارت گر عناصر رہے میری جھوک نے میرے ضبطِ نفس میں کیسے کیسے زلزلے پیدا کئے! کیسے کیسے سننے ڈالے! لیکن کسی طرح وہ مجھے فنا نہ کر سکے۔ چوں کہ انسانی زندگی کا دار و مدار کام پر ہے، کام ہر چیز سے اُمول ہے۔ اس حقیقت کے باوجود بیکاری پرست سا دھوسنت اپنے طرزِ حیات کی حمایت کرتے ہیں۔

پنچھی کرے زچاری، آجگر کرے ز کام  
داس مُلو کا کہہ گئے، سب کا داتا رام

حاجت کی وہ بھیانک شدت میرے خیال میں بھی نہ تھی، جو شہر کی افراط کی تفریط کا نتیجہ تھا۔ میرا دل متلایا اور اچک کر منہ کو آیا۔ میں صاف سانس لینے کے لئے تڑپ اُٹھا اور پیٹ پانٹنے کے بدلے، پیٹ پکڑ کر بھاگا۔ وہاں بھاگنے کے لئے جگہ کہاں تھی! سڑک اور فٹ پاتھ انسانوں سے بھرے پڑے تھے، جو ایک دوسرے کو روندنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ کئی میرے ساتھ ایسے ٹکراتے جیسے میں غیر مرئی شے تھا اور انھیں نظر نہ آتا تھا۔ میں ایک کے پہلو سے گھستا اور دوسرے کے پہلو سے نکلتا، گول ڈاک خانے کے پاس جا کر رکا اور وہاں سے نرم روی سے ٹالکھٹورا گارڈن میں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی میرے حالات یوں بحال ہوئے جیسے دن کی سختی سے کملے ہوئے پھول اور پتے، شام کی نرمی سے لہک لہک جلتے ہیں۔

مایا دیوی پھولوں کو سیراب کر رہی تھی۔ میں نے جاتے ہی اوک سے پانی پیا۔ پانی حلق سے ڈھیلے کی طرح ٹکرایا اور مجھے اُچھو آگیا۔ میں سینہ پکڑ کر کھوکھو کرنے لگا۔ مایا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، میری پیٹھ تھپک کر ملی جب کہیں میری سانس کھلی۔ اُس نے مجھے ڈانٹا، ”درا دم لے کر پانی پیتا تب کیا جاتا ہے“

میں نے ہاتھ منہ دھویا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹوں سے پانی پیا۔ جو ہوا چہرے کو چھو کر گئی اُس میں بادِ بہاری کی سی تاثیر تھی۔ اُس کے لمس نے مجھے پور پور مہکا دیا۔ مایا پھولوں میں سے سبزہ بیگانہ اکھاڑ رہی تھی۔ میں دل بہلاوے کے لئے اُس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا اور پھولوں کے آئینوں میں رُوح کے ٹکڑے دیکھنے لگا۔ میں ایک خیال سے کئی بار گزرا تھا، وہ تازہ ہو گیا۔

جسم کتنا سادہ ہے، پھول کی طرح!

رُوح کتنی انوکھی ہے، بیج کی طرح!!

پھول اس لئے سادہ ہے کہ اس کا وجود وقتی ہے، بیج اس لئے انوکھا ہے کہ اس کا وجود دائمی ہے۔ اس کے باوجود کتنے بیج ہیں جو عملِ افزائش سے گزر کر حسنِ نمود تک پہنچتے ہیں؟ میں عملِ افزائش کی لاجواب مگر غیر متعین تاثیرِ پزیری پر حیران ہوتا، اسے پابندیِ تقدیر سے منسوب کرتا اور کبھی نیرنگیِ فطرت سے۔ اول حالت میں میرا دل خوف سے بٹھ جاتا۔ میں مذہب کے سایہِ عاطفت کے ساتھ خدا کی غیابت کی حیثیت کرتا اور کبیر کے اس دوہے کو زندگی کا محور سمجھتا۔

چلتی چاکی دیکھ کے کاہ کبیر اڑے

جو کھونٹن سے جلگے بال بیکار ہوے

میری حالت اُس بچے کی سی ہوتی جو ماں کے حلقہ اثر سے باہر نہ نکلا ہو۔ وہ کسی خطرے کا سامنا کرتے ہی ماں کی طرف بھاگتا ہے اور اُس کی مدد چاہتا ہے۔ میں اپنے بچپن میں اس سے زیادہ نازک مراحل سے گزرا تھا۔ مجھ رستم رسیدہ کو ماں کی آغوش نہ ملتی تو میں چار پائی کے پائے کو تھام کر اپنی بے کسی کو سہارا دیتا۔ وہ بے جان پایہ مجھے میرا ہمدرد جان پڑتا اور میں اُس سے لیٹ کر سو جاتا۔ مجھے خواب میں لگتا کہ میری ماں مجھے تھامے ہوئے ہے۔ میری مظلومیت کے ہیولے مجھے ڈراتے، میں پائے کو مضبوطی سے پکڑا کہ اُس کے قریب کھسکتا اور اُس کی قربت میں محفوظ محسوس کرتا۔ میں دوسری حالت میں آزادیِ عمل بریقین کرتا اور ہر ناکامی کو کامیابی کی سمت نیا قدم سمجھتا اور ساحر کی اس پیش گوئی کو ہر حیات۔

غم نہ کر جو ہے بادل گھنیرا

کس کے روکے رکا ہے سویرا؟

میری خوش اُمیدی میری پشت پناہی ہوتی۔ جیسے اندھیرے میں لگا ہوا پودا اُجالے کی طرف بڑھتا بھولتا ہے اُسی طرح میری ترقی پسندی مجھے پستی سے بندی کی طرف اُٹھاتی اور وہی اُتار دیتا

میری شیکستوں، بے اطمینانیوں، حسرتوں، محرومیوں، نیتوں۔۔۔ کا واجد مداد اہوتی۔

میں گھر روانہ ہوا تو پیٹ میں شعلہ سا ایک رہا تھا۔ راستے میں ایک بنگلے کے احاطے میں آسم کب پڑ گیا تھا۔ اُس کی کچھ شاخیں باہر سڑک کی طرف بڑھی ہوئی تھیں جو گدراے ہوئے آسموں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں انھیں دیکھ کر لپکا گیا اور سوچنے لگا کہ انھیں کیسے چڑاؤں؟ سوچتے سوچتے میں نے سوچا کہ میں عین آسم کے نیچے کھڑا ہو کر اُس پر پتھر پھینک دوں گا وہ بنگلے کے باہر گرے۔ میں نے پتھر ڈھونڈا اور جیسا سوچا تھا ویسا ہی کیا۔ پتھر کسی آسم کو نہ لگا لیکن جیسے اوپر گیا تھا ویسے ہی نیچے آیا اور میری پگڑی کی کھڑکی میں گرا۔ میں درد سے ہائے ماں مر گیا، چلایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ درد یوں کم ہوا جیسے ماں کا نام دافعِ درد اُکسیر تھا۔ آج تک جتنے الفاظ ایجاد ہوئے ہیں، اُن میں سے 'ماں' کا لفظ سب سے زیادہ پُرکار، پُرشکوہ چرمی۔۔۔ ہے۔ کہیں یہ سچے کا حال ہے، کہیں مستقبل ہے، کہیں چاہ ہے، کہیں امید گاہ ہے، کہیں غمی ہے، کہیں خوشی ہے، کہیں غرور ہے، کہیں سرور ہے، کہیں اپنائیت ہے اور کہیں رجائیت ہے۔ یہ لفظ مکمل کائنات ہے اور بچہ اس کائنات کا جزو لا ینفک ہے۔ لیکن اپنی خودادعالی کا بھرم باندھنے کے لئے وہ ماں سے جدا ہوتا ہے تو غم مفارقت برداشت نہیں کر پاتا ہے اور آرزوئے وصال کے کرب سے نڈھال ہو کر اُسے پکارتا ہے، اُس اُمن پر دور ماحول کی امان مانگتا ہے، جہاں سے اُس کے خودختہ حالات باہر نکال پھینکتے ہیں۔ ماں پہلا لفظ ہے جو انسان نے بے ارادہ اور لاشعوری طور پر تخلیق کیا لیکن اس کے پیچھے اُس کی ساری نفسیات، ساری وجدانیت اور ساری روحانیت کار فرما ہے۔ ماں انسانی زندگی کی اُزلی اور ناقابلِ مصالحت حقیقت ہے۔

میں نے پگڑی اتار کر چوٹ پر ہاتھ لگایا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا اور بال، خون سے کچھل رہے تھے۔ میں اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہوا، اٹھا اور گھر کا راستہ لیا۔ میرا سر، تن پر بوجھ تھا، سانس پھنوں پر اور جوتا، پیروں پر۔ میں نے جوتا اتار کر پگڑی کے لڑ میں باندھا اور اُسے کاندھے پر ڈالا۔ بھوک اور درد سے میری بھارت جھائی دار آئینے کی سی تھی۔ میں نے سلیوٹ سکول کے پاس ایک نلکے پر پانی پیا، پاؤں پر تریڑا دے کر پاؤں کو دھویا اور آنکھوں میں چھینٹے مارے۔ میری تھکن کچھ دُور ہوئی اور وہ راہ گزر جو میری بے دلی سے آنجانی سی لگ رہی تھی، جانی پہچانی دکھائی دی۔

گھر سے ہوٹل دو فرلانگ اُگے تھا۔ وہاں جانے سے پہلے میں نے سستانا اور نہانا چاہا۔ منزل مقصود سامنے دیکھ کر میری آہ نکل گئی اور توانائی بالکل مثل گئی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، میرا سر ٹوک کی طرح چکرایا اور میں سر کو ہاتھوں میں پکڑ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔

جھگڑ سینگھ اپنا کھانا گھر میں پکاتا تھا۔ کسی اشیائے خورد و نوش کی تلاش کرتے ہوئے میں نے برتن الٹ پلٹ کر دیکھے، نمکدان اور صراحی کے سوائے سب میرے پیٹ کی طرح خالی تھے۔ میں نے سرکارِ زخم ٹٹول کر اس پر ہلکی لگائی اور پھر گلاس بھر پانی میں نمک ملا یا اور پہلا گھونٹ قسطوں میں پیا۔ میرے عمل کی نرمی نے گھونٹ کی تلخی کم کر دی۔ میں نے پورا گلاس رُک رُک کر اور ہلکے ہلکے گھونٹوں پیا۔ میری کھوئی ہوئی طاقت مجھے ایسے ملی جیسے ٹکڑ کرنے سے مجروح اعضا کا درد کم ہو جاتا ہے۔ چھینکا دیکھنے کو خالی لگتا تھا لیکن ٹٹولتے پر اس کی تہ میں سے ایک باسی روٹی ملی۔ جانے وہ کب سے وہاں رکھی تھی؟ سوکھ کر سخت ہو رہی تھی اور اُسے لال چیونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے روٹی ہاتھ پر مار مار کر اچھی طرح جھاڑی اور فرش پر رکھ کر مٹکے سے توڑی۔ روٹی کر کر تھی، ٹوٹ کر چھوٹے بڑے کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ میں نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکٹھے کئے، پھانکے اور گر کر، چبانے لگا۔

”گیان، تو پختہ کھا رہا ہے کیا؟ مجھے بھی دے!“

میں نے اُس آواز میں بے انت کور کا لالچی چہرہ دیکھا۔ میں پیچھے مڑا اور اُسے میرے اوپر سے مجھ پر بھانکنے پایا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور پھیلایا۔ اُس میں روٹی کے سوکھے ٹکڑے دیکھ کر وہ کھل کھلا کر ہنسن پڑی اور اپنے اُونچے بھدے دانتوں کو دوپٹے سے چھپانے لگی۔ میں نے منہ کا پھانکا کھایا اور اُس کے سامنے سوکھے ٹکڑے ٹھنگیے رہا جب کہ وہ میرا ٹھٹھا اڑاتی رہی۔ میری بے نوائی کی تنجید گئی! میں بالکل بہیم نہ ہوا۔ میں لوگوں کو اُن پر دردِ حالات پر ہنسنے دیکھ چکا تھا جہاں سراسر اُسٹو بہانے کا محل ہوتا تھا۔

وہ وقت نہایت صبر آزمایا تھا! میرا بدن، پانی میں پڑے برف کے ڈلے کی طرح گھل رہا تھا۔ کوہلے اور کمر دو نقطوں کے درمیان سیدھا خطِ نظر آتے تھے اور پیٹ کے اوپر پسیلیاں قوسیں۔ ہنسیوں کے اُپر خوبصورت ختم تھے، وہ بدنِ مار گڑھے بن گئے اور گھائیاں نمایاں رخنے۔ ناخن، دودھ سے سفید ہو گئے اور رنگِ یرقانی۔ پیٹھے گل کر رگوں میں مل گئے اور اُٹھو کا دریا اُتر گیا۔ ہڈیوں پر جلد مہین سی پوشش دکھائی دیتی اور دیدے، دراڑوں میں اٹکے ہوئے ڈھیلے۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، آبرِ باراں کے ہالوں کی طرح تھے جو برستے برستے آبرِ گریزاں میں بدل جاتے ہیں۔

ہر صورت اپنا رنگ دکھا رہی تھی! فاقہ مستی الگ، بیکاری الگ، آوارہ گردی الگ،

آزردگی الگ اور۔۔۔ خود فریبی الگ۔ ان میں سے کوئی بات میرے بس میں تھی تو وہ آخری تھی۔ میں اسے لینے بردار کی کمزوری کہوں کہ ضرورت کی زیادتی! میں اُس سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ اُس مکروہ زندگی میں دل بہلانے کا وہی ایک سُندر، شپھل اور آزمودہ طریقہ تھا۔ میں جوں ہی خود فریبی پر مائل ہوتا میرا ننھا اپنے گوشہ خاموشی سے مترنم لہجے کی طرح ابھرتا اور اُس تہذیب کا معتبر مشہر نظر آتا جو میری رگوں میں مضمر تھی۔ اُس تہذیب میں سانس لیتے ہی میرے سارے اعضاء کھل کھل اٹھتے، جیسے بہار آنے سے پودے، پرندے انسان، حیوان۔۔۔ ایک ساتھ چمکتے چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُس اسباب بے اسبابی میں میری تمنائیں خود تہذیبی اور شانِ خود اعتمادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے پوری طرح یقین تھا کہ میں خود کو خود پر بے دریغی سے خرچ کروں گا تو بھی مجھ میں کمی نہ ہوگی۔ میری خود خرچی، میرے دل کی تسکین، امیرِ راحت تھی اور رگوں کی روحانی قوت، جو میرے جسم کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچاتی تھی۔ آدمی کی خود خرچی، دھرتی کی پُرآوار طاقت ہے، جس سے گردشِ حیات اور آفرینش اصل جاری ہے۔ جیسے وہ شکتی، قحط میں پوری جالِ فزائی کا مظاہرہ کرتی ہے اور بناستی کو پالتی پوستی ہے، میری خود خرچی مجھے سنبھالتی تھی۔ اُس مقامی عمل میں نکلی پھیلا دیتا تھا جس میں حُسنِ غیب کا پرتو نظر آتا تھا۔ وہ مُتنا ہی کو لاسنا ہی سے ملانا اور میرے مخفی وجود کو عالمِ شہود میں لے جانا۔ جب تک وہ استحالہ جاری رہتا، میں نئی زندگی سے تھرکتا اور جوں ہی وہ عمل رکتا، لگتا کہ میرا وجود ختم ہو گیا ہے۔

میں گھر میں باسی روٹی کھاتا ہوا ناک بھوں چڑھانا تھا اور اب چوبیس گھنٹے اور کبھی اڑتالیس گھنٹے میں ایک بار کھانا تھا۔ میری آنکھیں ایسے ہمتی رہتی تھیں جیسے خود کو جھوک کے جبڑوں سے بچا رہی ہوں۔ میرا پیٹ اُس چولہے کی طرح تھا جو آگ کے انتظار میں اندرونِ قلب تک سرد پڑ جاتا ہے جسے گرم کرنے کے لئے ضرورت سے کمی گنا زیادہ ایندھن درکار ہوتا ہے۔ لیکن میرا صبر سچی تجربہ، چولہے کے برعکس ہے۔ میں معمول سے آدھا کھانا کھاتا، پیٹ بھرا محسوس کرتا اور ٹھنڈی رگوں کو پوری گرمی پہنچاتا۔ میں اپنی انوکھی کیفیت کی حقیقت بیان کرتا ہوں۔ میرا پیٹ سکڑ کر آنکھوں سے جال ملتا تھا اور آنکھیں رگوں سے۔ اُن کی مجموعی ضرورت کم ہو گئی تھی جیسے سانچے کتبے میں ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن عافیت بینہ حالات میں، میں کسمپرسی کے احساس میں مبتلا نہ ہوتا تھا۔ خود ساختہ مُصیبت میں آدمی کی حد برداشت لا انتہا ہوتی ہے اور سرکشی ناقابلِ تسخیر۔ میں اُس عیبِ جوئی کی جہلت سے بھی پاک تھا جو مجھے گھر میں گھیرے رکھتی تھی۔ میں اپنا مقابلہ دوسروں سے کرتا تو پریشان ہو جاتا۔ خوشی کا موقع بھی ہوتا تو میں اندرونی زخم کی طرح سلگتا رہتا۔ میں اُن ناگوار جذبات سے نجات پانا چاہتا لیکن

کامیاب نہ ہوتا۔ میری نفسیاتی حالت برف کے تودے کی سی تھی۔ سورج کی کرنیں اُس تک پہنچتی ہیں لیکن اُسے گرمانے میں ناکام رہتی ہیں۔

## باب ۵۴

ہوں خشک دہن دشت کے خادوں کی طرح  
دیران ہوں بوسیدہ مزاروں کی طرح  
سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں طوفان  
خاموش ہوں دیا کے کناروں کی طرح (شاہی)

میں اُمید دیاس کے درمیان گھڑی کے پینڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ میں پہلی کاسہارا لیتا تو دوسری مجھے پوری طاقت سے کھینچتی، دوسری کے حلقہ اثر میں ہوتا تو پہلی اپنی کشش آزما تی۔ میں جس دُنیا میں تھا دباں مجھے نیت نئی کدورتوں، ضرورتوں اور محرومیوں سے پالا پڑ رہا تھا۔ میرے جذبات کی اونچے نیچے پرانی سہی، اُن کی تاثیر بدل گئی تھی۔ میں کوئل کی طرح تھا جو موسم بہار گزر جانے پر اپنی رسیلی آواز کھو بیٹھتی ہے اور ٹیڑھی میڑھی بولیاں بولتی ہوئی کاگوں سے جان بچاتی پھرتی ہے۔ میں نے درشن سنگھ کو سائیکل کے لئے لکھا تھا لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ جگت سنگھ گاؤں گیا، وہ درشن سنگھ سے ملا اور اُس سے سائیکل لے آیا۔ میری آوارہ گردی آسان ہو گئی۔ میں سائیکل کے پہستے کی طرح کہاں کہاں گھوما اور کہاں کہاں پہنچا! لیکن مجھے کام نہ ملا۔ میری جدوجہد کی گردش ختم ہوتی لیکن شروع ہونے کے لئے۔ اپنا گڑھا بھرنے کے لئے میں آج کچھ کرتا اور کل کچھ۔ میں نے بوجھ اٹھائے، کھاؤں کے کُنڈ صاف کئے اور وہ ذیل کام بھی کیا جسے میں گھر میں اس لئے نہ کرتا تھا کہ مجھے خود پر مرد ہونے کا فخر تھا۔ میں نے ہوٹل میں برتن مانجے۔ لیکن کیسا سانحہ تھا! میں جتنا حقیر کام کرتا، میری روح اُسی قدر ظلمت آشنا ہوتی جاتی۔ تایاجی کے کہنے کے برعکس ہر کام کی شان و شوکت نہ تھی، کتنے کام ایسے تھے جو ذلتِ نفس کو ابھارتے تھے۔ میں جس دن دباغت کا کام کرتا، راہی سے چھاتی پر نیل پڑ جاتے اور بنگلوں میں پھوڑے سے منگلتے۔ میری رُوحانی حالت جسمانی

حالت سے غیر ہوتی۔ میں صابن سے مل کر نہانا لیکن گندگی کو اُسی طرح دیکھتا جیسے وہ تھی۔ ہاتھ سے لقمہ ٹوڑ کر کھانا کھانے سے میرا دل متلاتا۔ میں کھانا نئے انداز سے کھاتا۔ میں روٹی کی پونی بنا کر ہاتھ میں پکڑتا، اُس سے دانتوں سے نوالہ کاٹتا اور دال سبزی پیچھے سے اُٹھا کر منہ میں ڈالتا میں نہیں کو دوسری طرف مائل کرتا لیکن کھانوں کا کرہیہ منظر سامنے رہتا۔ میں حیران ہوتا کہ جو لوگ مسلسل گندے کام کرتے ہیں، وہ کیسے جیتے ہیں؟

میں ناخنوں کو ماس تک تراشتا۔ چاقو سے کچے ناخن زخمی ہو جاتے۔ اُس اُمرد شوار کا حل میں نے اس طرح نکالا کہ میں ریتی سے ناخن رگڑتا اور پھر کپڑے کو صابن لگا کر اُس سے۔ اس کو شیش اور احتیاط کے باوجود ناخنوں اور گوروں کی غلاظت پوری نہ اُترتی۔ میں ناخنوں کو دیر تک دیکھتا۔ مجھے لگتا کہ وہ ہریل، ہر گھڑی، ہر چھن لگتا رہتے ہیں، پچھنڈے کی طرح۔ میرے ناخن قدرتی طور پر انگلیوں کی نوکوں تک لمبے تھے اور اُن کی زیبائش لگتے تھے۔ روز روز کاٹنے اور رگڑنے سے ناخن، ماس کے اندر دھسنے لگے اور پورن لگے۔ ناخنوں کی طرح بد شکل دکھائی دینے لگے جو ناخن کھاتا تھا۔ اس کے باوجود میرا مسئلہ میرا قصبہ رہا کیوں کہ وہ غلاظت، جسے میں صاف کرنا چاہتا تھا، ناخنوں کے برعکس میرے خانہ دل میں تھی اور، مٹیلی مٹھی کی طرح وہاں جاں بھی۔ میں اُن غلیظ پیشوں سے اُتنا ہی کماتا جتنا مجھے کم سے کم دیکھتا تھا۔

میں رات کو بستر پر لیٹ کر اپنے خیال کو کیسے کیسے ہوا دیتا! میں اپنے مثبت اور منفی رویے کو فرداً فرداً بیان کرنے سے قاصر ہوں اس لئے اُس کی مجموعی وضاحت کرتا ہوں۔ دنیا کے بڑے بڑے جرائم اور بڑے بڑے کام ایسے ہی آوارہ خیالی کی پیداوار ہیں۔ میں ایسا نہ کرتا تو میری حالت جالے میں پھنسی مکھی کی سی ہوتی۔ وہ بے چاری رپٹی لٹپٹی قرار ہونے کے قریب آتی ہے تو مکڑی اُس کے اطراف نیا جال بن جاتی ہے۔ میری بے اطمینانی، جال تھا اور میری شکست، مکھی اور میری لاجبازی بھنبھناہٹ۔

ٹالکٹورامیری جا بے پناہ تھی۔ چھو لوں کے ستختے، پرندوں کے چچچے اور مایا کی ہمدردی مجھے کئی طرح سنبھالے ہوئے تھی۔ مایا ادھیڑ عمر کی بیوہ مالن تھی جو اپنی جوانی میں اپنے سسرال کے ظلم کی تاب نہ لا کر یو۔ پی۔ کے کسی گاؤں سے بھاگی تھی۔ اپنے حالات کی روندی اور ماری ہوئی، وہ جس کے پاس پہنچی، اُس نے اُسے گھر کے کام کاج کے بدلے مالن کی نوکری دلوا دی۔ اُس کا ایک لڑکا تھا جو اُس کے بڑے وقت میں میضے سے مر گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُسے اپنے لڑکے کی یاد آتی اور وہ



آزردہ غلام ہو کر کہتی، ”برجوز زندہ ہونا تو تیرے جتنا بڑا ہوتا!“ وہ مجھے دلاسا دیتی، ”بیٹا، بُرے دن ہمیشہ نہیں رہتے! مجھے دیکھ! میں یہی سوچتی تھی کہ مجھے موت ہی راس آئے گی لیکن زندگی نے آپ بڑھ کر میری بائہ پکڑ لی۔“

وہ میری بے کسی میں مجھے اس دے کر میری ڈھارس بندھاتی لیکن اپنی بے کسی کا بوجھ رو کر ہلکا کرتی۔ جب میں اُسے دلاسا دیتا تو وہ اپنے آنسوؤں کا جواز پیش کرتی، ”جیسے آشنا، تن کے لئے آمرت ہے، آنسو، من کے لئے۔“

غریبی میں اکثر ہوتا ہے کہ کوئی ایسی چیز زندگی میں آجاتی ہے جو کچھ اہمیت نہ رکھتے ہوئے بھی زندگی کی عین خوشی بن جاتی ہے۔ اپنے اس تجربے سے پہلے میں کجروں کو دیکھتا تھا اور انھیں بے وقوف سمجھتا تھا۔ اُن غریبوں کو اپنی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے پھر بھی وہ کتے، پرندے، بندر، نیولے۔۔۔ غرضیکہ ایسے جانور پالتے تھے جو کسی طریقے سے کارآمد نہیں ہوتے لیکن ذمہ داری کی طرح مُستط رہتے ہیں۔

ہالکٹورا گارڈن میں ایک کتیا رہتی تھی جو میری دوست ہو گئی تھی۔ اُس کے لال رنگ کی مشابہت سے میں نے اُسے لالی کا نام دے رکھا تھا۔ میں جس دن لنگر میں روٹی کھاتا اُس کے لئے کچھ نہ کچھ چھپا کر لے جاتا۔ میں نے اُسے دو تین فن سکھا دیئے تھے جیسے پتھر اٹھا کر لانا، چھپے ہوئے کو ڈھونڈنا اور اونچی چھلانگ لگانا وغیرہ۔ میں اُس کی نگھیاں اور چڑیاں مارا کرتا تھا جس کی وجہ سے اُسے کھیلوانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوتا اور اُس کی جانب راغب نہ ہوتا تو وہ مجھے اپنے اگلے پاؤں سے کھینچا کر ترغیب دیتی۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں اُس کے ان کہے جذبات کی جھلک ہوتی۔ وہ لاڈ کرتی کرتی آگے کھسکتی۔ میں اُس کی طرف دھیان نہ دیتا، وہ اٹھ کر میری گود میں بیٹھ جاتی۔ میرے پیار کرنے کی صورت میں وہ چت لیٹ کر پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتی اور گردن ڈال کر آنکھیں بند کر لیتی۔ میں جوں ہی ہاتھ کھینچتا، وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور اپنی اُمی ادا سے بھرانے لگتی۔ میں کئی بار اُس سے جہت را دھ کر کسی دوسرے مقام پر رُک جاتا، اُسے آواز دیتا۔ اور اُسے بھاگتے آتے دیکھ کر چھپ جاتا۔ وہ میری سائیکل منگھکتی، ہوا سے میری بوچرائی چرائی مجھ تک پہنچتی اور پھر سستا دار بھاگتی، جھانڈے دے کر لوٹتی، میری ٹانگوں سے پیٹتی اور جب تک میں اُسے پیار نہ کرتا، اُسے چین نہ پڑتا۔ اُس کی پیچیل ادواؤں سے میں کھل کھل اٹھتا۔

ایک دن جن پاتھ پر مژدوں کا جلوس جابا تھا۔ ”زندہ باد، مُردہ باد، اپنی مانگیں لے

کے رہیں گے۔۔۔۔۔ کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ سڑک نے فٹ پاتھ کو ایسے ہڑپ کر رکھا تھا جیسے آدمی اپنی سخت ضرورت میں اپنے سارے وسائل کو کام میں لانے کا جتن کرتا ہے اور اپنے آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کئی بار ضرورت کے بارے میں سوچا ہے اور اُسے الگ الگ تجربے کی الگ الگ روشنی میں دیکھا ہے۔ اس وقت میں اُسے الگ روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔

ضرورت سے بڑھ کر ہولناک شے، ضرورت ہے۔ اس کا حلقہ ایسے غیر شعوری طریقے سے پھیلتا ہے کہ آدمی اس کی روز افزوں افزائش سے بے خبر رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو دولت مند ہے وہ اور زیادہ دولت کا خواہش مند ہے کیوں؟ ضرورت سے زیادہ دولت، بے ضرورت اور جس شے کی حسی حقیقت ہے ویسی ہی اُس کی نفسیات۔ بے ضرورت شے، بے ضرورت شے کو جنم دیتی ہے جس کے تصرف سے ہوس بڑھتی ہے اور ہوس کی ایک ہی جہت ہے، تکذیبِ نفس!

تایاجی دولت اور ہنر کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے تھے، ”انسان کے لئے دولت ایسے ہے جیسے بڑے لورنتہ کے لئے پاؤں۔ دولت ذہنی تشوہ کا تائید ہوتی تو دولت مند ہی ہنر کے سرچشمے ہوتے لیکن ہنر صرف غریبوں کی پونجی ہی ہے۔ جہاں ہنر ہے، وہاں طمانیت ہے اور جہاں طمانیت ہے، وہاں انسان کی مادی ضرورت کم ہے کیوں کہ وہاں روحانی ترقی کی فراوانی ہے۔ دولت مند کی دولت اُس کے ذاتی صرفے کے لئے ہوتی ہے اس لئے وہ کھڑنڈ کے کیڑے کی طرح مرتا ہے جب کہ ہنرور کا ہنر دوسروں کے مفاد کے لئے ہوتا ہے، یہ داتا مرتا ہے۔ ہنر ہی ایک شے ہے جس کی روایت ہر شے سے الگ ہے، یہ بانٹنے سے بڑھتا ہے۔“

وہ ہنرور کی حمد و ثنا پورے وثوق اور دل سے کرتے تھے، بے ہنر کے لئے زندگی، بددعا ہے اور دولت مند کے لئے بھیانک بددعا۔ پہلا جہالت کے تیرہ خانے میں وحشت زدہ ہے اور دوسرا ذہنی فرسودگی کی بدبو سے محبوس الحواس۔ ہنرور زندگی کی بازیافت کرتا ہے اور اُس کی تقسیم جدید کر کے اُس میں اور خود میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ کام صرف سچائی اور خوبصورتی اور خوشی ہی کے ماحول میں ممکن ہے۔ ہنرور زندگی کی ان خوبیوں کا محقق ہے اور سر پرست بھی۔

جلوس زیادہ لمبا نہ تھا۔ چوں کہ جلوس، ہجوم ہے اس کی افتاد ہمہ رنگ ہوتی ہے ڈھبٹائی، ناصبوری، نکتہ چینی، آہستہ روی۔۔۔۔۔ اُسے یوں آفریں کر رہی تھی جیسے غم گرفتہ آدمی کی فریاد اُسے کثیر الاطوار بنا دیتی ہے۔ جدھر دیکھو ایک ناقابلِ فہم تضاد تھا۔ کہیں خاموشی

کاتیبہ شور تھا اور کہیں شور کا نتیجہ خاموشی، کہیں سختی کا اثر نرمی تھا اور کہیں نرمی کا اثر سختی، کہیں ندانی میں ٹھہراؤ تھا اور کہیں ٹھہراؤ میں روانی۔ ہر کوئی بظاہر علیحدہ علیحدہ تھا لیکن نادیدہ طور پر ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ جو کوئی اس زنجیر سے ٹوٹنا چاہتا، اُس کی تنگ و تاز دیدنی ہوتی۔ وہ پہلے اپنے گرد کے ہجوم کا حلقہ توڑتا، آزاد ہوتا اور جدھر جانا ہوتا، جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنی زنجیر کے حلقے کو محض کھینچ کر بڑھاتا لیکن اُسے توڑ نہ سکتا۔ جو کوئی چلاتا، چلاتا اور جو کوئی چپ رہتا، چپ رہتا۔ انھیں دیکھ کر گمان ہوتا کہ پہلا اپنی طاقت کو اُسی کام کے لئے صرف کرتا ہے جو اُس کا قطعی مقصد ہے اور دوسرا اپنی طاقت کو اُس مقصد کے لئے محفوظ رکھے ہوئے ہے جس کا اُسی کو علم ہے۔ ہر کسی کی اپنی مرضی تھی۔ وہ چاہتا تو ہنگامے کا مرکز بن جاتا اور نہ چاہتا تو اُس سے الگ تھلگ رہتا، اُس موقع کی طرح جو دریا کا حصہ ہوتی ہے لیکن کنارے کنارے بہتی ہے۔ جلوس جن ہتھ سے رہتا روڈ کی طرف مڑا اور فیروز شاہ روڈ کی آمد و رفت سے ٹکرا گیا۔ وہاں ایسی کشمکش پیدا ہو گئی جیسے دو قوی الجوتہ دیو ایک دوسرے کو روندنے کو شیش کر رہے ہوں۔ سڑک پر ٹھہرے ہوئے طوفان کا گمان ہونے لگا۔ کچھ کاروں والے اُس میں پھنس گئے تھے، جن کی حالت بُری تھی۔ وہ دیکھے اور ہنسنے ہوئے تھے اور ادھر ادھر پہلو بند لے ہوئے کمر ٹوٹے کیڑوں کی طرح کھلبلا رہے تھے۔ ایک طرف بے اصلی، بے جگری، بے داد گری، بے دردی، بے ڈھنگی، بے رخی، بے ضابطگی۔۔۔ تھی تو دوسری طرف بے کسی، بے دلی، بے دماغی، بے ثباتی، بے سروپائی، بے سروسامانی، بے مقدردی۔۔۔ تھی ایک فسادِ زندگی تھی جس کا انجام معلوم تھا۔

آدمی کی زندگی، جسے یہ تنہائی میں پالتا پو ستا ہے، ہجوم میں ایسے ابھرتی ہے جیسے چنگاری دیکھتے ہی گھاس پھوس میں چھپی ہوئی آگ۔ قاریبیں! تاریخ کے ورقے اُٹھتے اور انسانی خوں ریزوں کی کہانیاں پڑھیں، وہ مذہب کی تبلیغ میں ہوئی ہوں کہ ملک گیری کی ہوس میں، قوم پر قوم کی برتری ثابت کرنے کے لئے کہ جنگ کی حکمت عملی آزمانے کے لئے، اُن حادثوں کی نفسیاتی کار فرمائی ایک ہی ہے منظم ہجوم کی منظم زندگی کی دیوانگی!

ایک لمبی کالی شورلیٹ کار کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک سچو بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر دو عورتیں، جنھوں نے اپنی اطراف کے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ اُن کے جوڑ باندھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ کار کے پچھلے شیشے سے خوبصورت لگ رہی تھیں۔ کئی شوق سے آگے بڑھتے جھکے، اندر جھانکے اور پھر سامنے دیکھتے۔ اُن کے چہرے اس بات کی تصدیق کرتے کہ انھوں نے

کوئی ناپسند شے دیکھی ہے۔ وہاں سے جہذ قدم آگے فاختی رنگ کی فی ایٹ کار تھی۔ اُس کی اگلی سیٹ پر جو ان لڑکا اور لڑکی بیٹھے تھے، جو بھائی بہن تھے۔ آپ سوچیں گے کہ میں اپنے انجانے کرداروں کے بارے میں وثوق سے کیسے کہہ رہا ہوں! میں واقعے کی تفصیل پس از واقعہ لکھ رہا ہوں اور آپ قبل از واقعہ کی تمہید بڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے کھڑکیوں کے شیشے کھول رکھے تھے جیسے انھیں ہجوم سے خطرہ نہ ہو۔ کاروں کو آگے راستہ نہ ملا، ڈرائیوروں نے انجن بند کر دیئے اور گردنیں باہر نکال کر پیچھے دیکھنے لگے۔ ایک جھلوسی فی ایٹ کار کی کھڑکی کے برابر آیا اور اپنا ہاتھ لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیا جسے وہ کھڑکی میں رکھے ہوئے تھی۔ لڑکی نے بچکر اپنا ہاتھ اندر کھینچنا چاہا، لڑکے نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لڑکی مغرور اور دلیر تھی۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے لڑکے کی نگھٹی میں گھونسا مارا اور ہاتھ آزاد کروایا۔

”کیا ہوا دیدی؟“

’بھائی کے لہجے میں احساسِ خاطر تھا۔

”کچھ نہیں، ایک بد تمیز کو تمیز سکھائی ہے!“

ویدی کے لہجے میں غم تھا۔

”شیشہ اُپر چڑھا دو!“

بھائی کی آواز خوف زدہ تھی۔

”ایسے ہی ٹھیک ہے!“

لڑکی کی آواز نڈر تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی کے ساتھ جم کر بیٹھ گئی جیسے وہ کسی بھی خطرے سے بچنے کے لئے تیار ہو۔ اُس شرارتی لڑکے کے ساتھی اُسے کسی دوسری شرارت پر اُگساہے تھے لیکن وہ دامن چھڑاتا لگتا تھا۔ اتنے میں کوئی دوسرا لڑکا معصوم سی صورت بنائے آگے بڑھا اور لڑکی کے گال پر جھپٹا۔ جب تک لڑکی نے جانا کہ کیا ہوا ہے، وہ گال کے چرائے ہوئے لمس کو چوم رہا تھا۔

”کُتے، بدماش! لڑکی نے چلاتے ہوئے ہاتھ باہر نکالا، کسی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اُسے مُصیبت میں دیکھ کر بھائی نے کار سے باہر نکلنا چاہا لیکن دروازہ ہجوم اور قبضوں کے درمیان ٹھس تھا۔

”ہم سائیکلوں کے لئے ترستے ہیں اور یہ سڑامی کاروں میں گھومتے ہیں!“

کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

”اگ لگا دو ان کو!“

کسی نے ترغیب دی۔

اُس ہجوم میں کوئی ایسا نہ تھا جسے اپنی خواہش کا احترام نہ ہو۔ آدمی پہلے خواہش کرتا ہے پھر اُسے پورا کرنے کی راہ نکالتا ہے، جو ایسا نہیں کرتا وہ نہ اپنے آپ سے انصاف کرتا ہے اور نہ سماج سے۔ انسانی ترقی کے جو مناظر نظر آتے ہیں وہ انفرادی خواہشوں کی مجموعی تصویر ہے۔ خواہش تخلیق کار کی تخلیقی تحریک ہے اور غاصب کی ٹوٹ مار۔ پہلے کے جذبے کی اصلیت، محبت ہے اور دوسرے کے جذبے کی حقیقت، نفرت۔ دیکھنے میں دوسرا پہلے سے زیادہ اکٹھا کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ اپنی ذات کے ساتھ سب کچھ گنوا دیتا ہے۔

ایک جُلوس نے جھنڈے میں سے ڈنڈا نکالا، گھمایا، کار کے وندسکرین پر مارا اور اُسے چور چور کر دیا۔ پل بھر کا سناٹا، گالی گلوچ، بلوا، شور۔۔۔ اور جُلوس پیچھے مڑنے کے سے انداز میں رُک گیا۔ کچھ پولیس والے جُلوس کے ساتھ چل رہے تھے، وہ دروی نہ پہنے ہوئے تو جُلوس کا حصّہ لگے۔ اُن میں سے ایک بچکچا ہٹ سے مقامِ حادثہ کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں وہ دونوں مجرم بھینٹ کی آفر آفری میں گم ہو گئے۔

”یہ اسی کی غلطی ہے!“

”بھینٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے!“

”بچے ہیں، جلنے دو!“

”یہ ادھر آیا ہی کیوں تھا؟“

”آب کیا ہو سکتا ہے؟ جو ہو گیا، سو ہو گیا!“

”مال اچھا ہے!“

کاروں والے مُردوں کی طرح بے حرکت تھے۔ جُلوس آگے بڑھنے لگے، کچھ اپنی مرضی سے اور کچھ پولیس کی ترغیب پر۔ ہوتے ہوتے کاروں والے بُلوسیوں سے الگ ہو گئے جیسے بارود اُترنے پر اُس میں گھرے نبات و آشجار۔

ہر جُلوس، جُلوس کا حصّہ ہو کر بھی ایک جدا گانہ شریک تھا۔ ایک کے پاس بھونپو والا ہارن تھا۔ وہ پیچھے سے اُگے بڑھتا اور کسی کے کان پر بھونپو بجاتا، کوئی جتنا چونکتا، وہ اتنا ہی خوش ہوتا۔ کسی نے اُس سے بھونپو مانگا لیکن اُس نے دینے سے انکار کر دیا۔ وہ مایوس نہ



”مجھے بیماری پڑی ہے! یہاں اچھے بھلے مرتے ہیں اور کوئی دھیان نہیں دیتا ہے۔“  
میں جس کے ساتھ بات کرتا تھا اُس کے ایک ساتھی نے اُس کی طرف داری کرتے ہوئے مجھے خاموش کر دیا تھا۔ اتنے میں کسی دوسرے آدمی نے میرے کا دھڑے پر ہاتھ رکھا تھا اور مجھے اعتماد میں لے کر کہا تھا، ”تو بھی شہزاد تھی ہے! تجھے تو خبر ہے کہ ہم سب کتنے نذاب جھیل کر آئے ہیں۔ ان دلی دالوں کو کیا معلوم کہ کیمپوں میں ہم پر کیا گزری ہے؟ کنبوں کے کنبے مر گئے یا مار دیئے گئے۔ دھرتی خالی لگتی تھی! دلی میں آکر دیکھا تو لگا کہ لوگ دکھاوے کے لئے مرتے ہیں اور پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔“

وہ لوگ انسانی برادری کے رکن تھے لیکن صرف اپنا بھلا چاہتے تھے۔ اُن کی اُمید، نور ارتقا کی طرح حیات پرورد اور ناامیدی، تائی کی زوال کی طرح مُہلک تھی۔ وہ سب کچھ لینا چاہتے تھے اور دینے کے خیال ہی کو گمراہ کن سمجھتے تھے۔ اُن کی کم ظرفی نے اُن پر انسانی ہمدردی کی راہ سدود کر رکھی تھی جو سماجی قدروں کی پاساں ہے۔ اُن کی زندگی چھوٹی سی گلی تھی جو اُن کی ذات سے پرے خلعت کی گہری کھائی میں بدل جاتی تھی۔

اپنی نفرت کی انتہا میں وہ بالکل میری طرح تھے۔ اُن کے اور میرے اندرون پوری مماثلت تھی، بس اتنا فرق تھا کہ میں اپنی نفرت کا مظاہرہ اپنے خیال میں کرتا تھا اور وہ علی طور پر۔

نعروں کا خروش بڑھتے بڑھتے گھٹتے گھٹتے گھٹ جاتا۔ خروش بڑھنے سے لگتا کہ کوئی ہزاروں سروں والا ناگ پھنکار رہا ہے، اور خروش گھٹنے سے سانسوں اور پیروں کی آواز پر بڑی دل کے گزرنے کا گمان ہوتا۔ میں تولہ ہوں تو تولہ اور ماشہ ہوں تو ماشہ قسم کا آدمی ہوں۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب میرے خون نے جوش مارا اور میں نعرے لگانے لگا۔ دوسرے لوگ نعرے لگاتے لگاتے تھک چکے تھے جب کہ میری آواز سندرست و توانا تھی۔ میں جلو سیوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ کچھ میری گرمی جذبات اور کچھ دوسروں کی حوصلہ افزائی نے مجھے صفتِ اول میں پہنچا دیا۔ کسی نے مجھے عزت بخشی اور ایک لال جھنڈی میری سائیکل کے اگلے چمٹے سے باندھ دی۔ اُس نے میرا وہ حال کیا جو تیز آنچ بجتی کرکھی کا کرتی ہے۔

میری ذہنی کیفیت کی نفسیات کا ثنائی تھی۔ مذہبی عقیدے اور بھروسے کی طرح میں گم راہوں کا راہنما، حاجت مندوں کا حاجت روا، مظلوموں کا ہی خواہ اور بے سہاروں کا عالم پناہ تھا۔ قارسین، میں اپنی پروازِ فکوح کا صحیح احاطہ نہیں کر پائا ہوں! میں دوبارہ غور کرتا ہوں۔ میں عین اوتاروں کی طرح تھا جو ست جگ، تریتا جگ، دو آپر جگ اور کل جگ میں آئے ہی اس لئے کہ وہ نوعِ آدم

کو اُس کے دُنیاوی دیکھوں اور رُوحانی مسئلوں سے نجات دلائیں، غریبوں کو دولت، بیماروں کو صحت، بادشاہوں کو مُلک دیں اور مقہوروں کو مغفوروں میں شامل کریں۔ جب تک وہ نہ آئے تھے اس لمحوں دُنیا میں عورتوں اور مردوں کے جسمانی رشتے ناجائز تھے۔ اُن کے آنے ہی سے وہ ناپاک رشتے پاک ہوئے، حرام زادے، حلال زادے بنے اور قابلِ احترام ہوئے۔

جُلوس میری راہنمائی میں پارلیمنٹ پہنچا۔ وہ خوبصورت اور رُعب دار عمارت مجھے حقیقہ و ادنیٰ لگی اور قومی راہنما اُس سے بھی حقیر و ادنیٰ۔ اُن کی بے مروتی! اُنھوں نے جتنے وعدے کئے تھے اُن میں سے ایک پورا نہ کر سکے تھے۔

غلامی بدستور تھی!

بیکاری بدستور تھی!!

غریبی بدستور تھی!!

وہ ہر چیز بدستور تھی جسے انسانی سماج کی لعنت کہا جاتا ہے۔ اُن سے میری نفرت میری کم ظرفی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ آزادی کے وقت سارے قومی نفسیات کا جو تجزیہ کیا تھا اُس کا عملی ثبوت تھا۔

یہ جتن، جتن، مسرت نہیں تماشا ہے، نئے لباس میں نکلا ہے رہنری کا جُلوس

ہزار شمع اُخوت بُھا کے چمکے ہیں، یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوس

یہ شاخ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے، اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی

نہ پھل سکی تو نئی فصل گل کے آنے تک، ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

وہ حُب الوطنی کے پردے میں دہشت پھیلا رہے تھے، جس کا ایک منظر میں نے پہاڑ گنج میں

دیکھا تھا جہاں دادخواہ رفیو جیوں پر لاٹھی چارج ہوئی تھی۔ میں رہنماؤں اور اُن کے وعدوں سے کس قدر

مرعوب تھا! پینڈت جواہر لال نہرو ہوشیار پور آئے تھے تو میں انھیں دیکھنے کے لئے بیس میل

پیدل چلا تھا لیکن انھیں دیکھ نہ سکا تھا۔ میں مایوس ہو کر بھی مایوس نہ ہوا تھا کیوں کہ اُن سے میری محبت

رُوحانی تھی۔ سردار پٹیل کی موت پر میں بے اختیار رو دیا تھا تو میرے ساتھیوں نے میرا ٹھٹھا اڑایا تھا۔

میرا خالص خلوص! میں اُن نکتہ چینیوں کا خیال نہ کرتے ہوئے بھڑاس نکال کر ہی چُپ ہوا تھا۔ میں نے

اُن سے یہ جملہ کہا تھا تو مجھے اس کی نوعیت تاریخی لگی تھی، ”تم جاہلوں کو معلوم نہیں ہے کہ یہ قومی سانحہ

ہے اور مُلک کا ناقابلِ تلافی نقصان!“

دلی میں وہ ہر چیز موجود تھی جس کی راہنمائی کر رہے تھے۔ اُن کے کردار دہرے تھے!



وہ دے کر کچھ نہ دیتے تھے اور دیکھ کر کچھ نہ دیکھتے تھے۔ وہ پارلیمنٹ، کمپن گاہ تھی جہاں انگریزوں کی جگہ اپنے چھپے بیٹھے تھے۔ وہ اپنے، اُس عمارت کے پتھروں کی طرح بے حس اور اندرون کی طرح کھوکھلے تھے۔

میں نعرے لگاتا ہوا احاطے کی دیوار پر چڑھ گیا اور ساحر کی نظم بولا اُٹھانے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں جو بول رہا ہوں، وہ آفاق کا اسرار ہے جسے ظاہر کرنے کے لئے وقت نے مجھے چنا ہے۔ میرے سننے والوں کی خاموشی میری خود بینی کی ترجمان تھی۔ وہ غیر مرئی الفاظ کو دیکھنے اور اُن کی خوبصورتی اپنے اندر جذب کرتے لگتے تھے۔ میرے اندر کا مُصلح اور مُجاہد پیدا ہوا اسی چاہتا تھا کہ ایک ناگہانی حادثہ ہوا۔ کسی نا عاقبت اندیش نے کامریڈ ڈانگے زندہ باد، کانفرہ لگا دیا۔ اُس ہنگامے سے وہ اعجاز خیز نفوذ باہمی رک گیا اور میں اپنی طبعی حالت میں لوٹ آیا۔ میری آواز میرے کھلے میں لٹھک گئی۔ ناٹے قد کا ایک آدمی، جس کی چال بے رعنوت تھی اور چہرہ مہرہ بے ربط، اُس طرف بڑھنے لگا جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ ہجوم اُس کے قدم لینے کے سے انداز میں راستے سے ہٹ گیا اور اُسی طرح میں، ہجوم کا چلن نہرا لیا ہے! اپنی دیوانگی میں یہ کسی کو تخت پر بٹھاتا ہے اور کسی کو تختے پر، پھر اپنی دائمی نیند سو جاتا ہے جس سے وقتی طور پر جاگتا ہے۔

میری جگہ جو دوسری آواز بلند ہوئی وہ کمزور اور بے لطف تھی لیکن ہر کوئی اُسے غور سے سن رہا تھا۔ میرے قارئین، میرے زوال کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے! جو نہیں سمجھے، اُن کی اطلاع کے لئے عرض کرتا ہوں کہ کامریڈ ڈانگے کی راہ بری کی تصدیق ہو چکی تھی لیکن میری عظمت حُسنِ نمود کی منظر تھی۔

## باب ۵۵

چہرہ ہے غم دہریں جلتی سی کتاب  
آنکھیں ہیں امیدوں کے فسر و گلاب  
جینے کی تمنا پہ گماں ہے ایسا  
گھر لوٹ کے آتا ہے کوئی خانہ خراب

(شاہ)

میں یونیورسٹی سے دُور سہی لیکن علم و فن کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ میں اس بارے میں کس قدر جذباتی تھا! میں کسی کالج کے پاس سے گزرتا، کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر طالب علموں کو دیکھتا لیکن اُن کے روشن چہرے دیکھ کر الجھ جاتا۔ اُن درو دیوار کو میں بھاری دل اور اُداس نظروں سے تکتا جو انسانی زندگی کے نشوونما کی ضمانت تھے۔ میں خواہش کرتا کہ انھیں چھوڑوں اور محسوس کروں لیکن اُن خوش نصیبوں اور خوش لباسوں کے سامنے میری ہمت نہ پڑتی۔ میں آفسردہ و نامراد آگے بڑھ جاتا، مجھے لگتا کہ میں وہاں خود کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ اُن درو دیوار کے لمس میں وہ گرمی تھی جو لہو کو رگوں میں آتش شوق بنا دیتی تھی۔ ارتقاء نفس کے وہ نازک لمحے مجھے اُس دنیا میں اڑا لے جاتے جہاں اُرز دئے زندگی، نشاط اُگتی ہوتی۔ میں نازک خیالوں سے رس لیتا ہوا گھر پہنچتا اور اُس رات اکثر میٹھے پسنے دیکھتا۔

میرے جذبات کی یہی ندرت تھی جو اُس دن مجھے پارلیمنٹ سے کھینچ کر دلی پولیٹکنک لے گئی تھی۔ سردار سادھو، گنگہ مان وہاں شیٹ میٹل فورمین تھے۔ وہ خوش اطوار اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں، میں اُن سے بیمار پور میں گھر پر مل چکا تھا لیکن کبھی اُن کے پاس کالج میں نہ گیا تھا۔ کالج کے ساتھ پولیس چوکی اور اسلحہ خانہ تھا جس کے اندر سے بھی کالج کو برک جاتی تھی۔ جس کسی نے میری رہبری کی، اُس نے مجھے دی راہ دکھائی۔ صدر دروازے سے آگے صاف سٹھرا باغیچہ تھا۔ تھالی چننے بڑے ڈیلیا کے رنگ برنگے پھول، باغبان نے دوشاخوں پر تنھام رکھے تھے۔ گل داؤد یوں کی کیاری موتیوں کا جڑاؤ ہار لگ رہی تھی۔ مہندی کی سیاہی مائل سبز باڑ ایسے ٹھک رہی تھی جیسے خوشبو کے کنسترو کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔ تراشی ہوئی گھاس کیاریوں کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی اور کیا ریاں گھاس سے بالکل صاف تھیں۔ ذرا تخیل کو دوڑاؤ تو لگے کہ احساس کمتری سے نجات پانے اور پھولوں کی قربت کا لطف اٹھانے کے لئے گھاس نے پتوں کا روپ دھار لیا ہے۔ نرم ردو ہوا چلتی تھی کہ موج شراب بہتی تھی۔ میں اتنا مسرور ہوا کہ سائیکل کھڑی کر کے ایک کیاری کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھ میں تنگی کی روح سرایت کر گئی۔ میں پھولوں کو چومنے لگا، سونگھنے لگا اور گالوں سے مس کرنے لگا۔ میری مستی میرے احساس، مستی پر چھا گئی اور میں نے آنکھیں موند لیں۔

میرے فطرت پسند مزاج کی پرانی خوبی ہے کہ میں کہیں حسین منظر دیکھتا ہوں تو اُس کا حصہ بن جاتا ہوں۔ اس رشتے سے ایک بھولا ہوا واقعا یاد کیا ہے۔ ہمارے کھیت میں سورج مکھی کھلتی۔ میں ہر پونے کے پاس کھڑا ہو کر اُسے اپنے قد سے ناپتا اور جو پودا میرے قد کے برابر ہوتا اُسے میری مکھی کا نام دیتا۔ میں اُس کا زیادہ خیال رکھتا اور اُسے دیر تک گال سے لگاے رکھتا جیسے میں اُسے اپنے اندر سمونا چاہتا۔ اپنے

رُوحانی اہنزار میں مجھے لگتا کہ وہ میری شخصیت کا حصہ ہے اور اُس کے بغیر میرا وجود ادھوارا ہے۔  
”ہینڈ زاپ“

ایک تیز طرار آواز آئی اور لوہے کی جھنکار میں مل کر زلزلے کی طرح گزرتی گئی۔ میں کانپ گیا اور گرتا رہا، ہاتھ اوپر کئے ایسے اٹھا جیسے میں دھرتی میں دھنس کر باہر نکل رہا تھا۔  
”وہی ہی ہاتھ اوپر کئے میری جانب مڑو نہ گولی مار دوں گا!“  
اُس حکم کی سختی سنگین سے زیادہ سنگین تھی جو میری پیٹھ میں چبھتی تھی۔ میں گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ میرے ساتھ دھرتی بھی گھومتی ہے۔

میں ہریانہ کے تھانے کے باہر بندوق برادر سپاہی کو دوسرے دیکھ کر اُس کی جستی و چوبندی پر خوش ہوتا تھا اور اُسے قریب سے دیکھنے کی آرزو کرتا تھا۔ میری دیر نہ آرزو پوری ہوئی لیکن میں خوف سے کانپنے لگا۔ میں جس کے سامنے کھڑا تھا، وہ سپاہی نما سانپ تھا جسے انسان ڈسنے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔

”مجھے مُعاف کر دو، مجھ سے غلطی ہو گئی۔“  
یہ جانے بغیر کہ میں نے کیا تصور کیا ہے، میں نے قصور مان لیا۔

”چل پیچھے ہٹ!“  
اُس کی دُشمنی برقرار تھی۔ وہ میری عاجزی سے پسیمان تھا۔  
”مجھے مُعاف کر دو! مجھے مُعاف کر دو!“

میری خوف زدہ تکرار اُس مظلوم کی سی تھی جو طاقت و ظالم کے سامنے بے بس پڑا ہو اور اُس کے آخری فیصلے سے ناخبر بھی ہو۔ اُس نے سنگین کو آگے بڑھایا، میں پیچھے ہٹتے ہوئے مہندی کی باڑ میں الجھ گیا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ مجھ پر لپکا جیسے میں نے اُسے دھوکا دینے اور بھاگنے کی کوشش کی ہو۔

”ہوشیاری دکھانی تو پرور کر رکھ دوں گا!“  
اُس نے سنگین میری چھاتی پر رکھ کر دبانے اور اپنا ارادہ واضح کر دیا۔ میں اُس وقت زمین سے چپک نہ گیا ہوتا تو وہ بے لچک لوہا میرے پار نکل جاتا۔

”میں بھاگ نہیں رہا تھا، باڑ میں پھنس کر گر پڑا تھا“ میں نے اپنی بدحواسی پر قابو پا کر کہا۔  
وہ تھوڑا پیچھے ہٹا اور سنگین اوپر نیچے کرتے ہوئے مجھے اٹھ کر کھڑا ہونے کا حکم دینے لگا۔ میں

گھٹنوں تک اٹھا اور اُس کے پاؤں پر گر پڑا۔ وہ اُچک کر پیچھے ہٹا جیسے یں نے اُس پر حملہ کیا ہو۔ میرے کرنے سے میرا صاف ڈھکے گیا اور میرا جوترا اُٹھل گیا۔ اُس نے میرے صدفے کو ٹھوک مار کر باڑ میں پھینک دیا مجھے کیسوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور کشاں کشاں تھانے کے اندر لے جانے لگا۔ سائیکل، راہ میں کھڑی تھی۔ اُس نے اُسے دیکھا اور میرے کیسوں پر بھٹکا دے کر پوچھا، تیری بہن؟

”جی ہاں“ میں نے جھٹکے سے بیدار شدہ دزد کو مشکل سے برداشت کرتے ہوئے کہا۔ اس کے باوجود میں اُس آہ کو زردک سکا جو میرے بے قصور دل سے اُٹھی تھی۔

”اوہ، شر پسند!“

لال جھنڈی دیکھ کر اُس نے الزام لگایا اور سائیکل کو ٹھوک مار کر گرادیا۔ میرے کیسوں کو اُس نے اور کڑا کر کے پکڑا اور مجھے گسیٹتا ہوا تھانے کے اندر لے گیا۔ یہاں اُس نے میرے کیس چھوڑے اور پیچھے سے دھٹکا مار کر لگے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کیس باندھ کر نئی صورت حال کا جائزہ لیتا، میں تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور مجھے پکڑنے والا سپاہی مجھ پر پٹر سپاٹنگ کا الزام لگا چکا تھا۔

”کوئی بہن؟“

تھانیدار نے شاید اُن سپاہیوں کو بلایا جو باہر برآمدے میں بیٹھے تھے اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دکھائی دے رہے تھے۔ اُن میں سے دو تابتڑ توڑ آئے اور میرے گرد کھڑے ہو گئے۔ میں اُن کے درمیان بھیڑیوں کے حلقے میں بہن کے بچے کی طرح کھڑا تھا۔

”اس کی تلاشی لو“ اُس نے گھرکنے کے سے انداز میں حکم دیا۔

وہ میری تلاشی لینے لگے۔ میرے پاس ایسا کیا تھا جسے وہ ڈھونڈ نکالتے۔ میری جیب میں سے ایک روپے کے نوٹ کے ساتھ کچھ بھان نکلی۔ اتنے میں کوئی دوسرا سپاہی میری پیگڑی اور سائیکل اٹھا لایا۔ اُس نے سائیکل باہر کھڑی کر دی اور اُس سے جھنڈی کھول کر پگڑی کے ساتھ میز پر رکھ دی جہاں مجھ سے برآمد شدہ میری دوسری پونجی پڑی تھی۔

”اوہ، شر پسند کیونٹ!“ تھانیدار دانت پیچھ کر بولا۔

قارئین! انسان، حیوان نہیں ہے کہ اس کے دیکھتے ہی کوئی اس کی فطرت کا صحیح تجزیہ کرے۔ انواعِ حیات میں ایک انسان ہی ہے جس کے خمیر میں تفاوت ہے۔ یہ کہاں کی دانائی ہے کہ ایک فرقے کے سارے افراد کو ایک ہی لٹھ سے ہانکا جائے؟ قانون کا ایسا رویہ آفاقی نفرت کا مُرتکب ہوگا اور بغاوت کا علم بردار۔ ہر ہتھیار کی طرح قانون ایک مہلک ہتھیار ہے جس کا بے سوچا سمجھا

استعمال سوچے سمجھے قتل کے مترادف ہے۔ مجرم کتنا ہی بڑا ہو، قانون سے ڈرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اُس کا فعل غیر قانونی ہے۔ چوں کہ قانون کے نگران کو قانون کی تصدیق حاصل ہے، اس پر نگرانی عائد ہوتی ہے کہ یہ اپنے اختیارات کا استعمال منصفانہ کرے ورنہ یہ اپنی کارگزاری میں مجرم کو پچھاڑ جائے گا۔ قانون اور انصاف کی جنگ میں انصاف کی فتح لازمی ہے ورنہ قانون، منصف کے فیصلے کے برعکس ظالم کا خون خوار خنجر ہوگا۔

تھانیدار کی آنکھوں میں ایسی روشنی تھی جو اذیت پسندی کی خوبی ہے۔ وہ سوال کرنے لگا۔ میں جتنی بے کسی ظاہر کرتا، وہ اتنی ہی بے دردی۔ میری بے گناہی کا عذر تخر آمیز تھا۔ میری بے وطنی اور بے کاری کی سچائی جان کر اُسے یقین ہو گیا کہ میں خاظمی اور اپر ادھی قسم کا آدمی ہوں۔ وہ مجھے قید میں ڈالنے کی دھمکی دینے لگا۔ میں کچھوے کی شکر لگایا، بارے میرے پاس اعضا چھپانے کے لئے خول نہ تھا۔ ”لوٹ اُتار! وہ تہ بھونکا لیکن میں نے اُس کا مفہوم سمجھ لیا کیوں کہ وہ انسان کی زبان بولتا تھا۔

میں نے کانپتے ہوئے لوٹ اُتارے۔

”پاجامہ اوپر اٹھا کر پاؤں دکھا! وہ پھر بھونکا لیکن مجھے سمجھنے میں تکلیف نہ ہوئی۔ میں پاجامہ اٹھا کر پاؤں دکھانے لگا لیکن اپنی کپکپاہٹ کی وجہ سے کھڑا نہ رہ سکا۔ میں نے دیوار کا سہارا لے کر پہلے ایک پاؤں دکھایا اور پھر دوسرا۔

”ہاتھ دکھا!

میں نے اُس کے کوٹھم دیتے سنا اور ہاتھ آگے بڑھا کر ہاتھ دکھائے۔ مجھے لگا کہ وہ میرے صاف ستھرے ہاتھ اور پاؤں دیکھ کر کچھ مرعوب ہوا ہے، جو لڑکیوں کی طرح خوبصورت تھے۔ دانت دکھا! وہ غرایا۔

میں نے باجھوں تک ہونٹ سکیڑ کر دانت دکھائے۔

وہ مجھے ایسے دیکھتا تھا جیسے بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے خریدار، جانوار کو اُکلتا ہے۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ میرے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مرعوب نہ ہوا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے پر نرمی کی جو جھلک دیکھی تھی وہ حقیقت میں حیوانیت کی پرچھائیں تھی نہ کہ انسانیت کی۔

”کپڑے اُتار!“

اُس نے ایسے کہا جیسے وہ میری ابرو ریزی کا ارادہ رکھتا ہو۔ میری جان ہی بچ گئی۔ ہریانہ

کے تھانے میں ملزموں پر تشدد دھوتا دیکھ کر میں سوچتا تھا، ”اس پسند شہریوں کے تحفظ کے لئے پولیس جو کرتی ہے بالکل ٹھیک کرتی ہے۔“ لیکن پیارے سنگھ بیٹنگڑی ولے کا مشاہدہ مجھ سے الگ تھا۔ وہ کہتا تھا، ”مجھے بد معاش بنانے میں پولیس کا ہاتھ ہے۔“ میں نے کبھی اس کی بات پر یقین نہ کیا اور سمجھتا رہا کہ پولیس جرائم کی روک تھام کے لئے ہے، یہ کسی کو جرم کرنے پر کیوں اُکسائے گی؟

”صاحب، میں بے قصور ہوں! میری یہی بھول ہے کہ میں پھول دیکھ کر بے قابو ہو گیا اور کیاری میں گھس گیا۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے اطراف دیکھا جیسے میں اپنے ساتھ کھڑے سپاہیوں سے اپنے بیان کی تائید چاہتا تھا۔

”مجھے معلوم ہے!“

تھانیدار نے سراہا یا جیسے وہ میرے اعتراف کی داد دے رہا ہو۔ اس نے میرے حملے کو دہراتے ہوئے کہا، ”مجھے معلوم ہے کہ تُو بے قصور ہے اور صاحب ذوق بھی۔“

اس محبت میں جو ہمت پوشیدہ ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ بے حس آدمی کی ہٹ دھرمی نفی پسند ہے، اس لئے یہ اپنے حریف کو ذلیل و رسوا اور بے دست و پا دیکھنا چاہتی ہے۔

”اس پھٹیچر کو دیکھو! وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا اور پھر مجھ سے، ”حرام زادے! یہ پھول تیرے جیسوں کے لئے ہی لگائے ہیں کہ وہ یہاں آئیں اور آرام کریں!“

”میری غلطی ہو گئی صاحب! آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔“

میں نے اپنی غلطی مانی اور معافی چاہی۔

”تو کہاں تک پڑھا ہوا ہے؟“

اس نے میری بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے سوال کیا۔

”میٹرک صاحب، لیکن میں بے قصور ہوں۔ مجھے چھوڑ دیجئے۔“

میں نے پوری بے کسی کا چہرہ لگا کر آخری الفاظ کہے۔

جتنا پوچھتا ہوں اتنا ہی جواب دے، سمجھا! ورنہ اسے تیرے وہاں گھسیٹو دوں گا!

اس ذلیل نے میز پر رکھا ڈنڈا اٹھایا اور اس کی پوری لمبائی پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ اس کے آزمودہ عمل کا صداقت نامہ ہو۔

تو نے گیٹ پر بورڈ نہیں پڑھا! نو تھورونیر، ٹر سپائرزول بی پروسیکیوٹڈ۔ یہ شرع عام

نہیں ہے۔ خطا کار سزا کے حق دار میں۔“ اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔  
”نہیں جناب!“

میں نے چاہا کہ اپنی لاعلمی اور لاپرواہی پر سرپیٹ لوں جو میری شامت کا باعث ہوئی تھی۔  
”اُس میں میرا قصور ہے۔“

اُس نے میرا مضحکہ اُڑایا۔ وہ کرسی پر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پوری اونچی آواز میں اپنا  
بھولا ہوا حکم یاد کر کے دہرایا، کپڑے اتار!

میں نے اپنے کپڑے کھال کھینچنے کے سے انداز میں اتارے اور بغلوں میں ہاتھ رکھ کر کھڑا  
ہو گیا جیسے کوئی اپنی عریانی ڈھانکنے کی بے سود کوشش کرے۔ وہ میرے قریب آیا، میرے گرد گھومنے  
لگا اور مجھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر سانپ رینگ رہا ہے۔ راوی کا بیان ہے  
کہ سانپ اُوپر چڑھ آئے، دم سادھے پڑے رہو، مُودی رینگتا ہوا اُگڑ جائے گا۔ لیکن بد قسمتی سے  
وہ سانپ، انسان نما تھا، اُس نے رینگتے رینگتے ڈس لیا۔ میں پہلے چیخا کہ تڑپا، یہ یاد نہیں ہے ہاں  
یہ صاف یاد ہے کہ اُس کے ڈستے ہی میں نے اُسے پہلے اپنے رونگٹوں سے دیکھا، پھر ماس سے اور پھر  
آنکھوں سے۔ میرے پیٹ پر بڑا نیلا دِغ ایسے ابھرا جیسے لکڑی میں برماے ہوئے چھید کے  
اُطراف بر (لگر)۔

”تو رہتا کہاں ہے؟“ اُس نے اچانک پوچھا۔

”ریگڑ ڈھ پورہ میں!“

اُس کے عتاب سے بچنے کے لئے میں نے اتنا ہی جواب دیا جتنا اُس نے کہا تھا۔

”ادھر کیوں آیا ہے؟“

اُس کا رویہ بدستور مشکوک تھا۔

”سردار سا دھوسنگھ مان صاحب سے ملنے!“

میں نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کچھ اعتماد سے کہا۔ میرے اعتماد میں یہ جذبہ کار فرما تھا کہ  
انھیں دلی کارہرزد جانتا ہے اور یہ بھی ضرور جانتا ہوگا۔ سچ جانے کہ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اُن  
کا حوالہ پہلے کیوں نہ دیا؟

”وہ جو پولیٹیکنک میں نورین ہیں؟“ اُس نے کچھ جھینپ کر سوال کیا۔

”جی ہاں، وہی!“

میرا لہجہ بھڑور اور نڈر تھا۔ اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی نظر کی دھار پہلے سے کند تھی۔  
 ”تُو انھیں کیسے جانتا ہے؟“

وہ کچھ حیران، پریشان اور بدگمان نظر آیا۔ اُسے اُلجھن میں دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا اور اُسے مرغوب کرنے کے لئے میں نے جھوٹ بولا، ”وہ میرے رشتے دار ہیں!“  
 میرے قار سین! میں اُن کا رشتہ دار نہ تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے میں نے اُن سے جس طرح کا رشتہ توڑا ہے اس سے پہلے میں اُس کی تذلیل کر چکا ہوں۔ شاید آپ بھول گئے ہوں! یاد دہانی کے طور پر دوبارہ لکھتا ہوں، وہ میرے ہم فرقہ تھے۔

”وہ تیرے رشتے دار ہیں!“  
 اُس کی حیرانی، پریشانی اور بدگمانی بدستور تھی اور صاف دکھائی دیتی تھی۔  
 ”جی ہاں!“

اُس کے بدلے ہوئے رویے سے فائدہ اٹھانے اور کچھ اپنی خودداری ظاہر کرنے کے لئے میں کپڑے پہننے لگا۔ پہلے تو وہ مجھے یوں ہی دیکھتا رہا پھر اپنی درندگی کو انسانی سمت دیتے ہوئے بولا، ”کم بخت! مجھے تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

انسان کی خوب صورت زبان، نام اور لباس کی ریاکاری اتنی ہی پرانی ہے جتنی تہذیب و تمدن کی دل فریبی۔ اس نقاب میں ہر ذلیل چیز، جس سے انسان کو موسوم کیا جاتا ہے اپنے معنی بدل لیتی ہے۔ یہی حال رتبے اور سیدہ نسب کا ہے۔ یہ دونوں ایسے ہیں جیسے کھوٹے سونے کے لئے تاؤ بند۔

اُس تھا تیار کا نام ہر دیال سنگھ تھا۔ باہمی رنجش اور تناؤ کو مزید کم کرنے کے لئے اُس نے سپاہیوں کو باہر بھیج دیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔  
 یہ جھٹڈی تو نے کہاں سے لی؟

میں ایک جلوس کے ساتھ پارلیمنٹ گیا تھا، کسی جلوس نے میری سائیکل کے ساتھ باندھ لی  
 میں نے دانستہ طور پر کامریڈ کے لفظ سے احتراز کیا۔  
 ”اسے نہیں رہنے دو“

اُس کا لب و لہجہ اچانک مؤدب ہو گیا۔ میرے پیٹ میں مروڑ پڑ رہا تھا، میں نے اُس کا



درد کم ہوتا محسوس کیا۔

”ٹھیک ہے جی!“

”سرور صاحب میرے دوست ہیں! میں کتنے دنوں سے اُن سے نہیں ملا ہوں۔ میں تیرے

ساتھ چلتا ہوں اور اسی پہلے اُن سے مل بھی آتا ہوں۔“

میں نے پہلی بار اُس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ اُس میں مضامین کی کوئی بات نہ تھی  
میں نے جو کہا تھا اُس میں جھوٹ سے سچ کا جزو زیادہ تھا۔ مان صاحب کی درکشاپ وہاں سے چند قدم  
پر تھی۔ انھیں دیکھتے ہی میں اُن کے قدموں پر ڈھے پڑا۔ وہ میرے خلوص کے قائل تھے اور میری مدد  
کرنا چاہتے تھے لیکن کسی موافق صورتِ حال کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے مجھے اٹھا کر گلے سے لگایا اور  
اپنے مترنم لہجے میں میری گھبراہٹ کا سبب پوچھا۔ میں تذبذب میں نہ تھا کہ کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں؟ میرے  
مؤمن نے میری مشکل آسان کر دی۔ اُس نے میری رُپسائی نگ کی واردات سُن دی اور باقی بات چھپالی۔  
مان صاحب نے چائے کا اہتمام کیا۔ جب تک بیرا چائے لے کر آیا، میں اپنے اُنسوؤں سے لڑتا ہوا گمان  
کرتا رہا کہ ہر دیال سنگھ مجھ سے اپنی زیادتی کی معافی مانگے گا اور اپنے کٹھور روئیے پر شرمندہ محسوس کرے  
گا لیکن اُس نے ایسا نہ کیا۔ وہ جیسے خوش گپیاں ہانک رہا تھا اُس سے ظاہر تھا کہ وہ میرے حادثے کو  
یکسر بھلا چکا ہے۔ میں چائے پی کر اجازت لے کر چلا آیا لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔

میرے قارئین، قانون اور جرم ایک ہی دہندے کے دو نام ہیں۔ جوں کہ قانونِ انسدادِ جرم  
کے لئے ہے اس لئے جرم سے زیادہ طاقت دہے۔ اور طاقت پر اختیار نہ ہو تو یہ زندگی اور موت کے  
درمیان باریک سی لکیر ہے۔ جیسے جنگل کی آگ، حیوانات و نباتات کو جلا کر دھرتی کی زرخیزی کو پا مال  
کرتی ہے، جس کی تجدید نہایت دشوار گزار ہے اُسی طرح مظلوم انسان کی خاطر داری اور تشکیلِ نو کے  
لئے بڑی جھکاو دی دے رہے۔

میرے ستم کرنے لے ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا جو میرے دل کے زخم کا مرہم ہوتا یا جس سے  
میں یہ آخذ کرتا کہ وہ اپنے غلط رویے پر شرمسار ہے۔ میرے اندر جواں مٹھی کھول رہا تھا۔ اگر وہ پھٹ پڑتا  
میرے وجود کے ساتھ اُسے بھی بھسم کر ڈالتا۔

انسانی زندگی تضادوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک تضاد ہے کہ معاشی بد حالی میں یہ دو طرح

سے نمایاں ہوتا ہے۔

اول، یہ مصیبت کو حقارت سے دیکھتا ہے، اُس پر ہنستا ہے، اُسے زندگی کی لعنت

سمجھتے ہیں، اُس کے خلاف بے جگری سے لڑتا ہے، جینے کے لئے لوٹ مار کرتا ہے اور لُٹیرا بن جاتا ہے۔

دوسرے، یہ مہیبت سے ڈرتا ہے، اُس کا احترام کرتا ہے، بے کسی کی زندگی گزارتا ہے رحم و کرم پر جیتا ہے اور بھکاری کہلاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں معاشی تفاوت کم ہو وہاں ایسے سماجی مسائل کم ہوتے ہیں اور ان دونوں قسم کے لوگ نہ ہونے کے برابر۔ اصلیت کی طرف نگاہ دیکھنے کو مشرق و مغرب میں بعد ہے لیکن نہیں ہے وہی بات ان دونوں مخالف جذبوں کی نفسیات میں ہے۔ دونوں کی مَجلِ خوبی ایک ہے کہ یہ حیرت و استعجاب کو رغبت دلاتے ہیں، اپنے مداح پیدا کرتے ہیں اور اپنے کمال کو پہنچتے ہیں لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ۔

یہ جذبے اور ان سے پیدا شدہ نتیجے اتنے ہی پرانے ہیں جتنے انسانی تہذیب کے قصے۔ پہلے جذبے کے شدید اُنی نے قتل و غارت کو اپنا پیشہ بنایا، اسے طرز تمدن ٹھہرایا، اپنے اثبات میں کمال کو پہنچا اور راجا بنا۔ اُس نے اپنے جاں بازوں کو اُن کی جاں بازی کا صلہ رتبوں، جاگیروں، تاجوں و دوشیزاؤں۔۔۔ کی صورت میں دیا۔ جس کسی نے اُس کی برتری کے خلاف سر اٹھایا، اُس نے اُس کا چچا کیا، اُسے پکڑا، جان سے مارا یا قید میں ڈالا۔

راجا کا دبدبہ اُس کا اصل تھا۔ وہ اپنی مستی کی تشفی کے لئے نئے نئے قانون بناتا اور اس طرح اپنی رعایا کے سیاہ و سفید کی توثیق کرتا۔ راجا قانون سے بالاتر تھا لیکن اُس نے اپنے دبدبے کے شایانِ شان قانون بنایا۔ جو اُسے پسند ہو وہ اُسے عزت دے اور ناپسند ہو تو اُسے بے عزت کرے۔

دوسرے جذبے کا شدید اُنی اپنی نفی کی انتہا کو پہنچا اور پیر کہلایا۔ وہ اپنے مریدوں کے نان و نفقہ پر پلت تھا لیکن اُن کی خدمات کا صلہ نہ چکاتا تھا۔ تاکہ اُس کے مرید صلے کی امید ہی نہ رکھیں وہ انھیں نفس مارنے کی تلقین کرتا، عسرت پسند اور حسرت گزیدہ بناتا، اس دنیا کو دھوکوں کا مسکن جتنا اور دوسری دنیا کو سکھوں کا گہوارہ۔ راجا کی طرح پیر کو بھی اپنا تسلط بڑھانے کا خبط تھا۔ اُس نے اپنے مریدوں کو اپنی اور اپنے خدا کی تمام تر دنیاوی اور دوزخ کی تلقین دلایا اور زور دیا کہ اُس کے ارشادات پر ایمان لانے ہی سے وہ پاک دامن اور جنت نشین ہوں گے ورنہ آلودہ دامن اور دوزخی۔ اُس نے مَخلوق کو گناہ گار ٹھہرایا، عذابِ دوزخ سے ڈرایا لیکن یہ بھی باور کروایا کہ میں اِصراف میں ہی تمہیں قہرِ خدا سے بچا سکتا ہوں۔ تم مرنے سے ایک سانس پہلے بھی میری جفا ظلمت میں آؤ گے تو تمہاری مغفرت کا ذمہ دار،

میں ہوں۔ میں تمہیں دائم جلتے دوزخ سے نکال لاؤں گا اور جنت کے سدا بہار سایے میں پہنچا  
آؤں گا۔

راج بھون	راج بھون
راج بھوج	راج بھوج
پانی	امرت
راج ادیان	مُدھون
جیوٹ	دھرمی
شستر	استر
شما	کلیان
داس	گندھرو
داسی	آپسرا
دارو	سوم رَس
کوٹوال	دھرم راج
بھگور	پاپی
زربل	ادھرمی
بندی گرہ	نرک
بھول	پاپ
جلاد	جَم دوت

اور آدمی اس خرافات کو دھرمی بانی (ربّی بانی) سمجھنے لگا۔

اس کی وجہ کیا ہے؟

جاہل اپنے اُدھورے پن کو تفسور سے پورا کرتا ہے اور عاقل اپنے عمل سے۔ زندگی کی  
حقیقت بھی یہی ہے! عمل کتنا ہی نزار ہو، تفسور سے پرکار ہوتا ہے۔

## باب ۵۶

نفرت کے خداوں کی عبادت چھوڑو  
تفریق کے سنگین بتوں کو توڑو  
تم چاند ستاروں کی طلب سے پہلے  
انسان سے انسان کے رشتے جوڑو (شاطر)

میں کالج سے باہر نکل کر سائیکل پر سوار ہوا تو معلوم پڑا کہ 'فری ڈھیل' پر سے چین اُتری ہوئی ہے۔ میں اپنی طرف کھڑے کھڑے اُسے چڑھانے لگا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ میں نے سائیکل، سیٹڈ پر کھڑی کی، دوسری طرف بیٹھ کر گراری پر سے چین اُتاری اور پہلے فری ڈھیل پر چڑھائی پھر گراری پر۔ ایسے ہی اڑے وقت کے لئے میں نے کاٹھی کے کور اور سپرنگ کے درمیان ایک کپڑا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے نکالا، ہاتھوں کو بونچھا اور اُسے وہیں رکھ دیا۔ میں کچھ دُور تک بیدل چلتا رہا اور آل نٹ ہوٹل کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ کدھر جاؤں؟ میں بے ٹھکانا سا تھا۔ میں پیارا سنگھ کے پاس جانا چاہتا تھا جو کشمیری گیٹ کے جی۔ پی۔ او۔ کے سامنے کے ریلوے کو اڑ میں اپنے خسر دیپ سنگھ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ سات بجے کے قریب کام سے آتا تھا اور اُس وقت تقریباً چار بجے تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد مجھے میرا ٹھکانہ مل گیا، میں قدسیہ پارک میں جا کر لیٹ رہا۔

پیارا سنگھ اس کو اڑ میں رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ وہ وہاں اس لئے رہتا تھا کہ اُسے کئی طرح سے بچت تھی۔ مکان کے کرایے کی، مصارف کی اور ایندھن کی۔ مکان کے کرایے کے بات سیدھی سی ہے رہی مصارف کی بات، وہ انھیں اپنے خسر سے آدھے آدھے بانٹتا تھا حالانکہ اُس کا گنہ اُس سے بڑا تھا۔ وہ کو اڑز ریلوے یارڈ کے قریب تھے جہاں 'لوکو موٹوز' کے لئے کولے اور پانی کا انتظام تھا۔ اُن کو اڑز میں کچھ فائر مین رہتے تھے۔ جو کوئی ڈیوٹی پر ہوتا وہ اپنا 'لوکو موٹو' کو اڑز کے پاس سے گزرنے والی ریلوے لائن پر لاتا اور دیوار کے اوپر سے ادھر کو ملے پھینکتا۔ جب تک وہ یہ کام کرتا، ڈرائیور بھاپ اُڑاتا، سیٹی بجاتا اور تاکت جھانکتا۔ کہتے ہیں کہ جُور، شریف آدمی سے زیادہ دریا دل ہوتا ہے۔ اس کہات

کی سچائی یہاں دیکھنے میں آتی تھی۔ چند فائر مین سارے میچنوں کو ایندھن مہیا کرتے تھے۔ وہ کوئلہ کچی ہوتا تھا جس کا کاربن جلا کر انگیٹھی کے قابل بنانا پڑتا تھا اس لئے ہر گھر کے آگے کوئلے کا ڈھیر جلتا رہتا تھا اگر یلوے یا رڈ کی جانب سے جوا چلتی، وہ 'لو کو موٹو' کے دھویں کے ساتھ اُن جلتے ڈھیروں کا دھواں بھی اندر سیٹ لاتی۔ ترختے کوئلوں کی چنگاریوں سے آنکھوں کو ایسے سچا ناپڑتا تھا جیسے گڑ منڈی میں منڈ کو مکھیوں سے۔ اس صورت حال کے بارے میں بیارا سنگھ کا ردِ عمل نہت سمیز تھا۔ یہ نظارہ شمشان گھاٹ سے بڑھ کر ہے! وہاں بیک وقت ایک دوستان جلتے ہیں اور یہاں پورے پندرہ!

اُس کے پاس جاتے ہوئے میں اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ رات کا کھانا وہیں کھاؤں اور ایک وقت کی روٹی کے پیسے بچاؤں۔ بیارا سنگھ کی بیوی کا نام گیان کور ہے۔ ریکھوں میں ناموں کی ساخت بالکل الگ ہے، کسی کے آدھے نام سے اُس کی صنف قائم کرنا محال ہے۔ گیان کور کے بارے میں اُس کی ساس کہتی تھی، اپنی صورت کے ساتھ اس کی ماں نے اسے کوکھ بھی دے دی۔ وہ وہاں بلا لیں جلتی ہے اور یہ جہاں!

اپنی جنس کی طرف عورت کا منفی رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ تقسیم وطن کے بعد کسی ایسی عورتیں بھیک مانگنے آئیں۔ اُن کے دودھ کاٹے ہوئے اور جسم کے نازک حصوں پر کچھوں اور بچوں کے نشان تھے وہ عورتیں زیادہ تر عورتوں ہی سے اپنا دکھڑا روتیں اور وہ انھیں بے دزدی سے لتاڑتیں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا ہے اچھا ہی ہوا ہے۔ ایک بار میرے تایا جی نے تائی کو ایسا کہتے سنا، انھوں نے بے اعتیاد سے کہا، ”آدیت خواہی کی حد ہوتی ہے اگر ان کی جگہ تو ہوئی، اپنے زخموں کی مسکرا کر نمائش کرتی اور انھیں حقیر جتاتی، جن کے ساتھ ایسی درگھٹنا نہیں گھٹی ہے۔ وہ تیرے جیسی ہی تھیں! جنھوں نے اپنی بیوہ بہنوں کو چیتاؤں میں دھکیلوایا، جلویا، اُن کے زخموں سے لطف اٹھایا اور انھیں سستی کا مفقہ سس مقام دیا۔“

اپنے سکول کے دوران میں نے ایسی مثال دیکھی تھی۔ میرا ہم جماعت محبوب علی عزا داری میں کھائے زنجیروں اور پھر لوں کے زخموں پر اترتا تھا، اُن کی نمائش نہایت شان سے کرتا تھا اور اُسے حقیر کہتا تھا جو بے سادہ کر سکتا تھا۔

گیان کور نے اپنی ساس کے الزام کو جھٹلایا تھا۔ وہ فطری طور پر بد لگئی اور جسکی تمکنتی رہتی جیسے اُس کی عمر گزراں اُسے جینے کے نئے انداز سکھا گئی ہو۔ بیارا سنگھ خود لہکا مہکا رہتا۔ اُس کے مزاج سے نیا ڈنک ہویدا تھا اور وہ خود کو مردوں کا امام سمجھنے لگا تھا۔ سیوا سنگھ کی لڑکیوں کو عمر کے لحاظ سے

کھڑا کرو تو سیڑھی بنتی تھی۔ پیارا سنگھ نے اُسے نہ کا پید ا کرنے کا گرتایا، عمل کے دوران بیوی کے سر پر پگڑی باندھا کر، نثر طبع لڑکا ہو گا! کہتے تھے کہ اُس نے ہو ہو ہو وہی کیا جو پیارا سنگھ نے اُسے بتایا لیکن بڑا ہو کر چل کا جس نے عین وقت پر روشن کور کے سر پر سے پگڑی گرا دی۔

گیان کو رنے استخارہ لے کر لڑکے کا نام ملکیت سنگھ رکھا لیکن اُس کا باپ اُس کے نام سے خوش نہ تھا جیسے اُس کا عذرا استخارے سے زیادہ پاک اور مبارک ہو۔ وہ اُسے جانشین کہہ کر بلاتا اور اپنی مردانگی کے ثبوت میں اُسے تنکا رکھتا۔

پیارا سنگھ کے جذبے سے ملتا جلتا جذبہ میں نے نمبردار جگت سنگھ میں دیکھا تھا۔ ایشر سنگھ اُس سے طنزاً کہا کرتا تھا، ”تمہارے مرنے کے بعد یہ سب کچھ میرا ہی ہے! اسے جیتے جی مجھے دے دو اور جو روٹی دو روٹی کھانی ہے، آرام۔ سے میرے پاس کھائے جاؤ۔ دن رات کس کے لئے مرنے ہو؟ یہ ٹہمت امیز حملے سن کر جگت سنگھ کے چہرے کے اسلوب ایسے بگڑ جاتے جیسے کوئی بھری بزم میں کڑوی کیسی شے منہ میں رکھ لے اور شرم سے نہ اُسے اگل سکے اور نہ نگل سکے۔ وہ اپنے سر کو سینے پر جھکائے رکھتا جیسے کسی مجرم کے گلے میں بھاری طوق ڈال کر پاؤں سے جکڑا ہوا ہو۔ ایک رات پچھلے پہر اُس کی بیوی نے اُسے بیٹے کا تحفہ دیا۔ جگت سنگھ جھٹ پر چڑھ گیا اور تھالی پیٹنے لگا۔ رات کے ستائیس میں اُس کا رویہ عدم میں اپنا وجود منوانے کے مساوی تھا۔ وہ تھالی پیٹ رہا جب تک کہ سارا گاؤں اُسے مبارک باد دینے کے لئے اُس کے گھر میں نہ پہنچ گیا۔ اُس دن سے اُس کے جینے کے طور طریقے بدل گئے۔ وہ سر اڑائے، مڑھ چھوڑے ایشر سنگھ کے دروازے پر جاتا اور چلاتا، ایشر سیاں کیا حال ہے؟ اُس کا گستاخ انداز اس حقیقت کا غماز تھا کہ وہ ایشر سنگھ کا حال پوچھنے کے پرے میں اُسے اپنا حال بتا رہا ہے۔ اُس کی نفسیات ہی بدل گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا آسمان کو گھورتا جیسے اُس پر کمند پھینکنا چاہتا ہو۔ وہ کسی چلاتا ہوا ایسی آواز نکالتا جیسے ساری دھرتی پر اپنی وراثت کا دعویٰ کرتا ہو۔ اُس نے اپنے جذبے کے شایانِ شان اپنے بیٹے کا نام بوٹا سنگھ رکھا۔ وہ بڑا ہونے لگا، کسی سے کچھ سیکھنے لگا اور کسی سے کچھ لیکن اُس کے باپ نے اُسے جو سیکھایا، وہی سیکھا سکتا تھا! بوٹا سنگھ اپنی پچھنو ہاتھ میں پکڑ کر ایشر سنگھ سے پوچھتا، ”تایا جی! یہ کیا ہے؟“

میں پیارا سنگھ کے گھر جانے کے لئے اٹھا تو قدسیہ پارک روشن ہو چکی تھی۔ وہ کام سے لوٹا نہ تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر میں نے اوپر سے دل سے کہا، ”اچھا بھابی، میں چلتا ہوں! بھائی صاحب جانیں کب آئیں؟“

”جلدی جانا ہے تو میں کھانا ابھی بنائے دیتی ہوں، ورنہ ملکیت کے بابا بچہ کا انتظار کر، وہ کہتے ہی ہوں گے!“ بھابی نے سُلّس لہجے میں کہا۔

بھابی پہلے پیارا سگھ کو اوتار (اُن کی بڑی لڑکی کا نام) کے باپ کے نام سے بلاتی تھی۔ اُس کے بعد اُس کے دو لڑکیاں اور ہوتی تھیں لیکن اُس نے اپنا طرزِ تحاطب بدلا نہ تھا۔ اُس میں اچانک تبدیلی پا کر میں نے مذاقاً پوچھا، ”بھابی! اوتار کے باپ کو کیا ہوا؟ وہ کہاں چلا گیا؟“  
 ”اُسے پاکستان بھیج دیا ہے!“ اُس نے ہنسی روکے ہوئے جواب دیا۔  
 ”ٹھیک کیا، اب اُسے کتنے بھی مت دینا! میں نے اُس کی بات سے لُطف لیتے ہوئے، اُسے مشورہ دیا۔“

”میرا بھی یہی ارادہ ہے!“

اُس نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں ملکیت کو باہر گھملاؤں۔ اُس نے چلنا شروع نہیں کیا تھا لیکن اُنکلی پکڑ کر سیدھے ٹیڑھے پاؤں اٹھانے لگا تھا۔ اُسے رستہ پر سے اٹھا کر میں باہر لے جانے لگا۔ بھابی نے مجھے روکا، ”خدا اٹھ!“ وہ اندر گئی، نیا پوتڑا لائی، ملکیت کا پوتڑا بدلا، اُسے اٹھا کر مجھے دیا اور احساسِ خاطر سے کہا، ”تیرے کپڑے نہ خراب کر دے!“

میں کون سا کھواب پہننے ہوئے ہوں! میں نے ملکیت کو اٹھاتے ہوئے بظاہر ٹھٹھے سے کہا لیکن میں اندرونی طور پر کسرِ نفسی میں مبتلا تھا۔ بھابی خاموش اور سنجیدہ رہی اور میں ملکیت کو کاندھے سے لگائے باہر نکل گیا۔ وہ سڑک کی گہما گہمی سے متاثر ہوا اور کاندھے پر سے سر اٹھا کر آمد و رفت کو دیکھنے لگا۔ اُس کی سہولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے، میں نے اُسے باہوں میں لے لیا اور کانا باقی کر، کرتا ہوا اُس سے بائیں کرنے لگا۔  
 ”یہ دیکھو، سائیکل ہے!“  
 ”وہ دیکھو، کار ہے!“  
 ”وہ کس ہے، بولو کس!“

وہ چُپ تھا اور حیرت سے ہر چیز کو دیکھتا تھا جیسے اُس کی تفسیر اپنے طریقے سے سمجھتا ہو۔ اُس کا چہرہ اپنے آپ سے اس قدر ملتا تھا کہ وہ اُس کا چھوٹا نقشہ نظر آتا تھا۔ میں کو اُٹروں کے احاطے کے دروازے پر کھڑا تھا اور اپنے نتھے ساتھی کو طرح طرح سے بہلاتا تھا کہ میں نے لال قلعہ کی طرف فٹ پاتھ

پر غیر معمولی بھیر پائی۔ میں نے غور سے دیکھا، مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہاں بے بستی سائیکل سواروں کے چالان ہو رہے ہیں۔ میں چلتا چلتا ریلوے پل کے پاس پہنچ گیا جو دلی ریلوے اسٹیشن کو جنائپل سے جوڑتا ہے۔ کشمیری گیٹ کو جانے والی سڑک وہاں پر دو شاخے میں بدلتی تھی اور جہاں ریلوے کو اڑز ختم ہوتے تھے وہاں پھر ایک ہو جاتی تھی۔ اہل دلی کے نزاری رویتے ہیں، میں نے کہیں ہم آہنگی دیکھی تھی تو وہ یہ تھی کہ جہاں ایسی پکڑ پکڑ ہوئی تھی، دوسری طرف سے آنے والے سائیکل سوار اس طرف سے جانے والے بے بستی سائیکل سواروں کو خبردار کر دیتے تھے اور یہ پیدل چلنے لگتے تھے۔ میں کئی بار ایسے حالات میں پھنسا تھا اور ایسے ہی ہنزدہ، سائیکل سواروں کی وقتی اعانت سے پولیس کے چنگل سے بچا تھا۔

یہ بات میں ہزار وثوق سے کہتا ہوں کہ جرم میں ساتھ ملانے کے لئے آدمی کو نہ ترغیب دینے کی ضرورت ہے اور نہ بلادے کی، یہ ایک دم پورے کا پورا اکادہ رہتا ہے۔ لیکن کسی جائز مہم میں حصہ لینے کے لئے اسے ہر طرح سے مائل کرنے پر بھی اس کی بے دلی مستقل رہتی ہے اور شرکت کی توقع اٹھوڑی تا یا جی کہتے تھے، ”جا بھارت کے زمانے میں سارے دانش ور جانتے تھے کہ جنگ انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے لیکن وقت آیا تو ہر کوئی کسی نہ کسی بہانے اس فریق سے جا ملایا اس سے۔ نوع انسان اپنی منفیت میں ایک ہے لیکن قطعیت میں الگ! اور یہی اصلی انسان کی پہچان ہے کہ وہ بھیر میں اکیلا ہوتا ہے۔“

پولیس نے وہ مقام بڑی دور اندیشی سے چنا تھا۔ میں پل کے ادھر کھڑا ہو گیا تاکہ پیارا سنگھ آئے اور میں اسے آگے چھپے ہوئے خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے میرا ذاتی جذبہ کُل بن گیا اور بے بستی سائیکل سواروں نے اتر کر چلنا شروع کر دیا۔ اس کام کے لئے میری مزید ضرورت نہ تھی۔ میں وہاں سے آگے چل پڑا اور ٹریفک کنٹرول آئینہ ٹکے پاس جا کر رکا۔ میرا انتھاسا تھی اپنی دنیا میں چپ چپ مت تھا۔ میں جب ایک پہلو تھکتا اسے دوسرے پہلو اٹھا لیتا۔ پیارا سنگھ آیا، میں اسے پہچان نہ سکا۔ وہ ریلی کی نئی سائیکل پر سوار تھا جس پر ڈامنوفٹ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوا اور پھر خوش ہو کر مجھ سے اپنے جانشین کو لے لیا اور سائیکل مجھے تھا دیا۔ میں نے بے قابو ہو کر پیارا سنگھ کو بتایا کہ میں نے کیسے چالان کرنے والوں کا بھانڈا پھوٹا ہے ورنہ وہ جیسے چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں، اُن سے کوئی نہج نہ سکتا تھا۔ وہ خلاف امید سائیکل والوں پر تہمت لگاتے ہوئے بولا، ”جو سائیکل خرید سکتا ہے وہ بستی کیوں نہیں لگو سکتا؟“

میں اس کی بدلی ہوئی نفسیات پر حیران رہ گیا۔ جب اس کے پاس پرانی سائیکل تھی، جس



پرستی نہ تھی، وہ چالان کرنے والوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ ہم گھر پہنچے، سبھی ٹھنی بھابی نے دروازہ کھولا۔ پیارا سنگھ لہک کر بولا، ”لگتا ہے کہ دوسرے جاننیں کے استقبال کی تیاری ہو رہی ہے!“  
 ”کچھ شرم کیا کرو! اُس نے لٹا کر کہا۔

”گیان، میں اب سمجھا کہ تیری بھابی اتنی سیوا کیوں کرتی ہے؟ جب میں کام سے آتا ہوں مجھے گرم پانی سے غسل کرواتی ہے۔ کہتی ہے کہ تکان سے جڑے انگ کھل جاتے ہیں۔“  
 اُس نے انگ کھل جاتے ہیں، کچھ ایسے کہا جسے اُس کے کہنے کا مطلب کچھ اور ہو۔  
 ”تیرے بھیا نے شرم، مٹھائی سمجھ کر کھا رکھی ہے!“

بھابی نے یہ جملہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور پھٹکارنے کے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ وہ اپنے منہ پھٹ پتی کو غصے سے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی جیسے کوئی جھولا ہوا کام یاد آگیا ہو۔ پیارا سنگھ نے غسل کیا، لیونڈ کے دو پھاہے بنائے، ایک مجھے دیا اور دوسرا اپنے کان میں رکھ لیا۔ اُس کی ہر آواز اُس کی خوش فامی کی طرح دل پر سند تھی۔ اُس میں ایک ہی بُری بات تھی، وہ مجھے کسی کام پر نہ لگاتا تھا۔ بھابی کھانا پروستے لگی۔ میں ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانہ میں گیا۔ پیارا سنگھ میرے ہاتھ دھولانے کے بہانے وہاں آیا اور راز دارانہ انداز میں بولا، ”کچا ماس کھایا ہے کبھی!“  
 ”بالکل نہیں! وہ کیسے کھایا جاسکتا ہے؟“

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا اور ہاتھ دھونا دھونا ڈگ گیا۔  
 ”آج بتاؤں گا تجھے! میں کھانا کھا کر تیرے ساتھ چلوں گا۔“  
 اُس نے میرا کندھا دبایا اور مجھے تولیہ پکڑا کر باہر چلا گیا۔

میں نے سمجھا کہ وہ مذاق کرتا ہے۔ میں کھانا کھا کر گھر جانے لگا اور وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ پُرانی دلی کی سڑکیں نئی دلی کے مقابلے میں تنگ ہیں اور شام کے وقت گزری لنگے سے اور تنگ ہو جاتی ہیں۔ میں نے پہلی بار دیکھا، وہ سائیکل چلانے میں مجھ سے ماہر ہے۔ میں اُس کا ساتھ نہ دے سکتا اور اُسے آہستہ چلنے کے لئے کہتا۔ وہ قطب روڈ پہنچ کر رکتا تو اُس کا سوال میری سمجھ میں آیا۔

قاربین، میری نفس پرستی کی کج روی و صاحت طلب نہیں ہے۔ میں گندگی کے کیڑے کی طرح تھا جو اپنی تسلی کے لئے گندگی ہی کریدتا ہے۔ لیکن اُس وقت میری شدتِ احساس یوں نمایاں ہوئی جیسے کوئی معصوم تشدد کی تاب نہ لا کر سہم جاتا ہے۔

ضرورتِ حیات، بے چارگیِ حیات، حمایتِ حیات کی تثلیث، بقائے نفس کی کسی تمثیل

تھی! قصہ و غم کے فقدان نے آج ہستی کو کس پستی میں لے جا کر آیا تھا! انسانی زندگی ادا ابدی کا دوسرا نام ہے۔ اسے کہاں، کیا ہو جائے؟ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! یہ صحیح الدماغ رہے تو ایک بات لازم ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ بننے کے لئے عزم صادق چاہیئے۔

انسان کی دوسری ضرورتوں کی طرح بھوک بھلاں ایک ضرورت ہے اور واحد ضرورت ہے جو خیال سے ارمان تک اور ارمان پورا ہونے تک لذت آمیز ہے۔ چوں کہ اس کا آغاز اور دوران اور انجام عشرت دیدہ ہے اس ضرورت میں نفاست قائم رکھنا مشکل ترین عمل ہے۔ اس کی فطرت میں ایسی خواہش باخستگی ہے جو ہر وقت اپنی خوں آشامی پر ناز کرتی ہے لیکن کبھی اپنی بے صبری کی خاطر جمی نہیں ہوتی ہے۔

لباسوں کی چمک، گیسوؤں کی ٹہک، مانگوں کا سینڈور، ہونٹوں کے گلاب، آداؤں کی پزیرائی، باتوں کی نغمی، لہجوں کی دھنگ۔۔۔ ہر چیز مدھر ملن کی طرح تھی۔ وہ حُسنِ مقناطیسی کشش رکھتا تھا اور سراپا نیاز لگتا تھا۔ لیکن وہ مجبوری، جسے اُس نے اپنی رُوح کی گہرائی میں گاڑ رکھا تھا، اُس کی جھلک میں نے اپنی رُوح میں دیکھی۔ میں اُس کے پاس سے اُٹھ کر چلا آیا، کمزور کمزور، شرمندہ شرمندہ، اُداس اُداس!

پیارا سنگھ حجۃ عروسی سے باہر نکلا، مجھے سامنے دیکھ کر زہرِ نیکھے سمسٹر سے بولا، کیوں اندر گئے کہ باہر ہی سے باہر آگئے؟  
میں گونگا سا کھڑا رہا اور بے کسی سے اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے کسی محرم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر آیا ہے۔ اُس نے میرے جیسے بھوکے پیٹ کو اپنے کھنڈے چاٹو سے کاٹا ہے اور بدلے میں اُسے روٹی کا ٹکڑا دیا ہے۔

میری کہانی شروع سے لے کر یہاں تک مجموعہ اُضداد ہے اور یہی میری حقیقت ہے۔ میں اپنی حقیقت کی طرف داری نہیں کرتا ہوں لیکن کوئی اور حقیقت، جسے تمام تر پاکیزگی اور پوری بے عیبی سے منسوب کیا جاتا ہے، حقیقت نہیں ہے۔ جو کوئی ایسی حقیقت کا دعویٰ کرتا ہے، ریاکار ہے! مکار ہے!!

پیارا سنگھ کو میری حقیقت معلوم ہوئی اور دوسرے ہی دن میرے بارے میں یہ چرچا ہونے لگا کہ میں نامزد تھا۔

اپنی نظم 'مادام' میں ساجر لکھتے ہیں،

نورِ سرمایہ سے ہے رُوئے تمدن کی جلا  
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی  
مُغلی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے  
بھوکِ آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

ان اشعار کا مفہوم ہم اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی روشنی میں دیکھتا ہوں اور اپنا نتیجہ اخذ کرتا ہوں۔ اُن سنگدل حالات میں میری حسِ لطیف مرتے مرتے بجی تو وہ میری فطرتِ مینی اور سُخنِ رَمَہ کا کمال ہے۔ ورنہ جو کوئی فن کار نہیں، اُسے سوز و گداز سے مرو کا رہیں۔ ایسا شخص امیر ہو کہ غریب بچر حیا سے پر ٹھنٹھ ہے، جسے کوئی بہار ہرا نہیں کر سکتی۔

بازارِ ہوس میں جسمِ آد لوث مساوی ہوتے ہیں کیوں کہ ہاتھوں ہاتھ بدلتے ہیں۔ دونوں کے چلن ایک ہیں لیکن انجامِ جدا جدا۔ مسلنے اور مروڑنے پر نوٹوں کی قیمت یکساں رہتی ہے لیکن جسموں کی قیمت گرتی جاتی ہے اور گرتی جاتی ہے آد بازار کی چلا چلی میں ایک موڑ ایسا آتا ہے جہاں انھیں غیر ضروری اشیاء جان کر گوشہِ گمنامی و نا کسی میں پھینک دیا جاتا ہے۔

اُن مٹی ہوئی آدھ کھلی زرد کلیوں، کے منقر کا نفسیاتی اثر! میں کئی دن تک اُداس رہا جیسے اُن کی تقدیر کا ذمہ دار میں ہوں۔

## باب ۵۷

اخلاص اُسے راس نہیں ہوتا ہے  
قدروں کا اُسے پاس نہیں ہوتا ہے  
کس بات میں کیا حُسن ہے؟ کیا معنی ہے؟  
کم ظرف کو احساس نہیں ہوتا ہے (شاہ)

سانپوں کی سبھا میں زبانوں کی پیاپ مشہور ہے۔ جہاں میں تھا وہاں جتنے منہ تھے اُس سے کئی گنا زیادہ زبانیں تھیں اور ہر زبان کی بے ہودگی دیکھنے اور سُنے کے قابل تھی۔ میں چُپ رہتا تو مجھ پر

پہتتیاں کسی جاتیں اور بات کرتا تو مجھے جھڑکیاں پڑتیں۔ ہر عمل کا اپنا ردِ عمل ہے، میری بیکاری نے طرے سے میری لعنت بن گئی۔ جس کسی کو بازار سے سودا سلف لانا ہوتا، گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹوانا ہوتا، اُس کی نظر مجھی پر پڑتی۔ میری غریبی نے دوسروں کی خدا ترسی کا روپ دھار لیا۔ خدا ترسی، حقار اکبر رحم دلی کا لطیف انداز ہے۔ میں اُترن اور بچے کچھے کھانے سے نوازاجلے لگا۔

تایاجی کہتے تھے، ”غریبی سے لڑنے کا غزم ہو تو غریبی نعمت ہے کیوں کہ انسان کی کوشش اس پر زندگی کے اُن نازک پہلوؤں کو آجا کر کرتی ہے جو کسی بھی غور و فکر کی دست رس سے باہر ہیں۔ لیکن جہاں غزم کا فقدان ہو وہاں غریبی فقط لعنت ہے۔“

مجھ میں غریبی سے لڑنے کا غزم تھا لیکن میں اسے لعنت سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ تایاجی زندگی کے جن نازک پہلوؤں کی بات کرتے تھے وہ تخلیقی رویے کی بصیرت ہے نہ کہ بیکاری کی بے عنوانی۔ جیسے شہرِ فطرت میں ہر شہری کی نفسیات الگ ہے وہی حالت ہر بشر کی ہے۔ میں آپنا موازنہ کس سے کروں؟ میں اُس پورے کی طرح تھا جو دھرتی سے دُور دیوار کی دراڑیں اُگتا ہے اور اپنی غذا دھرتی کے برعکس ہوا سے حاصل کرتا ہے، بھٹلے پست قامت رہے، ہر ابھر اہتا ہے میرے سنجھل کی پرواز میری فطری طاقت تھی۔

جو کوئی مجھے کپڑا دیتا، میں اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیتا کہ یہ چھوٹا ہے، یہ بڑا ہے۔ میرے کپڑے جیسے تھے، مجھے اچھے لگتے تھے۔ اس کی وجہ زالی ہے! میں اُس جذبے سے پاک تھا جو غریبی کی بدنامی، کم مائی اور بد اخلاقی ہے۔ اگر کوئی مجھے کھانا دیتا، میں اُس سے کہتا کہ مجھے جھوک نہیں ہے۔ بے انت کور مجھے جس طرح ذلیل کرتی تھی، میرا خیال ہے کہ وہی نفسیات ہر اُس آدمی کی ہے جو کسی کو کچی کھجی چیز دیتا ہے۔ وہ کہتی، ”گیان، تھوڑا کھانا بچ گیا ہے، کھالے اور نہ مجھے کتے کو ڈالنا پڑے گا۔“ سو میٹر سگھ کو گانے اور گنگانے کا شوق تھا۔ اُس کا من پسند گانا تھا۔

راجاجی کی آئے گی برات

رنگیلی ہوگی رات

مگن میں ناچوں گی

اُس کے دڑھیل منہ سے یہ کوئل بول سُن کر میری لطیف حسِ مجروح ہوتی اور میں اُسے رائے دیتا، ”سو مٹر، تم کوئی دوسرا گانا گایا کرو، اگر یہی گانا ہے تو اس کے بول یوں بدل لیا کرو۔“

کاسویا ہوا کلا نوت جاگ پڑتا۔ وہ گانے لگتا۔ گاتے گاتے اُس کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور وہ مجھ سے کہتا یار، کچھ تو بھی سنا! اب تک مجھی سے سنے گا!

اُس کے کہنے کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے گانے پر میں مجبور کرتا تھا اور دم نہ لینے دیتا تھا، لیکن سچائی اس کے اُلٹ ہے۔ میں دل میں کڑھتا تھا کہ وہ مجھے موقع نہیں دے رہا ہے۔ ایک رات، چاند گھٹسوں پر ریٹنگتے ریٹنگتے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اُس کا مدقوق چہرہ ایسے روشن ہو گیا تھا جیسے بیمار مسافر شوقِ سفر سے تازہ رو ہو گیا ہو۔ جنوری کے جاڑے کی بھیننی بھیننی خوشبو فضا میں رچی بسی تھی۔ ہوا کا رخ تک بدلا ہوا تھا جیسے وہ ریگڑھ پورہ کی ساری گندگی کو سمیٹ کر انسانی بُود و باش سے دُور لے جا کر دفن کر رہی ہو۔ اس فیاض ماحول میں میرے دل کی حالت اُس نام لو کی سی تھی جو کسی سخی کے دروازے پر بے نیل و مرام کھڑا ہو۔ میں نے ہیر کی دھن پھیرٹی، جس میں کسک ہی کسک تھی۔

گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا (اوجوگی تیرا پیالہ مجھ سے ٹوٹ گیا ہے اور تقدیر کو یہی منظور تھا  
ساتوں تو لے جا قیمت مٹ دلوے (تو چاہے تو میں تجھے کھڑے کی قیمت دے سکتی ہوں۔  
تقدیر اللہ بن کون روکے (تقدیر کو اللہ کے سوائے اور کون روک سکتا ہے!  
تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی دے (تقدیر پہاڑوں تک کو اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔  
یوسف جھے پنخبران زادیاں نوں (تقدیر اتنی بلوان ہے کہ اس نے یوسف جیسے  
تقدیر کھو ہے وچ سٹ دی دے (پنخبر زادے کو کُنوں میں پھنکوا دیا تھا۔  
سلیمان جھو کے بھٹ ما پھیاں دا (تقدیر ہی نے سلیمان کو تخت پر بٹھایا اور پھر  
تخت چاڑھ تقدیر اُلٹ دی دے (اُس سے تخت چھین لیا۔

داڑھی منڈ تقدیر - - - (داڑھی مونڈ کر تقدیر - - -

”ارے وہ دیکھ، کون کھڑا ہے؟ سو مٹر نے مجھے ٹھوکا دے کہہا۔

اُس کی بے صبری نے اس چھوٹے سے جملے کو اور بھی چھوٹا کر دیا۔ میری لے میرے گلے میں ایسے ڈوب گئی جیسے رگِ آواز ٹوٹ گئی ہو۔ اُس کی بے جا مداخلت مجھے بُری لگی اور میں نے اُدھر دیکھ کر بغیر جھٹاکر کہا، کون ہے! ہو گا کوئی! مجھے کیا لینا ہے اُس سے؟

”پانگل! وہ تیرا ماما سر دن سنگھ ہے!“ اُس نے سانس روک کر جوش سے کہا۔ اُس نے سانس لی تو اُس کی آواز صاف سنائی دی۔

میں نے چونک کر ماما جی کو دیکھا۔ وہ قمیض شلوار پہنے ہوئے وہاں سے کچھ دُوری پر کھڑے تھے۔ اُن کی طرہ دار پگڑی، دراز قاضی کو آدھ دراز کر رہی تھی۔ وہ میرے سگے ماما تھے، میری ماں کے چھ پھیرے بھائی تھے۔ وہ جہاں کھڑے تھے اُس کا پس منظر ویران آدھ انسان تھا۔ انھیں ایکسپلر دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ وہ کسی کارواں سے پھڑپھڑے ہوئے مسافر ہیں۔ قارئین، وہ کارواں ہی کے فرد تھے۔ آج تو اُنٹھی بھرا ٹاگوندھتی ہوئی اگلے دنوں کو یاد کر کے کہتی، ”میں پورے بیس مہینوں کے لئے پرات بھرا ٹاگوندھتی تھی آدھ لوہ پر روٹیاں پکاتی تھی۔ جب سارا پر یوار ایک ساتھ کھانے بیٹھتا تھا، بھاگ بھری لوہ چھوٹی پڑتی تھی۔ آج مواتو اڑا لگتا ہے! میں مرسکوں تو آج مہرجاؤں!“ وہ آہ بھر کر اپنی بات پوری کرتی آدھ کئی بار گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگتی آدھ روتی رہتی، روتی رہتی آدھ کسی کے دلاسا دینے تک روتی رہتی۔ اُس کا پورا پورا کوٹے کے بیچ مئی، ۱۹۳۵ کے بھونچال میں دب کر مر گیا تھا۔ اُس آفتِ آسمانی سے ایک سرون سنگھ بچا تھا۔ دھنا سنگھ بوا کا بڑا لڑکا تھا جو اپنے ڈیل ڈول آدھوصلے کی وجہ سے پر شرام کہلاتا تھا۔ اُسے یہ نام اُس کے یاروں نے اِس لئے دیا تھا کہ وہ کلباڑا بجلانے میں ماہر تھا۔ لکڑی کے جن منگدروں سے وہ ورزیش کرتا تھا انھیں سیمسا پلایا ہوا تھا۔ میں نے وہ منگدر دیکھے تھے۔ جب تک بوا جیتی رہی، اُن منگدروں کو سینے سے لگا لگا کر روتی رہی۔ گھر میں کوئی مہمان آتا، وہ پہلے اُسے، اُن کے پاس کے بے جاتی جیسے وہ تبرکات ہوں اور جائے اظہار عقیدت۔

دھنا سنگھ آدھ میرے بھائی جی ٹھیکیدار مندر داس کے پاس کام کرتے تھے۔ دھنا سنگھ اُسے کے کام میں یکتا تھا آدھ بھائی جی باہر کے کام میں۔ سنٹرنگ کا کام تھا اور اتفاق یوں ہوا کہ وہ دونوں ہم رقبہ مردوں کا کام اُمنے سامنے کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں مقابلے کی بات چل نکلی اور اُن دونوں میں ٹھن گئی۔ اُس سمر کے کئی تفصیل بھائی جی یوں بیان کرتے ہیں۔ میں لچکدار اور پھر تیللا، دھنا سنگھ سخت اور طاقت ور، آغاز ہی میں انجام کی دہائی مچ گئی۔ لکڑی میں آری، مکھن میں چھری کی طرح اُترتی۔ بھوڑی کی پہلی چوٹ میں میخ کھڑی آدھ دوسری میں لکڑی کے آندر، بیٹھے بیٹھے اچک کر ادھر اور ادھر سے لپک کر ادھر، پسینہ پونچھنا منظور نہ تھا۔ اِس قدم پسینہ بہتا اور اُس قدم ٹپکتا۔ آنکھوں میں نمک، منہ میں نمک، ناک میں نمک۔۔۔ بدن لمبیزہ نمکدان کی طرح جھلکتا تھا۔ سنٹرنگ، آری، ہتھوڑے آدھ کیل کا کام ہے۔ ہر کام میں ٹکتہ ہوتا ہے جو مقابلے کے کام میں بہت کام آتا ہے۔ میں ڈبے سے زیادہ کیلیں اٹھاتا اور منہ میں رکھتا اور پھر منہ سے کیل لیتا۔ منہ

اور ہاتھ میں وہ رشتہ ہے جو زبان اور بات میں، دھنا سنگھ کیل کیل پچھڑنے لگا۔ وہ اپنے کام کے وسط میں تھا کہ میں نے اپنا کام ختم کیا، اُس پر آوازہ گسا اور بکرا بلا دیا۔ اُس نے کام وہیں چھوڑا، کُھٹاڑا اٹھایا اور مجھے مارنے کے لئے دوڑا۔ دوسروں نے اُسے روکا لیکن وہ نہ رکا اور مجھے کوئیٹہ چھوڑنا پڑا۔

بھائیاجی کے گاؤں چلے آنے کے کچھ ہی دن بعد بھونچال آیا اور تباہی مچا گیا۔ اُس خوں چکان اور درونک حادثے کو کسی نے نظم کیا ہے جو مجھے کسی حد تک آج بھی یاد ہے۔ اُس طویل نظم کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے،

کوٹہ کل سی شکل گلزار دی

اوسنوں موت سی بھائیاں ماری

(کوئیٹہ کل گلزار کی صورت دکھائی دیتا تھا لیکن موت اُس کی تاک میں کھڑی تھی)

جب وہ زلزلہ آیا تو تایا جی وہاں تھے۔ وہ اُس کی تفصیل جیسے بیان کرتے تھے، وہ اُس کی پیش گوئی ہے۔

رات کا دوسرا پہر تھا اور میں جاگ رہا تھا۔ اچانک کتے رونے لگے اور پرندے انوکھی سی بویاں بولنے لگے میں نے کرتار سنگھ کو جگایا اور اُسے کمرے سے باہر لے آیا کیوں کہ مجھے لگا کہ بھونچال آنے والا ہے۔ ہمارے کھڑے کے احاطے میں آخر وخت کا درخت تھا جس کے پیروں میں کیڑیوں کا بھون تھا۔ دھرتی میں رہنے والے کیڑوں کوڑوں کو بھونچال آنے کی خبر پہلے سے ہو جاتی ہے۔ کیڑیاں بھون سے نکل کر کالی چادر کی طرح پھیل رہی تھیں۔ ہم نے کہیں چلا کر اور کہیں دروازے پیٹ کر لوگوں کو جگایا۔ جو جلدی سے نکل آئے، نکل آئے، باقی سب دب گئے۔ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ ہم کھڑے کھڑے لٹکھڑا گئے۔ صحن میں آخر وخت کا درخت جھک کر سیدھا ہوا اور ایسے کئی جھٹکے لگے۔ سب مکان ڈھے گئے۔ ہمارے گاؤں کے باسٹھ لوگ مرے تھے، جن میں سے آٹھ ہمارے گھر سے تھے۔ گربخش سنگھ، اُس کی بیوی دھنتی، اُس کے چار بیٹے، ماڑا سنگھ اور ملکھی رام کا بڑا بیٹا بہیم سنگھ۔

ماما جی کو میں نے دیکھا نہ تھا لیکن اُن کے بارے میں، میں کیا کیا کچھ جانتا تھا۔ اُن کی بیوی بھاگ دنتی نہایت بدکلام اور منہ زور تھی جس کی تاب نہ لا کر وہ گھر سے بھاگ گئے تھے اور لاپتہ تھے۔ اُن کے اِس سخت فیصلے کی ایک وجہ اور تھی۔ بھاگ دنتی اُن کی ماں کی روٹی نہ پکاتی تھی۔ اُنھوں نے اُس پر ہر سختی برتی تھی لیکن وہ ہٹ کی پوری نکلی تھی۔

انسان کے بیدار نہ رہنے، اندھے عقیدے ہیں اور نوع انسان کی ہر مصیبت کے مؤاخذہ دار۔ ایسے جذبول کو پالنے والے نہ دلیل سے راغب ہوتے ہیں اور نہ سزا سے۔ ان کی انوکھی فطرت! یہ ہر ظلم کو اُسی بے حسی سے برداشت کرتے ہیں جس بیدردی سے کسی بظلم ڈھاتے ہیں۔ ہر فرقت کی تازخ ایسے رزمیوں سے بھری پڑی ہے۔ ایسے لوگوں کے تعصب اور جہالت کی انتہا! یہ اپنے بزرگوں کی حماقتوں کو تہذیب کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور ان پر ناز کرتے ہیں۔ برہمنوں میں کہاوت ہے کہ شودر کا مارنا پورا پن اور برہمن کا مارنا پورا پاپ ہے۔ اقبال اپنے اسلاف کی برہندگی میں بزرگی دیکھتا ہے اور اُس کا قصیدہ پڑھتا ہے۔

تو ہی کہہ دے کہ کھاڑا درخیز کس نے ؟ شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے ؟  
توڑے مخلوق، خداوندوں کے پیچ کس نے ؟ کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے ؟  
کس نے ٹھنڈا کیا آنکھ ابرائیل کو ؟  
کس نے پھر تازہ کیا تذکرہ یزداں کو ؟

ایک دھرم کے ماننے والے دوسرے کو ادھر ہی جانتے ہیں۔ دُنیا میں کتنے مذہب ہیں اور ہر کوئی اپنے مذہب کی یکتائی پر ناز کرتا ہے اور اُسی کی برتری کا دم بھرتا ہے۔ اقبال کی شجی اور تعلی کا مطلب یہ ہے کہ اٹھو اور اپنے عقیدے کو عام کرنے کے لئے دوسروں کو نیست و نابود کر دو۔ ایسے پاگل پن کا رچل اُلٹا بھی ممکن ہے۔ ساجر اپنی نظم پر چھائیاں میں کس پیش میں احساس سے آگاہ کرتا ہے۔

گذشتہ جنگ میں گھری جلے مگر اس بار  
عجب نہیں ہیں کہ تنہائیاں بھی جل جائیں  
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار  
عجب نہیں ہیں کہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

خدا کو خالق کل، ادراک کل، آسرا رکھل کا سرچشمہ کہا جاتا ہے۔ اُس کے بارے میں، میرے دل میں کئی سوال اٹھتے ہیں، تم صرف دو پرکتفا کرتا ہوں۔

دُنیاۓ حیات میں ہر ذی حیات اپنے بچوں کی حفاظت کرتا ہے اور اُنھیں مسلسل دیکھنا چاہتا ہے۔ کیا خدا ہر جانی پہچانی حقیر سے زیادہ حقیر ہے جو یہ اپنی آل اولاد کو پامال کرنا چاہتا ہے ؟ !  
کب تک انسان اپنے عمل کا ذمہ دار، خدا کو ٹھہرائے گا ؟ اپنے نیست و نابود ہونے تک ؟ !  
ایک روز میں اپنی ماں کے ساتھ ہریاں جا رہا تھا۔ اُدھر سے بھاگ وستی آرہی تھی، ہمیں



ڈی۔ اے۔ وی۔ ہائی سکول کے پاس ملی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دور کی باتیں کر کے ماں نے اُڑا رہا ہمدردی پوچھا ”بھائی! بھائی صاحب کی کوئی خبر ملی ہے؟“

”ملی ہے!“  
اُس نے اتنی عجلت سے کہا جیسے وہ خبر دینے کے لئے بے تاب ہو۔  
”کہاں ہے؟“

ماں کے لہجے کی بے قراری اُس شخص کی سی تھی جسے اپنے کھوئے ہوئے عزیز کی تھانگ ملی ہو اور وہ اُس کے بارے میں مزید جاننے کا متمنا ہو۔  
”اپنی ماں کی۔۔۔ میں!“

اس نے یہ پانچ لفظ جتنی تیزی سے کہے اتنی تیزی سے وہ اپنی راہ پر آگے بڑھ گئی۔ میری ماں اپنے پاؤں پر گڑ سی گئی۔ وہ اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی میرے کاندھے پر لٹک گئی اور میرے سہارا دینے کے باوجود زمین پر ڈھے پڑی جیسے ناگہاں بیمار ہو گئی ہو۔ وہ سر کو ہاتھوں میں پکڑے کتنی دیر لی ہی بیٹھی رہی۔

میں نے اُس روز پہلی بار سرون سنگھ کو نالی کے پُل سے پرے کھڑے چاند کی روشنی میں دیکھا تھا لیکن میں انہیں برسوں سے جانتا تھا۔ انسانی رشتوں کا فسوں! میں نے دہڑ کر اُن کے پاؤں چھوئے اور بولا، ”ماما جی، ست سری اکال!“

وہ نیچے جھکے اور مجھے باہوں میں لے کر دُرد بھرے لہجے میں بولے، ”بیٹا! تو کون ہے؟ میں نے پہچانا نہیں۔“

وہ کیسے پہچانتے مجھے؟ میں نے خود انھیں سو تیرے سنگھ کی وساطت سے پہچانا تھا۔ جوں ہی میں نے اپنی پہچان کر دوائی، انھوں نے میری بخلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اُوپر اٹھایا، غور سے دیکھا اور نیچے اُتار کر سینے سے لگایا جیسے میری دید اُن کی دلی تسکین کا باعث نہ ہوئی ہو۔  
”بہن کیسی ہے؟“

انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُن کا ہاتھ اتنا بڑا تھا کہ میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں گم ہو گیا۔ میں اُن کے سامنے کھڑا ہونا لگتا تھا اور گردن اُوپر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھتا تھا۔  
”ابھی ہے!“

”اور جنوائی بھائی؟“

”وہ بھی اچھے ہیں!“

”ہیر کون گارہا تھا؟“

”انھوں نے سوٹر سنگھ کی طرف دیکھا جو ابھی تک وہیں پُل پر بیٹھا ہوا تھا۔

”میں! میں گارہا تھا!“ میں نے خوشی سے لہک کر کہا۔

چل آ، وہیں بیٹھے ہیں اور ہیر سنتے ہیں۔ ”تُو خوب گاتاہے!“ انھوں نے میری پیٹھ تھپک

کر پُل کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں دُور اُس سڑک پر جا رہا تھا،“ انھوں نے اُس سڑک کی طرف

اشارہ کیا جو ریکڑھ پورہ سے آئندہ پربت کو جاتی تھی، ”میں نے ہیر سنی اور ادھر لوٹ آیا۔“

ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سوٹر سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اُسے ماما جی سے

مُتعارف کر دیا۔ ”آدہ پھر تم نینوں اُسی چھوٹے سے پُل پر بیٹھ گئے۔“ ماما جی نے میری پیٹھ پر ہاتھ پیر کر کہا

”باتیں پھر کریں گے، پہلے ہیر سنیں گے!“

میں نے محسوس کیا کہ میں بڑا گویا ہوں اور مجھے اپنے فن کا کمال دکھانا ہے۔ میں اُن کے پہلو

سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور غین گوئے کی طرح کھاس کھسکا کر گانے لگا۔ وہ پُورا بند میں نے دوبارہ سُنا یا اور

اور اُس کے بعد ایک بند اور۔ اُس گھڑی کی سہانی یاد مجھے یہ کہنے پر اُکساتی ہے کہ اگر اُستاد وارث شاہ

زندہ ہوتے اور اُس وقت اپنا کلام میری زبانی سُنتے تو اُس کے سوز و گداز اور گہرائی و گیرائی پر حیران رہ جاتے

کیوں کہ جہاں انھوں نے اپنے نفسِ مضمون کے لئے صحیح الفاظ کا صحیح انتخاب کیا وہاں میں نے انھیں

اپنے حُسنِ بیباں سے کمالِ معنی تک پہنچا دیا۔ وہ اپنے وجود کی حدیں توڑ کر کائناتی وسعت اختیار کر گئے۔

شاعری، سنگیت ہے اور الفاظ، سُر لیکن انھیں یہ مرتبہ دلانے کے لئے سنگیت کار کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ فن اُسی حالت میں تخلیق کیا جاسکتا ہے جب فن کار کو معاشرتی فراغت حاصل

ہو یا اُس کا فن، معاش پیدا کرنے کا ذریعہ ہو۔ اُن دونوں میں سے ہر وسیلہ حُسنِ ایجاد کا فروغ تو نہیں

ہے لیکن تحریک ضرور ہے اور تحریک میں احساس کی ملاوٹ ہو تو کمال تک پہنچنا آسان ہے۔ حساس

فن کار کی نفسیاتی کیفیتِ رحمِ مادر کی کسی ہے، جس کی اپنی تکلیف، تخلیقی وجدان کی طاقت اور بے

قراری ہوتی ہے۔

دوسرے سارے فن، فن کاروں ہی کی ماہیتِ قلب کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور انھیں کے

جذبات کو بے تحیط کرتے ہیں اور انھیں کی مسرت کا باعث بنتے ہیں لیکن نعمتِ درقص کا معاملہ الگ ہے

یہ جتنا فن کاروں کو نمودار کرتے ہیں اتنا ہی تماشاویوں کو کیوں کہ ان کا راستہ رشتہ جذبات سے ہے۔

اِن فنون اور دوسرے فنون میں وہی فرق ہے جو گفۃ اور نوشتہ میں۔ نوشتہ تاریخ سے منسوب ہے اور گفۃ وقت سے۔ تاریخ مُنجد ہے اور وقت مُتحرک اور وہ شے جو حرکت کرتی ہے، دل رُبا اور دل گداز ہوئی ہے۔

ماماجی، میرا نغمہ سنئے سنئے محبوب ہو گئے۔ وہ اپنے دل فریب و جد اور دل نواز کیفیت سے ابھر تو انھوں نے مجھے بے تکلف سراہا اور پیار کیا۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اپنی سرفرازی میں مجھے لگا کہ میرا غم میرا وہم ہے۔ پہلی بار مجھے اپنی ناداری بُری نہ لگی۔ مجھے لگا، آدمی کی معاشی حالت کسی بھی ہو، وہ اپنے فن سے خود پُرور ہے۔ مسموئیت، مجہولیت اور کمالیت، رجولیت ہے۔ اب سے میں نیچے کی طرح نہیں تھا، جس کی قوت ارادی نہیں ہوتی۔ میری آتش شوق تیز تر ہو گئی۔ زندگی رواں دواں اور ہر لمحہ تغیر پذیر ہے اس لئے حال، مستقبل کا پل ہے۔ وہ پل کتنا انوکھا ہے! میں اُس کی تلاش شہر میں کرتا تھا لیکن وہ اُس دیرا میں میری راہ دیکھ رہا تھا۔ ماما جی پٹی بلڈنگ کنٹریکٹر تھے اور پالم کے ہوائی اڈے پر بارکیں بندتے تھے۔ وہ جاتے ہوئے مجھے کام پر بلا گئے اور دس روپے رو نمائی کے طور پر دے گئے۔ میری جذباتی حالت اُس پیاسے کی سی تھی جو سرب کا پیچھا کرتے کرتے جتنے پر پہنچ جائے۔ دوسرے دن میں نے راجگیری کے اوزار خریدے اور ذرا دیر سے کام پر پہنچا۔ ماما جی میری راہ دیکھ رہے تھے اور کچھ پریشان سے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے اور مجھے سرجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اُسے سمجھا دیا کہ اُسے مجھے کام سکھانا ہے۔ یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا۔ ماما جی کو وقت ملتا تو وہ خود مجھے کام کے ٹکے سمجھاتے۔ ایک دن انھوں نے کہا، ”محراب میں فانے کی اہمیت تالے میں چابی کی سی ہے۔ فانہ ٹھیک لگا کہ ہو تو محراب، تالے کی طرح بند رہے گی اور توڑنے ہی سے کھلے گی۔“ ریگڑھ پورہ سے پالم کافی دُور ہے۔ میرا خدوش! مجھے بالکل پاس جان پڑتا۔ میری ذاتی اور جذباتی کیفیت کا چمکار! پہروں لمبا دن، لمحوں اور ہفتہ، پہروں میں سُکڑ گیا اور پندری (دو ہفتے کے بعد اجرت ملنے کی تاریخ) آگئی۔ مجھے پورے کاریگر کی اجرت ملی۔ میری بے قراری اوچھے غریب کی سی تھی جو کسی نہ کسی طریقے سے اپنی غریبی کے دھتے دھونے کی فکر میں رہتا ہے۔ میں نے احاطے میں مٹھائی بانٹی۔ بے انت کور میرے لالباالی پن پر ایسے ہنسی کہ اُس کے دانت سُوٹوں میں سے اُٹھ کر ہونٹوں پر بیٹھ گئے۔

بے انت کور میرے تایا جی کی بڑی بھوتھی اور بڑی چرثر ہار تھی۔ وہ سارا دن چپکے چپکے مہکتی۔ مٹی میں کرتا سنگھ کے گھر لوٹنے کا وقت قریب آتا تو بچھائے ہوئے کولے کی طرح ٹھپ بو جاتی۔ بیٹھے بیٹھے اُس کے دُدا اُٹھ کھڑا ہوتا اور وہ اٹواٹی کھواٹی لے کر لیٹ جاتی۔ اُس کا دُرد

درد نہ تھا، ابنِ سبیل تھا جو آج یہاں اور کل وہاں بسر کرتا ہے۔ اُس دن وہ وقت بھلے چنگے بیت گیا جیسے درد اپنا چلن بھول گیا ہو۔ اُسے خلافِ معمول دیکھ کر کرتار سنگھ نے پوچھا، ”جو گندر کی ماں، اودھم سنگھ گاؤں سے واپس آگیا ہے کیا؟“

اُس نے ٹھیک ہی پوچھا تھا! جس دن بے انت کور کا بھائی اودھم سنگھ ناگپور سے آیا تھا، وہ اُسی طرح مسکرائی تھی جیسے اُس وقت۔ اُس کا چہرہ ایسا بھونڈا تھا کہ مسکراہٹ ہی میں قابلِ برداشت ہوتا تھا۔ نتھنے پھول کر پھیل جاتے اور طوطے جیسی ناک ذرا چھٹی ہو کر خوبصورت لگتی۔ اپنے اُنچے جبڑے کو چھپانے کے لئے وہ موٹے بھدے ہونٹ غیر فطری طور پر آگے بڑھائے رکھتی تھی۔ مسکرانے سے وہ تناؤ جاتا رہتا، جلد کی نرمی دانتوں اور ہونٹوں پر چھا جاتی اور دونوں اپنی اپنی جگہ اچھے لگتے۔ بڑی بڑی آنکھیں نوچنے کے سے انداز میں جھانکتی رہتی تھیں۔ اُس رومیں وہ اپنی بدشعاری بھول جاتی اور نرم جذبات سے رسی بسی لگتیں۔ اُس روادری میں گالوں کی خودکاری دیکھنے کے قابل ہوتی! وہ اپنے پیلے پن میں ہلکا سا سیندر اور ملا لیتے اور گندی نظر آتے۔

جب کبھی ایسا ہوتا ریکر طورہ کی فضا میں تناؤ بڑھ جاتا۔ اُصول سے دیکھا جائے تو تناؤ کم ہونا چاہیئے۔ وہ ذلیل فضا ایسی پیچیدہ تھی جس کا تسلط صرف دو طریقے سے ٹوٹتا تھا۔ ایک جب بے انت کور کراہتی تھی اور دوسرے جب دو بڑوسی آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔

اودھم سنگھ نے وہاں جتنے دن قیام کیا، بے انت کور کا دردِ وحید باز سوار ہا۔ اور وہ بات بے بات مسکراتی رہی۔ باہر سے انگیٹھی اٹھا کر اندر لانا تو بڑی بات ہے، اُس نے کرتار سنگھ کو انگیٹھی بھرنے اور شلگانے تک کا موقع نہ دیا۔ وہ اُن کاموں کو ساہا سال سے دستِ کاری کی سی نفاست سے کرتا آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے بیدار ہوتا، کوئلہ چھوڑتا، کوئلہ رولت، چورا جڈا کرتا اور جھنجھری پر پتھر میں اور بڑا دھڑکھڑکھٹا کر انگیٹھی بھرتا۔ وہ لے اٹھا کر سڑک میں لے جاتا اور اُس کا منہ ادھر رکھتا جہر سے ہوا کا رخ ہوتا۔ وہ انگیٹھی کو آگ دیتا اور کونلوں میں سے پلکتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر خوش ہوتا جیسے وہ اُس کا کوئی دبا ہوا جذبہ ہو۔ اُس کے نہانے اور انگیٹھی سلگنے کا تال میل شاید ہی ٹوٹتا تھا۔ اُسے قائم رکھنے کے لئے وہ جو احتیاط برتتا تھا، وہ یہ تھی کہ وہ ہوا کا دباؤ پرکھ کر چمنی، انگیٹھی پر رکھتا تھا۔ اس چوکسی کے باوجود کبھی انگیٹھی نہ جلتی۔ وہ اُس وقت جو ترکیب کام میں لاتا، اُس کی اہمیت تازہ خیال کی سی ہے۔ وہ کونلوں پر تھوڑا سا نمک چھڑک دیتا۔ کوئلے پٹ پٹ، پیڑ پڑ کرتے ہوئے ہلنے لگتے جیسے خود، شعلوں کو ہوا دینے لگے ہوں۔ ایک ماہ میں ایک بار کرتار سنگھ اپنے معمول کو تبدیل کرتا، جس کا مقصد اپنے معمول کو پابندی سے قائم رکھنا اور

اُس غلاظت کو سمیٹنا ہوتا جو چورے کی شکل میں بڑھتی جاتی تھی۔ اُس دن وہ رات کو تیسرے پہر جاگ جانا گوالے کے گھر سے گوبر لاتا، اُسے کوئلے کے چورے میں گوندھت اور گولے بنا کر چھت پر رکھتا۔ گھر کے سارے چھوٹے بڑے کام اُس کی زندگی کا بے ندامت معمول تھا، جس کے بدل جانے سے وہ ادھورالگتا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر بے انت کور کو دیکھتا جیسے کوئی بیمار حُرس سے صحت مند کو دیکھے۔ اودھم گنگہ کے جاتے ہی اُس کا معمول لوٹ آیا اور وہ اُس میں گھر کر مشکل نظر آنے لگا۔

کرتار سنگھ کے غیر متوقع سوال نے بے انت کور کو الجھا دیا۔ اُس نے اُسے غصے سے دیکھا اور پھر اپنے آپ پر قابو پا کر کہا، ”نان جی! آج گیان کو پندری ملی ہے اور اُس نے مٹھائی بانٹی ہے!“ بے انت کور کے چہرے پر عجیب سی نرمی چھا گئی۔ وہ کیفیت اُس کی تب ہوتی تھی جب وہ شاخیں کھنچو کر آرام سے لیٹ رہی ہوتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اُسے فاسد خون کی شکایت ہے۔ جب وہ گاؤں میں تھی، میں اُس کے لئے جونکیں پکڑ کر لاتا تھا اور انھیں نچوڑ کر اُس کی پنڈلیوں پر لگاتا تھا۔

میرے کپڑے غور طلب تھے لیکن میرا دھیان کہیں اور تھا، اُن ردوپوں پر جو بھائی جی نے مجھے گھر سے نکالتے وقت دیئے تھے۔ قاربین، دیئے کہاں تھے! میرا منہ چڑا کر میرے منہ پر مارے تھے۔ وہ ذلیل روپے مجھ پر جلتا ہوا بوجھ تھے جسے اتار کر پھینکتے وقت میں نفرت و محبت کے جس ہنگامے سے گزرتا تھا، میں ہی جانتا ہوں۔

کئی قراردادیں ناممقول ہو کر معقول اور صحیح ہو کر غلط ہوتی ہیں۔ نازک فرق یہ ہے کہ خاص حالات میں اُن کا تجزیہ کرنا محال ہوتا ہے۔ ام اپنی شیرینی سے بے بہرہ ہے اور تھنڈی اپنی تلخی سے! اسی طرح آدمی کے جذبات کی بھلائی اور بُرائی ہے۔ وہ رشتے ناتے جو زنجیر سے مضبوط ہوتے ہیں، شدت جذبات کے ایک ہی جھٹکے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ محبت و نفرت کی دنیا زالی ہے! میری بات میں کتنی سچائی ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں، میں وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو میرے اس احساس کی تحریک ہے۔

ہم پانچ بھائی ہیں لیکن اکیلا میں ہی ہوں جو ماں باپ کی خدمت لگا تار کرتا آیا ہوں۔ ایک تقریب میں ہم سب اکٹھے تھے۔ بڑے بھائی اجیت سنگھ نے تجویز رکھی کہ ہر کوئی ماں باپ کو پچاس روپے مہینہ بھیجی کرے۔ میں نے کہا کہ اتنے کیوں! ایک سو بھیجو، جتنے میں بھیج ہی رہا ہوں۔ میرے اتنا کہتے ہی بات بگڑ گئی جیسے میں نے انھیں گالی دے دی ہو۔ میرے بھائی جی نے بھی مجھے ہی اتارا، تو اپنے روپے اپنے پاس رکھ! مجھے نہیں چاہیے تیرے روپے! میں بھوکا مر جاؤں گا لیکن تیری دی ہوئی بھیک نہیں کھاؤں گا!“

اُن کے یہ کہتے ہی ہر کوئی مجھ پر برس پڑا لیکن کسی نے اُن سے یہ نہ پوچھا کہ اُن کی کھوکھلی نکتہ چینی کا کیا مطلب ہے؟ میری معاملہ فہمی میری پریشانی بن گئی اور میں اپنے سکون کے لئے ایک گوشے میں سمٹ رہا۔ میں نے اپنے رویے کے بارے میں ہرزوایے سے سوچا اور بھائیوں کی مخالفت کو اُن کے احساس کمتری سے تعبیر کیا لیکن بھائیاجی کا چلن میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ جو اچھے اور بُرے میں امتیاز نہ کر سکے، وہ جیتے یا مرے، میری بلا سے! میں وہیں پڑا رہا اور اپنے بد صورت خیالوں کے گھنائونے چہرے دیکھ دیکھ کر خود سے اُلجھتا رہا۔ مجھے تایا جی کی یاد آئی اور میں نے اُن کے خیالوں میں پناہ لی جی چاہی۔ وہ کہتے تھے، اپنی ضرورت کے لئے انسان نے طرح طرح کے الفاظ ایجاد کئے ہیں اور شکریہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ احسان مند اپنے محسن کا شکریہ ادا کرتا ہے تو یہ اپنے ساتھ اُس کی روح کو بھی فیض پہنچا تلے۔“

انسان کی ہر فرست کی حقیقت اس کے عمل سے ہے، ورنہ یہ بے وجود ہے۔ مرنے والے کو میرے لئے کھانا لائی میں رکھائی سے پیش آیا اور کھانے سے انکار کر دیا۔ اُس نے اصرار کیا تو میں نے تمھالی پرے دھکیل کر نیچے گرا دی۔ وہ بسورنے لگی۔ میری کٹھنوتا! میں نے اُسے بسورنے دیا اور اُس سے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔

خوبصورت سے خوبصورت شے بھی اپنی مسخ شدہ حالت میں گھنائونی ہوتی ہے، وہی صغیرت نازک جذبے کی ہے۔ اسے پچھل دیا جائے تو بے حسی کی شکل میں اُبھرتا ہے جو انسان کا ہندسہ میری ماں کو اطلاع ہوئی، وہ میرے پاس آئی۔ میں نے اُس کی طرف دھیان نہ دیا اور جیسے پڑا تھا، پڑا رہا۔ وہ میری بے ہودگی کو نظر انداز کر کے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میری رنجش دُور نہ ہوئی، وہ میرے آدھ قریب کھسک آئی اور میرے سر کو آغوش میں لے کر میرے کیس سہلانے لگی۔ اُس کے ستھرے آدھ کھرے تنوک سے میرے مَر دہ دل میں جان پڑ گئی۔ اُس کی رغبت میں تو اُسے احساس کی وہ نے تمھیں جس کی لطافت کی بالیدگی، تخلیقی لمحے میں فن کار کا خلوص ہوتا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا، ”میں بیٹ سے بھی بھاری کام کرنے سے مجھے خون پڑنے لگا۔ گاؤں میں دوا دارو کہاں! میں نے دانی کو بلایا۔ اُس نے فرش پر بستر لگا کر پاتنی کو اوپر اٹھایا اور مجھے اُس پر لٹا دیا۔ مجھے فراش دیکھ کر تیرے بھائی کا پاہ چڑھ گیا۔ تو جانتا ہے! وہ دوسے ہی کتے، بلیے کے نام سے دھتکارے رہتے ہیں، اُن حالات میں میری کیا ڈرگت بنی ہوگی؟ میں کام کرنے کے لئے اٹھتی تو سنسی (میری دانی) اگر بھاپت کا ڈریتی۔ بھائیاجی (میری ماں) میرے تایا جی کو بھائیاجی کہتی تھی، نے اشوک چھال کا سفوف دودھ کے ساتھ تجویز کیا لیکن بیماری آتی ہے

تو جاتے جاتے جاتی ہے۔ میں نے بتا رام کو تیرے ننھیال دوڑایا، وہ اُسی دن تیری نانی کو لے آیا جب تک تیری نانی ماں نے کام چلایا۔ وہ دکھ میں نے کئی مہینے بھوگا اور گرو کرپا سے پیٹ گرتے گرتے بچا! اُس کی باتوں میں تسکین قلب کی خوشبو مُضر تھی جو صرف اُسی گھڑی ظاہر ہوئی ہے جب ناممکن کام ممکن ہو جاتا ہے۔

”تو جانتا ہے پھر کیا ہوا؟“

اُس نے میری آنکھوں سے میرے دل میں بھانکا۔

میں جانتا تھا کہ پھر کیا ہوا! لیکن میں اُسے بتا نہ سکا۔ میری عاجزی نے میرا سارا احوال چھین لیا اور مجھے بے کس بنادیا۔

تیرا ختم ہوا تھا! اُس نے اضطراب آمیز سکون سے کہا جیسے درِ وزہ کے آخری مراحل سے گزر رہی ہو۔

اُس کی کمزور آواز جذبہِ فحش سے معمور تھی۔ میں نے اُسے اجرِ غیرِ ممنون سے دیکھا اور اُس نے مجھے سہری سے جیسے اپنی رفعت میں دوپاک رُوحوں کے ایک دوسرے میں ملنے سے پہلے ہوتا ہے۔ ایسے ماحول کی خوبصورتی دُنیوی سے الگ رُوحانی ہوتی ہے۔ اُس نے میرا مُنہ چُما اور مجھے اپنے پیٹ میں بچھ لیا جیسے وہ اُس سے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے جوڑنے کی خواہش مند ہو۔

”تو پیداؤش کے وقت رُونی کے گالے کی طرح نرم اور سپید تھا۔ چھوٹا سا شیر، چھوٹے چھوٹے زین نقش، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، مونگ کی پھلیوں سی آنکھیاں، سانس لیتا ہوا ہلتا نہ تھا۔ تجھے چھوکر معلوم ہوتا تھا کہ تو زندہ ہے۔ چھ ماہ تک تو نے پاس نہ مارا۔ تجھے میں جیسے لٹاتی تو دیسے ہی بیٹا رہتا۔ تیرا پوتڑا بدلنے کے لئے میں تجھے اٹھا کر دوسری جگہ رکھتی پھر پوتڑا بدلتی۔ تو سال بھر کا ہوگا جب تو نے نمٹھیاں کھولیں۔ تجھے میں کسی کو اٹھانے نہ دیتی، کوئی زبردستی کرتا تو مجھے اچھا نہ لگتا۔ میں ڈرتی، تجھے سر سے پاؤں تک کپڑے میں گول پیٹے رکھتی تھی۔ اُس کی رُندھی رُندھی آواز آہوں میں بدل گئی۔ اُس کی ڈھارس بندھتا بندھتا میں خود رونے لگا۔ ہم دونوں فلاکت زدہ بچوں کی طرح تھے جو ایک دوسرے کے آنسوؤں کی ہمت ہوں۔ جب ہم ایک دوسرے کے سرخوے، ہم اُس گرمی اور خوشبو سے بھر گئے جو ماں کو صرف بچے اور بچے کو صرف ماں کے تن سے ملتی ہے۔ اُس نے اپنی بات یوں مکمل کی۔ ”یہ سب کچھ میں نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ تجھے تیری کمائی کھانی تھی! اس لئے کہ تو میری کوکھ کا ٹکڑا تھا اور تیرا پالن پوسن میری محبت تھی جنت اور ذلت داری میں فرق ہے! وہ دل کا قرار ہے اور یہ دل کا بار، اس لئے آدمی اسے باٹن چاہتا ہے۔“

ہاں قاریں! ماں اور بچے میں جو میل جول ہے اُس میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ اپنی ساجھ داری جس دیانت داری سے نباتے ہیں وہ اپنی عمدگی کی مثال ہے۔ یہ رشتہ اول سے آخر تک مکمل مثبت قدروں پر بنپتا ہے اور جسمانی، اخلاقی، ذہنی، تخلیقی۔۔۔ قوتوں کی فضیلت بنتا ہے۔ وقت کے لحاظ سے ہر رشتے میں زوال آیا ہے لیکن اس کا کمال وہی ہے جو عین آغاز حیات میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس رشتے کا کسی اور رشتے سے مقابلہ کروں لیکن میں نے ارادہ ترک کر دیا ہے۔ کامل کا مقابل نہیں ہوتا ہے۔

اتنے میں بھائیاجی ادھر سے گزرے، مجھے ماں کے زانو پر سر رکھے دیکھ کر کڑکے، تو ابھی تک اس گتے کے پاس بیٹھی ہے! مجھے اور کام نہیں ہے کیا؟“ بد خوئی نفسیات زالی ہوتی ہے! وہ کسی کے نازک جذبے کو زیر کرنے کے لئے ہی رد کرتا ہے کیوں کہ وہ اس کے جذبے کی آفرائش میں اپنے اسی جذبے کی نفی دیکھتا ہے۔ کاش وہ جانتا کہسی پاکیزہ جذبے کو سراہتا، اپنے میں مساوی جذبہ پیدا کرنا ہے۔

انہیں وہیں اڑے کھڑے دیکھ کر میری ماں جلدی سے اٹھی اور چلی گئی۔ اُس کے یوں چلے جانے سے مجھے لگا کہ میں خلا میں اڑ رہا ہوں، بے حقیقت، بے سلسلہ، بے سمت۔۔۔۔ اور بے ٹھکانا۔

یادوں کی روادوسی میں ایک یاد آ رہی ہے اور اس احساس کو بڑھا دیتی ہے کہ ماں، دنیا کی سب سے بڑی فن کار ہے اور فطرت کی لاجواب کیمیا گر۔ اس کے سامنے اعلیٰ سے اعلیٰ عمل، بیچ ہے کیوں کہ ماں تخلیق حیات کی عظمت ہے۔

میرے چھوٹے بھائی جو گندرسنگھ کی پیدائش کے وقت میری ماں کا پیٹ بہت بڑا تھا۔ والی نے آواز پھیلادی کہ جڑواں ہوں گے۔ وہ ماں کے پیٹ سے کان لگا کر کچھ سنتی اور اپنی پیش گوئی دہراتی۔ تائی بیرو نے حیران ہو کر ماں سے پوچھا، ”میلو! یہ ڈھول سا پیٹ مجھے بھاری نہیں لگتا؟“ ”بھابی! درخت پر پھل بھاری ہوتا ہے کیا؟ تانت سی بیل کو کتنے بڑے کدو لگتے ہیں! اسی طرح ماں ہے!“ اُس نے مسکرا کر لطیف جذبات سے رس لے کر کہا۔

میری ماں کے اوصاف کیسے اوصاف ہیں! وہ دکھ اور سکھ کے بھید بھاؤ بیان کرتی تو اپنی اپنی جگہ دونوں درست لگتے۔ وہ انسان اور فطرت کی حقیقت کا موازنہ اس طرح کرتی ہے

ماں پیو جہا نہ میوہ ڈٹھا

چٹاں پٹکا ادناں کھٹا



(ماں باپ نہ لایا میوہ ہے! جتنا پکت ہے اتنا ہی کھٹا ہوتا جاتا ہے)

بچے جہاں میوہ ڈٹھا

جتاں کچا اوناں مٹھا

(بچہ نہ لایا میوہ ہے! جتنا کچا ہوا اتنا ہی مٹھا ہوتا ہے۔)

میرے قارئین، معاف کریں! باتوں باتوں میں بات طویل ہو گئی ہے اور وہ بات ادھوری

کی ادھوری ہے جس کی اونچ نیچ سے یہ بات شروع ہوئی تھی۔

روپوں کی رسید کے ساتھ بھائیاجی کا خط بھی ملا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔ سنا کرتا

تھا کہ تقدیر اچھی ہو تو نکھٹو بیٹا اور کھوٹا پسا بھی کام آجاتا ہے! میں یقین نہیں کرتا تھا، آزما کر

دیکھ لیا۔

میں نے تایا جی کو بھی منی آرڈر بھیجا تھا۔ اُن کی خیر خبر کے ساتھ یہ پیام آیا، تیرے روپے گئے

تھے، میں نے واپس کر دیئے۔ جاننا چاہو گے کیوں؟ تیرے روپے مجھے اُسی وقت مل گئے تھے جب اُن نے

روپے بھجئے کا خیال کیا تھا۔ اپنی رفعت میں جذبے اور عمل کی کارگزاری ایک ہوتی ہے۔ تو پر درس ہے،

تجھے اُن کی زیادہ ضرورت ہے۔

بے انت کور کو تایا جی کی فیاضی کی خبر ملی، وہ بولی، یہ روایت ہمارے گھرانے کا ورثہ ہے۔

تھدا جانے اس میں رتن سنگھ کہاں سے آگیا؟

میری خوشی وجدانی تھی۔ میں بھائیاجی کے بدخو تبصرے سے دل برداشتہ ہوا اور نہ ہی بے

انت کور کی غیر ضروری بک بھک سے۔ میں تایا جی کے ردِ عمل پر کسی قدر ناخوش تھا لیکن میری مجموعی خوشی کا

سیلاب اتنا تند تھا کہ وہ چھوٹی سی ناخوشی اُس کی روانی میں بہہ گئی۔

# تیسری کتاب

صفحہ نمبر

باب نمبر

۴۹۵

۵۸

ہوا کوئی نہ ثانی آج تک مہر درخشاں کا  
سجانے کو سجایا ہے بہت شب نے ستاروں کو

۵۵۰

۵۹

وہ شخص ہے جہاں کا تنک ظرف، تنگ حال  
جس نے متاعِ دردِ محبت کو کھو دیا

۵۵۲

۶۰

خویاں لاکھ اپنی ذات میں ہوں  
غیب لازم ہے ہو بھلے کم کم

۵۵۶

۶۱

کتنی بے لطف! کتنی بے معنی!  
زندگی میں نہ کوئی تیرچ نہ خم

## باب ۵۸

مہو کوئی نہ ثانی آج تک مہر درخشاں کا  
سجائے کو سجایا ہے بہت شب نے ستاروں کو (شاطر)

میری جیب کیا بحال تھوئی، میری حالت ہی بدل گئی۔ میں پھول کی طرح تھا جو کانٹوں میں رہ کر بھی خوش رہتا ہے۔ میں خوش تھا اور بس خوش تھا۔ جہاں تھا، جیسا تھا، خوش تھا! اٹھتا ہوا، بیٹھتا ہوا، سوتا ہوا، جاگتا ہوا، کام پر جاتا ہوا، کام سے آتا ہوا، خوش تھا۔ میں نے اپنے دل کو کھوکریا پایا جو مجھے، خوشیوں کے جھونکے کی طرح اڑائے پھرتا۔ میرے اعضاء ہرے بھرے ہو گئے اور خیال مسرور و محرور۔ لا جوتی اور بلوندر کے جسموں کی قربت میں سینکڑوں میل کی دوری پر محسوس کرنے لگا۔ میری خوشی کا پیالہ زرا لا ہے! جتنی جلدی خالی ہوتا ہے اتنی جلدی بھر بھی جاتا ہے۔

لیکن جیسے دھوئیں کی زندگی آگ سے ہے، میرا رشتہ محرومی سے رہا ہے۔ میں اپنی اثر انگیز داستان میں کہیں دل جمعی کا پہلو تلاش کرتا ہوں لیکن میرا بچوگ! میری زندگی کا ہر واقعہ پہلے سے زیادہ دکھ بھر ہے۔ میری خوشی کی دنیا ایک بار پھر پستے ہی اُجڑ گئی۔ دراصل اُجالوں نے مجھے وہی بنا رکھا تھا اور میں خوشی کو غم کا پیش خیمہ سمجھتا تھا۔ میرا دم، یقین میں بدل گیا اور مجھ پر ہزاروں غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں نے تایا جی کی بیماری کی خبر اڑتی اڑتی سنی۔ اُن کی قوت برداشت، اُن کی عالی حوصلگی بھی وہ اپنا دکھڑا نہ روتے تھے اور نہ کسی سے کہتے تھے، کسی کو اطلاع کیوں کر دیتے؟ اُن کا ضبطِ غم آبِ رواں پر بند کی طرح تھا لیکن اُس کی نفسیات بند سے آگ تھی۔ وہ چھلکتا تھا تو اُن کے تخلیقی رُحان کو سیراب کرتا تھا اور اُسے تروتازہ بناتا تھا۔ دُکھتے تھے، انسان کے لئے دُکھ، دارو ہے، سُکھ، روگ ہے اور کام باعثِ ارتقاءِ حیات۔ جہاں احساس ہو وہاں تخریبی رُحان، تعمیری سمت اختیار کرتا ہے۔

مندرجہ ذیل دوہا اُن کے کردار کی مکمل عکاسی کرتا ہے،  
جِٹھے کُرتِ گرمِ داراج (جہاں کام اور عمل کا راج ہے،

اوتھے سٹوٹے سنگلا کاج (وہاں زندگی پوری طرح سنوڑتی ہے۔

کریں کلا، کلا آکار (ہاتھوں میں ہنر مضمر ہے اور ہنر ہی سے ہر چیز کا روپ مزوہ  
سامنے آتا ہے۔

مانس! کرنی، سوچ وچار (انسان، عمل اور سوچ وچار کا نام ہے۔

اُن کے پیٹ میں رسولی تھی جس کا دزدان کا پیرا ناٹمن تھا۔ ایک بار اُنھوں نے رسولی پر گلاس  
لگایا۔ اُس سے رسولی کٹ گئی۔ وہ کچھ قے سے خارج ہوئی اور کچھ پانخانے سے۔ اُنھوں نے پیٹ کے دزدے  
آرام پایا لیکن اس طریق علاج میں خون نہ بہ گیا جس کا اثر اُن کی صحت پر ہوا۔ اُنھوں نے اپنی حمت  
آزمائی، پردھان جکیم کی دوا کھائی لیکن کھوئی ہوئی طاقت واپس نہ آئی۔

گھر کی کھیتی ایسا کام ہے جس میں جتنے ہاتھ ہوں، کم ہیں۔ میں جب گاؤں میں تھا اُن کی ہر ممکن  
مدد کرتا تھا۔ میں جس سال دینی آیا اُس سے ایک رت پہلے وہ گھر جوت تیاگ چکے تھے اور خود کو مصروف رکھنے  
کے لئے بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ اُن کے لڑکے کرتار سنگھ، امر سنگھ اور پیار سنگھ گھر کے حالات واضح طور پر  
جاننے تھے۔ وہی جائیں! اُنھیں بتایا جی کی بیماری پر شک کیوں ہوا؟ وہ گاؤں کو خط لکھ کر خبر کی تصدیق کرنے  
لگے۔ میں نے جس دن سنا اُس کے دوسرے دن گاؤں روانہ ہوا۔ میں جسمانی طور پر ٹرین میں تھا لیکن روحانی طور  
پر بتایا جی کے پاس۔ میں سوچ رہا تھا، کاش، میرے پر پرواز ہوں اور میں اُڑ کر اُن کے پاس پہنچ جاؤں۔  
مجھے جتنی غلج تھی، ٹرین اتنی ہی سست رفتار۔ آندھیرے میں بھانک بھانک کر میرے دیدے دکھنے  
لگے۔ میں کہیں سوتا تو بس جاگنے کے لئے۔ وہ رات لمبی نہ تھی، شب غم کی طرح رُکی رُکی سی تھی۔ لگتا تھا کہ  
اُس رات کی سحر نہیں ہے۔ اُڑمڑ ٹانڈہ کے قریب اُجالے کی جھلک دیکھتے ہی میں بے اختیار چلایا۔ دن چڑھ  
آیا، دن چڑھ آیا۔ میرے والہانہ انداز سے گھبرا کر میرے پڑوسی مسافر جاگ پڑے اور مجھے حیرت سے دیکھنے  
لگے۔ ہریانہ سے گاؤں پہنچنے کے لئے میں سواری کا ضرورت مند نہ تھا۔ میرا کل سامان مختصر سا جھولا تھا۔  
میں کہیں بھاگتا اور کہیں تیز چلتا ہوا گاؤں کی آب جو میں پہنچا۔ وہاں سے ایک پگڈنڈی چھوٹی تھی جو شمشان  
گھاٹ کے پاس سے گزر کر سیدھی گاؤں پہنچتی تھی۔ ایک تازہ جلی بجھی چتا دیکھ کر میری دھڑکنوں کی شدت، تشدد  
کی حد تک پہنچ گئی۔ میں نے گھر میں قدم رکھا تو میں تقریباً ناپ رہا تھا۔ وہاں کا سکون ہر سانچے کی تردید  
کرتا تھا۔

میری بہنیں شیلندر کور اور ترسیم کور سنگھ صاف کر رہی تھیں۔ سال بھر میں دونوں الگ الگ  
طریقے سے جوان ہوئی تھیں، پہلی ہاتھوں پیروں سے اور دوسری سینے سے، جسے وہ اوڑھنی سے ڈھانپنے ہوئے

تھی۔ اُس میں ایک آدمِ تبدیلی واضح دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے چوٹی کے ساتھ مینڈیاں گوندھنی چھوڑ دیں تھیں اور زلفیں چھوڑی ہوئی تھیں۔ یس اُس عمر میں تھا کسی کو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے عناصر میں ردِ تبدیل ہوا ہے۔ اُس کے اور میرے عناصر کی نفسیات بھی الگ ثابت ہوئی تھی۔ وہ میرے برعکس لاجوتی سی ہو گئی تھی اور گلے ملتی ہوئی ہچکچاتی تھی۔ ماں حویلی میں تایا جی کے پاس تھی۔ میں نے جھولا اندر کھونٹ سے لٹکایا اور حویلی کا راستہ لیا۔ یکا یک مجھے چٹنا کُھیا لایا اور میں نے رُک کر ترسیم سے پوچھا۔ اُس نے جُبات بتائی وہ قابلِ ہمدردی تھی اور حیران کُن بھی۔ چند دن پہلے گوندھام کی بیوی گردنی مگر کی۔ گوندھام اُس کی استیاں چُسنے گیا اور مَسان پر مٹنے کے بل گر پڑا۔ اُس کے پوتے موہن سنگ نے اُسے اٹھایا اور مرا ہوا پایا۔

میں حویلی میں پہنچا۔ تائی اور میری ماں تایا جی کو سہارا دے کر بستر پر سے اٹھا رہی تھیں۔ مجھے دُور سے آتے دیکھ کر ماں نے تایا جی کو میرے آنے کی خبر دی۔ وہ دُوسری طرف دیکھ رہے تھے، میری طرف پلٹے جیسے وقت سحر سورج مٹھی، سورج کی طرف کھوم جاتی ہے۔ میں بھاگ کر اُن کے پاس پہنچا۔ اُنھوں نے بچے کی طرح ہنک کر باہیں پھیلائیں اور میں باہیں تھا مگر اُن سے گلے ملا۔ اُنھوں نے میرا چہرہ، ہاتھوں میں لے کر دیر تک میری آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کے ہاتھوں میں موت کی سردی تھی اور آنکھوں میں نا اُمیدی کی تیرگی۔ جب تک اُنھوں نے میرا منہ چُوما، ہونٹوں میں ٹھنڈی سی گرمی اُگئی اور آنکھوں میں اندھیری سی روشنی۔ اُنھوں نے اعتماد سے کہا، ”ہیرو، اِن بیساکھیوں کو اٹھا دو! اب اِن کی ضرورت نہیں ہے۔“

تایا جی شہتوت کے سارے میں مونج کی چارپائی پر لیٹے تھے، جس پر پُرانا بستر بکھایا ہوا تھا۔ اُن کی ذاتی حوائج کے لئے پاس ہی پردہ کیا ہوا تھا، جہاں سے بدبو آرہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اُس پر دے کو اٹھا ڈالا، اُسے حویلی کے باہر کے کونے میں لگایا، گندگی کو صاف کیا اور وہاں جُونا چھڑکایا۔ میں نے اندر سے فوٹری پلنگ نکالا اور اُس کے لئے تائی سے نیلا پتھونا مانگا۔ اُس نے جیسے انکار کیا، وہ انس کی زندگی کا ذیل ترین چلن تھا۔ پلنگ وہیں رکھ دو جہاں سے لائے ہو اور اس کے لئے زمین پر بستر بچھاؤ۔ اس کے مرنے کے دن میں نہ کہ پلنگ پر سونے کے!

اُس کے درِ بچن سُن کر میرے خون کھول گیا۔ میں کچھ بکنے ہی دالا تھا کہ ماں نے میرے کاغذ پر ہاتھ رکھ کر کہا، ”بھابی! اُسٹھ کیوں پلہتی ہو؟ بستر نہیں دینا ہے، نہ دے، میں اپنے گھر سے دیئے دیتی ہوں۔“

ماں کی بات سُن کر میرا اُبال ٹھنڈا پڑ گیا لیکن میں اُسے معاذانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں

گھرے نیا بستر لیا ، پلنگ پر بچھایا ، گرم پانی سے تایا جی کو کھسیا کیا اور دھلا ہوا لباس پہنایا ۔ میں انھیں لٹا کر سر کے نیچے سرانہ ٹھیک کر رہا تھا کہ وہ فطرط جذبات سے رو پڑے ۔ اُن کے سارے اعضاء بوڑھے ہو کر ٹھنڈے ہو گئے تھے لیکن دل اسی گرمی محبت سے تھرکتا تھا جیسے وہ تھرکتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی میرے احسان مند نہ ہوئے تھے ۔ اُن کی عادت کی طرح داری جوں کی توں تھی قندہ میری چھوٹی سی خدمت کا صلہ اسی وقت کیسے چکاتے ! اُن کے نزدیک لینے کی خوٹا نا ، دریا نا تھا ۔ اُن کی رفاقت اُن کی سخاوت تھی ۔ اُن کا دامن سرچشمے کی طرح تھا جس کا بھرا ہونا روایت ہے ۔ اُن کا قول تھا کہ لینے والے سے دینے والا بڑا ہوتا ہے ۔ لینا خالی ہونے کی علامت ہے اور دینا بھرے ہوئے کی ۔ کوئی اُن کی تھوڑی سی بھی مدد کرتا تو وہ اس کا بھر پور اور بے تکلف شکریہ ادا کرتے ۔ ایسا محو ہونا کہ انھوں نے ذرا سالے کر ڈھیر سا لوٹایا ہے ۔ وہ کہتے تھے کہ کسی کی مدد یعنی ضروری ہے تو اس کا اعتراف کرنا اس سے زیادہ ضروری ۔ چوں کہ وہ حساس تھے اس لئے زیادہ دکھ اٹھاتے تھے اور تلخی کو کام کی چاشنی سے مٹاتے تھے ۔

دلہن کا سنورا ، پرندے کا پرتونا ، پھول کا کھلنا ، خوشبو کا اڑنا ، پودے کا کھڑا ہونا ۔۔۔ آدمی کا کام کرنا ، اس کے حسن میں اضافہ کرتا ہے ۔ تایا جی کام کرتے ہوئے واقعی بہت خوب صورت لگتے ۔ اُن کی سانسوں کی تیزی ، گالوں کی گرمی ، آنکھوں کی چوکسی ، ہونٹوں کی طرف داری ، پیروں کی پھرتی ، ہاتھوں کی متاشقی ، آواز کی خوش حرکتی ۔۔۔ اُن سب آوازوں کو کام سے وہ ہم آہنگی اور نسبت تام تھی جو جزو کو کل سے ہے ۔

میں جتنا خوش تھا اتنا ہی غم زدہ ۔ میں خوش تھا کہ شہر کے اندھیرے سے گاؤں کے اُجالے میں لوٹ آیا تھا غم زدہ تھا کہ تایا جی کی صحت گرچکی تھی اور اُن کے بچنے کی امید نہ تھی ۔ دوسروں کو زندگی دینے والا ، زندگی ہار رہا تھا ۔

میرے قارئین ! میں اپنی مصیبت و مرّت ، نفرت و محبت ، نشیب و فراز ۔۔۔ کی کہانی کہیں بھول گیا ہوں تو اس کا امکان ہے ! لیکن جہاں تک تایا جی کی رفاقت کا تعلق ہے ، مجھے اُس ہر سانس اور لمحے کا زندہ احساس ہے جو میں نے اُن کے ساتھ گزارا ہے ۔ میں اُن کی آواز سناتا ہوں اور اُن کے اسلوبِ بیاں سے محفوظ ہوتا ہوں ۔ وہ میری روح کی آسودگی ہیں اور میرے خون کی روانی ، مناج ، مطمئن ، خالص پُر سکون لیکن سرگرم ۔۔۔ میں جس وقت اُن کا خیال کرتا ہوں ، انھیں اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہوں ۔ میں اُن کے پاؤں دبار ہا تھا کہ انھوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا ۔ میں نے ہاتھ تھام کر پوچھا ،

کچھ چاہیے؟

وہ ہلکا سا مسکراے اور میرا ہاتھ ٹٹولنے لگے۔ میں اُن کی بات سمجھ گیا اور فخر سے ہاتھ کھول دیا۔ وہ میرے ہاتھ کے گٹے رٹکاتے رہے اور پھر اپنی مخصوص گھلاوٹ کے ساتھ بولے، ”ہاتھوں میں ہنر ایسے مضمّن ہے جیسے کتابوں میں علم! لیکن ہنر کی حقیقتِ زعم سے الگ ہے۔ ہنر، عمل سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ عمل کا عملی پھیلاؤ ماورائے سخن ہوتا ہے اس لئے الفاظ کتنے ہی مفصل ہوں! نامکمل ہوتے ہیں ہاتھ عملاً کتابوں سے مقدّم ہیں، ہنر، علم سے اور عمل، سخن سے۔“

وہ ہاتھوں کو طرح طرح سے سراہتے تھے۔ اُن کے ہاتھ غیر معمولی جسامت کے تھے، یہی وجہ ہوگی کہ وہ ہر کام میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ کوئی انھیں پہلی بار دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا اور حیرت کا اظہار کرتے بغیر نہ رہتا۔ کوئی پوچھتا تو وہ فخر سے کہتے، ”میرے ہاتھ اس لئے اتنے بڑے ہیں کہ یہ کئی ہنردوں کے دینے ہیں۔“

وہ کسی مدرّسے میں نہیں پڑھے تھے اور زندگی ہی کو مدرّسہ مانتے تھے۔ ”مدرّسے سے بڑھ کر بھی مدرّسہ ہے اور وہ ہے زندگی۔ یہاں الفاظ بولتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، معنی بدلتے ہیں، پھیلتے ہیں اور عینِ ادراک بن کر اپنی ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہیں۔“

ہنر سیکھنے کے لئے اُن کی صلاحیت کی سرشتِ دھرتی جیسی تھی جس پر قطرہ گرتے ہی جذب ہو جاتا ہے۔ وہ کام کرتے ہوتے تو کام ایجاد کرتے لگتے۔ کام کے بارے میں اُن کا رویہ راہبرانہ تھا، وہی خوش قیمت ہے، جس کے ہاتھ میں کام ہے۔ نہ اُسے کسی کی حمایت کی ضرورت ہے اور نہ رحمت کی کیوں کہ نہ کوئی انسان کام کا نعم البدل ہے اور نہ کوئی بھگوان!

لکڑی کے کام میں توڑ ممکن ہے اور جوڑ ناممکن لیکن وہ لکڑی جوڑنے میں اختراعی لیاقت رکھتے تھے۔ انھوں نے حویلی کے دروازوں کے لئے گھر کی شیشم کے بڑانے گولے پیرے۔ بالے اور تختے جوڑائی اور موٹائی میں ٹھیک تھے لیکن لمبائی میں کم۔ انھوں نے بامیوں (دروازے کے لیے تیر) کو دو چول لگائی اور تختوں کو لیپ جوڑ، جن کی مضبوطی کے لئے اُن میں سرسّرے (دو مونہے چکور کیل جنھیں گول چھید میں لگاتے ہیں) بٹھائے۔ جوڑ، پستی بانوں سے ڈھک دیئے، پستی بانوں اور بینی پر منبت کاری کر دی۔ اس کام کے لئے اُن کے پاس اتنی قسم کی رکھانیاں تھیں کہ میں چاہتے ہوئے اُن کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ کوئی کام اُن کی سمجھ میں نہ آتا، وہ جسمانی ضرورتوں سے بے خبر اپنے خیالات میں ڈولے رہتے جیسے اُن کا مقصد نظامِ نفسی کا محور ہو۔ کوئی انھیں کھانا کھانے کے لئے بلانا، وہ اڈے سے ایسے اٹھتے جیسے

کام کو اُدھورا چھوڑنا، اُن کی تکلیف کا سبب ہو۔ چوں کہ وہ کام مست تھے، کام اُن کا روحانی فیضان تھا اور جسمانی وجدان۔ وہ کبھی بیکار نہ بیٹھتے، کبھی بیٹھے ہوتے تو مشاہدہ نفس میں غولگتے۔ انھیں کام پر اس قدر عبور تھا کہ جو شے اُن کے متصرف میں ہوتی، لگتا کہ وہ اپنی اندرونی شکتی سے قلبِ مہبت میں متصرف رہے اور تایا جی، اُس کے معرضِ تعمیر میں اُس کی صرف مدد کر رہے ہیں۔

”کام کی نفسیات پچھے کی طرح ہے جسے دیکھ کر اُس کی ضرورت کو سمجھنا پڑتا ہے۔ اسے جتنا سمجھو، یہ اتنا ہی کھلتا اور اپنے بارے میں حیرت ناک انکشافات کرتا ہے۔ ایک بار انھوں نے کام کی فطرت بیان کرتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وہاں جگہ کیسی ہونی چاہیے؟“

ہم طویلے میں کھڑے تھے، انھوں نے مویشیوں کی ناند کی طرف اشارہ کیا۔

”صاف ستھری! میں نے اُدھر دیکھ کر کچھ سوچ کر کہا۔

”مویشی گوبر روند رہے ہوں تو تمہیں کیسا لگے گا؟“

اُن کا سوال صاف تھا۔

”گوبر صاف کرنا چاہیے! میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ گوبر کو دیکھ کر تم نے سمجھا ہے کہ اسے صاف کرنا چاہیے۔ یہ سمجھ کی ابتدا

ہے، جس کی انتہا تمہاری کاریگری پر موقوف ہے۔“

اُن کے پاس کام کے معنی، ارتقاءِ شوق اور افزونیِ حیات کی تاویل تھی۔

”ہر کام کا اپنا طریق کار ہے۔ کاہندہ بقدر صلاحیت کام کی دشواریاں سمجھتا ہے اور انھیں

سلجھانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے ہر کسی کے کام کا کمال الگ ہے۔ کام، انسان ایجاد ہے، اسی بنا پر

دونوں ایک دوسرے کی طاقت اور نفاست ہیں۔ اسی تنوع سے وحدتِ ذہنی متصور ہوئی اور معیارِ حسن

کی طرح نکلی۔ چوں کہ ہر چیز انفرادی شعور سے ظہور میں آئی ہے، دنیائے حیات، انفرادی شعور کی مجموعی

حقیقت ہے۔ اور شعور ارتقاء پذیر ہے۔ جہاں میرا کمال ختم ہوتا ہے، دوسرے کا شروع اور اس طرح

یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔“

وہ میری ماں کے کام کی تعریف یوں کرتے، ”بیٹا! تو جو کام کرتی ہے، اُس میں روح نظر آتی ہے“

”بھائی! جی! روح کیا چیز ہے؟“ ایک بار میری ماں نے روح کی وضاحت چاہی۔



”روح کو بیان کرنا مشکل کام ہے۔ کام کی روح، نفاست ہے، آواز کی روح، دھار ہے اور انسان کی روح، ذکاوت ہے۔ انسان کی روح، اخلاق بھی ہو سکتی ہے لیکن روح دُہی ہے، جس کا تعلق خوبی حیات سے ہے۔“

کچھ لوگوں نے امرت پھک رکھے تھے اور وہ سنساری لوگوں کے ہاتھ سے پیدا تھلے کر نہ کھاتے تھے۔ تایاجی اُن کے رویے پر گربانی میں سے طنز کرتے،

سوچے ایہ نہ آکھیے، بہن جو پنڈا دھوئے

سوچے سر ہی نانکا، جین من دسیا سوئے

(انسان نہانے اور دھلے کپڑے پہنے سے پاک نہیں ہوتا)

(وہ انسان پاک ہوتا ہے، جو اپنے عمل سے خدا کا ہم سر ہوتا ہے۔ تایاجی، خدا کے

آرٹھ مکمل انسان کے لیتے تھے)

گرچن سنگھ گرنٹھی تھا۔ اُس کے جینے کا حیلہ وسیلہ پوجا پاٹھ تھا۔ وہ اپنے طرز حیات پر فخر کرتا تھا اور دنیا داروں پر اپنی برتری جتاتا تھا۔ تایاجی اُسے مجرہ نشین کتابی کیڑا کہتے تھے۔ وہ شاستروں کی تفسیر اُس سے الگ طریقے سے سمجھتے اور سمجھاتے تھے، شاستر، دھرم نہیں ہے، دھرم سمجھانے کا سا دھن ہے۔ شاستر کی اصل، شستہ ہے۔ جو کوئی اسے روزگار کا وسیلہ بناتا ہے، وہ اسے نہتوں کے خلاف ہتھیار کی طرح برتتا ہے اور انھیں ٹوٹاتا ہے۔ دھرم، فرد اور سماج کو ملانے کی کڑی ہے اور دیانت دارانہ زندگی جینے کا طریق عمل۔ دھرم، پوجا پاٹھ اور شاستروں کا رٹن نہیں، اصول ہیں جو اچھے، بُرے کام میں فرق بتاتے ہیں۔“

وہ گرنٹھ میں سے حوالہ دیتے،

ہر، مسیت، صدق، مصلہ، حق، حلال، قرآن

سرم، سنت، سیل، روزہ، ہو ہو مسلمان

کرنی، کعبہ، سچ پیر، کلمہ، کرم، نواج

تسیج، ست سبھاؤ دی نانک رکھے لاج

حق پرایا نانکا، اُس سود، اُس گائے

گر پیر ہا ماتاں بھرے، جال مردار نہ کھلے

(رحم و کرم کی مسجد بنا، صدق کا مصلیٰ بچھا، حق کی کمانی کو قرآن سمجھ)

(شرم و حیا کو سنت مان، اچھے اطوار کا روزہ رکھ اور یوں مسلمان بن)  
 (نیک عمل تیرا کچھ ہو، صداقت تیرا پیر ہو اور بخشش تیری نماز ہو)  
 (رواداری تیری تسبیح ہو تبھی اے نانک تیرا خدا تیری لاج رکھے گا)  
 (دوسرے کا حق غضب کرنا، مسلمان کے لئے سُور اور ہندو کے لئے گائے  
 کھانے کے برابر ہے)

(خدا اُسی حالت میں تیرے انسان ہونے کی حامی بھرے گا جب تو اچھے کرم  
 کرے گا۔)

ایک بار گرچن سنگھ، تایاجی مرے اپنی بات منوانے لگا کہ گیان، جہاں ہے، اس لئے گیانی  
 سنساری سے بڑا ہے۔ تایاجی نے ان شبنوں کے ارتھ جیسے بیان کئے، اُنھیں کی طبعِ سلیم کا کمال ہے  
 ”گیان، جانکاری ہے اور وچار، بھیدن کاری۔ غور کرو تو ان دو لفظوں میں زمین، آسمان کا  
 فرق ہے۔ گیان، ماضی کی طرح جہاں کا تھاں رہتا ہے جب کہ وچار، حال کو مستقبل کی طرف بڑھانا ہے۔  
 وچار، وقت کا میار ہے اور کبھی خود کو نہیں دہراتا۔ گیانی سے وچاری مُت زہ ہے، پہلا تاریخ گو ہے  
 اور دوسرا تاریخ ساز۔“

تایاجی کسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے گویا اپنی بات پر مزید غور کرنے لگے۔  
 وہ لفظوں میں ایسے تیز کرتے تھے جیسے کاشت کار تھموس سے تھموس میں اور پھر تھموس، تھموس  
 میں۔ اُنھوں نے ان دو لفظوں کو اس طرح بیان کیا۔ و، ویش (زیادہ) کا پرتی بدھی (ترجمان) ہے  
 اور وچار، چرو، کا، ارتھ ہے چلنا اور کھوج کرنا۔ مویشی، چراگاہ میں ہوتا ہے تو وہ چارہ چرتا ہے اس  
 لئے کہ اسے چارہ تلاش کرنا پڑتا ہے لیکن وہ ناند پر بندھا ہوا تو چارہ کھاتا ہے کیوں کہ اُس کے عمل سے تلاش  
 کا غنقر غائب ہوتا ہے۔ اسی طرح گیان صرف گیان ہے، ارتھ ہے جانا۔ اس کے ساتھ وہ بڑھانے  
 سے یہ وگیان بنتا ہے، یعنی جلنے کی کریا۔ کریا، گیان کا سوتا ہے اور اتپا دک (پیدا کرنے والا) بھی۔  
 ”یہ غلط ہے، وگیان، گیان سے بڑا نہیں ہوتا!“

گرچن سنگھ نے تایاجی کی بات کو جھٹلانے کے لئے جھٹلایا۔  
 ”کیوں غلط ہے؟“

اُنھوں نے وضاحت چاہی۔

”یہ میرے عقیدے کے خلاف ہے۔ وگیانی، گیانی سے بڑا ہوتا تو شاستر اُس کی سرانجام کرتے!“

اُس نے اپنے کٹر پین کا منطابہ کیا۔  
 ”اوہ! اُنھوں نے متاسفانہ لہجے میں کہا اور اپنی بات کو جاری رکھا، ”روایت پرست، خوبصورتی اور بدصورتی میں فرق کرنے کے نااہل ہوتے ہیں۔ شاستروں کے مؤلف گمانی تھے نہ کہ وچاری۔ اور وچاری سے گیانی جھگڑے پیچھے ہوتا ہے۔“

جو لوگ ویدوں کو ہر گیان کا خزانہ مانتے تھے، تایاجی انھیں گیانی کہتے تھے۔ وہ سمجھاتے تھے، ”وید کا آرتھ ہے، گیان۔ اُس وقت گیانیوں کو جتنا گیان تھا، اُنھوں نے اُسے لکھ دیا اور اُسے لکھے ہوئے ہزاروں سال بیت گئے ہیں۔ جب سے گیان بڑھا ہے اور لگا تار بڑھ رہا ہے۔ وہ گیان آج کے مقابلے میں دنائیت (پُرانا) ہے اور زیادہ تر ناکارہ۔ جو کوئی اُسے کُلّی طور پر سود مند سمجھتا ہے، وہ بے ہنر ہے۔ ارتقائی نکتہ نظر سے بے ہنر، بے وجود ہوتا ہے۔ ہنرور، معراج آدم ہے اور ہنر، اصل عالم۔“  
 وہ رسوم و روایات کو پُرکھا روگ کہتے تھے اور اپنے صحت مند رویے کی صراحت یوں کرتے تھے، ”انسان، حُسن آفرینش کا نام ہے۔ میرے بزرگوں میں سے کسی نے جیو پہنا اور کسی نے لنگوٹ، کسی نے پیلا لباس پہنا اور کسی نے گروا، کسی نے نیلا، سفید۔۔۔ اور سب سے پرانے بزرگ تو ننگے رہتے تھے۔ کیا میں اُن کے احترام میں ننگا رہنے لگوں؟ زندگی کی حقیقت، زندگی ہے! یہ دھرتی زندگی کی ملکیت ہے اور ہنروروں کی سلطنت۔“

وہ ہنروروں کو دانش وروں سے ممتاز سمجھتے تھے۔ ”دانش وروں کی زندگی انسان کے اقتصادی سماجی اور اخلاقی مسئلوں کو سمجھتا ہے اور انسانی ارتقا کو مد نظر رکھتے ہوئے، اُن کا حل نکالنا ہے۔ ان کا اول فریضہ اپنے خیالوں پر عمل کرنا ہے، چاہے انھیں آگ کے دریا سے گزنا پڑے تاکہ دوسرے، ان کے خیال کو اپنے فائدے کے لئے اپنائیں اور خود کو آنے والی مصیبتوں سے بچائیں۔ دانش وری، دانش وروں کی وراثت ہے، جو ہنر کے برعکس ناپائدار ہے کیوں کہ یہ صرف ذاتی خوبی ہے جو اپنی ذات کے ساتھ کے ختم ہو جاتی ہے۔ جو دانش ورا اپنے قول و قرار پر پورے نہ اُتریں وہ ریاکار اور رذیل انسان ہیں۔“

اُسی طرح وہ ہنروروں کے نکتہ چیں تھے۔ ”کسی کا گھر سونے سے بھرا پڑا ہو، وہ مٹی کے برابر ہے اگر اُس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں نہ ہوں۔ یہی حقیقت ہنر کی ہے۔ جو ہنر انسانی زندگی میں پراگندگی پھیلاتا ہے، اُس سے بے بہرہ ہونا اچھا ہے۔“  
 میں نے انھیں چیزوں سے ہم کلام دیکھا تھا اور اُن کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے سنا تھا۔

وہ پھلوں کے گنوں کو انسانوں سے ملاتے تھے، جیسے ستوگن، تموگن، رجوگن۔

ستوگن۔ وہ گن جو ہنر و قیام ہوں۔ پھلوں میں یہ گن آم، انگور، سیب وغیرہ میں ہیں۔  
تموگن۔ وہ گن جو سدھارن انسان میں ہوں۔ پھلوں میں یہ گن کدو، گھیا، لکڑی

وغیرہ میں ہیں۔

رجوگن۔ وہ گن جو راجے میں ہوں۔ پھلوں میں یہ گن بادام، اخروٹ، ناریل وغیرہ میں ہیں۔  
وہ ستوگن کو سب سے اتم گن مانتے تھے، اُس سے چھوٹا تموگن اور اُس سے چھوٹا رجوگن۔  
رجوگن کو وہ اس لئے حقیر سمجھتے تھے کہ اس کے گنی کو اپنے گن قائم رکھنے کے لئے پتھر دل ہونا ضروری ہے  
اور ایسا آدمی جابر، لٹیرا، لالچی، قاتل، جاہل۔۔۔ ہی ہو سکتا ہے اور بالآخر ہٹی۔

وہ کہتے تھے، خود آرائی کے لئے خود آگہی ضروری ہے۔ جہاں اس خوبی کا فقدان ہو وہاں  
اصلاح ذات نامکن بات ہے۔ خود آگہی، پرستی (وہ چادر جس سے ہو کر کے انانج میں سے جھوسا جدا کرتے  
ہیں) کی طرح ہے جو کھرے کو کھوٹے سے جدا کرتی ہے۔“

میں نے سُکھ اور دکھ کے بارے میں کتنی باتیں سنی تھیں۔ کوئی انھیں تقدیر سے منسوب کرتا تھا  
اور کوئی کمروں سے! لیکن تالیابی ان کے بارے میں الگ طریقے سے سوچتے تھے۔ ”زندگی سُکھ اور دکھ کا  
ایسا دھارا ہے جس کا بہاؤ انسان کے تابع ہے۔ اچھا سوچو، اچھا کرو، سُکھی رہو! بُرا سوچو، بُرا کرو،  
دکھی رہو! یہ دونوں عمل دوسرے سے زیادہ اپنے لئے اثر انگیز ہیں کیوں کہ انسان کا دل اُس پیالے کی طرح  
ہے جس میں سے کچھ لینے کے لئے پہلے اُسے بھرا پڑتا ہے اور دوسرے کو اتنا ہی ملت ہے جتنے  
چھلکتا ہے۔“

وہ کہتے تھے کہ ہر شے بات کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُسے پوری توجہ سے سُنو۔ مثلاً یہ کماد  
کہتے ہیں کہ میری آب پاشی کرو ورنہ میں سُکھ جاؤں گا۔ وہ کھیتی کہتی ہے کہ مجھے اٹھایا (سبزہ بیگانہ) سے  
بچاؤ۔ اُن کی سیدی سادی بات زندگی کی فلاسفی ہوتی تھی۔ ”ہر شے کے بات کرنے کا انداز اُس کی  
حقیقت پر متوقف ہے۔ کاٹا اپنی سفاکی پر نازاں ہے اور پھول اپنی نازکی پر۔ ہر ایک، دوسرے کی  
حقیقت سے بے نیاز ہے لیکن اپنی حقیقت منوانے کے درپے ہے۔ نظمِ فطرت کی خلاقیت، خوبی ہے کہ  
ہر شے اپنی بے آہنگی میں دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن عقلی انسان کی ستم ظریفی! یہ ایسی گونا گونی  
میں بے آہنگ ہے۔ انسانی ماحول میں ہم آہنگی فراست سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان نے عقل سے تلوار  
بنائی اور فراست نے اُسے سمجھایا کہ اسے صرف دفاع ذات میں استعمال کرو۔ لگام نہ گھوڑے کے

ساتھ جو کیا، فراست نے وہی انسان کے ساتھ، ورنہ دونوں آج بھی جنگلی ہوتے۔  
انسان ہو کہ حیوان، جمادات ہو کہ نباتات، وہ ہر شے کے معنی اپنے طریقے سے سمجھاتے تھے  
اور کئی کئی طرح بیان کرتے تھے۔

”انسان ایسا حیوان ہے جو آدمی سے اعلیٰ بننے کی کوشش کرتا ہے۔“

”انسان ایسا حیوان ہے جو اپنا رزق آپ پیدا کرتا ہے۔“

”انسان ایسا حیوان ہے جو کئی ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔“

”انسان ایسا حیوان ہے جو ہر اچھی، بُری شے کا معیار ہے۔“

”انسان ایسا حیوان ہے جس کا ورثہ نسل کی وضع داری سے الگ ہے۔“

”انسان ایسا حیوان ہے جو اپنے ہنر کے ذریعہ اپنے آپ کو لافانی بناتا ہے۔“

”انسان ایسا حیوان ہے جس کے وجود ہی سے کائنات کا وجود ہے۔“

اُن کے دل و دماغ میں جو کچھ تھا وہی اُن کے ہاتھوں میں تھا جس کی تصدیق وہ زبان سے  
بھی کرتے تھے، ”میری حقیقت وہی ہے جو میرے عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ اُس سے میں جتنا زیادہ  
کہتا ہوں وہ میرا خیال ہے اور خیال کی بات عمل تک پہنچتی ہے تو اُس کی شکل ہی بگڑ جاتی ہے۔“  
اُن کی بات اُن کے کردار پر پوری اُترتی تھی۔ وہ کام کرتے ہوئے کہ بات کرنے کے لئے الفاظ کا  
انتخاب، لگتا کہ وہ اُن کی باہری دنیا سے داخلی دنیا میں اُترتے ہیں اور اُس کی مُصنّف حقیقت کو ظاہر کرنے کی  
کوشش کرتے ہیں۔ جا سکے کام پر اُن کا موجود ہونا اس بات کی شہادت تھی کہ کام اپنی پوری نفاست  
کے ساتھ تمام ہوگا۔

اُن کی حقیقت پسندی نے اُن پر انسانی سچائی کے ایسے پہلو نمایاں کئے تھے کہ وہ کبھی آدمی  
پر بڑی بات کی سچائی پر شک کرتے تھے اور حدیث و حکایات، خاص کر معجزوں کی باتوں کو انسانی تصور  
کی خرافات کہتے تھے۔ ”یہ باتیں اُن لوگوں کی فریب کاریاں ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں ناکام رہے،  
و شواہد کی طرح۔ وہ کوڑھی کے کوڑھے کا علاج نہ کر سکا لیکن اُسے جنت نشینی کا یقین دلاتا رہا۔ معجزوں  
اور چمکاروں کی باتیں وہ کرتے ہیں جو زندگی کی اصلیت سے بے خبر ہیں۔ جن کی اپنی حقیقت، بے  
حقیقت ہے۔ ہر حقیقت، حقیقت سے خود آفشا ہوتی ہے لیکن جاہل لوگ اسے معجزہ سمجھ لیتے ہیں۔  
انسان، کمالِ فطرت کا مکمل نمونہ ہے اور ہنر، کمالِ انساں ہے۔ وجود، عدم سے پیدا نہیں ہوتا۔  
جو لوگ ایسی حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ کلین بلاس (ذہنی مباشرت) میں مبتلا ہیں۔“

نہ کہ علم کی تکرار سے۔

اُن کا نظریہ تھا کہ دھارمک کتابوں کو شعورِ حیات سے کوئی واسطہ نہیں، اس لئے اُن کے پڑھنے والوں کی ماہیت خود کو دہرانے میں ہے۔ چوں کہ وہ اختراعی صلاحیت کی لطافت سے بے بہرہ ہیں، وہ اپنے جمود کی کثافت میں نفاست دیکھتے ہیں۔ تایاجی ہر چیز کی سچائی کئی کئی طرح سے بیان کرتے تھے، شاستروں کے بارے میں کہتے تھے، ”اُن میں کچھ جوہر ہے لیکن اتنی خرافات میں دفن ہے کہ اُسے ڈھونڈنا خود کو کم کرنا ہے۔ علاوہ ازیں انسانی جوہر کی خصوصیت ہے کہ یہ وقت کے ساتھ بڑھتے ہوئے ہنر میں جذب ہو جاتا ہے اور اپنا اصلی وجود کھودیتا ہے۔ اس کا تاریخ سے کوئی رشتہ ہو تو ہو، اپنے طور پر اس کی نہ اہمیت ہوتی ہے اور نہ آئندہ ترقی سے واسطہ۔“

اُن کی حُسن پرستی کی بصیرت ہی الگ تھی۔ وہ اُسی چیز کو خوبصورت مانتے تھے جسے عملِ تخلیق سے نسبت ہو۔ انسان کے حسین ترین اعضا، ہاتھ ہیں۔ ہاتھ نہ ہوتے تو یہ دوسری انواعِ حیات کی طرح بے ثبات و بے شعور ہوتا۔ اپنے ہاتھوں کی عملی صلاحیت ہی سے یہ مرنی دُنیا سے غیر مرنی دُنیا میں پہنچا، اُس کی حقیقت کو پہچانا اور یوں اپنے حیاتیاتی وجود کی حدوں کو بڑھا کر لا محدود سے ملایا۔ اسی احسا تکمیل نے اسے باور کر دیا کہ اس کا حُسن دوامِ اہل و عیال کے برعکس ہنر سے ہے۔ ہنر، انسانی زندگی کا مرکز ہے اور ہنرور ہنر سے اپنی وابستگی کے عہد و یہاں کا مجدد۔

وہ کئی بار اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے جیسے اُن میں چھپے ہوئے ہنروں سے معذرت خواہ ہوں، جنہیں ظاہر کرنے میں وہ ناکام رہے تھے۔

میری ماں کے روحانی عذاب میں تایاجی اُسے جیسے سمجھاتے وہی سمجھا سکتے تھے۔

”بھائیاجی، آپ کہتے ہیں کہ دھرتی پر نفرت سے محبت زیادہ ہے، کیسے؟ مجھے تو الٹ لگتا ہے!“

اُس نے تایاجی سے پوچھا۔

”محبت، حیات ہے اور نفرت، ممات! یہاں رواں آئے، دریا دھسن آئے، چنگیز آئے، نادر آئے، ابدالی آئے۔۔۔ کیسے کیسے ظالم آئے اور تباہی مچا گئے لیکن زندگی رواں دواں ہے، بے خلل، بے داغ، بے نیاز! محبت اور نفرت کی بھی نفسیات ہے۔ محبت چُپ چاپ پروان چڑھتی ہے اور نفرت اس کے برعکس! اس لئے نفرت کتنی ہی کم ہو، زیادہ لگتی ہے۔“

وہ محبت اور نفرت کا تقابل یوں بھی کرتے تھے، ”محبت، صفائی ہے اور نفرت، گندگی۔ پہلی کے جینے کا انداز مدافعت ہے اور دوسری کا جارحانہ، اس لئے نفرت، محبت سے آفروں دکھائی دیتی ہے

صاف سُتھرے گھر میں تھوڑی سی غلاطت پڑی ہو تو سارا گھر بدبو سے سڑنے لگتا ہے اور وہاں کی ہر شے اُتو وہ نظر آتی ہے۔“

قاریں! یہ دُنیا ہے، ظالم دُنیا! اِس نے کس کے ساتھ انصاف کیا ہے جو اُن کے ساتھ کرتی۔ لوگ اُن سے ناراض ہوتے تھے، اُنھیں ذیل کرتے تھے۔ میں اُنھیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے کہتا لیکن وہ مجھے سمجھاتے، ”برائی، بھلائی کا اتنا ہی اہم جُز ہے جتنا بدصورتی، خُوب صورتی کا۔ فرق اتنا ہے کہ برائی اپنی حمایت برائی سے کرتی ہے اور بھلائی، بھلائی سے۔ میں اُن کی برابری کروں گا تو اپنے کردار کو کیوں کر زندہ رکھ سکوں گا؟“

اُن کے کردار کی یہی خصوصیت تھی جو اُن کے عناصر کی ترتیب کو مزید سُتھارنے کے لئے بگاڑتی تھی۔ وہ اُس کی بھی مدد کر دیتے تھے، جس نے اُن کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہوتا تھا۔ وہ اپنے غیر رسمی رویے کو جس فلسفیانہ انداز میں بیان کرتے تھے وہ بھٹکے ہوئے لوگوں کے لئے چراغِ راہ تھا۔ ایک سا کردار نبھانا مشکل ترین کام ہے۔ فرق یہ ہے کہ اچھا انسان کرتا ہے تو بچے پھل کی طرح گرتا ہے۔ پکا پھل، پیٹ بھرے کے لئے تسلی اور بھوکے کے لئے تُوٹا نائی ہوتا ہے۔“

اُن کی فِراست بالکل ارضی تھی، ”سچ وہ نہیں ہے جو میں کہتا ہوں، سچ وہ ہے جو میں کرتا ہوں کہنے اور کرنے میں اندھیرے اور اُجلے کا فرق ہے۔ جو آدمی صرف کہتا اور کہتا ہے وہ اندھیرے میں رہتا ہے“ وہ اوتاروں اور پیغمبروں کی جگہ ہنروروں کی ستائش کرتے تھے، ”حیات، اِفراتِ حیات میں گم تھی۔ اِس کی بازیافت کا ذمہ دار ہنرور ہے۔ حیات اور ہنرور ایک نازک فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے مُماثل ہیں۔ حیات خود کو دہراتی ہے اور ہنرور اپنی تجدید کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اِس لئے ہنرور کی روایت ہے کہ شاگرد، اُستاد سے سیکھنا ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر کی حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ یہ تعلیم و تربیت کی روایت سے بری ہے کیوں کہ یہ پیدائشی ہمہ بین و ہمہ داں ہے اور اِداراکُل کا سرچشمہ۔ اُنفس و افاق کے سارے رُخسراسمی پر عیاں ہیں اِس لئے مُقلد کا فرض ہے کہ وہ پیغمبر کے بیان و کلام پر ایمان لائے ورنہ اُس کی حمایت سے محروم رہے گا۔ مُقلد کی سُلّم اطاعت شعاری اُس کے نشوونما کے حق میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور وہ خود اُفروری کی خوبی سے بے فیض رہتا ہے۔ اُس کی نفسیات گُور کے بھٹکے کی سی ہوتی ہے جو اپنے اندھیرے خول کو کائنات سمجھتا ہے۔“

اِس کے باوجود وہ ایک کہانی سُناتے تھے جس میں اُستاد کو شاگرد سے سیانا گردانتے تھے لیکن اُس میں مزاح کا پہلو ہے۔ ”ایک اُستاد نے اپنے شاگرد کو اپنا سارا ہنر سکھا دیا اور اُسے جانشین بنادیا۔“

ہوتے ہوتے شاگرد مژر ہو گیا اور خود کو دنیا کا سب سے بڑا ہنرور جاننے لگا۔ اُس کے اُستاد نے اُسے سمجھا کہ ہنر لا محدود ہوتا ہے، جو انسان اس حقیقت سے غافل رہتا ہے، اُس پر ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ شاگرد، اُستاد کی نصیحت کو خاطر میں نہ لایا اور اُس کے مُنہ پر اُسے بڑا بھلا کہنے لگا۔ تنگ آمد، جنگ آمد اُستاد نے شاگرد کو تلوار کی لڑائی لڑنے کے لئے لکھا۔ بوڑھے اُستاد کی چوتی پر شاگرد کو ہنسی آئی اور اُس نے لڑائی کے لئے چوتی قبول کر لی لیکن اُس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ ادھر اُستاد نے لڑائی لڑنے کی تیاری شروع کر دی۔ اُس نے پانچ فٹ کی تلوار بنائی اور یہ خبر اپنے شاگرد تک پہنچا دی۔ وہ تلوار کی لمبائی پر حیران ہوا لیکن پھر اپنے لئے چھ فٹ کی تلوار بنانے لگا۔ مُقابلے کے دن اُستاد اور شاگرد اپنی اپنی تلوار میان میں رکھے میدان میں اترے اور ثالث کے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔ اشارہ ہوا اور دونوں اپنی اپنی تلوار کے دسے پر لپکے۔ جب تک شاگرد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اُستاد نے میدان میں سے خنجر نکالا اور شاگرد کے سینے پر رکھ دیا۔

اہل بیت ہیں کہ اہل سیف، اپنی اُصل کے شجرے رکھتے ہیں اور اُن کی عظمت پر فخر کرتے ہیں ایسے جذبات پر نیا جی یوں طعن کرتے۔ ”جو لوگ خود سے ناامید اور اپنے حال پر شرمندہ ہیں، وہ اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں اور اُسی طرح اپنے آب و اجداد کے کارناموں کو، جو کم و بیش بے ہنریوں اور خوں خرابوں کے عرصے ہیں۔ وہ لوگ تخلیقی جوہر سے عاری تھے لیکن مُردہ پرستوں نے اُن کے مرنے کا گناہ اُنہیں فوق الانسانی خوبیوں کا مالک بنا دیا ہے۔ جیسی کسی کی نفسیاتی کیفیت ہے، وہ ویسی ہی زندگی کا فروغ چاہتا ہے اور اُسی کی بڑائی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ آدمی کا اَدعا بڑے خیال کا سا ہوتا ہے جس کی عملی صورت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ بچوں کے علم و دیاں، عملی اسلوب کا بدصورت عکس ہوتے ہیں، انسان کی دانت داری کی پہچان ہنر ہے۔ ہنر، ظہورِ ترتیب کا سلسلہ ہے، اس لئے تہذیب و تمدن ہنروروں کے ممنونِ منت ہیں نہ کہ نام نہاد پیغمبروں کے۔ حیوانوں کے شجرے ہوتے ہیں اور انسانوں کے ہنر، اُن کا ماضی سے رشتہ ہے اور ان کا مستقبل سے۔ حیوان کی ماضی سے غیر دروئی ہے اور ہنرور کی مستقبل سے۔“

بیچ رکھدا آیا جی جگو جگ دا ہگرُو (جب جب پاپ بڑھتا ہے، تب تب بھگوان، اوتار دھارتا ہے، پاپیوں کا ناش کرتا ہے اور بھگتوں کی رکشا۔ سرشٹی کا توازن بھگتوں کے تپ سے ہے اس لئے بھگوان، بھگتوں کا احساس مند ہے) دھارمک گرتھوں کی اس بات پر اُن کا ردِ عمل بڑا کڑا تھا۔ ایسا بے دلیل دعویٰ کر کے اوتاروں نے انسانوں کو بہکایا ہے اور دنیاوی ذمہ داری سے فرار سکھایا ہے اور اُس آفاقی نظام پر ایمان لانے پر اُکسایا ہے جس کی حقیقت نامعلوم ہے۔ کیا خوب؟



انسان جلدی جلدی اپنی روحانی اور اخلاقی نفی کو پہنچنے تاکہ بھگوان اُس کی مسکیتی اور دُستی کے لئے اُتار دھارن کرے ! اُتاروں کے اس دعوے کو تسلیم کرنا اس جھوٹ کو سچ ماننا ہے کہ انسان کے جسم میں رُوح نام کی کوئی چیز ہے۔ انسان، ہمت و بُود کا حصہ ہے۔ جیسے نباتات و حیوانات۔ چوں کہ انسان اشتراکی قدروں کا مجموعہ ہے اور حقوقِ حیات کا مُدُن، انسان کا رشتہ انسان سے ہے اور یہی ایک دُوسرے کے دُکھ بھگھ کا سبب۔ اُتار اور بھگت، ریاکاروں کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔“

انسانی زندگی کی اُصل وہ اس طرح بیان کرتے، ”زندگی ایک مہتر ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ یہ اپنی ترقی کے لئے مسلسل تجدیدِ عہد کرے۔ کمالِ عزم تک پہنچنے کے لئے جتنی کوشش ننانوے فیصد کامیابی پر خرچ ہوئی ہے اتنی ہی باقی ایک فیصد پر۔ اس جدوجہد میں کون کہاں رہ جاتا ہے؟ یہ اُس کی اپنی بساط پر ہے ورنہ جمالِ کمال دعوتِ دید ویتا ضرور ہے۔ زندگی کی تعمیر چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے جو ایسی باتوں پر توجہ دیتا ہے، وہی بڑا آدمی ہے۔ فطرت اس لئے بڑی ہے کہ یہ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں پر مہمور نہ دھیان دیتی ہے اور اس کے بڑے بڑے کام اپنے آپ پورے ہو جاتے ہیں۔“

وہ ایک کہانی سنایا کرتے تھے جس کا عنوان تھا ”پرے سے پرے“۔ وہ ایسے کاریگر کی کہانی تھی جسے اپنے کمال فن پر ناز تھا اور وہ کاریگر کو حقیر سمجھتا تھا۔ اُس کے ساتھ ہوئی یہ ہوئی کہ اُس کے گھر میں ایک مسافر مہمان ہوا جو میمانسک (مثنائی) تھا۔ کاریگر نے بار اگھاتے ہوئے اُسے ڈھینکلی چلا کر دکھائی اور داد چاہی۔ چوں کہ کاریگر کے پُرکھے، ڈال اور بیڑی سے کھیتوں کو سیراب کرتے تھے، وہ اپنے نئے اور کاریگر مہتر پر نازاں تھا۔

”ڈھینکلی کا جنتر بیڑی سے اچھا ہے ! لیکن اس سے بہتر جنتر بھی ہے، رہٹ۔“

چاہیے تو تھا کہ وہ مثنائی سے رہٹ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا لیکن اُس کی ہیکڑی نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ اُس کی ہنسی اُڑانے لگا، ”میاں، تو نے خواب دیکھا ہے ! مجھے بتا دیا ہے، ٹھیک ہے ! کسی اور سے مت کہنا، وہ تجھ پر ہنسے گا۔“

”میں نے سوچا تھا کہ تیرا اناج کھایا ہے، بدلے میں تجھے کچھ دیتا چلوں لیکن تیری قسمت میں نہ تھا۔ خیر، اس میں تیرا قصور نہیں ہے ! انسانی زندگی عجیب آئینہ ہے ! اس میں گدھا مُنہ دیکھتے ہیں تو اُسے انسان نظر آتا ہے۔“

مثنائی کا انداز اُس کاریگر سے بھی طہریہ تھا۔

”دُنیا میں بے وقوف زیادہ ہیں اور ہوشیار کم، اس لئے تیرے جیسوں کو بہت مل جاتے ہیں۔“

کاریگر نے اپنا معاذلہ روئے بقرار رکھا۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ کاریگر ڈھینکلی سے اُوب گیا۔ اُس نے رَہٹ کے جتھر پر غور کیا جو اُسے اپنے جتھر سے بہتر لگا۔ اُس کا جذبہ تلاش عود کر آیا جو اُسے ایک راج سے دوسرے راج میں اُور وہاں سے تیسرے راج میں لے گیا۔ وہاں بھی رَہٹ نہ دیکھا، وہ مایوس ہو گیا اور منشی کو بُرا بھلا کہتا ہوا گھر واپس لوٹنے لگا۔ اچانک اُس نے سوچا کہ میں اتنی دُور تک آیا ہوں کیوں نہ اگلے راج تک جاؤں۔ وہ اُس راج میں پہنچا اور رَہٹ دیکھ کر حیرانی و خوشی کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اُس کا نکاس ڈھینکلی سے بسیار اُور لگا تا تھا۔ بیل رَہٹ چلا رہے تھے اور کسان گاہدی (پاٹ) کی کرسی پر بیٹھا گیت گاتا تھا۔ وہ مطمئن مگر نئی بصیرت لے گھر لوٹا اور رَہٹ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے جو رَہٹ بنایا اُس کی مال پر دوسرا ڈول بٹھایا اور اُس کا نام دو رَہٹ رکھا۔

انھیں کم مایہ کام کرتے دیکھ کر لگتا کہ زندگی کی خوب صورتی ادنیٰ عمل سے ظاہر ہوتی ہے نہ کہ اعلیٰ سے۔ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اُسے ایسے تاڑتے جیسے کوئی سرکش بچے کی آنکھوں میں تاکے۔ وہ کہتے تھے کہ کام کی نفسیات آدمی کی طرح ہے۔ اس سے ڈرو تو یہ ڈراتا ہے دُور رام ہو جاتا ہے۔

جو انسان اپنے مقدور سے زیادہ جیتا ہے، وہ اپنی دیکھ بھال کے لئے دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ اکیلا معذور انسان، حیوان کی طرح ہے۔ وہ جہاں ڈھے پڑتا ہے، مرجاتا ہے۔ یں سارا وقت اُن کی خدمت میں گزارتا اور اُن سے طرح طرح کی باتیں کرتا، باتیں سُنتا۔ اُن کے کہنے پر میں نے اُن کے بیٹوں کو خط لکھ دیا کہ وہ تندرست ہیں اور انھیں کسی قسم کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اُن کو پیروں پر بیٹھ کر چاہت رفع کرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ اُن کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے، میں نے تنخوں سے کھڑا پاخانہ بنایا۔ برتن کا مقام خالی رکھا۔ نیچے آدھا گڑ چوڑا، ایک گڑ گہرا گڑھا کھودا اور چند گڑ پیلے بچڑا کر اُس میں ڈال دیئے۔ اُن کو گڑ پیوں والی بات بہت پسند آئی۔ میری ایجاد اور مشاہدے کی داد انھوں نے اس طرح دی، صحیفہ فطرت میں آغاز کے معنی ہیں، آہل کی جھنڈ نکمیل اور صحیفہ ہنرمیں آغاز، مشاہدے سے مُستلک ہے۔ ہنر ہی ایک طریقِ عمل ہے جو اپنا پارکھ آپ ہے اور ایسا بے لوج پارکھ ہے کہ دائم صحیح پر کھتا ہے اور لوں ارتقا سے ارتقا کی ضمانت دیتا ہے۔ ہنر کے علاوہ ہر صنفِ عملِ عمومیت کا شکار ہے جو عوام کا درد ہے۔ عام طور پر انسانی کی معذوری اور موت کا خوف آدمی کو جھکنا لو اور بے رُوح بنا دیتا ہے۔

تایا جی بڑھاپے کی اس لعنت سے بری تھی۔ وہ موت کے بلے میں جیسی باتیں کرتے تھے، اُن سے موت، حیات کا احیا جان پڑتی تھی۔ ”زندگی ایک توانائی ہے جو صرف ہو جانے پر تجدید چاہتی ہے۔ اس کی یہ

ضرورت فقط موت سے پوری ہوتی ہے۔ مہات، حیات کا معرضِ شہود ہے۔“

میں اُن کی خدمت کرتا اور باتوں سے محفوظ ہوتا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں پوری طرح اُن کے پاس تھا اور ساتھ بھی۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے معمولی سے معمولی بات کے جو معنی بیان کرتے اُس کی بلاغت ہنر چہت ہوتی۔ کائنات کی اصل جو ہر ہے اور انسان کی اصل، ہنر۔ یعنی ایک وجود سے دوسرے وجود کو پیدا کرنے کے طریقہ کار کو ہنر کہتے ہیں۔ چوں کہ اس کا معیار مقرر ہے، انسان کا روپ سروپ ہنر ہی سے سنوارا ہے۔ جیسے قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے، اینٹ اینٹ مکان، لیک لیک کھیت، قدم قدم منزل۔۔۔ ویسے ہی ہنر ہنر انسان بنتا ہے۔ بے ہنری، پرانگندگی ہے۔ کوئی ہنر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، اُس کے پیچھے اُن کہی کوشش کا جہان ہوتا ہے، جس کے لئے سارے حواس ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کی طاقت بنتے ہیں۔“

صحیفوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتے، ”ان کتابوں میں سے دعاؤں، عبادتوں، جنتوں، دوزخوں، سزاؤں، جزاؤں۔۔۔ کی باتوں کو نکال دو تو یہ ابھی کتابیں ہیں!“

”ان کتابوں میں سے اُن باتوں کو نکال دیا گیا تو ان میں باقی کیا بچے گا؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جو ہم کھاتے ہیں کیا اُسے پورا بچاتے ہیں؟ اُس کا زیادہ تر حصہ فضلے کی شکل میں خارج کر دیتے ہیں۔ اُس کا صرف جو ہر رکھتے ہیں اور وہی حیاتِ آفریں جزو ہے۔ اسی طرح بھائی چارے کی زندگی گزارنے کے لئے ایک دو اخلاقی باتیں ہی کافی ہیں، جو ان کتابوں میں موجود ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو، جو تم چاہتے ہو کہ تم سے ہو۔ اپنے عیب پر ملامت کرو، دوسرے کے ہنر کو سراہو۔“

انھوں نے صحیفوں کا پنجوڑ بیان کیا۔

تہواروں پر جلے ہوئے اور ڈھادی رزمیہ گا کر سناتے۔ اُن کا جو شیلا اندازِ بیاں! سننے والے دیر رس سے سرشار ہو کر جیکارے بلاتے اور مرنے مارنے پر آمادہ لگتے۔ عوام کے اُس جذباتی ہیجان پر تیاہی یوں تبصرہ کرتے، ”جو قوم دوسری قوم کو نیست و نابود کرنے میں اپنی عظمت خیال کرتی ہے، وہ جاہلوں اور قاتلوں کا انبوہ ہے۔ جنگ کو جائز سمجھنا جرم ہے اور اسلاف کے جنگی کارناموں پر فخر کرنا مجرمانہ خصلت۔ باہمی عداوت انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر روک لگاتی ہے اور اپنی انتہا میں انھیں مجہول بناتی ہے۔ جنگ بھر کے ہوئے جذبات کا ٹکراؤ ہے۔ یہ کتنے ہی اخلاقی اُصولوں پر پڑی جائے، انسانیت کی بربادی ہوتی ہے۔ جو لوگ جنگ کی بات کرتے ہیں وہ فساد ہی ہوتے تھے۔ وہ ایسے ہی انسانِ نمادندے تھے،

جنہوں نے انسانوں کو انسانوں کے خلاف تبر و آزار کھا ہے۔ جنگ اور نیکی کاری کو خدا واسطے کا میرے  
جب کہ ہنر اور نیکی کاری ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ہمیں علم و ہنر کی باتیں کرنی چاہیں۔ صرف علم و  
ہنر ہی ایسا انداز حیات ہے جو انسان کی حیوانی جبلت کو تخلیقی سمت دیتا ہے۔ ماضی کے جنگ بازوں  
کے قصیدے پڑھنا لا شعوری طور پر حال کے جنگی عناصر کو بڑھا دیتا ہے۔ ہمیں ایسے بھیاںک کرداروں  
کو بھلا کر عالموں، فن کاروں اور ہنرمندوں کو یاد کرنا چاہیے، جن کی روشن خیالی نے ذہن انسان کو اجاگر کیا اور  
اُسے خود آرائی کا فن سکھایا۔ جنگ باز، خون کے بھیاںک دریاؤں اور لاشوں کے ہولناک انباروں کے دہرے  
ہیں اور انسان سے انسان کی نفرت کو تازہ کرتے ہیں۔ جب کہ ہنرور، سندر کلاؤں اور راحت رساں جنتوں  
کے موجد ہیں اور انسانی رشتوں کو نئے عنوان دیتے ہیں۔

وہ ”کرتا سنگھ“ کو ”توتا سنگھ“ سے ایسے جدا کرتے تھے۔ ”ان دونوں میں خوبیاں اور خرابیاں  
یکساں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کرتا سنگھ کی کار پر دازی اُس کی خوبیوں کو بڑھاتی ہے اور توتا سنگھ کی کار گری  
اُس کی خرابیوں کو۔“

اُن کو کتنے ہنروں پر ملکہ حاصل تھا لیکن وہ کہتے تھے، ”میں سکھ رہا ہوں۔“ اُن کے کھر درے  
ہاتھ کسی خوبصورت چیزیں تخلیق کرتے تھے! وہ میرے بچپن میں میرے چہرے کو سہلاتے، اُن کے سخت  
ہاتھ میرے کو مکمل ماس میں چبھتے اور مجھے بُرے لگتے۔ میں اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑتا، سامنے  
پھیلاتا اور استفسار کرتا۔

”تایا جی، یہ کیا ہے؟“

”میں گٹوں کو چھو کر اُن کی سختی پر حیران ہوتا۔“

”محنت کے پھول ہیں!“

وہ گٹوں کو دیکھ کر میری طرف دیکھنے اور مسکراتے۔

”پھول نرم ہوتے ہیں اور پودوں پر لگتے ہیں؟“

”میں اُن کی بات پر شک کرتا اور وضاحت چاہتا۔“

”محنت کے پھول سخت ہوتے ہیں اور ہاتھوں پر لگتے ہیں!“

اُن کا چہرہ ایسے روشن ہو جاتا جیسے وہ کوئی دل پریر چیز دیکھ رہے ہوں۔

”یہ پھول نہیں، گٹے ہیں!“

”میں اپنی سوجھ بوجھ کی روشنی میں اپنی بات منوانی چاہتا۔“

”یہ پھول ہی ہیں، محنت کے پھول! تم بڑے ہو گے، ہنر ور بنو گے تب میری بات سمجھو گے۔ یہ ایسے پھول ہیں جن کا ثمر ہنر ہے۔“  
وہ اُن ٹھنڈے نما پھولوں کی اصل بیان کرتے۔

میں چاہتا کہ میں اُسی وقت بڑا ہو جاؤں اور وہ سب کچھ جان جاؤں جو تایاجی جانتے تھے۔ وہ بے نظیر تر کھان، لوہار، معمار، کاشت کار۔۔۔۔۔ حکیم تھے۔ وہ جو کام کرتے تھے، اُسے دیکھ کر رشک آتا تھا۔ دراصل وہ صیقل گرتے جو اپنی نکتہ رسی اور طرح نوے معمولی سے معمولی چیز کو سنوار کر نفاست کی نظیر بنا دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھ متحرک ہوتے اور وہ ہر حرکت پر جسے اختراعیت، تجدیدیت، نزاکت۔۔۔۔۔ سے نسبت ہے، ظہور مقصود کی آئینہ دار ہوتی۔ وہ لوہے کو ٹھوک بجا کر پرکھتے اور اُس کی افادیت کے لحاظ سے اُسے برتتے۔ اُسے ضروری شکل میں بدلنے کے لئے کتے تاؤں کی ضرورت ہے، اُس کا اندازہ وہ شروع ہی میں لگاتے اور اُس سے کم تاؤ دینے کی کوشش کرتے۔ اس میں باریک نقطہ یہ ہے کہ لوہا جتنی زیادہ بار گرم کرواؤں گا ہی زیادہ بھڑکتا ہے اور اپنی اساسی خوبی زیادہ گنوا تا ہے۔ لوہے کو گھٹن سے کوٹن مقصود ہوتا۔ وہ گھٹن بردار کو اپنی ہنرور سے چوٹ کی نشاندہی اور صمیم شدت کا اشارہ کرتے تاکہ وہ ٹھیک چوٹ لگائے اور تال میل برقرار رکھے۔ گرم لوہا ٹھنڈا ہونے لگتا اور اُن کا اشارہ ہلکے سے ہلکا اور پھر ساز کی جھنکار کی طرح ڈوبتے ڈوبتے ڈوب جاتا۔ کئی اوزار وہ خود بناتے اور انھیں زنگ سے بچانے کے لئے سیاہ تاب کرتے۔ وہ اُن کی دھار لگاتے۔ آبر میں دھار کی جھلک، بڑق کی لپک کی طرح نظر آتی۔ وہ اوزار خوبی میں شیئنے کے اوزار کا مقابلہ کرتے تھے۔ اُن کا یقین تھا کہ جو کاریگر اوزار بنانے اور مرمت کرنے کا فن نہیں جانتا، وہ فن کی باریکیاں نہیں پاسکتا۔ اپنے سوہان، وہ آپ ٹکا کرتے تھے۔

برتن اور اوزار کی بدیہی خوبصورتی اپنی جگہ نشاط انگیز ہے لیکن وہ اوزار کی اندرونی خوبی ہے جو اسے برتن سے الگ کرتی ہے۔ وہ عمدگی گرم اوزار کو پانی میں بجھانے سے حاصل ہوتی ہے۔ کم بجھانے سے اوزار نرم رہتے ہیں اور سخت کام کے آگے ٹھہر نہیں سکتے ہیں۔ زیادہ بجھانے سے اوزار شیشے کی طرح بے لوج اور خستہ ہو جاتے ہیں اور دھار قائم نہیں رکھ پاتے ہیں۔ تپائے ہوئے اوزار کو پانی کی نمی تلی مقدار ملے بھی فولاد اپنے جوہر کو اوزار میں منتقل کرتا ہے۔ اُن کے آب دینے کے عمل کو میں نے غور سے دیکھا تھا۔ وہ گرم اوزار کے منہ کو آہستہ آہستہ پانی کے قریب لاتے اور اُسے پانی پلا کر فوراً اٹھا لیتے۔ اس طویل عمل میں اُن کی دُھی چھوٹی سی حرکت عین منتہائے کمال ہوتی جو اوزار کے خاطر خواہ

جمال کا باعث بنتی۔

وہ کسی کام کو دوبارہ کرنے کے سخت خلاف تھے۔ اُن کا اصول تھا کہ کام پہلے ہی ہاتھ میں ٹھیک ہونا چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک کام خراب ہونے سے سو کام خراب ہوتے ہیں۔ ایک بار میں نے پوچھا، کیسے؟ وہ بولے، اس لوہے کو لو۔ اسے کان سے کھودا گیا، اٹھایا گیا، کارخانے میں لے جایا گیا، ڈھالا گیا اور کاٹا گیا۔ یہ اور کتنے ہاتھوں اور عملوں سے ہو کر مجھ تک پہنچا ہے۔ میں اپنی بے ہنری سے اسے خراب کر دوں تو میں کتنے لوگوں کی محنت کا جواب دہ ہوں۔ فطرت کا کارخانہ ایک خزانہ ہے، اسے سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہیے۔

عام طور پر کاریگر اپنے آؤزار ایک پیٹی میں رکھتے ہیں جیسے کسان ٹوکری میں آلو، پیاز۔ تایا جی کے پاس آؤزار کے لئے باقاعدہ صندوق تھا جس کے آٹھوں کونے پیتل کے کلیٹوں سے مڑھے ہوئے تھے۔ جس دن وہ انھیں نمک اور نیبو سے صاف کر کے راکھ سے چمکاتے، وہ سونے کے ٹکڑے لگتے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کے پاس چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے وقت تھا۔ صندوق کا تالا تنھے کے اندر تھا جس کا منہ، مکھ پان کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ صندوق کا ڈھکن اور اُس کا قبضہ لمبائی میں برابر تھے۔ اُس کی چاروں دیواروں اور ڈھکن کے اندرون تسے لگے ہوئے تھے جن میں وہ دھار والے آؤزار ٹانگ کر رکھتے تھے اور دوسرے آؤزار فرش پر ترتیب سے قطاروں میں۔ صندوق کھولتے ہی ہر آؤزار اپنی مخصوص جگہ پر ایسے نظر آتا جیسے حکیم کے مطب میں ہر دوا کی شنشی۔ اُسی طرح اُن کا پر بیگوں (کیلوں) کا بس تھا جس میں ہر ساز کی پریگیں الگ الگ خانے میں رکھی رہتی تھیں۔ وہ کام کر کے ہٹتے، آڈے پر اِحتیاطاً چمک پھیرتے اور گری پڑی پریگ اٹھا کر وہاں رکھ دیتے جہاں اُس کی جگہ ہوتی۔ اُن کا وہ چمبک میرے بچپن کا بڑا ہی پیارا کھلونا تھا۔ صندوق کے سامنے کی دیوار پر ایک آنکڑا لگا ہوا تھا جس میں چوٹا لگا کر وہ آؤزار کے دم کی آخری دُستی کرتے تھے۔

اُنھوں نے میرے لئے چاقو بنایا۔ پھل پر اگر کام رک گیا۔ اُن کے پاس لوہے میں چھید کرنے کا براہ نہیں تھا۔ ویسے تو سنبے سے چھید ہو سکتا ہے لیکن بالکل گول چھید برے ہی سے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے پُرانا تیکونا سوہان لیا اور اُس سے برا بنانا شروع کیا۔ کام کٹھن نہ تھا، وقت کھپاؤ تھا۔ اُنھوں نے دھڑے کا مپ لے کر سوہان کے ضلع کا ناپ نکالا اور مجھے اُس کام پر لگا دیا۔ پھر کیا تھا! جب تک میں نے سوہان کو رگڑ رگڑ کر حسبِ ضرورت نہ بنالیا، بتھری سے سر اوپر نہ اٹھایا۔ اُس میں مجھ کا کام اور تھا جس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ اُنھوں نے اُس کے سرے کو نئے زوایے پر رگڑا کر اُس میں سے عموماً نوک نکالی اور یوں کو

میں چھید ڈالنے کا برما بنایا۔ باقی کام بھی خیال خیز تھا لیکن وقت لیوا نہیں تھا، انہوں نے ایک چوکور لکڑی میں گول چھید کیا اور اُس میں برے کو ٹھوکا۔ چوں کہ چھید، دائرے میں برے سے کم تھا۔ اُس نے اُسے تیکون میں بدل دیا۔ اُنھوں نے لکڑی شکنجے میں پکڑ لی، برے پر ہلکی سی چوٹ لگائی اور یوں برے کے زائد حصے کو توڑ کر الگ کر دیا۔ اُنھوں نے لکڑی کو تیشے سے پھاڑ کر اُس میں سے برما نکالا، اُسے کمافی میں جڑا، پھل میں جہاں چھید ڈالنا تھا وہاں مٹے سے نشان پٹکا کیا، چھید ڈالا، برما اٹھایا اور دھڑا لگایا۔ اُنھوں نے دستے میں دھڑے سے کم قطر کا چھید کیا تھا۔ اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ دھڑا اپنی جگہ جم گیا اور اُس پر ٹوپی بٹھانے کی ضرورت نہ پڑی۔ اُنھوں نے اُسے گھما پھرا کر دیکھا۔ اُس کی روانی کہہ رہی تھی کہ اُس میں نہ ٹٹک ہے اور نہ ہی پکڑ۔ میں نے اپنی بے قراری میں چاقو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا، اُنھوں نے کہا، ”درا ٹھہرو! اس میں کچھ اور ضروری کام ہے۔“

”کیا ضروری کام ہے؟“ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔  
 ”تھوڑا صبر کرو اور دیکھو!“

اُنھوں نے ایک تینکالیا، اُس کے ایک سرے سے موبل آئیل اٹھایا، دھڑے پر گر لیا، پھل کو زامایا اور بند کر کے مجھے دے دیا۔ میں چاقو لے کر بہت خوش ہوا اور پھر اُس سے زیادہ حیران، جب اُنھوں نے کہا، ”اسی کام کو سانچے سے کرنے سے اتنے وقت میں درجن چاقو بنائے جاسکتے ہیں۔“ وہ لکڑی سونگھ کر، یا چھیل کر، یا ایک سے ایک ٹکڑا کر اُس کی قسم پہچان لیتے تھے۔ مکان کے لئے وہ میسر کی لکڑی کو سب سے اتم مانتے تھے، دوسرے درجے پر کیکر کو، تیسرے درجے پر ساگون کو اور چوتھے درجے پر شیشم کو۔ اس کے باوجود وہ کالی شیشم کو سونا کہتے تھے اور رکھانی کے کام کے لئے نہایت موزوں سمجھتے تھے۔ میسر اور کیکر کی لکڑی میں ایک کیسلاین ہوتا ہے جو اسے دیمک اور گھن سے بچاتا ہے۔ تنھانیدار نے اپنے نئے گھر کے لئے میسر کوٹایا جس کا عمدہ تروجن سنگھ اور کرتار سنگھ نے چیرا۔ لکڑی سوکھنے پر دروازے اور کھڑکیاں بنانے کا کام اُنھیں کو سونپا گیا۔ کام پر جانے کے لئے وہ اوزار اکٹھے کر رہے تھے کہ تایا جی نے اُن سے کہا، ”میسر کی لکڑی کڑوی ہوتی ہے۔ کام کرتے وقت اڑتی ہے اور خارش پیدا کرتی ہے۔ تم روئی کے پچا ہے اور ڈھالے باندھ کر کام کرنا ورنہ چھینکتے چھینکتے مر جاؤ گے۔“

”اُسے چیرنے وقت ایسا کچھ نہیں ہوا تھا!“

کرتار سنگھ نے اپنے تجربے کا خلاصہ بیان کیا۔

”کڑیاں اور تنختے گیلے تھے سے چیرتے ہیں، جن کا برادہ نہیں اڑتا۔“

تایا جی نے اُسے گیلے اور سُکھے برس کے رویے میں فرق بتایا۔  
”کچھ نہیں ہوتا، چلو! دیکھا جائے گا۔“

اُن دونوں میں سے تریوچن سنگھ ہٹلا تھا۔ اُس نے کرتار سنگھ کو ٹھوکا دیا اور اُن ضروری چیزوں کے بغیر کام کرنے چلے گئے۔ وہ کام کرنے لگے اور چھینک چھینک کر بے حال ہونے لگے۔ تریوچن سنگھ چپکے سے آیا اور پچھا ہے اور ڈھالے لے گیا۔

تایا جی کے حافظے کا پورا گاؤں قائل تھا۔ ہار مھی ہو کر ساوئی، پٹواری اُن کے پاس آتا اور وہ جہاں بیٹھتے ہوتے وہاں خسرہ لے کر بیٹھ جاتا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے پورے گاؤں کی گرداوری (ہر فصل پر پٹواری کھانا کرتا ہے کہ کون سا کھیت کس نے بویا ہے اور کیا بویا ہے) کر دیتے۔ کھیتوں کے رقبے انھیں کھتونی کے مطابق یاد تھے۔ کوئی پوچھتا کہ فلاں کھیت کے لئے فلاں بیج کتنا درکار ہے؟ وہ اُسے یوں بتا دیتے جیسے وہ اعداد و شمار اُن کی نوک زباں پر ہوں۔

راج کل آہرن کے لئے فٹ بھر موٹی لہے کی سلاخ لایا۔ وہ لمبائی میں بڑی تھی اس لئے کام میں لانے کے لئے زمین میں گاڑنی ضروری تھی۔ تایا جی نے اُسے رائے دی، ”اسے گاڑنے کیوں ہو؟ کاٹ کر دو بنالو۔“

”واہ، یہ لکڑی ہے کہ اسے کاٹ کر دو بنالوں! اسپت ہے، اسپت! وہ مسکرایا اور تفصیح پر پیر پہچے میں بولا۔

”اسپت، لکڑی سے آسانی سے کٹتا ہے! تم لوہار ہو اور خود ماہر ہو، ایسا کیوں کہتے ہو؟ انھوں نے فنکارانہ انداز میں کہا۔

”یہ لکڑی سے آسانی سے کٹتا ہے! اس میں سے ایک آہرن اپنے لئے کیوں نہیں کاٹ لیتے؟“

”تمہاری ہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے!“

راج کل معمولی کاریگر نہ تھا۔ اُس کی ساری عمر آہن گری میں گزری تھی۔ وہ خان قلات کی ورکشاپ میں فوریمن تھا اور خود کو فلاطون کا استاد سمجھتا تھا۔ ویسے وہ ایسا دیوانہ تھا، ماہر فن تھا۔ تقسیم وطن کے بعد اُس پر روزگار تنگ ہو گیا اور وہ ممنوع ہتھیاروں کا کاروبار کرنے لگا۔ اُس نے تایا جی کا لوہا مانا تھا تو مضائقہ نہ تھا۔

اُس کی تیز فہمی کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ جسے میں نے اُسی کی زبانی سنا تھا۔ ”میں نے بارہ بگھ



کو بارہ بور کا پستول بنا کر دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نہ اُسے پستول چلانا آتا تھا اور نہ ہی مجھے۔ وہ جند کرنے لگا کہ میں اُسے پستول چلا کر دکھاؤں ورنہ بیعانہ واپس کر دوں۔ میں پورے بیعلنے کا دارو پی چکا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا! میں اُسے کانگو ہی کے بانگوں میں لے گیا اور ایک ایسا پیٹر تلاش کیا جو میرے کانڈے کے برابر دوشلخے میں بدلا ہوا تھا۔ میں نے کارٹوس بھرا، گھوڑا پیچھے ہٹایا، پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑا دوشلخے میں رکھا اور تنے کی آرٹ میں جھک گیا۔ بارہا سنگھ میرے پیچھے کھڑا تھا اور بے قراری سے بار بار پوچھتا تھا، کیا دیر ہے؟ جلدی کرو! مجھے حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ گھوڑا دباؤں۔ اُسی کشمکش میں میرے دل میں خیال آیا کہ اگر پستول اٹھا چل گیا اور میرا ہاتھ جاتا رہا تو میں کیا کروں گا؟ اپنی روزی کیسے کماؤں گا؟ میں نے جھٹ کھیتے ہاتھ میں پستول لیا اور داغ دیا۔ گولی ہی جانے کہ وہ کدھر گئی! بارہا سنگھ گرجدار آواز سن کر خوش ہو گیا۔ وہ پستول لے گیا اور پیازوں کا ٹوکرا مفت دے گیا۔

تایا جی کی ہنر میں نظر بڑی خیال آراتھی۔ ”ہنر ماورائے ادراک ترنگ کی حقیقت ہے۔ یہ گوش رس، دیدہ رس، احساس رس لطافت کا طریق ظہور ہے، جو غائب کو حاضر سے ملاتا ہے۔ حالانکہ جیہ کانی حرکت سے پیدا ہوتا ہے، یہ اپنے وجود میں روحانی ہے۔ چوں کہ یہ جالیاتی قدروں کا داعی ہے، یہ ہر ادنیٰ چیز کو اعلیٰ بنانے اور اُس کی کایا پلٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“

وہ اپنے فانی، ہتھوڑے، چھینیاں، سنسیاں راج مل کے لوہار خانہ میں لائے اور ایک کٹھوری میں موہل آئیل۔ اُس کام کے لئے اُنھیں گھن کی بھی ضرورت تھی، راج مل نے اپنا گھن دیا۔ اُنھوں نے اُس کے پھل اور دستے کا معائنہ کیا اور اُسے رہنے دیا اور مجھ سے اپنا گھن منگوایا۔ اُس گھن کا پھل راج مل کے گھن کے مقابلے میں سپاٹ تھا اور دسہ لمبا۔ تایا جی کے آواز میں سے چھینیاں قابل ذکر ہیں۔ چار اینچ لمبی، ایک اینچ چوڑی چھینوں کے دم، منہ سے لے کر ستر تک بلے تھے۔ دم کو منہ سے سر کی سمت متوازی پھرنے سے خط کے دونوں اطراف ساڑھے سات ڈگری کا برابر زاویہ بنے۔ میں اُن چھینوں کی باڑھ کو کیسے بیان کروں؟ وہ نہ تیشے کی طرح تیز تھی اور نہ ہی پھانے کی طرح ٹھس، ان دونوں کے درمیان ایک لکیر تھی۔ ہاڑھی قریب تھی اور لوہار خانہ میں کسانوں کی بھیڑ تھی جسے دیکھو اپنی ہانکتا تھا اور گھوم پھر کر اسی نتیجے پر آتا تھا۔ اتنی موٹی سلاح کا نٹی ناگھن ہے! اور وہ بھی چھینی سے!

”اسے نئے طریقے سے کاٹتی ہے، موہل آئیل سے!“

رام سنگھ نے پھبتی کسی کچھ لوگ ہنس پڑے اور اُس کا جملہ دہرائے لگے۔

”ٹھیک ہی تو ہے! یہ موہل آئیل ہی سے کاٹتی ہے۔ سب کے سامنے، یہیں! آپ لوگ

دیکھتے رہیے۔ جہاں حرکت ہے، وہاں پُرزہ ہے اور جہاں پُرزہ ہے، وہاں چکنائی ہے۔

انھوں نے اُس کی بات ایسے دہرائی جیسے تحقیق اور صلح جوئی اُن کے ہنر کی نشیبت ہو۔

وہ کام کرتے ہوئے خاموش رہتے تھے لیکن غور کرو تو بولتے محسوس ہوتے تھے۔ اُن کا روپ

مڑوپ، روم روم، انگ انگ۔۔۔ اپنی زبان آپ تھا۔ اُن کی نقل و حرکت موسیقی تھی جو انھوں سے سننی جاتی تھی۔ میں نے انھیں لکڑی خرا دتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُن کے پاس نہ کوئی نقشہ ہوتا تھا اور نہ کوئی نمونہ لیکن وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں اور آنکھوں اور آواز کی مدد سے لکڑی میں سے جیسی شکل نکالتے، اُسے دیکھ کر چھوٹے کوچی چاہتا۔ وہ جس آسانی سے لکڑی کی لمبائی اور چوڑائی اور گہرائی کو کھولتے، اُس سے لگتا کہ وہ شکل وہاں پہلے ہی سے موجود ہے جس کی رونمائی کے لئے انھوں نے صرف بھرتی ہٹائی ہے۔

فطرت اس لئے خوبصورت ہے کہ رواں دواں ہے اور محو تخلیق بھی۔ اس لحاظ سے ایک

فن کار ہی ہے جو فطرت کا ہم صفت ہے۔ اس کے تخلیق لمحوں میں اسے دیکھنا سہانے اور تھرکتے منظر کا نظارہ کرنا ہے کیوں کہ اُس وقت یہ عام زندگی سے زیادہ ثابت اور سیار ہوتا ہے۔

تایاجی نے سلاح کا واسطہ شمار کیا، کوئلے سے اُسے محیط پر بٹھایا اور بستے سے پکا کر دیا۔ ادھر انہوں نے سنسی میں جھینی اٹھائی اور ادھر ان کی چند نے ہتھوڑا سنبھالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے اعضا اور کام میں وہ تال میل آگیا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ہر ضرب کے بعد وہ جھینی اٹھاتے، سلاح کھٹاتے، جھینی کا منہ تیل میں ڈباتے اور اُسے اٹھا کر سلاح پر رکھتے۔ ہتھوڑے کے اوپر اٹھنے اور جھینی پر برسنے کا وقفہ، دل کے دھڑکنے کی طرح تھا جو ایک مخصوص لمحے میں اپنا عمل نہ دہرائے تو نظام عناصر انتشار کا شکار ہو جائے۔ مبادا جھینی زیادہ تیل لے اُٹھوں لے کوڑی میں ٹاٹ کا ٹکڑا رکھ دیا۔ ٹاٹ اٹھا اچ لہری ہونے پر انہوں نے جھینی رکھی، سلاح کھٹائی اور دائرے کا وہ حصہ اوپر لایا جسے خاص منہ بے کے تحت کھڑا کھا تھا۔ اب انہوں نے فانا اٹھایا۔ اُس کے منہ اور گالوں پر تھوکا اور الٹ پلٹ کر مٹی میں رگڑا۔

ہمارے پاس آواز پوجنے کی یرم پرا (روایت) ہے۔ آواز پر تھوکنا اس کی پوتر تاجنگ کرنا ہے۔ میں اُسے کاریگر نہیں مانتا جو آواز کی بے حرمتی کرتا ہو۔

رام سنگ خاندانی لوہار تھا۔ وہ تایاجی سے محاسمت رکھتا تھا اور انھیں نیچا دکھانے کی تاک

میں رہتا تھا۔ دیکھنے والوں میں وہ موجود تھا، اُس نے اُن پر الزام لگایا۔ اُس کا بے ساختہ لہجہ اس بات کی چٹلی کھاتا تھا کہ اُسے کام کے بننے سے زیادہ بگڑنے میں دل چسپی ہے۔

”اور کچھ؟“ تایاجی نے اُس سے سوال کیا۔

اُن کے مزاج کی خصوصیت تھی کہ وہ کہنے والے کی پوری بات سنتے تھے اور اُسے کاٹتے نہ تھے

اُن کی توہمیں اُن کی خاموشی اس فراست کی گواہ تھی کہ فطرت کا خاموش ضمیر اُس کے تخلیقی وجدان کی سنجیدگی کا ردِ عمل ہے۔

”اتنا کیا کم ہے؟ اور۔۔۔“

اُس نے حسبِ عادت بات بڑھانی چاہی لیکن دریاہ سنگھ کی کہنی کھا کر چپ سا دھلی۔  
”جیسے جلا ہے کاٹھوک اُس کے لئے سریش ہوتا ہے ویسے ہی کاریگر کا ٹھوک، جنتر۔  
جنتر کا وقار اسی میں ہے کہ اسے ٹھیک طور سے استعمال کیا جائے۔“

اتنا کہہ کر وہ رک گئے اور فانی کی طرف دیکھنے لگے جیسے اپنے خیال کے بارے میں اُس سے  
کچھ پوچھ رہے ہوں۔ پھر بھرے پُرے بچے میں بولے، ”کاریگر کا ہنر، کاریگر کی پہچان ہے۔ یہ نہ کسی کی  
تصدیق کا مَرہونِ احسان ہے اور نہ ممنونِ بنیاں کیوں کہ یہ اپنا صداقت نامہ آپ ہے۔ دھرتی پر صرف  
انسان کا کینہ ناپاک ہے! دوسری ہر شے اپنی جگہ پاک ہے۔“

انھوں نے فانی پر پھر ٹھوکا، مٹی میں رگڑا، اٹھا کر سلاخ پر مار کر فاضل مٹی بھاڑی اور اُسے  
اُن کٹ گھیرے کے ایک طرف لگایا اور اُسی طرح دوسرا فانی دوسری طرف۔ فانی کاٹ میں جم گئے تو آجی چند  
نے گھن اٹھایا۔ وہ ایک چوٹ اس فانی پر لگتا اور دوسری اُس پر۔ چند بھر بھڑچوٹیں لگا کر وہ گھن پیچھے  
رکھ کر سلاخ پر جھکا اور اُسے اُسی طرح پکارنا امید سا ہو گیا۔ اُس کی مایوسی سے فانی اٹھا کر تماشائی آگے بڑھے  
اور سلاخ کی مضبوطی کو سراہنے ہوئے تایا جی کو ایسے دیکھنے لگے جیسے اُن کی ناکامی پر دل ہی دل میں ہنس رہے  
ہوں۔ تایا جی جوش سے اٹھے، اُنھیں پرے دھکیلا اور آمی چند کی ہمت بندھاتے ہوئے اونچی آواز میں بولے  
”جوانا! پہاڑ توڑنے کے لئے پہاڑ کی سی ہمت چاہیئے! ایک کراری تڑی دے!“

آمی چند نے گھن اٹھایا، اُس کی مرضی میں نئی سرگرمی تھی۔ وہ لہک کر چوٹ کرتا جیسے سلاخ کو  
دھمکاتا۔ سلاخ زمین کے اندر دھنستی دھنستی ٹرک گئی تھی جیسے چوٹ کا مقابلہ اپنی ہٹ سے کر رہی ہو۔  
ناگہاں ایک چوٹ کی آواز بدل کر آئی گویا سلاخ کی طرف سے اعلانِ تسلیم گئی۔ آمی چند نے پینوں پر پھل  
کر گھن لہرایا اور کچکچا کر بولا، ”چل بھی پیاری!“

اُدھر وہ دار نہوا اور ادھر سلاخ ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی۔

واہ واہ کا شور اٹھا۔ وہی لوگ جو گھڑی بھر پہلے بدن اور طنزاً خوش نظر آ رہے تھے،  
اُس کام کو نا ممکن سمجھ رہے تھے آپس میں ہاتھ ملانے لگے جیسے اُس کا میابی کا سہرا اُن کے سر ہو۔  
تایا جی لسانِ الدہر تھے اور ایسی باتیں کرتے تھے جو وقتی نقاضوں اور سماجی مشکلوں کا کھرا حل

تھیں۔ وہ کہتے تھے، ”عام آدمی کے لئے سچ کا متقابل جھوٹ ہے اس لئے کہ سچ پر کھنے کے لئے ہنروری کی ضرورت ہے اور عام انسان اس لیاقت سے بیگانہ ہے۔ ہنرور کے لئے سچ کا متقابل سچ ہے جس کا دوسرا نام ہنر ہے۔ کہاں اور کب کون سا ہنر کام میں لانا ہے یہ ہنرور کی ضرورت ایجاد پر موقوف ہے۔ اوزار اور ہنر میں حرکی توازن ہے اور یہی ان کے نشوونما کا راز ہے۔ اوزار جڑ تھیل ہیں! اوزار سمت الاراس کی دلیل ہیں! اوزار نوع انسان کی بہبودگی کے کفیل ہیں۔ اہل مذہب کے ادعا کے برعکس انسان کے جسم میں روح نام کی کوئی چیز نہیں ہے جسے کہ بچایا جائے کسی کو بچانے کی ضرورت ہے تو وہ ہنرور ہے کیوں کہ اس کا ہنر وقت کا تسلسل ہے اور اس پر آنے والی نسلوں کا قرض۔ ہر دور کا ہنرور وہ راہ ہے جو آئندہ نسل کے لئے زندگی کی نئی راہ دکھاتا ہے اور تاقدارِ امکان اسے قابلِ سفر بناتا ہے۔“

اوزار ایجاد کرنا ان کی صلاحیت کی اُتج تھی اور انھیں صاف، سرتیز رکھنا ان کی ضرورت کی مصلحت۔ وہ کہتے تھے، ”خوب صورتی تاحید خوب صورتی، بد صورتی کو نمایاں کرتی ہے۔ یہی خوبی ہنرور کی بھی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ اپنے آپ کو عوام الناس سے الگ نہ کر سکتا۔ جس طرح خوب صورتی کی زندگی خوب صورتی سے ہے اسی طرح ہنرور کی زندگی ہنر ہے۔ خوب صورت اوزار ہنرور کی مہارت کی شہادت ہے اور دماغی چوکسی کی علامت۔ کچ دماغ تخلیق کرنے کے نااہل ہوتا ہے اور جو اس خوبی سے ناچار ہے، نظام انسان میں اس کی ہستی بے کاسب ہے۔ اس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔ فطرت اور ہنرور کا تخلیقی رویہ ہی ان دونوں کی ہمیشگی کا ضامن ہے۔ نازک فرق یہ ہے کہ فطرت کی تخلیقی یکسانیت اس کی خوبی ہے اور ہنرور کی ہنری یکسانیت اس کا انحطاط۔ ہنرور پتے در پتے بہتر سے بہتر تخلیق کرتا ہے اور یوں اپنے تخلیقی رجحان کو نازہ دم رکھتا ہے۔ جو کوئی اس منطرح حیات کو نہیں سمجھتا، ہنرور کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔“

راج مل کی قدر شناسی میں آگہی کا جزو تھا۔ وہ اٹھ کر سلاح کے ٹیکڑوں کے پاس بیٹھ گیا اور ان کا معاہدہ کرنے لگا۔

”سادھو سیال! دائرے کے ادھار رنج نہ کاٹنے کی وجہ کیا ہے؟“ اس نے سلاح کے اس حصے پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا جو پوری کاٹ میں سے الگ نظر آ رہا تھا۔

”یہ ہوتی ناں بات!“

انھوں نے اس کی بیٹھ ٹھونکی گویا اس کے تحقیق طلب رویے کی داد دی۔

”اس کام میں یہی ٹکتہ ہے! تم نہ بھی پوچھتے تو میں تمہیں ضرور بتاتا۔ یہ حصہ کاٹ دینے سے فائدہ لانے کے برعکس چھیننے کا کام کرتا اور دو فائدے ایک ساتھ نہ لگائے جاسکتے۔ سلاح خانوں کے دباؤ سے ٹوٹی

ہے نہ کہ چھینی کی کاٹ سے۔ کاٹ نے اتنا کام کیا ہے کہ درز کو سیدھ دکھائی ہے ورنہ سلاخ ٹیڑھی ٹوٹ سکتی تھی۔

وہ کہتے تھے کہ فاضل ٹھیک جگہ لگانے سے پہاڑ کو پھاڑا جاسکتا ہے۔

وہ ایسے ہنر ور تھے جو ہنر کی باریکیاں چھپاتے نہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہنر ہی ایسی دولت ہے جو بانٹنے سے بڑھتی ہے۔ انھوں نے راج کل سے لاڈ سے کہا، ”میرے کل! میں ایک بات تجھے اور بتاتا ہوں۔ فاضل کو مٹی لگانے کا مطلب یہ ہے کہ چھینی کی کاٹ کے اطراف کی کنارے شیشے جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سے فاضل پھسل کر اچھل سکتا ہے۔ مٹی نہ لگانی ہو تو کتاروں کو بھینے سے گھبرا کر لینا چاہیے۔“

وہ ہر کام کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ زندگی سے ان کا رویہ فطرت کی تقلید تھا، ”فطرت کے حُسن دوام کا راز یہی ہے کہ فطرت معتقدِ جمال ہے۔ یہ اپنے ہنر کی پیروی میں مجر و مکمل کا خیال رکھتی ہے اور جسے اُس کے جمال تک پہنچانے میں ناکام رہتی ہے۔ اُسے بے تکلف تلف کر دیتی ہے۔“

اور یہ طرزِ حیات اُن کی بڑائی تھی کہ وہ کسی سے بلا ضرورت کبھی کچھ نہ لیتے تھے۔ وہ راج کل کی ٹیٹھ ٹھونک کر چلے آئے اور اپنے جھٹے کی سلاخ اُسے دے آئے۔

”سادھو بیاں! تجھے سلاخ کا ادھا حصہ نہیں لینا تھا تو اُسے کاٹا کیوں تھا؟ اس کا روبرو میں تجھے کیا ملا؟ بوٹا سنگھ نے حیران ہو کر اُن سے پوچھا۔

”نہی خود آگئی!“ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

”نہی خود آگئی؟“

بوٹا سنگھ کو کچھ اور نہ سوچا اور اُس نے اُن کا جواب، سوال کی طرح دُہرایا۔

”اتنی بڑی سلاخ میں نے پہلے کاٹی نہ تھی۔ مجھے خیال تھا کہ ایسے کاٹی جاسکتی ہے۔ راج کل نے مجھے موقع دیا تبھی میں اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا سکا۔ ورنہ میرا خیال، خیال ہی رہتا اور مجھے اس کی پچائی ناسچائی کا علم نہ ہوتا۔ اپنے خیال کو ہنر کے درجے تک پہنچانے کے لئے میں، اُس کا احسان مند ہوں۔ میں ادھی سلاخ لے آتا تو اُس کا احسان کیسے چمکاتا؟“

انھوں نے اپنی بات کھول کر بیان کی تو اُس کی عملی اور اخلاقی حجت بھی سامنے آگئی۔

”اپنے ہنر کو چھپا کر رکھنا چاہیے! تم نے اُسے باریکیاں تک بتا دیں۔“ بوٹا سنگھ اپنی بات پر اُٹرا اور اُس نے انھیں تاڑنے کے سے انداز میں بتایا۔

ایک چراغ دوسرے چراغ کو جلاتا ہے تو اس کا اجالا کم نہیں ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر دنیاوی اثاثے کو پانے کی خوشی عارضی اور خود کو پانے کی دائمی ہے۔ کسی نئے ہنر کا پانا اپنی تجدید کرنا ہے۔“  
 انھوں نے احساس سے جھلکتے ہوئے کہا ہم آواز سن بھال کر گھر جانے لگے لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ بے سرو پا، بے فیض، بے پیرا۔

میں نے کتنے ایسے ہنرور دیکھے تھے جو کام جانتے تھے لیکن اُس کی فنی باریکیاں نہ بتا سکتے تھے۔ ”یہی دست کار، ہنرور کے مرتبے کو پہنچتا ہے جو عمل کے ردِ عمل کو سمجھتا ہے۔ ردِ عمل کا تجزیہ ہی باعث ارتقاء ہے۔“ وہ ہنروروں کو دنیا کے ہر خیال کا موجد مانتے تھے اور جس طرح انھیں پیغمبروں اور اوتاروں پر فوقیت دیتے تھے وہ انھیں کا سختی ہے۔ ہنرور اور پیغمبر میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ہنرور اپنے خیال کو عملی جام پہنا کر اُس کے صحیح ہونے کی ذمہ داری نبھاتا ہے جب کہ پیغمبر اپنے خیال کو فرض بنا کر مسلط کرتا ہے۔ وہ خیال پرستی جو اپنی سچائی کی ضمانت دے سکے، وہم پرستی ہے۔ اور وہم پرستی، خود کشی سے زیادہ مہلک ہے کیوں کہ اس کا حلقہ اثر، ذاتی ہوتے ہوئے سماجی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا ترکہ بلا وصیت نامہ ہے جو دریا کو ان کے حصے سے زیادہ ملتا ہے۔“

وہ کہتے تھے، ”سماجی قدروں کی یکساں روی کا نام اخلاق ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ ہنر، زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کا اگر کار ہے اور مسلسل کاوشوں کے سلسلے کی پے در پے تجدید۔ اس کے تشویشی و توضیحی پہلویت نے رُجوانوں کو جنم دیتے ہیں اور اپنی ترقی کی تیزی بنتے ہیں۔ ہنرور ایک بار ناکام ہو سکتا ہے، دوبار ناکام ہو سکتا ہے بلاخر کامیاب ضرور ہوگا۔ ناکامی، کامیابی کا سراغ ضرور دیتی ہے۔ سوچو تو ناکامی ہی کامیابی کی سیڑھی ہے۔ فطرت اور ہنرور مستقبل ہیں لیکن وہ ہنرور ہے جو حسنِ فطرت کو آئینہ دکھاتا ہے اور اُس پر اپنی برتری جتاتا ہے۔“

میرے بچپن کی بات ہے، وہ میلن خرا در ہے تھے اور میں پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرا شوق مجھے یقین دلانا تھا کہ میں اُن سے بہتر خرا در ہوں۔ وہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور میں وہاں اکیلے رہ گیا۔ میں خرا در پر جا بیٹھا اور اپنا خام ہنر آزمانے لگا۔ مجھے جس تریل ہنر کا خیال تھا وہ ممکن نہ ہوا، لہذا میلن کیا سے کیا ہو گیا میری آنکھیں مجھے میری غلطی بتا رہی تھی لیکن میرے ہاتھ اُسے درست کرنے میں ناکام رہے۔ اتنے میں وہ واپس آئے اور سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں ڈر گیا اور اُٹھ کر بھاگا۔ انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور پچکار کر کہا، ”ادھر بیٹھ، میرے پاس! میرا ڈر ایک دم جاتا رہا اور میں اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے میرا لگاڑا ہوا کام سنوارا، میلن کو چوب میں اُلٹ کر لگایا اور اُس پر کام کرنا شروع کیا۔ وہ رکھائی کو مسلسل دباتے ہوئے اچانک اُٹھاتے جیسے

لکڑی انھیں اپنی حقیقت سمجھاتی ہو اور ساتھ ہی ساتھ ہدایت بھی دیتی ہو۔ لکڑی چوب پر تھکر رہی تھی جیسے اپنے بدلے ہوئے روپ کو سراہ رہی ہو اور اُسے ہر پہلو سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں لکڑی ہی کی طرح بے قرار تھا لیکن اُس کے برعکس محرّجرت تھا۔ انھوں نے بیلن کی گٹھائی کر کے مجھے دیا۔ جسے دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔

انھوں نے مجھے سمجھایا، ”کوشش ایک ذاتی معیار ہے اور اپنی جگہ درست ہے۔ تو نے جو بنایا تھا وہ ٹھیک ہی بنایا تھا۔ وہ تیری کامیابی تھی اور یہ میری کامیابی ہے۔ عمل کے اسی فرق سے ادنیٰ و اعلیٰ کی روایت ہے۔ ہنرورانہ بصیرت کے لحاظ سے کامیابی، ناکامی کی اگلی سیڑھی ہے اور غلطی، صبحِ اسدِ لال کی قوتِ اور اک۔“

اُن کی حویلی گرد و وارے کے پاس تھی۔ وہاں سنت لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور کئیوں کے ساتھ اُن کے مذاکرات چلتے تھے۔ سنتوں کی بات بے رنگار آسنے کی سی رہتی جس کا اٹا سیدھا ایک بوتابے تایاجی کے اُسوبِ بیاں کے ساتھ اُن کے چہرے کے بھید بھاؤ بدلتے اور اُن کی زبان سے نکلتے ہوئے الفاظ صحیفہ محکم کے ورق در ورق لگتے۔ اُن کی سوچ و چار کے وقفے میں انھیں دیکھنا سرورِ خاموش سے لطف اٹھانا تھا۔ اُن سنتوں کا اکثر موضوع رُوح ہوتا تھا اور اُن کا ہر بیان شاستروں کی تقلید۔ تایاجی رُوح کی ضل اس طرح پر رکھتے تھے۔ ”ہنرور کی طرح عالم بھی صلاحیتِ ایجاد سے روشناس ہے لیکن عالم، ہنرور کے برعکس ریاکار ہوتا ہے اور بیکاری پسند بھی۔ اُس نے آدمی کو اپنی زندگی کا وسید اور حیل بنایا۔ وہ یوں کہ اُس نے اس کے فانی موجد کو لافانی رُوح کا ٹھہ دیا اور اس کی غلطی کو گناہ بنا کر پیش کیا۔ آدمی غلطیوں کے ذریعے ہی بڑھتا پھولتا ہے۔ اس غیب سے کوئی بری نہ تھا۔ چوں کہ رُوحانیت کے نظام کا سربراہ، عالم ہی تھا، گناہ گار، گناہوں کا کفارہ دینے کے لئے آئے تھے اور اُسے نان و نفقہ ہم پہنچانے لگے۔ جسے علما رُوح کہتے ہیں وہ دراصل قوتِ حیات ہے جو کبھی محقق کے شوقِ تحقیق اور کبھی ہنرور کے حُسنِ تدبیر کی صورت عیاں ہوتی ہے ”زندگی کے کئی پہلو ہیں، دو نمایاں ہیں، تخریبی اور تعمیری۔ جو کوئی جسے اچھا جانتا ہے اُسی کی تعریف کرتا ہے۔ غاصبوں نے خود کو مجاہد اور دوسروں کو کافر قرار دیا۔ جنگ جیسے ناپاک عمل کو مقدس بتایا اُس میں مرنے والوں کو شہید کہا اور لوٹ مار کے مال کو مالِ غنیمت۔ اپنے خیال کی حمایت کی خاطر انھوں نے جنگ کے دیوتا بنائے، اُن کی پوجا کرنے لگے اور اُن سے بل مانگنے لگے۔ ایسے لوگ جنگ کی آگ کی طرح آئے اور اپنے جوشِ جنوں کی طرح مٹی میں اُل گئے۔ اُن کی تخریبی کارروائی سے انسانی ترقی عارضی طور پر روکی لیکن ہنروروں کی تعمیری صلاحیت اُسے بھر حرکت میں لے آئی۔ ہنرور زمانے کے ساتھ رواں دواں ہے اور ہر شے

سے کسی نہ کسی شکل میں عیاں ہے۔ میں جدھر دیکھتا ہوں اُدھر مجھے ہنرور نظر آتا ہے۔  
 ”جس کے پاس جو کچھ ہے، وہ اُسی کی بڑائی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ جو اپنی روزی روٹی،  
 دسٹ کاری سے کھاتے ہیں، اُن کے پاس شاستروں کے لئے وقت کہاں ہے؟ لیکن شاستر، سننوں  
 کا ذریعہ معاش میں اودھ اُنھیں غلط کہیں گے تو گھاس چریں گے! اگر وہ لوگ بٹھر پڑتے ہیں، مردوں سے  
 نعمتیں مانگتے ہیں اور برکتیں چاہتے ہیں۔ قدامت پرستی اور بیکاری پسندی اختراعی جہلت کو مفلوج کرتی  
 ہے۔ جیسے آئینے کے بغیر چہرہ دیکھنے سے قاصر ہے، مردہ پرست، حیات پرستی کے بغیر اپنی نفی  
 دیکھنے سے۔ جدت طراز جہلت زندگی کا آئینہ ہے جس میں ہنرور اپنی پُر اسرار صلاحیتوں کا نظارہ لباس  
 حقیقت میں کرتا ہے۔“

وہ دھرتی کو حکیم مانہ مانتے تھے اور اپنے نظریے کی وضاحت یوں کرتے تھے۔ ”ناکارہ سے  
 ناکارہ چیز کو عمدہ بنا کر پیش کرنا دھرتی ہی کا سب کمال ہے۔ موجودات میں موت نام کی کوئی چیز نہیں ہے  
 کیوں کہ موت ٹھوٹی توازن کی نمائندگی کرتی ہے۔ حیات کی نجات، حیات میں ہے۔ ہر ذرہ قوتِ حیات  
 سے چمکتا ہے اور احساسِ حیات سے بھرکتا ہے۔ جو بظاہر مردہ نظر آتا ہے وہ سرگرم عمل ہے اور کایا  
 پلٹا ہے۔ کایا کی کیمیا گری اور ہنرور کی ہنروری متقابل ہیں۔ انسانی زندگی ترقی نفس کا عمل ہے۔“  
 تایاجی مراقبے کے خلاف تھے لیکن میں نے انھیں اُس حال میں دیکھا تھا۔ اُن کا مراقبہ غور و  
 فکری بلند تھی اور میلانِ خاطر کی پاکیزگی۔ وہ بیان کرتے تھے، ہر اسرارِ دنیا تجربے اور مشاہدے سے  
 منکشف ہوا ہے۔ انسان جتنا دیکھتا ہے، سوچتا ہے، اُس کا عشرِ عشر ہی سمجھتا ہے اور اُس عشرِ  
 عشر کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ حالانکہ حرفِ آغاز انسان ہے لیکن انسان، حرفِ آخر نہیں ہے۔ انسان  
 کی یہی سچائی، نا سچائی ہے جسے شاستر گول مول طریقوں سے سمجھاتے ہیں اور انسان کو دھرتی سے جدا کر کے  
 خدا کا حصہ بتاتے ہیں اور اسی بنا پر خدا کو حرفِ آغاز اور حرفِ آخر سے موعوم کرتے ہیں۔“

میرے جنم سے پہلے کی بات ہے۔ وہ ایک سنت سے اتنے مرعوب ہوئے کہ سچ کی تلاش  
 میں اُس کے ساتھ ہوئے۔ وہ چند ہی دنوں میں گھر لوٹ آئے اور اُس سے یہ آخوذ سیکھ کر آئے، ”جو آدمی  
 اپنی روٹی محنت سے نہیں کماتا اور دوسروں کی محنت پر جیتا ہے، وہ جینے کے لئے ڈھکوسلے کرتا ہے۔  
 پوتر بانا بہت، نام چہنا، نام کی آڑ میں ٹھکنا اُس کے تین بڑے حربے ہیں۔ بیکاری، جرم ہے اور  
 بیکار، مجرم۔ اس کا واضح نمونہ سا دھوسنت میں اور دھارمک استھان اُن کے اڈے ہیں۔“

ایک بار اُنھوں نے ایک واقعہ بتایا کہ میرے پاس ایک آدمی آیا جو تیرتھ یا تراسے لوٹا تھا۔



اُس نے اپنی بڑائی بتائی کہ اُس نے ایک برہمن کو نئی دھوتی دان میں دی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیوں؟ اُس نے کہا کہ اُس کی پُرانی دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے کہا، تیرا جذبہ اپنی جگہ دُرست ہے لیکن وہ نئی دھوتی نہیں پہنے گا! کیوں؟ اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ میں نے کہا، وہ جانتا ہے کہ اُس کی پھٹی ہوئی دھوتی اُس کے جینے کا وسیلہ ہے۔

وہ کہتے تھے، ”چند اخلاقی باتوں کو چھوڑ کر، صحیفے جس خرافات سے پُر ہیں۔ وہ ہے آتما اور پرما۔ ان دونوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے روحانیت کے قائل ہزاروں سالوں سے جتن کر رہے ہیں۔ اُن کی یہ کوشش کوٹھو کے بیل کی سی ہے، وہ زندگی بھر چلتا ہے، چلتا ہے اور چلتا ہے لیکن اُسی دروازے سے باہر نکلتا ہے، جس سے وہ اندر جاتا ہے۔ جیسے بیماری کے کٹرے بیماری ہی کے حامل ہیں، پیر فقیر، پیروں فقیروں کے سفیر ہیں۔ یہ بیکار لوگ کسانوں، ہنروروں اور کامگاروں کی محنت پر پلے ہیں۔ کیا کسی صحیفے میں اُن کا ذکر آیا ہے؟ ان کی احسان فراموشی کی حد دیکھئے! کوئی دانی ان کے لئے کچھ کرے یہ ممنون بھگوان کے ہوں گے کیوں کہ یہ ادعا کرتے ہیں کہ بھگوان کی کراہی سے دانی کے دل میں دان داتاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ورنہ وہ اس اچھے کام کے قابل نہیں ہوتا۔ دانی اُن کی تہمت میں عزت دیکھتا ہے اور اُن پر مرجھا کہتا ہے۔ زلت خواہی ایک نفسیات ہے۔ اس کا شکار پیروں اور فقیروں کی گندگی تک کو تبرک اور پیر ساد سمجھتا ہے۔“

”فطرت کے جاری و ساری رہنے کا راز تخم و مرکزہ میں ہے اور نوع انسان کے نشوونما کی حقیقت علم و ہنر میں۔ کہیں جاؤ، علم و ہنر کی صداقت ایک ہے۔ خدا ایک ہے تو ملہون کو مختلف زبانوں میں الہام کیوں کر ہوا؟ اُس نے ہر کسی کو پوچھا یا اٹھ کے طریقہ الگ الگ کیوں بتائے؟ اور اُن سے انحراف کرنے والوں کو کافر کیوں ٹھہرایا؟ ہر مذہب والے کو خواب میں اُس کے دیوی دیوتا اور دھرم استھان کیوں نظر آتے ہیں؟ آدمی جس مشاہدے سے گزرتا ہے اُسی کا انعکاس دیکھتا ہے۔ دماغ بذات خود تخلیق کرنے کے نا اہل ہے یہ مادی مظاہر اور جبلی ضرورتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی نفسیاتی کیفیت سے خواب ظہور میں آتے ہیں اور وجود پاتے ہیں۔ جیسے بچہ، ماں کے دودھ کا خواب دیکھتا ہے، جوان لڑکا، لڑکی کا اور بوڑھا، موت کے فرشتے کا۔“

”ہنرور کا ذہن سب سے نازک ہوتا ہے۔ وہ ہنر کی لطافت و نفاست کو پہچانتا ہے اور بوقت ضرورت اصلاح کن رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس کے برعکس خدا پرست کٹھور ہوتا ہے اور کم نظر بھی۔ اس کا کھرا ثبوت یہ ہے کہ وہ خود کو زمین سے زیادہ آسمان کا حصہ مانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کا بندے



معاون، اس لئے دھنرور مل کر تیسرے کی ترقی کی طاقت بن جاتے ہیں۔“

”ہر خدا رسیدہ کی سچائی ہنر کے برعکس مفروضوں پر مبنی ہے جس کی سچائی کی کوئی بھی مفروضہ ہی ہے۔ وہ آفرائش حیات کے ہنر سے بے بہرہ اور آرائش ذات کے کتب میں ماہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی کا جواب دہ سمجھتا ہے تو وہ اس کا آسمانی خدا ہے۔ اس طرح وہ نظم دنیا سے الگ ہو جاتا ہے جس کا وہ الٹو حصہ ہے۔ ہنرور کی وسعت احساس اسے عالمی برادری کا عامل رکن بناتی ہے اور اس سے نت نئے بلند و برتر فکر ہنر کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ہر مشکل کو آگھٹاتا ہے، جانچتا ہے اور اس کا حل نکالتا ہے۔ چھچک اور ہٹک کے ٹیکے کچھ ہنروروں نے ایجاد کئے، جن سے پوری نوع انسان فیض یاب ہوئی ہے۔ کپڑا کوئی ہمتا ہے اس سے تن میں ڈھانکتا ہوں۔ آپس میں مل کر جینے کا سلیقہ ہنرور کی طبع رسا کا نتیجہ ہے، ورنہ انسان اپنے فضل میں حیوان کی طرح اکیلا ہوتا۔“

وہ اوتاروں کے اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ سنسار ایک سپنا ہے۔ ”زندگی مکمل حقیقت ہے اور انسان اس حقیقت کا ترجمان۔ اگر زندگی بے حقیقت ہے تو ان کو اس حقیقت کا احساس کیوں کر ہوا؟ اور جب احساس ہوا تو وہ اس کی سلامتی کے درپے کیوں ہیں؟ اور سب سے تحقیق طلب بات یہ ہے کہ وہ اپنی بے حقیقی کو دوسروں کی حقیقت پر کیوں لادتے ہیں؟ چوں کہ انسان زندگی کی ہر حقیقت کا ترجمان ہے میرے نزدیک وہ لوگ ریا کار ہیں۔“

وہ اپنی حقیقت اس طرح بیان کرتے تھے۔ ”احساس نفس، حسنِ عمل کی تحریک ہے اور حسنِ عمل حسنِ ضرورت کی۔ یہ ایک لکڑی ہے۔ میں کٹھاڑ سے پھاڑ کر اس کا ایندھن بناؤں، آری سے چیر کر بالے بناؤں خزاں پر چڑھا کر پائے بناؤں، یہ میری ضرورت اور میرے ہنر پر منحصر ہے۔ یہ لکڑی اس لئے ہے کہ میں نے اسے لکڑی کا نام دیا ہے۔ میں اسے کوئی دوسرا نام دیتا تو یہ دہی ہوتی۔ اب یہ وہ سب کچھ ہے جو میرے ادراک میں موجود ہے۔ میں وہ غنیمتوں جو ہر دوسری شے کے تقدیر ہے۔ یہ دنیا کے موجودات میرے فکر و فن کی تفسیر ہے۔“

”مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ کے پیامبر، فاضل جاہل تھے، فرار پرست تھے اور عمداً کاہل۔ میں مسبب الاسباب ہوں اور ہر سبب کا ذمہ دار۔ میری مرضی میں کسی کو دخل ہے تو فقط مجھے۔ شاعر ایک ہی بات پر زور دیتے ہیں، بندے اپنی ’میں‘ کو مار۔ میری ’میں‘ مرگئی تو میں مر گیا، میرا احساس تقاضا نہ کر گیا۔“ وہ احساس تقاضا پر زور دیتے۔ ”ان کے نزدیک احساس کے بغیر ’میں‘ سرسرا انتشار تھا۔“ وہ سب کچھ مر گیا جو میرے ہمہ رنگ احساس کی تحریک اور تصدیق ہے۔ میری ’میں‘ ترکان ہے، لوہا رہے، معمار ہے، حکم ہے، جلاہا ہو چکی ہے، شاعر ہے، کل ہے، درانتی ہے اور بالاتر احساس انسان ہے، میری ’میں‘ توحید ہنر کا نایندہ ہے۔

اس نے کائنات و کائنات نئے نئے جو ہر پیدا کر کے 'ہمہ از اوست' کے فلسفے کی تردید کی ہے۔ چوں کہ میں 'تخلیق' کا رہنے، اس کے متضاد پہلو ہیں اور جو پہلو مسلکِ انسانیت کی نفی کرتا ہے وہ باعثِ ملامت ہے۔

شاید اسی لئے وہ کہتے تھے کہ جو کوئی، انسان کی مشکل کا حل، دُعا بتاتا ہے، وہ فریبی ہے اور باز اوروں کو تاذ کا آدمی، بھول کر بھی ایسے آدمی کی بات نہ سُنو۔ مشکل، انسان کا آفاقی اور لائٹانی ورثہ ہے۔ یہ ایسا آواز رہے جو انسان کے اندر دنی انسان کی تشکیل کرتا ہے۔

پتھر اے کھیتوں (نیچ آگئے سے پہلے کاشت کردہ کھیتوں پر پانی برس جائے تو رُوئے زمیں سخت ہو جاتا ہے۔ سوئیاں اُسے توڑ کر اوپر اٹھنے میں ناکام رہتی ہیں اور مر جاتی ہیں) کا ایک ہی ممکن حل ہے کہ کھیت دوبارہ نیچے جائیں۔ اس میں نیچ اور محنت کا خسارہ جو ہے، سو ہے، بڑا نقصان یہ ہے کہ کھیتی بچھڑ جاتی ہے اور بارانی کھیتی سے کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔ تایاجی کی اختراعی صلاحیت، حرفِ آخر کا مرتبہ رکھتی تھی۔ اس کام کے لئے انھوں نے پچھنا بنایا۔ وہ ایسا آکر ہے جسے کھیت میں گھمانے سے پیٹری ٹوٹ جاتی ہے اور کسان فضل دوبارہ نیچنے کی زحمت سے بچ رہتا ہے۔ اُن کی یہ ایجاد اس قدر فائدہ مند ثابت ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہو گئی۔ دُور دراز کے گاؤں سے کسان آتے، اپنے ساتھ بڑھی لاتے اور پچھنے کا نقشہ نکال کر لے جاتے۔ وہ چھوٹی سی اور سادہ سی ایجاد تین انچ مربع کڑی کا ڈیڑھ گز لمبا اور ایک گز چوڑا چوکھٹا تھا جس کی باہیوں میں آدھا انچ موٹی اور چھ انچ لمبی سلاخیں گاڑی ہوئی تھیں۔ سلاخ سے سلاخ میں چار انچ کا فاصلہ تھا۔ ایک باہی کے دونوں سروں پر دو گنڈے تھے جن سے جوت باندھے جاتے تھے۔ اُس آلے میں مخصوص خوبی یہ تھی کہ اُس کے چاروں کونوں پر چار پہیے تھے جو اوپر نیچے کئے جاسکتے تھے اور آلے کی کارگر گہرائی کو حسبِ ضرورت رکھنے میں مدد کرتے تھے۔

سین پور سے بگھٹا سنی آیا اور اپنا پچھنا گڈے پر لا کر لایا۔ اُسے شکایت تھی کہ اُس نے پچھنا اُن کے آلے کے مطابق بنایا ہے لیکن پاڑا (دو لیکوں کے درمیان بے جٹی میٹ) چھوڑتا ہے۔ انھوں نے دیکھتے ہی نقش پکڑ لیا۔ اصل کی پچھلی باہی کی سلاخیں اگلی باہی سے دو انچ ہٹی ہوئی تھیں جب کہ نقل کی سیدھ میں تھیں۔ اصل کی بناوٹ میں ایک فائدہ اور تھا۔ اگلی اور پچھلی سلاخیں متوازی نہ ہونے کی وجہ سے خراش مکرر نہ پڑتی تھی اور یوں نیچ کے اکھڑنے اور ٹھکاوے ٹوٹنے کا امکان معدوم تھا۔

اُن کے وجدان کو تحقیق و تخلیق سے یکساں نسبت تھی۔ وہ زور دے کر کہتے تھے، "جو ہے وہی ہے جو نہیں ہے، وہ نہیں ہے!! جو ہوگا، وہ کرنے سے ہوگا!!! انسان قصیہ منفیہ کا قاطع ہے اور قصیہ مسدود ہے!"

کا مُصَدِّق۔“

کوئی انھیں عبادت میں شامل ہونے کو کہتا، وہ اُسے صاف لفظوں میں کہتے، ”مجھے کام ہے!“ کسی کے اصرار کرنے پر وہ کہتے، ”تم خدا کے بندے ہو۔ تمہارا یہاں اور وہاں محفوظ ہے اس لئے شکر یہ ادا کرنا تم پر فرض ہے۔ میں دھرتی کا بیٹا ہوں، مجھے اس سے نباہنا ہے۔ مجھے اسے صاف کرنا ہے، کھودنا ہے، بونا ہے، نلانا ہے، سنبھالنا ہے اور جینے کا ڈھنگ نکالنا ہے۔ آپ کی اُصل اور ہے اور میری اُصل اور۔ میں اپنا آغاز بھی ہوں اور انجام بھی۔“

وہاں کوئی نہ تنہا جو ان کے خیالوں سے اتفاق کرتا ہو لیکن وہ کسی کی پروا نہ کرتے تھے اور اپنے خیالوں پر اپنے بچوں کی سی توجہ دیتے تھے، انھیں صحت مند سے صحت مند اور خوب صورت سے خوب صورت بناتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ”میں اپنے خیالوں کی پرورش پر اپنے بچوں سے زیادہ دھیان دیتا ہوں اور یہ عین فطری عمل ہے۔ آدمی کسی کو تعلیم و تربیت دے سکتا ہے، اُس کے نشوونما کا سبب نہیں بن سکتا! خود آگاہی، خود آرائی ہے جس پر یہ ظاہر ہے، وہ اپنا راہبر ہے۔“

وہ رسوم و رواج سے بالاتر تھے۔ اُن کا کردار اُن کے عمل کا محلِ خاند تھا۔ وہ خدا کا نام لیتے تھے، اُس کی باتیں کرتے تھے لیکن اپنے طریقے سے۔ ”خدا نے مجھے ننگا پیدا کیا۔ میں نے تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا بنالیا۔ اُس نے میرے لئے بیماری بنائی، میں نے اپنے لئے دوائی۔ سوکھا پڑنے پر میں نے دھرتی پھاڑ کر کتوں کھود لیا۔ طوفان نے کھیت اُجاڑے، میں نے دوبارہ کاشت کر لئے۔ اُس نے ہزاروں طریقوں سے میرے رزق پر امتناع لگایا، میں نے لاکھوں وسیلوں سے رزق حاصل کیا، اُس کی ہر سازش کو ناکام بنایا اور اپنی بہمت و فراست سے اُسے حقیر ثابت کیا، بھگوگن، انسانوں کے برعکس حیوانوں کا ہے۔ وہی ایک نوعِ فطرت ہے، جو راضی برضا رہتی ہے۔ میں ممکن الوجود ہوں! میں ممکن الوقوع ہوں!! میں ممکن المحصول ہوں!!! اور میں ہی حاصل۔ جو کوئی توکل پر جیتا ہے، اُس کا وجود و عدم برابر ہے۔“

آپ ہی آپ میں آپ ہے، آپ میں رہے بیاب

نہیں مرگ، نہیں نرگ ہے، نہیں پُن، نہیں پاپ

آل جتنا وہی کہتایا جی بیمار پڑ گئے۔ انھوں نے بیل اپنے دیئے اور کھیت ٹھیکے پر جتالے کھیتی خضم سیتی مشہور ہے، وہی بات ہوئی۔ نام دیو سنگھ نے شیاڈ (لیک) موٹار کھا اور سہاگ ٹھیک سے نہ دیا۔ سوائی دھرتی، بارانی بھی تھی، ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ صحت مند ہو کر کھیتوں کا جائزہ لینے گئے اور پریشان ہو گئے۔ دوسرے (دوسری بار کل چلانا) ڈالنے سے ڈھیلے اور نمایاں ہو گئے۔ کھیت کمانے کے لئے ڈھیلوں کا توڑنا ضروری

تھا۔ اس کام کے لئے انھوں نے لکڑی کا ہتھوڑا بنایا۔ اُس کا دستہ چھوٹا تھا اس لئے بیٹھے بیٹھے کام کرنا پڑتا تھا۔ کام کی ڈھیلی رفتار سے متاثر ہو کر انھوں نے اُسے لمبا دستہ ڈالا اور کھڑے ہو کر کام کرنا شروع کیا۔ اُس سے بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور انھوں نے کام چھوڑ دیا۔ اُس مصیبت سے بچنے کے لئے انھوں نے سہاگے ترمیم کی، جو پچھنے ہی کی طرح مقبول ہوئی۔ اُس سہاگے نے ڈھیلے سے مسل دیئے جیسے وہ مکھن کے ڈلے ہوں۔ اُس ترمیم کی تفصیل یہ ہے کہ سہاگے کا پچھلا سرا، پشتے کی مدد سے دو رانچ نیچے بڑھادیا تھا اور اگلے سرے سے اندر کی طرف دو رانچ موٹی روک کا اضافہ کر دیا تھا۔

اُن کی آنکھوں کی چوکھی، شرارے کی پلک کی سی تھی جو اپنی نمود کا اعلان دُور سے کرتی ہے۔ اُن کی نظر محسوس کرتی تھی، بات کرتی تھی، آواز کی طرح ہر شے کے اندر کی گہرائی تک پہنچتی تھی۔ اُن کی بیل گاڑی میں فنی خصوصیت یہ تھی کہ اُس کے دھڑے، دائرے کا ایک چوتھائی گھماے جاسکتے تھے۔ رانچ گاڑی کا تلو اور جامد ہونے کے سبب دھڑے ایک ہی جانب سے گھستے تھے، یعنی نیچے سے۔ وہ ہر بار بھی اور ساوٹی پر تلو کی سمت بدلتے اور دھڑوں کو کالی گریس سے چکنا دیتے۔ کوئی کام آرمبھ کرنے سے پہلے وہ آواز کا معاینہ کرتے اور ضرورت سمجھتے تو اُن کی مرمت کرتے۔ آواز اُن کا قصہ تخلیق تھے۔ ”میرا ہنر میرا جسم ہے، میرے آواز میرے اعضا ہیں اور اُن کا عمل میرا حاصل۔“ اُن کی اس بات پر کوئی حیران ہوتا تو وہ کہتے، ”میں زندگی کو نئے معنی دیتا تو لیک سے بے لیک نہ ہوتا اور بزرگوں کی حماقتوں اور جہالتوں کو تیز کر سمجھ کر پوجتا رہتا۔ وہیں پڑا رہتا جہاں وہ مجھے چھوڑ گئے تھے۔“

شاستر بتاتے ہیں کہ انسان، پانچ عناصر کا پیکل ہے۔ تایاجی کہتے تھے، ”ہر شے کون عناصر سے بنی ہے وہی جلنے! انسان، وجدان عناصر کا نام ہے۔ اپنے وجود سے باہر اس کا کوئی وجود ہے تو وہ احساس اور ہنر سے ہے۔ کون ہے جو اپنے پُرکھوں --- اور اُن کے پُرکھوں کا نام بتا سکتا ہے۔ یہ دعویٰ ہر کوئی کر سکتا ہے کہ اُس کے پُرکھے انسانی برادری کے رکن تھے۔ پھر پنج کون ہوا؟ انسان کی اونچ نیچ اس کے احساس سے ہے! ہنر سے ہے! انسان کے سولے ہر شے کی حقیقت مکمل حقیقت ہے۔ اس کی حقیقت اس لئے مکمل نہیں ہے کہ اس کی فطرت، نشوونما سے عبارت ہے۔ انسان کا موجودہ ارتقا اس کی جگہ جگہ کی محنت و بصیرت کا حاصل ہے۔ اس کی مفلوک الحالی! اس کے تنزل کی رفتار بے اختیار ہے۔ اس کے نیچے کو حیوانوں میں پالو پوسو، وہ انھیں کے طور طریقے سیکھ لے گا اور انھیں کی بولی بولنے لگے گا۔ تعلیم و تربیت انسان کا قلب ہے۔ عقیدے، انسان کا مَدَفَن ہیں اور استدلال، کل زمین۔ تصوف سب سے مہلک ہتھیار ہے جو خود ساختہ خداؤں اور خدا رسیدوں نے نوعِ انسان کے خلاف استعمال کیا ہے۔“

وہ بچوں کو ہمارے میلانے تھے اور انھیں کبھی نہ ڈراتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہوتے تو عمر کے فاصلے مٹا کر بچے بن جاتے۔ وہ کہتے تھے، ”بچہ، نازک آئینے کی طرح ہوتا ہے۔ اس پر جو خراش پڑگئی ہو پڑگئی، نیچے کی فطرت بڑے سے زیادہ پر غلوں ہوتی ہے۔ اُسے نہ اچھے سے مطلب ہوتا ہے اور نہ بُرے سے، اُسے سیکھنا ہے اور بس سیکھنا ہے۔“

بچوں کے بارے میں وہ ایک بات اور بتاتے تھے جو اُن کی فطرت پرند طبیعت کی فراست ہے۔ ”پھول کو دیکھو! حامل زر، کیسے ٹخم کو ٹخم دے کر جھڑ جاتا ہے، پھر ٹخم جانے اور کیڑے ٹخم! لیکن بچے کی پرورش میں پہلے ماں کو دخل ہے اور پھر ماحول کو، دونوں جتنے مقبول ہوں گے، بچے اُتے ہی بُردار۔“

وہ بچوں کی اچھی پرورش کے یہاں تک قائل تھے کہ سمجھتے تھے کہ ماں کو گر بھد کے دوران اچھی خوراک ملنی چاہیے، اس کے ساتھ اچھی باتیں کرنی چاہیں کیوں کہ ماں کی نفسیاتی کیفیت، بچے کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ”نفسِ مادری، نفسِ ٹخم کے برعکس ہے۔ ماں اپنے بچے کو احساسِ شعور سے سنوارتی ہے۔“

جہاں مری، پلیگ کی نشانیاں، کھیلوں کی صورت میں باہر کھینوں میں موجود تھیں۔ اُن دنوں لوگ چھوٹے چھوٹے گردہوں میں رہتے تھے۔ تایاجی اُس صورتِ حال کو یوں بیان کرتے تھے۔ ”بُخار چڑھتا گردن یا بغل میں گھٹی نکلتی جو مریض کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی۔ انگریزوں پر ٹھوکنے والے بتا سکتے ہیں کہ سستی کی رسم کو کس نے روکا؟ ٹھوگی کا بیج ناش کس نے کیا؟ علم و ہنر کے نظام کو عصری طریقے سے کس نے سنوارا پہلے مدرسے کہاں تھے؟ جو کہیں تھا روایتی قسم کا تھا۔ ہریانہ میں انگریز ڈاکٹر آئے اور تیبوتان کر رہے گئے۔ وہاں کا ہسپتال انھیں دنوں بنایا گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر گاؤں گاؤں گھومنے، لوگوں کو کھلی فضا اور دھوپ میں رہنے کے مشورے دیتے، نالیوں پر چوٹیاں چھڑکے کو کہتے اور چوہے مارنے کی مہم چلاتے۔ وہ جو پھندا گھر میں ہے، میں نے اُن دنوں بنایا تھا (وہ رات کو موش کش لگا کر سوتے تھے) اور جس نے مانگا تھا اُسے بنا کر دیا تھا۔ چوہے اتنے موٹے تھے کہ انھیں مارنے کے لئے شتھے پر وزن رکھنا پڑتا تھا۔ حکومت نے پنجرے دیئے تھے لیکن پنجرے میں پکڑے ہوئے چوہے مارنا مشکل کام ہے۔ انھیں پانی میں ڈبو کر مارو تو وہ مرتے ہیں، درند بھاگ جاتے ہیں۔ کون سا گھر تھا جو پلیگ کی مار سے باہر تھا۔ غریب ہندوؤں کے پاس اناج خیرہ نے کے لئے پیسہ نہ تھا، وہ مردوں کو جلانے کے لئے بالن کہاں سے لاتے؟ وہ مردے دفنانے لگے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ پلیگ خطرناک حد تک متعدی ہے۔ زندہ، مردوں سے جلد آز جلد چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ کیتوں نے ڈر کر گھر بار جلا دیئے۔ وہ پہلا موقع تھا جب زندوں نے مردوں کو نہ ہلایا اور نہ کھنایا

جوں ہی کوئی مرتا، اہل خانہ اُسے ڈنڈوں سے دھکیل کر اُتھی پر رکھتے اور اُتھی سمیت گاؤں سے دُور گاڑا کرتے۔ برہمن گلی چلاتے پھرتے، لے مانس! یہ تیرے بُرے کرموں کا پھل ہے! پاپوں کی سزا ہے! یہ کل جگ کی نشانی ہے! وہ ڈنڈ دینے لگے۔ جو ہندو اپنے مرنے ہوئے کو دفنائے گا وہ اپنی سات کُلوں سمیت ترک میں جائے گا۔ دان کرو، پُن کھاؤ، اپنے پُرکھوں کو مکتی دلاؤ۔“

وہ کہتے تھے، ”ہنرور کسی نہ کسی طریقے سے انسان کا معاون رہا ہے۔ بُجاری، آدمی کا دائمی جانی دشمن ہے۔ یہ آدمی کی ذہیل ترین قسم ہے، گدھ سے بھی بدتر! یہ زندوں اور مُردوں کو برابر کھاتا ہے جس کا ثبوت ہے شرادھ کی رسم! انسان کی زندگی میں کون سا مقام ہے جہاں بُجاری کو دخل نہیں ہے؟ شاستروں میں کیا لکھا ہے؟ کس کو معلوم ہے! اور جو لکھا ہے اُس کی صداقت کی ضمانت کیا ہے؟ وہ سب بُجاری ہی کے کسی پُرکھے کا اپنی اکل اولاد کے لئے سو آرتھ ہے۔“

”بُجاری کی نفسیات چچڑی جیسی ہے! وہ ٹھن پر بیٹھتی ہے لیکن خُون چوستی ہے حالانکہ ٹھن دودھ کا سوتا ہے۔“

تایا جی کہتے تھے کہ شاستروں میں کہیں کہیں بھولوں بھٹکوں کو راستہ دکھایا ہے، جیسے

پاتھر پوچیاں ہرلے، تال میں پُوج پہاڑ

نہیں تال، یہہ چچی بھلی، بیس کھائے سنسار

”لیکن بُجاری یہ بات کسی کو نہیں سمجھائے گا! اس میں اُس کا پول کھلتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دے گا۔“

جو سرسائیں نہ نبھے، سو سر کھجے کا سے؟

گئے بیٹھ جلائیے، بالن، سندھی تھائے

(جو سرسائیں کے آگے نہ بھجے، اُس سر کو کیا کریں؟ اُسے ہانڈی کے نیچے بالن کی جگہ جلاؤ)

اور کئی جابر خود کو مجاہد جان کر واقعی اُس راہ پر نکل پڑے اور کمزور قوموں پر پل پڑے۔ جب

بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوا، مُستاز انسان نواز تانک نے خدا پر طعن کیا۔

خُراسان کھسایا، ہندوستان ڈرایا

اپے دوس نہ دے ای کرتا، جہم کر مُغل چڑھایا۔

اسے قی مایہ پی کُڑلانے، تیں کی درونہ آیا

(لے خدا! تُو نے خُراسان کا ساتھ دیا اور ہندوستان کے لئے خطرہ پیدا کیا۔)



(کیا تُو یہ الزام لیتا ہے کہ تُو نے مُغل کو ملک الموت بنا کر بھیجا ہے۔)

(ظلم و ستم کی تالاب نہ لاکر انسان، چیخ چیخ اُٹھے! کیا تیرے دل میں ذرا بھی ترس نہ آیا؟)  
تایاجی بیان کرتے تھے، ”لفظ، انسان کی ایجاد ہے اور انسان، لفظ کی۔ دونوں اس قدر لازم و ملزوم ہیں کہ ایک، دوسرے کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی سَت ہے اور یہی اَسَت ہے۔ ہر انسان انہیں دو طاقتوں کے دائرہ اثر میں جیتا ہے اور جیسا کسی کا نفس ہے، کرتا ہے۔ قائل اپنے آپ کو مُجاہد کہہ سکتا ہے، کافر، مُسلمان، پھکاری، جوگی، ریاکار، اوتار اور حیوان، انسان۔“  
وہ اپنے اس خیال کی سند، گریانی میں سے دیتے تھے۔

مانس کھانے کریں نواج، چھری دگان بن گل تاک

متھے پٹکا تیر دھوتی لکھائی، ہتھ چھری، جگت قصائی

(آدم خور اور ظالم، نماز پڑھتے ہیں اور اُسی طرح لیٹروں نے جینو پہن رکھے ہیں۔)

(مانتھے پر تلک ہے، مکر میں گروے رنگ کی دھوتی ہے لیکن ہاتھوں میں چھری ہے اور بیٹہ، قصائی ہے۔)

تایاجی الفاظ کے بارے میں مزید کہتے تھے، ”لفظ اور بیج اپنی جگہ مُکمل ہیں لیکن پہلے کی تقدیر دوسرے کے برعکس ہے۔ دھرتی بیج کو جنم دے کر اُس کے اوصاف قائم رکھتی ہے اور انسان، لفظ کے معنی بدل دیتا ہے۔ کوئی کچھ کہے، اُس پر غور کرو پھر اپناؤ۔ غور زندگی کی کسوٹی ہے۔ یہ پُرانے خیال کو رد کرتا ہے اور نئے خیال کی بنیاد رکھتا ہے۔ فاضل، جاہل ہو سکتا ہے! ضروری نہیں کہ اوزار رکھنے والا بُھرہ بھی ہو غور کرو! میں نے زندگی کو کیا دیا ہے؟ قدریں دُہی ہیں، اوزار دُہی ہیں، الفاظ دُہی ہیں، ان سے میرا علاقہ بس اتنا ہے کہ میں نے ان کو پہچانا ہے اور تاحد ظرف ان کا ٹھیک استعمال کیا ہے۔ صحیح مَنوں میں بُہت کم لوگ زندگی میں اضافہ کرتے ہیں اور صرف دُہی قابلِ التفات ہوتے ہیں۔“

اُن کی انکساری سے مرعوب ہو کر میں نے حیرت سے پوچھا، ”وہ سلاح کاٹنے کا طریقہ بالکل آپ کا تھا۔ کیا وہ بھی کچھ نہیں ہے۔“

”مَن و نحوئی کی طرح علم و ہنر لاحقہ دہ ہے۔ ہنر و دہ کے پاس اس سے کہیں بڑے ہنر موجود ہیں۔ میں نے نہیں دیکھا ہے تو کیا ہے! مجھے معلوم ہے۔ لوہا، کالی مٹی (آکرن اور) سے بنتا ہے۔ جو ہنر اسے بنانے کے جتن بڑھاتے ہیں، وہ بڑے صاحبِ کمال ہیں۔ اُن کے سامنے میں کیا ہوں؟ منطق، انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔ میں نرکھان کا ہنر جانتا ہوں، نرکھان ہوں۔ لوہار کا کام جاننے والا، لوہار ہے۔“

یودوں اور لوٹوں کے گن پہچاننے والا، حکم ہے۔ ہنر ہمہ پہلو ہے اور ایک انسان کی گرفت سے یا ہر پہلے جس نے جو تلاش کیا وہی پایا۔ جلاہے نے کرگہ، ہل دار نے ہل، درزی نے سوئی، کاتب نے قلم۔۔۔۔۔ اور خدا پرستوں نے دوسروں کو گمراہ کرنے کا فن۔“

انہوں نے اپنی انکاری کی تائید میں دلیل دی اور ایک نئی بات بتائی، ”سیتلا کی روک تھام کے لئے ٹیکے ہونے لگے۔“ سیتلا ماں، کے مندروں سے سُجاری آنے لگے اور لوگوں کو اُس کا شراب دینے لگے جنہوں نے ٹیکے کروائے وہی بچے، دوسرے سیتلا کا شکار ہوئے اور پھر دیکھا دیکھی ٹیکوں کا رواج پڑا۔“

قارئین! اب جب کہ سیتلا کا نام و نشان مٹا دیا گیا ہے، ماما کے مندروں کی گہما گہمی ویسی ہی ہے جیسی کہ تھی۔ آدمی کی فراہمی کی انتہا ہے لیکن دیوانگی لا انتہا ہے۔ جہالت کی ہٹ دھرمی کو فتح کرنا سب سے کٹھن کام ہے۔ اقبال اپنے بزرگوں کی عظمت کا چچا پوٹ کرتا ہے۔

تھے ہمیں ایک ترے محرک ارادوں میں، تشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں

ریں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں، کبھی افریقہ کے پتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جیتی تھی جہانداروں کی

بگم پڑھتے تھے ہم جھاؤں میں تلواروں کی

وہی مجاہد، اپنی جہالت سے جہاد کرتے تو یقیناً ہار جاتے۔ میں اتنے وثوق سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں تایا جی کی اس بات پر یقین کرتا ہوں۔ ”آدمی اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے اپنی زندگی کی ہر بات ناپاک دکھائی دیتی ہے۔ یہ اپنے تزکیۂ نفس کے بارے میں سوچتا ہے، جو مر کر نئی زندگی پانے کے برابر ہے۔ فرار پرست، عبادات و مناجات کی جانب راغب ہوتے ہیں اور سقا، دارالحرب کو مُتمدد بنانے کے منصوبے بناتے ہیں اور جو شعور ذات سے آراستہ ہوتے ہیں وہی اپنی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو نشانہ بنانا جتنا مشکل ہے دوسرے کو نشانہ بنانا اتنا ہی آسان، جو یہ سمجھتا ہے وہ اپنا راہبر آپ ہوتا ہے۔“

اُن کی اس بات کا ثبوت بھائیاجی کے کردار میں ملتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی ماں کے ساتھ تہا بہت شرمناک سلوک کیا، وہ مرگئی تو اُس کے مُردے کو گلاب جل میں منہ لایا، چٹا میں چنڈن کا ٹکڑا رکھا اور اُس کے استوں کو گنگا میں بہایا۔ تایا جی کہتے تھے، ”زندوں کو احترام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ مُردوں کو! مُردوں کو گھر سے ہٹا نادرستی ہے، اُنہیں کیسے بھی ہٹاؤ! زندوں کو گھر میں پالنا پوسنا لازم ہے، اسے ذمہ داری سے نبھاؤ! مُردوں کو مقدس بنانے کا فریبِ مصلحتِ امیر اُن لوگوں کا تَجَدُّد ہے جو اُن کی ہڈیوں کا بیوپار کرنا چاہتے تھے۔ نظری اعتبار سے غیر مرنی مخلوق کا وجود نہیں ہے لیکن عملی نظریے سے ہے اور ہر مُردہ پرست کا اُس سے رشتہ ہے۔“

عمل اُن کی زندگی کا چلن تھا۔ اُن کے باپ اُتم سنگھ بیمار ہو کر بستر سے لگ گئے اور تائی نے اُن کی خدمت کرنے سے انکار کر دیا تو تایا جی نے پانچ سال تک اُن کی دایہ کا فریضہ نبھایا۔

دھرم شاستر، انسانی رشتوں کو جھٹلا کر بھگوان کو مایا بتاتا ہے میں اور اُسی کی حمد و ثنا کہنے پر زور دیتے ہیں۔ تایا جی اس خیال کی تردید کرتے تھے ”پتھر دل سے پتھر دل ماں باپ بھی یہ نہ چاہیں گے کہ اُن کے بچے لنگڑے، ٹوٹے، آندھے اور بد شکل ہوں۔ شاستر بھگوان کو دیا وِنت سے دیا وِنت ماں باپ سے دیا وِنت بتاتے ہیں اور پُورن کلاکار۔ پھر یہ کام کس کا ہے؟ کوئی مجھے بد طینت کہے لیکن انسانی رشتوں کے بارے میں شاستروں کی تفسیر یہی ہے کہ اپنے ماں باپ پر دقت پڑے تو انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو لیکن بھگوان کے نام پر اپنی جان دے کر بھی اپنی احسان مندی کا ثبوت دو۔ تیرا تینوں سوچا کیا ہے لاگامورا!“

میرے قارئین! جس کے کامل عقیدے کی صداقت یہ ہو کہ وہ حقیقت کو نظر انداز کر کے کسی غیر حقیقی کام کے لئے اپنی جان دے سکتا ہو، اُس کے نزدیک کسی دوسرے کی جان کی کیا وقعت ہے؟ خدا نہ کرے! ایسا کڑی کسی قوم کا سر پرست بن جائے تو وہ اپنے نظریے کو مسلط کرنے کے لئے اُس وحشیانہ طاقت کا استعمال کرے گا جس سے بچر خانے کی روایت حقیر لگے گی۔

لکڑی کے کام میں چُولوں اور چھیدوں کو اتنا دخل ہے، جتنا لکڑی کو کس چُول اور کس چھید میں کتنی چھوٹ ہونی چاہیے؟ یہ بھید اُن کی آنکھوں میں تھا۔ وہ ایسا ہیما نہ تھیں جو تُو سے تُو کو فرق کسر اعشاریہ تک بتا سکتی تھیں۔ دوسرے کاموں کی طرح وہ چُول کی صفت بیان کرتے تھے، ”انسان سانس لیتا ہے تو زندہ رہتا ہے چُول سانس لیتی ہے تو مر جاتی ہے۔“

کوئی غلطی کر کے مان لیتا تو وہ اُس کی داد یوں دینے، ”مہنر اور اخلاق کا غلطی سے اٹوٹ تعلق ہے۔ جو کوئی اپنا تجزیہ دیانت داری سے کرتا ہے، وہ خرابی سے خوبی کی طرف مڑتا ہے، جو ایسا نہیں کرتا، وہ ایک سے بے ایک نہیں ہوتا۔ اُس کی فطرت کا رجحان ہجوم کی طرح ہے، جیسے نہ اپنے راستے کا گیان ہوتا ہے، نہ مکان کا، نہ پاگل پن کا۔“

جس طرح بیج سے انور قریب ہے اُسی طرح وہ دھرتی سے تھے۔ گیتی کھیتی ہوتی کہ پچھیتی (اگیتی) موسم سے پہلے بولی گئی کھیتی، پچھیتی، موسم کے بعد بولی گئی کھیتی (زمین چاہی ہو کہ بارانی، سوائی ہو کہ ریتی، جو کوئی انھیں نمی دکھا کر بیج بوتا، اُس کی فصل کا حاصل عام فصل سے زیادہ ہوتا۔ اس حیرت انگیز نتیجے کا راز یہ ہے کہ اُنھیں اس بات کا پورا گیان تھا کہ نویں زمین میں کتنی نمی ہونی چاہیے، کہاں بیج پورنا چاہیے، کہاں کیزنا چاہیے کہاں پور (اکری) سے بونا چاہیے، کہاں بوکر لیک کو کھلا رکھنا چاہیے اور کہاں سہاگا دینا چاہیے کئی بار وہ

بچوں کو بگھوکے بچنے کا سہارا بھی دیتے تھے۔ اُن کھیتوں کی فضل اس دہقانے قول پر پوری اُترتی تھی۔ ”مینڈھ کو دھکا مارو تو کھیت ہلتا ہے!“

کوٹھے جٹاں کے شام سیکھ سے اُن کا بارانہ تھا۔ وہ اُنھیں دھرتی کا سپوت کہتا تھا۔ اُس نے اُن کے مشورے پر جہاں رہت لگایا تھا وہاں پانی کی پوٹ تھی۔ اُسے دن رات جوتے رکھنے سے بھی پانی ٹوٹتا نہ تھا۔ تایاجی کہتے تھے کہ دھرتی میں سمندر دفن ہے، جس کا پانی کھلے سمندر کے برعکس صاف اور میٹھا ہے۔ ایک بار بھائیاجی نے میرے ہاتھ شام سیکھ کو سندِ سیا بھیجا۔ تایاجی پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، اُنھوں نے کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔

”آپ کو کیسے خبر ہے؟“

”ایسے ہی جیسے کہ تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو!“

”کہاں گیا ہے وہ؟“

”شاید لامبٹرے کو چارہ ہے۔“

اُن کی بات سُن کر میں حیران نہ ہوا۔ وہ کئی بار عالمِ غیب کی باتیں کرتے تھے جیسے اُنھیں اِشراقِ ضمیر ہو۔ اُنھوں نے بھائیاجی سے کہا، ”اِسے وہاں مِت بھیجو، وہ یہاں آنے والا ہے۔“

بھائیاجی کب ماننے والے تھے! میں کوٹھے جٹاں گیا اور یہ خبر لایا گیا دُہ بجے وال (لامبٹڑے سے

جبراً ہوا اکاؤں سے) گیا ہے اور وہاں سے ڈوڈیا جانے والا ہے۔

[illegible]

اُن کی باتیں تصورِ کلی کی ترجمانی کرتی تھیں۔ وہ انسان اور حیوان میں جیسے موازنہ کرتے تھے لوگ اُس پر حیران ہوتے تھے۔ ”حیوان کی میراث اُس کی نسل کا ورثہ ہے اور انسان کی میراث، ہنر، کیوں کہ اِس نے اپنی زندگی خود تخلیق کی ہے۔ اِس کا عمل اپنے سے زیادہ دوسرے کے فائدے کے لئے ہے اور یہی اِس کا حقیقی صلہ ہے۔“

وہ نہ کسی کو دُعا دیتے تھے اور نہ ہی دُعا مانگتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کہتے تھے تو بس اتنا، جاؤ اپنے کام پر دھیان دو اور خوش بسو۔“

ایک بار اودھم سنگھ نے حسرت امیر اشتیاق سے تایا جی سے کہا، ”بھایا جی! کوٹلے کے شاہوں کو زمین کھودتے ہوئے اُس کھیت میں سے خزانہ ملا تھا، جس کا ڈانڈا میرے کھیت سے لگتا ہے۔ سب قسمت کا کھیل ہے!“

”اودھم سیال! اُم ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ تم بد قسمت ہو؟ بد قسمت وہ ہے جسے مُفت کا دھن ملتا ہے۔ وہی سب سے دھن دان ہے جسے دھن پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ مُفت کا دھن، بھنور ہوتا ہے جو اپنے ساتھ آنے والی آفتوں کو بھی لے ڈرتا ہے۔“

اُن کی بات سن کر اُس کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی جیسے اُس نے زندگی کا اہم سرِ لغایا ہو۔ وہ کہتے تھے، ”جو کچھ ہوتا ہے، کرنے سے ہوتا ہے۔ دُعاؤں سے ہوتا تو سنت الکھ نہ جگاتے اور نہ ہی صدقے سِلے پر جیتے، اُن کے لئے آسمان سے پدارتھ برستے۔ یہ غیر حقیقی باتیں ایسے لوگوں نے گھڑی ہیں، جن کے پاس محنت کا نظریہ مفقود ہے۔“

میں اُن کی مالش کرتا اور انھیں گرم پانی سے غسل کرواتا۔ وہ غسل نہ کرنا چاہتے تو گرم گیلے کپڑے سے اُن کا بدن صاف کرتا۔ اُن کے ہاتھوں اور پیروں کی ٹھنڈک کم نہ ہوتی تھی۔ میں تشویش ظاہر کرتا، وہ مسکرا کر کہتے، ”میرا وقت آگیا ہے! اُن کی زبان سے وقت کے محدود معنی سن کر میں حیران ہوتا۔ وہ کہتے تھے، ”وقت، ماں کی مٹا ہے، بچے کی مصمصیت، بواہوس کی ہوس، بوڑھے کی تنک، دولت مند کی حرص۔۔۔ اور کارگر کا جنتر ہے۔ وقت، ہر کسی کے لئے الگ معنی رکھتا ہے، صرف ہنرور کے لئے اِس کے ایک معنی ہیں، ہنر کی پیروی۔ وقت، غارت گر انسان ہے لیکن محافظِ ہنر ہے۔ ہنر وہ تحریک ہے جس میں وقت قید ہے۔“

ایک دن مجھے رنجیدہ دیکھ کر انھوں نے کہا، ”زندگی اپنی حفاظت نہ کر سکے تو جولا بدل لیتی ہے اور پھر نئی تاب و تاب سے شروع ہوتی ہے۔ میرے جولا بدلنے کا وقت آگیا ہے! وہ دیکھو! انھوں نے

اُڑوؤں کے خزاں زدہ بے برگ و بار درختوں کی طرف اشارہ کیا اور بولے، ”پڑانے پتے بھر گئے ہیں اور نئے پتے اُگنے کے لئے ہُمک رہے ہیں۔“

کام (جسے وہ انسانی زندگی کی نعمت مانتے تھے) اُن پر الگ طرح اثر انداز تھا۔ اُن کے ہاتھ، رینگمال کی طرح کھردرے تھے اور پاؤں کی چھنگلیوں کے گوکھرو بڑے اور بھدے، جن کے برابر جوتا کا ٹنا پڑتا تھا اور نہ پہننے سے تکلیف دیتا تھا۔ پنڈلیوں کی نسیں پریچ سیولیوں کی طرح پٹھوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کوئی ناخن ثابت نہ تھا۔ بدن کے بال گنڈلوں کی طرح مڑے ہوئے تھے۔ داڑھی کی سفیدی پیلی پر لگی تھی۔ گندمی رنگ جل کر مٹیالا ہوا ہاتھ اور یہ اُن کی فراست کے عین مطابق تھا۔ ”انسان، فطرت کی سب سے بد صورت خلقت ہے کیوں کہ اس کا سُسن، سُسن تعمیر سے عبارت ہے، جو اس کا حالات کے خلاف مُسلسل جدل کا حاصل ہے۔ اس نے جہاں جتن چھوڑ دیا یہ وہیں رہ گیا۔“

میرے بھائیاجی اپنی جسمانی خوب صورتی پر ناز کرتے تو تایا جی کہتے، ”رتن سیماں! انسانی اصطلاح میں خوب صورتی کے معنی ہیں، خود آگہی۔ یہ ضمیر حیات کے لئے بصارت ہے اور تنک ظرفی کے لئے وسعت۔“

وہ بہت حد تک اپنی دیکھ بھال کر سکتے تھے لیکن میں خدمت کرنے پر مُصر رہتا۔ میں اُن کے ناخن اور گوکھرو رکھائی اور ریتی سے اُس وقت کا مُتاجِب وہ نہا چُکتے۔ وہ میری دُور اندیشی اور کاریگری کو نئے معنی دیتے۔ ”ہنرورِ نئے تجربوں سے اپنے ہنر کی تجدید کرتا ہے اور اپنے آزار کے معنی کو پھیلاتا ہے۔“  
معدہ کمزور ہو جانے کی وجہ سے وہ کم کھانے لگے تھے۔ ماں دال اور بھری کا رُود ہضم شور با بناتی اور وہ اُس میں نوالہ بھگو کر کھاتے۔ وہ کھانا کھا چُکتے، میں اُنھیں وہیں پانی اور سلفجی اور تولیہ مہیا کرتا۔ اُن کے دانت پورے تھے۔ بوڑھوں کی طرح رکال اندر کو پیچکے تھے اور نہ ہونٹ، مُنہ میں دھنسے تھے۔ وہ بلا ناغہ کر کی مسواک کرتے تھے اور میں اُن کی عادت سے واقف تھا۔ میں کیکر کی تازہ شاخ کاٹ کر لاتا، کوٹ کر اُس کا بُرش بناتا اور اُنھیں دیتا۔ وہ مسواک کرتے اور ہاتھ مُنہ دھو کر داڑھی مچھ سٹواتے۔ اگر داتن کا کوئی ریشہ ٹوٹ کر بالوں میں رہ گیا ہوتا، میں اُسے نکالتا۔ وہ میرا ہاتھ چوم کر دھن بھاگ کہتے۔ وہ گنا چوسنے کے شوقین تھے لیکن گنا پھیل نہ سکتے تھے۔ میں نے بانک سے گنا پھیل، سرتوے سے گنڈیریاں بنائیں اور اُنھیں چوسنے کو دیں۔ اُنھوں نے دگنڈیریاں پھاڑ کر مُسکل سے چوسیں اور کہا، ”بیٹا، یہ تیرا ہی بھو جن ہے! تو ہی اس سے مرزہ لے۔“ میں اُن کے پاس بیٹھ کر گنڈیریاں چوسنے لگا۔ میرے بچپن کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ بروٹے (گنے کے ٹکڑے جو بوئے جاتے ہیں) کاٹے اور لمبی پوریوں میں سے گنڈیریاں بھی نکالتے۔ میں اتنی

گنڈیریاں جمع کر لیتا کہ جیب تو خیر جیب ہے، میرا دامن بھی چھلک جاتا لیکن میں ابھی گنڈیری پر مجموعے کی طرح بھینٹتا۔ وہ میرے حریصانہ رویے کو پیار کرتے لیکن اُس کا اظہار غصے سے کرتے، ”جتنی چاہے گنڈیریاں اٹھا لیکن گنڈا سے کی طرف ہاتھ نہ بڑھا۔ مجھ سے دور بیٹھ، وہاں! میں اُن کے پاس سے نہ اٹھتا تو وہ مجھے اٹھا کر اپنے سے دور بٹھا دیتے۔“

وہ جسمانی طور پر کمزور سہی، اُن کی آواز حیرت انگیز طور پر صحت مند تھی۔ میں اُن کی باتیں سننا اُن سے باتیں کرتا، وہ سوتے تو اُن کے پاس بستر لگا کر سو رہتا۔ ایک دن میں منہ اندھیرے اٹھا اور جنگل پانی کے لئے دریا میں سگھ کے رہٹ پر جان نکلا۔ اُس کے باغیچے سے میں گلاب کے پھول لایا اور انھیں کوزے میں ڈال کر اُن کے پاس میز پر رکھ دیا۔ کوزے کا منہ بڑا تھا اور پھول کم، اُس پر میرا مھوٹا پن، وہاں اُن کی حینیت بے ترتیب آنبار کی تھی۔ میری بدتمیزی انھیں بری لگی۔ کیوں نہ لگتی؟ وہ دنیا کی اس ریت سے واقف تھے کہ دنیا بد صورت کو اپنی غفلت سے مارتی ہے اور خوبصورت کو محبت سے۔ انھوں نے مجھے سمجھاتے آداب یاد دلاتے ہوئے کہا، ”پھول کا صحیح ٹھکانا پودے پر ہے۔ یہ نظر باز کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور اُس کی فرحت افزائی کا سبب بنتا ہے۔ تم اپنے بچپن میں ایک نظم سنایا کرتے تھے، پھول کی فریاد، یاد ہے؟“

”یاد ہے! میں نے قاتل ہو کر شرمساری سے کہا۔“

”پھول کی زندگی گردشِ آفرینش سے جڑتی ہے۔ اسے اس کے ماحول سے جدا کر دو تو اس کے وجود کو معنی منور دو۔ جیسے بھجاری اسے پوجا سگری بنالیتا ہے اور سُندری اپنی سُندرتا کا حصہ! تم ہنس رہو، اسے ایسے سجادہ کو کوئی نئی بات پیدا ہوا“ انھوں نے دعوتِ فکر و نظر دیتے ہوئے کہا۔

اُن کی بات دانش، رمز، مہر کی تخلیق تھی۔ اُس کا کوئی پہلو میری سمجھ میں نہ آیا اور میں تجبور و معذور اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اُن کے سمجھاؤ پر میں نے کوزے کے پیٹ کے برابر لکھوی کا سُورخ داڑھن بنایا، کوزے میں پانی بھر کر میز پر رکھ دیا اور اُن کی حضرت کے مطابق سامانِ فراہم کرنے لگا۔ سب سے پہلے انھوں نے ڈھکن کے درمیان چھید میں ایک سرکنڈا اکھڑا کیا اور پھر اُس کے اطراف چار و خس اس طرح لگائی کہ وہ دیران و بریاں خطے کی صورت نظر آئی۔ انھوں نے اُس میں سے سرکنڈا نکال دیا اور اُس کی جگہ پھول ڈال دیا۔ اُس منظر کے کھلتے ہی میں نے اُس کا مفہوم پایا اور میں بے اختیار چلا یا، ”یہ بالکل لالہ صحرالگتا ہے!“

وہ مسکرا دیئے اور کہنے لگے، ”میں نے بھی اسے اسی سے ملتے جلتے معنی دیئے ہیں۔ ہنگامہ فنا کے درمیان زندگی ایسے سر بلند ہے جیسے اس دیرانے میں پھول!“

زندگی کے بارے میں وہ ایک بصیرت افروز بات کہتے تھے، ”شوق میں احساس کا عنصر ہوتا تو زندگی اپنے معنی بدل لیتی ہے اور اس کی سختی، نرمی میں ڈھل جاتی ہے۔ پودے کے لئے پھول اور انسان کے لئے محبت ایک ہی بات ہے۔ ان کی خوشبو دوسروں تک پہنچتے ہی بنتی ہے۔“

وہ علم کی ایسی نفٹ تھے، جس میں لفظوں کے الگ معنی تھے۔ لیکن افسوس! کسی کو ان کے لفظوں کی حقیقی اہمیت کی وقعت نہیں تھی۔ میں ایک بد خو کی طرح دوسروں کو نشانہ بنا رہا ہوں۔ میں خود سے پوچھتا ہوں۔ جب تم خود ویسے ہی تھی، دوسروں کے منکے چھیں کیوں ہو؟ ہاں قارئین! میرے اس متعصب رویے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میری انانیت مجھے اپنے طریقے سے بہکائے رکھتی تھی کیوں کہ وہ میری تکمیل انفرادیت اپنے انداز سے کرنا چاہتی تھی۔ میں اُس کے ہاتھوں میں اُس کے میلان انصرع کا آلہ کار تھا۔ انانیت کی نفسیات جم غفیر کی سی ہے۔ جو کوئی اس سے بچنے اور سمت چھٹنے میں ناکام رہتا ہے، وہ روند جاتا ہے۔ میں کم و بیش مرود تھا۔

تایا جی کہتے تھے، ”انانیت کا سانچہ احساس ہے اور احساس کا عمل۔“

غلام بابہ بھول آدمی جیوں بانی بن مین

جیسے چولہا آگ بن، اکھیاں جیوتی بن

(بے عمل انسان کی حالت بمل بن چھلی، بے آگ چولہے اور جیوتی بن آنکھوں

کی سی ہوتی ہے۔)

وہ بیکاری کو انسانی خرابیوں کی جڑ کہتے تھے اور اپنا کام اس لگن سے کرتے تھے کہ ان کے ہاتھ اور آؤنا اور کام میں تکنیکا تال میل ہوتا تھا۔ کسی وجہ سے وہ کام کرنا بند کرتے، وہ تال میل ٹوٹ جاتا، لگتا کہ کام کھینچ کر سیدھی لیر کی طرح لمبا ہو گیا ہے۔ وہ کام کرتے ہوئے زیر لب گنگلاتے تھے۔ ان بے الفاظ سرود و نغمہ کا لطف بادۂ شبانہ کا سا تھا۔

ایک دن ماں نے ان سے پوچھا، ”بھائی جی! ہمارے گرد جہاں گئے، بُرے آدمیوں کے پاس ہی گئے، کیوں؟ کبھی اچھے آدمیوں کے پاس کیوں نہ گئے؟“

”جو زمین کمزور ہو، کسان اُس میں زیادہ ہل چلاتا ہے، زیادہ کھاد ڈالتا ہے، زیادہ محنت کرتا ہے۔ لیکن پیداوار کم اُٹھاتا ہے۔ معلوم ہے کیوں؟“

انھوں نے پوری تفصیل سمجھا کر سوال کیا جیسے انھیں امید ہو کہ وہ اُس سے صحیح جواب آخذ کر سکے گی۔ لیکن ماں نے کہا، ”اب ہی بتائیے!“



”کمزور زندگی کو راہنمائی اور پشتی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اور بُرا آدمی ایسی ہی زمین کی طرح کمزور ہوتا ہے۔“ انھوں نے اپنے سوال کا جواب آپ ہی دیا۔

”گیان کے پتا مجھ پر اتنا ظلم کرتے ہیں، کیا وہ کمزور ہیں؟“

میری ماں پر میرے بھائی جی کا تازہ تازہ عتاب ٹوٹا تھا۔ اُس نے اپنے دل کی تسکین کے لئے بات کی تہ تک پہنچنا چاہا۔

”ظلم و تشدد، بے بصیرتی اور اخلاقی کمزوری کی پیداوار ہے۔ انسان کی طاقت، دُردمندی میں ہے نہ کہ بے دُردی میں۔ لیکن عام انسان کی جہالت مُسلم ہے اور وہ اپنے معنی سے بے خبر ہے۔“ تایا جی نے اُسے دلا دیا۔

وہ اس بارے میں ایک اور مثال دیا کرتے تھے، ”استاد اُن بیٹوں پر زیادہ دھیان دیتے ہیں جو نالائق ہوں۔“

اُس بڑھاپے میں اُن کی صحت بھلا کیا سنبھلتی، میری خدمت گزاری سے اُن کے چہرے پر مچھنی سی تازگی آگئی۔ موت کس پر ٹکی ہے، جو اُن پر ظلمتی، اُن کا انجام آپہنچا، جو اُن کے وِچاروں ہی کی طرح خوب صورت تھا۔

بست کی کیمیاگری نے گندم کو سونے میں تبدیل کر دیا تھا۔ چند دنوں میں درانتی پڑنے والی تھی۔ باڈوں کا نام و نشان نہ تھا گویا آسمان کا دل، دھرتی ہی کی طرح صاف تھا۔ آنریوں میں مود آگیا تھا اور اُس طرح کوئل کے گلے کا سوز و گداز۔ وہ فطرت کی ثروت و سخاوت کا راگ الاپتی نہ تھکتی تھی۔ شہد کی مکھیاں نِیلیاں، بھونرے پھولوں کو ایسے چوم رہے تھے جیسے پڑوسی شبھ تیوہاروں پر ایک دوسرے کو نیوتے دیتے گلے ملتے ہیں۔ کاروانِ حیات پوری شان و شوکت سے رواں دواں تھا۔ عین اُس وقت جب سورج کی کرنیں کاروانِ حیات کی راہ روشن کرنے کے لئے بیدار ہوئیں، میں جنگل جاکر واپس آیا۔ تایا جی جاگ رہے تھے۔ میں نے دیکھا، وہ کچھ سوچتے لگے۔ تاکہ اُن کا دھیان نہ ٹوٹ جائے، میں اُن کے سر کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور اُن کا چہرہ پڑھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا، وہ اپنے اس خیال کا جائزہ لے رہے ہیں کہ میں نے نوعِ انسان کو کیا دیا ہے اور کیا لیا ہے؟

اُردوؤں کے درختوں پر گلدستوں کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ ترم ہوا سے ہلتے، دھدکرتے لگتے تھے۔ اُن کی کُنواری پوتہرتا سے سارا ماحول مہکا ہوا تھا اور گلابی عکس، تایا جی کے بستر کی رونق بنا ہوا تھا۔ وہ مسکرائے، اُن کے چہرے کی روشنی رنگین سحر کو بڑھا وادیتی جان پڑی۔ میں آگے بڑھا اور تسلیم بجا لایا۔

انہوں نے گلہ سٹوں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا، ”احساسِ لطیف ایسا مٹہر ہے جو اپنے ساتھ دوسرے کو سنوارتا اور مہر کا تا ہے، موسمِ بہار کی طرح۔ دیکھو! وہ درخت کل سوکھے اور مڑھکے ہوئے لگتے تھے لیکن آج لہک، مہک رہے ہیں اور ہمارے دیدہ و دل کی راحت بنے ہوئے ہیں۔“

پورے گاؤں میں وہ اپنی پیڑھی کے آخری فرد تھے اور اپنی دانش و حکمت کی واحد نشانی۔ میں اُن کے سامنے طفلِ سہی، جاہلِ سہی، بد عملِ سہی لیکن میرا دل سراپا محبت تھا۔ میں ایسا نہ ہوتا تو اُس گُزر اور گونگے وقت کو زبان نہ دے سکتا۔

اُن کی محبت بھری بات سُن کر میرے دل و دماغ مہک اُٹھے جیسے پوری فضا میں پھول کھل اُٹھ ہوں۔ میرے جی میں آئی کہ وہ باتیں کرتے رہیں اور اُن کے الفاظ خوشبو کے جھونکوں کی طرح آتے رہیں۔ میں کچھ نہ کہوں، بس سنوں تاکہ وہ بے روک بولتے جائیں اور وہ جاں فرّا جو ہر لٹاتے جائیں جو کبھی تیز تیز اور کبھی بھینا بھینا تھا۔ لیکن وہ خاموش ہو گئے اور وہ جادو ٹوٹ گیا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ جادو پھر چل نکلا لیکن اس بار اُس کی زنبیل میری زبان تھی۔ ”آپ کہتے ہیں کہ انسان مرتا نہیں پورا ہوتا ہے، کیسے؟“

”انسان ایک لایہ جان ہے جو دہری زندگی جیتا ہے، ایک حیوان کی اور دوسری تخلیق کار کی پہلی زندگی پوری ہو جاتی ہے تو کایا پلٹ لیتی ہے اور دوسری تخلیق کی شکل میں زندہ رہتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس میں پانچوں عناصر (مٹی، پانی، آگ، ہوا، آکاش) اپنی انفرادیت کھوتے ہیں اور امر ہوتے ہیں تخلیقِ نظریۂ وحدتِ اصل کی دیدہ صورت ہے۔“

اسے میں بوتا سنگھ آیا اور اُن کی عیادت کے لئے پلنگ کی باہی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھتے ہی باہی ترخ سے ٹوٹی اور وہ نیچے گر پڑا۔ وہ بگڑی سنبھالتا ہوا اُٹھا اور ترکھانوں پر برسے لگا، ”سبزی فروش اور ترکھان کی خصلت ایک سی ہے۔ وہ گلی سڑی ترکاری کھاتا ہے اور یہ گلی سڑی لکڑی سے گھر کا سامان بناتا ہے۔ کیوں سا دھو ریاں؟“

اُس کی عادت تھی کہ وہ وقت بے وقت طعنے، مہنے دیتا تھا اور اپنی ہانکتا تھا۔ ایک دن وہ دریا م سنگھ کے ساتھ تیمار داری کے لئے آیا تھا۔ دریا م سنگھ نے تایا جی کا حوصلہ بندھائے ہوئے کہا، ”بھائی جی! کب تک بیمار ہو گے؟ جلدی تندرست ہو جائیے اور غسلِ صحت کیجئے!“

اس سے پہلے کہ تایا جی کچھ کہتے، بوتا سنگھ بولا، ”غسلِ صحت کی بجائے، غسلِ میت کی بات کر، دریا م ریاں! دھرتی کا کچھ تو بوجھ ہلکا ہوا!“

تایا جی اُس کی بات سُن کر مُسکرا دیئے اور گویا ہوئے ”ہاں بوٹا سیایا! غُسلِ صحت کی طرح غُسلِ میت بھی روایت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ آخری دوسرائی نہیں جاتی۔ اور کوئی دھرتی پر بوجھ نہیں ہوتا! آدمی، آدمی پر بوجھ ہوتا ہے! اور کئی تو خود پر بوجھ ہوتے ہیں۔“

میں نے غصے سے اُسے دیکھا لیکن چُپ رہا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اُسے روکنے سے وہ ضد پکڑ لیتا تھا ورنہ بھونک بھانک کر چلا جاتا تھا۔

میں جلدی سے تایا جی پر جھکا۔ اُن کا سر ایک طرف گرا ہوا تھا۔ میں نے اُسے سیدھا کیا لیکن وہ دوسری طرف لٹھک گیا۔ میں نے گھبرا کر انھیں آواز دی، ”تایا جی! تایا جی!!“

بوٹا سنگھ سنجیدہ ہو گیا اور کسی ناگہانی حادثے کا خیال کرتے ہوئے، اُن کی نبض دیکھنے لگا۔

”نبض نہیں ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر پتھر سے لہجے سے بولا۔

”کیا کہا؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا اور سمجھا کہ وہ ٹھٹھا کر رہا ہے۔

”سورگ باس ہو گیا ہے! اُس نے اُن کے پیوٹے سر کا کر دیکھے اور اُسی بے حسی سے تصدیق کر دی، جس بے حسی سے اُس نے پہلی بات کہی تھی۔

میں جیسے تھا ویسے ہی جم گیا۔ میں نے نہ چیخ ماری اور نہ آہ بھری لیکن میرے اُسوایسے رواں ہوئے جیسے لبابِ تالاب سے دھلوان کی طرف لکیر کھینچ دی جائے تو وہ بہنے لگتا ہے۔

بوٹا سنگھ نے سنت گرجنِ سِکھ کو آواز دی۔ وہ کھڑا اُسے ٹھپ ٹھپ کرتا آیا اور تایا جی کے سر ہانے کھڑا ہو کر چلانے کے شلوک پڑھنے لگا۔ میں نے بوٹا سنگھ کے کہنے پر زمین پر کھیس بچھایا اور اُس کی مدد سے تایا جی کو پلنگ پر سے اٹھا کر کھیس پر لٹا دیا۔ میں نے اُسے وہیں رکنے کے لئے کہا اور گھر میں اطلاع دینے کے لئے بھاگا۔ ماں دودھ دودھ کر بالٹی اٹھائے انگن میں کھڑی تھی۔ مجھے بھاگتے ہوئے آتے دیکھ کر اُس نے تشویش سے پوچھا، ”کیا ہوا؟ سُکھ تو ہے؟“

”تایا جی تُرگ باس ہو گئے!“

اُس کے ہاتھ سے بالٹی گر گئی اور وہ لڑھکنے کے سے آنداز میں پیروں پر ڈھے پڑی۔ میں نے اُسے سنبھالا اور پکارا، ”ماں! کیا ہوا ماں؟ تم ٹھیک ہو؟“

وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی اور کچھ دیر دیکھتے رہنے کے بعد بولی، ”ہے واہرؤ! ہے واہرؤ!!“

اُس کی آواز میں اشکوں کا سیلاب دکھائی پڑا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا جیسے سارا ہوا، پانی بن

کر آنکھوں میں چڑھ آیا ہو۔ اپنی نئی ذمہ داری کا خیال کرتے ہوئے، میں نے اپنی بہن تریم کو روک بولایا، ماں کو اس کے حوالے کیا اور واپسی قدموں سے حویلی پہنچا۔ کچھ دیر کے بعد تائی، تائی ماں اور ماں روتے پیٹتے وہاں پہنچیں۔ تائی کو جوں ہی خبر ہوئی کہ تایا جی پلنگ پر پورے ہوئے ہیں، وہ رونا بھول گئی اور مجھ پر برس پڑی، ”بچو پیٹو! یہ مر رہا تھا تو تو نے اسے نیچے زمین پر کیوں نہ اتارا؟ ہائے، یہ نرک باسی ہوا! یہ پلنگ بھی ٹوٹ گیا، پیہرا سگھ کے جھینز کا پلنگ تھا۔ وہ کیا کہے گا؟ یہ سب تیرے کارن ہوا!“

وہ حرفِ علامت کی طرح مجھ پر برستی رہی اور اُس نازک صورتِ حال میں اپنی کٹھور دلی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ وہ بظاہر رورہی تھی لیکن اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اُس نے میری پیٹھ پر دو ہتھ مارا اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ہولے ہولے اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلا کرتی تھی۔ وہ دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی سامان اٹھانے لگی اور اندر رکھنے لگی۔ اُس نے مجھے مدد کے لئے بلایا لیکن میں دل ہی دل میں کڑھتا ہوا وہیں کھڑا رہا۔

وہ عودت، میری تائی ایک عمر تایا جی کے ساتھ رہی تھی، اُس فکرو عمل کے سرچشمے کی تنہا تک نہ بٹائی تھی لیکن سوکھی کی سوکھی رہی تھی۔ اُس کی سختی کانٹے کی طرح مُسلم تھی! وہ پھول کے سایے میں پلتا ہے لیکن اپنے اوصاف برقرار رکھتا ہے اور اپنے حریف سے لمبی عمر پاتا ہے۔

میری ماں، تایا جی کے پیروں میں بیٹھی، سرگھٹنوں پر رکھے خاموش رورہی تھی۔ وہ اپنے غم میں بالکل اکیلی تھی جیسے وہ اُس کا ذاتی سوگ ہو۔

بھایا جی لاہڑے میں ٹنگ پر تھے۔ میں نے امی چنڈ کو بھایا جی کو بلانے کے لئے بھیجا اور خود دلی کو تار دینے کے لئے ہریانہ جانے لگا۔ رام کشن وہیں کھڑا تھا، اُس نے کہا، ”میں ہریانہ جا رہا ہوں تار میں دے دوں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے! ایکسپریس دینا“

میں نے اُسے دس کانوٹ اور سرنامہ جیب سے نکال کر دیا۔

تایا جی کو ڈھانپنے کے لیے بوٹا سگھ نے تائی سے چادر مانگی۔ وہ بولی، ”تیلیٹی کو اکہری کر لو اور اُسی سے ڈھانپ دو۔ نہیں تو بستر کی درمی لے لو، اب اسے پھینکنا ہی تو ہے۔“

ماں نے گھٹنوں پر سے سر اٹھایا اور تائی کو تیرت سے دیکھا۔ اُس نے رقت سے کہا، ”بھائی! میں اس بستر کو بھیجنے لگی نہیں! یہ میرے لئے بھایا جی کی آخری نشانی ہے۔“

”تائی نے جیسا کہا تھا، میں نے ویسا ہی کیا۔ سنت کو چھڈ یاد آیا اور وہ چلا گیا۔ حویلی کے ایک

کونے میں نرسل کے پوٹے رکھے تھے۔ وہ اُن میں سے ایک لمبا نرسل نکال کر لایا اور مجھے دے کر بولا ”اے شرگماہی کے قد کے برابر کاٹ کر اُس کے ساتھ رکھ دے اور ڈور سے پاؤں کے انگوٹھے ایک ساتھ باندھ دے۔“

اُس کی بات کا روحانی پہلو میری سمجھ میں نہ آیا لیکن میں نے وہی کیا جو اُس نے کہا تھا۔ غم کی شدت بقدرِ توجُّہ ہے، توجُّہ بٹ جلتے تو یہ اپنے آپ کم ہو جاتا ہے۔ پُرسہ دینے والوں کا ہجوم چٹھنے لگا اور اس طرح کے سوال جواب شروع ہو گئے۔

کر یا کرم کب ہے؟

کیا کہہ سکتے ہیں!

دلی والوں کو تار دے دیا ہے؟

دے تو دیا ہے!

بے چاری اُم کو نہ آسکے گی!

کوئی سگاپاس ہوتا تو بے چارہ یوں نہ مرتا!

بھائیاجی کے آنے پر بزرگوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے مُردے کا کر یا کرم ضروری ہے۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی تایاجی کے آخری سفر کی تیاری شروع ہو گئی۔ بھائیاجی نے بودو رام سے کہا، ”گھر جاؤ اور بالَن میں سے موٹی موٹی لکڑیاں نکالو، میں گڈالے کر آتا ہوں۔“

”پندرہ مَن سے کم بالَن نہ ہو! گوئدارام اور ہری رتھ آدھے چلے رہ گئے تھے، انھیں گاڑنا پڑا تھا۔“ وہاں کئی لوگ کھڑے تھے۔ اُن میں سے کچھ نے لگ بھگ نیک زبان کہا۔

”ہم نے کون سا بازار سے خریدنا ہے؟ جو کچھ سوس کریں گے! گھر کا بالَن ہے جتنا چاہو ڈالو“ بھائیاجی نے لاپرواہی سے کہا۔

بھائیاجی ارٹھی بنانے لگے اور میں گھٹ (وہ کوزہ جس میں چتا جلانے کے لئے گرہ پتی لگتی لیتے ہیں) تیار کرنے لگا۔ اُس کام سے فارغ ہو کر تایاجی کو نہلانے کے لئے اوٹ کھڑی کی گئی۔ اُن کا لباس اُتارا گیا اور تسخے پر لٹا دیا گیا۔ اُن کے بدن کی تازگی مرچھائے ہوئے پھول کی سی تھی۔ پھولوں کے بارے میں وہ کسی کیسی باتیں کرتے تھے! ”پھول دھرتی ماں کی محبت کے سچے پیامبر ہیں۔ بھی وہ بے کہ وہ ہر دل کو بھاتے ہیں اور مرچھانے پر بھی نرمی اور خوشبو پوری نہیں گناتے ہیں!“ وہ پھول توڑتے نہ تھے، انھیں محافظ کی نظر سے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے جیسے وہ دولت مشترکہ آسٹاک ہو اور اُسے ذاتی تصرف میں لانا بددینا

آورد وضعی۔ وہ ہر کسی سے الگ الگ انداز سے محبت کرتے تھے۔ سماجی قدروں کے لحاظ سے اُن کی محبت تعمیری قدروں اور تجویزِ عمل سے عبارت ہے۔ وہ ضرورت مندوں کو قرض، قرضِ حسنہ کی شکل میں دیتے تھے، کسی کو ہنر سکھاتے تھے تو اُس کی محنت کی کچھ نہ کچھ تلافی ضرور کرتے تھے۔ وہ پورے گاؤں کو اپنا کنبہ مانتے تھے، اس کے باوجود کسی کو بھیک نہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ”ہر کسی کو محنت سے کما کر کھانا چاہیے۔ خیرات کی روٹی ایک طوق ہے! یہ جس کے گلے میں پڑتا ہے، اُس کے مرنے پر اُترتا ہے۔“

آرذہ جل (عُسلِ میت) کے بعد لاش اُرتھی پر رکھی گئی تو بھائی جی یکایک دھاڑ مار کر رو پڑے۔ میں نے انھیں اُس نازک حالت میں دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ماں کے دل میں اُبال اُٹھا جسے وہ دبا نہ سکی۔ اُس نے دپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے آپ کو سنبھال کر کہا، ”بھائی جی کی زندگی میں تیری آنکھ کا پانی مر رہا، اب یہ آنسو کیسے!“

وہ سُنتے ہی لال انگارا ہو گئے۔ انھوں نے اچھل کر پاس ہی پڑا ڈنڈا اٹھایا، اوپر لہرایا اور پھر کسی جذبے کے تحت ہاتھ نہ چلایا۔ انھوں نے پکیا کر گہری سانس لی اور روک لی جیسے رگوں میں جذب کر لی ہو۔ اُن کے منتھنے پھولے کے پھولے رہے، ہونٹ کھلے کے کھلے رہے، آبروتے کے تنے رہے، دیدے پھٹے کے پھٹے رہے اور آنسو بہتے بہتے رُک گئے۔ وہ اپنے شکار کو ناگواری سے گھورتے رہے اور گھورتے رہے جیسے اُن کا جذبہ اُمٹ اور اٹل ہو۔

اتفاقاً یہ بیساکھ کا مہینا ہے اور وہ واقعہ چھتیس سال پُرانا۔ میں انھیں دیسے ہی دیکھ رہا ہوں جیسے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اُس آتشِ فشاں کی طرح نظر آ رہے ہیں جو پھٹے، اوپر لپکے اور جم جائے۔ وہ پہلا موقع تھا جب انھوں نے اپنے حیوانی جذبے کو قابو میں رکھا تھا۔

بھائی جی نے رام نام ست ہے، کانورہ لگایا اور گھٹ سنبھالا۔ لوگ جنازہ اٹھانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ انھوں نے اُن کے شبدوں کو دہراتے ہوئے جنازہ اٹھایا اور اُن کے پیچھے ہوئے۔ اُرتھی کی پائنتی سامنے رکھی گئی جیسے کسی ملعون کی لاش کو گھر سے نکال رہے ہوں۔ زمانے کی دورنگی! تایا جی زندہ تھے تو اُن کلبیر اُمبارک سمجھا جاتا تھا۔ ہر کوئی جنازے کو کا ندھا دینے کے لئے بیتاب تھا اور یہ جذبے سے زیادہ اس روایت کا احترام لگتا تھا کہ جنازے کو کا ندھا دینا ثواب ہے۔ بوٹا سنگھ دور دور چل رہا تھا اُس نے جنازے کو چھوا انک نہ تھا۔ ایشر سنگھ نے طنزاً کہا، ”بوٹا ریاں! تو بھی ثواب کمالے۔ اب تیری باری ہے، تیرے بھی سارے ولی میں ہیں۔“

”ایشر ریاں! تو چنتا نہ کر۔ تم لوگوں نے اپنے سکہ کے لئے مجھے اٹھا کر مسان میں پہنچا نا ہے اور

پھر جلا ناہے۔ ورنہ یوں سڑوں گا کہ گاؤں خالی کروا دوں گا!“  
 اُس نے ایشر سنگھ کے ساتھ ہر کسی کا منہ چڑایا۔  
 ”بھگوان کرے ایسا ہی ہو!“ سنت گرجن سنگھ نے پاٹھ کرتے کرتے رُک کر کہا۔  
 ”بھگوان ایسا کیوں کرے؟ مجھ سے اُسے کیا تکلیف ہے؟ اُس نے مجھے پیدا کیا، میں پیدا  
 ہوا، جیسا دماغ دیا ویسا چیا، وہ جب بلائے گا چلا جاؤں گا۔ لیکن ہاں! اگر وہ بتا دے کہ وہ مجھے فلاں  
 دن بلائے والا ہے تو میں اُسے بتا دوں گا کہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔“  
 بوٹا سنگھ نے آخری الفاظ ایسے کہے جیسے کوئی معمار مقابلے کے ردے میں آخری اینٹ  
 لگاتے ہوئے اپنے ہاتھ ہارے ہوئے حریف کو دیکھے۔

”کون بد بخت اٹھائے گا تبھی؟“ گرجن سنگھ نے آخری زور لگانے کے سے انداز میں کہا۔  
 ”تیرے سوائے ہر کوئی! کیوں کہ تیرے لئے یہ گھائے کا سودا ہو گا!“  
 ”رام رام! رام رام!! دھرم ریتی کی کیا بے حرمتی ہے!“  
 بوٹا سنگھ کی بات سے سمجھی لطف اٹھانے جان پڑے۔ اُن کے رویے سے لگا کہ وہ اُس کی بات  
 پر یقین کرتے ہیں لیکن کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ہیں۔

شمشان آسنے پر ہر کسی نے جوتا اُتار دیا جیسے وہ پوٹر اسٹھان تھا۔ بھایا جی نے کرایا کر م کام  
 نبھالا، چتا پر کرایا ساگر کی ڈالی، گھٹ سے اگنی لے کر چتا سدا گائی اور گھٹ توڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں آگ  
 کی لپٹیں اٹھنے لگیں اور بھایا جی چتا سے کچھ دور کی پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اُن کی یہ عادت غیر معمولی ہے! وہ  
 ایک ہی اسٹھان پر پاؤں گاڑے پہروں بیٹھ سکتے ہیں۔ اُن کے ساتھ تایا جی کا کتا جوگی بھی بیٹھا ہوا تھا۔  
 بھایا جی چتا جلانے لگے تو وہ انھیں زور زور سے بھونکا تھا اور دھتکارنے پر ہی چپ ہوا تھا۔ وہ جیسے  
 بیٹھا تھا اُسی طرح بیٹھ رہا تھا، اپنا سر اگلے پاؤں پر ڈالے ہوئے جیسے اُس کی سر اٹھانے کی طاقت جاتی ہی  
 ہو۔ ایک ایک کر کے سارے چلے گئے۔ شام سنگھ، ملکھی رام، بھایا جی اور میں جلتی چتا کے سامنے بٹھے  
 بیٹھے رہے جیسے اُس پر تاثیر ماحول سے عبرت اندوز تھے۔

شام کا وہ وقت کس قدر بھیا تک تھا! انسان مَسان، جلتی چتا، ڈوبتا سورج، لال گوں  
 افق جیسے خون کا سیلاب اُمڈ رہا ہو۔ پھر ہر منظر ڈوبتے ڈوبتے گویا جیسے بڑھتے ہوئے اندھیرے  
 میں سایہ۔

کپال کرایا کے بعد ہم وہاں سے اٹھے، اگر وہ دوارے پُنیچے، نہائے، کپڑے بدلے اور مگر گئے

ماں چوہا چوکا لیب پوسٹ بھی تھی اور گھڑوں کا پیرانا پانی گرا کر تازہ پانی بھر رہی تھی۔

## باب ۵۹

وہ شخص ہے جہاں کا تنگ ظرف تنگ حال

بس نے متاعِ دردِ محبت کو کھو دیا (شاہر)

تایاجی کی آل اولاد تیبے پر گاؤں پہنچی۔ اُسی دن پھول چنے جانے تھے۔ اُن کے کیریا گرم پر اُن تمام رسوم و روایات کا لحاظ رکھا گیا جن کے وہ خلاف تھے۔ میں نے زندگی کے بارے میں اُن کے کئی وچار لکھے ہیں، ایک یہ بھی ہے۔ ”اپنے پاؤں کی کاٹ کے لئے عبادت کرنا، تیرتھ نہانا، آثر ہونے کی خواہش میں نام چھینا، دان دینا اور پُن کمانا مائس جاتی کا سب سے بڑا وبال اور بُدھی کا زوال ہے۔ مائس، گرم وادی ہے! اس کا سمبندھ اچھے گرم سے ہے یا بُرے سے۔ اس پر لازم ہے کہ یہ جس کے ساتھ بُرا کرے، اُس سے معافی چاہے، اُس کے زخم پر مرہم لگائے اور اپنے بے فیض دل کو فیض پہنچائے۔ پاپ کا شہید کپٹی گیا نیوں کی رچنا ہے۔ اُنھوں نے پہلے گرہ دشا بنائی، پھر گرہ پتر اور پھر گرہ دیکھنے کی پریم پرا۔ اس کے بعد اُنھوں نے نئے ڈھکوسلے نکالے جن سے وہ گناہوں کو توابوں میں بدلنے لگے اور گناہ گاروں کو آنے جینے کا وسیلہ بنانے لگے۔“

اُن کا تیرھواں بھٹے کی دیر تھی کہ دنیاوی باتیں پھر سے زندگی کا رکھ رکھاؤ بن گئیں۔ کیرتن سونے کی جگہ لوک گیت گانے جانے لگے۔ دنیاے فانی کے ٹھہرے ٹھہرے فلسفے دریائے حیات کی روانی میں بہہ گئے۔ کے رُکے اعتراض بدل نکلے، مڑھائے مڑھائے چہرے کھل اٹھے، سنبے سنبے تیشم کھلے قبچھ بنے لگے اور بات بات میں خیالات کے تضاد ابھرنے لگے مرحوم کے قصیدوں کی جگہ زندوں کی ضرورتوں کا ماتم ہونے لگا۔ کارخانے میں آؤزار اور رسوائی گھر میں برتن کھٹکنے، کھٹکنے لگے۔ فرش پر سے بورسے اٹھا دیئے گئے ماتمی پہراوے بدل لئے گئے، اپنے ہنر اور دوسروں کے عیب، بات چیت کا موضوع بن گئے۔ انکساری سے غرورِ نفس اور لبِ دلیمے سے کڑواہٹ جھلکنے لگی۔ ہر کوئی خود رائے، خود آگاہ، خود غرض نظر آنے لگا یوتی اور خطا ہی سمجھوتا ٹوٹ گیا۔ تُو تُو اور میں میں سُنائی دینے لگی گویا زندگی مٹھول پر آگئی۔



اور پھر وہ ہوا جس کی تہمت صرف آدمی کے سر کرتی ہے!

وہ بیٹے جو تباہی سیکھ جو دھوں اور انسان دوستوں کی قربانیوں کا ذکر گلا پھاڑ پھاڑ کر کیا کرتے تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنا نسب اُن سے جوڑتے تھے، ماں کا بٹورا (وہ یوں کہ ماں تینوں بیٹوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے) کر کے اُن کے بٹورے پر مجموع ہوئے۔ وہاں باٹھنے کے لئے اتنا تھا ہی کیا؟ پھر بھی اپنے ڈھب سے ہر کوئی بڑے بوالے کی فکر میں تھا۔ بات بڑھا ہی چاہتی تھی کہ میری ماں کی مصالحت کام آئی اور جیسا بے انت کوڑ چاہتی تھی، بٹورے کی پردھان بنا دی گئی۔

خانگی بھران میں اپنوں کے انتقامی جذبے اصلی رنگ دکھاتے ہیں اور اُن کی تنگ دلی اور کم ظرفی کے ایسے چہرے سامنے لاتے ہیں جو عام حالات میں دکھاوے اور سمجھوتے کے پردے میں چھپے رہتے ہیں۔

اجناس بیٹے، نقدی بٹی، مویشی بیٹے، زمین بٹی اور پھر وہ بٹا جس کے خیال ہی سے بیس کا پی جاتا ہوں۔ میرا کلیجہ میرے سینے سے اُچھلتا ہے اور جلتے ہوئے ڈھیلے کی طرح حلق میں اٹک جاتا ہے۔ میں سانس لینے کے لئے تڑپتا ہوں، نہیں کچھ سوچ سکتا ہوں اور نہ میں کچھ سمجھ سکتا ہوں۔ ذریعہ انساں سے میری نفرت! میں اسے دھرتی کی حقیر ترین چیز سمجھتا ہوں۔ میں اس کی خوبوں سے منکر ہوتا ہوں تو اس کے بارے میں ہر بڑی بات کو نفرت سے دیکھتا ہوں اور نفرت کے اس ہنگامے میں یوں گھرتا ہوں کہ خود سے بھی نفرت کرتا ہوں۔

وہ بٹورا! وہ ذلت آمیز بٹورا!! اس ذلیل حد تک ٹھوکہ تایا جی کی بگڑیاں پھاڑ کر تقسیم کی گئیں۔ اُس آندوہ ناک حادثے کا جگر دھار پہلو یہ ہے کہ حاضرین میں سے کسی نے بے انت کوڑ کو وہ شرمناک کام کرنے سے نہ روکا۔ سبھی چپ چاپ دیکھتے رہے۔ اُن کی خاموشی اس بات کی گواہی تھی کہ وہ وہمی چاہتے تھے، جو وہ کر رہی ہے۔

کاش! میں اپنی ہولناک کیفیت کا اضطراب الفاظ میں بھرسکوں، جلتے اور تڑپتے آنسوؤں کو کسی رقت خیز شے سے تعبیر کرسکوں، آہ سوزاں کو آہ رسا بنا سکوں، سینہ چر کر وہ زخم دکھا سکوں جو ابھی تک تازہ ہیں اور درد سے مجھے دیوانہ بنائے ہوئے ہیں۔ میں ایسا کرسکوں تو یہ روئے کاغذ، فرش تاہم کہہ ہو اور میرے قارئین ایسے تڑپیں جیسے تڑپتے ہوئے ہیں یہ عبارت لکھی ہے۔ اُس لمحہ جال کاہ میں میں شدت غم سے بے ہوش نہ ہوتا تو شاید خودکشی کر لیتا۔

تباہی کھیتوں میں ہوتے گھر میں، جوگی کو اپنی روٹی میں سے روٹی دیتے تھے، وہ لاوارث

ہو گیا۔ وہ گھر سے حویلی، حویلی سے کھیتوں، کھیتوں سے مسانوں میں جاتا جیسے انھیں ڈھونڈتا۔ وہ گلیوں اور گھروں میں سونگھتا ہوا حویلی میں پہنچتا اور ٹوٹے ہوئے پلنگ پر نظریں جمائے کھڑ رہتا۔ وہ اپنے تجسس میں کبھی پلنگ کے اندر گہرائی تک دیکھتا اور کبھی دور غلامیں۔ وہ تھک کر بیٹھتا تو اپنا منہ پلنگ کی طرف رکھتا جیسے اپنے مالک کی تلاش اس کی زندگی کا آخری مقصود ہو۔ حویلی سے باہر جاتے ہوئے وہ سرحد پار کرنے سے پہلے رکتا، کان گھما پھر اگر مستی جیسے کسی نے اسے بلایا ہو۔ کوئی اسے روٹی کا ٹکڑا پھینکتا، وہ اسے سونگھ کر چھوڑ دیتا۔ وہ مجھ سے زیادہ غم زدہ اور ادا اس تھا۔ کوئی اسے آواز دیتا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا لیکن دم نہ ہلاتا۔ تایا جی کی بیماری کے دوران وہ ان کے پاس سے ہلا نہ تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر نرم نرم قدموں سے ٹہلتے، جوگی سائے کی طرح ان کے آگے پیچھے رہتا جیسے ان کا نگہبان ہو۔ وہ لیٹے لیٹے کراہتے۔ جوگی اپنا اگلا پاؤں اٹھا کر انھیں لگا تا کو یا ان کا حال پوچھتا اور درد بانٹتا۔ بھائی جی کے معسوب پلوں میں سے وہ بیسایلا تھا جسے تایا جی نے تالاب کے کنارے پر ڈوبنے سے بچایا تھا اور پال لیا تھا۔

ایک صبح میں کھیتوں کو جا رہا تھا، میں نے جوگی کو شمشان میں لیٹے دیکھا۔ میں نے اسے اس کے نام سے بلایا، وہ ویسے ہی بے حس و بے حرکت پڑا رہا۔ میں نے دوبارہ پکارا وہ نہ ہلا تو میں تشویشناک قدموں سے اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اسے سہلایا تو اسے مرا ہوا پایا۔ میں بے اختیار رو پڑا۔ میرے غم کا غبار چھٹا، میں گھر سے کستی لایا اور وہیں گرٹھا کھود کر اسے دفنایا۔ میں گھر لوٹتا ہوا اس وفادار جانور کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسے دفن کر کے میں نے اس کے کسی جذبے کا پاس نہیں رکھا ہے۔ آخر میرے احساس نے اس کے جذبات کی وضاحت کر دی۔ میں اُلٹے پاؤں مسان میں گیا۔ میں نے جوگی کی قبر کھولی اور اس میں تایا جی کی راکھ ڈال کر پھر سے پائی۔

میں اس وقت سوچتا ہوں کہ حیوان کا اپنا کوئی فلسفہ ہے تو انسان کے برعکس ہے! جس کا کھاؤ، اس کے وفادار رہو۔

## باب ۶۰

خوبیاں لاکھ اپنی ذات میں ہوں

(شاہ)

عیب لازم ہے ہو بھلے کم کم

بھی قصدِ سفر کرنے لگے۔ میں نادان نہیں تھا کہ مجھے ترغیب و راہبری کی ضرورت تھی۔ میں نے تایاجی کے کنبے کے ساتھ دلی کے لئے سامانِ سفر باندھ لیا۔ میں دنیاوی رشتوں کو جتنا قریب سے دیکھتا تھا اتنا ہی ریاکار اور سخت ہوتا جاتا تھا، یوں نہ ہوتا تو میں کسی سے میل جول نہ رکھ سکتا۔

او انسانِ رشتہ! تم نے مجھے کیسے کیسے جاں کا ہجر کے دیئے ہیں! تمہاری وجہ سے میں کتنے غمناک اور دکھ کا شکار ہوا ہوں! تمہارے مُسلم فریبوں کو بے نقاب کر کے ہی میں نے اپنا بھرم کھویا ہے۔ تم مجھے اور دھوکا نہیں دے سکتے تھے! میں مجرّد مرنے پر مُصر تھا لیکن میری نفس پرستی! اس نے مجھے متزلزل کر دیا اور میں بیاہ کے بندھن میں بندھ گیا۔ اُس پر میری مجبوری اور ابنِ الوقتی! میں نے اُن مقدّس رسموں کا احترام کیا، جنہیں میں ذلیل سمجھتا تھا۔ ریت (وہ کلمات، جن کے تحت آدمی اور عورت بیاہ کے بندھن میں باندھے جاتے ہیں) کے لحاظ سے میری ماں کو مجھے سو بر اور پندت جتنا چاہیے تھا لیکن اُس نے مجھے بُردل اور جاہل بیدا کیل ان خوبیوں کے گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے میں نے سر پر کھنی لگائی اور شمشیر زیب کر لی۔ اُن رشتوں کو سراہنے سے میں نفرت کرتا تھا۔ اس کی وجہ! عورت کے لئے میری بھوک مُستل تھی جسے مُستقل طور پر حاصل کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا۔ یہ جو کچھ ہوا، ضرورت کے تحت ہوا لیکن سُریندر کور سے اس مفاہمت پر ہوا کہ میں بچوں کے خلاف تھا۔ اب مجھے اس کی بھی وجہ بتانی ہوگی! میں نہ چاہتا تھا کہ میرے بچے میری ہی طرح جسمانی و روحانی صدمے اُٹھائیں۔ لیکن لیکن میں پھر انسانی رشتوں کے جھانسنے میں آگیا۔ او ذلیل رشتہ! میں ہرگز تمہارے جھانسنے میں نہ آتا لیکن میری مجبوری! واٹے میری کمزوری! میں بھٹک گیا، نہیں نہیں، میں بہک گیا، میں شاید نہ بہکتا! لیکن سُریندر کی التجاؤں نے مجھے بے بس کر دیا اور اُس سے میں نے ایک بچے کی حد تک سمجھوتا کر لیا۔

تایاجی کی موت کے بعد میں ایک نئے تغیر سے روشناس ہوا تھا۔ میرے پڑھنے والے مجھے کوسیں گے کہ میں رہ رہ کر تغیر، تغیر کی کیارٹ لگا رہا ہوں! میں مجبور ہوں۔ زیرِ بحث موضوع آدمی ہے جس کا حسبِ مرشت نام، تغیر ہے۔ جو آدمی تغیر کے اثر سے متاثر نہیں ہے، وہ اُس مُقابل ماحول میں ہے جہاں مجہود اپنی زنجیر آپ ہے۔ تغیر کے ہزاروں چہرے ہیں! جسے میں دکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں بھائیاجی کی اذیت دہی کو کسی حد تک جائز سمجھنے لگا۔ میرا دل ٹوٹنے کی حد تک اُن سے کچھا رہتا تھا، اُس میں کچھ ڈھیل آگئی۔ مجھے میں یہ تبدیلی کیوں اور کیسے آئی؟

اجیت سنگھ بوت مال میں تھا اور درشن سنگھ ہریانہ میں۔ بھائیاجی کھیتی باڑی نیاگ کر اور زمین بھاڑے پر دے کر صرف ٹال کرتے تھے۔ گھر میں دوسرے کام دھام نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک ٹوکڑ (کا)

یا بھینس جو آٹھ نو ماہ دودھ دے چکی ہو اور آگے گا بھن نہ ہو) اور ایک تازہ بیانی بھینس تھی، جس بھال ماں کے لئے معمولی بات تھی۔ میرا کرہ لیپا پوتا اور الگ تھلگ تھا لیکن میں خیالوں کی ایک رنج پنجنے کے لئے برآمدے میں اٹھٹھا بیٹھتا۔ اُس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اُسے کھلا رکھنے سے تارہ ہوا آ اور آنے جانے والوں میں سے کسی کسی سے بات ہوتی رہتی۔ اس پر بچوں کا شور، ایک روتا ہوا گھر میں آنے دوسرا ہنستا ہوا گھر سے باہر جاتا۔ اُسی برآمدے میں بیٹھے ہوئے میں نے ایک تماشائے سال ہا سال دیکھ لیکن اس بصیرت سے نہیں جس کی تفسیر بیان کر رہا ہوں۔

وہاں چڑیاں رہتی تھیں۔ وہ اپنے جینگے بوٹے کس محنت اور محبت سے پالتی تھیں! اُن دنوں میں وہ انھیں اجیو کا (معدے سے اگلی ہوئی خوراک) کھلاتیں، پھر زود ہضم کیلے مکوڑے اور پھ ہوا دانا ڈنکا۔ انھیں جو کچھ ملتا اُس کا بیش تر حصہ بچوں کے پالنے پر خرچ ہوتا، اس کے باوجود وہ گھونسلوں میں لوٹتیں، اپنے بچوں کو چونچیں کھولے پائیں۔ اُن کے بال و پر نکالتے ہی وہ دستھیں اُسکھاتیں۔ وہ کہیں خطرہ دیکھتیں، شور مچاتیں، انھیں اڑنے پر اُکساتیں اور اُن پر سے خطرہ ٹلنے تک اُن غافل نہ ہوتیں۔ ہوتے ہوتے اُن کی پرواز متوازن ہوتی، چونچوں پر سے دال بھڑتی اور وہ دیکھے میں سے نظر کتے لیکن وہ اپنے بڑوں کے اتنے دست نگر ہو گئے ہوتے کہ سامنے پڑا چوکانہ چمکے۔ وہ یہی چاہتے کے ماں باپ ہی دانہ بھرائیں۔ وہ چونچیں کھولے، گردنیں میکڑے، بیکوں کی سی صورت بنائے چوہ دیکھتے، چوں چوں کرتے اور اپنے ماں باپ کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے اُن کے آگے پیچھے گھومتے۔ کے ساتھ ماں باپ کے جذبات بدلتے وہ اُن سے پیچھا چھڑانے کے لئے اُن سے جنگ کرتے۔

میں اپنے باپ کے شجرے پر غور کرتا۔ خوشحال سنگھ کی اولاد کتنے کنبوں میں بٹی تھی! سنا مہند سنگھ، اودھ سنگھ، لال سنگھ، ہری سنگھ، دیپام سنگھ، عطر سنگھ، ایشر سنگھ، رام سنگھ، راج دولت رام، بلی رام، ملکی رام، سادھو سنگھ، رتن سنگھ۔۔۔۔۔ ان سب کے بچوں کے بچے تھے۔ یہ سار ایک ہی گھر میں رہتے، ایک ہی چولہے میں پکاتے، ایک ہی چوکے میں کھاتے، ایک ہی کام کرتے تو یہ بھوکے مرجاتے۔ ہر کوئی اپنے انداز میں جیتا تھا اور یہ اختلاف و انحراف کا ہدیہ تھا۔ اب رہا میرے بھائی کی بدخلقی کا سوال؟ انسانی اور آسمانی سختی سے پنجنے کے لئے جفا کشی، زندگی کا تقاضا ہے۔ یہی ہے اور دوئم زاد میں جو ایک دوسرے کے میلان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اُن کے متواتر سخت کام نے انھیں کٹھ چیت بنا دیا تھا۔

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ بھر ساؤن تھا اور آب جو پر ٹوفانی دریا کا گمان ہو رہا تھا۔

جو کہ اُس پار کی زمین اُونچی سطح پر تھی اور اس پار کی کناروں کے برابر۔ بھائیاجی کا ندھے پر کُسی رکھے کھیتوں کی مینڈوں پر گھوم رہے تھے۔ وہ وہاں سے اب جو کہ کنارے تک جلتے۔ گنگ کھیلے پانی پر ایک نظر دوڑاتے، واپس لوٹتے، کھیت میں نیچے جھک کر مینڈہ اور اب جو کہ کنارے کو ایک ساتھ دیکھتے، آنکھوں ایسی آنکھوں میں دونوں سطحوں کا مقابلہ کرتے اور جہاں مینڈہ نیچی لگتی وہاں مٹی ڈال کر پیروں سے دباتے۔ وہ کئی گھنٹوں سے موسلا دھار بارش میں گھوم رہے تھے۔ اُن کا بھول بہہ رہا تھا اور کچھا، کُرتہ، جلد تک بھیگا ہوا تھا۔ سردی سے اُن کے رونگھے کھڑے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں، روٹی کے گالے سے سفید ہو رہے تھے جو بدن کا حصہ نہ لگتے تھے۔ تکلیف اور مصیبت میں اُن کی قوت برداشت انسانی حدود کو پھلانگ جاتی تھی۔ وہ اپنی ضرورت سے کم سوتے اور کم کھاتے۔ میں اُن کے لئے پوست اور پتھری کا گرم کاڑھالے کر گیا۔ اُنھوں نے بے پردائی سے کہا، ”اِس کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کاڑھالے اُن کی جانب دیکھتا رہا۔ اُنھوں نے میرا دل رکھنے کے سے انداز میں کہا، ”لایا ہے تو لا، پی لیتا ہوں۔“ اُنھوں نے مجھے سے جگ لیا، مونچھوں پر ہاتھ مار کر اُن پر سے پانی بھاڑا، پھرتے پھرتے اور بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے کاڑھالیا، خالی جگ مجھے دیا اور احساسِ خاطر سے کہا، ”تو گھر جا، یہاں ٹھنڈ ہے، بیمار ہو جائے گا۔“

نفرت اپنی غضبناکی میں وحشت خیز رہے لیکن حیرت انگیز حد تک گل ریز رہے۔ میں پھری ہوئی اب جو کا نظارہ کرنے کے لئے رُک گیا۔ کالی گھٹا، طوفانی پانی، اندھی دھند، کڑی بجلی، سنسناتی ہوا، فسادِ فضا، پھسپھسی دھرتی۔۔۔۔۔ ماقبل تاریخ کا منظر پیش کرتی اور بھائیاجی اُن بھیا تک حالات کا بھیا تک معجزہ۔ جب وہ ٹھکے مینڈ پر اکڑوں بیٹھ جاتے، کسی کے دست پر بوجھ ڈال کر ٹانگوں کا تناؤ دور کرتے جوں ہی اعضا کچھ ڈھیلے پڑتے، اُٹھ کر گھومنے لگتے۔ ناگہاں رُک کے پاس اب جو کہ دریٹوں نے باندھ توڑ دیا۔ پانی کو ندے کی طرح لپکا اور لاوے کی طرح پھیل گیا۔ ہم دونوں نیک زبان چلائے، ”باندھ ٹوٹ گیا“ اُنھوں نے مجھے دُور اُونچی جگہ پر بھگایا اور خود وہیں کھڑے رہے۔ دم پر کھڑے اور چمکاتے ہوئے سانپ کی طرح بڑھتی ہوئی دھار کے سامنے جو چیز آ رہی تھی، وہ اُسے ٹھکرتی جا رہی تھی۔ لیکن بھائیاجی وہیں کھڑے تھے کتسی لہرائے ہوئے، رینہ تانے ہوئے، یادیں جمائے ہوئے، آنکھیں پھاڑے ہوئے جیسے وہ اُس تباہی کی تندی سے ٹکر کر اُس کا منہ موڑ دیں گے۔ اُن کی سرکشی دھرتی کی اصلیت کی طرح بنیادی اور کثرتِ حیات کی طرح ناقابلِ تسخیر تھی۔ اُن کی جدوجہد کی سرگرمی اس حقیقت کی ترجمانی کرتی تھی کہ مصیبت کتنی ہی مزدنگ کیوں نہ ہو وہ انسان کو نہیں مٹا سکتی!

اُن کی اپنی کتنی ضرورت تھی؟ اپنا ایک پیٹ وہ کسی طرح بھی پال سکتے تھے۔ وہ ایسے خطرے

مول لیتے تھے! اپنا لہو، پیسینہ ایک کرتے تھے اِس کے لئے؟ وہ دن کو دن اور رات کو رات کیوں نہ سمجھتے تھے؟ کس کاندھے پر رکھے اور برچھا ہاتھ میں تھا۔ وہ رات رات بھر کانگری سے پیر پھلا ہی، پیر پھلا ہی سے مقام اور وہاں سے کانگری کا چکر لگاتے اور بھٹیوں کے موکھے (جوں جوں لکڑی جلتی ہے، بھٹی بیٹھتی ہے اور سرپوش مٹی میں دراڑ پڑتی ہے۔ اُسے وقت پر بند نہ کرنے سے کوئلہ، راکھ ہو جاتا ہے) بند کرتے وہ جتنا کھاتے تھے اُس میں سے زیادہ نہ سہی، میں اتنی مقدار کا حصّے دار تھا جو میری پرورش اور پوشش کے لئے کافی تھا۔ اتنی کڑی مشقت کے بعد وہ چولہے کی گرمی سے مکمل لطف اٹھانے کے لئے اُسے پورا گھر لیتے اور ہر کسی کو وہاں سے دُور بھگا دیتے تو اُس میں کیا بُرائی تھی؟ اُن کی سردی کھائی اور محنت سے چور ہڈیوں کو گرمی اور آرام کی زیادہ ضرورت تھی۔ میں جب گھر میں لحاف کے گداز میں محو خواب ہوتا تھا، وہ جنگل کے خطوط سے اکیلے لڑتے اور بروت بارہوا سے بچنے کے لئے بھٹی کی گرم مٹی سے لگ کر رات گزارتے۔ میری ماں انھیں زیادہ گھی اور زیادہ دودھ دیتی، تھال میں کٹوریاں سجا کر انہماں سے کھانا کھلاتی تو انھیں اُس خاص رعایت کی ضرورت تھی۔ میں ہی تھڑکلا تھا جو اُن کے منفرد حقوق پر جمل مرتا تھا۔ پورے کنبے کا بار وہ اکیلے اٹھاتے تھے۔ اُن کی سلامتی کنبے کی سلامتی کی علامت تھی اور ضمانت بھی۔ عورتوں میں یہی مصلحت کا فرما ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضرورتوں اور سہولتوں سے تنگ آکر انھیں بُری بھلی بددعا دے دیتی ہیں لیکن اپنے مردوں کی بد مزاجی پر الگ طریقے سے برہم ہوتی ہیں۔ وہ روتی ہیں، سرپیٹتی ہیں، دُوب مرنے کی سوگند کھاتی ہیں لیکن انھیں ایسے بول نہیں بولتی ہیں جو اُن کے زوال کی ترجمانی کرتے ہوں۔

زیادہ نہ سہی، کم کم ہی سہی، میں اپنے بدلے ہوئے احساس سے مصالحت کر چکا تھا۔

## باب ۶۱

کتنی بے لطف! کتنی بے معنی  
زندگی میں نہ کوئی تیج نہ خم (شاہ)

آدمی کا سب سے زوال پذیر فطری فعل کام سے جی چڑا نا ہے۔ جس کسی کی ایسی فطرت ہے،

وہ داغ دار پھل کی طرح ہے جسے اپنی بڑھتی ہوئی فرسودگی کا علم نہیں ہوتا۔

میری ماں کا ذوقِ نظر کام طلب تھا۔ اُس کے پاس کام نہ ہوتا تو وہ کام ایجاد کر لیتی۔ اُن اُمید خاں داری میں سے ایک کام خاص طور پر قابلِ ستائش ہے کیوں کہ اُس میں اُن بے زبانوں کی بھلائی کا جذبہ کار فرما ہے جن کی خاموش خدمات گھر کے ہنگامے میں نظر انداز رہتی تھیں۔ طویلے کے ایک طاق میں سرسوں کے تیل کی کٹوری رکھی رہتی تھی۔ جوں ہی ماں اُس کٹوری کو اٹھاتی، مویشی سر ہلاتے اور اُڑاتے جیسے پہلے نہیں پہلے تیل کی دہائی دیتے ہوں۔ وہ جس مویشی کے بدن پر ہاتھ رکھتی، وہ ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے انداز میں خیر مقدم کرتا لگتا۔ وہ اُس کی چھڑیاں توڑتی اور انھیں تیل میں ڈبو کر مارتی۔ ایک ایک کر کے وہ ہر کسی کے پاس جاتی، اُسے اُس کی نحوست سے نجات دلاتی، چمکارتی اور بچکارتی جیسے اُس سے اپنی بے توجہی کی معافی چاہتی ہو۔ اُس انسانی رشتے میں دردمندی کے ایسے پہلو پوشیدہ ہیں، جنہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ماں طویلے سے جانے لگتی، مویشی دُم ہلاتے، کان پھٹ پھٹانے اور پیارے پیارے آواز سے نکالتے جیسے اُس کے ہمدردانہ رویے کی داد دیتے ہوں۔

فالتو وقت میں بھائیاجی اپنے ڈھنگ سے مصروف رہتے تھے۔ وہ بھینس مونڈتے، بیل نہلاتے، درانٹیاں تیز کرتے، ربے چنڈتے (کسی ہتھیار کو تھوڑے سے پیٹ کر تیز کرنا)، جالیاں اور جال مرمت کرتے، جب کوئی گھریلو کام نہ ہوتا، پھندیت لے کر جنگل میں نکل جاتے اور تیر، بٹیر، پھکولاتے۔

میں دہلی میں گاؤں کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے وہاں کی ہر چیز ٹھہری ٹھہری لگتی تھی لیکن یہاں کتنی تبدیلیاں آئی تھیں! جو گند سنگھ کی بیوی نے اٹھ سال کی بارنچہ زندگی گزارنے اور اپنے سُسرال کی تلامتیں بھیلنے کے بعد وارث کو بچم دیا تھا، جس کا نام گلزار سنگھ رکھا گیا تھا۔ جس گھر میں اُسے بیگار کامگار سے بدتر سمجھا جاتا تھا، وہاں اُسے پلنگ پر بٹھا کر پیچیری کھلاتے تھے اور کام کرنے سے روکتے تھے۔

ایشر سنگھ کے پانچ لڑکے تھے، جنہیں وہ اپنے دس بازو کہتا تھا۔ اُس کا بڑا لڑکا، جو میرا ہمنام تھا، دہلی میں کسی فساد میں مارا گیا تھا۔ ایشر سنگھ نے اپنے لڑکے دیوان سنگھ سے سرجیت کور (گیان سنگھ کی بیوی) پر چادر ڈالوا دی تھی۔ دیوان سنگھ عمر میں مجھ سے کچھ مہینے چھوٹا تھا لیکن ڈیل ڈول میں پورا آدمی تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہنے لگا اور جاداد سے دو حصے مانگے لگا۔ ایشر سنگھ نے ایک حصہ دینا چاہا تو وہ ساری فصل زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ ایشر سنگھ مجھ سے ملا۔ اُس کا رویہ پہلے سے بدلا ہوا تھا۔ اُس نے مجھ سے

جذباتی انداز میں کہا، ”کاکا، میں جن بچوں کو بازو سمجھتا تھا وہ آخر کار سانپ ثابت ہوئے! میں تجھے کمزور دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ تو جھیک مانگے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے سانپ جیسے لڑکوں نے مجھے بھکاری بنایا“ اُس نے اپنی سچائی کا اعتراف کیا۔ مجھے اُس پر ترس آیا۔ میں اُس کی ایک اور کڑوی سچائی جانتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا، ”دیر جی! جو آپ نے اپنے ماں باپ کے ساتھ کیا وہی آپ کی اولاد نے آپ کے ساتھ آپ کو برا کیوں لگا؟“

میرے غیر متوقع سوال سے وہ اُلجھ سا گیا اور کچھ دیر کے بعد کہنے لگا، ”میں سمجھتا تھا کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ میں اُن سے بدلہ لینے کا جذبہ پالتا تھا۔ میں نے خود سے مننا کیا تھا کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا لیکن اب مجھے اچھے، بُرے میں فرق نہیں لگتا ہے۔ اچھا کیا ہے؟ بُرا کیا ہے؟ سامنے والے کی سوجھ بوجھ پر ہے۔“

”میں نے آپ کا کیا لگاڑا تھا جو آپ میرے بارے میں ایسا سوچتے تھے؟“

اُس کے خود میں ردیتے سے فائدہ اٹھا کر میں نے اُس کے جذبے کی ٹوہ لگانی چاہی۔

”جَلَن، اور کیا! ہم سب ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ کوئی مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے، کسی کو میں خواہ مخواہ! اور اُس کشاکش کا حاصل ہے یہ گلی مٹری زندگی۔ ہم جتنا جتن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے کرتے ہیں اُس کا گئی ماتر ایک دوسرے کے سہاے ہوتے تو اپنی اپنی جگہ سارے ہنسی خوشی رہتے۔ سادھو سیکھ کتنا بھلا مانس آدمی تھا! اُس کے بچوں نے اُس کی عزت مٹی میں ملا دی۔ کون جانے میرے ساتھ کیا ہوگا؟ میں نے ہر کسی سے کہہ دیا ہے، میرے مرنے پر جو پاٹھ کروائے، نہ رک میں جائے! زندوں کو روٹی نہیں دے سکتے، مردوں کے شرادھ کرواتے ہیں۔“

راتنے میں اُس کا لڑکا دھیان سنگھ وہاں آگیا اور ایشور سنگھ چپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔

سایاجی کہتے تھے، ”جس کسی نے عدم رواداری کا بیج بویا، وہ آخر پھٹتا یا اور خود بھی اُسی کا شکار ہوا۔ چوں کہ انسان، حیوان ہے اور عدم رواداری اس کی فطرت، اسے رواداری کا سبق پڑھانا لازم ہے ویسے انسان مثال سے زیادہ سمجھتا ہے۔ جس طرح اوزار، ہنر کا اول و آخر چارہ کار ہے اُسی طرح رواداری انسانی رشتوں کا۔“

دلی سے لوٹ کر میرے ہم عصروں میں میرا مرتبہ اُس گدھے کی مانند بڑھ گیا تھا جو کاشی ہو آئے۔ وہ مجھے درآمد شدہ شے کی طرح عزت اور حیرت سے دیکھتے تھے۔ میں نے ریاکاری اور خاموشی دونوں ہی سے کام لیا۔ کہیں وہ جان پیتے کہ میں دلی میں طویلے سے بدتر مکان میں رہتا ہوں اور گندے سڑے



ڈھابے میں کھانا کھانا ہوں، وہ ضرور مجھے ذلیل کرتے اور ملعون سمجھتے۔ وہ میرے صاف ستھرے کپڑوں سے مرعوب تھے اور دلی کو عیش و اِطرا کی سُرزمین مانتے تھے۔ وہ مجھ سے دلی کی دوشیزاؤں کے بارے میں پوچھتے جو سن گھڑت کہانیوں کے مطابق مانگ پٹی سجائے گاؤں کے پٹھوں کا انتظار کرتی ہیں اور اُن سے اپنی جنسی جھوک سٹو کر انھیں مالا مال کر دیتی ہیں۔

قاربین، احساس کی نفسیات دریا کی طرح ہے! یہ کمالِ جوش میں ہو تو دُور دور تک اثر انداز ہوتا ہے ورنہ اپنے ہی کناروں کو پیا سا رکھتا ہے۔

میں پھرتے پھرتے گھاٹ پر جا نکلا۔ لاجوتی پٹری پر بیٹھی تھی اور اُس کا مردِ لیا رام کچھ دُور پر جگان باندھ رہا تھا۔ لاجوتی کے بارے میں شیر سنگھ کی دونوں باتیں غلط تھیں، پہلی یہ کہ چلتی سورت اور چلتی راہ ہری نہیں ہوتی، دوسری یہ کہ آوندھے گھڑے کو دریا بھی نہیں بھر سکتا۔ لاجوتی پیٹ سے نچی اور گول مٹول ہو رہی تھی۔ اُس کی جلد گدراے پھل کی طرح چمکتی تھی اور رنگت نکھری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسے خوش ہوئی جیسے دریا طغیانی میں کناروں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ میری اُننگ، ترنگ میں بدل گئی اور میں نے اُسے آنکھ ماری۔ وہ شرمائی۔ اُس کی شرم کچے میوے سے لدی ٹہنی کی لرزش تھی جو اُس دلا کر نراش کرتی ہے۔

”کیسی ہو؟“

میرے لہجے میں پوشیدہ اُمید کا ہلکا سا عکس تھا۔

”میں ماں بننے والی ہوں!“

اُس نے میرے گمراہ کُن انداز کو نظر انداز کر دیا اور اپنی حالت پر فخر کیا۔

”کس کا ہے؟“

چوں کہ اُس سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا، میں نے اُسے اڑانا چاہا۔

”میرا ہے!“

اُس کے جذبات کے ساتھ چہرے کا رنگ بدلا جسے میں نے اڑتے اور مجھ پر منڈلاتے دیکھا۔

”آپ کیسے ہیں سردار جی؟“ لیا رام نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں!“ میں نے کھیتوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں نے چند قدم آگے جا کر پیچھے مڑا کر کہا۔ لاجوتی ویسے ہی تنہی کھڑی تھی اور مجھے غصے سے

دیکھ رہی تھی۔ اُس کا گھمنڈ، فطرت کے تخلیقی رُحان کی ایسی نظیر تھی جس پر غور کرنا، یقین کرنا ہے۔

پودا دھتورے کا ہوکہ سنگترے کا، اپنے پھل پر ناز کرتا ہے اور اُسے اُس کے کمال تک پہنچاتا ہے۔ اور یہی نفسیات آدمی کی ہے۔ جو جسے ٹھیک سمجھتا ہے، اُسی کا تحفظ کرتا ہے اور اُسی کا ڈھنڈورا بٹاتا ہے۔ تہذیب نفس کا معیار، ذاتی معیار ہے۔ میں کیا ہوں؟ میں زور دے کر کیسے کہہ سکتا ہوں! ہاں، میں یہ ضرور کہوں گا کہ کسی کا تجزیہ کرنا آسان ہے اور اپنا مشکل، اور اُس سے مشکل ہے اپنی مرثت کو بدلنا۔ درشن سنگھ سائیکلوں کی دکان کیلایا ہی سمجھاتا تھا۔ اُس نے اپنے شاگرد پیشہ رتن چند کو چوری کے الزام میں نکال دیا تھا۔ اُسے ہمیشہ کسی مددگار کی ضرورت رہتی تھی، خاص کر اُس وقت جب اُسے کل پرزے خریدنے کے لئے باہر جانا ہوتا تھا۔ دکان بند رکھنا، دکان داری کی ادھار سے بڑی لعنت ہے۔ اُس نے دکان پر یہ تختی لٹکار رکھی تھی۔

آج نقد کل ادھار

نوا ہو واقف خواہ ہو یار

اس کے باوجود گرینچ سنگھ ٹائر اور ٹیوب ادھار لے گیا تھا اور دام چمکانے کا نام نہ لیتا تھا۔ درشن سنگھ نے میری موجودگی سے فائدہ اٹھایا، دکان مجھے سونپ کر لدھیانہ چلا گیا اور جاتے ہوئے تاکید سے کہا، ”کوئی میری بابت پوچھے تو کہنا کہ میں ننھیال گیا ہوں۔“ اُس کے اس جھوٹ کا مقصد تھا کہ اُس کے لدھیانہ جانے کا راز چھپائی محرز پر نہ کھلے اور وہ کل پرزوں پر محسول بچا سکے۔ درشن سنگھ نے دکان کے سامان میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔ اُس نے دکان کے دروازے کے متوازی دو آنکڑوں پر ایک بانس لٹکار کھا تھا جو نئے ٹائرول سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ نئے اوزار بھی خریدے تھے، اُن میں سے جال پانا قابل ذکر ہے۔ اُس ایک پانے میں چودہ پانے تھے اور ایک بیچ کس۔

رکھا مگر گیا تھا۔ وہ زندہ تھا تو درشن سنگھ اُسے دکان سونپ کر رات کو گھر آجاتا تھا، مجھے وہیں سونا پڑا۔ پہلے دن میں بیدار ہوا ہی تھا کہ ایک سائیکل سوار اڈے کی جانب سے پیدل چلتا ہوا آیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا، ”شکر ہے کہ تم مل گئے! اڈے کی دونوں دکانیں بند ہیں۔ اسے دیکھ، کیا ہوا ہے اسے؟ یہ پھلتے چلتے ٹک گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔“ اُس نے سائیکل، سٹینڈ پر کھڑی کی، اگلے سیٹیے پر جھکا اور اپنی بات کو جاری رکھا۔ ”یہ ٹوٹ گیا ہے، کیا کہتے ہیں اسے؟“

”چمٹا!“

میں جب تک سارے نقص کا جائزہ لے چکا تھا۔ بیک ٹیڑھا ہو کر فورک سے نکل ہوا تھا اور فورک بیرنگ غائب تھی۔

”آپ یہاں بیٹھیے۔ میں باہر جا کر آتا ہوں پھر اسے دیکھتا ہوں۔ کام لمبا ہے اور میں ابھی اٹھا ہوں۔“

میں نے چارپائی پر بسترہ کرتے ہوئے، اُسے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ذرا جلدی آنا! مجھے دُور جانا ہے، ہوشیار پور سے کگے، پُرہیراں۔“

وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بستر اٹھا کر اندر رکھا اور باہر چلا گیا۔ میں واپس آیا، وہ بڑی

بے قراری سے میری راہ دیکھ رہا تھا، دیکھتے ہی بولا، ”بڑی دیر کر دی؟“

”مگر اور باہر کی ٹٹی میں یہی فرق ہے! میں نے دیر کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔“

”خدا جانے، شہر کے لوگ چوہوں میں کیسے ہنگ لیتے ہیں؟ مجھے تو سوچ کر گھن آتی ہے۔ یہ

رواج انگریزوں کا چلایا ہوا ہے۔ وہ آپ چلے گئے اور اپنی ساری برائیاں مجھے چھوڑ گئے۔“

حالاں کہ اُسے جلدی تھی لیکن مجھے لگا کہ وہ چاہتا ہے کہ میں کام چھوڑ کر اُس کی بات سُنوں۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟“ مجھے متوجہ نہ پا کر اُس نے سوال کیا۔

اگلا پہیہ اور چمٹے کی نالی کھولنے کے لئے میں سائیکل کو جگاڑ (جنٹر) میں پکڑ رہا تھا اور

اُس کام میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے اُس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا، ”ادھر آئیے، جلدی

ہے تو تھوڑی مدد کیجئے۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں! اُس نے کگے بڑھتے ہوئے تیزی سے کہا۔“

اُس کی مدد سے میں نے سائیکل کو جگاڑ لگایا، ایکسل کے نٹ کھولے اور جوں ہی گز اور مٹکاڑ

کے تار نکالے، پہنچا اپنے آپ نیچے گر گیا۔ وہ سائیکل ہر کوئیس کا پرانا ماڈل تھا جس کے چمٹے کی آنکھیں

بند ہوتی تھیں۔ میں نے چمٹے کو اُس کی ٹانگوں سے کھینچ کر ایکسل میں سے نکالنا چاہا لیکن نکال نہ سکا میری

ناکامی سے متاثر ہو کر گاہک نے کہا، ”نہ انگریز سائیکل بناتے نہ میں یہ مُصیبت خریدتا!“

اُس کی جُت سُن کر میں جھلا گیا، ”آپ وہاں آرام سے بیٹھیے اور انگریزوں کے پیچھے مت

پڑئیے۔ یہ عقل کا کام ہے، عقل سے ہوگا، نہ کہ انگریزوں کو گالیاں دینے سے!“

”ٹھیک ہے! تو اپنی عقل لٹا، میں وہاں بیٹھتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ایک کون ڈھیلی کرتے

ہوئے اور دوسری کتے ہوئے، میں ایکسل کو ایک طرف لایا اور اُس میں سے چمٹے کو آسانی سے باہر نکال

لیا۔ گاہک گردن ڈالے بیٹھا تھا اور کبھی کبھی کافی آنکھ سے مجھے بھی دیکھتا تھا۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا

اور بولا ، ”واہ ، تو انگریزوں کا باپ ہے!“

”شکریہ ! ایک بات کہوں ، انگریز اتنے پاگل نہ تھے جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ سمجھدار کی بات سمجھنے کے لئے سمجھدار ہونا ضروری ہے!“ میں نے ہینڈل کی ڈھبہری کھولتے ہوئے ناصحانہ طور سے کہا۔

جیسے مذہبی اساطیر میں ہر رفتے کا ماخذ شیطان کو گردانتے ہیں ، اُسی طرح آزادی کے بعد لوگ اپنی ہر مصیبت کا باعث انگریزوں کو مانتے ہیں۔ ایک بار مڈی دل آیا ، کسی نے مشہور کر دیا کہ انگریزوں نے اُسے ہندوستان کی معیشت تباہ کرنے کے لئے افریقہ سے بھیجا ہے تاکہ وہ پھر ہندوستان پر قبضہ جاسکے۔ بند آکھوں والے چٹے کارواج بند ہو چکا تھا ، اُس کی جگہ کھلی آنکھوں والا چمٹا آتا تھا۔ میں نے چٹے کی بند آنکھیں کاٹ کر کھول دیں اور ریتی سے چراؤ کی بر کو صاف کر دیا۔ گاہک جو میرے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا ، میری پیٹھ تھپک کر بولا ، ”میں تو سمجھتا تھا کہ تو موٹا موٹا کام جانتا ہوگا ، تو تو ماہر نکلا کیا نام ہے تیرا ؟“

”گیان سنگھ!“ میں نے اگلی اور پچھلی بریک کو ہینڈل سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

”جیسا نام ویسا کام!“ اُس نے خوش ہو کر کہا۔

”شکریہ ، آپ بیٹھے!“

میں نے اُس کے جذبے کا احترام نہایت سادگی سے کیا لیکن میرے دل میں دلولہ خیز خیال آیا کہ کیوں نہ کوئی ایسی ایجاد کی جائے جو رہتی دنیا تک میرے نام سے پہچانی جائے۔

”تمہیں کام کرتے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔“ اُس نے بغیر کسی بناوٹ کے کہا۔

میں نے اُسے مسکرا کر دیکھا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ ہینڈل ، نالی میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے ہینڈل بولٹ کھولا ، اُس پر ہتھوڑی سے ضرب دی ، کون فری کی اور ہینڈل اوپر کھینچتے ، گھماتے ہوئے نکالا۔ اُس کے بعد ہر کام آسان تھا۔ میں نے بھٹی جلائی ، چٹے میں نئی نالی بٹھائی اور سائیکل فٹ کر دی۔ گاہک اتنا خوش ہوا کہ میں نے جتنی مزدوری مانگی ، ہنس کر دے گیا۔

میری ہریانہ کی زندگی دکان کے گرد گھومتی ہے اور ہر طرح کی یاد اُس سے جڑتی ہے۔ ایک یلو جادو بھری ہے ، جس کا تعلق صرف رات سے ہے۔ وہاں رات پڑتی نہیں ، چڑھتی تھی اور اُس رات کا چاند ، سادھورام تھا۔ میں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا ، اپنے دلی منے بدلتا گیا۔ اُس روا روی میں وہ وقت بھی آیا جب میں سادھورام کے طرز حیات پر فدا تھا۔ اُس کی خوش خلقی اور خوش الحانی پر بھایا جی طنز کیا کرتے تھے ، ”جسے بیٹھی بیٹھی نہ ہو اور بھولانی نہ ہو۔ اُسے دونوں طرف سے گانا چاہیے!“ اس میں

کوئی خرابی ہے جو ایک ہی طرف سے گاتا ہے۔“

سادھورام باغیچے کی آمدنی پر جیسا تھا اور تاں لگا شوقیہ چلاتا تھا۔ دوسرے تانگہ دانوں کے برعکس، وہ بم کے بجائے اگلی سیٹ پر سواری کے برابر بیٹھتا اور سمائی سے ایک سواری کم لیتا۔ وہ نہ کبھی پوش پوش، رولا مچاتا اور نہ کبھی چابک پیٹے کے تیروں سے ٹکرا کر راہ گیروں کو خبردار کرتا۔ اُس کام کے لئے تانگے کے چھاج میں گھنٹی تھی جو پاؤں سے دبانی سے بجتی تھی۔ اُس کے گھوڑے کے سردوال میں لال رنگ کا پھندا لگا ہوتا جس سے اُس کا تانگہ دُور سے پہچانا جاتا۔ وہ تانگے پر سیدھے ہاتھ کی جانب بیٹھتا جہاں چونگے میں چابک کھڑا ہوتا جسے وہ کبھی کبھار استعمال کرتا اور زیادہ تر گھوڑا لگام سے ہانکتا۔ وہ اپنے گھوڑے کو جیسے صاف ستھرا رکھتا، کوئی سنگھڑاں اپنے بچے کو رکھتی ہوگی۔ گھوڑے کو تانگے سے نکال کر وہ پہلے دُجی سے اُس کی دُم نکالتا، زیر بند کھولتا اور پھر ساز اُتارتا۔ وہ اُسے ریت میں لٹا کر لاتا، پانی پلاتا اور لے جا کر کھونٹے سے باندھ دیتا۔ وہ اپنے آپ کو گھوڑوں کا امام سمجھتا تھا اور سبق آموز انداز میں کہتا تھا، ”گھوڑا سفر سے آئے تو اُسے لٹانا ضروری ہے، نکان اُترتی ہے، لٹانے سے پہلے پانی ہرگز نہ پلانا چاہیے، بیٹ میں گانٹھ پڑتی ہے۔“

پختے اور جو، وہ سویرے جھگو دیتا اور شام کو انھیں اوکھلی میں در در کر کے حسب ضرورت چھوڑ دیتا اور توڑے میں ڈال کر گھوڑے کے منہ پر چڑھا دیتا۔ تھکا تازہ کر کے وہ ایک حلیم تبا کو بیٹا جب تک گھوڑا دانہ کھا پچتا۔ وہ توڑا اُتار کر گھوڑے کو آگاہی، پچھاڑی لگا دیتا، ایک ہاتھ میں کھر کھالیتا، دوسرے میں جیب اور کلائی کرتا، آخر کار گھوڑے کا بدن شیشے کی طرح چمکنے لگتا۔ وہ گھوڑے کو چمکارتا ہوا، اُس کا پاؤں اٹھاتا، کرملینی سے سُم کریدتا، پوٹلی سے چوٹا پھرتا، نعل کا معاینہ کرتا اور اُسے ٹھیک ٹھاک دیکھ کر فخر سے کہتا، ”جس کے گھوڑے کے سُم پر نعل اور گرہ میں مال ہے، اُس کے لئے سفر رخت کمال ہے۔“ وہ گھوڑے کے ایال اور دُم ماہ بہاہ دھوتا لیکن اُن پر کنگھی ہر روز کرتا اور کنگھی ہر وقت مارتا باغیچے میں کچھ قابل کاشت زمین تھی، جس میں وہ جڑالہ، برسم اور گندم اُگاتا تھا۔ جس فصل کا موسم ہوتا، وہ اُسے اپنے ہاتھ سے کاٹ کر لاتا اور گھوڑے کو کھلاتا، لگتا کہ کوئی ماں اپنے بچے کو نوالہ دیتی ہے اور اُس کی ناز برداری کرتی ہے۔

اُس کا باغیچہ، شہر کے محیط پر آخری مسکن تھا جس کے اطراف رات کی رانی اور جوبھی لگائی ہوئی تھی۔ جھاڑیوں کی سیاہ پوشی میں کلیاں، ستاروں کی طرح چمکتی تھیں اور اُس آبادی کے خوش نما ماحول کو لطیف بناتی تھیں۔ سدی کے پاکھ میں خوشبو کا رویہ اُس کٹواری کا سا ہوتا جو اکھیں ملائے،

مُسکرائے، گرمائے اور کل کی آس میں بہکا جائے۔ نہت گہرا سانس لے کر کہتا، ”کھترانی آہی ہے۔“ وہ اپنے تصور سے لطف لیتا اور موٹی، بھدی آواز میں گاتا،

نرم دیہ کھترانی دی (کھترانی کا بدن ایسا نرم ہوتا ہے  
جداں گڑوی بھری ہوئی پانی دی (جیسے ٹھلیا میں ٹھل ٹھل کرتا پانی۔  
سخت دیہ ہے جٹی دی (جٹی کا بدن چٹان کی طرح سخت ہوتا ہے  
جیٹری سئل مے ناں پٹی دی (جسے سئل سے کھو دنا پڑتا ہے۔

سادھورام کی آواز، جذبات کا ریلا تھا جو آدمی کو اڑا لے جاتا تھا۔ وہ اپنی شام کا آواز ان سطروں سے کلیاں چنتے ہوئے کرتا،

دو دبراد دل دے نال مل جا (دسے دبرآ، میرے دل سے مل جا  
جداں رانجھڑے ناں جٹی میر مل گئی (جیسے رانجھے یار سے ہیر ملی تھی۔  
شاہ برام نوں ملی سی حسن بانو (شاہ برام کو حسن بانو ملی تھی۔  
عالم گیر نوں بدر منیر مل گئی (اور عالم گیر کو بدر منیر۔

جوں جوں رات گہری ہوتی جاتی اُس کی آواز چاندنی کی طرح نکھرتی جاتی۔ وہ پھولوں کے چار گجرے بناتا تھا لیکن ایک خاص ترتیب سے۔ پہلے دو گجرے بنا کر وہ کلائیوں پر باندھ لیتا اور پھر دو بڑے گجرے بنانے شروع کرتا اور اُس کے ساتھ پھولوں اور عجوب کی کبھی نہ ختم ہونے والی مدح سرائی۔ وہی جانے وہ کب سوتا تھا؟ جب میری آنکھ کھلتی، میں اُسے گاتے ہوئے سنتا۔ کہتے تھے کہ اُس کا منسو باہمنی سے یارا نہ ہے۔ وہ دونوں کب ملتے تھے؟ وہی جانیں! میں نے منسو کو دیکھا تھا۔ اُس کے کا ندھول کی ڈھلانیں اور پیروں کی کمانیں دیدنی تھیں اور اُسی طرح دوسرے انگوں کی سُندر تائی۔ اُس کی چال، خوش خرامی کا وہ غنائی نغمہ تھا جس میں دلِ ربانی کا حسین پیام ہوتا ہے۔ جسم کی خوب صورتی متناسب اعضا سے ہے لیکن ناز کی قوسوں سے۔ یہ انھیں کا کرشمہ تھا کہ منسو کے خط وخال پگھل کر ایک دوسرے میں بہتے لگتے۔ روانی کی خوبی ہے کہ اس کا رخ اوپر سے نیچے کو ہوتا ہے، منسو اس چلن سے مستثنیٰ تھی۔ وہ اُس ندی کی طرح تھی، جو دونوں طرف بہتی ہو۔ اُس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے تایا جی کی ایک بات یاد آرہی جو بڑی کلا پورن ہے۔ ”فطرت کی تخلیق میں پرکار کو بڑا ذل ہے۔ یہ پرکار ہی کی پرکاری ہے کہ ہر شے اپنی سادگی میں تاحد کمال خوبصورت ہے۔“

منسو کوئی ایسا لفظ بولتی جس میں ’س‘ یا ’ش‘ کا حرف ہوتا تو سیٹی بجتی سُنائی دیتی۔

اُس کے ہونٹوں کی سرشتی ان لبوں کی سی تھی جو چومنے پر آمادہ ہوتے ہیں تو تھوڑا آگے بڑھ آتے ہیں اور بے اختیار لگتے ہیں۔

رُت کا کوئی پالک ہو، سادھو رام کے نغمے کی اڑان مُدام تھی لیکن اُس کے لئے رات شرط تھی۔  
لُسے ہزاروں بیت یاد تھے اور وہ اکثر موسم کے لحاظ سے گاتا تھا۔ ایشوراس کا بارہ ماس اُسے زبانی یاد تھا۔  
وہ ہر ماس کے پہلے نور کے رٹ کے ماس گاتا گویا اُسے خوش آمدید کرتا۔ ایک مؤثر ملاحظہ ہو۔

- ۱ چڑھے بیسا کھ خبر لے گھردی، بارغ پکے پھل تیرے
- ۲ کد تک میں ہٹھ کر ساں دل دا، دس ناہیں کچھ میرے
- ۳ تیرے، توتے، مور، جانور، جھک جھکدین چو پھیرے
- ۴ لاگو لاگ طُفانی دشمن، چاکھو چور لٹیرے
- ۵ توڑی مَر جی پھٹکاواں، آون جلدی گھیرے
- ۶ امب، اُمرد اجا میں جاندا، سیب انار چنگیرے
- ۷ جے توں سچ پچھیندا سائوں، تیتوں دُکھ ودھیرے
- ۸ سو سو باری یاد کراں میں، ہر پرخے دے پھیرے
- ۹ بیٹو کہو اسدا جیون، کدوں کرن گے پھیرے
- ۱۰ ایشوراس بناں جند میری، جائے سانجھ سویرے

### ترجمہ

- ۱ بیسا کھ چڑھا ہے، گھر کی خبر لے، تیرے بارغ میں پھل پک گئے ہیں۔
- ۲ میں کب تک اپنے دل کو بہکنے سے روکوں؟ میرے بس میں نہیں ہے!
- ۳ تیرے، توتے، مور، جانور چاروں طرف سے حملے کرتے ہیں۔
- ۴ اُن کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے بھی دشمن ہو گئے ہیں۔
- ۵ اُن کو کتنا ہی پھٹکاواں، وہ گھیرے ہی رہتے ہیں۔
- ۶ آم، اُمرد برباد ہو رہے ہیں اور اُسی طرح سیب، انار۔
- ۷ تو سچ پوچھے تو میرے سارے دکھوں کا سبب تو ہی ہے۔
- ۸ پرخے کے ہر پھیرے کے ساتھ میں نیچے سو سو باری یاد کرتی ہوں۔
- ۹ سنبھلو، کہو! میرا پرتم کب لوٹ کر آئے گا؟

۱۰ اے ایشوراس! تیرے بغیر میری جان سانجھ سویرے جاتی ہے۔

منسو کے جسم کی ہر حرکت کسی ایسے شعر یا خیال کی نمائندگی کرتی جس کا رشتہ شہوانیت سے ہو اُس کی ایک نظر طویل ملاقات کا مزہ دیتی کیوں کہ وہ رگوں میں جو دس گھولتی وہ دیر تک اپنا اثر بنائے رہتے اور زائل ہو کر آذرِ قوتِ تازہ ہونے کا ظرف رکھتے۔ اُس کی دید سے بُرا لطف لینے کے لئے مَن ہی مَن میں یا کھلے طور پر ایسے الفاظ بولنا ضروری تھا جو جذبات کو بہکنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ بہکے ہوئے جذبات حَظِ نفس کی جائے نزول ہیں جو اصلی صُورت کی مماثلت پیدا کر دیتے ہیں۔ حُسنِ میرے بھائی جی کا ہم عمر تھا لیکن مجھ سے یاروں کی سی باتیں کرتا تھا۔ وہ منسو پر مرتا تھا اور اُسے دیکھ کر کبھی تنہا م کر کہتا تھا، ”تو دُن بان کی طرح میرے یہاں گھسی ہوئی ہے۔“ حُسنِ چھڑا چھانٹ تھا، منسو پر بال بچوں والے مرتے تھے اور اُس کے بارے میں بد اخلاقی کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے رویے سے لگتا تھا کہ بد اخلاقی، جنسی زندگی کی مثبت خصوصیت ہے۔ عورت کے مقابلے میں مرد کی جنسی نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو آشکار ہوگا، مرد اپنے آپ کو طویلے کا ساند بھختا ہے۔ اس کی اس شہوانی کج روی کی وجہ کیا ہے؟ مرد، بیج کی طرح ہے۔ وہ اپنی ہر حالت میں دوسرے کی پوری ذمہ داری ہوتا ہے۔

تایا جی مرد کو ’اردھا لگا‘ اور عورت کو ’اردھا لگتی‘ کہتے تھے۔ (اردھہ انگا اور اردھا لگتی) اس نظریے کی تاویل ہے کہ افزائشِ نسل کے تعلق سے ہر جاندار آدمی خویوں کا حامل ہے جو اُس کے مقابلے سے مل کر پوری ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ عورت کو مرد سے افضل مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ”عورت، مرد کا رفیق ہے لیکن اس کے غاصبانہ رویے سے حَظِ نفس کی علامت بنی رہتی ہے۔ عورت تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو تو گھر کھل (ادارہ) ہے اور نوعِ انساں کے نشاۃ ثانیہ کی ضامنت۔ بچے کو رے کاغذ سے ہوتے ہیں جس پر کچھ بھی لکھنا ممکن ہے۔ ماں، بچے کی دایہ ہے، دوست ہے، معلم ہے، یہاں تک کہ نفس ہے۔ ایک ماں ہی ہے جو ایک ہی نسل میں روایتوں اور اہام پرستیوں کو مٹا کر اُن قدروں کو روشن کر سکتی ہے جن کی جلاد انہی ہے۔ لیکن عورت کی تقدیر ایہ اُس لفظ کی طرح ہے جو اپنے معنی سے نا آشنا ہے۔ اور انسان کی بتم ظریفی اور نیت نئی دنیاؤں کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن اس کے گھر میں جو کائنات پوشیدہ ہے، اُس سے بے خبر ہے۔“



## چوتھی کتاب

صفحہ نمبر

۵۶۲

دوستی بے ہنر سے اسے شاطر  
خام آغاز اور خام انجام

باب نمبر

۶۲

۵۸۳

حالات نے ہر گام اٹھایا مجھ کو  
جو ان کو تھا مقصود بنایا مجھ کو  
جب دست خزاں نے مجھے ہسٹا کیا  
نادید بہاروں نے بلایا مجھ کو

۶۳

۵۹۱

کیا کیا نہ کریں اٹھنے گرانے کے لئے  
ہو خواہ مضر کتنا زمانے کے لئے  
ہر فعل کو انسان روا رکھتے ہیں  
پہچان کوئی اپنی بنانے کے لئے

۶۴

۵۹۷

جب بھوک کا سانسوں میں دھواں ہوتا ہے  
جب درد کا احساس ہوا ہوتا ہے  
پھر چاند نظر آتا ہے روٹی کی طرح  
تاروں یہ بتا ستر کا گھاں ہوتا ہے

۵۴

- ۶۰۳ توڑنا اِس سے جوڑنا اُس سے ۶۶  
زندگی کے یہ تانے بانے ہیں
- ۶۱۷ کم زوریِ اخلاق جہاں پلتی ہے ۶۷  
ہلکی سی بھی تنقید وہاں کھلتی ہے  
ہر سانس پہ ہوتا ہے تَنادُ ایسا  
لگتا ہے کہ آری سی کوئی چلتی ہے
- ۶۲۰ چہرے کی ہر لکیر ہے تاریخ کی صدا ۶۸  
دل کا ہر ایک زخم ہے اُمید کی کرن
- ۶۲۶ جیسا مرا سروپ ہے ویسا نہیں ہوں میں ۶۹  
انسان کے لباس میں کیا کیا نہیں ہوں میں

## باب ۶۲

دوستی بے ہنر سے اے شاہ!

دشاہ!

خام آغاز اور خام انجام

میرا دوسرا سفر اندھیروں کی سمت تھا۔ دستِ وقت نے میری بساطِ معیشت پر کانٹے پی کاٹنے پچھا دیئے تھے۔ انہیں چُسنے کا ایک ہی طریقہ تھا، انہیں چھیلنا۔ ماما جی کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر کہیں چلے گئے تھے۔ انہوں نے یہ حرکت ماما سے بچنے کے لئے کی تھی جو اُن کے بھیسے ہوئے منی آرڈر سے ایڈریس لے کر دلی پہنچ گئی تھی۔ میں کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ کی حالت میں تھا کہ امر سنگھ کو تین مہینے میں ایم۔ پی۔ اے کاؤنٹر لاپٹی کنٹرکٹ مل گیا۔ چوں کہ اُسے جلدی مدد لگانی تھی، اُس نے مجھے بلا بھیجا۔ جن کامگاروں سے مجھے دھان داسا پڑا وہ چیونٹی کی طرح محنتی تھے مگر تھے بے وقوف۔ وہ مجھ پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے چیونٹیاں اپنے قبیلے کی ناکارہ چیونٹی پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

کامگاروں کی ایک غصّت نرالی ہے۔ کوئی اُن کی برتری نہ مانے تو وہ زور منواتے ہیں جو آپس میں جوڑے ہوں، وہ سامنے والے حریف کو زک دینا تو قریب ہنر مانتے ہیں۔ میرے ساتھی ہنر کی باریکیوں کے ساتھ ہنر کے حربے بھی جانتے تھے۔ اُن کی ہر حرکت ایک لفظ فرہنگ تھی۔ وہ اکسار ہاتھ ایسے تھے کہ نہ سائل، ڈوری دیکھتے تھے اور نہ سادھنی سے ردّ اُسادھتے تھے، صرف کونے کی اینٹ احتیاط سے لگاتے تھے جیسے جلاہا بانے کی ٹی نلی کا دھاگا ترتیب دیتا ہے، پھر چل سوچل، ٹھک ٹھک۔ اُن کی نظر اُن کی سائل تھی، سادھنی تھی، ڈوری تھی اُن کی آنکھوں، ہاتھوں، جنتروں میں تو صیفی تال میل تھا۔ اُن کے اعضاء اور معاون اعضاء تک ماہر اور قائم انداز تھے۔ اِس لئے اُن کی تدبیر و تکمیل میں اختلاف نہ تھا۔ صریحاً ہر کوئی اپنی کوشش میں اکیلا لگتا لیکن درپردہ دوسرے سے جڑا ہوا تھا۔ اُن سب کی ذاتی خوبیوں کا مجموعی حاصل کمال ہنر تھا۔ اُن کے جسم میں ایک رگ ایسی نہ تھی جو اُن کے اشارے پر صحیح طور پر متحرک نہ ہو۔ اُن کا ایک سانس ایسا نہ تھا جو بے مصرف ہو۔ اُن کی ایک چال ایسی نہ تھی جو مناسب موقع نہ ہو۔ وہ سمروں سے پیروں تک اور کاندھوں سے ہاتھوں تک کاوش ہی کاوش تھے۔ کام کی جامد حقیقت کا حرکی تصور تھے، ایک ساز تھے جس کے پردے جدا جدا آہنگ سے تھرکتے لیکن مخرجاتی طور سے رزمیہ راگ بن جاتے، جس کی موزونیت کی کمالیت معرکہ آرائی حیات کی منظر کشی کرتی۔

ہر مقصودِ نظر کے اپنے نشیب و فراز ہوتے ہیں اور اپنے راستے، اِس لئے ہر متلاشی الگ طریقے سے

جھپٹتا ہے، میرے اینٹ جمانے، سہلی دیکھتے اور سوت باندھتے تک وہ دو تین اینٹ لگالیتے اور اپنے اچھے حصے سے ایک اینٹ آگے نہ رکھتے۔ وہ سوت باندھ کر مجھ پر احسان جتلاتے کہ وہ میری سہولت کی خاطر دیا کرتے ہیں ورنہ انہیں ضرورت نہیں ہے۔ میں اینٹ اینٹ پچھڑتا پچھڑتا پورا روڈ پچھڑ جاتا۔ میرے ساتھی میری اناہلی پر فقرے گتے،

”پہلے کرنی پکڑنی سیکھو اور وزن بند کیا کرو تاکہ ہاتھ صاف ہوں!“

”تو نے چٹائی کی ہے کہ لٹر بٹر کھیر کھائی ہے؟“

”مصالح سے ہاتھ ایسے سان لیتے ہو جیسے رنگ ریز، رنگ سے راج وہ ہے جو اپنے ہاتھ بزاز کی طرح صاف رکھے!“

”ہر اینٹ میں صحیح زاویہ، صحیح گوشہ، صحیح سیدھ، صحیح آثار پوشیدہ ہے! لیکن یہ سب دیکھنے کی بصیرت استاد سے ملتی ہے۔ کسی کو استاد بناؤ، دان دکشنادو، پھر آڈار پکڑو، ہنر اپنے آپ آجائے گا۔ بے استاد، استاد نہیں بنتے!“

اُن کی طعنہ زنی اور میری کم نظری ہم مگر تھی ورنہ میں کسی کو استاد بنانے کے بارے میں سوچتا اور اُس ناقابلِ برداشت صورتِ حال سے نجات پانے کی راہ نکالتا۔ جہاں تک اپنے طور پر اصلاح ذات کا سوال ہے، نے خیال کو قبول کرنا شعورِ خام کے لئے جتنا تکلیف دہ ہے، اُس سے زیادہ اذیتِ بزرِ طنزِ نمادِ دلیل ہے۔ اجروں اور اجرتوں میں استادِ زمانہ سے استحصال کا رشتہ نئے نئے طریقے اختیار کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ناقابلِ تغیر شکلِ اجرتیوں کے ہاتھوں اجرتیوں کی غارت گری ہے۔ امر سنگھ جو گڈے دچار کار یگوں کا گروہ امیں سے ایک کا خیال رکھتا۔ وہ ایک باقی تینوں کو ایسے دوڑاتا پھرتا جیسے اُن کی نیکیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔ چاق چوندی کو جینے کا حق ہے، میں وہ حق کھو بیٹھا۔ میں اُن کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ مجھے طعنے دیتے، میرے خاکے اڑاتے، یہاں ذلت، وہاں ذلت، ادھر ذلت، ادھر ذلت، اپنی ذلت آمیزی اور ہر کسی کی ذلت پسندی سے متاثر ہو کر مجھے لگتا کہ آدمی کمالِ فطرت کے برعکس اسقاطِ فطرت کا نتیجہ ہے۔

تایا جی عبادت اور صنعت میں فرق کرتے تھے۔ ”عبادت کے طور طریقے لا حاصل ہیں۔ کوئی بھی احمق اس میں شرکت کر سکتا ہے لیکن ہنر اور ہنرور ایک دوسرے سے جہازت سے منسلک ہیں اس لئے کہتے ہیں، تجربہ کار پر بھروسہ کرو! تجربہ زندگی کی کوٹی ہے۔ ہنر ثمر اور ہے اور نفسِ نفیس کا منظر۔ یہ ایک ہی اعلان ہے۔ تو راست ہے تو ہے ورنہ نہیں ہے۔“

میری کم آمیزی میری خود اعتمادی کو مغلوب کر لیتی اور میں زندگی کی سچائی سے گھبرا جاتا۔ میری تنہائی

جھپٹتا ہے، میرے اینٹ جمانے، پہلی دیکھنے اور سوت باندھتے تک وہ دو تین اینٹ لگالیتے اور اپنے کچھ حصے سے ایک اینٹ آگے نہ رکھتے۔ وہ سوت باندھ کر مجھ پر احسان جتلاتے کہ وہ میری سہولت کی خاطر دیا کرتے ہیں ورنہ انہیں ضرورت نہیں ہے۔ میں اینٹ اینٹ پچھرتا پچھرتا پورا ردا پچھ جاتا۔ میرے ساتھی میری اناہلی پر فقرے گتے،

”پہلے کرنی پڑنی سیکھو اور درز بند کیا کرو تاکہ ہاتھ صاف ہو!“

”تو نے چٹائی کی ہے کہ لہڑ بڑ کھیر کھائی ہے؟“

”مصلح سے ہاتھ ایسے سان لیتے ہو جیسے رنگ ریز، رنگ سے۔ راج وہ ہے جو اپنے ہاتھ بزاز کی طرح صاف رکھے!“

”ہر اینٹ میں صحیح زاویہ، صحیح گوشہ، صحیح سیدھ، صحیح آثار پوشیدہ ہے! لیکن یہ سب دیکھنے کی بصیرت استاد سے ملتی ہے۔ کسی کو استاد بناؤ، دان دکشنادو، پھر اڈار پکڑو، ہنر اپنے آپ آجائے گا۔ بے استاد، استاد نہیں بنتے!“

اُن کی طعنہ زنی اور میری کم نظری ہم عمر تھی ورنہ میں کسی کو استاد بنانے کے بارے میں سوچتا اور اُس ناقابلِ برداشت صورتِ حالی سے نجات پانے کی راہ نکالتا۔ جہاں تک اپنے طور پر اصلاح ذات کا سوال ہے، نئے خیال کو قبول کرنا مشورِ حرام کے لئے جتنا تکلیف دہ ہے، اُس سے زیادہ اذیت پریر طنزِ نمادہ لیل ہے۔ اُجروں اور اُجرتیوں میں استادِ زمانہ سے استحصال کا رشتہ نئے نئے طریقے اختیار کرتا رہا ہے۔ اُس کی ایک ناقابلِ تغیر شکل اُجرتیوں کے ہاتھوں اُجرتیوں کی غارت گری ہے۔ امر سنگھ جو گڈے (چار کار گیروں کا گروہ) میں سے ایک کا خیال رکھتا۔ وہ ایک باقی تینوں کو ایسے دوڑاتا پھرتا جیسے اُن کی ٹیکلیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔ چاق چوبند ہی کو جینے کا حق ہے، میں وہ حق کھو بیٹھا۔ میں اُن کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ مجھے طعنے دیتے، میرے خاکے اڑاتے، یہاں ذلت، وہاں ذلت، ادھر ذلت، ادھر ذلت، اپنی ذلت آمیزی اور ہر کسی کی ذلت پسندی سے متاثر ہو کر مجھے لگا کہ آدمی کمالِ فطرت کے برعکس اسقاطِ فطرت کا نتیجہ ہے۔

تایا جی عبادت اور صنعت میں فرق کرتے تھے۔ عبادت کے طور طریقے لا حاصل ہیں، کوئی بھی احمق اس میں شرکت کر سکتا ہے لیکن ہنر اور ہنر ور ایک دوسرے سے قہارت سے منسلک ہیں اس لئے کہتے ہیں، تجربہ کار پر بھروسہ کرو! تجربہ زندگی کی کسوٹی ہے۔ ہنر ور اور ہے اور نفسِ نفیس کا مظہر۔ یہ ایک ہی اعلان ہے۔ تو راست ہے تو ہے ورنہ نہیں ہے۔“

میری کم آمیزی میری خود اعتمادی کو مغلوب کر لیتی اور میں زندگی کی سچائی سے گھبرا جاتا۔ میری تنہائی

تہراٹھانی اور میں جینے کے لئے کسی آسان وسیلہ روزِ کار کے بارے میں سوچتا۔ تارک الدنیا کے پیشے کے سوائے مجھے کوئی دوسرا پیشہ نظر نہ آتا لیکن میں کسی طرح ایسا کرنے سے باز رہتا۔ میرے کتے ساتھی اُن کھڑو حال کا مقابلہ شراب کی بوتلوں اور قحبہ خانوں کے سہارے کرتے اور مجھے اُگساتے، سمجھاتے کہ یہی ٹھیک راستہ ہے۔ میں اُن کے ساتھ نہ چلتا۔ وہ مجھ پر آوازے کتے ”تیرا، ہمارا کیا ساتھ؟ تو کمر کا ڈھیلا ہے۔“ اپنی نااہلی اور نامردی کو میں نے کیسے کیسے بھگتا، کہاں کہاں جھیلا! صبح کام پر جاتے ہوئے، دن بھر کام کرتے ہوئے، چھٹی کے دوران کھانا کھاتے ہوئے، رات گھر لوٹتے ہوئے، یہاں تک کہ اپنے خوابوں میں، میری آسائش کی خاطر وہ ہر جگہ موجود تھی۔

میرے ساتھی جیسے بھی تھے، مزے کے لوگ تھے! اُن کے بارے میں زیادہ لکھوں گا تو کئی ورقے سیاہ کر دوں گا۔ میں صرف دو باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہر بنس سنگھ آسے دن پی کر کرتا، رچوٹ کھاتا اور حادثیوں بیان کرتا۔ دلی کی سڑکیں لاٹوالی اور غیر ذمہ دار سڑکیں ہیں، کہیں بھی کیسے بھی مڑ جاتی ہیں! اگلے میں کشمیری گیٹ سے سبزی منڈی جا رہا تھا، سڑک اچانک قدسیہ گارڈن کی طرف مڑ گئی اور میں اپنے دھیان میں سیدھا نکل گیا۔ سڑکوں کو مسافروں سے پوچھ کر مڑنا چاہیے۔ اپنی شراب نوشی کی وجہ سے ہر بنس سنگھ بالکل کنکال رہتا اور آسے دن باوا سنگھ سے پیشگی مانگتا ایک دن باوا سنگھ نے آسے سمجھایا بلکہ ڈرایا، ”ہر بنس! تو جانتا ہے کہ شراب دیر آثر زہر ہے؟“ ہر بنس بلا کا ظریف تھا۔ اُس نے ترنٹ کہا، ”مستری جی! جانتا ہوں۔ اسی لئے تو پیتا ہوں۔ میں خود زہر آثر چیز سے نفرت کرتا ہوں۔“

سردوں سنگھ قطب روڈ کا ایک واقعہ بڑی بے باکی سے بیان کرتا تھا۔ ”میری جیب میں اٹھ آسے تھے، میں نے سوچا، چلو کسی سے دل لگی کرتے ہیں۔ بڑی مشکل سے ایک پٹائی۔ باتوں باتوں میں، میں نے کہا، ”مجھے اور کچھ نہیں چاہیے، ذرا سا دودھ چوٹھنے دو۔“ وہ بد ذات بڑی مہذبہ لگی، بولی، کیوں نہیں! بیٹا، ماں کا دودھ نہیں چوٹھنے کا تو کیا باپ کا تھیں چوٹھنے کا؟ میں خود کو بڑا جنگا در دی سمجھتا تھا لیکن اُس نے میری بولتی بند کردی اور مجھے بھاگتے ہی نہی۔

تین مورتی کے کام کا ایگزیکٹو انجینئر پورن چند تھا، جس کی سختی کی دھوم تھی۔ اینٹیں تر، کشتیاں اوپر گلے سنبڑے بھرے ہوئے اور متوازی نہ ہوتے تو وہ چھت تک تیار دیوار گروا دیتا۔ دیوار آندر سے کھوکھی ہے کبھی مٹولی، وہ آپ مٹا دیتا۔ چٹائی کا آندر دنی جھد دیکھنے کے لئے اُس کے پاس دو طریقے تھے، ایک تھا مٹولی اور دوسرا غیر مٹولی۔ مٹولی جانچ کے لئے وہ دیوار کو ٹھونکتا، اُڑتی ہوئی آواز کو سنتا اور اُس سے اپنا مطلب نکالتا۔

غیر معمولی جانچ کے لئے وہ چھڑی کا ایک سرادیلوار سے لگاتا، دوسرا کان سے اور اس طرح ہاتھوں اور کانوں اور آنکھوں کے اتحاد سے جو فیصلہ کرتا وہ ننانویں عشریہ ننانویں فیصدی درست ہوتا۔ چونکہ چُنائی میں مصالح بھرنے میں وقت لگتا تھا اس لئے مصالح پتلارکھا جاتا تھا جو پھیلاتے ہی بہہ کر درزوں میں بھر جاتا تھا۔ پورن چند کے آنے کی خبر ملتے ہی کام ریگنے کے سے خرام سے چلتا۔ ریت چھاننے والا ریت احتیاط سے چھانتا، مصالح ملانے والا مصالح ذمہ داری سے ملاتا۔ بہشتی اینٹیں سیلف سے ترکرتا، مزدور چھانٹ کر چکورا اینٹیں اٹھاتا اور انجانے میں طنابِ معمار کی ابتدائی ذمہ داری نبھاتا۔ پورن چند کے جاتے ہی وہ عارضی گٹھ جوڑ ڈٹ جاتا اور ہر سست کام دوڑنے لگتا۔ کریبوں، ایسولوں، اینٹوں، تسلوں، پیروں اور ہاتھوں کی دور میں بظاہر ہلکڈنظر آتی لیکن اندرونی طور پر پورا تال میل تھا، ایسا نہ ہوتا تو ایک دوسرے کی بے تحاشگی سے مارا جاتا۔

تر اینٹیں اٹھاتے اور تر سیمنٹ پھیلاتے ہوئے لگتا کہ انگلیاں، ریگمال پر گھس رہی ہیں۔ ہوتے ہوئے انگلیاں زخمی ہو گئیں اور ضرورت سے زیادہ پکے پھل کی طرح پھللی۔ اس کو سخت بنانے کے لئے یں ہاتھوں کو گرم توے پر جلاتا۔ اس سے اُن کی صورت ہی بگڑ گئی، وہ پُرانے مسکے ہوئے کپڑے کے سے ہو گئے۔ یں انگلیوں پر پٹیاں باندھ کر کام کرتا اس سے اُن کی حرکت پزیری متاثر ہوتی۔ ہم آہنگی، انتشار کا شکار ہو جاتی اور انتشار صنعتی نفسیات کے معیار ہے۔ ماما جی کے پاس سیکھ ہوئے کام کی قیمت تجربے کے میدان میں اڑکھڑاتے قدم کی سی اہمیت رکھتی تھی۔ پاڑ پر چلنا، کرنی پکڑنا، مصالح پچھانا، بٹولی اٹھانا، درہلی توڑنا، اینٹ جمانا، سوت باندھنا، ساہل کرنا، ٹھانس لگانا.... ہر چھوٹے سے چھوٹا کام نہ مکمل ہنر کا منصوبہ ہے بلکہ طاقت و نزاکت کا ایسا اتحاد ہے جو کامل تہارت ہی سے عمل درآمد ہوتا ہے۔ یں جس کام کو راحتِ جاں سمجھا تھا وہ بلائے جاں نکلا۔ میرے تصویری قلعی یوں اُتری کہ یں اپنے ادھورے پن کو اپنی رگوں تک دیکھنے لگا۔

یں بچا سگھ کو پرایا سمجھتا تھا اور اُسے الزام دیتا تھا لیکن یہاں میرا سگامیرے خلاف تھا۔ کوئی مشورہ دینے کے بدلے وہ مجھے دھتکارتا، ”مرمر میٹرک لیٹ! پورے کاربیر جتنا کام کرے گا تو ادھاریٹ ملے گا۔ بیٹھ بیٹھ کر تیرے چوڑا، تروڑ کی طرح موٹے ہو گئے ہیں۔ کام کرتے ہوئے نیچے سے ہلار، تاکہ گودا گلے۔ موٹے چوڑا کھترانی کی پہچان ہیں اور تو ترکان ہے۔ یہ تیرے بیچھے اچھے نہیں لگتے۔“

میرے کام کی خرابی کا میری تعلیم سے کیا رشتہ؟ لیکن ہر کوئی مجھے اُسی کا طعنہ دیتا۔ میری بے اصلی اُس بھولی کنواری کی سی تھی جو کسی کے پیار میں بیٹ سے ہو جائے لیکن آخر اُسے پتا چلے کہ اُس کے پیار کا پھل جائز نہیں ناجائز ہے اور اُس کے پیار پر ہمت۔

آخر سگھ کی غلیظ سی پچکی ہونی ناک ہمیشہ بند رہتی اور وہ منہ سے سانس لیتا۔ وہ میرے سامنے منہ

پھاڑے، اُچھے اُچھے سانس کھینچتا تو مجھے لگتا کہ وہ خاموش گالیاں دے رہا ہے۔

یہاں سائیکل مرمت کرنے کا تجربہ بروئے کار آیا۔ میں نے پُرانی ٹیوب سے انگلیوں کے لئے نول بنائے، اُن کی نرمی اور لچک سے انگلیوں کی کارروائی اور خوش اُسُونی بحال ہوگئی۔ میری وہ ایجاد مقبول ہوئی اور کئی دوسرے ہمارے مجھ سے نولوں کی فرمائش کرنے لگے۔ وہ اپنی ضرورت میں میری پُر مژدہ خیالی کوتاہی کو تازگی اور بے حوصلگی کو دلیری دے گئے۔ میرا وجدان ایجاد میرے لئے یوں تھا جیسے غیر مالوس ماحول میں بھٹکے ہوئے مسافر کے لئے خطِ جادہ۔ اس سے ملتی جلتی روحانی تاثیر سے میں ایک بار پہلے بھی فیض یاب ہوا تھا۔ اُس کی تفصیل اس طرح ہے۔ تڑکے کا اندھیرا تھا، پانی برس رہا تھا اور میں دُکّان میں سویا ہوا تھا۔ کسی ادھیر عمر کے کسان نے مجھے نیند سے جگایا اور سائیکل کے کتے مرمت کرنے کے لئے کہا۔ میں نے صاف انکار کیا اور دروازہ اُس کے منہ پر بند کر دیا۔ اُس نے رُندھی ہوئی آوازیں مجھے پکارا، بیٹا، ایک بات سنو!

”کیا ہے؟“ میں نے ادھا دروازہ کھولا اور اُس میں سے گردن باہر نکال کر پوچھا۔

بیٹا، کوئی اور موقع ہوتا، میں تجھے تکلیف نہ دیتا! میرا بھائی سُمر گباس ہو گیا ہے اور میں اپنی بہن کو بلانے بڑی بسی جا رہا ہوں۔“

اُس کے الفاظ کی سچائی میں نے رُندھے ہچے میں دیکھی اور میں جھٹ پٹ بدل گیا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا ہمدردی سے اُسے اندر بلایا اور فری وھیل دیکھا۔ کتے ٹھیک تھے لیکن اُن کے مددگار تارنا کارہ تھے۔ میں تار بدلنے لگا۔ مجھے تار کا گچھانہ ملا، میں پریشان ہو گیا اور وہ مُصیبت زدہ، بدحواس میں نے اُسے نیافزی وھیل لگانے کا سنجھاؤ دیا لیکن اُس غریب کے پاس اتنے پیسے نہ تھے۔ عین اُس وقت میری صلاحیتِ ایجاد کام کر گئی۔ میں نے کتوں کے نیچے موٹر ٹیوب کے ٹکڑے رکھ دیئے جو تار کا کام کر گئے۔ پورا عمل جو ہر ذات کی مباحثات ہے۔ کچھ احساسِ دردِ مندی اور کچھ خوش کامیابی سے سرشار ہو کر میں نے اُس کسان سے مزدوری نہ لی۔

بڑے بڑے کام انسان کے ایسے ہی عارضی جذبے کی دائمی مثال ہیں۔ لاکھوں ایسا سوچتے ہیں لیکن اُن میں سے ایک اپنے جذبے کی پیروی کرتا ہے اور اُسے کمال تک پہنچانے کے لئے مرمت ہے۔ غور کرو تو وہ ایسا ہی ہنرور تھا جس نے تہذیبِ ایتار کا پہلا چراغ جلایا، دوسرے نے دُوسرا اور جب سے یہ سلسلہ جاری ہے جس دن پہلی پندری بٹی، میری بے قراری دیدنی تھی! باوا سنگھ چٹھا بانٹا اور میں بھیڑ میں کھڑا ادھر جھک کر، ادھر اُچک کر سُر سُرول دیکھنے کی کوشش کرتا۔ پہلے ورتے پر مجھے اپنا نام نظر نہ آیا، میں ورتہ پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے کنگھیوں سے باوا سنگھ کو دیکھتا اور سوچتا کہ میرا نام سُرول کے آغاز میں ہونا چاہیئے تھا، ایسا کیوں نہیں ہوا۔ میرے دلوے کا زیرو بم بڑھ گیا لیکن پہلا ورتہ پلٹنا نظر نہ آیا۔



آخر کلابہلا وقت پلٹا۔ میں اس کے اس پہلو سے اور اس کے اس پہلو سے سُکھ کر آگے بڑھا، مٹرول دیکھا اور اپنا نام نہ پکار خیران ہوا۔ مٹرول کے دُرتے اُلتے رہے اور کمار، پکار لے کر جاتے رہے۔ آخر باوا سنگھ نے مٹرول گولی کیا، نلو سے میں رکھا اور میری طرف دیکھا۔ امر سنگھ، پیارا سنگھ اور باوا سنگھ کنٹرکٹر شپ میں پارٹنر تھے اور اس راستہ کے لے مشہور کہ جہاں وہ دونوں کوئی ناخوشگوار کام کرتے ہیں، باوا سنگھ کو آگے کر دیتے ہیں اور باوا سنگھ ان دونوں کو۔ باوا سنگھ انھیں جھکائے، میری نظر کو ٹالتے، کچھ ہاتھ میں چھپائے، آگے بڑھا، میرے پاس پہنچا، اپنا ہاتھ میری جیب میں ڈالا، نکالا اور جلدی سے پیچھے مڑا جیسے اُسے ڈر ہو کہ میں اس کا تعاقب کرنے والا ہوں۔ اس کی اندالت دھکی چھپی نہ تھی لیکن میری توجہ جیب پر لگی۔ توجہ کی نقیسات، خواہش کے برعکس ہے، اس لئے کہ یہ حاضرے متاثر ہوتی ہے۔ میری آنکھوں نے اس کا دہان تک پچھا کیا جہاں تک وہ نظر آتا رہا۔ میری جیب کا نظارہ غم ناک تھا، وہاں دس روپے کا نوٹ تھا۔

چرن سنگھ سائیکل سنبھالے کھڑا تھا۔ وہ باوا سنگھ کے ساتھ سڑک تک گیا اور لوٹ آیا جیسے کچھ بھول گیا ہو۔ وہ میرے پاس آیا اور میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر سادگی مٹا چالاکی سے بولا، ”میری رائے مانو گے؟“ کیا؟ میں نے غصے سے پوچھا۔

”کل سویرے آتے ہی اس نوٹ کی تہی بنا کر باوا سنگھ کے گھسادو۔ پندرہ دن میں بھکاری اس سے زیادہ کمالیتا ہے۔“ اس نے دانت پیس کر انتقام آمیز لہجے میں کہا۔

اس کارخانہ حیات کا دروازہ صرف سازش گھر میں کھلتا تھا اس لئے ہر قدم سازشیوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ چرن سنگھ کی طرح وہاں کتنے اور تھے جو مجھے درغلالتے تھے، اُلٹا بیدھا پڑھاتے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ میں ان راستوں پر چل نکلوں جو متنزل حیات کی جانب مڑتے ہیں۔

میں اپنے دل میں کچھ ویسا ہی سوچ رہا تھا۔ اُس کے مشورے سے میری شرمِ ناگسی کو جرأت ملی اور میں نے باوا سنگھ کو موٹی سی گالی دے کر کہا، ٹھیک ہے، میں کل ایسا ہی کرتا ہوں!“ یہ ہے مردوں والی بات!“ اُس نے میری دلیری کی تائید کی اور بیٹھ ٹھونکی۔

چرن سنگھ کی باہوں کے بال اتنے کھردرے تھے کہ آستینوں میں سے کانٹوں کی طرح باہر نکلے رہتے تھے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کا بازو میرے گال کو چھو گیا۔ میں نے اُسے حقارت سے دیکھا۔ اُس کی ہمدردی کا اثر اُدھ منفی جذبہ اُٹھتے ہی دب گیا اور میں نے پُر امید ہو کر پوچھا، ”مانا کہ میں نے کام چھوڑ دیا، مجھے کہیں اور کام مل جائے گا؟“

اُسے کام کا کیا ہے! عزت ہے تو کام بہت!“ اُس نے مفر سے کام لیا۔

”پھر بھی! مجھے یہی کام بڑی مشکل سے ملا ہے اور امر سنگھ نے مجھے خود بلایا ہے۔“  
 اُس کے ادھورے جواب سے میری گرمی کسی حد تک کم ہو گئی اور میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت  
 لوٹ آئی۔ میں نے اُسے یقین دگمان کے طے جملے جذبے سے دیکھا۔  
 ”تو بزدل ہے! تو خاک ترقی کرے گا!“  
 اُس نے مجھے اُکسایا اور جوش دلایا۔  
 ”مجھے نہیں کرنی ایسی ترقی!“  
 اُس کے خلاف میرا عتاب بڑھنے لگا اور نتھنے پھڑکنے لگے۔  
 ”تو یس جاؤں؟“

اپنی بات نہ بنتی دیکھ کر اُس نے جانے کا اشارہ کیا۔  
 ”میں نے تجھے پکڑا ہوا ہے کیا؟“ میں چلا کر بولا تو مجھے لگا کہ میرے الفاظ خونِ دل میں ڈوب کر زبان  
 پر آئے ہیں۔

وہ مجھ پر چڑھ آنے کے سے انداز میں کھڑا تھا، میں نے اُسے ہلکا سا دھکا دیا۔ اُس کا پاؤں پیچھے روٹ  
 پر پڑا، وہ پھسلا اور گرتے گرتے سنبھلا۔ اُس نے منہ بنا کر مجھ پر خفگی ظاہر کی، سائیکل اٹھالی اور گھر کی راہ لی۔ اُس  
 کے چلے جانے سے میرا دبا ہوا اہال ابھرا اور میں زور سے چلایا، ”رو ذیل کہیں کا! حرام زادہ!“  
 اُس کی پیٹھ کے پیچھے گالی دے کر مجھے وہی تسلی ہوئی جو اپنے دشمن کو پورے طور پر کچلنے سے ہوتی ہے۔  
 میری زندگی میں اس رویے کو بڑا دخل رہا ہے۔ گالی کمزور آدمی کا سامانِ جنگ ہے۔ یہ اپنی ضرورت کے لحاظ سے  
 اس ہتھیار کو برتا ہے اور اپنے طاقت ور دشمن کو زیر و زبر کرتا ہے جو بصورتِ دیگر ناممکن ہے۔

میں کتنی دیر وہیں کھڑا رہا اور اپنے محنت زائیدہ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ رات کی خاموشی اور میری  
 سنجیدگی کی وجہ سے اُس بے منفعت کام کا مفہوم ہی بدل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دیکھنے کو میری طرح مجبور ہے  
 لیکن درپردہ شہود مندی سے بھرپور ہے۔ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آیا،

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

میں نے اس شعر کو ہر پہلو سے سمجھا اور مہمل پایا۔ ایسی بات ادھورے انسان کرتے ہیں۔ پورے انسان  
 اپنی ساری توانائی، ساری لیاقت، ساری پونجی، پامال ادارے میں لگاتے ہیں۔ اُسے بچاتے ہیں اور کمال تک پہنچاتے  
 ہیں۔ ایڈلین ہنری پیشہ کی بار دیوالیہ ہوا لیکن ہنر سے منہ نہ موڑا۔ اپنے عزم سے اُس نے ہنر کو اُس مقام پر پہنچا دیا کہ

انسانی زندگی کا ناگزیر حصہ بنادیا۔

ریزہ پھر بھی ریزہ ہے، میری اُہرت مزدور سے بھی کم تھی اور تایاجی کی اس بات کا برحق ثبوت کہ اُدھورا ہنرور، مغرور انسان سے بدتر ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے عمل کا جواب دہ ہوتا ہے۔

میں ہوٹل سے کھانا کھا کر دیر سے گھر پہنچا اور جگت سنگھ کو اپنا منتظر پایا۔ پچھلے دو مہینے سے میں نے اُسے مکان کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ اُدھار کے بارے میں اُس کا خیال نہ لایا تھا جسے وہ پنجابی محاورے میں سُناتا تھا۔ پنجابی زبانِ حتمی میٹھی ہے اُس سے لاکھ گنا کڑوی ہے۔ میں اپنے قارئین کے منہ کا مزہ خراب نہیں کروں گا۔ تیرنے اپنے محبوب کی شیریں زبانی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

کشتہ ہوں میں تو شیریں زبانی یار کا

اے کاش وہ زبان ہو میرے دہن کے بیج!

کاش وہ اپنے محبوب کی تلخ زبانی کا بھی ذکر کرتا! جس سے مجھے اپنی بات سلیقے سے کہنے کا اشارہ ملتا۔ میری زندگی سکون نما بے سکونی سے گزرنے لگی۔ میں کوئی دوسرا کام سیکھنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ بلدیو سنگھ الیکٹرک ویلڈر تھا اور اپنے کام کو بڑا سراہتا تھا۔ میں نے میت سماجت کر کے اُسے کام سکھانے کے لئے منایا۔ میری خیالی ہم کو جو عملی تجربہ ہوا اُس سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری آنکھوں کو الیکٹرک سپارک سے الرجی تھی، ان میں تڑپائی سے ملتے دُورے اُبھر آئے اور جھپکنے لگے۔ اپنے مخصوص پیشے سے غیر حاضر رہنا، مصیبت مول لینا ہے۔ اپنی بیدار کردہ صورتِ حال سے چھٹکارا پانے کے لئے مجھے تین چار دن لگ گئے اور وہ دن میں نے جیسے کاٹے میں ہی جانتا ہوں۔ میں اپنے گرد و نواح اور وسائل کا تجربہ کرتا، مجھے لگتا کہ میں اُسی کام کے لئے بنا ہوں جسے حالات نے میرے اوپر لا رکھا ہے۔ میں نے اُس کام میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کے لئے مشقت اور جہاد کی ضرورت تھی۔ یہ دونوں چیزیں ریزے کے لئے ایسے ہیں جیسے بیج کے لئے پانی اور دھرتی۔ پانی میں بیج رکھنے سے چھوٹ بھلے آئے لیکن اگر نہیں بکڑتا جب تک اُسے دھرتی نہ ملے۔

میرے ساتھ جتنے لوگ تھے، مجموعہٴ آفنداد تھے۔ کسی پر بھروسہ کرنا اپنی بے ہنری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ تایاجی کے پاس ہنرور کا اعلیٰ تصور تھا جو ہنرور، ہنر بانٹنے میں پس و پیش کرتا ہے یا ہنر کا غلط استعمال کرتا ہے، وہ سماج دشمن ہے۔

اُن کے معیار سے وہاں ہر کوئی سماج دشمن اور بے رحمی کی حد تک خود غرض تھا۔ ہنرور ہنر کی باریکیاں چھپاتے تھے۔ وہ احساسِ تناسُب سے عاری تھے اور کسی کی رسوائی میں اپنی بڑائی سمجھتے تھے۔ اُن کی زندگی فہم و فراست سے دور تھی، ایک مشین تھی جو اُن کے لئے معیشت فراہم کرتی تھی۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر کسی مشکل کا حل نہ نکال سکتے تھے، اپنی اپنی

ہاں کتے تھے، ایک دوسرے کو نشانہ بناتے تھے اور اوجھڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی جس ضرورت پر مرتے تھے، دوسری اُسی ضرورت پر ہنستے تھے۔ اپنے لئے جو اچھا سمجھتے تھے، دوسرے کے لئے قوی برا جانتے تھے۔ ان کی کسی بات پر اعتماد کیا جاسکتا تھا تو وہ ارتکاب ہنر تھا۔ ان کی ہر مصیبت اپنی پیدا کردہ تھی لیکن وہ ذمہ دار دوسرے کو ٹھہراتے تھے۔ ان کے پاس اخلاق کا ایک ہی معیار تھا، دوسرے کو کیا کرنا چاہیے۔ وہ بھول کر نہ سوچتے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے! چوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ جو کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں۔ وہاں تصحیح ذات کی بات خارج از بحث تھی۔ وہ اپنے سے آگے بڑھنے والے کی ٹانگ کھینچتے تھے اس لئے باہم تنے رہتے تھے۔

میرے قارئین یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر وہاں ہر کوئی اپنی غرض کا بندہ تھا تو جیون کا وہندا کیسے

چلتا تھا؟

کوئی کسی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے، اپنے لئے برا نہیں کرتا ہے اور اُس کا یہ رویہ فمنا دوسرے سے جڑتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مفاہمت کے برعکس مزاحمت سے منسلک ہیں اور اہل ظرف ہو کر اپنی کم ظرفی کا شکار ہیں۔ زندگی ستر گئی کا نام ہے، نہ کہ ستر دھری کا! جو کوئی اسے پوری گئی نہیں دے سکتا، وہ اس کی نیم رخ ضرورت ہی دیکھتا ہے جو بنتے بنتے اُس کی نفسیات بن جاتی ہے، نا کبھی بھگڑے سپاہی کی طرح۔

جنگت سنگھ صاف لفظوں میں مجھے سمجھا چکا تھا، تم جو ہو، سو ہو! ایک بات یاد رکھو، نہیں جو بنائے اپنے آپ بننا ہے۔

میں نے اُس کی بات کو پہلے باندھا لیا لیکن وہ جو قول ہے کہ خام کو کام سکھا لیتا ہے، مجھ پر پورا نہ اُترا۔ تانا جا جی کہتے تھے، ہنر کا نعم البدل بیش تر ہنر ہے اور جہارت کا بیش تر تہارت "میری بے مقدوری! میرے پاس ہنر کا بدل بے ہنری تھی اور جہارت کا ناقابلیت۔ میں اپنے سامنے ہاتھوں کو غلطی کرتے دیکھتا لیکن انہیں صحیح سمت نہ دے پاتا، روک سکتا، دے اُس سے میری مشکل کا حل نہ نکلتا۔ جہاں کہیں پہلا ردِ ٹیڑھا لگ جاتا اُس کا عکس آخری ردِے میں نظر آتا جو اس کہادت کا جینا جاگتا ثبوت ہوتا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج (اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی لگاتا ہے)  
تا ثریا می رود دیوار کج (وہ دیوار ثریا تک جائے ٹیڑھی رہے گی)

ایک دن کام سے واپس آتے ہوئے، میں شکر روڈ کی چڑھائی سائیکل پر سے اتر کر پیدل چڑھ رہا تھا کہ پیچھے سے اجیت سنگھ سائیکل پر آیا۔ وہ کاٹھی سے اٹھ کر پیدلوں پر کھڑا ہو کر زور لگا رہا تھا، مجھے دیکھ کر حیرت و مسرت کے لئے جھکے لہجے میں بولا، "اوہ، تم! اور سائیکل پر سے اتر پڑا۔ وہ ایمبیڈر ہوٹل کے پاس کام کرتا تھا اور کبھی کبھار یوں ہی آتے جاتے مل جاتا تھا۔ اُس ہنسور کو گمبھیر دیکھ کر میں نے پوچھا، کیوں، کیا بات ہے؟ چہرہ اُترا ہوا ہے؟"

کیا بتاؤں؟ میں گاؤں گیا تھا اور بھائیے کو ساتھ لے آیا۔ وہ اتنے ہی بیمار پڑ گیا اور واپس جانے کی رٹ لگا رہا ہے۔ اُس نے بلغمی کھانسی کھانتے اور تھوکتے ہوئے کہا۔  
 ”اس موسم میں کھانسی ایکیا ہوا؟ میں نے اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”زکام ہوا تھا، وہ جاتے جاتے کھانسی ہلک گیا۔“  
 اُس نے کھنکار کی وضاحت کی۔

ہاں، تم کہہ رہے تھے کہ تایا جی کو گاؤں سے لے آئے ہو۔ کیوں؟  
 میں نے بات کا رخ پہلے کی جانب موڑا۔  
 ”تم تو جانتے ہو کہ وہ زمین کی ساری کمائی دوسروں کو کھلاتا ہے اور...“  
 تم دلی میں پڑے ہو، اُس کی دیکھ بھال کون کرے؟ وہ جنہیں کھلاتا ہے، وہ اُس کا پورا خیال رکھتے ہیں۔“

”میں نے اُسے بیچ میں ٹوکا اور اُس راز کی طرف اشارہ کیا جو راز نہ تھا۔  
 ”یار، کمائی کھلاتا ہے تو چلتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جو گندرسنگھ کے نام زمین لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس لئے یہاں لے آیا ہوں۔ وہ گاؤں میں رہتا تو کچھ نہ کچھ کر گزرتا۔“  
 اُس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے وہ مجھ سے ہمدردانہ تبصرے کا خواستگار ہو۔  
 ”لیکن وہ یہاں کرے گا کیا؟ کام کا ادنیٰ بیکار کیسے رہ سکتا ہے؟“  
 میں نے اُس صورتِ حال کی جانب اشارہ کیا جو کام دار کے لئے سرطان کا درجہ رکھتی ہے۔  
 ”میں نے سوچا تھا اس کے بارے میں! اُسے پیسی کولامیں گیٹ کیپر کھوانے کا بندوبست کیا ہے۔  
 اُس کے بیمار ہونے سے سارا کام بگڑ گیا اور اب وہ گاؤں واپس جانے کی ضد کر رہا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو اور اُسے سمجھاؤ، وہ تمہاری بات مان لے گا۔“

ہم باتیں کرتے کرتے وہاں پہنچ گئے جہاں سے گڑ گاؤں کو سڑک چھوٹی ہے اور چڑھائی ختم ہوتی ہے۔  
 میں نے اُسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔

اجیت سنگھ، شیر سنگھ کا اکلوتا بیٹا تھا اور مجھ سے تین چار سال بڑا تھا۔ وہ سکول کا بھگوتا تھا لیکن مہماری کے میدان کا جنگجو۔ شیر سنگھ نے یہ سوچ کر اُس کی شادی جلدی کر دی تھی کہ اُس کی بیوی گاؤں میں رہے گی اور گھربار دیکھے گی لیکن وہ اپنی بیوی کو دلی لے آیا۔ شیر سنگھ اپنے بڑے بھائی گرو دتے کے ساتھ رہتا اور جو کماتا اُسی کے گھر ڈالتا۔  
 وہ اپنے بیٹے کے بارے میں کہتا، ”اُس سے میرے مولیشی اچھے ہیں۔ یہ میرے لئے دن رات کام کرتے ہیں اور بڑے

بھلے میں میرے ساتھ رہتے ہیں۔ ایسی اولاد کس کام کی؟ جو اپنے ماں باپ کے کام نہ آئے۔ ”وہ کھلے عام کہنے لگا تھا، ”وراثت پر اُسی کا حق ہے جو اپنے ماں باپ کی خدمت کر کے اُسے پانے کا حق حاصل کرتا ہے۔“

ہر باند میں ایسی مثال موجود تھی۔ گیان سنگھ کھتری کے بچے اُس کے بڑھاپے میں اُس کے ساتھ نہایت شرمناک سلوک کرنے لگے۔ نہسراج چمار نے اُس کی جی جان سے خدمت کی اور اُس نے اپنی بیٹی نہسراج کے نام کر دی۔

اجیت سنگھ شادی پور میں مندر کی گلی میں دو خانہ چوبارے میں رہتا تھا اور نیچے کے مکان کی آدھی چھت کو بطور جین برتنا تھا۔ شادی پور گاؤں تھا جو بڑھتی ہوئی دلی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ رُوپیہ مکملنے کی ہوس میں وہاں کے مکان مالکوں نے ہر ممکن محصول زمین پر جیسے جیسے مکان بنالے اور وہ بھی کسی جانے پہچانے کی سفارش سے بھاڑے پر دیتے۔ گلیوں اور نالیوں کے رقبے پرانی آبادی کے لئے موزوں تھے، نئی آبادی اور گندگی سے اُن کی حالت حلق تک بھرے پیٹ کی سی تھی۔

شیر سنگھ بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ اجیت نے جوں ہی اُسے بتایا کہ گیان آیا ہے، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، جیسے اچھا بھلا ہو۔ میں نے اُس کے پاؤں چھوئے۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھایا اور دُعا دیتے ہوئے کہا، ”جیتے رہو! اچھا ہوا، تم آگئے ہو! مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ بتایا جی! میں نے اُسے ترقم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ اُس کا ہاتھ بخار سے جل رہا تھا اور آنکھیں گرمی سے چڑھتی ہوئی تھیں۔

”آپ آرام سے لیٹئے، میں آپ کی بات سننا ہوں۔“

میں نے اُسے بستر پر لیٹایا، اُس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور بستر کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہاں بیٹھو!“

اُس نے سر ہانے کے پاس باہمی پر ہاتھ مارا اور مجھے بُلایا۔ وہ دلی کو ملعونوں کا شہر سمجھتا تھا اور اُس کے بارے میں حقارت آمیز خیالات رکھتا تھا۔

”دلی کے لوگ گھروں میں چولہوں میں کہتے ہیں اور وہیں پکاتے کھاتے ہیں، مگر شرم کی بات ہے!“

”دلی کے لوگ لوہے کی بھینس کا دودھ پیتے ہیں اس لئے لوہے کا دل رکھتے ہیں۔“

”دلی میں پڑوسی، پڑوسی سے بے خبر ہے، یہاں میں سارے گاؤں کو جانتا ہوں! اور یہ بھی جانتا ہوں

فلان گھر میں کیا پکاتے؟

”بولیے، کیا بات ہے؟“ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”تم اسے کہو کہ یہ مجھے گاؤں بھیج دے!“ اُس نے اجیت سنگھ کی جانب آنکھوں سے اشارہ کر کے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”میں اسے کئی بار کہہ چکا ہوں لیکن یہ میری ایک نہیں سنتا! یہ جس دن پیدا ہوا تھا، میں نے شریکوں میں بادام بانٹے تھے اور فخر کیا تھا کہ میرا وارث پیدا ہوا ہے۔ یہ اُسی بُری پہل کا نتیجہ ہے کہ اس کا دل بادام کی طرح کڑا ہے۔ میں شیرینی بانٹتا تو ہو سکتا ہے یہ نرم دل ہوتا۔“

”تباہی، آپ اس حالت میں سفر کیسے کریں گے؟ پہلے تندرست ہو جائیے پھر جانے کی بات کیجئے“ اُس کی بات کی حکمت اور خواہش پر مُسکراتے ہوئے، میں نے سمجھا دیا۔

”سفر کیا ہے؟ جیسے یہاں تڑپتا ہوں ویسے گاڑی میں تڑپوں گا لیکن گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ تو اسے کہہ دے کہ یہ مجھے گاڑی میں بٹھا آئے۔“

وہ گرم گرم سانس چھوڑتا تھا اور قریب قریب ہانپتا تھا۔

”راستے میں کچھ ہو گیا تو؟“

اجیت سنگھ میرے اوپر سے اُسے دیکھ رہا تھا، اُس نے غصے کا اظہار کیا۔

”راستے میں مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ ہو گا تو تیرے پاس، یہاں!“

اُس کی بات سے واضح تھا کہ اجیت اُس کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے جسے وہ جانتا ہے۔

”آپ گاؤں کیوں جانا چاہتے ہیں؟ وہاں آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

میں نے اُس کی ہٹ کاراز جانا چاہا۔

”مجھے دیکھ بھال کی ضرورت ہے اور نہ دوا داروں کی، اب مرنا ہے مجھے! لیکن گاؤں میں مرنا ہے۔ میں یہاں مرا تو اڑوی پڑوسی کہیں گے، اجیت کا باپ مرا ہے۔ کون؟ یہ کسی کو معلوم نہ ہو گا! دلی میں میرا مرنا اور کسی جانور کا مرنا ایک برابر ہے۔ میری کیا پہچان ہے یہاں؟ گاؤں میں میری پہچان ہے۔ کھیوٹ کھتونی میں میرا نام چلتا ہے۔ میں شیر سنگھ ہوں اور شیر سنگھ ہی جینا چاہتا ہوں۔“ وہ جوں جوں بولتا گیا، اُس کا ہجو قوی سے قوی تر ہوتا گیا جیسے دورانِ انہاریت ترقیِ اظہار کا عمل ہوتا ہے۔ اچانک وہ بستر پر سے دھن سے اٹھا اور اپنے اطراف نگاہِ خودزائیدہ سے دیکھنے لگا، جس میں اسیم اعظم کا تاثر تھا، جس کے اشارے سے عدم نے وجود پایا تھا۔ وہ منظر ہو، ہو بُری آنکھوں میں ہے۔ شیر سنگھ کی مٹی کو مٹی میں ملے دہے گزر گئے ہیں لیکن میں اُسے زندہ و تابندہ دیکھ رہا ہوں، نقشِ مدام کی طرح! ایک مقدس آسمان کی طرح!

میں وہاں سے گھرا آیا، وقت کافی ہو چکا تھا۔ جگت سنگھ، کرتار سنگھ اور سومتر سنگھ خلافِ معمول جاگ رہے تھے اور میری راہ دیکھ رہے تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے ڈھنگ میں مجھ پر برس پڑا۔

”اتنی رات گئے تھم کہاں سے آئے ہو؟“ جگت سنگھ نے ڈانٹ کر پوچھا۔  
 ”کہیں جانا ہو تو بتا کر جانے میں کیا ہرج ہے؟ تجھے دیکھنے کے لئے میں دس بارست نگر کے موڑ  
 تک گیا ہوں! دلی میں اتنی گردی ہے کہ جب تک گھر سے جانے والا گھر میں نہ آجائے، دوسوے لگے رہتے۔“  
 کرتار سنگھ نے ہمدردی سے اُس خطرے کی برائے اشارہ کیا جو اُٹانے سفر مند لا تارہتا ہے۔  
 ”کہیں مشاعرے میں چلا گیا تھا کیا؟“ سو متر سنگھ نے استہزائے انداز میں پوچھا۔

اتنے میں بھابی بے انت کور اندر سے نکلی اور اپنی تیز طرار آوازیں بولی، ”تو ایسے دیر سے آئے گا تو  
 مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا! او دیر سے آتا ہے تو میری جان گھل گھل کر ادھی رہ جاتی ہے! کچھ اُن ہونی ہو گئی تو میں چاچی  
 کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ کیا جواب دوں گی؟“

بے انت کور کے ناگہاں نرم رویے کے پیچھے ایک نیا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ اُس کی بہن پر سنی کچھ دن  
 پہلے دلی آئی تھی، مجھے اپنی بیٹی کے لئے پسند کر گئی تھی اور بے انت کور مجھے ہونے والے داماد کے روپ میں دیکھنے  
 لگی تھی۔

جب ہر کوئی اپنا اپنا اہال نکال چکا، میں نے دیر سے آنے کا سبب بتایا اور پھر ہمیشہ کام سے سیدھے  
 گھر آنے کا وعدہ کیا۔ میں بستر پر لیٹا اور اُن کے احساسِ تعلق پر حیران ہوا۔ انہیں میری ذات سے ذرا سی بھی ہمدردی  
 نہ تھی لیکن وہ میری ممت پر کیسے فکر مند تھے! کیوں؟ کیا وہ میری ناداری سے لطف اٹھاتے تھے؟ اُسے مسلسل  
 دیکھنا چاہتے تھے جو میرے مرنے کی صورت میں ختم ہو سکتی تھی! اذیتِ خواہی کا جذبہ دوسروں کی نسبت اپنوں میں  
 مزید شدید ہوتا ہے کیوں کہ یہاں راست مقابلہ ہوتا ہے۔ اور نگ زیب نے اپنے باپ کی آنکھیں نکلو کر  
 اُسے زندگی بھر قید رکھا۔ وہ چاہتا تو اُسے جان سے مار کر اُس کی اذیت ختم کر سکتا تھا۔

وہاں ایک یوسف مراد آبادی تھا۔ بڑے ناموں کی آرٹیں جتنے ذلیل پناہ لیتے ہیں اُن کی تعداد  
 مُصدّقہ جُرموں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ شاعر اور خوش طبع آدمی تھا لیکن اُس کی شاعری اور خوش طبعی یکساں طور پر  
 مُتعدی تھیں۔ میرے اذیت خواہوں میں وہ سب سے آگے تھا۔ وہ نہایت نڈہ بھی تھا۔ اگر مذہب ملت کا حا  
 ہے تو وہ ملت کی کم آہلی کا مکمل نمونہ تھا۔ ایک دن میں نے اُس سے کہا، ”میاں! اُم اتنے پاک باز بنے ہو پھر یہ  
 مخالفت کہتے ہو! ان دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“

”وہی رشتہ ہے جو ہمارا اچھے سے ہے، جو جیسا ہوتا ہے، اُس کے لئے دیا ہی جذبہ رکھتے ہیں اور  
 ویسے ہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تجھے فکر کرنا چاہئے کہ ہم اتنے بڑے کاریگر ہیں لیکن تجھ جیسے نو آموز پر مرتے ہیں۔“  
 وہ مجھ سے بات کر کے ہونٹوں پر رزبان پھیرتا اور اپنی خیالی خواہشوں کا غلی مظاہرہ کرتا۔ وہ سوا سنگھ



مستری کی ناک کا بال تھا۔ وہ مراد آباد جاتا تو اُس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتا۔ اُس سے اُلجھنا مُصیبت کو بلانا تھا۔ تفریح کے دوران وہ کچھ زیادہ ہی مَنہ پھٹ ہو جاتا۔ ایک دن ہزاری لال کا ایس۔ ڈی۔ او اودھورام وہاں آ نکلا جہاں سارے معمار تفریح میں اکٹھے ہوتے تھے۔ یوسف انہیں شعر سُنانے لگا۔ ایک دو شعر سلیقے کے سنا کر وہ اپنی اصلیت پر آگیا۔

دل میں آتی ہے کہ تیری مار دوں  
مُنہ کی مکھی ریشمی رُو مال سے

اُس نے مصرعہ اُولا کنا تیا لڑھکا لڑھکا کر یوں سُنا یا کہ بس! میرا مقدور ہوتا تو میں اُس حرامی کا مَنہ فوج لیتا۔ اردو کے بے ہودہ اشعار سے میری جان پہچان یوسف ہی کے ذریعہ ہوئی تھی ورنہ میرا خیال تھا کہ اردو ایسی شائستہ اور متمدن زبان ہے جس میں ہرزہ سرائی اور بد گوئی ناممکن ہے۔ میرا یہ جذبہ میری رُوح کی سادگی کی دلیل ہے۔ میں اردو کی طرف اسی لئے رُجوع ہوا تھا کہ میں اس کی نفاست و لطافت کا دلدادہ تھا۔ پنجابیوں میں رواج ہے کہ وہ اچھے معاملے اردو زبان میں نپٹاتے ہیں اور جھکڑے کھری پنجابی میں۔ اور جہاں دو پنجابی ہوتے ہیں وہ زیادہ تر جھکڑتے ہیں۔ میری نئی تہذیب نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔ میں اپنے لوگوں میں بیٹھ کر بات کرتا ہوں تو میری ہر بات بے محل لگتی ہے۔

میں اپنے ایک مخصوص مزاج کا ذکر کرتا ہوں جسے میں بھول گیا تھا حالانکہ وہ میری کئی مُصیبتوں کا پیش کار ہے۔ میں بُیادی طور پر اس قدر شرمیلا تھا کہ وجہ بے وجہ مُسکرا دیتا تھا۔ اس طفلانہ مُسکراہٹ کا نتیجہ یہ نکلتا کہ دوسرے کسی نہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے اور خام کر پچھلا ذوق رکھنے والے حضرات اپنے تصور میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل پڑتے۔ میں اُس بھول کی طرح تھا جو نظر باز کو دعوتِ دید کے ساتھ ضیافتِ طبع بھی دیتا۔ یوسف کی بدتمیزی وہیں ختم نہ ہوئی۔ اُس نے مجھ سے کہا، ”صاحب زادے، سنا ہے آپ ادبی ذوق رکھتے ہیں! کچھ ہو جائے۔“

میں اپنی بد نصیبی کے غم میں خاموش رہتا، اور میرا رویہ میرے بودے پن کی علامت بنا ہوا تھا میں نے خاموشی پر معاملہ ٹالنا چاہا لیکن اودھورام نے اصرار کیا۔ اُن کے مڑے لوگوں میں وہی میرا ہمدرد تھا جو مجھ سے کہتا تھا، ”کا! اچاشنی اور پانی ملانے سے نہیں ملے۔ یہ کام کچوں لفگوں کا ہے۔ اس میں کھینا ہے تو دیسا ہی بننا نہ لے گا۔“

میں نے ساجر کی نظم ’مادام‘ سُنائی۔ کہاں اُس نظم کا پر دہ مفہوم اور کہاں اُن نامعقولوں کا ہجوم! اودھورام نے اُن سب کو پنجابی میں دھر لیا، اُسے میری قلیل اُجرت کے بارے میں خبر ہو چکی تھی اور اُن تینوں کی جُند

وہاں بیٹھی تھی۔ اُس نے اُن پر لغت، ملائت کی اور میری دہاڑی تین روپے مقرر کروادی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے رُکے رُکے شب و روز چل پڑے ہیں۔

جس آرام سے کریشم گزری، کچھ اُسی طرح برکھا گزری لیکن شردنے آتے ہی اعلان کر دیا کہ ہم اور ششہر کے لئے مستعد رہو۔ میں نے پانچ روپے میں پرانا اونی کوٹ خریداجو گھس گھس کر نمڈے کا سا ہو گیا تھا۔ میں کبھی اُسے صاف کرتا، اُس پر سے پھوسٹر چٹنا پڑتا ورنہ میں جتنا پھوسٹر جھاڑتا اُس سے زیادہ نکل آتا۔ صبح کے وقت ہوا کا چلن سائیکل کی رفتار کا مڑھون ہوتا۔ نمڈہ کسی حد تک چھاتی کی حفاظت کرتا لیکن دوسرے اعضا کی حالت غیر ہوتی۔ ناک اور کال برف کے ڈلے بن جاتے اور گھٹنوں کے علاوہ ہر جوڑ بڑ جاتا۔ سائیکل سے اترنا، پابائے گرنا تھا۔ ٹخنے ایک دم بوجھ نہ لیتے اور اُن کو گمانے کے لئے چند قدم ادھر ادھر ہو لے ہو لے لینے پڑتے۔ میں سو سو کرتا، ہاتھ رگڑتا، پاؤں جھٹکتا، چہرہ ملتا اور ناک پکڑ کر اُس کا جما دیکھلاتا۔ میری ریڑھ کی ہڈی کی حالت دوسرے اعضا سے بالکل دیگر ہوتی۔ وہ اپنی پستی سے جیسے ابھرتی اُسی کی بڑائی ہے۔

قارئین! میرے روز و شب کے نشیب و فراز پر اُنے تھے، عنوان بدل گئے تھے۔

## باب ۶۳

حالات نے ہر کام اٹھایا مجھ کو

جو اُن کو تھا مقصود بنایا مجھ کو

جب دست خزاں نے مجھے مسمار کیا

(شاہ)

نادیدہ بہاروں نے بلایا مجھ کو

کام شروع ہوتا اور کام بند ہوتا، میری حالت کو ٹھوکے کی سی تھی جو صبح سے چلتا اور چلتا اور چلتا ہے

لیکن شام کو اُسی دروازے سے باہر نکلتا ہے، جس سے وہ اندر جاتا ہے۔ میرے بوٹ سینٹ نے کھائے اور اُن کے تلے پھول کر دو گئے ہو گئے۔ اُن کی حالت گیلی لیروں کے ڈھیر کی سی تھی جس میں مرد چوہے کاڑے لگتے ہیں۔ ایک بوٹ کے اگلے ٹانگے ٹوٹ گئے اور اُس کا بیجہ اونٹ کے پچلے ہونٹ کی طرح لٹک گیا۔ پچلے ہوئے پاؤں زمین سے اُٹھتا، اُسے ضرورت سے زیادہ اٹھا کر پھینکا پڑتا جس سے چال میں لنگ پیدا ہوتا۔ وقت کا ٹپنے کے لئے میں نے تلے کو پتے سے رسی سے باندھ لیا۔ وہ عارضی گٹھ جو میری جان پر آیا۔ تلا، پارٹھ کی درڑیں پھنسا، پاؤں اُکھڑا اور میں ستر کے بل گرا۔ حسنِ تقدیر! میرا ہاتھ پارٹھ کے ہانس پر پڑا جسے میں نے دبوچ لیا۔ پریم سنگھ پاس ہی کھڑا

تھا۔ پہلے وہ مُردہ بے حسی سے دیکھتا رہا پھر زور سے ہنسا اور اُسی ترنگ میں بولا، ”واہ! وہ قلابازی ماری ہے کہ بازی گر کی ایسی میسی کر دی ہے!“

میں حد سے مفلوج ہو گیا اور پاڑھ کے اوپر چڑھنے میں ناکام رہا۔ میں نے پریم سنگھ کو مدد کے لئے پُکارا، اُس نے اوپر ہاتھ اٹھا کر کہا، ”بھگوان، تیرا بھلا کرے!“ میں نے نیچے کود جانا چاہا لیکن پاڑھ کے نیچے مندر پڑا تھا جس پر گرنا ہاتھ پاؤں ٹرنا تھا۔ رن سنگھ ماسے کا تھارہ لئے پاڑھ پر چڑھ رہا تھا، وہ اُسے پھینک کر میری طرف بھاگا، مجھے باہوں سے کھینچ کر اوپر اٹھایا اور بٹھایا۔ میں جوں ہی بیٹھا، سر جھکا گیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور میں اپنے گھٹنوں پر ڈھسے پڑا۔ میں سمجھتا نہیں تھا کہ پریم سنگھ مجھ پر جھکا اور اپنا منہ میرے منہ کے برابر لاکر بولا، ”جھوٹے بھائی! اوپر جانا آسان ہے کہ نیچے؟“

”بڑے بھائی! میرے لئے دونوں ہی مشکل ہیں۔“ میں نے تملاکر کہا جیسے میرے سانس کی سِلک ٹوٹ کر جڑی ہو۔ واقعی، اوپر جانے کے لئے حوصلہ و کار ہے اور نیچے رہنے کے لئے ہنر آنا چاہیے۔ مجھ میں دونوں کی کمی تھی۔

میں پریم سنگھ سے نفرت کرتا تھا جس پر میری مردودیت کا طمع چڑھ رہا تھا۔ اُس وقت وہ مجھے منہ میں پڑی گندگی کی طرح گھناؤنا لگا۔ ایسی صورت سے نفسیاتی طور پر نجات پانے کے لئے آدمی کئی بار ٹھوک لیتا ہے لیکن میں دیسا بھی نہ کر سکا۔ وہ میرے ساتھ رہا اور میں اُس غلاظت کو نگھتا رہا۔ کسی نا مہذب عمل کو حد برداشت سے زیادہ برداشت کرنا خود تردیدی کی نشانی ہے اور ندرتِ فمیر کی ترقی کی نفی جو کوئی اس منحوس صورتِ حال کا عادی ہو جاتا ہے، وہ ہزیت ہی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

پریم سنگھ اشاروں اور کناہوں میں جو کہتا تھا، اُبھھا دیتا تھا وہ دراز دستی کی حد تک ہنسک امیز ہے۔ اپنی ذلیل حرکتوں اور بُرے ارادوں کے باوجود وہ گھر جاتے ہوئے گرو دوارہ بنگلہ صاحب میں اتھا ٹیکنا اور بھول چوک کی معافی مانگتا۔ بھوتنا چوں کہ اہلِ مذہبِ عبادت گاہوں کو مقامِ مہر سمجھتے ہیں وہ مقام سب سے گندے ہیں۔ کبیر کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ میرے بیان کا ثبوت ہے۔

تیر تھ تیر تھ ہم پھرے پایا نہ کچھ بن پانی

مندریں پاتھر لے پر بھو صورت نہیں جانی

انسان کی نفسیات اُس کے ماحول سے مطابقت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خدا پرست اولیادوں اور آدمیوں کے سوائے صرف مُردوں کو اچھا گردانتے ہیں۔ اُن کی زوال پرستی! وہ حیات کی بات نفرت سے کرتے ہیں کیوں کہ وہ زندوں کو قہقہو اور مُردوں کو مغفور جانتے ہیں۔ اُن کے دُجود کی حقیقت، غلاظت کی ہی ہے جو تاحید

رسانی ہر چیز کو منظر کردیتی ہے۔

میری بے ہنری پوری تھی! اور رادی کا بیان ہے کہ بھیک مانگنا ہنر ہے۔ کوئی جاٹ سویرے سویرے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے نکلتا، اُسے ایک بھکاری ملتا جو بھلا ہو جھمان! کہہ کر آگے نکل جاتا۔ اتفاق یوں ہوتا کہ اُدھر جاٹ دوپہر کو بھٹا کھانے کے لئے رہٹ پر آتا اور اُدھر وہ بھکاری۔ ایک دن جاٹ نے بھکاری سے پوچھا، ”کیوں بے! میں صبح سے شام تک مرنے ہوں، کام کرتا ہوں اور روکھا سوکھا ہڑپتا ہوں! تو سارا دن گھومتا پھرتا ہے، تنکا نہیں توڑتا ہے اور بھانت بھانت کا مزہ لیتا ہے۔“

”بھلا ہو جھمان! آپ کو ایسا لگتا ہے تو وہی کیجئے جو میں کرتا ہوں۔ بھکاری نے احترام سے کہا۔

”ٹھیک ہے! اس کے لئے کیا کرنا ہو گا مجھے؟“ جاٹ نے ڈانٹ کر پوچھا۔

”کرنا کیا ہے جھمان! اپنے تہمد کو گیارنگو کر چلا سلا لیجئے اور گھر گھر جا کر اکھ جگائیے! بھکاری

نے ہاتھ جوڑ کر بھجا دیا۔

جاٹ اپنے پیشے سے دکھی تھا۔ اُس نے تہمد گیارنگو کر چلا سلا دیا اور بس کر بھیک مانگنے چل پڑا۔

اُس نے پہلی ہی جگہ جہاں اکھ جگائی، ایک عورت چارپائی پر لیٹی آرام کر رہی تھی، بولی، ”جاد، مُعاف کرو! ہاتھ خالی نہیں ہے۔“

”تو سامنے پرسی پڑی ہے اور کہتی ہے ہاتھ خالی نہیں ہے؟“ بھکاری نے کہا جاٹ نے اکڑ کر پوچھا۔

”ابے تو کون ہوتا ہے ایسا کہنے والا؟“

”میں کون ہوتا ہوں؟ تیرا بار!“

اپنی عادت سے مجبور جاٹ نے گالی دے دی۔ وہ عورت اُس کا سیپا کرنے لگی اور اپنی عزت کی دہائی دینے لگی۔ گلی کوچہ اکٹھا ہو گیا۔ جس نے اپنے بچے کے چپکی نہ بھری تھی اُس نے جاٹ کے لات جمادی۔ وہ گرتا پڑتا جان بچا کر بھاگا جیسا کہ بھکاری کا معمول تھا وہ جاٹ کے رہٹ پر آیا اور جی کو اُس کی مرہم پی کرتے پایا۔ ”بھلا ہو جھمان!“ بھکاری نے اُسے دُعادی اور اُس درگت کی وجہ پوچھی۔ جاٹ نے کراہتے ہوئے اُسے ماری کتھاسائی۔ بھکاری نے خدا لگتی تھی، ”آپ کی غلطی تھی جھمان!“

”غلطی اور میری! تیری تو ماں کی۔۔۔“

جاٹ غصے میں آپنا دزد بھول گیا اور اُسے مارنے کے لئے اٹھا۔

”شانتی جھمان! شانتی!“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھیک مانگنا ہنر ہے جھمان! اس کے اپنے اصول

ہیں، جھمان!! بھیک نہ دینے والے کو بھی دُعادیتے ہیں اور آگے چل پڑتے ہیں۔“

میں اپنے ہنر اور اپنے حریفوں کے ہنر کا تجزیہ نئے سرے سے کرتا ہوں۔ میرا ہنر، خارا، اشکا کافی تھا اور ان کا ہنر، شیشہ گری۔

میں نے جیسے جیسے چھٹی تک وقت کاٹھا اور بوٹوں کو اتار کر دیکھا، ٹانگے ٹوٹے نہ تھے، بودے پتے کو پھاڑ کر نکل گئے تھے اور تلے میں جوں کے توں محفوظ تھے۔ ایٹری کے ٹانگے پلٹے ہوئے دانتوں کی طرح تھے جو ہاتھ لگاتے ہی اپنی غیر یقینی کاسراغ دیتے ہیں۔

”رگیان!“

پریم سنگھ ہاتھ منہ دھو کر اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا میری طرف بڑھا اور تکیھی نظر سے دیکھنے لگا۔  
”کیا ہے؟“

میں نے بوٹوں پر سے اسٹیکھیں اٹھائیں اور ناگواری اور بے بسی کے ملے جلے جذبے سے اس تیسرا انتظار کرنے لگا جو میرے اذیت خواہ کے کمان کی طرح کچھے ہونٹوں سے چھوٹنے والا اور میری رگ ہستی کو لہو لہان کرنے والا تھا۔

”ان بوٹوں کو ہتھال کر رکھ لے، آنے والی نسلوں کی اطلاع کے لئے! وہ دیکھیں گی اور فخر کریں گی کہ ان کے پرکھے کس شان سے رہتے تھے!“

اُس نے اپنی قیمتی راسے دی۔ میری قیمتی راسے ہے، اُس کا تکیہ کلام تھا۔  
”ٹھیک ہے، ایسا ہی کر دوں گا!“

اپنی غارت گردانہ معیشت کا بھرم باندھنے کے لئے میں نے اُس کی بات کو یکسر تسلیم کر لیا۔  
”ایسا کرنا ضروری ہے اور نہ تیرے ساجر کے عقیدے کا بھرم نہ رہے گا۔ ڈی۔ ایم۔ سی کو جھگیوں اور جھوپڑیوں نے بجائے کوٹھیوں اور بنگلوں کو مسمار کرنا چاہیے کیوں کہ جھگیوں جھوپڑیاں آنے والے وقتوں کے آثارِ شریف ہیں اور کوٹھیاں بنگلے منجوس تعمیرات۔“

میرے دل میں ٹیس اٹھی، خالص اپنی ناداری کی ٹیس۔ میں نے اُس کے بوٹوں کو حسرت سے دیکھا، اُس جذبے کو بڑی مشکل سے کچلا جو اُس کے طعنے کا رِوَعَمَل تھا اور میری رقابت کا حاصل۔ میں کچھ نرم پڑا۔ میرے دل نے مجھے سمجھایا، ”تو جن لوگوں کا حصہ ہے، وہ متواتر مجھے مسترد کرتے ہیں اور تو ہے کہ ان سے لگا پھرتا ہے۔ انہیں چھوڑ کر تو ہم مشرب لوگ کیوں نہیں تلاش کرتا؟“ میں نے اپنے دل کے جرات آمیز سوال کا جواب ترحم آمیز ہنسکڑا سے دیا اور اپنے ٹوٹے ہوئے بوٹوں کو دیکھا، انہیں پھینکنا چاہا لیکن پھینک نہ سکا اور اٹھا کر سائیکل کے کیرئیر میں اُلٹا لیا۔ میں سائیکل لے پیدل چلنے لگا، ابھی تین مورتی مارگ کے بیچ ہی تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے موٹر

کید کی پائلٹ کار شور چاتی گزری اور سڑک پر گشت لگاتے سپاہیوں نے ٹریفک روک دیا۔ میں وہاں کھڑا کھڑا سوچنے لگا، ”جو لوگ عوام کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، عوام کے بل بوتے پر اپنے کمال کو پہنچے ہیں، وہ اُن کی نفی کس بے رحم شوکت سے کرتے ہیں۔“ میرے خیال کی شدت! میرے سامنے سے وہ قافلہ گزر گیا لیکن مجھے ہیولا سا نظر آیا۔

شنکر روڈ پر بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک موچی بیٹھا کرتا تھا۔ میں نے کیرئیر سے بوٹ نکال کر اُسے کاٹھنے کو دیئے۔ وہ اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور پُرانے بوٹ کی ایٹری مرمت کر کے اُسے شیشے کے ٹکڑے سے پلاس رہا تھا۔ اُس نے میرے بوٹ دیکھے اور سمجھا کہ میں اُسے بنا رہا ہوں۔ اُس نے کچھ کہے سُنے بغیر غصے سے بوٹ اٹھائے اور پرے ایک طرف پھینک دیئے۔ اُن کی حالت دھکی بھکی نہ تھی۔ میں موچی کے ردیے پر ہنس پڑا اور اُس شرم ناک حالت میں بھی ہلکا ہلکا محسوس کیا۔ میں نے اپنے پچھٹے ہوئے پاتا بے جھولے میں سے نکالے اور بوٹوں پر بیٹھ دیئے۔ مجھے سنجیدہ پاکر موچی کا غصہ حیرت میں بدل گیا۔ اُس نے مُنہ کھولا لیکن چُپ رہا۔ میں وہاں سے سیدھا صدر بازار پہنچا اور نئے بوٹ، اور نئے پاتا بے خرید کر پہنے، مجھے لگا کہ میں نے اپنے گلے سڑے پاؤں کاٹ کر پھینک دیئے ہیں اور نئے لگائے ہیں۔ دوسرے دن میں کام پر گیا، پریم سنگھ کے آنکھیں مٹکانے کا انداز ہی الگ تھا۔ اُس کی ”ہوں ہوں، جی جی“ کے جتنے معنی تھے، وہی بہتر جانتا ہو گا۔ کاریگروں کی بھیڑ میں وہ اکیلا تھا جوئے بوٹ خریدتا تھا اور دھوبی دھلے کپڑے پہنتا تھا۔

اُدھر وہ بلندی اور ادھر یہ پستی! اور اس پستی سے زیادہ پستی بھی تھی۔ مجھے نئے بوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر رن سنگھ یوں خوش ہوا جیسے کسی حسرت گزیدہ کی زندگی میں اُمید جھلک اُٹے۔ اُس نے اُمیدوارانہ انداز میں پوچھا، ”سردار جی، آپ نے پُرانے بوٹ کیا کئے؟“

”اُن کو کیا کرنا تھا؟ پھینک دیئے!“

میری بے نیازی میں شان تو نگری تھی۔

”اُہ! کیوں؟“

اُس کی آہ میں ڈوبا ہوا سوال جواب طلب نہ تھا، میں چُپ رہا۔

”مجھے دے دیتے!“ اُس نے منت طلب لہجے میں کہا۔

”وہ تو بالکل خراب تھے!“ اُس کی ضرورت کی تاب نہ لا کر میں اُسے ٹالتے ہوئے بولا۔

”کچھ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے!“ اُس نے اپنی ضرورت کی اہمیت جتلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! میں آج شام کو دیکھتا ہوں۔ وہ جہاں پھینکے تھے وہیں بڑے ہوں گے۔ کون لے جائے گا“

انہیں؟ میرے احساس نے مجھے، اُسے دلاسا دینے پر مجبور کیا۔

اُس کی اُس نے اُس کے چہرے کو جگمگا سا دیا۔ اُس نے تغارہ اٹھایا تو اُس کی حرکت میں موسیقی کا سالوچ تھا۔ اُسے خوش دیکھ کر میں خود بھی کسی حد تک ہلک گیا۔

کام کے بعد گھر جاتے ہوئے میں اُسی راستے سے گزرا اور وہاں بوٹ نہ دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے سوچا کہ ضرور موجی نے اٹھائے ہیں۔ میرا ایسا سوچنا عین طبیعت تھا۔ جو گاہک سائیکل کے نئے پُرزے ڈلواتے تھے وہ پُرانوں کو کسی بھی قیمت پر بیچنا چاہتے تھے۔ اُن سب کے لئے ہمارا ایک ہی جواب ہوتا تھا یہ ہمارے کس کام کے! آپ لے جاؤ، کہیں بک سکتے ہیں تو بیچ لو۔ شاید ہی کوئی گاہک ہوتا جو پُرانے پُرزے لے جاتا۔ اُن پُرانے پُرزوں میں سے کئی کم قیمت پر بک جاتے اور باقی وزن کے لحاظ سے کوڑی خرید لیتا۔

میں نے موجی کی طرف دیکھا۔ وہ پیروں میں بوتا پکڑے سیتا آدریچ میں مجھے بھی دیکھتا جیسے اپنے کسی تحقیق پسند جذبے کی رواداری میں مصروف ہو۔ وہ جیسے ٹوچتی کھساتا، اُس کے منہ میں دھاگا اڑتا، اُسے کھینچ کر کستا، اُس سے لگتا کہ وہ کوئی آناڑی ہے۔ اُس کی ساری کاریگری اُس کی بے توجہی کھا گئی لیکن اُس کی مجھ میں دل چسپی بدستور رہی جیسے وہ میرے بارے میں کوئی ناپاک راز جاننے پر مصمم ہو۔ بوٹوں کی جگہ کالے بھورے رنگ کے گولے سے پڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا اور میری سمجھ میں آیا۔ وہ گولے میرے بوٹ تھے جو دن کی دھوپ کھا کر کیا سے کیا ہو گئے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ موجی نے ہلک کر پوچھا جیسے اُس نے میرا عزم جان لیا ہو لیکن مجھ سے تصدیق

چاہتا ہو۔

”وہی جو تم سمجھ رہے ہو! میں نے اُسے شہ دیتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے خریدار مل گیا ہے کوئی؟“

”بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے!“

”زیادہ کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے جایو۔“

”ضرور، ضرور! اپنے بھائی کا خیال بھائی نہ کرے گا تو کون کرے گا!“

میں نے اپنی خوش طبعی سے اُس کی زندہ دلی کو بڑھا دیا۔

”تم سچ مچ روی داسیے ہو!“

میرے ایجاد کردہ رشتے نے اُسے میرے بارے میں سنجیدہ بنا دیا۔ اُس نے اپنے پیچھے سے پلٹا

اٹھا کر آگے رکھا، مجھے بیٹھنے کو کہا اور پہلے سے بھی آہستہ روی سے کام کرنے لگا۔

اپنے آپ کو بڑی شخصیتوں سے منسوب کرنا خبط عام ہے اور یہ خبط اُن میں شدید تر ہے، جن کی اپنی حقیقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ منسوب کردہ انفرادیت، فریبِ نفس سے عبارت ہے اور آدمی کی سب سے بڑی مردودیت۔ کئی ریاکار سادہ آدمی کے اس جذبے سے جیسے فائدہ اٹھاتے ہیں اُس کی مثال عالم گیر ہے۔

”ہاں بھئی، میں روی داسیا ہی ہوں!“

اُسے مکمل مرعوب کرنے کے لئے میں نے جھوٹ بولا۔

”ہمارے بزرگ روی داس کتنے بڑے بھگت تھے! اُن کی سل کے نیچے گنگا بہتی تھی۔“

اُس نے اپنی سل کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ جیسے ناگہاں اُسے اُس کی تقدیس کا علم ہوا ہو۔  
”تسے میں کوئی گاہک آیا، اُس نے اپنا جوتا اُسے مرمت کرنے کے لئے دیا اور جلدی کرنے کو کہا۔

”اچھا تو میں چلتا ہوں! میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”آتے جاتے ملتے رہنا، بھائی صاحب!“ جوتے کا معاہدہ کرتے ہوئے موچی تپاک سے بولا۔

”کیوں نہیں، ضرور! میں نے آگے جاتے ہوئے پیچھے دیکھ کر کہا۔

میں گنگارام ہسپتال روڈ سے ہوتا ہوا اچل خاں روڈ پر پہنچا اور وہاں سے ریگر دھپورہ کی جانب مڑا۔ رن سنگھ کا چہرہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ میں نے بڑا کڑا فیصلہ کیا، صدر بازار کا راستہ لیا اور رن سنگھ کے لئے بوٹوں کا جوڑا خریدا۔ اُس حالت میں میرے لئے ایسا کرنا، حاتم کی گور پر لات مارنا تھا لیکن میرا جذبہ اس قدر بھرپور اور خالص تھا کہ میں نے بوٹوں کے ساتھ پاتا بے بھی خریدے۔ دوسرے دن میں محول سے پہلے کام پر پہنچا اور حسبِ امید رن سنگھ کو میرا منتظر پایا۔ میں نے اُسے وہ تحفہ دیا جس کا اُسے اندازہ تھا اور نہ مجھے۔ پہلے تو اُس نے یقین نہ کیا، کیا تو بے اختیار رو دیا۔ اُس کے انسو میرے جذبے کی طرح کتنے طبعی اور اصلی تھے! وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ اُس نے مجھے پر نام کیا تو میرا دل بھر آیا۔ حُسنِ بیاں اور حُسنِ معنی الفاظ کو دائم اثر بنا دیتے ہیں لیکن رن سنگھ کی خاموش خوش خلقی کی بھرپور ازی دہی ہے جو کہ تھی۔

وہ مجھے راستے میں ملتا تو راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور پرنام کرتا۔ میرے ساتھ کام کرتا ہوتا تو میری ضرورت بن کہے سمجھ لیتا اور جہاں تک ممکن ہوتا، میرا ہاتھ بٹاتا۔ میرے لئے یہ روح افزا اور انوکھا تجربہ تھا۔ آج تک کسی نے نہ میری اتنی عزت کی تھی اور نہ ایسی صورتِ حال سے پیدا شدہ کیفیت سے میری واقفیت تھی۔ میں اپنے تایا جی اور ماں سے ایسا برتاؤ کرتا تھا لیکن اُس جذبے کا رُوحِ عمل الگ ہوتا تھا۔ میں دونوں جذبوں کا از سر نو تجربہ کرتا ہوں، پہلا جذبہ خود تھا اور دوسرا خود آرا۔



میں اُس نجوم میں واحد فرد تھا جو تعلیم میں کوئی درجہ رکھتا تھا۔ میرے وہ ہم عصر جو استادوں کے ڈنٹوں کی تاب نہ لا کر فصلوں میں چھپتے تھے، موٹے دماغوں کی وجہ سے فیل ہوتے تھے، کم عمری میں گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، وہ تمام کامیاب بڑھئی، کامیاب وائٹرز، کامیاب موٹر میکینک کامیاب ٹرنرز، کامیاب ٹیلر، کامیاب محار۔۔۔ نابغہ روزگار تھے۔ وہ میرے لحاظ سے اُدھورے سہی، اپنے لحاظ سے پورے تھے۔ اُن کی پور بارہ ہی پور بارہ تھی اودھ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور اچھا رہتے۔ وہ مجھ سے چالاک تھے اور اذیت رساں بھی۔ وہ اپنی تعلیمی شکست کا بدلہ مجھ سے یوں لیتے کہ مجھے میٹرک صاحب کے خطاب سے بلاتے۔ یہ دو لفظ، رزالت کا کتنا بڑا صحیفہ ہے! میں ہی جانتا ہوں۔ وہ زندگی کا ایک محرکہ ہار گئے تھے لیکن جنگ جیت گئے تھے۔ وہ میری ہار سے وہی تسکین لیتے جو کسی وقت اُن کی ہار سے میں، وہ مجھے ویسا ہی پھسڈی سمجھتے، جیسا میں انھیں۔ اُن کی آنکھوں سے وہی حقارت آمیز بے نیازی برتی جس پر کبھی میں ناز کرتا تھا۔ مزید براں وہ ساری باتیں جو برسوں پرانی اور میری بدنامیاں تھیں، اُن کی وجہ سے رُو تازہ تھیں۔ تہذیب و تمدن کی مزین آرائش کے پیچھے آدمی اپنے وحشی اجداد سے زیادہ مصنوعی، زیادہ قدیم۔۔۔۔۔ زیادہ ننگا ہے کیوں کہ پہلے یہ جو کچھ تھا، تھا، اذیت خواہی کے جذبے سے بے بہرہ تھا۔ میری مظلومیت نے مجھے انسان بینزار اور حیوان پسند بنا دیا تھا۔ حیوان کے سینے میں جیسا قابل اعتبار دل ہے اُس کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے اُسے آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اتنا سادہ لوح اور بے ٹوک ہے کہ اسے جیتنا بے حد آسان ہے۔ اس کی قربت مسرت ہے اور مسرت کے سوائے کچھ اور نہیں ہے۔

تایاجی کہتے تھے، ”آدمی کی زندگی اپنے لئے فرض شناسی اور دوسرے کے فیض رسائی ہے۔ جو کوئی اس معیار پر پورا نہ اُترے، وہ سماج کا ناکارہ انگ ہے۔ وہ خود پر بوجھ ہے اور دوسرے کے لئے مفرت رساں۔“ یہ بات مجھ پر سو فیصد پوری اُترتی تھی۔

اخراجات کم کرنے کے لئے میں ہوٹل پر مہوار ی روٹی کھانے لگا۔ میں روٹی کھاتا ہوا چند ہواے چرا کر جیب میں رکھ لینا اور اپنے محلے کی گلی میں پہنچ کر کتوں کو آواز دیتا۔ ایک کے پیچھے ایک، وہ بھاگتے آتے، مجھے گھیر لیتے اور دم ہلاتے، کُراتے، چاٹتے، لوٹتے، مجھے مہکا دیتے۔ میں نے ہر کسی کو اُس کے رنگ کی نسبت سے نام دے رکھا تھا۔ میں اسے منہ میں لقمہ دیتا، اُسے لقمہ دکھا کر دُور پھینکتا، باری باری ہر کسی سے پیار کرتا اور اُن سب کو مسرور دیکھ کر اپنا غم بھول جاتا۔ میں خوش و خرم گھر پہنچتا، بستر پر لیٹا اور خیالوں کی دُنیا بساتا اور سونے تک اُسی کیفیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا۔

## باب ۶۴

ہر اک زمین پہ ہوتا قتلِ انساں کا

یہ کیا ضرور زمین وہ زمینِ مقتل ہو (شاہر)

میری زندگی بد صورتی کی طرح ناقابلِ برداشت تھی۔ معمول وہی تھا لیکن عذابِ مجدا۔ رینگتی رینگتی جوئیں، مڑے مڑے کیڑے، گھاؤ گھاؤ ہاتھ، کرد ہیاں کرد ہیاں پیر (کرد ہی، پاؤں گیلا اور گندہ ہونے سے گھائیوں کا زخمی ہونا)، اُجڑا اُجڑا چہرہ، تھکے تھکے سانس، اُداس اُداس جذبات۔۔۔ میری ہُصیت میرے لئے جگن ناتھ رتھ تھی۔ (جگن ناتھ رتھ کے بارے میں روایت ہے کہ جو آدمی اُس بوجھ کو ڈھوتا ہے اور پھر اُس کے نیچے آکر مرتا ہے، وہی بیکھنکھ سداھا تلبے) متواتر نرم گرم سنسنے میں اک نئے طریقے سے بدلا تھا۔ میں بظاہر بردبار تھا لیکن اندر چڑچڑا۔ ایسے آدمی کا اپنے آپ سے برتاؤ، بند پانی کا سار ہوتا ہے، جو بدرد سے زیادہ غلیظ ہوتا ہے۔

یرتیم سنگھ کا چوگڈیا ہر بس لال غیر حاضر تھا۔ میری شامت آئی اور مجھے اُس کی جگہ جھونک دیا گیا دوسرے تینوں پورے کا یرگتھے۔ وہ اینٹ اٹھانے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کا جائزہ لیتے، اُس کے ٹیڑھے اور سیدھے پاسے کا فیصلہ کرتے، اُسے اٹھاتے، ہوا میں اُچھالتے، ویسے ہی واپس پکڑتے جیسے موت میں ہوتی۔ اُن کی آنکھیں، ہاتھوں ہی کی طرح ہنر پروردہ تھیں۔ ادھر ہاتھ، اینٹ توڑنے کے لئے بسولی اٹھاتا ادھر آنکھ چوٹ لگانے کا نشان چنتی، چوٹ کی سختی طے کرتی اور ہاتھ کو مکمل ہدایت دے کر پلکوں کے نیچے چھپ جاتی پھر جیسے کام پر نظر کھتی وہ اُسی کی ہنروری تھی۔ ہاتھوں اور نظروں میں جو ردم تھا وہ مشقِ ہنر کا کمالِ بلوغ تھا۔ بایاں ہاتھ اینٹ کو چھٹ پکڑتا، دایاں اُس کے درمیان ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، ٹک، بسولی چلانا جو ہی عمودی حصے پر پہنچتا، بایاں اُس کا پاسا اُس سے زیادہ تیزی سے پلٹتا جس تیزی سے دایاں کام کرتا ہوتا۔ جب بسولی چھٹے سے کھڑے، کھڑے سے چھٹے اور چھٹے سے کھڑے حصے پر پہنچتی، وہ گھڑی ایجاز و المیاب کی بی بی علی تصویر ہوتی۔ ایک ہلکی سی چوٹ اس سر پر، دوسری اُس سر پر پر اور اینٹ دو ٹلیوں (دلی، آدمی اینٹ سے دُرز کا تسلسل توڑنے کے لئے لگاتے ہیں) میں چڑ جاتی۔ دونوں

میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور دُستی کی مثال ہوتی۔ اُن کاریگروں کے اعضاء غلط حرکت شاذ ہی کرتے اور اگر کرتے تو اُن کی مقتدی حرکت اُسے دُست کرنے کی صلاحیت رکھتی۔ اُن کا فخر پیشہ کمال مقصود کا حامی تھا اس لئے دونوں ایک دوسرے کے دردمند اور بھی خواہ تھے۔

میری بے ہنری میری جاں گئی تھی۔ میری آنکھوں میں کرچیں بڑتیں اور ہاتھوں پر چوٹیں لگتیں۔ میرا ہر عمل میرا خیر مقدم یوں کرتا جیسے سنگ راہ، راہ گیر کا کرتا ہے۔ میں کئی بار ہمت کر کے اپنے حریفوں کے برابر کام کرتا۔ وقتی طور پر ایسا کرنا آسان تھا لیکن اُس مقام پر ڈٹے رہنا مشکل۔ جہاں مجھ سے کوئی ہوتی میں پیچھے رہ جاتا۔ مقابلے کے کام میں کسی عمل کو سہرانا دوران سفر رک رک کر چلنے کے مساوی ہے۔ ایسی صورت حال میں اڑے رہنے کا ایک ہی موثر طریقہ ہے۔ جو قدم اٹھاؤ، نپاٹا اٹھاؤ اور آگے بڑھو۔ لیکن میری حالت اُس نپے کی سی تھی جو ہاتھ پاؤں زکاتنا ہے تو ہر کام پر سہارا بانگتا ہے۔

بیرونی سامان اندرونی وجدان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اجزائے تغیر کو جنم دیتے ہیں۔ یہ شوق ظہور میں حُسن ترکیب سے گزرتے ہیں، لہو کی نفسیات بدلتے ہیں جو اعضاء کو نئے سرے سے ترتیب دیتے ہیں، اُن میں وہ خوبیاں بھرتا ہے جو ضرورت وقت کی متحمل ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ خوبی پیدا کرنے کے بارے میں سوچتا، جس کی عدم موجودگی میری خواری اور بدنامی تھی۔ میرے داخلی وجدان اُدھورے تھے شاید اسی لئے میرے ہاتھ جیسے تھے ویسے کے ویسے رہے۔ میرے ساتھی اپنی چٹائی کی درزیں ساتھ ساتھ بیٹھتے اور یوں ایک کام ختم کر کے دوسرا شروع کرنے تک کچھ آرام کر لیتے۔ میری دلچسپی بدستور تھی جسے میں اپنی انگلیوں کو ہڈیوں تک گھسا کر سلجھانا سکنا۔ میرے خوب صورت ہاتھ، بد صورت انگ تھے مزید میرے لئے باعثِ ننگ تھے۔ میری آنکھیں اچھے، بُرے کام میں فرق کرتیں لیکن اپنے کردار میں ناقابلِ ارتکاب رہتیں۔ ایک لمحہ مؤند کر کام پر نظر ڈالنا ایک ہنر ہے۔ میں اس ہنر سے بھی فائدہ نہ اٹھا پاتا۔ کیوں؟ میں کیسے تشریح کروں! بنتے بنتے میرا عمل پُجاری کی مجبہ ساقی کی طرح طریق بن گیا جسے میں بے فائدہ دہراتا۔ میں مکمل، نامکمل تھا جس کی تلافی کامل عمل تھا۔

بچوں کی میں بے ہنر تھا ممکن ہے کہ میرے قارئین مجھے اپنے ساتھی ہنروروں کے بارے میں متعصب سمجھیں، ایسا ہرگز نہیں۔ میں نے انھیں بھگتا ہے اس لئے اُن کی نفسیات کو مستعد پہلوؤں سے سمجھا ہے۔ وہ بڑھ چڑھ کر کام کرتے تھے، مجھ سے زیادہ کماتے تھے لیکن اس میں اُن کی باطنی خوبی کو دخل نہ تھا۔ اُن کی صلاحیت درپردہ بربریت تھی۔ تمدن نے انسان کی رذیل جبلتوں اور آدنی جذبات کو نہایت اعلیٰ نام دیئے ہیں اور انھیں زندگی کی روح رواں کہا ہے۔ اُس دن لگاتار دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آگے دوڑا اور پیچھے

چوڑ ہو گیا۔ میں دیوار کے اندر کی جانب تھا اور یرتیم سنگھ باہر۔ وہ اپنی درزیں بنا کر آند آیا اور میرے کام پر نظر بازی کرنے لگا۔ میں نے کچھ گھبرا کر کام کی جانچ کی اور اپنی ناتجربہ کاری کے پھل کو دیکھا اور اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا تاکہ اُسے اُس کی تجربہ کار نظروں سے بچا سکوں۔

”واہ اِگیان تیرا پانسہ ایسا ہے جیسے بیل پیشاب کرتا ہو اگر اُڑا ہو۔“

یرتیم سنگھ کی تشعیک پر درداد کا ڈنک اُس مستانہ قہقہے سے کم تھا جو اُس نے بعد میں مارا۔ وہ مظلوم کے زخموں کی دل کشی ہے جو ظالم کو تشدد و یر اکساتی ہے اور اُسے گہری سے گہری جوٹ لگانے پر آمادہ کرتی ہے، ورنہ اُن کی مکروہیت اُسے ایسے نابود کر دیتی جیسے پیپ، صحت مند پنکھے کو۔ آدمی ایسا نامہ نگار ہے جو وقت بے وقت اپنے بارے میں اچھی اور دوسرے کے بارے میں بُری خبر سناتا ہے۔ سیوا سنگھ اُدھر سے گزر رہا تھا، یرتیم سنگھ نے اُسے درغلالتے ہوئے کہا، ”مستری جی، آئے، ایک نظارہ دیکھئے!“

”کیا ہے؟“ اُس نے سرسری انداز سے پوچھا۔

”دیکھنے کی چیز ہے!“ اُسے متوجہ کرنے کے لئے یرتیم سنگھ تجش بھرے لہجے میں بولا۔

وہ اُس سے متاثر نہ ہوا اور بلاوے کو نظر انداز کر کے آگے چلا گیا لیکن لوٹ آیا۔

”کیا بات ہے؟ خواہ مخواہ میرا وقت برباد نہ کیا کرو۔“ اُس نے یرتیم سنگھ کو ڈانٹ کر کہا۔

”اُدھر دیکھئے!“

اُس نے دیوار کی طرف اشارہ کیا اور اُدھر منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ سیوا سنگھ اُس کا مطلب نہ سمجھ

سکا اور دیوار کے پیروں میں پڑے سسلے کو دیکھ کر غصے سے بولا، ”کس کا کام ہے؟“

”جی میرا!“ میں نے جھینپ کر نہایت میٹھے لہجے میں کہا۔ وہ کسی حد تک سہجٹا نظر آیا۔

”کیتنا مسالا نیچے گرایا ہے! پورا اٹھاؤ اور ہودہ میں ڈال کر آؤ۔“ دیوار کے پیروں میں بوریال

بچھالیا کرو، مسالا اٹھانے میں آسانی رہتی ہے۔“

وہ یہ نصیحت کر کے جانے اور میں تسلسلے میں مسالا اٹھانے لگا۔ یرتیم سنگھ نے اُسے آگے بڑھ کر

روکا اور بے کم و کاست کہا، ”وہ تو ہے جو ہے! یہ دیکھئے مستری جی!“ اُس نے دیوار کو ہاتھ لگایا اور ایک

آنکھ موند کر دیکھا۔

انسان کی حیوانی جبلت ماکس بہ کمال ہو کر کیفیتی تبدیلی سے شناسائی پیدا کرتی ہے اور اپنے طرہ امتیاز میں قوت ایجاد بنتی ہے اور ہنر کہلاتی ہے۔ اسی طرح عوام اور مظاہر کے اختلاط سے انسان ظہور میں

آتا ہے جو بمقدور ظرفِ انسانیت سے رشتہ نبھا رہا ہے۔

سیوا سنگھ دیوار کے برابر کھڑا تھا، اُس نے وہیں سے اُدھر دیکھا اور ایک ہی نظر میں سارا معاملہ سمجھ لیا۔ وہ گالیاں دینے لگا اور میں مسالا اٹھاتے ہوئے نیچی نظر کئے سننے لگا۔ کاش، بات وہیں ختم ہو جاتی لیکن میری بد بختی کو بھی تو آتا تھا۔ یہ اپنے جلو میں اپنے سارے ارکانِ خاندان، بربادیوں، دکھوں آنسوؤں، محرومیوں، ذلتوں، فاقوں۔۔۔ کے ساتھ آتی ہے۔

سیوا سنگھ کو کیا سوجھی! وہ بسوئی لے کر دیوار سیدھی کرنے لگا۔ سیمنٹ کی چٹائی گیلی گوبر اور سوکھی پتھر مشہور ہے۔ ٹھونکنے اور پیٹنے سے گلے سنڈے بہہ گئے، دیوار بکٹری ہو گئی اور وہ بلا بھی میرے ہی سر آئی۔  
”تو یہاں سے دفع ہو جا!“

اُس کی آواز باریک اور تیز تھی، غصے سے اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ ہاتھ سے اشارہ نہ کرتا تو اُس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آتا۔ میں کہاں دفع ہوتا! وہیں کھڑا رہا۔  
”تو نے سنا نہیں! کہیں مَر رہتا، اِدھر مُنہ نہ کرنا!“

میں شرم سے گرٹھا جا رہا تھا جب کہ میرے ساتھی سر بلند محسوس کر رہے تھے اور کئی مُنہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روک رہے تھے۔ سیوا سنگھ کے مُنہ میں جو کیا، بکلتا گیا۔ اُس کا لہجہ اُس کے ارادے کی طرح صاف تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ سوبات سے ایک چُپ بھلی! میں اسی پر عمل کرتا رہا۔  
”تو اپنے آپ جانتا ہے کہ چوکیدار سے دھکے مروا کر نکلوانا پڑے گا؟“

میری خاموشی سے وہ کچھ نرم پڑ گیا اور دیوار کو ایسے دیکھنے لگا جیسے اُس ناگوار مسئلے کا حل سوچ رہا ہو۔ اُس نے بے ارادہ میرے دشمن سے پوچھا، ”اس کا کوئی علاج ہے؟“  
”سیوا بیساں! کہتا ہے اس پندرہری پر پوری دھاڑی لوں گا!“ میری بات بنتی دیکھ کر اُس نے سے ہکایا۔

”اچھا! یہ گاندھرا کر دو روپے نہیں لاسکتا اور پوری اجرت کی بات کرتا ہے!“  
وہ پھر پھر گیا اور جیسے مارنے کے لئے میری طرف بڑھا۔ اُس نے ہاتھ روک لیا لیکن مجھے ایسا ذلیل کیا کہ بس! مجھے لگا کہ کاریگر کی اولاد کو آزار برتنے کا ہنر اپنی ماں کے پیٹ ہی میں سیکھنا چاہیئے۔ اہمیت کی طرح۔ وہ لحو بڑا نازک تھا! میری رگوں میں بغاوت کا جذبہ لاوے کی طرح دوڑ گیا۔ انسان اس لئے شریف نہیں ہے کہ شرافت کی اہانت کے خیانت سے زیادہ امکان ہیں۔ کسی نے خوب کہا، ننگے سے بھگوان بھی ڈرتا ہے۔ اُن ننگِ خلاق میں میری کیا بساط ہو سکتی تھی؟

میری بے کسی میں کوئی مجھ سے میٹھا بول بولتا تو میری تقصیرِ ذات سے تکمیلِ ذات کا جذبہ اُبھرتا میرا کرتا ہوا حوصلہ سنبھلتا اور میں مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا۔ دوسری صورت میں میری حالت ریت کی دیوار کی سی ہوتی جو اڑنکلا ہٹاؤ تو اپنے ہی بوجھ سے ڈھس پڑتی ہے۔ میں اپنے بے سرو پا حالات میں ایک زلزلے تجربے سے فیض یاب ہوا تھا جس کا بیان ضروری ہے کیوں کہ اُس نے مجھے کسی حد تک بے دلی کے اندھیرے میں گم ہونے سے بچایا تھا۔ میں روحانی پستی کے پاتال میں تھا۔ میں رکابِ گد کے پاس سے گزر رہا تھا جہاں ڈھاڑی، بندہ مہار کی رزمیہ سنار ہے تھے۔ اُن کے طرزییاں سے نفسِ مضمون اس قدر پر اثر ہو رہا تھا کہ میری کایا ہی پلٹ گئی۔ میں ”جے گوہند، جے گوہند“ کا نعرہ لگاتا ہوا دوڑنے اور مکا اوپر لہانے لگا۔ میرے چلن کا خفیہ ردِ عمل یہ تھا کہ میں بھلے مر جاؤں لیکن میرے جذبے کا خروش ہوا کی موجوں میں دائم قائم رہے گا جیسے حیات موجودہ کے بعد حیاتِ آئندہ۔ راہ گیر مجھے حیرت سے تنک رہے تھے۔ چوں کہ مجھے نصرت کی عظمت اور اُس سے منسوب عزت کا جذباتی تجربہ نہیں تھا، تماشا بیوں کے متجسس رویے سے میرے بیجان کی تحریک کو تقویت ملی اور میری رفتار میں مزید تیزی آگئی۔ پچی سڑک پر تنگ پاؤں دوڑنے سے میرے تلوے گھس گئے اور آبلوں کی طرح جھلنے لگے۔ میری تکلیف میرے جوشِ عمل کے لئے اکریر ثابت ہوئی۔ میں ایسٹ راجندر نگر کے قریب پہنچا اور وہاں ایک سدر راہ سے ٹکرا کر گر پڑا میں اُسی سرگرمی سے اٹھا لیکن میرے مجروح پیروں نے میرا ساتھ دیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں میرے جونی جذبے کا جادو ٹوٹا۔ میں اپنی پستی میں اُن جیالوں کے کارنامے یاد کرتا جو اپنے حوصلے سے ہر مصیبت سے گزر گئے تھے۔ اُس نفسیاتی کیفیت کی ایک سوئی جذبات کی بے تصریح ندی تھی جس کا افکارِ تخلیق سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ میری یہ حالت میرے جذبِ انتقام کو بھڑکاتی اور مجھے تشدد پر اُکاتی، جس کا حاصل صرف ابطال ہے، اپنا یا پرایا۔ وہ لوگ جو ایسا مقابلہ پرانک بیر پُرشوں سے کرتے ہیں، وہ سب سے زیادہ کھوکھلے اور قابلِ مذمت ہیں۔

میرا اڑیل پن! میں لتاڑا اور پھٹکارا ہوا وہیں کھڑا رہا۔ میرے ضدی رویے نے سیوا سنگھ پر اٹا اثر کیا۔ اُس نے میرے اوزار لے جا کر جو پچھ میں ڈال دیئے اور چلا گیا۔ میں یکا ارادہ کر چکا تھا کہ وہ مجھے دھکے دے کر نکالے گا تبھی نکلوں گا۔ میں جو پچھ کے کنارے پر سے اُندر جھک کر اوزار نکالنے لگا۔ ہاتھ نکھاہا تک نہ پہنچا، میں جھکتے جھکتے اپنا ہی پاستک بن گیا۔ پریم سنگھ میرے پیچھے سے چپکے سے آیا اور میرے جوتڑوں میں پاؤں گھسا گیا۔ میں ہاتھ اوپر اٹھا کر سنبھلا لیکن توازن کھو بیٹھا، پانی میں گرا اور ڈوب کر ابھرا۔ میں قہقہوں اور ملعونوں کی بوجھار میں اوزار لے کر باہر آیا، میری حالت پانی سے نکالے ہوئے اسفنج کی سی تھی۔

میں نے کپڑے بچوڑ کر پہنے، کیش جھٹک کر پھیلائے، پگڑی پاٹھ پر ڈالی اور اپنی بے غیرتی کا ثبوت دینے کے لئے چوگڈے سے جا ملا۔

میری بے ہنری میری بیماری تھی، میری تپ دق تھی جو مجھے اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ مجھے اُس کا احساس تھا لیکن میں اُس کے سامنے بے بس تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میرے ہونٹ سوکھنے لگے۔ اُس بے قراری سے نجات پانے کے لئے میں ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور کچھ آرام محسوس کرتا۔ وہ صورت حال زیادہ دیر نہ رہی اور میری حالت مجھ پر واضح ہو گئی۔ میں کانپنے لگا، بخار میں خلتے لگا۔ اور کام چھوڑ کر گھر روانہ ہوا۔ بخار کی غنودگی میں راستہ نہ سوچتے وہ میری پکیپی تھی جو میری بے ہوشی کا تسلط توڑتی تھی۔ شکر روٹی اُترائی اور مجھے گھر پہنچنے کی جلدی، سائیکل تیز ہوتی گئی لیکن میں نے بریک نہ لگائی۔ جیسے صحت مند رہنے کے لئے آدمی کی انتڑیوں کا صاف ہونا ضروری ہے اُسی طرح شہر کے لئے سڑکوں کا۔ سڑک میں گہرا گرٹھا تھا، بہتیا اُس میں گھسا اور اٹک گیا۔ مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ میں کٹھی پر سے اُچھلا ہینڈل کے اوپر سے اڑ کر نیچے گرا اور دُور تک گھسٹتا گیا۔ کوئی انگ ایسا نہ تھا جس پر کھونچا نہ لگا ہو۔ منہ میں خون کا لون محسوس کرتے ہوئے، میں اٹھا لیکن سر سننا گیا۔ کچھ لمحوں کے لئے میں جہاں کا تھاں رُک گیا پھر سنبھلا۔ میں گرتا پڑتا پگڑی اٹھا رہا تھا کہ چند سائیکل سوار ایک ساتھ گزرے۔ اُن میں سے ایک بے ادب نے سائیکل روک کر دم آمیز حقارت سے مجھے دلاسا دیا، ”سکھڑے! رام کا شکر کر، جس نے تجھے نیا جیون دان دیا ہے! تیرا گرد تو مجھے مار ہی چکا تھا“ اُس بے دودھٹے کی رُوحانی چوٹ! میں پل بھر کے لئے جسمانی تکلیف بھول گیا۔ میں نے اُس کٹھوردل کو تیرانی سے دیکھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں کیسے گھر پہنچا!

میرے شب و روز صبر آزما حد تک بے رحم تھے۔ اُن کی ہر یاد آج بھی آنسوؤں کے کہرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میں نے بخار سے چھٹکارا پایا تو میرا منہ آگیا۔ میری حالت اُس پرندے کی سی تھی جو عقاب کے پتھوں سے چھوٹ کر کیڑوں مکھڑوں کے بھون پر جا گرے۔ کام پر طنزوں اور بدنامیوں کا درد سہی، مصروفیت میں وقت گزر جاتا تھا۔ بیکاری اور اُس پر بیماری! میں غلامیں لٹک گیا۔ میں تایاجی کو یاد کرتا جو کام کی حمد و ثنا کرتے نہ تھکتے تھے۔

”کام، زندگی کا آرام ہے!“

”کام، ہر روگ کا دارو ہے!“

”کام، اصل حیات ہے! جو لوگ دل لگا کر کام کرتے ہیں وہی تسکینِ نفس کے معنی سمجھتے ہیں۔“

لیکن میرا کام میرے لئے کُلفتِ حیات تھا، حسرتِ حیات تھا، لعنتِ حیات تھا۔ ایک ناتوانی کی بے کسی اور دوسرے تنہائی کی ادا سی، زندگی دباؤ میں پھندے کی طرح کسنے لگی۔ میں نے خست کی اور دوانہ کھائی۔ بُخار اُترتے اُترتے اُتر گیا لیکن مجھے لگتا کہ اُس کے بخاراتِ دماغ میں چڑھ گئے ہیں۔ اوچھی پُوچی کتنے دن رہتی؟ سرکتے سرکتے سرک گئی۔ ایک میری کمزوری، دوسرے غریبی، تیسرے بے اُصلی، میری مظلومت کئی تہری تباہی اُدھکی اور اپنا سنفی رنگ دکھانے لگی۔ میری رُوح، میرے جسم میں ایسے رہنے لگی جیسے بندرِ خم میں پیپ، اُس کا پکنا اُس کے وجود سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میری کوئی دانائی اور ہوشیاری کام نہ آئی۔ میری قوتِ یابی کی صلاحیت مگر گئی۔ میرے قارئین، مجھے دوبارہ سوچنے دیجئے! میں اس صلاحیت سے عاری تھا۔ صلاحیت، مبذول نہیں مُتوار دُنوانائی ہے جو اپنے عمل سے اپنی تجدید کرتی ہے اور خود کو پہلے سے زیادہ کارگر بناتی ہے۔ میں باہر دھوپ سینکتا اور گلے گلے آسمان کو تکتا۔ میرا بیمار خیال! مجھے وہ سنگ سار کردہ گناہ گار کی طرح نظر آتا۔ میں زوال کی انتہائی کیفیت میں تھا۔ میری دماغی حالت گزنگ کے کیرے کی سی تھی! وہ ریختے ریختے گندگی سے باہر سر نکالتا ہے لیکن تازہ ہوا لگے ہی اپنا منہ اندر کی طرف گھمالتا ہے۔

میں پیروں اور فقیروں کی دانش پر حیران ہوتا! اُنھوں نے ناداری، بیماری اور نفس کشی کو رُوحانیت کا درجہ دیا ہے اور ان تینوں گندی سٹری چیزوں کو رحمتِ جان کر سہا ہے اور نجات کا راستہ بتایا ہے۔ اپنی حالت پر غور کرتے ہوئے، میں اُن کے مقدس ارشادات "پر غور کر تا جو مجھے کُذِب آفریں لگتے۔ اُس نازک گھڑی میرا زخم خوردہ وجود حقیقت سے زیادہ حقیقی لگتا۔

## باب ۶۵

جب بھوک کا سانسوں میں دھواں ہوتا ہے

جب درد کا احساس جواں ہوتا ہے

پھر چاند نظر آتا ہے روٹی کی طرح

(شاطر)

تاروں پہ بتاشوں کا گمماں ہوتا ہے



میں حیران ہوں کہ جس ماحول میں انسان صاف سانس نہ لے سکے اُس میں جہانی صحت کے ساتھ روحانی فراغت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ غریبی سے بڑھ کر کوئی لغت ہے تو وہ غریبی ہی ہے۔ غریبی انسانی زندگی کا سراپ ہے۔ بے عملی، بیماری، خواری، بے کسی، بیزاری۔۔۔۔۔ ساری تنزل پریز قوتیں اسی کے پھل پھول ہیں۔ یہ ایسا انوکھا درخت ہے جو دھرتی سے پاتال کی طرف بڑھتا ہے۔

میرے دشمن میرے بخار کو جوانی کی گرمی کہتے اور میری ناٹوانی کو بیکار پسندی۔ وہ مرگ آشنا ماحول، انجانے راستے، منزل لامعلوم، امید کی روشنی نابود، محرومی کا اندھیرا محیط۔۔۔۔۔ اندھیرے کی فطرت ہے کہ یہ دہشت، وحشت، اندیشے، کھٹکے کے بغیر کسی دوسرے جذبے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں منفی اثرات کو زیر کرنے کے لئے آدمی نے آگ ایجاد کی اور پھر اس کی تندہی کو سدھانے کی نئی ترکیب۔ ایجاد کی وہ گھڑی، فزوفن کی ترقی میں اُس چوٹ کی سی اہمیت رکھتی ہے جو لوہار، لوہے کو اوزار بنانے کے لئے عین آغاز میں لگاتا ہے۔

میرے منہ کا مزہ نہایت خراب تھا۔ اُس پر پیٹر اے ہونٹ، زہر بھٹی سانس، مجروح سماعت اور دھندلائی بھارت کی چیرہ دستی الگ تھی۔ میری پستی نے ہر لفظ کے معنی بدل دیئے اور ہر خیال میں تردید کا جُود پیدا کر دیا، بالکل ایسے جیسے گندگی کو یکدم صاف نہ کیا جائے تو وہ اپنی فرسودگی کی انتہا کی طرف حیرت انگیز تیزی سے بڑھتی ہے اور تاحد رسائی صاف ستھری چیزوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور انہیں مائل بر زوال بناتی ہے۔ مجھے یاد وطن آتی، سُلگتی اور تڑپتی ہوئی یاد! میری افسردگی اور بڑھ جاتی۔ وہاں کون تھا میرا درد بانٹنے والا! میرے زخموں پر پیار کا پھاہار کھنے والا! بھائیاجی کا جُود رانا سر چٹھا تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف دم لینا مشکل تھا۔ میں بھری بہار میں اُس پھول کی طرح تھا جو طوفانی موسم میں ٹھنی سے ٹوٹے اور یہاں ٹکراتا ہوا الجھتا، ریشہ ریشہ ٹوٹتا ختم ہو جائے۔

میں گھر سے نکل پڑا، کھویا کھویا، اُداس اُداس، زخمی زخمی، بکھرا بکھرا، اُنسو اُنسو، بو جھل بو جھل، اکیلا اکیلا کا لوٹ (ہر نوں کی لڑائی میں ہار ا ہوا ہرن، وہ غول کی سر پرستی کھو کر اکیلا گھومتا ہے۔ دوسرے کے مقابلے میں اُس کے مارے جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے) کی طرح۔ ریگڑھ پورہ اور پٹیل نگر کے درمیان ارض فاصل تھی، میں ادھر چل پڑا۔ وہ جگہ دُور سے خوب صورت نظر آتی تھی۔ میں وہاں پہنچا، مجھے لگا جیسے بن قریح کا بیچھا کرتے کرتے اُس کے اندھیرے سرے پر پہنچ گیا ہوں۔ میں جہاں تھا وہاں کوئی سمت نہیں تھی۔ میرا غم اور بڑھ گیا۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور بے خیالی میں کنکر اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی ان کنکروں کی طرح بے معنی شے ہے جسے وقت کا ہاتھ اٹھانا گراتا اور گراتا اٹھاتا ہے۔

میں پیروں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پیر جو سارا دن چلتے پھرتے کوئی تکلیف نہ دیتے تھے، پچھلے منٹ کی نشست میں بلبلاتھے اور طرزِ نشست بدلنے کی دہائی دینے لگے۔ مہل خیاں اور بے ہودہ دھیانی کام کے دوران دماغ کے کسی گوشے میں بند رہتی تھی، وہ اپنی تمام کچے روی کے ساتھ ہنگامہ آرا تھی۔ میری رگیں اُلجھی ہوئی آنٹی کی طرح تھیں جس کا آغاز ہوتا ہے اور نہ انجام، کوئی اُسے سلجھائے تو اُس میں گرہ در گرہ پڑتی جاتی ہے۔ ویسے ہولناک لمحے مجھ پر پہلے آئے تھے اور میری بدظورتی مجھے دکھا گئے تھے۔

جیسا کہ مذہبی تصور ہے، انسانی زندگی چوراسی لاکھ جوتوں کے درمیان برائے نجات وقفہ نہیں بلکہ دو وجودوں میں باہم تصادم ہے۔ جو انسان پہلے فلسفہ حیات پر یقین رکھتے ہیں اور عبادت سے عاقبت سنوارتے ہیں، وہ نادان اپنی دنیا و عاقبت دونوں کو خراب کرتے ہیں۔

اس نقدِ دل سے افادہ کروں تو میں کروڑوں لمحوں میں سے چند ہزار لمحے جیا ہوں۔ میں روحانی مسرت کے لمحات کو ٹھیک سے جانچوں تو میرے حصے میں مشکل سے چند لمحے پڑتے ہیں۔ ان روحانی لمحوں کا انوکھا پن ایہ آسودگیِ نفس کے برعکس وجدانِ تخلیق کی معراج ہیں۔

دوبتے دُوبتے سورج ڈوب گیا اور دھلتے دھلتے دن ڈھل گیا۔ جھینگروں کی اُداس لے سے رات درد کی کسک کی طرح ابھری۔ میری دشت و دہشت اور بے حوصلگی و بے دلی بڑھنے لگی۔ ہوا سانس سے نازک تھی اور سانس، دھڑکن سے۔ کسی قسم کا کوئی شور نہ تھا، بالکل ٹھہرا ہوا تھا۔ کہیں تھوڑی زندگی تھی تو میری آنکھوں میں تھی۔ میں اُس حادثے کی طرح تھا جو وقوع پذیر ہو چاہتا ہو۔ میں نے روکر خود کو بجال کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میرے احساس کا رویہ جوتوں کا سانچا جو آدمی کے مرنے پر اُس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ میں اپنی بے بسی پر حیران ہوا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنے آپ کو مجروح کر لوں تو مجھے درد نہ ہوگا۔ میں نے درد سے پتھر پر مگن مارا۔ میرا ہاتھ جھٹکا گیا۔ اُسے تھپکتے اور سہلاتے ہوئے، میں اٹھ کھڑا ہوا اور گھومنے لگا۔ اس بار میں نے جہاں بیٹھنے کا ارادہ کیا وہ گھاٹی کے پیروں میں جگہ تھی۔ چوٹی سے گھاٹی میں اترنا زمین کے اندر پہاڑ پر چڑھنا ہے۔ میری آنکھیں میرے پیروں میں مسکد گئیں اور میرے مختصر وجود کو بالکل مختصر کر گئیں۔ مجھے بیٹھتے ہی لگا کہ یہ دنیا کا آخری سہرا ہے۔ میں نے ڈر کر دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ پتھروں اور جھنڈوں کے سائے ڈراؤنے بیوہوں سے رینگتے ہوئے مجھ پر آنے لگے۔ میں خوف سے کانپ گیا۔ میری کپکپاہٹ تپ لڑزہ کی اینٹھن کی طرح لمبی اور شیلی تھی۔ اپنی بے بسی سے میں اپنے آپ میں زائل ہونے لگا۔ میرا رنگ بدلنے لگا اور بدلتے بدلتے میرے کپڑوں جیسا پیلا پڑ گیا۔ میرے کپڑوں کا رنگ اُن کی فرسودگی کا نتیجہ تھا اور میرا رنگ میری جان گنتی کا۔ سوکھی ہوئی برساتی گھاس اندھیرے میں آگ کی طرح چمکی اور میری

طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس موت کے سیلاب سے میں نے نہ بچ نکلنے کی خواہش کی اور نہ کوشش۔ نہ مجھے حیات سے رغبت تھی اور نہ موت سے نفرت، نہ اپنی ذات کا سوز و گداز اور نہ تعلقی دُور و دراز، نہ کوئی شورِ ماتم اور نہ کوئی شریکِ غم، ایک ہوکا عالم! میری حالت نوعِ آدم کے اُس بشر کی سی تھی جس کا سارا قبیل کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہو اور اُس کا اپنا انجام اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو۔

بُرا اپنی بُرائی، نیک اپنی نیکی، حرصی اپنی حرص، فیاض اپنی فیاضی، بے حس اپنی بے حسی اور حساس اپنی حس کا شکار ہوتا ہے۔ میں مغلوبِ سارے حرکت پڑا رہا اور اپنے نابود ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اُس وقت موت اپنی حقیقت میں سامنے آتی تو میں خوشی سے اُسے گلے سے لگا لیتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُس بھیانک زندگی سے حسین ہوتی جس کا میں تصور کئے ہوئے تھا۔

ایک پتھر لڑھکتا ہوا آیا اور تیزی سے میرے پاس سے گزر گیا۔ اُس کے پیچھے ریزے، ذرے، تنکے گھٹنے اُڑے اور کیر سی بنا گئے۔ میں چونک کر جھٹکے سے اٹھا۔ میرے گھٹنے زور سے چٹخے جیسے آئینہ ٹوٹا ہے۔ میں نے احتیاط سے قدم اٹھایا، مجھے لگا کہ گھٹنے ٹوٹ کر مُعجزاتی طور سے جڑ گئے ہیں۔ میں نے اوپر دیکھا ایک جنگلی بلا جھاڑی میں کھودنا نظر آیا۔ میں پھر سے بیٹھ گیا۔ میں نے کسی جانور کے پیچنے کی آواز سنی۔ بلا، خرگوش کو دبوچ کر اُسے جھنجھوڑا ہوا لے جا رہا تھا۔ اُس کے آنکھوں سے ادھل ہوتے ہی وہی سکوت لوٹ آیا لیکن کچھ الگ طریقے سے، میری بھوک کا احساس تازہ ہو گیا۔ میں نے اُسے کچلنا چاہا لیکن کچل نہ سکا۔ وہ دوپہر ہی سے مجھ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ زیندہ رہنے کے ہونٹ کا ادھار بند کر دیا تھا اور میری منت سماجت سے پیسجماں تھا۔ اُس کے بے درد رویے سے میرے دل میں نفرت بھڑک اٹھی تھی۔ مجھے کپکپی آئی اور متلی ہوئی تھی جیسے میں نے نہایت گندی چیز دیکھ لی ہو۔ میں نے بے قابو ہو کر تھوکا، جھبی اپنے آپ پر قابو پایا تھا۔ اُس شہری سے بُباں دیہاتن اچھی تھی جو بوقتِ ضرورت ’ٹھنکے دی چنگ‘ (گاڈل میں رواج ہے کہ کسی کے پاس دانے نہ ہوں، وہ بھٹیاریں سے کہے تو وہ اُسے اپنے پاس سے دانے بھون دیتی ہے اور پھر کبھی بھاٹے کے ساتھ وُصول کر لیتی ہے) بھون دیتی تھی۔ اُس نازک گھڑی وہ بخود صورت بُڑھی کتنی پیاری لگتی! ایک بار میں نے خوشی سے اُس کی بچی لے لی اور وہ کنواری کی طرح شرمائی۔ اس دل پذیر یاد کے ساتھ بھٹی کا منظر آنکھوں میں پھر گیا۔ میری بھوک کے درد کو میرے خیال کی نکبت اڑا لے گئی اور میں بولی گانے لگا۔ یہ بولی نہایت فحش ہے۔ اسے قابلِ تسلیم بنانے کے لئے میں نے چند لفظ حذف کر دیئے ہیں۔

دلنے بھننے، بھیرے ساڈے

بھکھیاں دے۔۔۔۔۔ ہڑدے

(اوبھٹیارن ، جلدی سے ہمارے دل نے بھون دے! بھوک کے مارے

۔۔۔ کھڑے ہو رہے ہیں۔)

میرے احیا کا کمال! میرے مُذ کا ذائقہ ہی بدل گیا جیسے بولی کے الفاظ مزیدار نوالے تھے۔ میرے نُون میں مزے کی پُچھل دوڑ گئی۔ میری کمزوری جاتی رہی اور لے اُونچی ہو گئی۔ میری خوش خیالی ، حُسنِ حقیقت میں ڈھل گئی ، سانس میں تانہ بٹھنے دانوں اور جلتی مٹی کی خوشبو ناچ اُٹھی۔ گاؤں کی بھٹی کی کہانی ، جوانی کی اُننگ اور ترنگ ہے۔ جس دن شکر کی سالی ریتا دانے بھونتی ، بھٹی پر معمول سے زیادہ بھیڑ ہوتی۔ کئی یار لوگ دو دو بار ، تین تین بار دانے بھناتے اور جب تک وہاں کھڑے رہتے اُس کے مَموں پر نظریں گاڑے رکھتے۔ اُس کے مَمے ، ٹھوڑی کی رعونت کو پچھاڑ کر اپنی سر بلندی کا اعلان ایسے کرتے جیسے اُس کا دوبار کی ساری ذمہ داری اُن کے سر ہو۔ لبّال دانوں کا چوتھائی بھنوائی لے لیتی تو وہ اُس سے لڑ پڑتے لیکن سیتا آدھے سے زیادہ بھنوائی رکھتی اور وہ اُس کے رویے پر خوش ہوتے جیسے اُس نے رعایت کی ہو۔

ایک بولی یاد آرہی ہے جس کا مفہوم مند جب بالا مضمون پر بھاری ہے۔

میتوں کوئی دودھ نہ لوے

پانی یکدا نمنے تیرا

(کوئی گواہن بھادج اپنی نند کے جو بن پر طنز کرتی ہے۔ جو لوگ مجھ سے دودھ

کے بھاد دودھ نہیں لیتے ، وہ مجھ سے دودھ کے بھاد پانی خریدتے ہیں)

میں ٹیڑھا میڑھا چلتا ، ڈھیلے پتھروں سے پاؤں بچاتا ، کہیں چٹانوں کہیں جھاڑیوں کا سہارا لے کر کھٹکے اُپر چڑھنے لگا اور ایک جھاڑی کے پاس ٹک گیا ، تھک کر نہیں ، تھک کر۔ میرے اس خلاف توقع رویے کا راز یہ ہے کہ جس جھاڑی کی شاخ کا سہارا لے کر میں نے قَدَم اُٹھایا وہ اپنی کوئل میرے ہاتھ میں چھوڑ کر میری پکڑ سے نکل گئی اور میں دھک سے رہ گیا۔ یہ تجربہ لا جوتی سے اُس مٹھ بھیڑ کا سا تھا جب وہ جلدی سے چھوٹا سا چمادے کر اُصل بات پھر کبھی پر ٹال باقی تھی۔ اُس مخصوص لمحے کی بے قراری اور بُرداری ایسی ہی ہوتی تھی۔ میں اُپر پہنچا ، آنکھوں سے پیروں تک سُکڑا ہوا منظر ایسے پھیل جیسے میں قید خانہ سے نگار خانہ میں جا نکلا تھا۔ دلی پوری رعنائی سے جلوہ گر تھی۔ میرے ہمکے ہوئے دل میں خیال آیا کہ کوئی نادار لڑکی میری ہی طرح آوارہ گھومتی ادھر آنکے اور ہم ایک دوسرے کا جکھ یوں بانٹیں کہ مٹھیں ہو جائیں۔ اپنی خیالی جنت بسائے میں اب جس پتھر پر بیٹھا ہوں سے کچھ ہی دور

مَسان تھا۔ بجلی کا آخری کھمبا اُس کے پھاٹک کے آگے گاڑا ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے کوئی سادھو  
گیرے کپڑے پہنے ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے ٹہل رہا ہو۔ اُسے دیکھ کر میں بے اختیار گانے لگا۔

بتے، بتے، بتے !

بھئی بچی ہندی ہوگئی سادھنی

موہاں لین گے گرو دے چیلے

(کیا خوب ہے کہ چھوٹی عمر میں سادھنی ہوئی ہے ! بڑی ہوگئی تو گرد  
کے چیلے موج مزہ کریں گے)

وہ سادھو میری طرف مڑا جیسے میں نے اُسے اُس کے نام سے چکارا ہو۔ وہ آگے بڑھنے لگا  
اور میں کسی ناگوار تاثر سے ڈرنے لگا۔ چوں کہ وہ روشنی سے اندھیرے میں آ رہا تھا، اُس کا سراپا دھندلایا  
ہوا تھا۔ وہ جیسے میری جانب آتا گیا، میرا خوف، دل کی دھڑکن کی طرح بڑھتا گیا۔ میں نے سوچا  
کہ وہ میری بولی سے برہم ہو گیا ہے اور میرے ساتھ لڑنے آ رہا ہے۔ میں اُٹھ کر دوسری طرف چل پڑا لیکن  
اپنی ٹانگ سُن پا کر رُک گیا اور اُس پر ہلکے ہلکے گھونٹے مار کر اُسے ہوش میں لانے لگا۔ جب تک اُسے  
ہوش آیا۔ سادھو میرے قریب آ گیا اور اُونٹ کی طرح ہچکولے مار کر چلتا صاف دکھائی دیا۔ حُسنِ فطرت  
کی گونا گونی میں کتنی یکسانی ہے ! ایک سے دوسرے ڈھونڈنا بڑی بات ہے، ایک چال دوسری سے  
الگ ہے۔ وہ سادھو بھگت سنگھ کے سوائے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شے جو مجھے اپنے فیصلے  
پر نظر ثانی کے لئے مجبور کرتی وہ سادھو کی صفائی صورت تھی۔ اُس نے اپنا بیراگا پھینکا اور مُصافحے  
کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اُسی طرح میں نے بھی۔ اُس نے میرے ہاتھوں کو چھو کر انھیں جھٹک دیا، مجھے  
یاہوں میں لیا، گلے ملا، میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے اوپر اٹھایا اور گول گھمایا۔  
”تت تت تول، مے مے میں۔۔۔“

میں بھگت سنگھ کے نئے روپ پر حیران تھا اور وہ میرے وہاں ہونے پر۔ میں تو بھرا پھوٹا  
تھا، اُس کے ذرا چھیڑتے ہی بہہ نکلا۔ وہ مجھے غور سے سُنتا رہا لیکن اپنے بارے میں اُس کا ردِ عمل نہ نکلا۔  
وہ ہنسے لگا اور اُس کے ساتھ میں۔ ذرا سی ہنسی نے میری حالت ہی بدل دی۔ کہتے ہیں کہ ایک ہنسی سو  
دکھوں کا علاج ہے۔ میں کئی ماہ کے بعد دل کھول کر ہنستا تھا۔ میں ایسے ہلکا چلکا ہو گیا جیسے کوئی کام  
کرتے کرتے تھک کر ٹھنڈے پانی سے نہالے۔ ہنستے ہنستے میں چپ ہو گیا لیکن وہ ہنستا رہا۔ وہ چپ  
نہ ہوا تو مجھے لگا کہ وہ میرا، اپنا، اپنے گھر والوں کا، رشتہ داروں کا۔۔۔ ساری دنیا کا ٹھٹھا اڑا رہا

ہے۔ اُس کی ہنسی واقعی رشتوں ناتوں اور رسموں رواجوں کی تقدیس پر گہری چوٹ تھی۔ اُس کی بیوی سرجیت کور (جسے وہ شاستروں کے اُساہ بیاہ کر لایا تھا) شاستروں کا پالنہ نہ کر سکی اور اپنے تن من کی آگ بجھانے کے لئے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے لگی۔ اُس کے اور بھگت سنگھ کے بارے میں ہر طرح کی بازاری خبریں پھیلیں۔

سرجیت کور کچی ٹوٹی ہوئی ہے!

بھگت سنگھ نامزد ہے!

سرجیت کور کا بھگت سنگھ کے بارے میں کیا خیال تھا؟ یہ وہی بتا سکتی تھی لیکن بھگت سنگھ اُس کے بارے میں کہتا، ”وہ ایسی بھٹی ہے جسے ہر دم تازہ جھوکا چاہیے!“

قاریب، ضرورت کی نفاست کو کٹوارے لمس سے نسبت ہے! جب تک یہ لطافت برقرار رہتی ہے، ضرورت بصورتِ قوتِ حیات پختی ہے۔ جس سے روحانی ترقی کو تقویت ملتی ہے جو ہی یہ نازک توازن بگڑ جاتا ہے، ضرورت مند زوالِ نفس کا شکار ہو رہتا ہے۔

## باب ۶۶

توڑنا اس سے جوڑنا اُس سے

زندگی کے یہ تانے بانے ہیں (شاہ)

بھگت سنگھ، سرجیت کور کی بھٹی کو جھوک نہ سکا اور وہ اُس سے ڈر کر گھر سے بھاگ گیا۔ ہر کوئی سمجھتا تھا کہ وہ ندامت سے ڈوب مرا ہے لیکن وہ بے غیرت زندہ تھا اور شمشان گھاٹ کے ایک گوشے میں رہتا تھا۔ اُس کا چھوٹا سا حجرہ بے داغی کی حد تک صاف ستھرا تھا۔ کیس اور داڑھی مونڈنے سے اُس کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا۔ ٹھوڑی پر گڑھا دکھائی دے رہا تھا جو چہرے کا دلکش منظر بنا ہوا تھا۔ گہرے لباس کے پر تو سے جلد کے نیچے فانوس جلتا لگتا اور سنہری رنگ ٹپکتا دکھائی دیتا۔ اُس کی باتوں میں شربی تھی ہی، معرفت کے رنگ نے اُن میں خیال آرائی بھی بھر دی۔ وہ بات بات پر شاستروں سے حوالہ دیتا اور بے ریا لگتا۔ اُس احاطے میں کچھ اور اُسی قسم کے لوگ رہتے تھے جو ایک

دوسرے کو مہاتما کہہ کر بلاتے۔ بھگت سنگھ نے ایک مہاتما سے میرا تعارف اس طرح کر دیا، یہ ہمارے سنساری مہتر ہیں۔ وہ مجھے خیر باد کہنے کے لئے دُور تک آیا اور گلے مل کر بولا، ”جب تک ہم ہیں، فکر نہ کرنا ویسے ہم رستہ جوگی ہیں۔“ یہ کہہ کر اُس نے چولے کی اندرونی جیب سے سو سو کے کچھ نوٹ نکالے اور میرے سویٹر اور شرٹ کے درمیان گھسیٹتے ہوئے بولا، ”ست گرو سب دے کاج سنوارے!“

اُس نے یہ سب اس آسانی سے کیا اور نرمی سے کہا کہ میں حیرت و مسرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بچلا گیا، میں وہیں کھڑا رہا اور اپنی الجھن میں اُس کا شکریہ تک نہ ادا کر سکا۔ وہ دس قدم گیا ہوگا کہ نوٹ آیا جیسے کچھ کہتا بھول گیا ہو۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور رازدارانہ انداز سے کہا، ”یہ بات کسی سے نہ کہنا کہ ہم، تم سے ملے تھے۔ اس میں دونوں کی بھلائی ہے۔“

”ٹھیک ہے!“ میں نے بولے سے کہا۔

میں جس سودمند صورت سے دوچار ہوا، وہ میرے خیال میں بھی نہ تھی۔ اُس نے مجھے یوں تذبذب میں ڈالا کہ میں اپنے جذبے کو صحیح سمت نہ دے پایا جس کی وجہ سے وہ ٹھنڈا اور ادھورا رہا۔ احسان مندی کا جذبہ احسان گزاری کے برعکس مجھوں ہے۔ اس کی تجہوویت کی ابتدا ہے کہ یہ اپنے محسن کا احسان ماننے سے احتراز کرے اور انتہا ہے کہ یہ اُسے بھول جائے اور لا انتہا ہے کہ یہ اُسے الزام دے۔

میں نے نوٹوں کو ٹھیک سے جیب میں رکھا، سویٹر نیچے کھینچا، دامن دُرست کیا اور تیز تیز چلنے لگا۔ میرے پیٹ میں بک پرنے لگا لیکن اُس میں درد کے بدلے خوشگوار ربط تھا۔ میری نالوائی میری نالوائی کو کہاں اور کیسے چھپائے ہوئے تھی؟ یہ اُس کے تسلط سے کیسے آزاد ہوئی؟ وہی جانے! وہ میری رگوں کی زور آفرینی بن گئی اور میں بڑھتی ہوئی سردی میں گرمی محسوس کرنے لگا۔ میں پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا! میرے دل میں طرح طرح کے خیال اٹھنے لگے۔

کوئی اتنے سارے روپے دیکھے گا تو کیا کہے گا؟

یہ بڑک ٹوٹی ہے، کہیں چور نہ چھپے ہوں!

میں زیندر کو دیکھ لوں! وہ ذلیل اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟

یہ نوٹ جعلی تو نہیں ہیں؟

یہ کتنے روپے ہوں گے؟

میرے جی میں آئی کہ میں اُن کی وہیں گنتی کروں لیکن میں خوف سے ویسا نہ کر سکا۔ خوف

انسان کو بڑول بنا دیتا ہے لیکن بڑولانہ رویہ کسی صورتِ حال میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ میں نے جگت سنگھ کو بتایا تھا کہ میں جگت سنگھ (جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی) کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اُس نے ایک ہی بات میں سارے رشتوں کا کھنڈن کر دیا۔

بندھن توڑے ہووے جگت

سوئی جگت پو جن جگت

کاش آدمی جانتا کہ کون سا راستہ کہاں ختم ہوتا ہے اور کون سا کہاں شروع! لیکن آدمی کے برعکس راستے کو اپنے نشیب و فراز کا علم ہے۔ جو راستہ مجھے قریب قریب بھیا نک موت کے منہ میں لے گیا تھا، وہی مجھے جاں فرحیات کے دروازے پر لے آیا۔ میرا تجربہ ہے کہ راستہ، راہ رو کو نفسیاتی طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس کے زیر اثر کوئی کہاں، کیا کر بیٹھے؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

تاہیاجی دولت ہنر اور دولت زار کا مقابلہ کئی طرح سے کرتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے، ”ہنر، تجدیدِ ذات کرتا ہے اور زر، تکتہ بندِ ذات، وہ اسے بڑھاتا ہے اور یہ اسے گھٹاتا ہے۔“

میرے تجربے کی روشنی میں تاہیاجی کی ہر بات غلط تھی! ہنر نے مجھے گھٹایا تھا اور زر نے بڑھایا تھا۔ چند قدم تیز تیز چلنے کے بعد میں نے تروتازہ محسوس کیا، میں بھاگنے لگا اور اپنی گلی کے کونے تک بھاگتا رہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہاں پہنچ کر میں نے گلی کے کتوں کو آواز دی۔ اُن میں سے ایک میری خوشبو پا کر دم ہلاتا ہوا میری جانب لپکا۔ میں نے اسے زور سے دھتکار دیا۔ وہ دم دبا کر ٹک گیا اور ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگا۔ شام، رات کے پہلے مراحل میں تھی اور گلی سُنان۔ کرتار سنگھ، بے انت کور، سومتر سنگھ اور اُس کی بیوی اپنے چینگے لوٹنے کے ساتھ اپنے اپنے گھر میں نہجت تھے۔ میں چور کی طرح چاہتا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ موسم میرے آٹے آیا۔ جگت سنگھ کی بیوی نے پہلے بچے، لڑکے کو جنم دیا، جسے دیکھنے کے لئے وہ گاؤں گیا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے نوٹ گئے، پورے بیس تھے۔ میں نے ہر ایک نوٹ کو بلب کے مقابل دیکھا اور اُس میں عمودی لکیر دیکھ کر خوش ہوا۔ میں نے ایک نوٹ جیب میں رکھا، دُوروں کو سربانے میں چھپایا اور ہوٹل کا راستہ لیا۔ حالانکہ میں وہی تھا جو تھا! لیکن میری چال میں غرور اور اعتماد تھا جو پہلے کبھی نہ تھا۔ وہ یہ وہ طاقت ہے جو اعتمادِ نفس کی رفعت ہے۔

زیرِ درِ سنگھ نے مجھے دیکھا اور اُن دیکھا کر کے اپنے کام میں مصروف رہا جیسے اُسے یقین ہو کہ میں اُدھار کھانے کے لئے پھر منت سماجت کرنے آیا ہوں۔ میرے جی میں آئی کہ میں نوٹ اُس کے منہ پر ماروں، کھڑے کھڑے کھری کھری سُناؤں اور اُس کے سامنے ساتھ والے ہوٹل پر کھانا کھاؤں۔ میں اسے



اگر کئی طرح سے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ چلا چلا کر بتانا چاہتا تھا کہ میں نہایت اعلیٰ خاندان کا فرد ہوں! میری مغرب میری خود ساختہ مُصیبت ہے ورنہ میں اس جیسوں کو نوکر رکھ سکتا ہوں۔ ضرورت پڑے تو خرید سکتا ہوں۔ لیکن میری ریاکار فطرت نے جو حربہ ایجاد کیا وہ اُس کی برطراذالت پر خاموش وار تھا۔ میں نے سو کانوٹ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور ادلے بے نیازی سے اندر جا کر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ہوٹل پر خلاف معمول پھیٹر تھی۔ جیسا کہ ایسے ہوٹلوں میں ہوتا ہے، کوئی روٹی کے لئے چلا رہا تھا، کوئی دال سبزی کے لئے اور کوئی پانی کے لئے۔ ہر کسی کی ضرورت کو نظر انداز کر کے زیندر سنگھ میرے سامنے آکھڑا ہوا، مجھے ہٹا ہٹا سا دیکھتے لگا اور بات کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے کے لئے صاف کئے ہوئے ٹیبل کو دوبارہ صاف کرنے لگا۔ میری بے رخی نے اُسے کوئی مناسب موضوع نہ دیا تو اُس نے خود سے بات کرنے کے انداز میں مجھ سے کہا، ”سنگھ صاحب آج میری پسند کا کھانا کھاؤ۔“

ہنرمند کے سامنے عام آدمی بے ہنر لگتا ہے لیکن اپنی جگہ وہ ہنر سے بھرپور ہے۔ اس حقیقت کا احساس مجھے زیندر کی بات سن کر ہوا۔ وہ مجھے میرے نام سے بلاتا تھا۔ اُس کا لہجہ قدتی طور پر کھردراتھا جو کئی بار سراسر بدمیزی لگتا تھا لیکن اُسے برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ تھا۔ اُس نے سنگھ کے ساتھ صاحب کی اضافت لگائی۔ اس انفاست نے وہ کام کیا جو پارس، پتھر کو چھو کر کرتا ہے۔ میرے نام کی اہمیت مجھے لے اُڑی۔ میں نے اُس غریب، امیر کی طرح محسوس کیا جسے اچانک دھینچل جائے اور وہ اپنی اصل کی آبرو بڑھانے کے لئے کوئی ایسا کام کرنے کا خیال کرے جس کی عظمت میں شہرت اور بقائے دوام ہو۔ اُس نے دال اور سبزی بگھاری، تھالی پونجھ کر بھٹی پر سینکلی، زفیہہ جھاڑی، گلدی میں سے لوٹی توڑی، حسب معمول سے زیادہ احتیاط سے روٹی بنائی اور تنور میں سے سینگ پر چڑھی روٹی تھالی میں پروی۔ اُس کا نوکر روٹی کی تھالی لایا اور پانی کا گلاس لے گیا جسے وہ پہلے رکھ چکا تھا۔ زیندر کی ہدایت پر اُس نے صابن سے گلاس دھویا، اُس میں ڈورے سے پانی بھرا اور اُسے پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیا۔ میں حیران ہوا کہ وہ جس سلیقے اور قرینے کو جانتا تھا اُسے برتنا نہ تھا۔ میں کھانا کھا کر باہر نکلا، وہ اپنے روپے کاٹ کر باقی کے روپے واپس کرنے لگا۔ میں نے شان استغنا سے کہا ”میرے کھانے میں جمع کر لیجئے۔“

اُس کی ناشائستگی کا جواب شائستگی سے دینے کے لئے مجھے جس جذبے نے اکسایا وہ میرا انکسار نہ تھا بلکہ میری سخت اذیت وہ فطرت کا لطیف اختراع تھا۔ اُسے درپردہ ذلیل کرنے کی لذت الگ تھی۔ میری ریاکاری نے انسانی جذبے کا جو حیران کن پہلو دریافت کیا وہ بظاہر موڈب تھا لیکن درپردہ مذلت۔

میں نے اپنا راز چھپایا جیسے لوگ اپنی کمزوریاں چھپاتے ہیں لیکن راز کھل کے رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شفا پانے کے بعد میں نے کام پر جانا بند کر دیا۔ مجھے آواہ پھیلانے ہی تھی کہ بھائی جی نے مجھے دو ہزار روپے بھیجے تھے کہ میں کالج میں داخل ہو جاؤں۔ میرے جانے پہچانے اُن کی تعریف کرتے اور مجھے بدخوش کہتے۔ میری خوشی سے بے انت کور سب سے زیادہ دکھی ہوئی۔ وہ طعنہ زن رہی، ”چاپلے تجھے گھر سے نکالا ہی اس لئے تھا کہ تجھے پڑے پڑے کھانے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ جب تک کالج میں داخل نہ ہو، کام پر جایا کر دو۔“

میں اپنے بے جا رویے کو سراہتا اور لوگوں کی طنزوں کو اُن کی کم ظرفی سے منسوب کرتا۔ اپنی بے وقوفی کو عقل مندی ثابت کرنے کے لئے میں بڑی بڑی باتیں بناتا۔ جب سے ہوش بسنھالا تھا، میں مَن پسند کپڑوں کے لئے کسمپاس رہتا تھا۔ مَن پسند کپڑے میٹھی اور مہکتی ہوئی یادوں کے تھکے ہیں۔ اس وقت میں اُن کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میری رگ جاں میں رَس دوڑنے لگا ہے۔ اُن کے کورے پن کی تازگی کورے تن کی سی ہے۔ پہلا ہی آدمی ملا اور میری نگاہ انتخاب انگریزی لباس پر پڑی۔ میرے رنگ پر سب رنگ کھلتے تھے لیکن میں نے رام سنگھ کے مشورے سے ایک کالا دار سٹنڈ کا سفید دھاری والا سوٹ خریدا اور دوسرا گیارہ ڈین کا پلین میرون۔ اُس یادگار لمحے کا ایک منظر اُسی نزاکت سے آنکھوں میں ہے۔ بڑا زقیض کا کپڑا چٹکی لگا کر پھاڑنے لگا لیکن اُس کا ہنر مجھے چھوٹ پرین نظر آیا۔ میں نے اُسے سختی سے دیکھا ”ایسے نہیں، قینچی سے کاٹو!“

وہ رُک گیا اور تھانوں کے نیچے سے قینچی نکالتے ہوئے بولا، ”اس طرح کیا فرق پڑتا ہے؟“ ”فرق پڑتا ہے! ہمارے ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔“ میں نے نہایت نفیس لہجے میں کہا۔ ”آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں کیا؟“ میری نازک کلامی سے متاثر ہو کر اُس نے پوچھا اور ساتھ ہی اپنے نوکر سے دو کوک لالے کو کہا۔

”جو ہیں، آپ کے سامنے ہیں۔“ میں مسکرایا اور بات گول کر گیا۔

اُن دنوں چوڑے اور اٹنگے پائینچول کا رواج تھا جو مجھے پسند نہ تھا۔ کپور ٹیلر کے اصرار کے باوجود میں نے پیٹنٹ کی مٹری اوسط سائز کی رکھوائی اور اُسی طرح لمبائی۔ اُس کام سے فارغ ہو کر میں نے دوسرے سامان کی فہرست تیار کی جو کچھ اس طرح تھی۔

دو عدد آئڈریٹرز، رُومال، جُراب دو دو کارٹرز

دو عدد ٹاؤلز فل سائز۔

دو عدد بانٹا شوز، ایک بلیک، دوسرا میرون۔  
دو عدد شوخ رنگ بکٹائیز، ایک میں لال اور دوسری میں کالا رنگ نمایاں۔

دو عدد کنگے

دو عدد رینگر

دو عدد لیڈر بلٹ، ایک کالی، دوسری میرون۔

صندل سوپ و دسوپ کیس

لکس سوپ و دسوپ کیس

ایک عدد ایونگ ان پیرس

ایک عدد مینا کا ٹوٹھ برش و مینا کا گرین ٹوٹھ پیسٹ

ایک پیکٹ رنگ برنگے سرور دالے آپسین

ایک عدد پورے عکس کا آئینہ

اس فہرست سے بڑھ کر میں نے دو پکڑیاں چھتہ کی مکمل کی خریدیں اور سوٹوں سے ملتی رنگوٹس گھر میں سرسوں کی تیل کی بوتل تھی، میں نے اسے گلاب کے پھیل کی پٹھ دے دی۔ جگت سنگھ گاؤں سے واپس آیا اور میری حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے جس دن کپڑے سلتے دیئے، میں چاہتا تھا کہ اُسی دن بل جائے لیکن ویسا نہ ہو سکا۔ میری وارننگ ایس نے ٹیلر کو مقررہ ریٹ سے زیادہ ریٹ دینا چاہا، اُس نے اپنے فیصلے کی طرف داری میں کہا، ”آپ ڈبل ریٹ دیجئے لیکن جتنا وقت لگتا ہے، اتنا لگتا ہی ہے۔“

مجنوں مارنے کے لئے میں نے سر میں فلٹ ڈالی اور پھر نہانے کا اہتمام کیا۔ ایک بار صابن سے نہا کر میں گاہے گاہے بدن بگھوٹا رہا اور مساموں میں گہرے جھے میل کو اگاتا رہا۔ میں نے بدن ملا، میل مروڑیوں کی صورت اُترا بالکل ایسے جیسے گہستہ اُٹا گوندھ کر ہتھیلیوں سے اٹا چھٹائے۔ تویسے سے بدلتا بونچھنے سے پہلے میں نے پانی کے موٹے موٹے قطرے ہاتھوں سے نچوڑے۔ ہاتھ، ماس پر ’کر کر کر کر‘ کرتے سنائی پڑے۔ یہ گدگداتی آواز میں نے آگے بھی سنی تھی لیکن الگ طریقے سے۔ میں گاؤں کی آبِ حوض میں ریت سے دانت صاف کرتا، کلیاں کر کے دانتوں پر انگلی پھیرتا، یہی دل کش اولز سننا اور اُس غیر مرنی آئینے میں دانتوں کی چمک دیکھتا۔ میرا خیال لہک اٹھا اور رگوں میں ترنگ سی چھیڑنے لگا۔

میں نہا کر دھوپ میں بیٹھا کیس سُکھا رہا تھا کہ میں نے جلد کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ ماس کی اُوپرچی پرست صابن میں گھل کر بہ گئی ہے۔ اُس رنگت میں کھرچی ہوئی ہنڈیا کی سی سفیدی تھی۔ میں کھڑی پر

بیٹھے بیٹھے تیل مالش کرنے لگا۔ اُس سادہ سے کام کو میں نے جس نفاست سے کیا وہ دیکھتے ہی ہنسی تھی۔  
میں تیل لگا کر ملتا اور کل کل کر اُسے ماس میں جذب کر دیتا۔ میں بدن کے اُس حصے کو دوسرے کے مقابلے  
میں دیکھتے وہ ایسے لگتا جیسے گل پڑ مردہ کے سامنے گل تازہ پڑا ہو۔ میں جوں ہی اُس کام سے فارغ ہوا،  
میری آنکھوں میں سُرد گھٹنے لگا اور میں سو گیا۔ میری نیند کھلی تو کھڑی کا بان چُھنے سے جلد پر جُنت پڑ گئی۔  
میری رُوح آفرانی! میں جُنت کو سہلانے لگا اور دل ہی دل میں اُس کی خوش صورتی سراہنے لگا۔

خیال کوئی بھی ہو، جذبے کی ہم آہنگی اُسے آفرزد کرتی ہے۔ گاؤں کی آب و ہوا کا پانی چڑھ  
کر اُتر جاتا تو گناروں پر بالوں کی دھاریوں کا منظر ایسا ہی نظر آتا جسے میں دیر، دیر تک دیکھتا رہتا اور  
دل ہی دل میں تایاچی کی اس فراست کی تائید کرتا، ”خوبصورت خیال، خوبصورت جذبہ، خوبصورت عمل  
۔۔۔ انسان کو اس کے مشاہدے کا عطیہ ہے۔ خوبصورتی انسان کو بناتی اور سُوارتی ہے، بدصورتی  
انسان کو لگاڑتی اور اُجاڑتی ہے۔“

انسانی زندگی سانس سانس تناقص ہے! ایک صورت حال الگ الگ صورت میں الگ  
الگ معنی رکھتی ہے کہوں کہ میں کا سیدھا رشتہ اُس مخصوص وقت کی نفسیات سے ہوتا ہے جو اُس  
کا جائزہ لیتی ہے۔

میں نے بال دھو کر اُن میں اُسی وقت تیل لگا لیا تھا۔ میں نے انھیں پہلے آنکھوں سے چُڑھایا  
پھر موٹے کنگھے سے اور پھر باریک سے۔ اس کے بعد میں نے کھڑا لنگا (کنگھے کے دندانون کی جڑوں میں  
دھاگا باندھ کر اُن کا فاصلہ کم کرنا) باندھ کر پھیرا، جس نے بالوں پر سے آخری لکھ تک کھردھ لی۔  
میں نے جُڑا باندھا، مجھے لگا کہ سر پر سب گُل رکھا ہوا ہے۔ میں نے ناخن کاٹنے چاہے، مجھے نیل کڑک  
یاد آئی، جسے میں نے اس لئے نہ خریدا تھا کہ اُسے فہرست میں داخل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے پُرا  
فن آزمایا اور سوئمن سے نیل کٹر کا کام لیا۔

سوٹوں کا ٹرائل شکر دار سویرے ہوا تھا جو اتوار شام تک تیار ہو گئے۔ لطف کی بات  
یہ ہے کہ وینس ٹیلرز کا مالک کپور خود سوٹ لایا۔ میں نے سوٹر سنگھ کی مدد سے پگڑی کی پونی کی، پگڑی  
باندھی اور لڑا اتنے نیچے رکھے کہ وہ آنکھوں کے بیرونی گوشوں کو مس کر رہے تھے۔ جُڑا پگڑی کے اوپر  
دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اُسے ڈھیلا کیا، دبایا، پگڑی کا پچھلا لڑا احتیاط سے اوپر کھینچا، جُڑے پر پھیلا  
کر کسا اور موڑ کر ٹانگا۔ پگڑی ہر زاویے سے سُوار کر میں نے اپنی آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کا نیل گول رنگ  
نکھر کر چمک رہا تھا۔ میرا جذبہ خود پکندی! میں نے محسوس کیا کہ وہ رنگ، خوشبو کی طرح میرے وجود

سے پھوٹ نکلے گا اور ارد گرد کے سارے ماحول کو مہکا دے گا۔

خود پسندی عارضی جذبہ ہے لیکن کم ظرف کی زندگی میں دوا می حشیت رکھتا ہے۔ یہ سراب صفت خوب صورتی ہے جو ناظر میں بھائی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اُسے اپنی خرابی میں خوبی دکھاتی ہے میں اپنے خیال سے رس لیتے ہوئے مسکرایا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جگہ گاہٹ لے کر گویا کی چونچ پر آہیں سے 'جی' لکھنے لگا۔ سو مٹر سنگھ نے دیکھا اور میرا ٹھٹھا اڑایا، "دیہاتی کے دیہاتی رہے! انگریزی کا 'جی' اردو میں لکھتے ہو۔"

اپنے پرانے کپڑوں کے ساتھ میں احساس کمتری سے نجات پا چکا تھا۔ میں چہک کر دُور لایا، "انگریز کے بچے! یہ 'جی' اردو ہی کا ہے۔ جی آیاں نوں!"

"پورا لکھو۔ آدھا کیوں لکھا ہے؟ شرم آتی ہے؟"

میری زبان درازی سے وہ سکتے میں آگیا۔ اُس نے جلدی سے ٹھوکا اور خود کو بٹھالا۔ اُس کے ٹھوکے کا انداز اُس کی دماغی کیفیت کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ کسی الجھن میں ہوتا اور کہیں تھوک نہ سکتا تو اپنے آپ پر خفا لگتا۔

"شرم کا ہے کی بڑے میاں! جوابات مُقتد ہو، زیادہ معنی خیز ہوتی ہے۔"

اپنی پُوری بات کہہ کر میں نے اُسے آنکھ ماری۔ اُس سے بات کرتے ہوئے میں آداب و انقباب کا خیال رکھا کرتا تھا، میں نے انھیں ایک لہجہ ترک کر دیا۔

"اوہ!"

میری جرات نے اُس کی الجھن کو حیرت میں بدل دیا۔

"جی جی جی جی، جی آیاں نوں!"

میں آداب بجالایا جیسے میں واقعی کسی پیاری چیز کے قدم لے رہا تھا۔ میرے قارئین حیران ہوں گے کہ وہ خود اعتمادی مجھ میں کیسے آئی؟ وہ بدلہ سنجی اور حاضر جوابی میں نے کس سے سیکھی؟ مجھے بھی نہیں معلوم لیکن میں اتنا اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جب مجھے اُس کی ضرورت پڑی میں نے اُسے پیش پیش پایا، بالکل ایسے جیسے بند پانی بہنا بھی جانتا ہے۔

میری نفاست پسندی! میں نے چار پائی پر کھڑے ہو کر پتلون پہنی اور اُس میں قمیض (اس سلیقے سے گھسائی کہ پنٹ کے اوپر قمیض میں ہلکی سی تہ دکھائی دی۔ بمٹائی کو دوہری گانٹھ لگائی اور اُس کی لمبائی حدِ حسن تک رکھی۔ یہ میری پہلی جسارت تھی اور کامیاب جسارت تھی۔ سو مٹر سنگھ اپنی ٹائی کو اکہری گانٹھ

دینا تھا جو مجھے ناپسند تھی کیوں کہ وہ کسی مفلوج کی طرح ایک طرف کو ٹھکی رہتی تھی۔ اُس کے قمیض پہننے کا انداز بھی مجھے بے لطف لگتا تھا۔ پہلے وہ گلا پہنتا پھر آستینوں کو بازوؤں پر چڑھاتا اور یوں اپنے پھوٹ پرن کا مرقع لگتا۔ میں نے پہلے آستینیں پہنیں، اُس کے بعد گلا اور ساتھ ہی جس نزاکت سے قمیض کو بدن پر سرکایا اُسے کشیر انیریکا (محبت کرتے کرتے ایسے لپٹنا کہ دو جسموں کا فرق مٹ جائے) سے مشابہت ہے گھر میں کرسی نہ تھی۔ میں نے کھڑی برتولیہ پچھایا اور اُس پر بیٹھ کر مونہ چڑھائے، کارٹریز پہننے اور ڈبلے میں سے بوٹ نکالے۔ میرے اطراف نئے کپڑوں کی خوشبو گھوم رہی تھی، اُس میں نئے چمڑے کی بو سما گئی اور ایک انوکھے جذبے کو جگا گئی۔ میں بوٹ پہننے لگا تو مجھے شوہارن کی ضرورت پڑی۔ میں نے اُسے بھی نئی فہرست میں شامل کیا اور وقتی طور پر اٹھکی سے کام چلایا۔ تیسے پھندنے کی طرح باندھ کر میں نے بوٹ، کپڑے سے صاف کئے، ہاتھ جھاڑ کر کوٹ پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہوا، میں خود کو پہچان نہ سکا۔ میری لمبیں اتنی چھوٹی تھیں کہ ہونٹ صاف دکھائی دیتے تھے، اس کے باوجود میں نے چور اور بے محل بال موچنے سے اکھاڑ پھینکے اور باقی ڈھانا باندھ کر چپکائے۔ میں نے مسکرا مسکرا کر اس زوایے سے منہ دیکھا اور کبھی اُس زوایے سے، ہاتھ پھیر پھیر کر رخسار سنوارے اور رگڑ رگڑ کر اُن میں رنگ بھرا۔ میرے رخسار، مہاسوں سے پاک تھے اور جلد بے عیب۔ علالت سے اُس میں پیلا پن آ گیا تھا، جس میں دل پر زبردستی تھی۔ اُسے پیار کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میری گم شدہ روح نئی لب و تاب سے لوٹ آئی اور مجھے آئینہ چومنے پر اکسانے لگی۔ میں نے شرماتے اور لچکتے ہوئے اُسے چوم ہی لیا۔ اُس کے بوسے میں بے دل ہونٹوں کی سی گرمی تھی لیکن میری ادا نے مجھے مہکا دیا۔ میں دیکھنے لگا کہ اعضا وہی ہیں لیکن نمود الگ ہے۔ جلد میں نئی جاذبیت ہے جس میں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ رگیں نمود ہیں اور اُسی طرح اُن میں خون کی موجیں۔ میری روح، جسم کو پہلی نظر کے گداز سے دیکھنے لگی، مجھے اکسانے لگی کہ میں اُسے بار بار دیکھوں، بار بار چھوؤں اور اُسے گہرائی تک محسوس کروں۔ میری بڑھتی ہوئی خود پسندی، خود انہماکی اور خود نمائی بتی جا رہی تھی۔ میں ادھر ادھر گھوم کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور خود کو دیکھتا جیسے کوئی تخلیق کار اپنی بے نظیر تخلیق کے سامنے حیرت زدہ کھڑا ہو۔

مجھے دو لہائی مانند نگہ رکھنے سے دُرست دیکھ کر ہر کوئی مسکراتا اور آنکھوں سے جھپٹتا۔ آنکھوں کے کتنے کردار ہیں! اس بار اُن کا کردار فن شناس کی طرح تھا۔ وہ بیٹھریں چھپے صنم کو احترام سے دیکھتا ہے اور اُسے قابلِ افشا سمجھتا ہے۔

میرے دل نے مجھ سے کہا، ”تم اچھل خاں روڈ پر جاؤ اور وہاں اُلوکی میکان کھاؤ۔“

ٹیکوں کی ریڑھی پر سُندریوں کا بھر مٹ ہوتا تھا۔ وہ جس نفاست و نزاکت سے ٹہکیاں کھائیں وہ منظر، منظر در منظر در منظر۔۔۔ ہوتا۔ اُسے لفظوں میں بیان کرنا، مسح کرنا ہتھ لیکن میرا قلم اُسے نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ اد میں جسارت کر رہا ہوں۔

وہ دوشیزائیں بیٹوں کو ہاتھوں میں تیرتا ہوا اٹھاتیں، چچوں کو انگوٹھے اور اُس کے ساتھ کی دو انگلیوں کی مدد سے پکڑتیں، باقی انگلیوں سے ایسا نقشہ بناتیں کہ ہاتھوں میں چمچے کوئی دوسری ہی نفیس چیز لگتے۔ وہ ہاتھوں کی ہر حرکت کے ساتھ چچوں کے زاویے بدلتیں، ٹہکیاں قسطوں میں ٹہکتیں اپنی مصروفیت میں تاکتیں، جھانکتیں، اٹھکیلیاں کرتیں، چچوں کو نیم قوسی شکل میں ہلا کر کاٹے ہوئے ٹکڑے اٹھاتیں، مُنہ کھول کر چچوں کو زبان پر لیتیں، دانتوں سے مُنہ میں لقمے سرکاتیں اور جس اولے ناز سے اُنھیں کھاتیں حُسنِ دلبری سے زیادہ خواہش گدازی تھا۔ اُن کے حُسنِ عمل کا حُسنِ انتظام ایسا تھا کہ وہاں ہر عمر بہ بندہ خود آرائی سے سرشار تھا۔ جس کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوتی، وہ آہ، آہ، آہی، آہی کرتی ہوئی ہونے کو تو شرمندہ ہوتی، درحقیقت وہ اپنی کیفیت کی آن بان بڑھاتی۔ اُن کی ادائیں اُن کی مشا تھیں جو اُن کے روپ کو بہت نئے طور سے سنوارتی تھیں۔ اُن کی لپ رنک ویسے ہی سخی دھجی اد چمکتی دکتی ہوتی لیکن اُن کی خود آگاہی! وہ ہونٹوں کو ایک دوسرے پر جاکر ایسے دلربا انداز سے ہلاتیں کہ اپنا بوسہ آپ لیتی لگتیں۔ اُن کے ہونٹ، ناخنوں کے رقیب تھے اور ناخن، گالوں کے۔ اُن تینوں کی دلبری کے لئے وہ چوبیسوں کی کٹوریوں میں سے ہلکے پھلکے خوش نما رومال ایک خاص جھٹکے سے نکالتیں جس سے بستانوں میں لرزش پیدا ہوتی جو میرے اندر طوفان اٹھا جاتی۔ وہ دراسی بے حجابی مکمل عریانی کی سی ہوتی جسے دیکھ کر میں آپے سے نکل پڑتا۔ میں جیسے پسند کرتا اُسے خواب گاہ خیال میں اٹھا لاتا اور وقت ملتے ہی اُسے اپنے وجود میں تحلیل کر لیتا۔

میں اپنی غریبی میں اُن سُندریوں کو دُور سے دیکھتا تھا لیکن اُن کے پاس جانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ اب میں اُن سے آنکھیں لڑاتا چاہتا تھا میں نے سوہنہ سرسنگھ کو اچھل روڈ چلنے کے لئے مدعو کیا لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ میں نے رام سنگھ کو بلایا، وہ اپنے گاؤں کی لڑکی چرنجیت کور کے پاس گیا ہوا تھا اور رات کو دیر سے لوٹنے والا تھا۔ میں نے اکیلے ہی جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں احاطے کے دروازے تک گیا اور باہر جھانک کر اندر لوٹ آیا۔ میری شرمیلی طبیعت میرے عتابِ صریح کی کمزوری تھی۔ میں نے جیسے تیسے اُس احساس پر قابو پایا اور گھر سے باہر نکلا۔ میرے جانے پہچانے مجھے پھر سے جاننے پہچاننے لگے۔ ہر کسی نے اپنے طریقے سے مجھے دیکھا۔

”انگریزی میں بات کرنی پڑے تو مجھے بلالینا سو ستر سنگھ طنز آمیز دل لگی سے بولا۔  
”چار پیسے کیا آگئے ہیں، اوقات بھول گیا ہے!“ بے انت کوہ کی زبان، کھال گند کی طرح

بھبکی۔

”فارس کے کتے فارسی بولتے ہیں، لیکن ہندوستانی کتے انگریزی!“

لاہور سنگھ نے اپنی گندی رائے اُسی دن دے دی تھی جس دن اُسے اطلاع ملی تھی کہ میں

انگریزی طرز کے کپڑے سلوار ہٹوں کسی نے نصیحت کی تو جگت نہ گھنے۔

”روپے آگے ہیں تو انہیں سنبھال کر رکھ! روپیہ کمانا مشکل ہے اور اُڑانا آسان!“

لیکن میرے شعور خام نے میری ساری مہیتوں کا ماتخذ، لباس بتلایا اور اُس کا فوری اور کلاگر

علاج بھی لباس۔ جیسے گندے نالے کی پہچان اُس کی بدبو ہوتی ہے اُسی طرح میرے لئے میرا لباس تھا۔

مجھے دُور ہی سے دیکھ کر لوگ میری اصلیت کا اندازہ لگا لیتے اور مجھ سے ویسا ہی سُٹوک کرتے۔ ایک دن

میں راجندر نگر سے گزر رہا تھا۔ کسی آدمی نے خود کو مجھ سے امرجیت سنگھ کے نام سے متعارف کروایا اور میرے

ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ سوٹ بٹو بٹو پہنے ہوئے تھا اور کسی کھاتے پینے کھرکا لگتا تھا۔ اُس نے مجھے ایک جگہ

روک لیا اور مجھے روشن مستقبل کے خواب دکھانے لگا۔ ممکن ہے کہ نوڈل کا ایسا مستقبل ہو لیکن میں نے

اِسے جان بوجھ کر ٹھکرایا ہے۔ قرآن مجیم نے اُمردوں اور اُمرد بازوں کو ملعون و مَطُون ہی ٹھہرایا ہے۔

سوٹ پہننے سے پہلے میں نے سائیکل دھونی تھی اور پھر نیل کا ہاتھ لگا کر سوکھے کپڑے سے

پونجھی تھی۔ وہ ٹی کی طرح چمک رہی تھی۔ میں اُس پر سوار ہوا جیسے عقاب پر مارتا مارتا، بیٹھتا بیٹھتا شاخ

پر بیٹھتا ہے۔ میں ٹولوں کے پنجوں سے بیڈل دبا رہا تھا کہ گھٹنے اُونچے رہیں اور نقل و حرکت میں حسین لگیں۔

اُسٹھ دس بیڈل آگے مار کر میں دوچار بیڈل پیچھے گھماتا اور گھنٹی بالکل نہ بجاتا، راہ روک کے عین پیروں کے

پاس بریک لگاتا، پہیوں کی اچانک رگڑ سے اُسے چونکاتا اور اِس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، اُس کے پہلو

سے تیزی سے نکل جاتا۔ میں ریگڑ پھ پورہ سے دیونگر اور دُہتک روڈ کے راستے اُجل خاں روڈ پہنچا۔ ہر

کوئی اپنے آپ میں مست تھا۔ کسی نے مجھے قابلِ قدر نظر سے نہ دیکھا۔ مجھ میں وہ جذبہ نہ ابھرا جس سے

برتری کا احساس ہو۔ بچیوں کے ٹھیلے پر دو شیرازوں کی چہل پہل تھی۔ اُن کی قربت کا لطف اٹھانے کے لئے

میں نے ٹیمیاں کھائیں۔ میری بے کسی! کسی نے مجھ میں وہ دل چسپی نہ دکھائی جس کی مجھے اُمید تھی۔ میری بُری

اور سرخوشی یک طرفہ تھی۔ کسی کو میرے پُرانے اور نئے لباس میں تمیز نہ تھی۔ میرے جذبات میرے عمل

سے پیش پیش تھے اور یہی وہ صورتِ حال ہے جہاں انتشار کا دور دورہ ہے۔ وقت گزرنے لگا۔ ادھر میں



نملنے کی ناقدری سے اداس رہنے لگا۔ میں نے تصور میں جتنے سبز باغ دیکھے تھے وہ حقیقت میں  
ویرانے تھے۔ میں پہلے سے بدتر تھا لیکن مجھے تسلیم کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

تباہی کہتے تھے، ”اومی جو اندر ہے وہی باہر ہے۔“

مجھ سے باہر میری بے یارگی تھی۔ اور بے یارگی بھیا نک بے قراری ہے، افراتفری ہے جو  
اومی کی اصل پر چوٹ کرتی ہے اور اُسے تپس نہیں کر دیتی ہے۔

میری اُس حالت میں بھی مجھے امر جیت سنگھ جیسے ملے لیکن اُن کی پہنچ اُس سے الگ تھی۔  
اُن کا مدعا تھا کہ وہ مجھے استعمال بھی کریں اور مجھ سے فائدہ بھی اٹھائیں۔ جو کوئی خود کو نہ بچا سکے گا، زمانہ  
اُسے کھا جائے گا! یہ قانون حیات ہر شعبہ حیات پر لاگو ہوتا ہے۔ میں جانتا تھا لیکن میں نے بھلا دیا تھا۔  
میں خام کار تھا اور خام کار رہا۔ میرے شناساؤں پر میری امارت کا اثر میری امید کے برعکس تھا۔ پہلے  
وہ حریف، ہمدرد تھے اور اب حریف، حاسد۔

تجربہ کی بات یہ ہے کہ میرے خوبصورت لباس کا اثر مجھ پر اُلٹا ہوا تھا۔ نرم و نازک جذبہ  
جو بصورت دیگر میرا اڑھنا چھونا رہتے تھے یکسر غائب ہو گئے اور علم و ہنر بڑھانے کے خیالات غارت  
ذاتی خوبیوں کو بڑھانے کی آگ میرے اندر متواتر جلتی رہتی تھی، وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ خواہش اپنے سے  
الگ کسی دوسری چیز میں اپنی تکمیل دیکھتی ہے اس لئے اپنی مصیبت بنی رہتی ہے۔ مجھ پر حرص و ہوس  
مسلط ہو گئی۔ بد اخلاقی زود اثر زہر کی طرح میرے کردار میں نفوذ کر گئی اور اُسے مغلوب کر گئی۔ میں اس سوچ میں  
مست رہنے لگا، ”میرے پاس کار ہو، کناٹ پلےس میں بنگلہ ہو اور دل بہلانے کے لئے خوب روکٹواریا  
مجھے دولت ملے۔“ چوں کہ محنت، دولت کا سرچشمہ نہ تھا، میں مجرمانہ طریقوں سے دولت بٹورنے کا خیال  
کرنے لگا۔ محنت کے برعکس دولت، حیات کا ایسا حاصل تھا جو ہر چیز کا نعم البدل تھا۔ یہ جادو کرنی تھی  
جو ہر مندرجیز کا روپ دھارن کر سکتی تھی۔ میری بے حسی! مجھے ساحر کا کلام بے معنی لگنے لگا اور اپنے  
کپڑے پرانے جو ایک شوب نہ پڑے تھے۔ مجھے لگتا کہ دوسرے مجھ سے بہتر کپڑے پہنتے ہیں بلکہ اُن پر  
کپڑے زیادہ چھپتے ہیں۔ جب سہل پسندی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے تو زندگی ایک ڈھرے پر چلتی ہے  
اور ایسی جہالتوں کا دم بھرتی ہے جو اپنی نفی آپ بھتی ہیں۔

جب میں کام کرتا، پوری نیند سوتا، سویرے بیدار ہوتا تو جسم مزے دار بے کیفی سے چھلکتا  
جو انکڑائی لیتے ہی تروتازگی میں بدل جاتی۔ سخت کامی میری رگوں کو وہ توانائی فراہم کرتی جو خود کار و خود  
پردور تھی اور میری مستعدی کا دست راست۔ میرے معمول معمول نے میری حوصل کی جمعیت بندی کو ڈھکے

چھپے بھیرا لیکن اُس کی شدت سرگرم مخالفت سے زیادہ تھی۔ دن سے رات لمبی اور مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ تھی لیکن میری نیند پوری نہ ہوتی۔ نیند سے تکان اُترنے کے لئے بجائے تکان بڑھتی جیسے وہ طاقت کا تحلیل خانہ ہو۔ میں تندرست بیمار تھا۔ میں جتنا وقت کام پر جانے کے میں لگا تا تھا اُس سے زیادہ بننے سنورنے میں گزارتا اور پھر گھر سے باہر نکلتا۔ ایک دن میں گھومتا ہوا ٹالکٹورا کارڈن میں جا نکلا اور مایا کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ مجھے پہچان نہ سکی اور دیکھ کر انجان ہو گئی۔ مایا ادھ لالی نے مجھے میری آواز کے آئینے میں دیکھا اور پہچانا۔ لالی مجھ پر لپکی اور اپنی اُمنگ اور ترنگ میں سمت کھو بیٹھی اور پانی کی کیاری میں اتر گئی۔ اُس سے اُس کا خروش ٹھنڈا نہ پڑا۔ وہ بدن جھٹک کر میری جانب دوڑی۔ میں نے سائیکل آگے رکھ کر اُسے روکا اور مایا نے اُسے جھڑک کر بھگایا تو مجھے اطمینان ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ دُور ہو کر بیٹھ گئی لیکن بے چین رہی۔ مایا نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر سر سے پاؤں تک دیکھا اور مہک کر کہا، ”ایک دم لاٹ صاحب لگتے تھے۔“

اُس کا جذبہ میرے جذبے کی تجدید کر گیا۔ میں چاہنے لگا تھا کہ دوسرے میری آرزو کو پہلے ہی سے جان لیں اور اُسے نہایت سلیقہ مندی سے پوری کریں۔ چوں کہ لوگ ایسا نہ کرتے تھے میرے جذبے سے وہ لطافت غائب رہتی جو ستائش کر کی شنا کوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ میرے جذبہ نام و نمونے میری تمیز خود پسندی اس قدر بٹھا رکھی تھی کہ مجھے چھو لوں کا حسن پھیکا لگا۔ مایا نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں جس سبزے کے لمس کو ترسا کرتا تھا، اُس پر ٹاول بچھا کر بیٹھا۔ میں ادھر ادھر ہاتھ بٹھاتا ہوا سبزے کو چھو لیتا تو ہاتھ جھٹ کر صاف کرتا جیسے کسی گندی چیز کو چھو لیا ہو۔ لالی ٹپکتی اور کوں کوں کرتی وہیں بیٹھی رہی اور مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اُسے پیار نہ کیا۔ مایا سے بھی میرا رویہ بے تکلف نہ تھا میں کیسا بدل گیا تھا۔ رُوح افزا ٹھنڈک، راحت آمیز نرم دھوپ، سوسن نوخیز سا آسمان، صحن گلستا سی دھرتی، بلبل کے نغمے کی نشا طر سردی، جا دو جگاتی ٹھہری سُھری فضا، نفس پرستی کے جذبے کی طرح کیف پرور ہوا جس کی عشرت سامانی پاک باز کُنواروں اور کُنواریوں کو در غلاتی ہے اور اُنھیں ہر پسند بناتی ہے۔ سب کچھ بہارِ سماں تھا لیکن کسی شے وہ دلِ ربانی نہ تھی جو پہلے خاص کر ہوتی تھی۔ اُسی جگہ بیٹھ کر میں ساجر کا کلام پڑھتا اور گاتا تھا اور ہر لفظ زندگی سے ٹھہرتا ہوا پاتا تھا۔ عہدِ رفتہ کی تجدید کے لئے میں نے ساجر کے اشعار گنگناتے شروع کئے لیکن بند کر دیئے۔ وہ اُس درد و کرب سے خالی تھے جو میرے دل کو پگھلا کر اشکِ رواں بنا دیتے تھے۔ مایا خود مجھے بد شکل دکھائی دے رہی تھی۔ میں اُکتا کر وہاں سے جلنے لگا۔ مایا نے ادھ کھلے گلاب کی کلی توڑی اور میرے کوٹ کے پھول کاج میں لگا دیا

اُس کا یہ ناز مجھے پسند آیا اور میں نے خوشی سے اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ میری خود پرستی کی رعوت! دوسروں کے تعلق سے میرے سارے جذبے ایک ہی جذبے میں ڈھل گئے۔ جو کوئی مجھے دیکھے، میری عزت کرے اور مجھے سر رہے۔

میں وہاں سے تین مونی پہنچا۔ کاریگر کام بند کر چکے تھے، امر سنگھ اور پیار سنگھ پروگرس نوٹ کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں سائیکل کھڑی کر کے آگے بڑھتا اور کوئی بات کرتا، امر سنگھ نے ناک ٹٹک کر کہا، ”اینٹ رسیدھی نہیں لگا سکتا اور سوٹ پہن کر دکھانے آیا ہے!“ مجھے دھچکا لگا اور میں ایسے رکا جیسے کسی غیر مرنی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔

”انگلیمنڈ میں بھنگی بھی سوٹ پہنتے ہیں!“

امر سنگھ کی طنز و تحقیر کی کسک دینی نہ تھی کہ پرہیزگار نے مہنا مارا۔ مہنا، بھالے کی طرح ہے جسے دل پھٹ کر ہی برداشت کرتا ہے۔

اُن کے نرم گرم رویے کے برعکس میں اُن کی عزت کرتا تھا اس لئے میرے دل میں کچھ جھجک اور کچھ حیا تھی، وہ اڑگٹی اور میری رگوں میں آتش سیال دوڑ گئی۔ میں نے کسی طرح اپنے آپ پر قابو پایا۔ لیکن اُن کے غیر ضروری محاسمانہ رویے پر حیرت زدہ کھڑا رہا۔ مجھے معلوم ہونے لگا کہ کوئی نادیدہ ہاتھ میرے کپڑے پھاڑ کر مجھے نکا کر رہا ہے۔

”اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لئے انگلیمنڈ جاوے اور ارادہ ہے کیا؟“ بچتر سنگھ نے مسکاکر زہر اُگلا۔

میں نے اُسے اُس بے کلی سے دیکھا جو ہتھیار بند کے سامنے ہتھ کی بے کسی ہوتی ہے۔

”باپ کے چوتھروں میں بُرا داگھسا ہوا ہے اور بیٹا انجمنیر بننے کا خواب دیکھتا ہے۔“ پرہیز سنگھ نے میری اصل پر چوٹ کی اور مجھ پر حقارت بھری نظر ڈالی۔

انسان کے بننے اور بگڑنے کا سلسلہ اس کے جنم سے شروع ہوتا ہے اور مرن تک جاری رہتا ہے۔ اوصوہ و اپن انسان کی سرشت کا جزو ناگزیر ہے۔ اخوس ناک بات یہ ہے کہ ہر فرد اسے اپنے حق میں مبارک اور دوسرے کے حق میں نامبارک خیال کرتا ہے۔ میری ناکامیاں، کمزوریاں اور بدنامیاں زندہ چیزوں کی طرح میرے ساتھ لگی پھرتی ہیں اور مجھ سے اس قدر نمایاں رہتی ہیں کہ میں جہاں ہوتا میری جگہ لوگوں کو وہی نظر آتی ہیں۔

میں پوری اونچی آواز سے چلا یا، ”میرے ہی باپ کے کیوں؟ تم سب کے باپوں کے چوتھروں میں

براد اگھسا ہوا ہے۔ تمہارے اپنے گھسا ہوا ہے! تم اس لئے جل مرے ہو کہ میرے چوتھوں میں سے وہ فاسد مال کیوں نکل گیا؟ اپنے جلال میں مجھے لگا کہ میری آواز دُور آسمان تک پہنچی ہے اور اُس سے ٹکرا کر ساری دھرتی پر پھیل گئی ہے اور میری پوری ذات برادری نے سن لی ہے۔ وہ اپنی تندی میں اُن کے جسم میں تھوک گئی ہے اور اُنہیں جَم جَم تک ذلیل کر گئی ہے۔ خود کو اُن سے الگ پا کر میں نے سر بلند محسوس کیا۔

اُس گھٹک رکت ہوا آگے بڑھا میرے قریب آیا اور کاندھے پر ہاتھ رکھنے لگا۔ میں نے اُسے جھٹک دیا، اپنا ہاتھ رُو مال سے صاف کیا جیسے گندی چیز کو چھو لیا ہو۔ اُس نے مجھ سے کُچھ کہا لیکن میں نے کُچھ نہ سنا۔ میری قوتِ حقارت، قوتِ سماعت پر غالب آگئی۔ اور جب ایک حس اپنے عروج پر ہو، یہ دُور ساری حیوں کو مفلوج کر دیتی ہے۔ علاوہ بریں نفسیات کا یہ پہلو بڑا خطرناک ہے کہ یہ صرف اپنے مطلب کا لحاظ کرتی ہے۔ جب مخاطب کا ارادہ صاف ہو تو اُس کا اپنے حریف سے کُچھ کہنا نہ کہنا برابر ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اُس کے الفاظ بظاہر کُچھ اور ہیں لیکن اندرونی طور پر کُچھ اور۔ میری ایجابی کیفیت نے میری مجروح ذات کو اُکسایا، ”تم اپنے ذلت آمیز ماضی کو دٹا دو، جس نے تمہاری ہر خوشی غارت کر رکھی ہے اُن سارے افراد کو قتل کر دو جو تمہاری کمزوریوں اور بدنامیوں سے واقف ہیں۔ تم کسی ایسے فرقے کا نام لینا جو جس کی اصل آفاقی اور تاریخی ہو اور یوں نئی زندگی کا آغاز کرو جس کے سب سانس گریں۔“

## باب ۶۷

کم زوری اخلاق جہاں پلتی ہے  
ہلکی سی بھی تنقید وہاں کھلتی ہے

ہر سانس میں ہوتا ہے تناؤ ایسا  
لگتا ہے کہ آری سی کوئی چلتی ہے (شاہ)

میری رُو حافی تکلیف اپنی ہی نوعیت کی پریشانی تھی اور اُسی طرح اس سے پیدا شدہ فزنی

اذیت۔ بھگت سنگھ کی وجہ سے میرے نوئندہ اور بارہ سدا ہوئے لیکن میں اُس سے ملنے سے کترانے لگا۔ مجھ پر وہی جذبہ مسلط تھا، جو احسان فراموش مقروض کے دل میں اپنے محسن کے بارے میں ہوتا ہے۔

جوانی کی صحت چاند کی طرح ہے، جسے گھٹے دیر لگتی ہے اور نہ بڑھتے۔ میرے رُخسار فکے، ہونٹ دہکے اور سانس ممکنے لگے۔ میری اداؤں میں بے باکی اور باتوں میں شوخی آگئی۔ میں کبھی رام سنگھ کے ساتھ سیر کرنے جاتا اور کبھی سوتر سنگھ کے۔ میں جس کے ساتھ ہوتا اُس پر پیسے خرچ کرتا۔ اپنی دیا دلی کی دھاک جمانے کے لئے میں کہیں بڑا نوٹ تڑاتا، جڑاتا اور ریزنگاری کئے بغیر ہی جیب میں رکھتا۔ میرے اچھے حالات نے مجھے نئے طریقے سے خراب کر دیا اور نہ میں کار آمد دوستوں اور فضول جذبوں میں فرق کرتا، اپنے بے کار ذہن کے اُدبازانہ دلوے کو سمجھتا۔ ایسے جذبے اور دلوے ریاکار دوستوں سے زیادہ زیاں کار ہیں کیوں کہ اُن کے طریقہ عمل پر شک کرنا اپنی دیانت داری کو جانچتا ہے اور ایسی جرات بالغ نظر ہی کر سکتا ہے۔ دکھاوے کی زندگی جینے کے لئے میرے پاس ایسی چیزیں جمع ہونے لگیں جن کی مجھے ضرورت نہ تھی۔ میں فراغِ خاطر کے لئے سچ دھج کر بازاروں میں گھومتا، نظر بازی کرتا، پارکوں میں بیٹھتا، ہونٹوں میں کھانا کھاتا لیکن میرا دل نہ بہلتا۔ رگ وریشہ کی ساری گرمی میری رگ جال میں اکٹھی رہتی، وہ وہاں ایسے جلتی جیسے موم بٹی میں فٹید۔ میری طبیعت میں ایک اضطراب تھا جو کسی صورت کم نہ ہوتا۔ اس کا کیا سبب تھا؟ میں جذبات رفتہ کا سراغ لگاتا ہوں۔ میں خود آگاہی سے نکل چلا تھا اور اپنے آپ کو ہر کسی سے ممتاز سمجھتا تھا اور صرف اپنے جیسوں سے ملنا چاہتا تھا اور میرے جیسے کم یاب تھے۔ کوئی کردار میرے مطلعِ نظر پر پورا اُترتا تو وہ فلمی ہیرو کا تھا۔ میں خود کو ہیرو سمجھتا اور ہر لڑکی کو ہیروئن۔ ضبطِ نفس اور مشاہدہ نفس جو ترقی نفس کے سرچشمے ہیں، میرے وجود میں ایسے سوکھ گئے جیسے موم گہا میں برساتی نالے۔ میرے سامنے کردار مر گئے، ایک بو الہوس زندہ رہا۔ اور بو الہوس کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ اصول کی جگہ بے اصولی بھاتا ہے اور انجانے میں احساس کی پاکیزگی سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ اپنے کھوکھے پن میں وہ بیجانی جذبے کا بیجھا کرتا ہے، اُسے ہر دوسرا جذبہ پہلے سے زیادہ بھرپور اور سچا لگتا ہے جو اُسے اُس پر اسرار مسرت کا یقین دلاتا ہے، جو اُس کے پہلے جذبے سے غائب ہوتی ہے۔

میں اجل خاں روڈ پر کھڑا نظر بازی کر رہا تھا، سامنے سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ میں ہوس مت نے اُسے آنکھ ماری، وہ جواباً مسکرا پڑی۔ وہ پاس سے گزری، میں نے اُس کے کولہے

پر چٹکی بھری، وہ پھر کئی اور شور مچانے لگی۔ میری قسمت ابھی نھی! جب تک کسی نے اُس کا مطلب سمجھا میں شاطر تو نچ نکلتے میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے یاد ہے کہ پشپا کو دیکھ کر میرا دل دھک دھک دھڑکتا تھا۔ میں اُس سے آنکھ ملاتے ہوئے شرماتا تھا، اُس سے کوئی بات کرتا تو میرا دل ٹھہر سا جاتا۔ میرا رویہ معصوم بچے کا سا تھا۔ وہ ماں کی گود میں رہ کر کسی کو دُور سے دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے لیکن اُس کے پاس جانے سے بچکا تا ہے۔ کچھ ایسی ہی نفسیات شریف آدمی کی ہوتی ہے! وہ پہلا جرم کرتا ہوا ڈرتا ہے اور کسی حد تک اپنی جہارت سے نفرت بھی کرتا ہے لیکن جب جرم، بٹھاؤ کے مرتبے کو پہنچ جائے تو وہ بے شرم اور بے رحم ہو جاتا ہے اور جرم کے تحفظ کو اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ ہر عیب میں خود تخریب کے عناصر چھپے ہیں لیکن عیب پرست کو نظر نہیں آتے ہیں۔

کردار اپنا صلہ آپ ہے اس لئے انسان کا وقار ہے اور اسے کہیں بھی سرفراز رکھتا ہے۔ بد اخلاقی، گندگی ہے۔ . . کہ سرفرشتے کو اُودھ کرتی ہے اور آخر کار اُسے اب مُردہ میں بدل دیتی ہے۔ جیسے اب مُردہ میں کوئی سن رندی نہیں چھوٹی پھلتی، اُسی طرح بد کردار میں انسانی خوبی۔ اور جو آدمی اپنی اخلاقی اور سماجی ذمہ داری کو نفس پرستی، مے آئینی اور مفرد تنہائی نذر کرتا ہے وہ اپنے چلن سے اپنے جنگلی اسلاف سے جا ملتا ہے کیوں کہ اخلاقی اور سماجی قدوں کی پیروی کے لئے ہی وہ اُن سے جدا ہوا اور شہری بنا تھا۔

میرے نرم و نازک جذبات میری سربر آوردہ خواہش کی آگ میں جل چکے تھے۔ میں حیران ہوں کہ میں چکلوں کی جانب کیوں متوجہ نہ ہوا؟ میری نفسیاتی ضرورت میری خود فریبی ہی کی مرہون منت رہی۔ بے کاری اور بے مقصدی کی مستی چند دن ہی بھلی لگتی ہے۔ حالات کا محمود رنگ دکھانے لگا اور میں کوئی نیا کام کرنے کے امکان پر غور کرنے لگا جس میں محنت کم اور حاصل زیادہ ہو۔ میرا ہر منصوبہ، خیال کی حیات پیدا ہوتا اور سرگوشی کی موت مر جاتا۔ میری مالی حالت بگڑنے لگی اور میں اُسے بحال کرنے کے لئے شرم ناک اور مخرب اخلاق طریقوں پر غور کرنے لگا۔ میری تجربہ باز چلتیں سر اٹھانے لگیں۔ میں ایسی تدبیریں سوچنے لگا، جنہیں کامیاب بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے، غیر قانونی زندگی کی رواداری۔ میں جو کرنا چاہتا تھا، علاناً ممکن تھا اور جو کرتا تھا اُس سے بے زار۔ میری بے سمتی اور کم ہمتی نے میری آسودگی کو گھناؤنی زندگی میں تبدیل کر دیا۔ جیسے شب پروردہ اُجالے میں دیکھ نہیں دیکھ سکتے، اُسی طرح تنگ نظر وسعت حیات میں۔

## باب ۶۸

چہرے کی ہر لکیر ہے تاریخ کی صدا  
دل کا ہر ایک زخم ہے اُمید کی کرن (شاطر)

میرا سرمایہ ختم ہونے لگا اور یہ جانتے ہوئے کہ آنے والا حادثہ ٹل نہیں سکتا، میں اُسے ٹالنے لگا۔ کب تک ٹالتا ہوں؟ میں نے اُوزار کی جانب دھیان دیا اور انھیں زنگ اُٹو دیا۔ میں نے انھیں مٹی سے رگڑا، پانی سے دھویا، پونچھا، مسکھایا اور تلاشِ معاش میں نکل پڑا۔ لیکن اس بار میں اکیلا نہ تھا۔ سو مٹر سنگھ کا چاچا آخر سنگھ میرا ساتھی تھا، جو دو تین دن پہلے دلی آیا تھا۔ اُس کی اور میری جوڑی ہوئی اور کام ملنے میں آسانی۔

زندگی اُسی ڈھرے پر اُگتی جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ وہی کندے کپڑے، وہی گھناؤنے فقرے، وہی دل کے ڈکھڑے، وہی جذبے اُکھڑے اُکھڑے۔ کم ہمت راستے کی گھاس طرح ہوتا ہے جو سر اٹھاتے ہی کچلا جاتا ہے۔

تین مورتی کا کام جاری تھا کہ ہزاری لال کو پنڈارا روڈ پر نیا کام مل گیا۔ اُس نے چھوٹی کار بیچ کر بڑی کار خرید لی اور شو فر کو وردی بنوادی۔ پہلے وہ کام پر دقت بے وقت آتا تھا اس لئے اُس کے خیر مقدم کے لئے کوئی موجود نہ ہوتا تھا۔ اب وہ کام پر باوقت، بے وقت آتا جب تک اُس کے اہلکار اور چھوٹے ٹھیکیدار انتظار کرتے کرتے اُوب جاتے۔ اُس کی کار کبھی ادھر کھڑی ہوتی اور کبھی ادھر، اہلکاروں اور ٹھیکیداروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک آگے بھاگ کر کار تک پہنچتا اور وہ کام کرتا جو عام طور پر شو فر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اُسے لال جی کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو رائے صاحب کے خطاب سے موسوم کر لیا اور وہی اُس کا نام پڑ گیا۔ اگر جانا پہچانا چہرہ نظر نہ آتا، وہ پہلے اُسی کو پوچھتا، آداب و سلام کا جواب نہ دیتا، جیسے کہ اسے انداز میں بات کرتا اور بات کرنے والے کی ہر بات میں کیڑے نکالتا۔ کوئی اُسے اہم بات یاد دلانا، وہ بے پروائی سے کہتا، ”کوئی اور بات کر، یہ ہم جانتے ہیں“ یا ”ہم سے کام کی بات کیا کرو، ورنہ چپ رہا کرو۔“

اُس کی غیبت میں اُدھورام سے گالی دے کر کہتا، ”سنجے کی اولاد اِسے ہر بات کی خبر ہے“ (سنجے، جہا بھارت کا ایک کردار، جو آنکھوں سے دُور مہونے والے حادثے کو دیکھ سکتا تھا) اُدھورام کی طرح ہر کوئی ہزاری لال کو گالیاں دیتا، اُس کی بد زبانیاں پر خون پیتا لیکن اُس کے سامنے بھیگی بلی بنار ہٹتا، پیچھے فقرے کستا، کردار پر حملے کرتا جب ضرورت ہوتی خوشامد کرتا اور ہاں میں ہاں ملاتا۔

ہزاری لال کو دیکھنے سے لگتا کہ وہ جو کھاتا ہے کسی طرح خارج نہیں کرتا ہے۔ اُس کے اندر مٹی اعضا اُس فاضل مادے کو قبول نہ کرتے اور اُسے باہر دھکیل دیتے جس کے نتیجے میں وہ بیرونی حصوں پر گرنے کی حالت میں چپکا نظر آتا۔ قد کے لحاظ سے ہزاری لال پہلے ہی بے ڈھب تھا، اب وہ بے ڈھبی کی انتہا کو پہنچ گیا۔ سر پینڈا پیکے گھڑے کا سا ہو گیا، گردن پر گوشت کے پھندے نظر آتے اور شملے تختے جیسے چپٹے۔ چھاتی ڈھلک کر ڈھیلے مٹوں کی طرح لٹک پڑی اور کمر، گولہوں میں دھنس گئی۔ بھڑتی ہوئی ٹانگوں کے اوپر جوڑ جھکا لیتی کرتے اور کپڑا کھاتے لگتے۔ بنیلیں بھر گئیں جس سے باہیں، دھڑ سے زوایے بنانے لگیں۔ جوڑ چربی میں دب گئے اور اعضا چربی کے تودے دکھائی دیتے۔ آبرو، آنکھوں پر اور گال، گالوں پر چڑھ گئے۔ ماس چوٹ کھائے ماس کی طرح سُوج گیا۔ کار سے باہر نکلنے نکلنے اُس کا سانس پھول جاتا۔ وہ تھکی تھکی حرکت سے اُس رطوبت کو پونچھتا جو رستے رستے ٹپکنے کے قریب ہوتی۔ توازن قائم رکھنے کے لئے اُسے پیچھے جھکنا پڑتا جس سے اُس کا چھوٹا قد اور بھی چھوٹا نظر آتا۔ وہ پیٹ کو آگے کی طرف دھکیلتا ہوا چلتا اور مضحکہ خیز لگتا۔ اُس تھکا دینے والے عمل سے بچنے کے لئے اُس نے کار سے نکلنا بند کر دیا۔ وہ اندر بیٹھے، باہر کھڑے آدمی سے سوال کرتا جسے جھک کر جواب دینا پڑتا۔ وہ اُس سے جس طرح کا بدیہ احترام وصول کرتا وہ کسی دوسری صورت میں ناممکن تھا۔ اُس کی بے کسی وہ کام کر گئی جو اکثر بازی نہ کر سکی۔ حالانکہ اُس کی حالت مغرور کی سی تھی لیکن صحت مندوں کے غلامانہ چلن سے اُس کی انانیت کو وہ تسکین ملتی ہوگی جو کسی بد شکل کو اپنے سے زیادہ بد شکل کو دیکھ کر۔ جھگی لوگوں میں حقوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس لئے سب برابر تھے۔ لیکن تمدن نے متمدن لوگوں کو حقوق دے کر اُن کی اپنی ساری ذمہ داری، جواب دہی، دل پزیری، شائستگی۔۔۔ کا بوجھ عوام پر ڈال دیا۔ پہلے وہ جسے بلاتا اُس کے نام ساتھ جی کی اضافت لگاتا تھا، اب اُس نے وہ صفت لگنی چھوڑ دی۔ اُس کے لہجے کی دُشتی، بد تمیزی کے مماثل ہو گئی۔ اُس کا اثر اُس کے اہلکاروں اور پٹی کٹر بکڑوں پر الگ نظر آتا۔ وہ اُن کتوں کے سے لگتے، جن کی دُمیں سامنے ہوں۔



سُرجن سنگھ، ہزاری لال کے پاس بھارت تھا۔ کوئی اُس سے پوچھتا کہ وہ کیا کرتا ہے تو وہ فخر سے کہتا، ”میں بیٹی کنو بکرت ہوں۔“ ہوتے ہوتے وہ واقعی بیٹی کنو بکرت ہو گیا اور اُس کے ہاتھ کے نیچے دس پندرہ بھارت، مزدور کام کرنے لگے۔ وہ اوپر کا کام دیکھتا اور ادھر ادھر گھومتا رہتا۔ اُس کی نفسیات ہی بدل گئی۔ اُسے کوئی جانا پہچانا آدمی ملتا اور اُس سے پوچھتا کہ کیا کرتے ہو تو وہ ترنت کہتا، کرنا کیا ہے! مزدوری کرتا ہوں۔ اُس کی پورے طور پر صاف گوئی سے لگتا کہ اُس نے مزدوری کی عظمت کے راز کو پایا ہے جسے وہ عام کر رہا ہے۔ اُس کے طنز پر انداز کو وہی پہچان سکتا جس نے پہلے اُسے اپنے پیشے کو چھپاتے دیکھا تھا۔

جوں جوں مکان تیار ہونے لگے، تین سو ترقی کے کاریگر اور کامگار پنڈارا روڈ جانے لگے۔ آہنگ آویں اور کچھ مزدور پیچھے رہ گئے۔ ہم درہیسی کے ساتھ چھوٹے موٹے کام نبھانے لگے۔ مکانوں پر قبضے ہونے لگے، آخری مکان پر قبضہ ہونے تک ہم اُسے ذاتی ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے رہے۔ جس دن اُس پر قبضہ ہوا، ہم نے جھاڑیوں کی اوٹ سے کام چلایا حالانکہ ایس۔ ڈی۔ او۔ نے ایسا نہ کرنے کی ہدایت دی تھی لیکن ہم کیا کرتے؟ وہ علاقہ ایسا تھا جہاں دور دور تک پبلک ہاتھ روم نہ تھا۔ دوسرے دن کھانے کا وقت آیا اور میں قریب کے مکان سے پینے کے لئے پانی لینے گیا۔ میں نے کال بل سحائی دروازہ کھلنے میں دیر لگی تو دوبارہ بجادی۔ جس عورت نے دروازہ کھولا، اُسے دیکھ کر لگا کہ وہ سو تی ہوئی اٹھ کر آئی ہے۔

”کیا ہے؟ کون ہے تو؟“ اُس نے کچھ آکسی سے پوچھا۔

”جی، میں بھارت! پینے کے لئے پانی چاہیے۔“

کچھ اپنی ندامت چھپانے کے لئے اور کچھ ضرورت کا احساس دلائے لئے میں نے ڈبّا

اُگے بڑھایا۔

”یوں فُل گٹ لوسٹ! یو ڈسٹر بڈ اُس! بے وقوف دفع ہو جا! تو ہمارے آرام میں مُخل ہوا ہے۔“

اُس نے میرے ہاتھ سے ڈبّا چھینا اور میرے سر کے اوپر سے سرک میں دے مارا۔

میں نفرت و تشدد کے جذبے سے کانپ گیا لیکن اُس کی شدت نے مجھے گونگ بنا دیا۔ میرے دل نے مجھے پرکارا اور جتلیا، ”یہ مکان تیری محنت کا نتیجہ ہے! اس پر تیرا حق ہے! تیری محنت تجھ سے چھین لی گئی ہے! تو اس عورت کو غارت کر دے اور مکان پر قبضہ جمالے!“

میں نے اُس بد تمیز عورت کی آنکھوں میں سختی سے جھانکا اور کوٹھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا

ہو گیا۔

”آئی ول کال دی پولس اینڈ سی یو آر سٹڈ، یو آر سکل! میں پولس کو بلاتی ہوں اور تجھے گرفتار

کروانی ہوں، بدماش!

اُس نے دروازہ ایسے بند کیا جیسے میرے منہ پر مار رہی ہو۔

اگر سنگ میرے پیچھے سے آیا اور کا ندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ”جیل چھوڑ! دکان پر چلتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ہم نے ووٹ دے کر انھیں پارلیمنٹ بھیجا ہے کہ یہ ہمارے بارے میں سوچیں اور کچھ کریں۔ جو ہمیں پینے کے لئے دو گھونٹ پانی نہیں دے سکتے، وہ بھلا اور کیا کر سکتے ہیں؟“

میں چپ چاپ اُس کے ساتھ ہولیا۔ اُس نے ڈبّا اٹھایا، دیکھا اور پچک پر ہاتھ بھیرا گویا اپنی چوٹ کو سہلایا۔ وہ نہایت ملاحت آمیز لہجے میں بولا، ”ہمارے لوگ کامگاروں کو حیوان سمجھتے ہیں۔ جلتے ہیں کہ یہ اپنی ضرورت جیسے تیسے پوری کر لیں گے۔ آدم پورے کے ہوائی اڈے کا انچارج انگریز تھا۔ اُس نے پہلے کامگاروں کی ضروری حواجات کا سامان کیا تھا پھر کام چلایا تھا۔“

میں نے دل ہی دل میں انگریزوں کو سراہا اور ہندوستانیوں کو برا بھلا کہا۔ میں کتنے کاریگروں کو جانتا ہوں، جنھوں نے انگریزوں کے ہاتھ کے نیچے کام کیا ہے۔ ہر کسی نے اُن کے حسن انتظام، طریق عمل اور دیانت داری کی تعریف کی ہے۔ جو انھیں گالیاں دیتے ہیں، وہ ہمارے سیاست دان ہیں۔

تایا جی کہتے تھے، ”کردار اور آواز ایک دوسرے کے پابند ہیں لیکن بڑے نازک طریقے سے کردار معاشرے کو سنوارتا ہے اور آواز کردار کا احیا کرتا ہے۔ ایک کی راستی دوسرے کی راستی کی ضمانت ہے، ورنہ دونوں کی سلامتی کو خطرہ ہے۔ جس آدمی کی زندگی اس کسوٹی پر پوری نہ اترے، وہ نہ خود پتہ پتا ہے اور نہ دوسرے کو پتہ دیتا ہے۔“

میں تایا جی کی کسوٹی پر پورا نہ اُترتا تھا اس لئے اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دردِ سر تھا۔ چائے کی دکان پولیس کی بارکوں کے پاس تھی، جہاں پینے کے پانی کا نل بھی تھا۔ وہاں جانے آنے میں ادھی سے زیادہ بھٹی خرچ ہو جاتی تھی۔ ٹھیکدار کی جانب سے ہم پر کوئی سپردِ دائر مامور نہ تھا اس لئے اگر سنگ موعین وقت سے کم چھٹی کرتا تھا۔ اُس نئی صورت حال سے سمجھتا کرتے ہوئے، ہم کچے تل کا پانی پیتے اور رفع حاجت کے لئے جھاڑیوں میں جاتے۔ مجھے سننا سنگھ یاد آتا۔ اُس کی جن حرکات کو میں کسرِ اخلاق سمجھتا تھا، عین اخلاق لگتیں۔ شام کا جھٹ پٹا تھا۔ میں کام بند کر کے ہاتھ منہ دھو رہا تھا کہ میں نے دیکھا اُس گھر کے مکین کار میں بیٹھ کر باہر جا رہے ہیں۔ میں کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ میری دبی دبی نفرت، طوفان کی طرح اٹھی اور مجھے اڑا کر اُس دروازے پر لے گئی جہاں سے میں پھٹکارا گیا تھا۔ مجھ پر ایک جنون سوار ہو گیا، جنونِ انتقام۔ نہ مجھے پولیس کے ظلم کا ہراس، نہ اپنی ابرو کا

پاس! میں نے دروازے پر پیشاب کیا اور آخری قطرہ گرنے تک تن کر کھڑا رہا۔ میں واپس ہوتے ہوئے بہت خوش تھا جیسے وہی میرا مقصودِ حیات ہو۔

تین مورتی سے ہم پنڈارا روڈ پہنچے اور وہاں سے تہاڑ، جہاں بڑی جیل کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔ اُس کے در دیوار کی غیر معمولی لمبائی اور چوڑائی اور اونچائی جو دیکھتا، سراپتا جیسے اُسے اپنے گھر کی گٹھی گٹھی فضا ناپ نہ ہو۔ ریگڑھ پورہ سے پوسا تک باقاعدہ سڑک تھی اور اُس کے آگے پگڈنڈی، جو سانپ کی لکیر سے مشابہ تھی اور سیدھے فاصلے سے کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ طلوع و غروب کام کے وقت کا تعین تھا۔ مہر و فیت کی طوالت! آرام کے لمحے روندے ہوئے کیڑے کی طرح سکڑ گئے۔ نیمند کی نرمی جتنا بحال کرتی، کام کی سختی اُس سے زیادہ کچل دیتی۔ بدن پانی میں پڑے برف کے ڈلے کی طرح گھلنے لگا۔ راحت کے بعد اذیت ایسے لگ رہی تھی جیسے زخم پر سے پھاہا اٹھا کر نمک چھڑک دیا جاسکے۔ قار سین! میں کام چور نہ تھا، نازک مزاج تھا اور ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس میں جسمانی محنت کم ہو۔ مہمار کا کام نہایت سخت کام ہے جو میرے تن و توش کو راس نہ آتا تھا۔

تہاڑ کی راہ میں پوسا اسٹیٹ پڑتی ہے۔ وہاں نہر ہے جس کی شاخیں کھیتوں میں آنتریوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ اہلہاتی کھیتیاں، ہری بھری گھاس، پھولوں کے تنھے، درختوں کی قطاریں، سیدھی روشیں، جہاں بیٹھو ہلکورے لیتا پانی دکھائی دیتا اور سُناٹی بھی پڑتا۔ وہاں ہر منظر تحقیق طلبی اور نشاط انگیزی کی حد تک دل رُبا اور بہار افزا تھا اس لئے ناظر ایک ہی لے میں گھنٹوں گزار سکتا تھا۔ اپنی پُراسرار آرائشی خوبی کی وجہ سے وہ جھوٹا سارقہ بڑا لگتا۔ اُس کی حدود میں داخل ہو کر باہر نکلتے ہوئے میں محسوس کرتا کہ میں زندگی پار کھور ہا ہوں۔ میرے اندر ایک فن کار تھا اس لئے میرے پاس حسن تصور کی افراط تھی۔ چوں کہ اُس کی کوئی سمت نہ تھی وہ میری الجھن بنی ہوئی تھی۔

میری فطرت پسندی ایسی جگہ کے لئے ترستی رہتی تھی جہاں حسن فطرت کی سُتھرائی اور تنہائی ہو۔ اُجالے پاکھ میں وہ دھرتی ارض موعودہ کا نمونہ لگتی۔ پٹیل نگر کے خوش ذوق شہری وہاں سیر و تفریح کے لئے آتے تو اُبلے کپڑوں میں اُبلے بدن لہکتے، جھلکتے اور جھکنے لگتے۔ اُن کے خوش و خوش چہرے مجھ پر اُٹا اثر کرتے اور میرے تخیل کی صورت ہی بگاڑ دیتے۔ ہلکورے بیتا ہوا پانی، ہلکورے (آہیں) بھرتا جان پڑتا۔ میری محرومی کا احساس جاگ پڑتا اور میں کسی گوشے میں پڑا حسرت آمیز ننگا ہوں سے آسمان کو تکتا، کسی شہابِ ثاقب کو دیکھتا تو میرے دل میں ہول پڑتا۔ مجھے لگتا جیسے وہ میری تقدیر کا نمائندہ ہو۔

میری روحانی پستی کا اثر! میں اُس لکڑی کی مانند ہوتا جو بظاہر بھلی چنگی ہو لیکن اندر سے رُکھ خوردہ۔

جیل سے کچھ فاصلے پر چھاؤنی تھی۔ وہاں سے ایک بھیری والا آتا، جو اشیائے ضرورت کے ساتھ تھری لیکس رَم سے دایموں بیچتا۔ امر سنگھ رَم کا رسیا تھا اور ہر ماہ بوتل دبوٹل خریدتا تھا۔ جس دن اُس نے بوتل خریدی اُس دن بُنیاد، ڈیمپ پروف تک لانی ضروری تھی۔ کام ختم نہ ہوا اور اور ٹائم کرنا پڑا۔ ہم ٹھہرنے کے غم میں نہ تھے لیکن ٹھیکیدار کے محکم کو ٹال نہ سکے۔ آسمان پر بادل گھبراہٹا تھا۔ ہم نے اُسے ایسے دیکھا جیسے اُسے وقت میں آدمی غائبانہ مذکور اُس کرتا ہے۔ ہماری مُراد برائے لیکن کُتب، جب اُس کی ضرورت نہ تھی۔ ہم بادوباراں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ایک پیٹر کے نیچے رُک گئے۔ برق ایسے کوک رہی تھی جیسے اُس کا نشانہ وہی پیٹر ہو۔ میں نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا لیکن امر سنگھ راضی نہ ہوا۔ میں نے گاؤں میں پتل پر بکلی گرتی دیکھی تھی۔ وہ آگ کے نیند گولے کی شکل میں گری، تصادم سے شعلہ جوالہ بن گئی اور پتل پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ میں ڈر کر وہاں سے نکلا تو امر سنگھ میرے پیچھے ہویا۔ اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپتے، پاؤں سے راستہ مٹولتے، ہم چلے جا رہے تھے۔ جہاں کہیں پاؤں پگھلنے لگی سے نیچے پڑتا، زمین میں دھنس جاتا۔ میں نے گر گئی پہنی ہوئی تھی، ایک جگہ دایاں پاؤں دلدل میں بٹنے رہے بچا۔ راستہ پاؤں لگا تھا اس کے باوجود اُس سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اندھیرے میں ہمیں تب تجربہ ہوئی جب رعد کی لپک میں بستی نظر آئی۔ کہات ہے کہ تھکا اُونٹ سرائے کو دیکھتا ہے، میں نے ایک جھوپڑی میں پناہ مانگی۔ تنجوگ اسے کہتے ہیں! بستی نے اوٹ ہٹا کر باہر دیکھا لیکن میری آنکھوں نے یقین نہ کیا۔ جب تک امر سنگھ اندر آیا۔ تنگ و تاریک جھوپڑی بستی کی مسکراہٹ کے اُجالے میں پھیل کر حویلی کی وسعت اختیار کر گئی تھی۔

کپڑے بھیگ کر چپک رہے تھے۔ ہم نے اتار کر بچڑے اور سونکھنے کے لئے پھیلا دیئے۔ ہمارے کپڑے گیلے سہی، فصفا کی سردی اور جسم کی گرمی کے درمیان پردہ تھے، اُس کے اُٹھتے ہی ہم کانپنے لگے۔ ہماری میزبان نے مجھ مارنے کے لئے کھنسیاں دیں۔ وہ محنت کی جانی پہچانی خوشبو سے اس قدر بھری پُری تھیں کہ ہم نے لوٹاتے لوٹاتے اوڑھیں۔ ٹھٹھری ہوئی ہڈیوں کو گرمانے کے لئے امر سنگھ نے رَم کی بوتل کھولی۔ بستی کا شور ہر بھڑی سنگھ خاموش طبع آدمی تھا، وہ اپنا گلاس لے کر کونے میں سکر گیا۔ بستی نے آگ جلانی، جھوپڑی میں موکھانہ تھا اور باہر ہوا کا دباؤ زیادہ، دھواں اندر جمع ہونے لگا اور آنکھوں کو جلانے لگا۔ اُس نے اپنی تکلیف سے ہماری اذیت کا اندازہ لگایا ہوگا ورنہ وہ آگ کیوں بچھاتی؟ بارش

تھمنے اور ہمارے گھر جانے کے لئے تیار ہونے تک مجھ کو ریٹا لگائیں پسارے سو رہا تھا۔ بسنتی نے ہمیں وہی رات رہنے کے لئے کہا لیکن امر سنگھ راضی نہ ہوا۔ میں نے بھی سائیکل اٹھالی حالانکہ میری تینت اور تھی۔ امر سنگھ چلتے رکتے اور رکتے چلتے کچھ آگے بھل گیا لیکن میں بسنتی کے پاس کھڑا باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے روکنا چاہتی تھی اور میرے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ میں خود اس سے اپنی باتیں کرنے اور اس کی باتیں سننے کا ارزومند تھا۔ بات راستے کی طرح ہے۔ یہ کہیں سے شروع ہوتی ہے، کہیں بھی پہنچتی ہے اور اس دھکے چھپے رشتے کو ظاہر کرتی ہے جس پر خاموشی پردہ ڈالے رکھتی ہے۔ آدمی ایسا حصار ہے، جس میں سیندھ لگانے کے لئے بات کا اوزار درکار ہے۔

انسان کی نفسیات کی عجیب حالت ہے! اپنی محبت میں جو غم خوار کاردار بھائی تھی، وہ چات میں اُمتنگ بھری تھی۔ اُس وقت اُس کی خوشی انسانی ہمدردی سے بھر پور تھی اور اس وقت گرمی نفس سے۔ میں نے دونوں صورتوں میں اُس کے جذبے کا لحاظ کیا۔ اب میں نے اُسے باہوں میں لیا، اپنے ساتھ لپٹایا اور محسوس کیا کہ وہ میرا مجزوم شدہ ہے۔ میں نے اُس کی ٹھوڑی پکڑی، ہونٹ مسلے اور آنکھوں میں دیکھا۔ اُن کا رویہ تاریک رات کی طرح پُر اسرار تھا۔ وہ ہر کسی کی حقیقت دیکھتی ہے لیکن اپنا فیصلہ محفوظ رکھتی ہے۔ امر سنگھ اپنی بے قراری کی انتہا کو پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے ڈانٹ کر بلایا۔ میں نے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کیا تو بسنتی نے میرا ہاتھ چھوڑا۔ میری رگوں میں رُس گھل رہا تھا۔ اُس کے شایان الفاظ نے میں اور نہ ہی مجھے مؤذوں طرزِ بیاں سوجھ رہا ہے ورنہ میں اُس لطف کی تاثیر کی تفسیر لکھتا۔ بادل چھٹے نہ تھے، اندھیرا جوں کا توں تھا لیکن پگ ڈنڈی، چاندنی کی ککیر کی طرح نظر آتی تھی۔

انسان کا ہر ہنر مرمونِ فرست ہے اس لئے معیارِ حیات سے عبارت ہے لیکن ہوس، ناموسِ اُلوہیت کی طرح خود آفرینِ جہلت ہے اس لئے فقط اپنی ہی حقیقت کی ضمانت ہے۔ ہوس مست سے انسانی قدروں کی توقع رکھنا، مردم آزار سے رحم دلی کی التجا کرنا ہے۔ ضابطہ اخلاق، تقدیرِ عمل کی بکندی ہے اور دوسری صورت، پستی۔

## باب ۶۹

جیسا مرسوپ ہے ویسا نہیں ہوں میں

(شاہ)

انسان کے لباس میں کیا کیا نہیں ہوں میں

رے سکھ اور دکھ کی کہانی نرالی ہے۔ میں اپنے سکھ میں اکیلا اور دکھ میں میلے میں گھرا ہوا تھا با میری بے منتی تھی اور بے منتی بے سرو پائی کی تائید ہوتی ہے۔ میری بے سرو پائی، سرکشی کی، دست گیری کرتی اور کبھی شرمندہ و فائدہ ہوتی۔

یہ میری کتاب کا آخری باب ہے اور میں اپنے قارئین سے آخری اعتراف کرتا ہوں۔ حالاتِ فراز سے میں نے کوئی سبق نہ لیا۔ میں وہی مغلوب الجذبات بے قوف تھا، جو تھا۔ بے وقوف کے ہنر سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ وہ زمانے کو اوپری نظر سے دیکھتا ہے، سطحی اور ادنیٰ جذباتوں سے، انھیں کو زندگی سمجھتا ہے، یوں خود سے پرے دیکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر پاتا ہے ل کی طرح اپنے ادھورے پن میں مُنکن رہتا ہے۔

تایاجی کہتے تھے کہ تنقیدِ ذات سے ضبطِ نفس پیدا ہوتا ہے اور ضبطِ نفس سے اصلاحِ ذاتِ قیود ذات کا تقدیر نکلا۔ دراصل میری سچائی کی نوعیتِ دوہری تھی۔ میں جیون کے مان رہا، دوسروں سے اُن پر عمل پیرا ہونے کی اُمید رکھتا لیکن جہاں مجھے موقع ملتا، انھیں ردِ رائے بچاتا۔

ایک رات میں کام سے لوٹا، بے انت کور نے مجھے دیکھتے ہی کہا، ”گیان، تیرا خط آئی ہے۔“ وہ بزر پر سے اٹھی، اندر گئی اور خط تلاش کرنے لگی، تلاش کرتے کرتے عاجز آگئی اور اپنی کوتاہی کا ہرنے لگی۔ اُس کی ڈبل ڈوسی اُمی کی آنکسی تھی جو اُس کی جان کے ساتھ دوسروں کے لئے بنتی تھی۔

مجھے کسی سے مراسلت نہ تھی اور نہ ہی کہیں سے مراسلے کی اس۔ کچھ بے انت کور سے ڈر کر کے پیشِ نظر، میں نے خط کو اہمیت نہ دی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک رات میں سونے ا تھا کہ میں نے سائیکل کھڑی کرنے کی آواز سنی، پلٹ کر دیکھا اور اپنے پیچھے مان صاحب کو انھیں دیکھ کر میں خوش ہوا اور حیران بھی۔ خوش اس لئے کہ اکیلے وہی تھے جو میری فلاح و بہبود مند تھے اور حیران اس لئے کہ وہ میرے پاس پہلی بار آئے تھے۔ میں نے جلدی سے چارپائی وراٹھیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ کھڑے رہے اور میری پیٹھ تھپک کر کہنے لگے، ”میں ست نگر آیا تھا ا تھا کہ ریگو ہر پورہ کی تختی پڑھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ تجھ سے ملتا چلوں!“

آپ بیٹھئے!

مجھے کچھ اور نہ سوجھی، میں نے اُن کے ہاتھ سے سائیکل لے کر سٹینڈ پر کھڑی کر دی۔

”نہیں! مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ میں بیٹھ گیا تو آوریٹ ہو جاؤں گا۔ میں صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ انٹرویو کارڈ جاری کر دیئے گئے ہیں تجھے تیرا۔۔۔“

”کب؟ مجھے تو نہیں ملا!“

میں اپنی بے قراری پر قابو نہ پاسکا اور انھیں بیچ میں ٹوک دیا۔

”یکتنے دن ہو گئے ہیں! پیرسوں انٹرویو ہے۔ کارڈ نہیں ملتا، نہ ملے! تو انٹرویو کے لئے آجا میں نیا کارڈ جاری کروا دوں گا۔ میں نہ اتنا تو کیا ہوتا؟ کیسا اتفاق ہے!“

وہ یہ اطلاع دے کر چلے گئے اور مجھے حیران چھوڑ گئے۔ انھوں نے مجھے اپنے تئیں دہلی پولیسٹانک میں داخل کروانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اُن کے والد ہر نام سنگھ میرے بھائیاجی کے دوست تھے۔ انھیں بھروسہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح انھیں مجھے پڑھانے کے لئے راضی کر لیں گے پہلے انٹرویو کا کام ہو جائے۔ مجھے بھائیاجی سے بالکل اُمید نہ تھی لیکن خیال، خیال ہے!

وہ رات انوکھی رات تھی! میں جگت سنگھ سے باتیں کرتا اور وہ مجھے سونے کی تاکید۔ مجھ سے تنگ اگر اُس نے مجھے چھڑکا، ”مجھے سونے دے، ورنہ بیٹوں کا تجھے!“

اُس کی ڈانٹ ڈپٹ سے میں چُپ ہو گیا لیکن میری پروازِ شوق میں فرق نہ آیا۔ میں کبھی ٹھلتا کبھی آسمان کی وسعت میں دیکھتا، کبھی لیٹتا، کروٹیں بدلتا اور جاگتا ہوا خواب دیکھتا۔ اُن خوابوں کا اعجاز! میں بے خوابی کی ماندگی اور اعضا شکنی کی اسلکسی سے دور اور حیات پرور تازگی سے مہکتا تھا۔ میری اس نے میرے تھون کی تاثیر ہی بدل دی، وہ رگوں میں ترنگ کی صورت تھرکتا تھا۔ ترنگ، جذبے سے کہیں زیادہ گہری اور دیرپا ہوتی ہے۔ میں وجہ، بے وجہ مسکراتا اور خوش ہوتا۔ میں اپنے رویے پر جتنا قابو پاتا میری ترنگ، مجھے اتنا ہی گدگداتی اور مجھ سے اٹھکیلیاں کرتی۔ میرا مُستکون کردار نکتہ جینی کا مستحق ہی لیکن میری حسّاس طبیعت ایسی ہی تھی! ہر کوئی کام پر تیار ہونے لگا اور میں بے پروا گھومنے لگا۔ کوئی ہوگا جس نے میرے لالابی پن کو ہدفِ ملامت نہ بنایا ہو۔

”تو جو کرتا ہے، چُپ چاپ کئے جا! کو لہو کے بیل ہل میں نہیں جوتے جاتے!“ ہر بھجن سنکھنے میرا ٹھٹھا اُڑاتے ہوئے کہا۔

”اگے انجام نہیں دیکھا؟ تو پاگل ہے جو دھاڑی توڑتا ہے!“ کرتار سنگھ نے بن مانگے مشورہ ”تیری ہڈیوں میں چور گھس آیا ہے!“ اپنے خضم سے شہ پاکر بے انت کو لعنت بھرے

نیرے جیسے انجنیر بننے لگے تو ہندوستان کا بیڑا غرق ہو جائے گا! سو مٹر سیکھنے نے اپنے  
ہکی بات سے نئی بات پیدا کی۔

نم جو بھی کرو، کرو، پہلے ریڑھ کی ہڈی مضبوط کرو! ورنہ ہر جگہ دھوکا کھاؤ گے! جگت سنگھ  
لگایا اور ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔

فارسلین، انسان کی فطرت زراں ہے! یہ دوسروں کے بارے میں کچھ بھی کہتا ہے اور کھڑے  
سارے مسئلوں کا حل نکال دیتا ہے۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ اپنی ذات میں کوئی گن پیدا کرنے  
کے طوفان سے گزرنے پڑتا ہے۔ تصور بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ناموافق صورت میں مسرت  
نق صورت میں غم آفرین طریقے سے کام کرتا ہے۔ چوں کہ یہ حقیقت کی ضد ہے یہ حالات حاضر  
مصلحت نہیں رکھتا۔ یہ صانعِ تحریر عدم کو خیالی وجود دینے اور اُس کی خوب صورتی سے لطف  
ہے۔ لیکن حقیقت میں عدم اور وجود میں لامتناہی اور ناقابلِ تسخیر خلا ہے۔ ہر انسان اپنی  
بق اس خلا کو بھرتا ہے اور وہی اُس کا حاصل ہے۔ جو کم نظر ابتدا ہی نہیں کرتا، اُس کا  
سل ہے۔

میں نے ہر کسی کی بات سنی اور نظر انداز کر دی۔ وہ دن یوں ہی گزر گیا، کچھ نہانے دھونے اور  
لرنے میں۔ دوسرے دن میں نے سفید پتلون، قمیض پہنی اور سیلٹی رنگ کی پگڑی باندھی۔  
سامنے کھڑا ہوا تو دھرتی پاؤں کے نیچے سے کھسکتی جان پڑی۔ میں سائیکل کی سیٹ پر سفید  
ار ہوا تو تن میں سے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ میں اہل خانہ پارک کے پاس سے گزر رہا  
نظر گلاب کے تختے پر پڑی۔ میں رُکے اور اندر گئے بغیر نہ رہ سکا۔ حالاں کہ پھول توڑنے  
مائن پاس ہی کھڑی تھی، میں نے اُس کی نظر بچا کر پھول توڑا اور ہاتھ میں بھنچ لیا۔ میں نے  
اُسے ہاتھوں میں مسلا اور سونگھا اور وہاں اکیلے کھڑے کھڑے محسوس کیا کہ میں دلی کی بے  
سائیکلا ہوں اور میری الگ سمت ہے، الگ پہچان ہے۔ میں نے اپنے اُمید افزا مستقبل کو  
بے دیکھا اور اُسے چھو کر مزہ اٹھایا۔ میں ڈی سی۔ ایم کے قریب جا رہا تھا۔ میں روحانی طور  
ڈکے سامنے بیٹھا اُس کے ممبروں کی نگاہ انتخاب کا مرکز بنا ہوا تھا کہ میں سڑک پر دائم حاضر  
زا گیا اور شرمندہ ہونے کے بدلے مسکرا دیا۔ ریڑھی والا دلدار قسم کا آدمی تھا، رازدارانہ  
، سردارجی! کسی پیاری سے ملنے جا رہے ہو جو خوشی کے مارے راستہ نہیں سوجھتا،  
اُس کے تنخیش کی جولانی میری مسکراہٹ کو نمایاں کر گئی۔ میں اُس لطافت آفریں خیال سے



نُطف لیتا ہوا آگے بڑھا، اُس پیارے آنجانے نے کھلے خزانے کہا، ”جاؤ جاؤ، عیش کرو ابھی تو عمر ہے عیش کرنے کی! پھر ہماری طرح بھاڑی جھونکنا ہے۔“  
میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اُس کے چہرے کی اُمید و یاس سے لگا کہ وہ اپنے کسی پرانے ارمان کی تجدید کر رہا ہے۔

ستری منڈی کے برف کے کارخانے کے قریب پانی ٹھہرا ہوا تھا، جو گاڑیوں کے پہیوں سے اڑتا تھا۔ مبادا کپڑے خراب ہو جائیں، میں سائیکل سے اُنزکرفٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور پیدل چلنے لگا۔ اپنی بیکاری کے دوران میں اُس مرٹک پر سے گزرتا تو مجھے لگتا کہ میں اکیلا اُس بھیسٹر میں بیکار ہوں۔ اب میں نے محسوس کیا کہ مرٹک بیکار آدمیوں سے بھری پڑی ہے، جو بے فائدہ ادھر ادھر دوڑتے ہیں اور میرا راستہ روکتے ہیں۔ میں اُن سب سے زیادہ مصروف ہوں اور نہایت اہم کام سے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں چلا کر اُن پر اپنی اہمیت بخاؤں اور انھیں راستہ دینے پر مجبور کروں لیکن میں کسی جذبے کے زیر اثر ایسا نہ کر سکا۔

انسٹریو نو بجے تھا۔ میں وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور سائیکل، سائیکل سینڈز پر رکھ کر دفتر کے پاس مان صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آئے اور مجھے ہیڈ کلرک آملو والیا سے ملوا گئے۔ اُس نے مجھے دوسرا انسٹریو کارڈ بنا دیا اور ہاتھ ملا کر گڈ لک کہا، مجھے لگا کہ میں انسٹریو میں پاس ہو گیا ہوں۔  
اُمیدوار چھوٹی چھوٹی محکولیوں میں بیٹے کھڑے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ کوئی انسٹریو دے کر باہر آتا تو وہ محکولیوں سے ٹوٹے، اُس کی طرف پکیتے اور اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ کوئی اُن کے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا اور کوئی خاموشی سے اُن کا حلقہ توڑ کر نکل جاتا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور اپنی جھلّاہٹ سے لڑتے ہوئے پھر نئے ساتھی ڈھونڈ لیتے۔

میری طرح مجھ سے کچھ دیر پال سنگھ الگ تھلگ کھڑا تھا، پورا بانکا جوان! اُس نے داڑھی کو مونچھوں سے موچنے سے بڑے سلیقے سے الگ کیا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہٹلر نام کا ایک خوب روئو خیز لڑکا تھا۔ وہ اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور اُس کے گال سہلاتا تھا۔ وہ کبھی زور سے گال توڑتا تو ہٹلر دُور سے بللاتا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا، ”ہولے، درد ہوتا ہے!“  
”او۔ کے۔ میری جان!“

ہر پال سنگھ پیار بھرے لہجے سے اُس کی طرف دیکھتا اور پھر اُس کے گال سہلانے لگتا۔ کچھ دیر بعد بانگل نام کا ایک بے خط لڑکا آیا۔ وہ ہر پال ہی کی طرح شوخ و شریر تھا لیکن اُس کا چشمہ

بھی پر اثر انداز نہ تھا۔ اُس نے دُور سے یہ آواز بلند کہا، ”ہائے ہر پال!“  
ہائے بانسل!“

”تم کیا سارٹ ہو! آتے ہی ٹھوڑھکا نا ڈھونڈ لیا۔“  
”پرندہ پہلے گھونسل بنا تا ہے پھر آئندہ دیتا ہے۔“

”تفے میں ہر پال سنگھ کا نام انٹرویو کے لئے پکارا گیا۔ اُس نے سٹر کو بانسل کے حوالے  
باکری چھپے ایسے دیکھا جیسے اُسے انٹرویو سے زیادہ سٹر کی فکر ہو۔

میں انٹرویو بورڈ کے سامنے حاضر ہوا تو میں مسکرا رہا تھا جیسے مجھے اپنے خوشگوار نتیجے کا پہلا  
بری مسکراہٹ میری کمزوری تھی۔ اس نے مجھے بارہا ناگوار صورتوں میں الجھایا تھا لیکن میں  
لے میں ناکام رہا تھا۔ نفیس لباس پہن کر میری یہ کمزوری اور بڑھ جاتی تھی۔ وہاں سارے  
ی میں پوچھے گئے۔ میں جتنی انگریزی جانتا تھا، جانتا تھا، روانی سے بول نہ سکتا تھا  
نہ ہر جواب مسکرا کر دیا۔

”سٹر سنگھ، یو سیم ٹوبی ویری پیپی! وائی؟ سٹر سنگھ، آپ بڑے خوش نظر آ رہے ہیں!  
”صاحب نے سوال کیا جو بورڈ کے چیئرمین تھے۔

”بیکور آئی ایم پیپی سر! اس لئے کہ میں خوش ہوں جناب! میں نے مسکرا کر کہا۔  
”او۔ کے۔ تھینک یو سٹر سنگھ، یو کین گو! ٹھیک ہے بشکر یہ سٹر سنگھ! تم جاسکتے  
بھرانے مسکرا کر نہایت لے پروردہ بچے میں کہا۔

میں نے بھی تھینک یو کیا، مسکراتا ہوا اٹھا اور باہر چلا آیا۔ میں وہاں سے سیدھا مان حصاب  
چا اور کچھ احساسِ قصور سے انٹرویو کا حال سنایا۔

”تو سلکٹ ہو گیا ہے!“ انھوں نے اپنے چہرے جتنی بڑی مسکراہٹ سے کہا۔ ”میں نے  
لکھ رکھا ہے اور آج کل میں جواب ایسا چاہتا ہے۔ میں خبر کرتا ہوں۔ جاؤ، خوش رہو!“  
میں گھر پہنچا۔ اپنوں کو اپنی خوش بختی کی خبر سناتے ہوئے، میں اپنی ہی ہانکتا تھا اور اپنے  
خامیز روپ دیکھتا تھا گویا اُن کا ہونا، نہ ہونا برابر ہو۔ میری شانِ بادِ عائی و خود نمائی! میں  
یا کہ یہ کیا ہیں! سارا زمانہ میرے لئے ہے، صرف میرے لئے ہے۔ میں اپنے خوب صورت  
، ننگی چارپائی پر بیٹ گیا جیسے لباس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ بے انت کور نے دیکھا اور منہ  
یا نواب کی طرح لیٹا ہے، کپڑوں سمیت! ابھی سے تیرا یہ حال ہے تو کالج میں داخل ہو کر کیا کہے گا؟

”جو کروں گا سو کروں گا ! بھابی، تم کیوں پریشان ہوتی ہو ؟“

میرا موجی جیوڑا ! میں پاؤں نیچے رکھ کر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پاؤں اٹھا کر اوپر رکھ لئے اور اکڑ کر لیٹ گیا۔

”گدھا، کاشی بھی ہو اے تو گدھا ہی رہتا ہے ! بڑا چلا کالج میں پڑھنے !“

”بھابی، پانچول تیر تھ تم نے نہاے ہیں اور تہمت مجھ پر لگاتی ہو۔“

”تو میری عقیدت پر طعن کرتا ہے، کفایت پڑے گی کچھ پر !“

”چپ کر گیان !“ جو گندر کور نے مدافعتاً انداز میں کہا۔

میں چپ ہو گیا۔ میری حریف کتنی دیر تک بڑبڑاتی رہی اور پھر سر پر دوپٹا باندھ کر لیٹ گئی جیسے دردِ سر میں مبتلا ہو۔ اُس کا یہ دتیرہ جانا پہچانا تھا۔ وہ جب کسی سے لڑتی اسی طریقے سے کرتار سنگھ کو آگاہ کرتی۔

اپنی انٹرویو کی امید پر میں نے کام پر جانا بند کر دیا۔ امر سنگھ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ میں کام پر جایا کروں لیکن میں اُس سے مَس نہ ہوا۔ دوسرے تیسرے دن مان صاحب آئے اور یہ منحوس خیر لائے کہ اُن کے والد میرے بھائیاجی کو منانے کے لئے گاؤں گئے تھے لیکن بے نیلِ مرام آئے تھے۔ اُن کے کہنے پر میں نے بھائیاجی کو خط لکھا۔ جس کا بھوڑیہ تھا کہ اگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تو میں زندگی بھر دردِ در کی ٹھوکریں کھاتا پھروں گا۔ میرے خط کا جواب واپسی ڈاک آیا۔ میں نے خوشی سے کانپتے ہوئے لفافہ کھولا، اندر کوئی نوشتہ نہ تھا، میرے خط کے ٹکڑے تھے۔

میرا خوش آئندہ مستقبل جسے میں نے چھو کر دیکھا تھا، اپنی بھیانک حقیقت میں میرے سامنے اکھڑا ہوا۔ میں اپنی پہچان بناتا بناتا پھر اُسی بھیسٹر کا جھنڈ بن گیا جس میں کسی کی کوئی پہچان نہیں ہوتی میں ننھا اور میرا کام ! اور بے شناخت کام آدمی سے ایسے منسوب ہے جیسے زخم سے کھرنڈ۔ دونوں کا وجود دوسرے پر منحصر ہے، ایک نہ رہے تو دوسرا خود بخود مرٹ جاتا ہے۔

اس بار پھر میرے اپنوں نے مجھے اپنے اپنے انداز میں ہدفِ ملامت بنایا۔

”اچھا ہوا ! کبڑے کے لات ہی لگے تو وہ سیدھا ہوتا ہے۔“

بے آنت کور دانت نکال کر ہنسی اور اپنی خوشی میں اپنے منہ پر کپڑا رکھنا بھول گئی جو اُس کی مخصوص عادت تھی۔

”چاچا جانتے ہیں، کون کس کام کے قابل ہے!“

سو مٹر سنگھ نے میرے بھائی جی کی فراست کی داد دی۔

”تو یہ کام کرنا چھوڑ دیتا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا! اپنے خاندانی ہنر سے دست بردار ہونا اپنے

بزرگوں کی بے عزتی کرنا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے اُن کی رُوح اُسے کبھی مُعات نہیں کرتی۔“

ہنر بھیج سنگھ نے مجھے گلے لگایا اور میرے لئے اپنا پیار جتایا۔

”لاکھوں لوگ رنج گری کرتے ہیں اور دُنیا داری چلاتے ہیں۔ تیرا بیاہ کر دیتے ہیں سب ٹھیک

ہو جائے گا۔ ذمہ داری گلے پڑے گی تو اپنے آپ کام میں دل چسپی بڑھے گی۔“ کرتار سنگھ نے مجھے بیاہنے

الائق کُٹوارا سمجھا اور ماہر نفسیات کا سامنہ دیا۔ میرے لئے کوئی کُٹواری دھونڈنے کا وعدہ کیا جیسے زندگی

کے تاریک سفر میں کُٹواری، شمعِ راہ ہو۔

”پڑھنے کا اتنا شوق ہے تو تم دِن کو کام کرو اور ایوننگ کالج میں داخل لے لو۔ اپنی زندگی

آپ بنانے کا لطف ہی آور ہے!“

جھگت سنگھ کی بات حقیقت کے قریب تھی لیکن میرے عیب جو دل پر گراں گزری۔ آدمی

جتنی سرگرمی سے دوسرے کے عیب پوچھتا ہے اُس کا ایک حصہ اپنی تنقید پر خرچ کرتا تو کیا سے کیا

ہو جاتا!

اُن کی برد آور بے مہربانوں سے میرے مُنہ کا مزہ خراب ہو گیا۔ میرے دل میں اُن کے لئے

نفرت بھگ گئی۔ ایسی نفرت جو نفاست پسند انسان کے دل میں غلیظ ماحول میں جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اُن کے تاریک چہروں پر روشنی دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ میری ہنریت سے لذت اُٹھاتے ہیں اور مجھے

اُس راستے پر چلنے سے روکتے ہیں، جو میرے کمال کی طرف جاتا ہے۔ اپنی نفرت میں مجھے لگا کہ اُن کی

رگوں میں ایسا ناپاک خون ہے جو اپنے نطفے کی طرح ہر کسی کو پریشان، چاک گریباں اور اسیرِ زنداں

دیکھنا چاہتا ہے۔

قارئین، میری کم نظری میری بے زاری کا سبب تھی اور میری بے زاری میری ناخوشی کا۔

میری ناخوشی کا سامان کسی کے پاس تھا تو بسنتی کے۔

خوابِ نفسانی نہایت دل پریر اور سرسبزِ انشاؤں کا جذبہ ہے۔ اس کی طاقت پر اختیار نہ ہوتا

اس کی نفاست میں رذالت کا جزو پیدا ہو جاتا ہے اور انسان، حیوان سے بدتر۔ حیوان کی نفسانی ضرورت

آئینِ آفرائش حیات کے تابع ہے جب کہ انسان اس طریق کار سے بری ہے۔ اس پر لازم ہے کہ

یہ اپنی ضرورت اور چاہت میں توازن پیدا کرے۔ یہ نہایت مشکل کام ہے اِرفعت کا راستہ بے لطف اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔

بسنتی خود اپنے کام اور ماحول سے بے زار تھی۔ ہم دونوں یوں ملے کہ ایک دوسرے کا مقصود بن گئے۔ وہ مجھ سے پانچ چھ سال بڑی اور بانجھ تھی۔ اُس کا پتی بھیری سنگھ اُس سے آٹھ دس سال بڑا تھا اور قبل از وقت بوڑھا ہو گیا لگتا تھا۔ بسنتی کے محنت پروردہ گندمی رنگ پر میل ایسے جما رہتا جیسے سانچے میں تازہ ڈھالے جیسے پر چلی مٹی۔ اُس کے اعضا مضبوط اور خوب صورت تھے اور دیکھتے ہی اپنا لحاظ کرنے کی ترغیب دیتے۔ میں شروع میں اُن کا احترام اس طرح کرتا جس طرح مذہبی آدمی تبرکات کو چھو تا ہے۔ اُن کا تقدس مجھے چومنے پر مائل کرنا لیکن تبرکات کے برعکس اُس کے اعضا میری گرانی کے مشتاق تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مرنی لذت کی مانند بہہ نکلتے۔ اُس لذت کی کوناکوئی! وہ ماتھے پر الگ، گالوں پر الگ، ہونٹوں پر الگ، گردن پر الگ، چھاتیوں پر الگ، ناف پر الگ، رانوں پر الگ۔۔۔۔۔ اثر رکھتی۔ لیکن ہاں! اُن میں ایک سواد مشترک تھا، گدے پانی کا سواد۔ اُس کی نسوں کا رنگ اُن انکھوں سے ملتا جو سائے اور اُس میں پیدا ہوتے ہیں۔ گردن کے دونوں کی طرف کی رگیں اتنی تحریک خیز تھیں کہ اُن پر ہونٹ رکھتے ہی ترنگ اٹھتی کہ اُنہیں چبا کر اُس ناک کو چوڑوں جو بدن سے زیادہ اُن میں بہتا تھا۔ اُس کے پستان دُنیا ئے حُسن کے سب سے زیادہ خوب صورت اور تندرست باشندے تھے۔ اُن کے اثر سے اُس کا پھر یا بدن تھوڑا آگے کو جھکا رہتا۔ وہ جس ادا سے اٹھتی بیٹھتی اُس سے لگتا کہ وہ اپنی حرکت کی چوکی سے اُنھیں سنبھالے ہوئے ہے اور اُن کی سرکشی سے پوری طرح مطلع ہے۔ وہ کہیں پاؤں اٹھا کے چلتی تو ناز کی لیکن استوار سی سے آگے پیچھے لہراتے ہوئے پستان اُن خط و خال کو عیاں کرتے جو نہاں ہوتے ہوئے تسکینِ نفس کی جانے اماں تھے۔ مانا کہ میں اُن کے بارے میں لکھ رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی لذت ضابطے سے بعید اور دل کشی لطافت سے مزید تھی۔ لبریز پستانوں کو دبانے سے لگتا کہ اُن میں سے دودھ کا سوتا پھوٹ پڑے گا۔ اُس کی رپر دگی میری وارفتگی کو بڑھاتی۔ میں ہونٹوں سے چومتا چومتا دانتوں سے کاٹنے لگتا۔ اُس کے جذبات میرے میحان کی طرح بھر پور تھے۔ وہ اپنے لطف میں کرب آمیز سستی سے چملاتی اور کراہتی ہوئی میرے بھرٹکے ہوئے نفس کو خوں خواری پر آمادہ کرتی۔ ہم دو ہمیں مست و رندوں کی طرح ایک دوسرے پر پھینٹتے، روندتے ہوئے مجروح کرتے اور وہ سارا دھک اُس سُکھ کے لئے بہتے جو ہمارے آغاز کے انجام میں ہوتا۔ رات کے اندھیرے ہمارے ناجائز رشتے کی ضمانت ہوتے ہوئے کسی جائز فعل میں

زکاوٹ نہ ڈالتے جس انگ کو جس انگ کی ضرورت ہوتی وہ اُسے لمس سے محسوس کرتا، آگے بڑھنا، باہم جدوجہد سے کمال عمل کو پہنچتا اور یوں مطمئن ہوتا جیسے تازہ گھاؤ میں دزد کی لہر۔ اُس کی نشاط کے آخری مراحل میں میں اُس کے اندر گہرا اتر جاتا۔ وہ لذت انگیز اذیت سے بڑائی اور دانت بھینچ کر کہتی، ”بس! بس! اندر اور جگہ نہیں ہے۔ میں بھری پڑی ہوں۔“

کچھ ہی دنوں میں اُس کی چھاتی پہلے سے زیادہ پوری جلد ملائم، آنکھیں خواب آگئیں، ہونٹ تازہ اور رنگ شہرے کنول کی طرح چمکنے لگا۔ سانس گلاب جل میں نہائی ہوئی ہوا کی طرح ہلکے اور دوسے حواس پر اثر انداز ہونے لگی۔ جیسے آگ کو ظہور پذیر ہونے کے لئے حرارت چاہیئے، زندگی کو حرکت۔ یہ غلطی تحریک چلتی ہے تو اپنی تیزی میں تحلیل ہو کر ہی رکتی ہے۔ اگر ضرورت نفس کی خاطر داری ہنہر ہے تو میں اس میں حد کمال تک باہر تھا۔

اُس کے جسمانی رشتے نے اچانک روحانی سمت اختیار کر لی۔ اُس کے لئے میرے علاوہ دنیا میں کسی اور شے کا وجود نہیں تھا۔ اُس کی نظروں میں، میں وہ بہترین اور حسین ترین مرد تھا، جو اُسی کے لئے بنا تھا۔ وہ صرف میری خاطر جیتی تھی اس غرض سے کہ وہ مجھے نفسانی محبت کی وہ سوغات دے سکے جو آج تک کسی عورت نے کسی مرد کو نہ دی تھی۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرنے لگی اور میرے بچے کی ماں بننے کے سنے دیکھنے لگی تاکہ جذبات کا ناریدہ رشتہ، دیدہ رشتے میں بدل کر زیادہ مضبوط ہو جائے۔ محبت کا جذبہ حیرت انگیز جذبہ ہے! یہ انتہا میں اپنی جان دے سکتا ہے، دوسرے کی لے سکتا ہے۔ وہ مجھے جتلاتی کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ مجھے گندھرب بیاہ کرنے پر کساتی اور وہاں سے کہیں دُور بھاگ چلنے کی ترغیب دیتی۔ اپنے جذبے کی سنجیدگی ظاہر کرنے کے لئے اُس نے مجھے اپنی سناوت سے نہال کر دیا لیکن وہ مجھ میں وہ جذبہ پیدا نہ کر سکی جو اُس کے جذبے کا مقابل ہوتا۔

تکمیل محبت، مباشرت نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو میاں بیوی کا رشتہ نہایت بُردبار اور دل آرا ہوتا۔ دُور مندی محبت ہے۔ کیوں کہ بھی ایک جذبہ ہے جو اپنی نزاکت میں جاں فزا اشتیاق اور بے لاگ انسلاک سے معمور ہے۔ دوسرے ہر جذبے کی نفسیات غرض پرور ہے، جس کا مجموعی حاصل نفرت ہے۔ جہاں تک مباشرت کا سوال ہے یہ جذبہ جتنا سربُزگمال ہے اتنا ہی سریع الزوال ہے۔ اس لئے کم ظرف کی بے اصولی اور بے دریغی ہے۔

تایاجی شاستر دے اس دعوے کا کھنڈن کرتے تھے کہ آئرت، غلاظت پر گرتا ہے تو اُسے آئرت بنا دیتا ہے۔ وہ کہتے تھے، ”آئرت نام کی نہ کوئی چیز ہے اور نہ تھی۔ روحانی اعتبار سے آئرت وہ

جذبہ ہے جو کرتے ہوئے انسان کو سنبھالتا ہے اور اُس میں انسانی صفات جگاتا ہے۔ روحانی جذبے میں انسانی وقار کا احساس مَر جائے تو اس کا احیا مشکل کام ہے۔“

میرے کردار کے ساتھ میرا احساس بھی مَر چکا تھا اور میں بسنتی کو نفسانی ضرورت کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ اُس کے پاک جذبے کو محسوس کرنا بڑی بات ہے، میں نے اُس کے دل میں جھانک کر نہ دیکھا۔ اُس کا جذبہ اپنی وفا شکاری اور میرا میری بدکاری میں اکیلا تھا۔

قارئین! جہاں تک ممکن ہے، میں نے اپنے چلن کا تجزیہ کیا ہے اور اُسے لکھا ہے۔ اب جب کہ میں اپنی کہانی کے خاتمے کے قریب ہوں، میرے دل میں ایک ناممکن خیال آیا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں کسی کے مجروح جذبات کا صحیح ردِ عمل بیان کر سکتا۔ تایاجی کہتے تھے، ”حیات انسانی کے تین پہلو ہیں، حُسن تجزیہ، حُسن نثر، حُسن اخلاق۔ حُسن تجزیہ انسان کو سنوارتا ہے اور حُسن نثر اسے پھیلاتا ہے اور حُسن اخلاق اس کا تحفظ کرتا ہے۔ جہاں یہ تینوں برابر ہیں وہاں خوب صورتی کا راج ہے اور اسی طرز حیات میں انسان کا ثبات ہے۔“

چوں کہ اس وقت تایاجی کا کردار میری زندگی کا معیار ہے، مجھے گزشتہ زندگی کا ہر باب ناکارہ، فرسودہ اور دریدہ نظر آتا ہے۔

مجھے راہِ راست پر لانے کے لئے بسنتی نے دوسرا طریقہ آزمایا۔ وہ مجھ سے دُور رہتی اور مجھے دُور رکھتی، اپنی ران پر سرتک رکھ کر نہ بیٹھنے دیتی جو میری پیاری طرزِ نشست تھی۔ میرے اکیلے پن کی بدبو، جو آرزوئے وصل کی خوشبو میں دبی رہتی تھی، تنہوں پر بیٹھی رہنے لگی۔ وہ وجود جو اپنی فراخ دلی میں میرے وجود کا حصہ بن جاتا تھا، اپنی بے لفاظی میں مجھ سے الگ ہو گیا۔ وہ اعضاء جو مجھے دیکھتے ہی گرمی شوق سے پگھل جاتے تھے، مجھ سے مل کر ویران دھرتی کی طرح سُوکھے رہتے۔ میری مطلب پرستی اور اُس کی انصاف پسندی کے ٹکراؤ سے ہمارے درمیان جذباتی فاصلے بڑھ گئے اور ہم اپنے اپنے انداز میں بھگتنے لگے۔

ایک رات ہوا کا رویہ اُس جھونکے کی طرح تھا جو پانی کی پھواریں سے گزر کر آتا ہے۔ مائل گرد و غبار اور آسمان بادلوں سے پاک تھا۔ چاند اپنی پوری رعنائی سے چمک رہا تھا اور دھرتی کی سادگی کو پُرکاری میں مُتغلب کر رہا تھا۔ خوب صورتی خون میں جوار بھاٹے کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور دیوانگی کو بڑھاوا دیتی ہے۔ بسنتی میرے ساتھ گھر بسانے کے لئے گھر سے بھاگ آئی اور اپنے فیصلے پر اڑ گئی۔ اُس کا دل متانت سے لبریز تھا اور میرا اثر اس سے، اُس کی متانت کا خیال نہ کرتے ہوئے

اور اپنی مرادِ خصلت کا دم بھرتے ہوئے، میں نے اُسے کچھ روپے دیئے اور گھر لوٹ جانے کی تلقین کی۔ میرے لئے یہ نئی بات نہ تھی۔ میں لاجونتی کی روحانی مہربانی کا صلہ دنیاوی نعمتوں ہی میں پھیلایا کرتا تھا، اکثر چارے اور کبھی کبھار آناج کی خشک میں۔ اجر جائز رسم و رواج تہذیب و تمدن ہے۔ جہاں نفسِ اجر غیر ممنون ہے وہاں انسان، بیوان ہے۔

قارئین! اب میں رسم و رواج، تہذیب و تمدن، اجر جائز، اجر غیر ممنون۔۔۔۔۔ بڑی بڑی باتیں کرتا ہوں جو مختصر میرت شریف انسان کی زندگی کا سرمایہ ہیں۔ اسے پرہیز کر آپ خوش ہوں گے کہ ناخوش، یہ آپ کے احساسِ طبیعت پر منحصر ہے۔ لیکن یقین جانئے، اُس خام غم میں وہ خام جذبہ اپنی نظیر آپ تھے اور حاصلِ حیات لگتے تھے۔ فطرت کی اصلیتِ فطرت جانے! انسان کی فطرت میں تغیر بڑا تکلیف دہ طریقِ عمل ہے۔

لاجونتی کی آنکھوں سے چنگاری پھوٹی، وہ اپنی بے عزتی کے درد سے تڑپتی اور سبحان پرورد ہجے میں بولی، ”تو اپنی اوقات پر آہی گیا آخر! میرے قیاس میں نہ تھا کہ تو اس پاکیزہ رشتے کو گندی نظر سے دیکھے گا اور اس کا لین دین کرے گا۔“

میرے اس قطعی اقرار کا مقصد اُن نیش و فراز کو ظاہر کرنا ہے، جن سے ہر انسان اپنے انداز سے گزرتا ہے اور جینے کے طور طریقے اپناتا ہے۔ لیکن ہاں! اخلاقی پستی روح کا زخمِ خوں چکاں ہے۔ اس سے جان بچانے کا ایک ہی علاج ہے۔ مکمل بے ضمیری! مکمل بے حسی!

اُس نے روپے میرے منہ پر دے مارے اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ جب اُس نے آخری جملہ کہا تو اُس کی آواز شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ رات کے ملگجے میں، میں نے دیکھا کہ وہ آنسوؤں سے لڑ رہی ہے اور اُس دلوے کو روک رہی ہے جو ایسے حالات میں انسان کی کمزوری ہوتا ہے۔ بے اخلاق کے لئے وجودِ مقدم ہے اور اخلاقِ ثانوی اس لئے وہ وجود کو اخلاق پر ترجیح دیتا ہے۔ میرے اندر کسی ایسے جذبے نے جنم نہ لیا جو دردِ بھرے حالات کا حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنے قیلے پر اٹل رہا کہ یہ سب وقتی جذباتی لپچل ہے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا اور میرا کام نکلتا رہے گا۔ میری ضرورت میرے اندر سے پیدا ہوئی مگر مجھے مسلط ہو گئی۔ اس کے باوجود یہ اپنے آپ کو مجھ سے الگ رکھتی رہی اور اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لئے مطلب پرستی بنی رہی۔ میں نے دکھاوے کے لئے اُسے گلے لگانا چاہا۔ اُس نے مجھے پرے دھکیل دیا اور چھلک کر کہا، ”میرے زخم تیرے زخم ہیں۔ اس وقت تو مردہ ہے مردہ! کبھی زندہ ہوا تو یہ زخم درد کریں گے اور نبچھے تڑپائیں گے۔ تیری حالت قابلِ افسوس



ہے، قابلِ افسوس! شاید قابلِ رحم!!

اُس نے سارے قوائے عوامل کو یک جا کیا، اپنے آپ کو بے حال اور مجھے نفرت سے دیکھا۔ عام طور پر نفرت انسان کی اپنی شکست اور ذلت کا عروجِ زوال ہے لیکن خاص حالات میں یہ انسانی وقار کی ڈھال ہے۔ جہاں اس کی نفسیات دوسری نوعیت کی ہے وہاں یہ پہلی سے زیادہ خوں خوار اور خود بردار ہے۔ محبت کی طاقت کے سوائے کوئی اور طاقت اس کی مطابقت نہیں کر سکتی کیوں کہ محبت ہی ایک ایسی سمائی ہے جو انسان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرتی ہے۔ اس وقت جب کہ میں خود بینی و خود گیری میں مصروف ہوں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ اُس وقت میں واقعی مُردہ تھا۔ اس وقت میں زندہ ہوں اور اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔ میں ناقابلِ بیاں ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ میرا دل غم دیدہ مجھے رُلا تا ہے اور میں خود سے سوال کرتا ہوں، ”اُن بے موقع افسوسوں اور پچھتاؤ کا کیا مطلب ہے؟“

انسان عجیب مخلوق ہے! یہ اُسے پاتا چاہتا ہے جو خود کسی کو دے نہیں سکتا، اس لئے سے احساس لگا رہتا ہے کہ دنیا بُری ہے۔ دراصل یہ اس کا اپنا نامِ نفس ہے جس سے یہ جگہ جگہ ٹکراتا ہے۔ ہوتے ہوتے میں اس غیر مہدّہ سچائی کا قائل ہو گیا ہوں کہ یہاں صرف وہی اچھا انسان ہے جسے میں نہیں جانتا ہوں ورنہ وہ مجھے ضرور ملتا۔

انسان کی قوتِ تولید کا ربطِ حظِ نفس سے ہے اور قوتِ ایجاد کا جمالیاتی تجربے سے۔ یہ دونوں عملِ حسنِ رفاقت اور حسنِ لذت کا سرچشمہ ہیں۔ ان کی افادیت اور جمالیّت سے مرعوب ہو کر انسان نے ان کے ماعذوں (گرہستوں میں لنگ آچن اور کاریگروں میں جھنڈا آچن کی روایت ہے) کو قابلِ پرستش قرار دیا اور ان پر اپنا پورا حق جنلایا۔ انسان کے نشوونما میں یہی وہ مرحلہ تھا جب اسے اپنے حقوق کے تحفظ کا خیال آیا اور اسے اخلاقی و سماجی قدروں کی ضرورت پڑی۔ فنِ ایجاد میں خود تنقیدی ضروری تھی اور ترقی کے لئے مشارکت لازمی۔ جو ہی انسان نے ترقی کا یہ راز پایا، اس نے اسے زندگی کا نظریہ بنایا اور فیض اٹھایا۔ لیکن قوتِ تولید کی نفسیات خود پرست تھی اور بالاتر یہ کارروائی اپنی بلکہ پوری تھی۔ اس کے تقدس کو برقرار رکھنے اور اس کی مدافعت کے لئے انسان نے قانون بنائے اور غیر قانونی جسمانی رشتوں کو حقارت سے دیکھا، انھیں زنا کاری سے موصوم کیا اور اُن سے پیدائندہ بچوں کو حرام زادوں سے۔ حظِ نفس عین ذاتی قسم کی چیز ہے جیسے رگوں میں خون۔ جو لوگ ہنر کی طرح اس کا برملا اظہار کرتے ہیں اور خاص کر وہ جو اس کا کاروبار کرتے ہیں، اپنی لطیف حسوں کی آبروریزی میں

وہ تسکینِ نفس کی خاطر داری کے لئے کیا نہیں کرتے لیکن ناتمام رہتے ہیں۔ اور ناتمامی کی موت ہے۔

انسٹروپو کے کچھ دن بعد کالج سے خبر آئی کہ میں انسٹروپو میں پاس ہو گیا ہوں اور پندرہ دن کے رہوش کی فیس جمع کروانی ہے۔ یہ نویدِ سعید میری آرزو دگی بن کر آئی۔ مستقبل کا جامِ خوش وقت سا تھا لیکن میں اُسے پی نہ سکتا تھا۔ بھگت سنگھ کی مالی اعانت سے مجھے معاشی فراغت ملی بی نالائق اور نا عاقبت اندیشی اُسے پامال کر چکی تھی۔ میری لابیالی طبیعت میری مصیبت پر مدار میں تھا، صرف میں جس کام سے میں نفرت کرتا تھا وہ میری قسمت بن کر رہ گیا تھا۔ میں منفی رویہ خود بلانی آفت ہے جسے ہزاروں سال کی بے ہمت محنت، رحمت میں فی۔ میں اپنے چلن پر نالال پھٹنے لگا۔ میں افسردہ افسردہ اور بے زار بے زار کام پر جاتا، بس آتا اور پوسا پارک میں لیٹ کر ستاروں کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا۔ ستارے اُسار ہر آدمی کی فرد حیات بننے اور بگاڑنے میں مصروف ہیں لیکن اُن میں مجھے وہی یکسانیت بن بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ مجھے چھوڑ مال کی پیش گوئی جھوٹی جان پڑتی اور بھائیاجی

چھوڑ مال ایک فقیر تھا جو کبھی کبھار بھائیاجی کے پاس آتا تھا۔ میں وہاں ہونا تو وہ مجھے حیرت دینا آمیز لہجے میں کہتا، ”سرداجی! آپ کے نور چشم کے ستارے بہت اچھے ہیں۔“ یہ اور نور چشم! مجھے ڈر ہے کہ یہ بڑا ہو کر میری آنکھیں نہ نکلوا دے۔ اس کے ستاروں میں مجھے تیرے سے زیادہ خبر ہے، چھوڑ آ! یہ جیسا کم نظر، کام چور اور نوالہ حاضر ہے، تیری مانگتا پھرے گا۔“

میرے بد خو بھائیاجی اُس کا منہ چڑاتے اور اُس پر ہنستے، میری طرف ایسے دیکھتے جیسے ت پر پل۔ ہانتھا۔

میں اُن دونوں کی باتوں پر غور کرتا اور دیانت داری سے اپنا جائزہ لیتا۔ مجھے لگتا کہ اپنی بن اور خرابیوں کی جڑ مول میں ہوں۔

© Gian Singh Shatir

Published by Gian Singh Shatir, A-501, Satya Apartments,  
Masab Tank, Hyderabad-500028, Phone 220438 & Printed at  
Ushnak & Arvind 1303, Kalan Mahal, Darya Ganj, New  
Delhi 110 002, Phones 3272990, 3280125

**Price: Rs 300**

*Available at following address:*

Prem Gopal Mittal  
C/o Modern Publishing House  
Gola Market  
Darya Ganj  
New Delhi-110 002

Janab Asad Yar Khan  
Educational Book House  
University Market  
Aligarh (U.P.)

Dr. Khaliq Anjum  
Urdu Ghar  
Deen Dayal Upadaya Marg  
New Delhi-110 002

362  
1-94